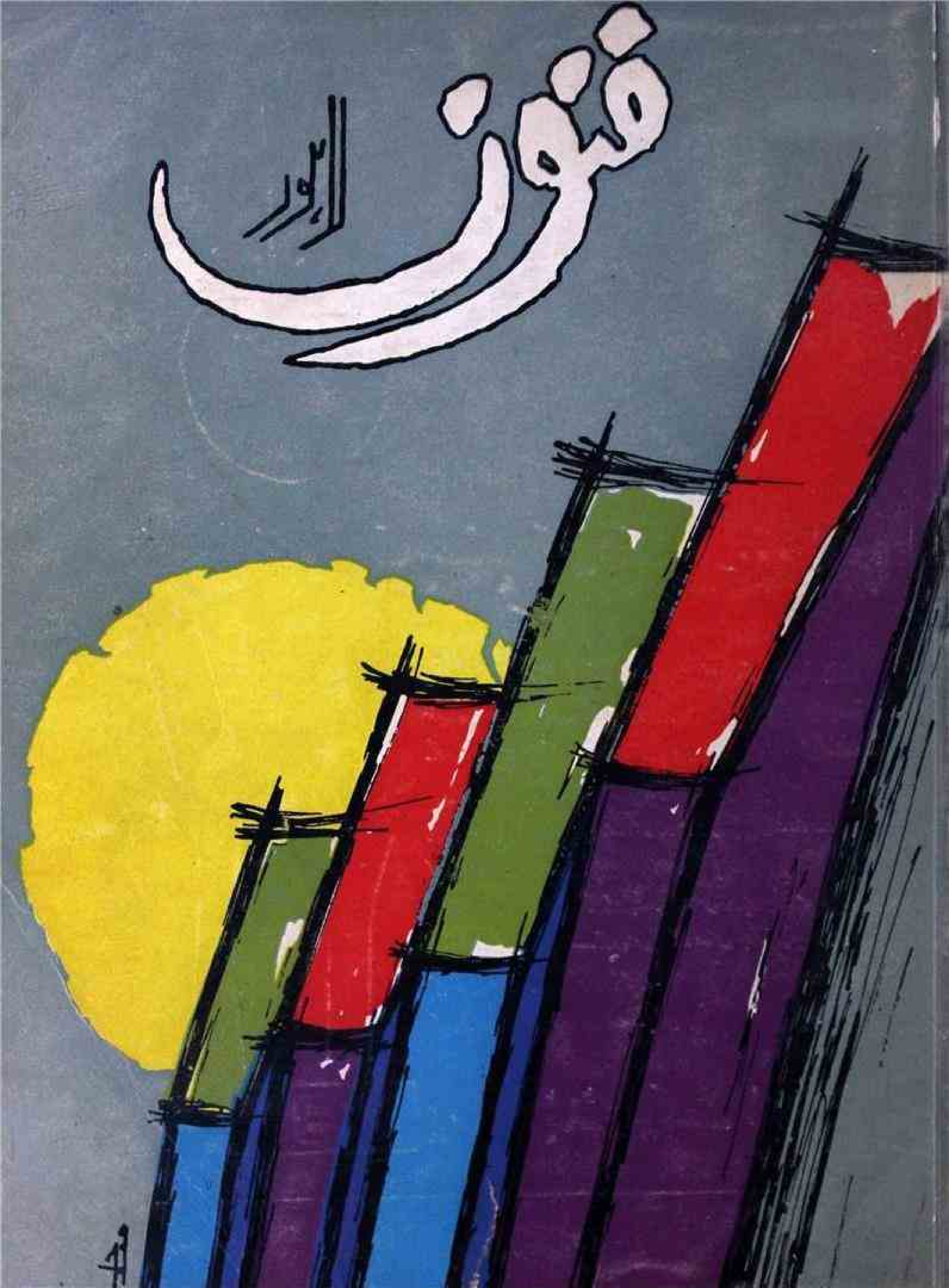

فنون
لاہور


ENDOWMENT INSURANCE
CHILD protection policy
PERSONAL ACCIDENT AND DISEASES INSURANCE
Group Insurance Scheme
خاندان کی حفاظت
بچوں کی شرطیہ تعلیم
THREE PAYMENTS PLAN
TAX SAVING THROUGH LIFE INSURANCE
آپ کی پسند
بیمۂ حیات کے یہ منصوبے آپ کی اور
آپ کے اہل و عیال کی حفاظت و بہبودی
کے مستقل ضامن ہیں۔
ایسٹرن فیڈرل بیمۂ حیات کے علاوہ آتشزدگی، بحری نقل و حمل، حادثات، جسمانی ضرر،
چوری، ہڑتالوں کی تخریب، ٹوٹ پھوٹ وغیرہ کا بھی بیمہ کرتی ہے۔
efu
ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کمپنی لمیٹڈ


انوسٹمنٹ
سیونگ اسکیم
بہتر زندگی کیلئے
اپنی ایک سال کی بچت کی حد تک ۱۵،۰۰۰/- روپیہ
قرضہ رعایتی شرح پر مل سکتا ہے۔
اسٹینڈرڈ بینک نے ایک انوسٹمنٹ
سیونگ اسکیم بنائی ہے۔
اس اسکیم میں آپ کی ایک سال کی بچت کے برابر
رعایتی شرح پر اضافی رقم بطور قرض مل سکتی ہے۔
یہ اضافی رقم مساوی ماہانہ اقساط پر دو سال میں
ادا کی جا سکتی ہے۔ اس اسکیم کے تحت اسٹینڈرڈ بینک
میں کھاتہ کھولنے سے آپ کو بیک وقت کئی فائدے
حاصل ہونگے۔ سال کے ختم ہونے پر اپنی بچائی ہوئی
رقم اس کے مساوی قرضہ اور بچت پر ملنے والا
منافع کو آپ اپنے
کاروبار - مکان کی تعمیر
کار اور دوسری ضروریات
کے خریدنے اور اپنی زندگی کو خوشحال
بنانے پر صرف کر سکتے ہیں۔
اب آپ ایک سال پہلے ہی سے ۳۰،۰۰۰/- روپیہ
کی حد تک انوسٹمنٹ کا منصوبہ بنا سکتے ہیں۔
مگر اس کے لئے ضروری ہے کہ آپ اس اسکیم
کے تحت آج ہی سے بچت شروع کریں۔
اس نادر موقع سے فائدہ اٹھایئے۔
مینیجر
اسٹینڈرڈ بینک لمیٹڈ
سے اپنی زندگی بہتر بنانے میں امداد کی تفصیلات دریافت فرمایئے۔


ریڈیو کا انتخاب بھی کوئی مسئلہ ہے؟
فلپس
خریدیئے اور کئی دیگر فوائد حاصل کیجئے!
۳۱۵ روپے*
فلپس ۳ بینڈ ٹرانزسٹر پورٹیبل ریڈیو
۴۲۵ روپے*
فلپس ۴ بینڈ ٹرانزسٹر ریڈیو
فلپس کوالٹی
فلپس گارنٹی
فلپس سروس
۱۵۰ روپے*
فلپس ایک بینڈ ٹرانزسٹر پورٹیبل ریڈیو
۲۰۵ روپے*
فلپس ۲ بینڈ ٹرانزسٹر پورٹیبل ریڈیو
فلپس ہی طلب کیجئے
فلپس کی مصنوعات ۵، سال سے زیادہ مدت کے تجربہ کا نتیجہ ہیں
PHILIPS


بلینڈ عمدہ، فلٹر اعلیٰ
سگریٹ نوشی کا لطف دوبالا!
WILLS
NAVY CUT
ولز
فلٹر ٹپ
خوردہ قیمت: ۲۰ سگریٹ ۱.۲۴ روپے میں اور ۱۰ سگریٹ ۶۲ پیسے میں
PTC
پاکستان ٹوبیکو کمپنی لیمیٹڈ


KARIMS
ایمبرائیڈرڈ
کیریلین فیبرکس
جاذب نظر۔ دلفریب۔ خوش رنگ!
کریم سلک ملز لمیٹڈ، جنہیں
فیشن کی دنیا میں نت نئے ڈیزائن پیش کرنے کا
خاص ملکہ حاصل ہے، اب
اس دور کا جدید ملبوس "ایمبرائیڈرڈ کیریلین فیبرکس"
پیش کرتے ہیں جو
دیکھنے میں خوشنما، چھونے میں ملائم اور پہننے میں
بے مثال ہیں!
شکنوں سے مبرا، دھلنے میں خنک، یہی کریم کے
"ایمبرائیڈرڈ فیبرکس" کی خصوصیت ہے
آرائش جمال کے لئے آج ہی
کریم کے ایمبرائیڈرڈ فیبرکس
کا انتخاب کیجئے!
یکے از مصنوعات: کریم سلک ملز لمیٹڈ، کراچی
M-19/66
Crescent

رجسٹرڈ نمبر ایل ۷۵۷۹

ٹیلیفون: ۶۹۵۸۰

فنون

خاص شمارہ

۱۰

سالنامہ ۱۹۶۸ء

ادارہ

احمد ندیم قاسمی — حبیب اشعر دہلوی

تزئین

مُوجد

جلد ۶ — جنوری فروری ۱۹۶۸ء — شمارہ ۴۳

سالانہ چندہ ۱۲ روپے — غیر ممالک سے: ۲۵ روپے

قیمت فی پرچہ (خاص شمارہ ۱۰) ۵ روپے ۲۵ پیسے

مقام اشاعت: ۴۷/۲ - انارکلی - لاہور (مغربی پاکستان)

مندرجات

مقالات :

افسانہ نگار :

مذاکرہ :

رفتگاں :

غزلیں :

فنونِ لطیفہ :

سفرنامہ :

طنز و مزاح :

اختلافات :

تبصرے :

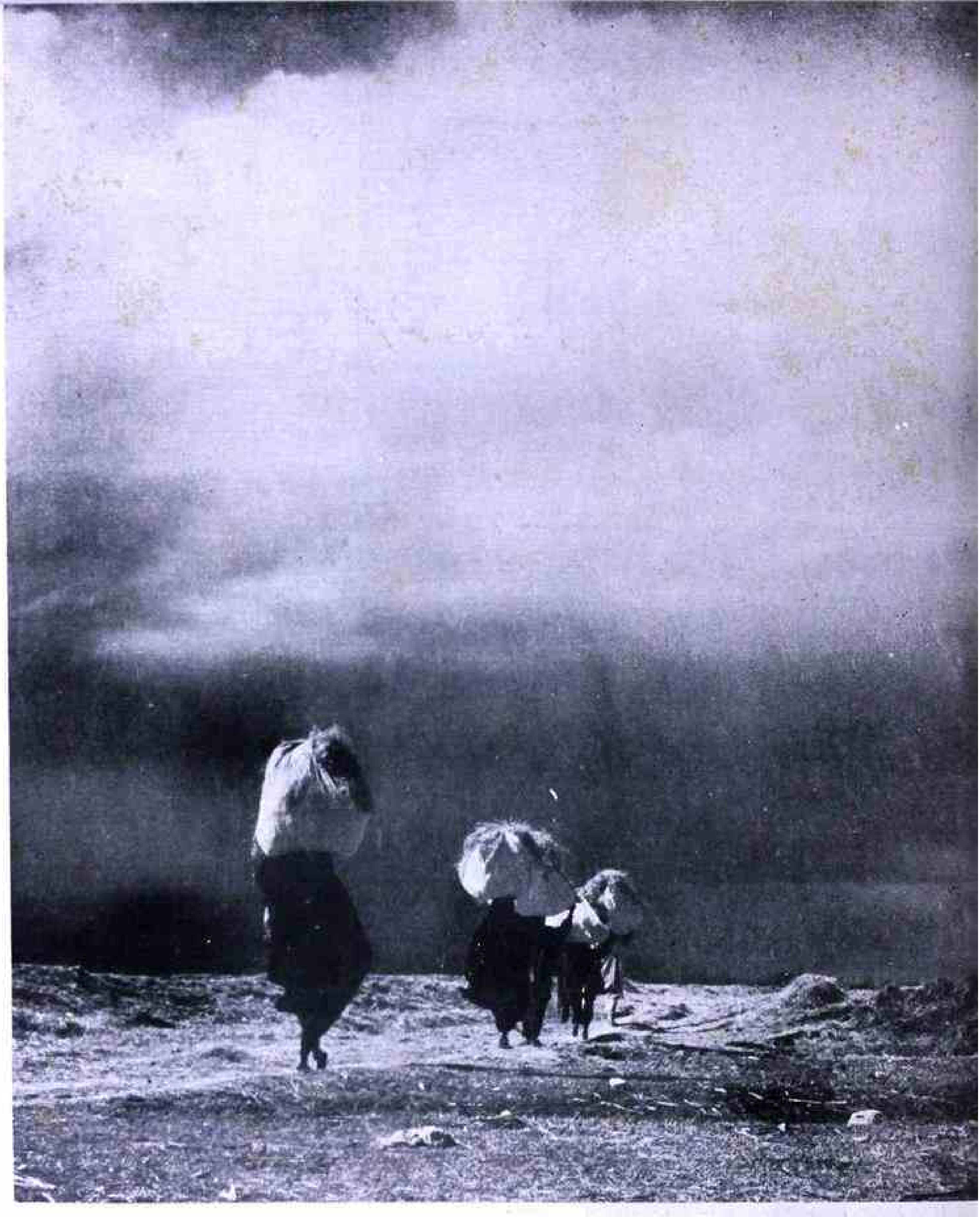
ادارہ

حرفِ اوّل

قارئین کو یاد ہوگا کہ ہم نے "فنون" کے اجراء پر بلند بانگ رسمی دعووں سے قطعی طور پر احتراز کیا تھا۔ ہم نے "فنون" کے اجراء کی صرف یہ وجہ عرض کی تھی کہ بس ہمارا جی چاہا۔ پھر اس رسالے میں ہم نے ہر مکتبِ فکر کے ادیب کو صرف ایک شرط پر شمولیت کی دعوت دی تھی اور وہ شرط معیار کی تھی۔ یہ درست ہے کہ رسالے کے مندرجات کا معیار بیشتر اس کے مرتبین کے ادبی معیاروں کا عکس ہوتا ہے اور اس سے مفر ممکن نہیں، لیکن اگر ادب کے قاری کو کسی رسالے کے مرتبین کی نیک نیتی اور فن کے ساتھ ان کی لگن پر اعتماد ہو تو معیار کا مسئلہ بہت حد تک حل ہو جاتا ہے۔ "فنون" کے گذشتہ فائل گواہ ہیں کہ ہم نے اپنی اس واحد شرط کے ساتھ انصاف کیا ہے اور اب ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ جہاں "فنون" کے مندرجات اس کا معیار معین کرتے ہیں وہاں "فنون" میں کسی چیز کی شمولیت اس امر کی ضمانت قرار دی جانے لگی ہے کہ یہ چیز معیاری ہے۔

<u>مندرجات کا معیار</u>: "فنون" کے صرف اس شمارے کو سوا سو سے بھی زیادہ اہلِ قلم کی شمولیت کا شرف حاصل ہے۔ ان میں مستند و معروف شعراء و ادباء کے علاوہ وہ نوجوان اور بعض صورتوں میں نووارد ادیب اور فنکار بھی شامل ہیں جو ہمارے شعر و ادب کا مستقبل ہیں اور جن کی نگارشات کی جدت اور تازگی اور توانائی اور سچائی علم و فن سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اطمینان اور آسودگی کا سرمایہ ہے۔ اس کے باوجود یہ قطعی ضروری نہیں ہے کہ "فنون" کے ہر قاری کو ان سوا سو اہلِ قلم میں سے ہر ایک کی تخلیقات پسند آئیں۔ ہماری کوشش یہ ہوتی ہے کہ "فنون" کے مندرجات میں ایک ایسا تنوّع ہو کہ ہر قاری کو اس کے ہر شمارے میں سے اپنے ذوق اور اپنی پسند کی چند چیزیں مل جائیں۔ ایک معیاری ادبی رسالے کے مرتبین سے اگر یہ مطالبہ کیا جائے کہ وہ ہر اشاعت میں ایسے ادب پارے جمع کریں جو اس رسالے کے ہر قاری کی پسند کے معیار پر پورے اتریں، تو یہ ایک ایسا مطالبہ ہے جسے پورا کرنا انسانی اختیار سے باہر ہے۔

یہی وجہ ہے کہ "فنون" کے سے معیاری رسالے کے بعض مندرجات پر بھی بعض قارئین اعتراض فرماتے ہیں۔ سب سے بڑا اعتراض عموماً یہی رہا ہے کہ فلاں چیز ہمیں پسند نہیں آئی مگر اب ایک اور اعتراض بھی کیا جانے لگا ہے اور وہ جدید نظم اور جدید غزل اور جدید افسانے اور جدید تنقید پر ہے۔ اعتراض یہ ہے کہ یہ چیزیں اتنی جدید کیوں ہیں؟ نظموں کے موضوعات ایسے کیوں ہیں جن پر ابھی تک نظمیں نہیں کہی گئی تھیں؟ غزل کی "دلکشی" کیوں بدل رہی ہے اور اس میں جذبہ و احساس کے ایسے گوشے بھی کیوں نمایاں ہونے لگے ہیں جن پر ہمارے قدیم غزل نگاروں نے تشبیہ و استعارہ کے نقاب ڈال رکھے تھے؟ افسانہ تلخی کی حد تک سچا کیوں ہے اور تنقید اتنی بے لحاظ کیوں ہے؟ مشکل یہ ہے کہ اس قسم کے سب اعتراضات سے بالواسطہ طور پر جدید ادب کی تحسین کا پہلو نکلتا ہے۔ لیکن اگر معترضین کو ضد ہو کہ ان کے اعتراض کو اعتراض ہی کے لغوی معنوں میں لیا جائے تو ہم بڑے ادب کے ساتھ عرض کریں گے کہ یہ اعتراضات اس حقیقت سے مکمل بے خبری کی علامت ہیں کہ ادب و فن کی قدریں جامد نہیں ہوتیں۔ ادب زندگی کی طرح مسلسل ارتقاء پذیر ہے اور جدید ادب اسی ارتقاء کی علامت ہے۔ یہ درست ہے کہ جدت کے نام پر ہر دور میں رطب و یابس کے بھی انبار لگتے رہے ہیں اور رطب و یابس پیدا کرنے والوں



مبادا طوفان آجائے

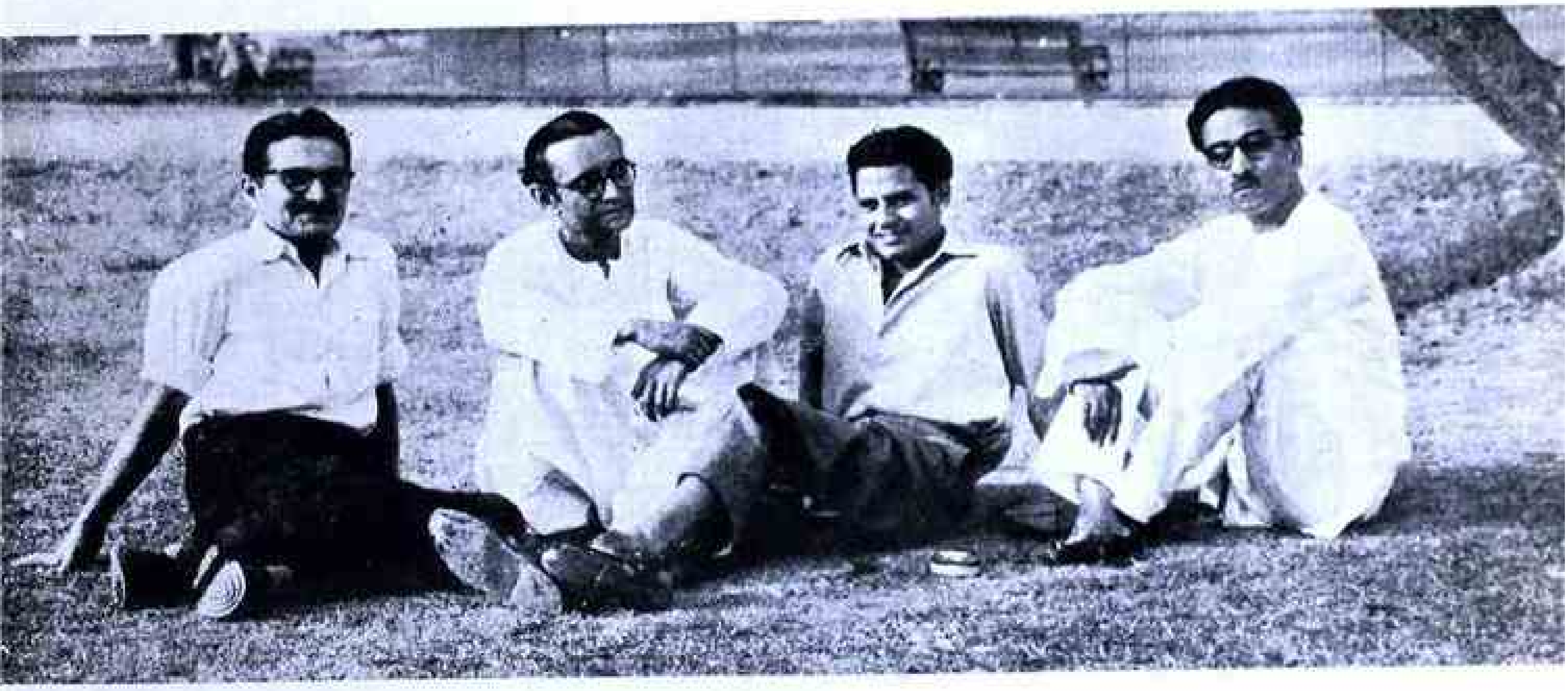
فوٹو ۔ محمد قاسم

عصمت چغتائی



احسان دانش





دائیں سے بائیں۔ شوکت تھانوی (مرحوم) اے حمید سعادت حسن منٹو (مرحوم) اشفاق احمد



ظفر اقبال

منظور عارف



انتظار حسین



صفی الدین صدیقی





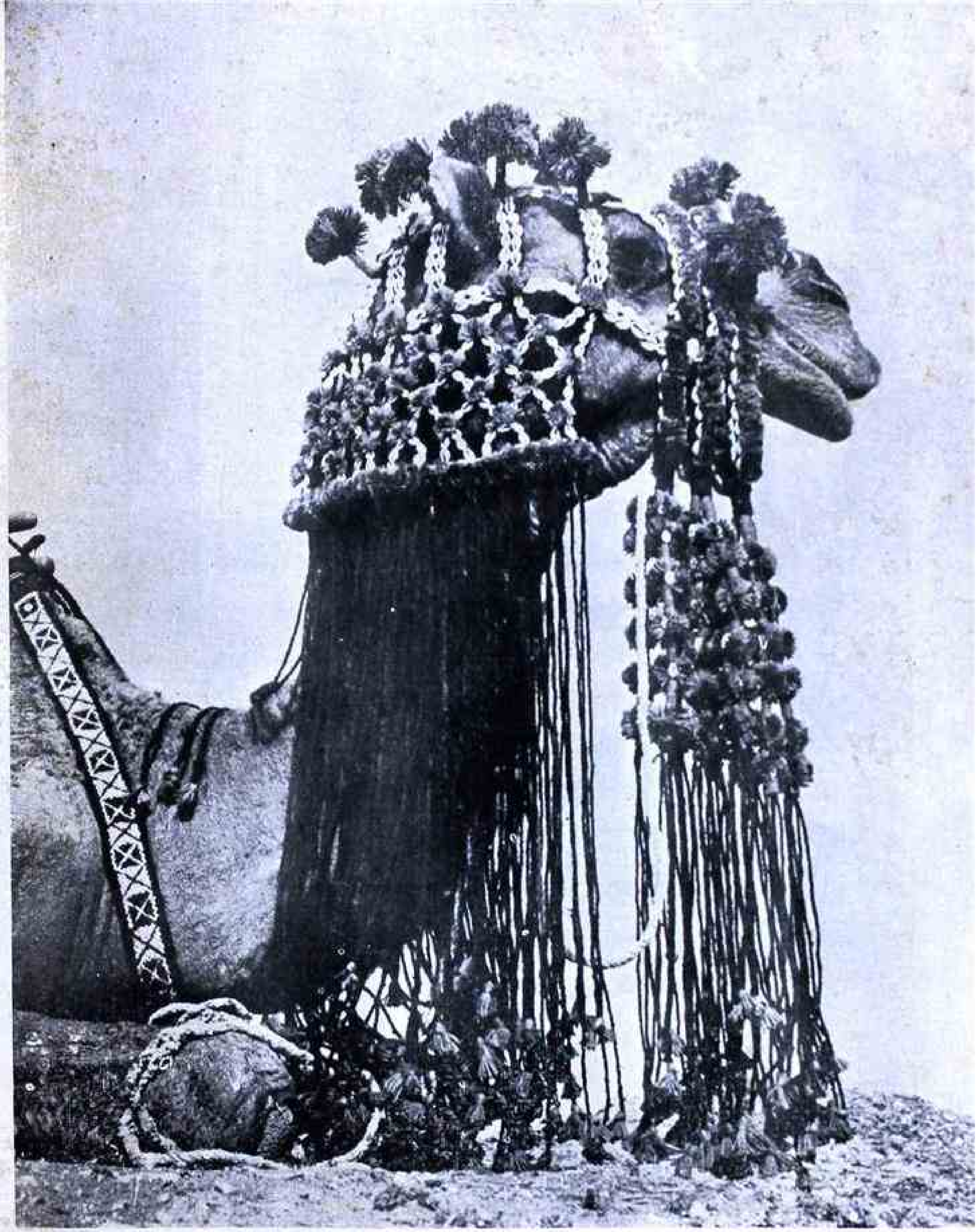
فہمیدہ ریاض



خالد احمد



محمد ایوب اولیا



یک رخ

فوٹو ۔ محمد قاسم

کو بھی یہ اصرار رہا ہے کہ انہیں نیا ادیب تسلیم کیا جائے۔ مگر ایک معیاری ادبی رسالے کا منصب یہ ہے کہ وہ ادب میں جدت کے بھی معیار معین کرے اور اپنے قارئین کو صرف ایسی جدت سے روشناس کرائے جس کا ہماری عظیم ادبی اور فنی روایات سے رشتہ بھی قائم رہے اور جو روحِ عصر سے بھی بیگانہ نہ ہو اور جس کا تخلیقی معیار بھی شک و شبہ سے بالا ہو۔ اس جدت کو قبول کرنے کے لئے بے اصول ہونا ضروری نہیں، صرف فراخ دل ہونا لازمی ہے۔ "فنون" کو اپنے اس امتیاز پر فخر ہے کہ اس کے سامنے نہ کوئی مصلحت ہے اور نہ کوئی مجبوری ہے۔ "فنون" فنکاروں کا احترام کرتا ہے مگر اولیت فن پاروں کے معیار کو دیتا ہے۔ وہ ادبی رسالوں کی برادری کا ایک ایسا رکن ہے جس کی ایک اپنی انفرادیت ہے اور اسے اپنی اس انفرادیت پر فخر ہے۔

کچھ اس شمارے کے بارے میں: اس شمارے سے "فنون" کے مستقل عنوانات میں ایک عنوان "افسانہ نگار" کا اضافہ ہوا ہے۔ اب کے ممتاز مفتی اور انتظار حسین کی افسانہ نگاری پر مضامین شائع کئے جا رہے ہیں۔ آئندہ شماروں میں یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ ہم کوشش کریں گے کہ اردو کے سب قابلِ ذکر افسانہ نگاروں پر مضامین لکھوائے جائیں اور یوں اردو افسانہ نگاری کی ہمہ گیری اور ہمہ جہتی کے علاوہ اس کی بعض نارسائیوں کا احساس بھی بیدار ہو تاکہ نئے افسانہ نگاروں میں علامت نگاری کی بجائے نئے نئے موضوعات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کا حوصلہ پیدا ہو — اس شمارے میں مذاکرے (اقبال کا اصل کارنامہ) نے خاصی شدت اختیار کر لی ہے اور بحث کے دائرے میں علامہ اقبال اور مولانا مودودی کے علاوہ سر سید احمد خاں اور اکبر الٰہ آبادی بھی آگئے ہیں۔ یہ بڑے اطمینان کی بات ہے کہ اہلِ قلم نے اس مذاکرے میں اتنی سنجیدہ دلچسپی لی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ بحث محض برائے بحث ثابت نہیں ہوگی بلکہ بعض علمی، فنی، تہذیبی اور نظریاتی مسائل کے بارے میں کسی متفقہ نتیجے تک پہنچنے کی راہ ہموار ہو جائے گی — "اختلافات" کے حصے میں اب کے بھی گذشتہ شمارے میں شامل ہونے والے "مخالفین" کے ارشادات کی طرح تلخی اور برافروختگی کا عنصر نمایاں ہے۔ تلخی تو شاید اختلافات کا منطقی نتیجہ ہو مگر اس ضمن میں گذارش یہ ہے کہ ذاتیات کو زیرِ بحث لانے سے گریز فرمایا جائے۔ ادب و فن میں اختلافات نظریاتی ہوتے ہیں، شخصیاتی نہیں۔ بلاشبہ اختلافات کے اظہار میں شخصیتوں کا ذکر آنا لازمی ہے مگر اصل بحث متذکرہ شخصیت کا نقطۂ نظر ہونا چاہیے نہ کہ اس کی سوانح عمری۔ "فنون" میں اختلاف کے اظہار کی آزادی کا مقصد یہ ہے کہ اختلافِ رائے کے اظہار کے بھی مہذب معیار قائم کئے جائیں اور بحث و تمحیص کو باہمی عداوت کی بجائے افہام و تفہیم کا ذریعہ قرار دیا جائے۔ ہمیں معاونین اور قارئین سے توقع ہے کہ وہ اظہارِ اختلاف کرتے ہوئے ہماری اس گذارش کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھیں گے — شاعروں اور افسانہ نگاروں میں اب کے بھی قارئین کو چند نئے نام نظر آئیں گے۔ ایسے نئے لکھنے والوں کی نگارشات سے "فنون" کو آراستہ کرنا ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں جن کے ہاں خیال کی چمک اور لہجے کی کھنک ہو۔ مگر اب کے "فنون" نے ایک اور کارنامہ بھی انجام دیا ہے۔ اردو کی نامور شاعرہ زہرا نگاہ گذشتہ کئی برس سے خاموش تھیں اور اگر لکھ رہی تھیں تو اشاعت سے گریزاں تھیں۔ "فنون" کے گذشتہ شمارے میں بھی زہرا کی ایک غزل شامل ہوئی تھی۔ اب کے ان کی تین نظمیں اور تین غزلیں شاملِ اشاعت ہیں۔ یہ ان کے زیرِ ترتیب مجموعۂ کلام "موجِ ہنر" سے لی گئی ہیں۔ قارئین کو زہرا کے کلام کے مطالعے سے اندازہ ہو جائے گا کہ اس فنکارہ نے گذشتہ کئی برس کی "غیر حاضری" میں اظہار و معیار کی کتنی منزلیں طے کر لی ہیں۔ ہم اردو شاعری کی محفل میں زہرا نگاہ کی واپسی کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

سہ ماہی کی بجائے دو ماہی اشاعتیں: قارئینِ "فنون" کو مژدہ ہو کہ آئندہ سے ہم نے "فنون" کی خاص اشاعتوں کو سہ ماہی کی بجائے دو ماہی کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اب سال میں "فنون" کے چھ شمارے شائع ہوا کریں گے۔ یوں "فنون" کی "بے قاعدگی" کا مسئلہ بھی باقاعدہ طور پر ختم ہو جائے گا اور قارئین کو بھی طویل انتظار کی زحمت سے چھٹکارا حاصل ہوگا۔ ہمیں یقین ہے کہ قارئین کی توجہ اور محبت ہمیں اپنے اس فیصلے پر کاربند رکھے گی۔

جدید غزل نمبر: سالِ رواں کے وسط میں ہم "فنون" کا "جدید غزل نمبر" پیش کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اقبال کے بعد سے لے کر اب تک کی غزلوں کا ایک ضخیم انتخاب ہمارے پیشِ نظر ہے۔ غزل گو شعراء سے استدعا ہے کہ وہ "فنون" کے ساتھ تعاون فرمائیں اور اپنی غزلوں کے انتخاب میں ہمارا ہاتھ بٹائیں۔ صرف اسی طرح ہم ایک ایسا نمبر مرتب کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں جسے جدید اردو غزل کا نچوڑ کہا جا سکے۔

حفیظ جالندھری

لفافوں کا تمدّن

بنا ہو جس تمدّن کی، لباسوں کی ستائش پر
جِلَو میں جن کے چلتی ہو غلامانہ سرشت اُن کی
جہاں حق اور باطل میں نہ ہو ضدّین کی صورت
عبارت زیست ہو جن کی دواؤں سے غذاؤں سے
جہاں ذہنی کثافت کا شرافت نام نامی ہو
تلاطم ہو جہاں بھی بدعت و غضب و خیانت کا
شریروں کے جتھے، غارتگروں کی ٹولیاں ٹوٹے
وہاں ناحق پرستوں کو صداقت کس طرح بھائے

جہاں مضمون قرباں ہو لفافوں کی نمائش پر
ہوئی ہو ساتھ ہی جن کے تولد خوئے زشت اُن کی
جہاں اپنی غرض ہی میں ہو نصب العین کی صورت
پھلا پھولا ہو جن کا نفس معدے کی ہواؤں سے
ثقافت فحش آرائش، خباثت دھوم دھامی ہو
وہاں سایہ نظر آتا نہیں صِدق و دیانت کا
کھڑے ہوں جس جگہ "جیبھیں" نکالے اور منہ کھولے
وہاں پیٹے نہ کیسے پڑ رہے ہوں، کیوں نہ چھاتی پھٹ جائے

وہاں اے دوست تیرے صِدق کا اظہار بے معنی
بصیرت اور بصارت اور یہ کردار بے معنی

فیض احمد فیض

رخصت

درد اتنا تھا کہ اُس رات دلِ وحشی نے
ہر رگِ جاں سے اُلجھنا چاہا
ہر بُنِ مُو سے ٹپکنا چاہا
اور کہیں دور، ترے صحنِ چمن میں گویا
پتّا پتّا مرے افسردہ لہو میں دُھل کر
حسنِ مہتاب سے آزردہ نظر آنے لگا
میرے ویرانۂ تن میں گویا
سارے دُکھتے ہوئے ریشوں کی طنابیں کھُل کر
سلسلہ وار پتہ دینے لگیں
رخصتِ قافلۂ شوق کی تیّاری کا
اور جب یاد کی بجھتی ہوئی شمعوں میں نظر آیا کہیں
ایک پل، آخری لمحہ تری دلداری کا
درد اتنا تھا کہ اُس سے بھی گزرنا چاہا
ہم نے چاہا بھی، مگر دل نہ ٹھہرنا چاہا

یوسف ظفر

شخصیت اور روایت

میں کنگرہ ہوں!
میرے جسم میں میرا سایہ مجھ کو ڈھونڈ رہا ہے

بند دریچوں کے اندر میں چھپ بیٹھا ہوں
شیشوں سے اک روشن سایہ
ٹک ٹک مجھ کو دیکھ رہا ہے
آنکھ جھپکنا اس پر بوجھل
اس کو ڈر ہے
ہو جاؤں گا آنکھ سے اوجھل —
بچپن میں یہ سایہ میرے سر پر تھا
اب یہ بند دریچوں کے باہر بیٹھا ہے
دھوپ ہو یا بارش ہو یا تاریکی ہو
روشن سایہ میری تاک میں رہتا ہے —
سو جاتا ہوں تو یہ میری آنکھوں میں چھپ کر
خواب کے تانے بانے بن کر
مجھ سے باتیں کرتا ہے
مجھ کو ساتھ لیے ہر وادی، ہر صحرا سے گزرتا ہے
شاید میرے جسم کے سائے سے یہ سایہ ڈرتا ہے
جاگتا ہوں تو بند دریچوں کے باہر
یہ بیٹھا آہیں بھرتا ہے۔

میں کنگرہ ہوں
میرے جسم میں میرا سایہ مجھ کو ڈھونڈ رہا ہے
میں نے اس سے پیار کیا تھا
اس کی خاطر دنیا کے سب دکھ جھیلے تھے
لیکن اس نے باہر آ کر
مجھ سے ملنا
کبھی گوارا کیا نہیں ہے
کبھی مرے سائے سے مل کر چلا نہیں ہے

دونوں سائے کس کے نور سے ابھرے ہیں!
کس کے سورج میرے اندر، میرے باہر چمک رہے ہیں
جن کی دھوپ سے گھبرا کر میں ان سایوں کو دوڑاتا ہوں!
منزل سے منہ موڑتا ہوں!

اک دن میرے جسم کا سایہ تھک کر پتھر بن جائے گا
میرا جسم بھی پتھر ہو گا
دونوں پتھر قبر میں ہوں گے
لیکن باہر، بند دریچوں کا یہ سایہ
کتبہ بن کر پہرا دے گا
چلتے وقت کو ٹھہرا دے گا —

اختر انصاری (دہلوی)

رباعیات

آ صبر کریں شیخ! خدا ہے والی
ہم دونوں کی تقدیر میں تھی پامالی
ہے کاسۂ سر مغز سے خالی تیرا
جس طرح مرا جام ہے مے سے خالی

گُل اور گریباں دریدہ! ہے ہے
نازک جگر اور زخم رسیدہ! ہے ہے
یارب کبھی تو نے بھی نہ سوچا ہوگا
انسان اور انسان گزیدہ! ہے ہے

بھونرے ہیں ابھی تو پل رہی ہے دنیا
سانچے میں ابھی تو ڈھل رہی ہے دنیا
ہے دور بہت عہدِ بلوغت یعنی
گر گر کے ذرا سنبھل رہی ہے دنیا

دل میں مرے نغماتِ ابد پلتے ہیں
افکار میں خورشید و قمر ڈھلتے ہیں
قانونِ ہلاکت سے بری ہے مرا فن
واللہ یہاں موت کے پر جلتے ہیں

ادا جعفری

بنامِ حیات آفریں

تیرا شہ پارۂ فن — حیات آفریں
زندگی — اور میں زندگی کی امیں
نغمہ خواں زندگی، نوحہ گر زندگی
راہرو، راہزن، راہبر زندگی
دل ربا زندگی، دل شکن زندگی
تیرگی زندگی، ضو فگن زندگی
تیرا پیمانہ اضدادِ اقدار ہے
صاحبِ تاج ہے۔ جو سرِ دار ہے
ہاں مگر اک محبت کا ایوان ہے
جس پہ بارانِ انعام و الوان ہے
جس پہ یکساں ہے تیری نگاہِ کرم
تیری جود و عطا، تیرا جاہ و حشم
وہ نگہ جو محبت سے بھرپور ہے
درد سے آشنا، زخم سے چور ہے
محترم ہو گئی، معتبر ہو گئی
بے کراں ہو گئی، باخبر ہو گئی
فرش کو عرش سے ہم عناں کر دیا
پیکرِ خاک کو جاوداں کر دیا
وہ محبت جو باقی ہے، فانی نہیں
جو حقیقت ہے، کوئی کہانی نہیں

تیرا شہ پارۂ فن — حیات آفریں
زندگی — اور میں زندگی کی امیں
وہ جسے میں نے ہر آرزو سونپ دی
ہر خوشی خود ترے روبرو سونپ دی
سحر و اعجاز تھی وہ جدھر ہو گئی
اُس نگہ کی کرن سے سحر ہو گئی
زندگی ہے عطیّہ ترا بالیقیں،
زندگی کی لگن اُس کا عکسِ جبیں
عشق کے سامنے خار و خس ہی سہی
زندگی مہلتِ یک نفس ہی سہی
یہ نفس دو نفس بھی اُسے سونپ دوں
اُس کی خوشبوئے انفاس بن کر جیوں
ہاں بنامِ محبت — حیات آفریں
اُس کا حق بھی تو اس جاں پہ کچھ کم نہیں!

منیر نیازی

خزاں زدہ باغ پر بوندا باندی

آمدِ باراں کا سناٹا
کبھی کبھی اس سناٹے میں ٹوٹ کے گرتے پتے
دیو آسا اشجار کھڑے ہیں
کہیں کہیں اشجار تلے ویران پرانے رستے

لے کے چلیں آوارہ ہوائیں
ایک نشانی اس کی جو تھی اس کو واپس پہنچانے
آج بہت دن بعد آئی ہے شام یہ چادر تانے
اک وعدہ جو میں نے کیا تھا، اس کی یاد دلانے

آج بہت دن بعد ملے تھے گہری پیاس اور پانی
ساحلوں جیسا حُسن کسی کا اور میری حیرانی

قتیل شفائی

کچھ آوازوں کے سائے

گیت

کچھ آوازوں کے سائے میری کھوج میں ہیں
میں ان سے بھاگ کے جاؤں کہاں
میں اپنا آپ چھپاؤں کہاں ؟
کچھ آوازوں کے سائے میری کھوج میں ہیں

یہ میرے دل کی ویرانی، یہ درد کا گھر استھان
جھونکا بھی چلے تو شور مچے، آنسو بھی گرے تو آئے صدا
اس شور مچاتی وادی میں
اس اُجڑی ہوئی آبادی میں
کچھ آوازوں کے سائے میری کھوج میں ہیں
میں ان سے بھاگ کے جاؤں کہاں
میں اپنا آپ چھپاؤں کہاں ؟
کچھ آوازوں کے سائے میری کھوج میں ہیں

کل تک پازیب چھنکتی تھی جن رُکتے بھاگتے خوابوں کی
اب قبر بنی ہے آنکھوں میں اُن جیتے جاگتے خوابوں کی
اب کوئی سہانا گیت نہیں
وہ ساز نہیں سنگیت نہیں
کچھ آوازوں کے سائے میری کھوج میں ہیں
میں ان سے بھاگ کے جاؤں کہاں
میں اپنا آپ چھپاؤں کہاں ؟
کچھ آوازوں کے سائے میری کھوج میں ہیں

قتیل شفائی

سوچ ، سمندر سے بھی گہری

سمندر کی تہہ میں اُتر تو گیا ہوں
میں اپنے سبک جسم سے باندھکر ایک خوش رنگ پتھر
یہ پتھر جو مجھ کو سمندر کی تہہ سے
ابد تک ابھرنے نہ دے گا
یہ پتھر جو زنجیرِ پا بن گیا ہے

یہ مانا سمندر کی شفاف تہہ میں
مرے واسطے اک حسیں جل پری نے
صدف ہی صدف موج در موج بکھرا دیے ہیں
جدھر دیکھتا ہوں
چمکتے دمکتے ہزار رنگ موتی
مرے راستے میں نچھے جا رہے ہیں
مگر ان حسیں موتیوں کی جواں جگمگاہٹ سے آگے
طلسماتِ صد رنگ کی سیڑھیوں سے اتر کر
چٹانوں کے نیچے
پُراسرار ، نادیدہ گہرائیوں میں
کوئی بدنما و بد اندیش عفریت سویا ہُوا ہے
خود اپنے ہی خوابوں کی لذت میں کھویا ہُوا ہے

سمندر کی نادیدہ گہرائیوں کا یہ منظر
ابھی تک تو اوجھل ہے میری نظر سے
ابھی تک تو عفریت جاگا نہیں ہے
ابھی تک تو میں سانس روکے کھڑا ہوں
مگر دیکھتا ہوں
کہ گہرے سمندر کے اِن پُرسکوں پانیوں میں
مرے جسم کی آنچ سے بلبلے بن رہے ہیں
یہ بنتے ہُوئے بلبلے آس کے وہ محل ہیں کہ جن میں
ارادوں کی رنگین شہنائیاں بج رہی ہیں
مجھے ڈر ہے شہنائیوں کی صدا سے
یہ خونخوار عفریت اگر جاگ اُٹھا
تو سارے سمندر میں ہلچل مچے گی
نہ میں بچ سکوں گا نہ میری کوئی آرزو بچ سکے گی

اگر میں نے گھبرا کے چاہا پلٹنا
تو مجھ کو ابد تک ابھرنے نہ دے گا سمندر کی تہہ سے
یہ خوش رنگ پتھر
یہ پتھر جو زنجیرِ پا بن گیا ہے
یہ پتھر جو میرا خدا بن گیا ہے

ظہور نظر

آخری سوال

راندۂ روح دل کی تنگ و تاز پر
یاس کی آفتِ ناگہاں پھر پڑی
زینہ ذہن پر لڑکھڑاتی ہوئی
سوچ بیساکھیاں چھوڑ کر گر پڑی،

ماضی و حال و فردا کے سب آئینے
کرب کی تہہ بہ تہہ گرد سے اٹ گئے
سلسلے گرمیٔ جاں کے جتنے بھی تھے
خوف کے خنجرِ سرد سے کٹ گئے
دھڑکنوں کے دریچوں میں ہنستی ہوئی
آرزوؤں کے لب درد سے پھٹ گئے

کانپتی کپکپاتی ہوئی روح کی
تیرگی میں مرے خون کی بو رچی
زندگی کے جزیرے میں چار دل طرف
ایک طوفاں اٹھا، اک قیامت مچی

تو بھی آئی نظر تو یہ کہتی ہوئی
خودکشی، خودکشی، خودکشی، خودکشی!!
خود کو خود سے بچائے رکھوں کب تلک؟
آج، کل پر اٹھائے رکھوں کب تلک؟؟

ظہور نظر

لاوارث

فلک کی داشتہ زمیں
ہے کائنات کی تمام بیسواؤں سے حسیں
یہ فاحشہ
یہ زندگی
نرت پہ آفتاب کی
ازل سے محوِ رقص ہے
فلک،
کہ وقت کا غلام اک کمین شخص ہے
ہُوا ہے اور نہ ہوگا مجھ پہ مہرباں
کہ اُس کی داشتہ زمیں
ہے میری ماں ——— !!

ظہور نظر

انجانا دُکھ

ہرے بھرے لہراتے پتّوں والا پیڑ
اندر سے کس درجہ بودا، کتنا کھوکھلا ہو سکتا ہے

مجھ سے پوچھو!
میں اک ایسے ہی چھتنار کے نیچے بیٹھا
اُس کی چھاؤں سے اپنے سنسان سفر کی
دھوپ کا دکھڑا بھول رہا تھا
آنے والے وقت کی ٹھنڈی، گیلی مٹی رول رہا تھا
اپنے آپ سے بول رہا تھا
میں بھی کتنا خوش قسمت ہوں
جیون کی سنسان ڈگر پہ
میرے کتنے یار کھڑے ہیں پیڑ کی صورت

اتنے میں اک جھونکا آیا
یہ جھونکا چاندی کی کان کے اندر سے ہو کر آیا تھا
ایک ہی پل میں
پیڑ کی چھال نے رنگت بدلی
ایک ہی پل میں
ہر پتّے کی شکل ہوئی ٹکیالی گدلی
شاں شاں کرتی شاخوں میں اک زہریلی سرگوشی جاگی
چھاؤں چھپٹ کر پیڑ کے تن کی جانب بھاگی
دل یہ منظر دیکھ کے سہما، کانپا، رویا
چاروں اور سے اٹھتی اک انجانے دکھ کی دھول میں کھویا
زہر سا اک رگ رگ میں سمایا
اتنے میں اک اور جھومتا جھونکا آیا
یہ جھونکا خود غرضی کے کہسار پہ منڈلا کر آیا تھا
بس اتنا ہی یاد ہے مجھ کو

کیسے اور کب پیڑ گرا، یہ پیڑ سے پوچھو!
مجھے نکالو!
اس بودے اور کھوکھلے پیڑ کے نیچے دب کر
میرے ساتھ مرا احساس بھی مر جائے گا
جو بھی یہ منظر دیکھے گا، ڈر جائے گا
دیکھنے والوں کو اس خوف سے، اس صدمے، اس غم سے بچا لو!
مجھے نکالو ——!!

آیندہ میں ہر چھتنار کو اپنا یار نہیں سمجھوں گا
کبھی کبھی ڈھل جانے والی چھاؤں کو پیار نہیں سمجھوں گا

رئیس امروہوی

خودرفتگی ہا

(متفرقات)

○

نہ وجود و عدم نہ غیب و حضور — وقت میں بہ رہی ہے موجِ شعور
ذات ہے ذات کی طرف مائل — واپسی کا سفر ہے، منزل دور
آج تک ہے جراحتِ تخلیق — سینۂ کائنات کا ناسور
منزلیں اپنی راہ میں جولاں
قافلے اپنی گرد میں مستور

○

کھُل رہی ہے عجم جہاں کی کتاب — پڑھ رہا ہوں خود اپنی زیست کا باب
ایک ایسی زباں میں لکھی ہے — کاتبِ وقت نے یہ فردِ حساب
جس کے خط و حروف و معنی کی — ابتدا اور انتہا نایاب
اسی خط میں لکھے گئے ہوں گے — زندگی کے نوشتہ ہائے عذاب
یہ زباں قبلِ آفرینش کی — کلمہ جس میں ہے "نہ کُن" کا خطاب
ہاں اسی "اجنبی زباں" میں کیے — دلِ بیدار نے بعالمِ خواب
اَحدیت سے کچھ پیام و سلام
ابدیت سے کچھ سوال و جواب

احمد فراز

خوں بہا

اُجرتی قاتل کی صورت
بے حس و بے درد لمحوں کا خدا
آج پہلی بار جیسے قتل کر کے
سخت شرمندہ ہُوا

بے گناہی کے لہو میں تر بتر
معصومیت کی خاک میں لت پت
تڑپتی آرزو چیخی
کہ آخر کس عداوت کس ارادے
کس خطا کی یہ سزا؟

ایک منعم کی طرح
اُجرتی قاتل نے میرے سامنے
بکھرے ہوئے اوراق پہ
لفظوں کے کچھ لعل و گہر
یاقوت و مرجاں — رکھ دیئے
— لو خوں بہا!
اور میں مقتول کے مجبور وارث کی طرح
چپ ہو گیا

احمد فراز

عقیدت

میں کتنی وارفتگی سے اس کو سُنا رہا تھا
وہ ساری باتیں، وہ سارے قصے
جو اس سے ملنے سے پیشتر
میری زندگی کی حکایتیں تھیں

میں کہہ رہا تھا
کہ اور بھی لوگ تھے
جنھیں میری آرزو تھی، مری طلب تھی
کہ جن سے میری محبتوں کا رہا تعلق
کہ جن کی مجھ پر عنایتیں تھیں

میں کہہ رہا تھا
کہ ان میں کچھ کو تو میں نے
جاں سے عزیز جانا
مگر انہی میں سے
بعض کو میری بے دلی سے شکایتیں تھیں

میں ایک اک بات
ایک اک جرم کی کہانی
دھڑکتے دل، کانپتے بدن سے سنا رہا تھا
مگر وہ پیکر بنی
مجھے اس طرح سے سنتی رہی
کہ جیسے مرے لبوں پر
کسی مقدس ترین صحیفے کی آیتیں تھیں

احمد ظفر

خیال کے روپ

زرد ہوا کی لمبی چادر
سوکھے پیڑ کی چھاؤں بن کر
سونی رہ میں پھیل گئی ہے

پند شاید دستِ قضا ہے
شاخ ہے خنجر
پھول جنازہ
خوشبو ایک مسافر — جس نے
نگری نگری گیت سنائے

پانی کی اک پتلی دھار ہے چشمہ
پھر اک ندی
چشمہ چشمہ ندی ندی
پھیلتا بڑھتا چڑھتا دریا

وہ تقدیر تھی
یا زنجیر تھی
جس کو میرے ذہن کی آنچ نے
موم کی صورت ڈھال دیا ہے

احمد ظفر

ایک سفر

میں تھا اس لمحے کا پجاری
جس نے مجھ کو رنگ دیے تھے

کھیت میں بیٹھے بیٹھے لڑکی
گہری سوچ میں ڈوب گئی تھی
ساس نے اس کو کوکھ جلی کا طعنہ دے کر
زہر میں ڈوبا درد دیا تھا

میں اک بس میں اونگھتے اونگھتے
منظر منظر دیکھ رہا تھا
گائے تھان پہ رہٹ پہ لڑکا
کیاری کیاری پانی سے سیراب تھی
گندم اور گنے کی فصلیں
سرد ہوا میں ہولے ہولے جھوم رہی تھیں

گاؤں گاؤں گھومتے گھومتے
میں پھر شہر میں آ ہی گیا ہوں
دھواں دھواں ہے شہر کے اونچے مل کی چمنی
جیسے گاؤں کی وہ لڑکی
کوکھ جلی کہنے پر اب تک
زہر فضا میں گھول رہی ہے
لمحے کا بت ٹوٹ گیا ہے

جمیل ملک

معراج

کب تک لفظوں کے پیمانوں میں سینے کا زہر گھلے گا!
کب تک تشبیہوں کا جادو پاگل دل کو بہلائے گا!
رمزوں اور کنایوں سے تو درد کا درماں ہو نہ سکے گا!

فن کو اپنا خون پلاتے صدیاں گزریں
شبنم روئی تو ہم روئے
چاند گہن میں آیا، ساری رات نہ سوئے
زخم کو پھول ہی کہتے گزری، پھر بھی دل کے گھاؤ وہی ہیں

میں لفظوں کا زندانی ہوں
کنج قفس میں بیٹھا کب سے سوچ رہا ہوں
لفظوں کی زنجیریں توڑ دوں
زنداں کی دیوار سے باہر جست لگاؤں
اُس دکھیاری ماں کی دھڑکن میں کھو جاؤں
جس کے بیٹوں کا خوں اس فن کی سُرخی ہے
جس کے آگے لفظ و بیاں کی، صوت و صدا کی سب زنجیریں ٹوٹ گئی ہیں
جس کے رنگ میں سب فنکاروں کی تحریریں ڈوب گئی ہیں

جمیل ملک

زود پشیماں

اب آئے ہو !
جب جسم مرا سب چھلنی ہے
اور آنکھیں بھی پتھرائی ہیں
اب آئے ہو !
جب خون کی برکھا ہے ہر سُو
جانسوز گھٹائیں چھائی ہیں !!

وہ وقت تمھیں کیا یاد نہیں !
جب میں نے کہا تھا —
"مت جاؤ — !
ذرّوں کا سینہ چیر کے تم
مجھ پہ ہی قیامت لاؤ گے
یہ چاند اگر ہاتھ آ بھی گیا
آپس میں ٹکرا جاؤ گے"

اب روتے ہو !
جب اُوپر نیچے، دائیں بائیں
چاروں اور الاؤ ہیں !
اب روتے ہو !
جب میرے مٹیالے دل میں
خوشبو کے بدلے گھاؤ ہیں

اب آئے ہو — !
کیا لائے ہو — !!

ساقی فاروقی

ساحل کی شام

یہ ساحل پہ بکھری ہوئی پیاس
ترسی ہوئی ریت
سیپی کی لاش
اور آبی پرندوں کے ٹوٹے ہوئے نرم پر
یہ تھکن دائمی —
اور اخبار میں
ایک اُڑتی خبر — خودکشی
ایک تصویر — جلتا ہوا آدمی
کوئی گمنام موت ایشیا میں کہیں
اور لہروں کی نوحہ گری

منظور عارف

آئینے کے داغ

(دُنیائے عرب کے حالیہ بحران سے متاثر ہو کر)

منجمد یوں تو کبھی نہر نہ تھی
خشک ایسا کبھی دریا تو نہ تھا
اس قدر ٹھہری ہُوئی، سہمی ہُوئی کب تھی خلیج
تپتے سورج کی تمازت کے طفیل
اتنا ٹھنڈا کبھی صحرا تو نہ تھا

میں نے دیکھا نہیں، محسوس کیا ہے منظر
پھر بھی اک درد کی شدت ہے مرے سینے میں
شکل کیا دیکھوں، کئی داغ ہیں آئینے میں

جانے کب سازشِ شب ہو ناکام
جانے کب ٹوٹے یہ پھیلایا ہُوا کہر کا دام
جانے کب برف سے ماحول کی سِل
آپ ہی اپنی حرارت سے پگھلنے کے بہانے ڈھونڈے
دھند اور کہر چھٹے
آئینہ صاف ہو، شفّاف ہو کاش
کاش یہ درد کی شدّت نہ رہے سینے میں
اپنی صورت نظر آئے مجھے آئینے میں

خلیل الرحمٰن اعظمی

میں گوتم نہیں ہوں

میں گوتم نہیں ہوں
مگر میں بھی جب گھر سے نکلا تھا
یہ سوچتا تھا
کہ میں اپنے ہی آپ کو ڈھونڈنے جا رہا ہوں
کسی پیڑ کی چھاؤں میں
میں بھی بیٹھوں گا
اک دن مجھے بھی کوئی گیان ہوگا
مگر جسم کی آگ
جو گھر سے لے کر چلا تھا
سلگتی رہی
گھر کے باہر ہوا تیز تھی
اور بھی یہ بھڑکتی رہی
ایک اک پیڑ جل کر ہوا راکھ
میں ایسے صحرا میں اب پھر رہا ہوں
جہاں میں ہی میں ہوں
جہاں میرا سایہ ہے
سائے کا سایہ ہے
اور دور تک
بس خلا ہی خلا ہے

ایزرا پاؤنڈ
ترجمہ: اسد محمد خاں

کرن پھول

"شکریہ!
"اب جو ہونا ہے ہوتا رہے"۔ ۔ ۔ ۔ ۔
اس نے اتنا کہا
تیز قدموں سے چلتی ہوئی
اک طرف مڑ گئی
جیسے پھولوں سے نرمل کرن روٹھ جائے
جب اُنھیں رُخ بدلتی ہوا
روشنی کی ڈگر سے ہٹائے
(جب دل ٹوٹ جائے)

اب جو ہونا ہے ہوتا رہے ۔ ۔ ۔ ۔
آج کی ایک ساعت کرن پھول تھی
پے بہ پے روشنی میں نکھرتی ہوئی
آج کی ایک ساعت گذرتی ہوئی
کیسے کیسے خدا فخر سے دیکھتے
اور یہ کہتے کہ اُس کے سوا دیدنی
کوئی منظر نہیں
اس کرن پھول کا کوئی ہمسر نہیں۔

زہرا نگاہ

درسِ فراموشی

مجھے بھول جاؤ
تمنا کے موتی، طلب کے یہ لعل و گہر
یہ چاہت کی چاندی، امنگوں کا زر
یہ نگاہوں کی قوسِ قزح، آنسوؤں کے بھنور
یہ خیالوں سے رنگیں محل، آرزو سے سجے بام و در
عمر بھر ساتھ دینے کی یہ روشنی
عمر بھر ساتھ چلنے کی یہ رہگزر
کسی پر بھروسے کا اک خوبصورت دیا
کسی عرضِ مطلب کی اک بیش قیمت نظر
بھلا دو انھیں اس طرح سے بھلا دو
انھیں وہم کی گرد میں یوں چھپا دو
انھیں وقت کی خاک میں یوں ملا دو
کہ احساس کے سارے ذرّے
اور یادوں کے یہ سنگریزے
نہ اب زندگی کا سہارا بنیں
نہ اب آسماں کا ستارا بنیں —

اور وہ دل جو اس درس سے نا آشنا بھی ہُوا، بہرہ ور بھی ہوا
آج اپنے مقدر پہ خود مطمئن زندگی کی روش پر رواں ہے
اور وہ دل کہ جس نے اسے ایسا درسِ حقیقت دیا تھا
آج بھی ان فراموشیوں کے سبق کو
اپنی آنکھوں میں، دل میں بسائے ہوئے سوچتا ہے —
یہ امانت ہے اس ہم سفر کی
یہ امانت ہے اس بہرہ ور کی
یہ امانت وہ ہے جس کا اظہار کیا؟
صرف مبہم سا اقرار ہی، اک طرح کی خیانت نہیں ہے تو کیا ہے؟

زہرا نگاہ

دلاسہ

دوستی کا اک سمندر
ان گنت ساحل وفا کے
اپنے سینے میں چھپائے
جانے کب سے بہہ رہا تھا
دفعتاً اک موج اُبھری
موتیوں کی شکل میں ڈھلتے ہوئے الفاظ، جملے
خود بخود دل سے اُٹھے
لب تک گئے
دل کا ہر اک بوجھ لفظوں نے اٹھایا
فکر کا ہر لمحہ اک جملے سے ٹکرایا
بکھر کر کھو گیا ـــــ
غم کا ریزہ ریزہ کچھ باتوں کی رَو میں بہہ گیا

زہرا نگاہ

گھر کی رونق

دو روشنی کے چشمے
اس گھر میں بہہ رہے ہیں
دو پھول مسکرا کے
خوشبو لٹا رہے ہیں
دو گیت گنگنا کے
اک رس سا گھولتے ہیں
دو تارے جگمگا کے
رستہ دکھا رہے ہیں
دنیا کی دلکشی کا
اعلان کر رہے ہیں
محنت کی دھوپ میں یہ
پروان چڑھ رہے ہیں

انور معظم

وقفہ

آج نہ سوچو
دیواریں کتنی اونچی ہیں
زنجیریں کتنی بھاری ہیں
قید کی اس میعاد کے کتنے لمحے بیتے
کتنے لمحے باقی ہیں

آج اپنی آواز کی گونج میں
اپنی ذات کا عکس نہ ڈھونڈو
آج ان دیواروں، زنجیروں، لمحوں، آوازوں کو بھولو
دیکھو
دل کے آنگن میں اک پھول کھلا ہے!

انور معظم

تیسرا شخص

بھنور نے
گرجتے ہوئے قہقہوں میں
یہ مجبور تنکے سے پوچھا ـــــ
"بتا،
کس طرح آج
میرے شکنجے سے آزاد ہوگا؟
تجھے کون موجوں کی اس قبر میں
دھیرے دھیرے اُترنے سے محفوظ رکھے گا؟"

مجبور تنکے نے گردش کی بڑھتی ہوئی بے بسی میں یہ مانا
"یہ سچ ہے کہ رفتار کا تو ہی خالق ہے
میں صیدِ رفتار ہوں"

اور
دریا
وہ اک تیسرا شخص
خاموش
یہ گفتگو سن رہا تھا!

زہرا نگاہ

گونج

مجھے آج بھی یہ یقیں ہے
کہ لاکھوں میں اچھی طرح جان پہچان کر ہی
اُسے میں نے آواز دی تھی
زباں سے، نگاہوں سے، دل سے
بہت دور تھا وہ
مگر اُس نے آواز کی ڈوبتی نبض پر ہاتھ رکھا
دھڑکنوں کو گنا
درد کو پیار سے اپنے دل میں سمویا
وہ آیا
وہ آیا مرے دل کی آواز کی گونج بن کر
مگر اس نے دیکھا
کہ وہ جس نے آواز دی تھی، کوئی اور تھا
میں نہ تھا!

پناہ

صحرا کی یہ تپتی وسعت
سورج ٹوٹ کے
ہر ذرّے میں بکھر گیا ہے

جلتی کرنیں
چلتی تلواروں کی مانند
چمک رہی ہیں

شعلوں کی یورش میں جانے
دل خاکستر ہو
یا
دامن

آؤ
ہم سب سایہ بن کر
اپنے پر چھا جائیں

فہمیدہ ریاض

لاؤ، ہاتھ اپنا لاؤ ذرا

لاؤ، ہاتھ اپنا لاؤ ذرا
چھو کے میرا بدن
اپنے بچے کے دل کا دھڑکنا سُنو
ناف کے اس طرف
اس کی جنبش کو محسوس کرتے ہو تم؟
بس --- یہیں چھوڑ دو
تھوڑی دیر اور اس ہاتھ کو میرے ٹھنڈے بدن پر یہیں چھوڑ دو
میرے بے کل نفس کو قرار آ گیا!
میرے عیسیٰ! مرے درد کے چارہ گر!
میرا ہر موئے تن
اس ہتھیلی سے تسکین پانے لگا
اس ہتھیلی کے نیچے مرا لال کروٹ سی لینے لگا
انگلیوں سے بدن اس کا پہچان لو
تم اسے جان لو
چومنے دو مجھے اپنی یہ انگلیاں
ان کی ہر پور کو چومنے دو مجھے
ناخنوں کو لبوں سے لگا لوں ذرا
اس ہتھیلی میں منہ تو چھپا لوں ذرا
پھول لاتی ہوئی یہ ہری انگلیاں ---!
میری آنکھوں سے آنسو اُبلتے ہوئے
ان سے سینچوں گی میں
پھول لاتی ہوئی انگلیوں کی جڑیں --- چومنے دو مجھے
اپنے بال، اپنے ماتھے کا چاند، اپنے لب
یہ چمکتی ہوئی کالی آنکھیں

یہ کچھ مسکراتی، یہ حیران آنکھیں
مرے کانپتے ہونٹ، میری چھلکتی ہوئی آنکھ کو دیکھ کر کتنی حیران ہیں!

تم کو معلوم کیا — تم کو معلوم کیا
تم نے، جانے، مجھے کیا سے کیا کر دیا
میرے اندر اندھیرے کا آسیب تھا
یاکراں تاکراں ایک انمٹ خلا
یوں ہی پھرتی تھی میں
زیست کے ذائقے کو ترستی ہوئی
دل میں آنسو بھرے، سب پہ ہنستی ہوئی
تم نے اندر مرا اس طرح بھر دیا
پھوٹتی ہے مرے جسم سے روشنی

سب مقدس کتابیں جو نازل ہوئیں
سب پیمبر جو اب تک اُتارے گئے
سب فرشتے کہ ہیں بادلوں سے پرے
رنگ سنگیت، سُر، پھول، کلیاں، شجر،
صبحدم پیڑ کی جھولتی ڈالیاں
ان کے مفہوم جو بھی بتائے گئے
خاک پر بسنے والے بشر کو مسرت کے جتنے بھی نغمے سنائے گئے
سب رشی، سب مُنی، انبیا، اولیا
خیر کے دیوتا، حسن، نیکی، خدا —
آج سب پر مجھے
اعتبار آگیا — اعتبار آگیا

ریاض مجید

آج پھر چاند کی گیارہویں ہے

آج کی رات پھر جانے کے مرتبہ دل کسی جا چکی چاند کی گیارہویں رات کا قصّہ دہرائے گا
ان پُراسرار یادوں میں کھو جائے گا
جو ابھی تک مرے واسطے اک معمّے کی مانند ہیں

رات بھر گزرے لمحات یاد آئیں گے
بانجھ ہمدردیوں کی خلش دل کو تڑپائے گی
بے ثمر آرزوؤں کے دکھ تازہ ہو جائیں گے

صبح تک ہو گیا واقعہ میرے سینے میں اپنی اذیت کا خنجر چبھو جائے گا
وہ جو میری پہنچ سے بہت دور ہے
اس سے ربط اور بھی گہرا ہو جائے گا

ریاض مجید

اُسے علم ہے میں کبھی اُس کا رستہ نہ روکوں گا

خود مروں یا کسی اور کو مار دوں
کچھ مری تلخیوں کے منافی نہیں ہے
سبھی جانتے ہیں
کہ جس طرح مجھ کو ستایا گیا، اُس کے پیشِ نظر —
میں ہر اک بات کے کہنے اور کرنے میں حق بجانب ہوں

لیکن اُسے علم ہے —
میں ہمدردیوں کی طلب میں کبھی خود پہ جھیلی ہوئی سختیوں کی کہانی نہ دہراؤں گا
اُس کا دامن پکڑ کر کبھی یہ نہ جتلاؤں گا —
کہ تیرے سبب مجھ کو کس طرح کانٹوں پہ چلنا پڑا ہے —
مجھے بے گناہی کے کس کس جہنم میں جلنا پڑا ہے — !

ریاض مجید

دُکھ کی بات

نارسائی کے جزیروں میں دہکتے خون سے سرشار جسموں کی تمازت
اِن ہواؤں پر جھپٹتے ہاتھ کی قسمت کہاں ہے!
ان نگاہوں کی پہنچ سے بھی پرے کھلتے گلابوں کی مہک کو کون سونگھے؟
کون جانے، کان کس کس کی صدا کے معجزے سے بے خبر ہیں؟
ایک سوچوں کا ذریعہ ہی تو ہے
وہ بھی کتنا نامکمل — اور مبہم —
اَن چکھے لمحات کے بنتے بگڑتے ذائقے سے حلق کڑوا ہو رہا ہے
(جن کو دیکھا ہی نہیں ہے ان کی بابت سوچنا بھی کتنے دکھ کی بات ہے)
زندگی ہے روز و شب کا بحرِ بے پایاں — مگر —
اپنی ذات —
ہائے بس اک لمحۂ پرّاں کی موج
ہم نے ماضی بھی نہ دیکھا اور فردا سے بھی بے بہرہ رہیں گے
حال کی بھی وسعتوں میں کون جھانکے؟
پا مِسَل مجبوری کی مٹی نے پکڑ رکھے ہیں اور —
اور تا حدِ نظر بیچارگی کی دھند ہے
کتنا کچھ ہے جن سے کتنی دور ہیں؟
کیا خبر وہ کتنی پیاری صورتیں ہوں گی کہ ہم جن کے لیے ساری حسیں
رکھتے ہوئے بے حس رہے؟
(جن کو دیکھا ہی نہیں ہے ان کی بابت سوچنا بھی کتنے دکھ کی بات ہے)

آتے لمحوں کا دُکھ

جُرم تیرا نہ میرا
مگر ایسے لگتا ہے دونوں ہی مجرم ہیں —
بات کچھ بھی نہیں ہے —
مگر اپنی اپنی جگہ دونوں نادم ہیں —

کہیں شہر میں چلتے پھرتے اگر سامنا ہو گیا تو . . . .
ندامت کی دیوار کس سے گرے گی —
میں تجھے دیکھ کر اپنی آنکھیں جھکا کر گزر جاؤں گا
تجھے اور آزردہ کر جاؤں گا —
تو مجھے دیکھ کر اپنا دامن بچا کر گزر جائے گی —
مجھے اور افسردہ کر جائے گی —

ادیب سہیل

شخصیت کا انتشار

گاہ کر کے آرزوئے خود فروزی کو رفیق
گاہ اپنے رم کی رعنائی میں گم
گاہ رہوارِ انا پر بے لگام
مختلف سمتوں میں جب برسوں رہا محوِ سفر — تو میرا "میں"
منتشر لمحوں میں پل پل ڈھل گیا
ذات کی دلکش کڑی تقسیم ہو کر رہ گئی

اب کہ جب اُبھری ہے میری ذات میں تقسیم کی پیچیدگی
اب کہ جب بارِ گراں ہے ذہن پر یہ انتشار
سعیٔ آخر کی مثال
جاگ اٹھی ہے دل میں اس چاہت کی لَو
پھر سے میرے ساز کے سب تار ہم آہنگ ہوں
مختلف سمتوں میں بکھرائے ہوئے
شخصیت کے گوہرِ زریں کو پھر یکجا کروں
ایک مرکز پر سمیٹوں ذات کو
اپنی رو میں آ گیا ہوں لیکن اُس منزل پہ میں
اب سمٹنا بھی اگر چاہوں، سمٹ سکتا نہیں — !

پروین فنا سیّد

مٹی کا رشتہ

دل میں بھڑکتی آگ کی حدت سے گھبرا کر
دو "دیوانے"
تج کر شہروں کی آسائش
چھوڑ کے چھاؤں غنچہ و گل کی
اک انجانی منزل کی جانب اک ساتھ چلے تھے
سر پر تپتی دھوپ کے انگاروں کی سلگتی چادر
پاؤں میں کانٹے
قدم قدم پر ایک عجیب سا دھڑکا
اک بے نام سا خوف ان "فرزانوں" کا
جو شب کی تاریکی میں آباد کریں میخانے
صبح سویرے وضو کریں اور شب کے دھبے دھوئیں
اندر اندر قہقہے ماریں، اوپر اوپر روئیں
سجدوں سے دنیا کو بتائیں
ہم کتنے عاجز بندے ہیں!
کتنے عظیم اور کتنے مسکیں!
کتنے خوش اور کتنے غمگیں!

ان دوہری شخصیت والے انسانوں کی نظروں سے چھپ کر
یہ دو دیوانے
لو کے گرم تھپیڑوں میں
جلتی مٹی پر بیٹھے
سوچ رہے ہیں
ان کی سوچ، اشکوں کی سوچ
اور ان کی چیخیں، خاموشی کی چیخیں

پھر جب اک لمحے کے روپ میں ایک صدی گزری
تو اک دیوانہ بولا — ہاتھ میں جلتی تپتی دھڑکتی مٹی لے کر —
مجھ کو اس مٹی کی قسم ہے
یہ مٹی جو مجھ سے ہے اور جس سے میں ہوں —
میں صدیوں سے تیرا تھا
اور میں قرنوں تک تیرا ہوں — تیرا ہی رہوں گا
تو جو دھرتی کی بیٹی ہے
تو جو مجھ سے ہے
اور جس سے میں ہوں

پروین سیّد فنا

شکوہ

باغباں!
تم نے سوچا تو ہوتا
کہ یہ گل جسے تم بڑی شان سے، شاخ سے توڑنا چاہتے تھے
خود اپنی ہی ہستی کے نشے میں گُم
اپنے ہونے کے احساس سے شادماں ہے
یہ گل جانتا ہے کہ ہر گلستاں کا مقدر خزاں ہے
مگر یہ تمھارے لپکتے ہُوئے ہاتھ میں
ٹوٹ گرتا تو کیا
اپنا سر ایک پل کے لیے بھی نہ خم کر سکے گا
کہ یہ گل بڑا خود نگر ہے

چلو تم کو گُل چینیوں کے جنوں میں
کم از کم یہ عرفاں تو حاصل ہُوا ہے
کہ اس گلستاں میں
کوئی گل تو ایسا بھی تھا
جو تمھارے لپکتے ہُوئے ہاتھ سے دُور
پندارِ غیرت سے مخمور
اب تک سرِ شاخ گردن اُٹھائے مہکتا ہے
یونہی مہکتا رہے گا

عرفانہ عزیز

پندارِ شکستہ

دلِ مشتاق طلبگارِ زر و سیم نہیں — تشنۂ دید کو محبوب نہیں رنگِ محل
خوب تر ارضِ سمرقند و بخارا سے مجھے — تیرے دیوانِ گہربار کی بس ایک غزل

کاسۂ شوق لیے در پہ ترے آئی ہوں — عظمتِ فکر کے پھر بخش مجھے لعل و گہر
مسندِ عدل کا حقدار زمانے میں ہے تُو — منصفی چاہتا ہے تجھ سے مرا زخمِ جگر

تو کہ ہے دہر میں سرخیلِ مسیحا نفساں — چند لمحوں کے لیے بخش مرے دل کو سکوں
لبِ معصوم کی جنبش سے اگر تو چاہے — ٹوٹ سکتا ہے مرے کربِ دروں کا افسوں

مری مجبور نگاہوں کو پرکھنے والے — گوشۂ چشم میں آنسو ہیں، مئے ناب نہیں
اپنے آسودہ تخیّل کی مجھے بخش ضیا — میری تخئیل کا عنوان ابھی زرتاب نہیں

سنگ و آتش کے سلگتے ہوئے بازاروں میں — جل بجھا جنسِ گراں مایۂ دوراں کا شعور
نقدِ دل، گوہرِ جاں، تیری محبت پہ نثار — تیری چوکھٹ پہ نگوں سار ہے پھر میرا غرور

میرے پندارِ شکستہ پہ نہ جا، میرے حبیب
کون ہے دہر میں جو کشتۂ تقدیر نہیں
میرے باطن میں جو انساں ہے، پہچان اُسے
میرے چہرے پہ مرے ذہن کی تصویر نہیں

عرفانہ عزیز

تصویر

کس مصوّر کا ہے شہکار سراپا تیرا
تو ہے اخلاص و محبّت کی مجسّم تصویر
متبسّم ہے ترے لب پہ بہاروں کا غرور
ضوفشاں تیری نگاہوں میں سحر کی تقدیر
نیم خوابیدہ شگوفوں کو جگا دیتی ہے
تیرے مہکے ہوئے لہجے کی شگفتہ تاثیر

مجھ کو مل جائے گا گم گشتہ بہاروں کا سراغ
اپنی آنکھوں کا حسیں راز بتا دے مجھ کو
میں ہوں کہساروں میں کھوئی ہوئی مغموم صدا
وادیٔ گل کا کوئی گیت سنا دے مجھ کو
میری خوابیدہ محبت کا سویرا بن کر
اپنے شاداب اُجالوں سے جگا دے مجھ کو

بے سُود

نہ کسی جذبۂ عیاں کا نشاں
نہ کسی حسرتِ نہاں کی نمود
زندگی مجھ سے اس قدر خائف!
کس قدر بے ضرر ہے میرا وجود

بے نیازِ طوافِ کوئے حبیب
کوئی راوی نہ رازداں نہ رقیب
ایک دلدادۂ صداقت ہوں
مجھ کو ہے آرزوئے دار و صلیب

کتنے بے کیف ہیں یہ شام و سحر
صبحِ فردا ہے منتہائے نظر
دل کا گاہک ہُوا ہے سوزِ سخن
جاں کے درپے ہُوا ہے زخمِ ہُنر

نوشاد نوری

رنگِ شب

زلفِ شبگوں، عارضِ گلفام، چشمِ نیل رنگ
اپنے سرمائے سے ہے یوں تیرا ربطِ باہمی
جس طرح کہسار میں اُتری ہو تنہا بادِ صبح
دشت میں جیسے اکیلی پھر رہی ہو چاندنی

اور بجھ سکتی تو بجھ جاتی سرابِ دشت سے
خود بخود صحرائے گرد آشام کی تشنہ لبی
اور ڈھل سکتی تو ڈھل جاتی شبِ نوروز میں
اپنے لب پر اپنے ہیجانِ طلب کی چاشنی

ہر تصوّر کو سراغِ دلربا کہتے نہ لوگ
ہر زمانے کو سبیلِ ارتقا کہتے نہ لوگ
اپنی حد کو حرفِ آغازِ خدا کہتے نہ لوگ

زلفِ شبگوں، عارضِ گلفام، چشمِ نیل رنگ
تیرے سرمائے سے ہے کیا کیا نہ ربطِ باطنی
خود بخود شاخوں سے مٹی پر اتر پڑتی ہے چھاؤں
خود بخود گُل میں سما جاتی ہے کرنوں کی اَنی

اور رُک سکتا تو رُک جاتا رگِ لمحات میں
رنگ کا طوفاں، نمو کا رقص، جینے کی امنگ
اور جم سکتا تو جم جاتا زمین و چرخ پر
عرصۂ شب میں شبِ تاریک کا تاریک رنگ

ہر تصوّر کو تلاشِ دلربا کہتے نہ لوگ
ہر کشاکش کو نزاعِ ارتقا کہتے نہ لوگ
ہر سحر کو قربتِ سرِّ خدا کہتے نہ لوگ

رحمان فراز

المنیا[۱] کے قزینو میں

گرم بے کیف گہری شاموں میں
ساحلِ نیل پر اُترتے ہیں
لانبے پیڑوں کے ملگجے سائے
اور دن کی تمازتوں میں نہائے
جاگ اُٹھتے ہیں اونگھتے رستے
سرد جاموں کی کھنکھناہٹ میں
اُجلے چہروں کی جگمگاہٹ میں

مختلف لوگ، مختلف موضوع
ایک ہی بات کے کئی پہلو
اُف وہ لمبی کٹار سی پلکیں
ہائے اس کے کمان سے ابرو
اور ادھر دور ــــ ادھر وہ میز کے پاس
بنتِ یونان ــ مصر کا جادو
ہائے وہ صبح سا سہانا روپ
ہائے اُس کی طلائی زلف کی دھوپ

ساحلِ نیل پر قزینو میں
بات چلتی ہے وقت کٹتا ہے
اور کلو باترا[۲] کے سگریٹ کے
دُور اُڑتے دھوئیں کے مرغولے
رات کی تیرگی میں ڈوبتے ہیں
اُجلے میزوں کے گرد اجنبی لوگ
جن کے سینے ہیں اک جوالا مکھی
کون جانے یہ دل ہیں کتنے دُکھی
ان گنت لوگ، جن کے دل کی آگ
آنچ دے تو جہاں جھلس جائے
اس قزینو کو موت ڈس جائے
اپنا ایندھن بنے ہوئے ہیں آپ

مست انساں مگن ترنگوں میں
دل کی اس آگ کو بجھاتے ہیں
اس قزینو کے سرد جاموں سے
یا کلو باترا کے مرغولے
اور دو گھونٹ کوکا کولا کے

۱؎ بالائی مصر میں نیل کے کنارے آباد ایک پُر فضا شہر جو اپنے قزینو کے لیے مشہور ہے
۲؎ مشہور مصری سگریٹ

مغیث الدین فریدی

تضمین

(بر غزل فیض احمد فیضؔ)

زنداں میں بھی نہ بدلا اندازِ مے گساراں
بے بادہ کیف و مستی، بے فصل ابر و باراں
مجبورِ غم نہیں ہے عیشِ جگر فگاراں
یادِ غزال چشماں، ذکرِ سمن عذاراں
جب چاہا کر لیا ہے کنجِ قفس بہاراں

آغازِ شب سے دل میں ہے سوزِ صبحگاہی
نورِ دل و نظر ہے یہ ہجر کی سیاہی
مسجودِ کامرانی ہونے لگی تباہی
آنکھوں میں دردمندی، ہونٹوں پہ عذر خواہی
جانانہ وار آئی شامِ فراقِ یاراں

یہ نکہتوں کا طوفاں، پچھلے پہر کا عالم
یہ درد ہلکا ہلکا، یہ سوزِ عشق کم کم
یاد آ رہی ہے بن کر زخمِ جگر کا مرہم
شاید قریب پہنچی صبحِ وصال ہمدم
موجِ صبا لیے ہے خوشبوئے خوش کناراں

ہوتی ہے رفتہ رفتہ راہِ جنوں منور
جھومے گی روحِ مستی، مہکے گا قلبِ مضطر
بوئے وفا سے ہو گا اک اک نفس معطر
آئے گی فیضؔ اک دن بادِ بہار لے کر
تسلیمِ مے فروشاں پیغامِ مے گساراں

مغیث الدین فریدی

تضمین

(بر غزل ڈاکٹر خورشید الاسلام)

تمنا تھی کہ خوابیدہ دلوں کی انجمن جاگے ہوا بدلے، کرن پھوٹے، زمیں ناچے، گگن جاگے
یہ ممکن ہی نہ تھا یزداں تو سوئے اہرمن جاگے "یہ مانا نت نئے فتنے، نئے رنج و محن جاگے
مگر یہ بھی تو دیکھو چار سُو کیا کیا چمن جاگے"

زمانہ یونہی دکھ دیتا رہے گا بھول بھی جاؤ مزاجِ دہر سے برہم نہ ہو، جانے بھی دو، آؤ
علاجِ درد تو تم ہو وہ جامِ غم رُبا لاؤ "بجھے بیٹھے رہیں کب تک بس اب شیشے کو چھلکاؤ
لہو چھلکے، نفس مہکے، خرد ناچے، بدن جاگے"

کہاں سویا ہُوا ہے جذبۂ شورِ جنوں افزا نہ اب وہ اشک کے جلوے نہ اب وہ درد کا پردا
وہ سناٹے کا عالم ہے کہ دیکھا ہی نہیں جاتا "خمارِ بے دلی حد سے فزوں ہے اور دل تنہا
کوئی ایسی غزل چھیڑو کہ ہر داغِ کہن جاگے"

وہ دن آئے کہ دنیائے طرب کا ہر طبق دیکھیں جنوں کی لہر کو پرکھیں، تمنّا کی رمق دیکھیں
کہاں سے مسکراتی ہے جوانی کی شفق دیکھیں "کتابِ جسم نرمی سے ورق اندر ورق دیکھیں
حجابِ شوق گرمی سے شکن اندر شکن جاگے"

سمجھ میں آج رازِ کیف و مفہومِ طرب آئے خمِ آغوش میں تو آئے، دل میں تاب و تب آئے
کبھی مجھ کو بھی لطفِ خلوتِ خاصانِ رب آئے "کوئی ایسی بھی ساعت ہو کوئی ایسی بھی شب آئے
کہ میری حسرتیں سو جائیں تیرا بانکپن جاگے"

امجد اسلام امجد

منزلِ منزل

ہمارے جسموں کے سرد خانے ازل کے شعلے میں جل رہے ہیں
ہم اپنے پاؤں ہوا کی بے رنگ سیڑھیوں پہ
کچھ اس طرح سے سنبھل سنبھل کے جما رہے ہیں
کہ جیسے پھسلے تو اس بلندی سے ایسی پستی میں جا گریں گے
جہاں اندھیرے سیاہ غاروں میں کوئی رستہ نہ مل سکے گا
جہاں تمنا کے خشک ہونٹوں پہ کوئی غنچہ نہ کھل سکے گا
ہوا کے زینوں کو ہم نے اپنا رفیقِ منزل بنا لیا ہے
فنا کے رستے کو پا لیا ہے
ہم آرزوؤں کی تیز حدت میں ہولے ہولے پگھل رہے ہیں
ہمارے چاروں طرف سمندر ہے اور پانی کے تند ریلے
ہمارے جسموں کے آبگینے اٹھا اٹھا کے پٹک رہے ہیں
ہماری کشتی ازل کے دریا کی ریتلی تہہ میں کھو چکی ہے
ہمارے چاروں طرف ہماری ہی خواہشوں کے بھنور پڑے ہیں
ہماری ٹانگیں عجیب رنگوں کے پتھروں سے الجھ الجھ کر
سیاہ مٹی میں دھنس رہی ہیں اور "آکٹوپس" کی زرد سونڈوں میں بندھ چکے ہیں ہمارے بازو
کئی جزیرے ہماری آنکھوں کے راکھ دانوں میں جل رہے ہیں
کسی نے سنس کو بلا لیا تو ہر ایک دھڑکن چمک اٹھے گی
کسی نے دامن بچا لیا تو اک آگ دل میں دہک اٹھے گی
ہماری خوشیوں کی عمر کیا ہے؟ ہمارے دکھ کی بساط کیا ہے؟
ہم اپنے ہاتھوں میں شمع لے کر ہوا کے رستے پہ چل رہے ہیں
ہماری آنکھوں کے سب ستارے سیاہ راتوں کی تیرگی میں
جوان سینوں، گداز جسموں کے پیچ و خم میں بکھر گئے ہیں
ہمارے سانسوں میں بسنے والی تمام خوشبوئیں مر چکی ہیں

ہم اپنے ہاتھوں کو روز اپنے ہی خشک بالوں میں پھیرتے ہیں
ہمارے ہونٹوں کے سارے نغمے صدا کے نوحوں میں ڈھل رہے ہیں
ہمارے سر سے چمکتے بالوں کے کالے بادل سمٹ رہے ہیں
ہمارے چہروں کی سُرخ رنگت میں زردیوں کے عجیب سائے
بڑے تسلسل سے بڑھ رہے ہیں
ہماری پینٹوں کی پیٹیوں کے پرانے سائز بدل رہے ہیں
ہم اپنے ماضی کے پھولدانوں سے آرزوؤں کے برگ ریزے
کچھ اس توجہ سے چُن رہے ہیں کہ جیسے ان کو ملا کے رکھنے سے کوئی غنچہ چٹک اُٹھے گا
ہم اپنے بچھڑے ہُوئے عزیزوں کی، دوستوں کی حسین تصویریں البموں میں کچھ اس طرح سے سجا رہے ہیں
کہ جیسے ان میں سے کوئی پیکر اچانک اک دن دھڑک اُٹھے گا
ہماری سوچوں کی وادیوں میں عجیب چشمے اُبل رہے ہیں
ہمارے چاروں طرف ہزاروں حسین چیزیں پڑی ہوئی ہیں
کہیں دریچے کھلے ہُوئے ہیں، کہیں صلیبیں گڑی ہوئی ہیں
مگر ہماری نظر کے آگے سیاہ پردے لٹک رہے ہیں
ہم اپنے رستے سے بے خبر ہیں، اکیلے پن میں بھٹک رہے ہیں
ہم آنے والے ہر ایک لمحے کی رہگزر میں کھڑے ہیں لیکن
ہماری ٹانگوں میں ایک لمحے کے ساتھ چلنے کا دم نہیں ہے
نئے جزیروں کی آرزو ہے، کنارِ دریا مچل رہے ہیں
کھلے دریچوں میں، چلمنوں میں، حسین باغوں میں ہوٹلوں میں
ہزاروں چہرے ہماری آنکھوں کی خلوتوں کو سنوارتے ہیں
کسی کے عارض، کسی کے گیسو ہمارے خوابوں کی وادیوں کو بہار بن کے نکھارتے ہیں
طویل راتوں، خنک سویروں کی منزلوں سے پکارتے ہیں
مگر ہمارے قریب آکر ہر ایک چہرے کی خوش نمائی بدن کے لفظوں میں بولتی ہے
ہمارے خوابوں کو رولتی ہے
ہم اپنی آنکھوں پہ ہاتھ رکھے فنا کے رستے پہ چل رہے ہیں
ہمارے جسموں کے سرد خانے ازل کے شعلے میں جل رہے ہیں

مخمور سعیدی

مثال پرست

وہ اکیلا ہی کسی دُھن میں چلا جاتا تھا
راستے میں کوئی مل جائے تو گھبراتا تھا
جب وہ ہوتا تھا تھکن سے کہیں رکنے کے قریب
جانے کیا دُور سے اس کو نظر آ جاتا تھا
کون ایسا تھا، بہ ظاہر تو نہیں تھا کوئی
ظلمتِ شب میں اُسے راہ جو دکھلاتا تھا
منزلیں گردِ سفر بن کے رہی جاتی تھیں
آئینہ اُس کی طلب کا نہیں دھندلاتا تھا
راہ دینے کو دریچے کئی کھُل جاتے تھے
وہ اگر سر کسی دیوار سے ٹکراتا تھا
کبھی جا لیتا اُسے قافلۂ وقت تو وہ
اپنی درماندگیِ حال پہ شرماتا تھا
اُس کی رفتار بہت تیز ہوئی جاتی تھی
تھک کے گر جائے گا وہ صاف نظر آتا تھا

محمد علوی

دو نظمیں، تین شعر

ایک نظم

ہال میں گہرا اندھیرا تھا مگر
روشنی کے دائرے میں ناچتی
ننگی لڑکی کے لیے بے کار تھا

دوسری نظم

دھوپ
نگلتے سایوں کو
اب تھوڑی دیر میں
اُگلے گی

تین شعر

پڑا تھا میں اک پیڑ کی چھاؤں میں
لگی آنکھ تو آسمانوں میں تھا

برہنہ بھٹکتا تھا سڑکوں پہ میں
لباس ایک سے اک دکانوں میں تھا

مجھے مار کے وہ بھی روتا رہا
تو کیا وہ میرے مہربانوں میں تھا

قیصر ادیب

گھروندے

مجھے یہ دکھ ہے کہ تم امیدوں کے لہلہاتے چمن میں رہ کر
ابھی تلک صرف ساونوں اور حسین بہاروں سے مل سکی ہو
کہانیوں میں طلسمی محلوں، اڑن کھٹولوں کا ذکر سُن کر
تم اپنے خوابوں میں مجھ کو اب تک کہیں کا شہزادہ دیکھتی ہو

کبھی کبھی سوچتا ہوں میں بھی کہ کس کو اتنا شعور ہوگا
جو خود کو حالات اور حقیقت کے آئینے ہی میں دیکھتا ہو
کسے میسّر ہے کامرانی، کسے امنگوں نے کچھ دیا ہے
وہ کون ہے جو ضرورتاً خود فریبیوں پہ نہ جی رہا ہو

نہ جانے تم جیسی کتنی معصوم لڑکیوں نے اسی جہاں میں
حیات کو دلفریب خوابوں کے قمقموں سے سجا لیا ہے
پھر ایسے ماحول میں تمہاری بھی آرزوئیں غلط نہیں ہیں
تمہیں بھی انسانیت کے ناطے فریب کھانے کا حق ملا ہے

مگر ذرا اس طرح بھی سوچو کہ زیست کے بحرِ بیکراں میں
کسے ملے ہیں مسرّتوں کے ہرے بھرے نقرئی جزیرے
جو لوگ آندھی کی طرح لپکے تھے اپنی حدِّ نظر کو چھونے
وہ پھر کنارے پہ آ رہے ہیں شکستہ کشتی میں ڈھیرے ڈھیرے

ذرا تصوّر کے رنگ محلوں سے جھانک کر تم مجھے بھی دیکھو
میں زندگی سے شکست خوردہ بھلا کہاں تک اُبھر سکوں گا
یہ تم جو تاروں کی وادیوں میں حسیں گھروندے بنا رہی ہو
تمہارے معیار پر میں شاید کبھی نہ پورا اُتر سکوں گا

اکبر حمیدی

مجھ کو شاعر بنانے والے

مجھ کو شاعر بنانے والے
میرے غم کو زبان دے دے

میرے زخم اور میرے آنسو
ایک آواز ڈھونڈتے ہیں
ایک اظہار کا سلیقہ
ایک انداز ڈھونڈتے ہیں
دل میں بیتاب ہیں جو محشر
ان کو زورِ بیان دے دے
میرے غم کو زبان دے دے
مجھ کو شاعر بنانے والے

پُر ہے نغموں سے بربطِ دل
اس کو مضراب آشنا کر
سازِ احساس دینے والے
اس کو آواز بھی عطا کر
میرے دُکھ کی خموش لے کو
ایک دلدوز تان دے دے
میرے غم کو زبان دے دے
مجھ کو شاعر بنانے والے

نصیر اختر

فنا کے موڑ پر

ابھی ہم جئیں گے
ابھی تو (دلِ چاک کو تہنیت ہو)
زمانے کے نادیدہ ترکش میں
لاکھوں ہی محفوظ ناوک پڑے ہیں
ابھی کتنے غم ہیں، ابھی کتنے دکھ ہیں
لگائے ہوئے آس ہم سے وفا کی
ابھی تو ہزاروں ستم ہیں، ہزاروں ادائیں
ہمارے جواں گرم بوسوں کی حدت سے
جلنے کو مضطر
ابھی کتنے آنسو
ابھی کتنے شعلے
ہمارے لہو کو معطر کریں گے
ابھی تو تمنا کی کتنی ہی پُر ہول
دشوار راہیں
ہمارے لیے دیدہ و دل بچھائے ہوئے ہیں
ہم اس مہرباں زیست کو
کیسے مایوس کر دیں
جو ہم کو زمانے کی سب تلخیاں بخشنے پر رضامند ہے
درِ دل سے فردا کی دیوی کو لوٹا دیں کیسے
ہمارے لیے زہر سے پُر ساغر لیے جو کھڑی ہے
ابھی ہم جئیں گے
ابھی وقت کو اپنی مشقِ ستم کے لیے
کچھ لہو کی ضرورت پڑے گی

اعجاز گل

مرا عقیدہ

مرا عقیدہ جلیل تر ہے
مرے عقیدے کی روشنی سے
ہر ایک زنداں سنور گیا ہے
مرے عقیدے کی آگہی سے
ہزار صدیوں کا دردِ رشتہ نکھر گیا ہے
مرے عقیدے نے زندگی کو شعور بخشا
مرے عقیدے نے مفلسی کی سیاہ راتوں کو نور بخشا
مرا عقیدہ
گذرنے والے خموش چہروں کی داستاں ہے
مرا عقیدہ
مرے تعاقب میں آنے والی عظیم نسلوں کا راز داں ہے

خدائے برتر!
مرے تفکر کا فیصلہ ہے
ازل ترا تھا
ابد مرا ہے

فہیم جوزی

فاختہ

یوں بھی تزئینِ گلستاں نہ ہوئی تھی اُس شب
اور مہماں کہ جو آیا نہ گیا، اس کی نشست
کنجِ عزلت میں پڑی اونگھتی تھی
جاگتی آنکھ کھڑی ہنستی تھی اور دیکھتی تھی
فصلِ امکاں کا دہکتا ہُوا وہ منظر بھی
موت کی آہنی، بے مہر، فصیلِ کہنہ
جس کے شعلوں کو نمو روک نہیں سکتا ہے
لیکن افسوس وہیں شاخوں جلے پیڑ پہ، اک فاختہ،
محرومِ نظر روتی تھی

فاختہ روتی رہی ہے برسوں
اور آنسو کہ سدا خاک بسر ہوتے ہیں
فصلِ امکاں کے معانی نہ بنے
کوئی آیا نہ گیا
اور آئے بھی تو محرومِ نظر فاختہ معذور رہے،
کیسے دیکھے ؟!!

تلاش

تیری آنکھوں کے ستارے
زہر بن کے میرے خوں میں گھُل گئے
اور دھرتی کی جلی آغوش میں منظر کھُلا

برف کی شفاف قبریں،
ہر طرف سایوں کا بے معنی طلسم
..... سرد لاشیں سو رہی ہیں
مرمریں کتبوں کے انجانے حروف
رات کی پرچھائیوں میں کھو گئے ہیں
..... سرد لاشیں سو رہی ہیں

میرا جسم اک سرد لاش
برف کے تابوت میں لیٹا ہُوا ہے ـــ سو رہا ہے
اور مری ہم شکل لاشیں ان گنت قبروں میں عریاں سو رہی ہیں
میری تنہا ذات
میرے جسم کی دھن میں پریشاں
چیختی پھرتی ہے، لیکن کون جانے
میرا جسم ان برف کی قبروں میں ہے بھی یا نہیں ہے ؟!

احمد ندیم قاسمی

عشق کرو

عشق کرنے کا یہی وقت ہے، اے انسانو!
اس سے بہتر کوئی لمحہ تمھیں شاید ہی ملے

اس سے پہلے کبھی نفرت کے یہ معیار نہ تھے
جنگ کرتے تھے فقط اپنے تحفظ کے لیے
نوعِ انساں سے تو تم برسرِ پیکار نہ تھے
حسن و زیبائیِ عالم سے تو بیزار نہ تھے

وہ بھی کیا دن تھے کہ "تہذیب" ترقی پہ نہ تھی
جب عداوت کے بھی آداب ہُوا کرتے تھے
ذہن، بنجر نہیں --- شاداب ہُوا کرتے تھے

اب تو انسان کچھ اس زور کا جذباتی ہے
جنگ، کلیوں کے چٹکنے سے بھی چھڑ جاتی ہے

اس طرح چاک ہُوا پیرہنِ امن و سکوں
رہنمایانِ سیاست سے یہ شاید ہی سِلے
اپنے فن کار کا، اک بار تو کہنا مانو
اس سے بہتر کوئی لمحہ تمھیں شاید ہی ملے
عشق کرنے کا یہی وقت ہے، اے انسانو!

اتنی نفرت بھی نہ بوؤ کہ قیامت کاٹو
عشق کر لو، کہ یہی عشق ہے اب شرطِ بقا

پتھروں نے اسی قوت سے اُبھارے کہسار
یہی قوت ہے سمندر، یہی قوت صحرا
اسی قوت سے ہے مربوط ستاروں کا نظام
شاخِ گُل ہے اسی قوت کے سہارے، گلنار
یہی قوت ہے توازن، یہی قوت ہے خدا

آج ہو جائے جو انسان کو انسان سے پیار
چار سو ایک تبسّم کا ہو عالم طاری
صحنِ گلشن میں بدل جائے یہ دھرتی ساری
توپ ہو رُوئے زمیں پر، نہ فضا میں بم بار

لاکھ طوفان اٹھیں، لاکھ عناصر گرجیں
عشق چاہے تو شجر کیا، کوئی پتّہ نہ ہلے
آدمیت کا جو منصب ہے، اُسے پہچانو
اس سے بہتر کوئی لمحہ تمہیں شاید ہی ملے
عشق کرنے کا یہی وقت ہے، اے انسانو!

ڈاکٹر سید عبداللہ

"میزان" پر ایک نظر

تنقید کی ہر اچھی کتاب ایک ارمغان ہے مگر جب کوئی بلند پایہ شاعر تنقید کی کوئی کتاب پیش کرتا ہے تو اس ارمغان کی قیمت بہت بڑھ جاتی ہے۔ اس سے جستجو کرنے والے کے سامنے غور و فکر کے کئی نئے راستے کھل جاتے ہیں اور تقابلی حوالے سے ہم شاعر کے فن اور شخصیت کے بارے میں بہت کچھ جاننے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

فیض کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ (میزان) ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا تھا۔ اس اثنا میں، میں نے ان مضامین پر کئی بار نظر ڈالی اور ہر بار یہ خیال ہوا کہ ان کے بارے میں اپنی رائے یا تاثر کا اظہار کروں۔ خصوصاً جبکہ فیض کی طرف سے اس کی اجازت بھی تھی[1]۔ لیکن ہر بار قلم رُک جاتا رہا۔ اس کی وجہ زیادہ تر یہ تھی کہ "میزان" کے بارے میں میں بے دردانہ لکھنے سے قاصر تھا۔ اگرچہ میں نے جتنی مرتبہ اس کتاب کو پڑھا، ہر مرتبہ پہلے سے زیادہ دلچسپی محسوس ہوئی۔ یہ تو معلوم ہے کہ میں زندگی بھر طالب علم رہا ہوں، اس لئے تنقیدی ادب پر طالب علمانہ نظر ڈالتا ہوں۔ میری یہ عادت تدریس کے مشغلے سے پیدا ہوتی۔ میری ہمیشہ یہ آرزو رہی ہے کہ میں پڑھانے سے پہلے، مسئلے کو خود اچھی طرح سمجھ لوں۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے اگر کوئی شخص مدرس کہتا ہے تو مجھے یہ بات کبھی بری نہیں لگی۔ میں مدرس کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ "میزان" میری محسن کتابوں میں سے ہے کیونکہ مشکل سے مشکل مسائل آسان ترین انداز میں حل کئے گئے ہیں۔ چنانچہ میں نے اپنی تدریس میں اس سے بہت فائدہ اُٹھایا۔

بایں ہمہ "میزان" پر کچھ لکھنے سے میں ڈرتا رہا۔ مجھے یہ کتاب جتنی اچھی لگی اسی نسبت سے یہ بھی محسوس ہوا کہ بنیادی تنقیدی نظریئے کے اعتبار سے، کئی مسئلے ایسے بھی ہیں جن کے بارے میں، میں دوسری طرح سوچتا ہوں ..... اور اگرچہ دوسری طرح سوچنا کوئی اچنبھے کی بات نہیں اور نہ اس پر کوئی جائز اعتراض ہو سکتا ہے، تاہم مجھے اس معاملے میں ذرا سی بے دردی بھی گوارا نہ ہوئی۔ تاہم یہ قرض تھا جسے ادا کرنے کی سعیٔ ناتمام میں اب کر رہا ہوں۔

"میزان" سے پہلے اور اس کے بعد تنقید پر کئی اچھی کتابیں شائع ہوئیں۔ بعض ترقی پسند نظریئے کے حق میں، بعض مخالفانہ۔ بعض بین بین۔ ان سب کے مطالعہ کے بعد، پھر "میزان" پر نظر ڈالی تو اس کی اس خصوصیت کو لاجواب اور منفرد پایا کہ ترقی پسند تنقید کے بنیادی مسئلوں کی تشریح (عام فہم انداز میں) جس طرح "میزان" میں ہے وہ کسی دوسری کتاب میں موجود نہیں۔ پھر ایک معاملہ یہ بھی پیش آیا کہ ادب کے مسائل کے بارے میں جستجو رکھنے والے "میزان" کے بارے میں اب بھی برابر سوال اٹھا رہے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہ رہا کہ پڑھنے والوں کی ایک بڑی

---

[1] "...... اس پر بھی نظر ڈال لیجئے۔ بیشتر معمولی باتیں ہیں، کوئی نکتہ قابلِ اعتنا ہو تو کچھ لکھ دیجئے۔" (میرے خط کے جواب میں فیض نے ایک خط لکھا تھا۔ میں نے کچھ لکھنے کی اجازت مانگی۔ انہوں نے دے دی)۔

تعداد اب تک "میزان" ۔۔۔۔۔۔ کے فیصلوں کے بارے میں، کچھ جاننا چاہتی ہے، اور اگرچہ ترقی پسند تحریک اب میدانِ عمل میں نہیں اور فیض بھی قدرے گوشہ نشین ہو گئے ہیں مگر ادب کے طلبار کی جستجو پر ان باتوں کا کچھ اثر نہیں پڑا۔ اس سے "میزان" کی مستقل قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ فیض نے میزان کے دیباچے میں لکھا ہے:۔

"ادبی مسائل پر سیر حاصل بحث کے لئے نہ کبھی فرصت میسّر تھی، نہ دماغ۔ ریڈیو پر اور مختلف محفلوں میں ان مسائل پر باتیں کرنے کے مواقع البتہ ملتے رہے۔ یہ مضامین انہی باتوں کا مجموعہ ہیں، اس لئے ان میں سخن علمائے نہیں، عام لکھنے پڑھنے والوں سے ہے جو ادب کے بارے میں کچھ جاننا چاہتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر اب سے (۱۹۶۲ئسے) بیس پچیس برس پہلے جوانی کے دنوں میں لکھے گئے تھے۔ بہت سی باتیں جو اس وقت بالکل نئی تھیں اب پامال نظر آتی ہیں اور بہت سے مسائل جو ان دنوں بالکل سادہ معلوم ہوتے تھے، اب کافی پیچیدہ دکھائی دیتے ہیں۔"

غرض یہ مجموعہ ان لوگوں کے لئے ہے جو ادب کے مسائل کے بارے میں کچھ جاننا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر کوئی مجموعہ ادب کے مسائل کے بارے میں جستجو کرنے والوں کی تشفی کرتا ہے تو وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہے۔

"میزان" بنیادی طور پر، ترقی پسند نظریئے کی نمائندگی کرتی ہے مگر یہ قابلِ توجہ امر ہے کہ اس چھوٹی سی کتاب میں ادب کے اکثر بنیادی مسائل کی بحث موجود ہے جن پر ۱۹۳۶ء کے بعد اہلِ قلم نے خاص توجہ صرف کی۔ اور ایک لحاظ سے آج بھی یہ مسئلے موضوعِ بحث اور مابہ النزاع ہیں۔

ادب کا ترقی پسند نظریہ کیا ہے، احتشام حسین، علی سردار جعفری، مجنوں گورکھپوری، عزیز احمد اور ممتاز حسین وغیرہ اپنے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق اس موضوع پر لکھ چکے ہیں۔ اسی طرح سجاد ظہیر نے "روشنائی" میں اس نظریئے کی کڑیاں جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ مگر مذکورہ کتابوں میں یہ بحثیں اتنی مشکل ہیں کہ وضاحت کے بجائے مسئلہ اور الجھ جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں "میزان" کی توضیحات فوراً ذہن نشین ہو جاتی ہیں۔

فیض کے نزدیک ترقی پسند ادب سے ایسی تحریریں مراد ہیں جو (۱) سماجی ترقی میں مدد دیں۔ (۲) ادب کے فنی معیار پر پوری اتریں۔

پھر اس تعریف کو ذرا وسعت دے کر یوں بیان کیا ہے "ترقی پسند ادب ایسی تحریروں سے عبارت ہے جن سے سماج کے سیاسی اور اقتصادی ماحول میں ایسی ترغیبات پیدا ہوں جن سے کلچر ترقی کرے اور رجعت پسند ادب وہ تحریریں ہیں جو ان رجحانات کی مخالفت کریں اور جن کی وجہ سے کلچر کے راستے میں رکاوٹیں پیدا ہوں۔"

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ترقی پسند ادب (اور فیض کے نقطۂ نظر سے ہر صحیح ادب) ایک سماجی اور عمرانی عمل ہے، اور اس کا مقصد سیاسی و اقتصادی ماحول کو اس طریق سے متاثر کرنا ہے کہ اس کے زیر اثر کلچر کو ترقی ہو۔

اس میں کچھ شبہ نہیں کہ ادب کا ایک رخ عمرانی بھی ہے اور اس کے ذریعے سیاسی و اقتصادی ماحول متاثر بھی ہوتا ہے۔ اور بالآخر اچھے ادب سے کلچر بھی پیدا ہوتا ہے لیکن یہ جزوی سچائی ہے۔ پوری سچائی یہ ہے کہ ادب ایک روحانی عمل بھی ہے۔ اس کی تخلیق میں فرد کے خصائص ذاتی اور اس کی منفرد اصلی زندگی بھی پورا حصہ لیتی ہے۔ اس میں وہ فیضان بھی کارفرما ہوتا ہے جس کا صحیح تجزیہ ابھی ممکن نہیں ہوا۔ اس فیضان کو پرانے لوگ الہام کہتے تھے۔ نئے لوگ اسے نفسِ انسانی کی گہری اور پیچ در پیچ عصبی اور نفسی کیفیتوں سے تعبیر کرتے ہیں۔ ادب صرف

سیاسی و اقتصادی ماحول ہی کو متاثر نہیں کرتا بلکہ مخاطب کے کل ماحول کو متاثر کرتا ہے، یعنی مخاطب کی داخلی زندگی کو بھی متاثر کرتا ہے اور آخر میں یہ کہ کلچر صرف سیاسی و اقتصادی نظام اور اس کی ترتیب و تنظیم سے عبارت نہیں۔ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ کلچر میں زندگی کا ہر وہ رُخ موجود ہے جس کی آراستگی کی ضامن وہ قوت یا صلاحیت ہے جسے ذوق کہتے ہیں — اور ظاہر ہے کہ ذوق سے اجتماعی اثرات خارج نہ سہی مگر ذوق ان کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے — اور یہ "بہت کچھ" اتنی وسیع کیفیت ہے کہ بر تقریر در نہ آید۔

ادب کو ایک ایسا عمرانی ادارہ سمجھ لینا جیسا مثلاً امدادِ باہمی کا کوئی ادارہ ہو — یا کوئی اور معاشرتی نظام — یہ دراصل ادب کو ایک محدود خارجی کاروباری عمل سمجھنے کے مترادف ہے۔ یہ ساری تکلیف دراصل، اس تصور سے پیدا ہوتی ہے کہ انسان کی کل زندگی کھانے پینے، اچھے کپڑے پہننے، روزی کمانے اور روزی کے ذرائع پر قابو پانے سے عبارت ہے۔ بلاشبہ یہ بھی ہے مگر سب کچھ یہی نہیں۔ اس کے ماوراء اور اس کے علاوہ بھی انسان کی دنیا دور دور تک، بڑی گہرائیوں تک پھیلی ہوئی ہے، جسے ہم کبھی روحانی دنیا کہہ دیتے ہیں، کبھی آج کل والے نفسیاتی دنیا کہتے ہیں — اور سچ یہ ہے کہ یہ الفاظ بھی کافی نہیں — اسے نامعلوم پُراسرار دنیا کہہ دیجئے تو قدرے ترجمانی ہو سکتی ہے۔

اقتصادی اور سیاسی مسئلے، انسانی سرگرمی کا صرف ایک حصّہ ہیں، مگر "میزان" میں اسی ایک رخ کو ابھارا گیا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ ادب کا کاروبار انجمنیں بنانے اور انجمنوں کے ذریعے بعض سیاسی اور اقتصادی مسئلوں کے لئے تبلیغ کے سوا کچھ نہیں — اور تعجب یہ ہے کہ فیض نے اس کی تردید نہیں کی تائید ہی کی ہے اور کہا ہے کہ ادب بھی ایک طرح کا پروپاگنڈا ہی ہوتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ادب اچھی چیزوں کے لئے پروپاگنڈا کرتا ہے اور اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

چلئے، تسلیم۔ اگر یہ پروپاگنڈا ہی ذم کا پہلو ہے۔ ہم پروپاگنڈا کیوں کہیں۔ اظہار، ترجمانی، ابلاغ کیوں نہ کہیں۔ لیکن دشواری یوں پیدا ہو جاتی ہے کہ جونہی ہم ادب کو سیاسی اور اقتصادی ماحول میں ترغیبات کا ذریعہ سمجھنے لگتے ہیں، اس کے پروپاگنڈا ہو جانے میں کوئی امر مانع نہیں رہتا — اور پروپاگنڈا کے لفظ سے ہم اس لئے ڈرتے ہیں کہ اس میں وہ ذرائع بھی شامل ہو جاتے ہیں جو ضروری نہیں کہ اعلیٰ و ارفع ہوں۔ ادب اور پروپاگنڈا میں اگر فرق ہے تو یہی کہ ادب، مذہب کی طرح پاکیزہ مقاصد کے لئے پاکیزہ ذرائع کا استعمال سکھاتا ہے۔ پروپاگنڈے کا مقصد نیک بھی ہو، تب بھی اس کے ذرائع ہر قسم کے ہو سکتے ہیں۔ اچھے بھی بُرے بھی۔ پاکیزہ نصب العین کے لئے بُرے ذرائع کا استعمال نصب العین کی قبولیت اور اس کی اچھائی پر بُرا اثر ڈالتا ہے۔

ادب صرف اس لئے ارفع نہیں کہ اس کی پیش کش جمالیاتی ہوتی ہے (جیسا کہ فیض نے اپنے مضمون "شاعر کی قدریں" میں واضح کیا ہے)۔ بلکہ اس لئے بھی کہ اس کے مضامین ارفع اور اس کے وسائلِ تاثیر پاکیزہ ہوتے ہیں (مضامین کے ارفع ہونے سے مراد یہ نہیں کہ وہ مضمون انسان کی ایک بنیادی قدر روٹی تک محدود ہیں۔ بلکہ اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ وہ مضامین انسان کو اس کی فطری نیکی کی طرف دعوت دیتے اور اسے اس کے روشن تر پاکیزہ نصب العین کی طرف بلاتے ہیں۔ شاعر کا اصلی پیغام محبت کا پیغام ہوتا ہے۔ وہ جھگڑوں سے اونچا متحارب فریقوں میں ثالثی کرنے والا، اپنے عمل اور پیغام کے ذریعے کدورتوں کو دور کرنے والا، ہر حال میں سچ بولنے والا، انصاف کرنے والا — اور بالآخر سقراط کی طرح سچائی کے لئے زہر کا پیالہ پینے والا — فرد ہوتا ہے۔ ادب کو پروپاگنڈا کہنے سے، ادیب کی یہ ساری فضیلتیں اس سے چھن جاتی ہیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ ایک ہنرمند سیاست دان بن جاتا ہے جو نیک مقاصد کے لئے جھوٹ بھی بول سکتا ہے۔ ادیب کا یہ منصب یقیناً کمتر اور پست ہے۔ بات جس طریق سے پیش کی گئی ہے، یہ بات اس سے نکلتی ہے ورنہ شائد فیض کا بھی یہ مقصد نہیں۔ میں نے یہ نتیجہ ایک دوسرے مضمون

سے نکالا ہے۔ یہ مضمون ہے "شاعر کی قدریں"۔ اس مضمون میں فیضؔ نے شاعر اور ادیب کو بلند تر مقام عطا کیا ہے۔

"شاعر کی قدریں کیا ہیں؟" اس مضمون میں فیضؔ نے جمالیت اور افادیت کے امتزاج پر زور دیا ہے اور لکھا ہے کہ "حسن کی تخلیق صرف جمالیاتی فعل ہی نہیں، افادی فعل بھی ہے"۔ "اگر کسی شاعر کا کلام جمالیاتی تاثر کے لحاظ سے ناقص ہے تو یہ نقص اس کی افادیت پر بھی اثر انداز ہو گا"۔ ان خیالات سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن قدرے تامل یوں ہوتا ہے کہ فیضؔ جمالیاتی قدر کو بھی خالص سماجی کیفیت مانتے ہیں اور سماجیت کا معیار ان کے نزدیک سماجی مفاد ہے۔ گویا فرد کی ذوقی دنیا اس سے خارج ہے، اور بحث یوں پیدا ہوتی ہے کہ سماجی مفاد سے ان کی مراد وہ امور ہیں جن پر ایک خاص نظریئے نے زور دیا ہے یعنی معاشیات و سیاسیات۔ ظاہر ہے کہ انسانی دنیا کا یہ تصور بہ حد محدود ہے۔ بایں ہمہ "شاعر کی قدریں" میں دوسرے امور کے لحاظ سے توازن اور اعتدال پایا جاتا ہے — اور "صحیح طرف ہونے" کی دعوت کے باوجود شاعر کے لئے جو منصب تجویز ہوا ہے اس سے اتفاق کیا جا سکتا ہے اور ہرچند کہ شاعری کا دائرہ اور اس کے مقاصد محدود کر دیئے گئے ہیں، تاہم یہ نصب العین غلط نہیں کہ "شعر کی مجموعی قدر میں جمالیاتی خوبی اور سماجی افادیت دونوں شامل ہیں"۔ جمالیاتی خوبی اور سماجی افادیت کی بے شمار تعریفیں ہو سکتی ہیں، اور اس توضیح میں وہ سب شامل ہو جاتی ہیں۔

مضمون "ادب اور جمہور" میں یہ اہم سوال اٹھایا ہے کہ ہمارا پرانا ادب کس حد تک جمہور اور عوام کا ترجمان ہے۔ اس مضمون میں مصنف نے بجا طور سے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ "ادیب کا ذہن ایک آئینہ ہوتا ہے جس میں اس کے دور کی سماجی حقیقت اور اس کا معاشرتی ماحول مجموعی طور پر منعکس ہوتا ہے اور آج تک دنیا میں کوئی ایسا دور نہیں آیا جب اس معاشرتی ماحول میں عوام شریک نہ ہوں"۔ اس حقیقت کو تسلیم کر لینے کے بعد دوسرے نتائج جن کے بارے میں رائے الگ ہو سکتی ہے، ضمنی معلوم ہوتے ہیں۔ جمہور اور عوام سے مراد صرف وہ طبقے ہی نہیں جنہیں مارکسی اصطلاح میں کارکن، مزدور اور کسان کہتے ہیں بلکہ وہ سب عام و خاص مراد ہیں جن سے معاشرہ عبارت ہے۔ پرانے زمانے میں طبقاتی تفاوت کا وجود تو ٹھیک مگر اس کا تیز احساس گاہے گاہے نظر آتا ہے۔ اس لحاظ سے جمہور سے مراد، یکساں عقائد رکھنے والے وہ سب عام و خاص ہیں جو ان عقائد سے متاثر ہوتے ہیں۔

فیضؔ کی یہ رائے بھی بڑی دقیع معلوم ہوتی ہے کہ:-

> "جس طرح پرانے ادب میں نواب ہی نواب دکھائی دیتے ہیں، اسی طرح اس نئے ادب کے مطالعہ سے یہ
> محسوس ہوتا ہے کہ سماج میں عوام کے علاوہ کوئی طبقہ موجود ہی نہیں۔ اس طرح سماج کا خاکہ ادھورا اور غیر مکمل ہی رہ جاتا ہے"۔

مصنف کا نقطۂ نظر یہاں بھی معقول اور صحت مند ہے۔ جو لوگ نئے ادب سے مطمئن نہیں، اس کی ایک وجہ یہی ہے جس کی طرف اوپر کے اقتباس میں اشارہ کیا گیا ہے، اور سچ یہ ہے کہ ادب میں سیاسی غرض مندی کے علاوہ اس کی یہی محدودیت ہے جس نے سلسلے نئے ادب کو بدنام بھی کیا اور اس کو بے تاثیر بھی بنایا۔

اس مضمون میں "میزان" کے سب مضامین کا تجزیہ نہ مقصود ہے نہ ممکن۔ البتہ بقیہ سب مضامین کے بارے میں یکجا چند نتیجے نکالے جا سکتے ہیں:

۱- فیضؔ کا نقطۂ نظر بنیادی طور پر سماجی (سیاسی و اقتصادی) ہے۔

۲- اس کے باوجود فیضؔ دو امور کو بطور خاص مدِ نظر رکھ رہے ہیں:

(الف) شاعری اور ادب کی ایک اہم قدر حسن بھی ہے۔ جو شاعری حسن سے دور ہے اس کی افادیت بھی مشکوک ہے۔

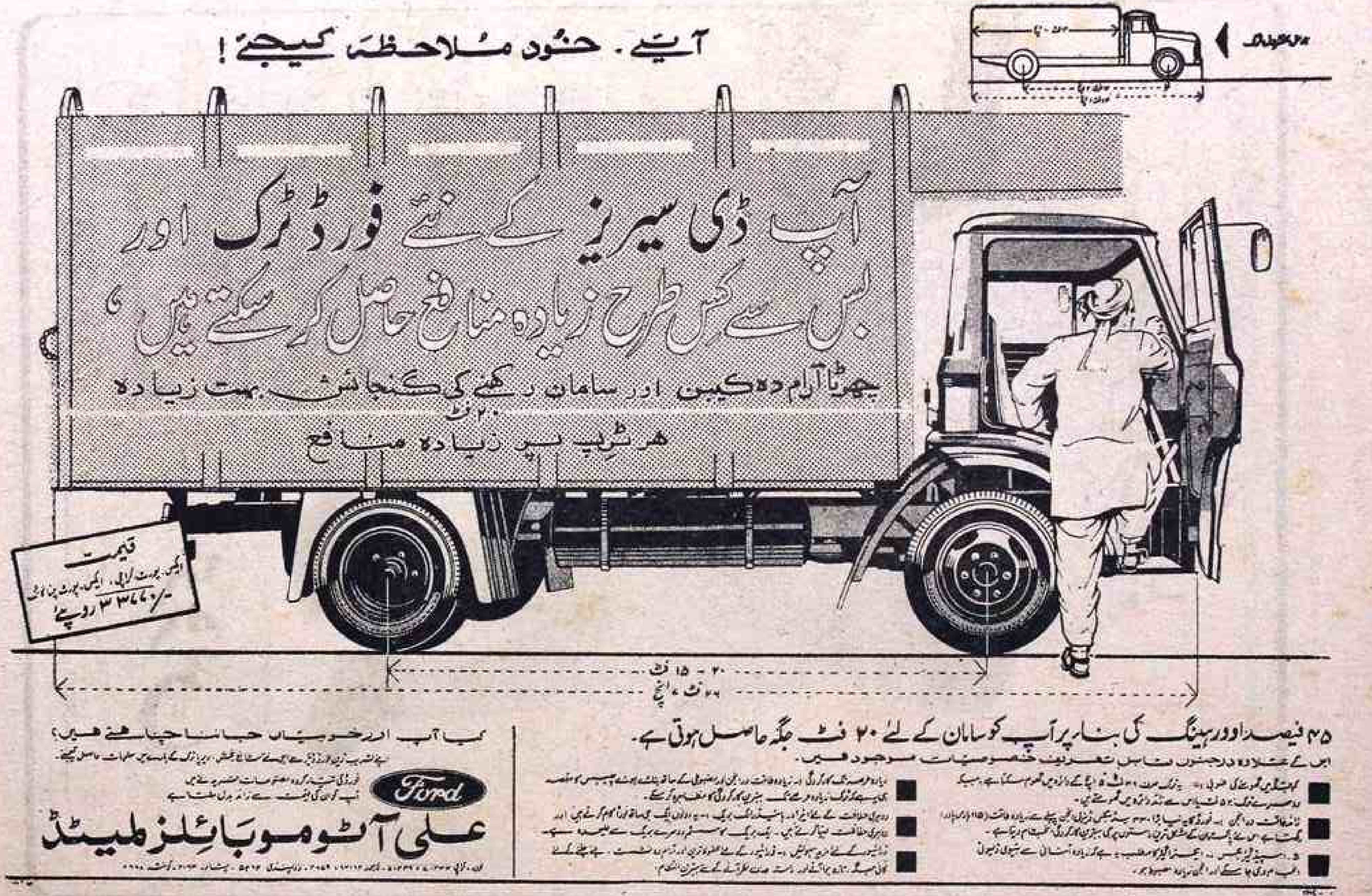
(ب) وہ قدیم ادبی روایتوں کے صالح حصے کے مداح ہیں۔ انہوں نے اپنے چند مضامین (مثلاً "جدید فکر و خیال کے تقاضے اور غزل"۔

— اسی طرح "ہماری تنقیدی اصطلاحات" اور "اردو شاعری کی پرانی روائیتیں اور نئے تجربات" ہیں، پرانی ادبی روایات کے حسین حصّے کی عمدہ تشریح و تعبیر کی ہے۔

فیضؔ نے پاکستانی تہذیب کے موضوع پر کئی مضامین میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ یہ ان کا محبوب موضوع ہے اور اتفاق یہ کہ راقم الحروف کو بھی اس مسئلے سے خاص دلچسپی ہے۔ مگر اسے سوٗ اتفاق سمجھئے کہ اس بارے میں فیضؔ کے استدلال سے مجھے کبھی اطمینان نہیں ہوا۔ وجہ یہ کہ موصوف کے نزدیک کلچر کا سارا مسئلہ از سرتاپا زمینی، خارجی اور قدرے اقتصادی و سیاسی ہے۔ میں بھی کلچر کی ان بنیادوں کو تسلیم کرتا ہوں لیکن پاکستانی کلچر سے اسلامی عقیدوں (یا مسلمانی عنصر) کو خارج نہیں سمجھ سکتا۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ پاکستانی کلچر ابھی معرضِ تعمیر میں ہے اور اس کی کسی واضح شکل کے لئے کم و بیش پچاس برس کی مدت درکار ہوگی۔ البتہ اس کی تشکیل کے رخ متعین کرنے کی شعوری کوشش ممکن ہے۔ پاکستانی کلچر آئندہ کیا ہوگا؟ ابھی سے اس کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے، البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ پاکستانی کلچر میں اسلامی فضا تبھی پیدا ہوگی جب یہاں کے لوگ اسلام کو عملاً اپنی زندگیوں میں نافذ کریں گے۔ اگر یہ نہیں تو محض نظریئے سے کسی معاشرے کا اسلامی بن جانا ناممکن ہے۔

"میزان" کے بقیہ دو حصے (۱) متقدمین اور (۲) معاصرین جو کئی مضامین پر مشتمل ہیں۔ کم و بیش انہیں نظریات کے آئینہ دار ہیں جن کا تذکرہ ہوچکا ہے۔ ان میں نقطۂ نظر سماجی ہے، مگر فیضؔ کے سماجی تصورات میں فن اور جمالیت کی اہمیت کسی عنوان کم نہیں ہوئی اور اسی کو میں مصنف کی سلامتِ طبع کہتا ہوں۔

میں نے اس تبصرے کے آغاز میں لکھا تھا کہ "میزان" سے پہلے اور اس کے بعد کئی تنقیدی کتابیں لکھی گئیں لیکن "میزان" پھر بھی منفرد ہے۔ یہاں پہنچ کر اس انفرادیت کی وجوہ کا اعادہ کر دینے میں کوئی قباحت نہیں۔ میرے نزدیک "میزان" کی اہمیت چند وجوہ سے ہے۔ اول اس وجہ سے کہ اس کتاب میں ادبی و تنقیدی مسائل کا تجزیہ قابلِ فہم اور تشفی بخش ہے۔ اس سے اختلاف ہوسکتا ہے مگر ان پر ابہام کا الزام نہیں لگایا جاسکتا۔ دوسری وجہ یہ کہ مصنف بنیادی عقیدوں میں استواری کے باوجود، اپنے سے مختلف نقطۂ نظر کے لئے بھی گنجائش کا قائل ہے۔ تیسری وجہ یہ کہ مصنف پچھلے ادب کی صالح روائتوں کے حق میں ہے اور چاہتا ہے کہ حال و مستقبل کی تعمیر نئی زندگی کے ساتھ ساتھ پرانی روائتوں کی اساس پر ہو (کم از کم ادب کے بارے میں اس کے یہی خیالات ہیں) اور چوتھی وجہ یہ کہ فیضؔ کے شاعرانہ درجے کے حوالے سے ہر شخص یہ جاننا چاہتا ہے کہ نقد و نظر کے معاملے میں شاعر کی بصیرت نے کہاں تک اس کی رفاقت کی! یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ "نقشِ فریادی" میں جو کچھ ہے، وہی "میزان" میں ہے مگر "میزان" کے مطالعے کے بعد، یہ نتیجہ فوراً نکالا جاسکتا ہے کہ "میزان" کے مضامین "نقشِ فریادی" کے مصنف ہی کے ہیں اور شاعر کی تخلیقی شخصیت کے ان دونوں رُخوں میں فاصلہ بہت کم ہے!


آیئے، خود ملاحظہ کیجئے!
آپ ڈی سیریز کے نئے فورڈ ٹرک اور بس سے کس طرح زیادہ منافع حاصل کر سکتے ہیں
چھوٹا آرام دہ کیبن اور سامان رکھنے کی گنجائش بہت زیادہ
ہر ٹرپ پر زیادہ منافع
قیمت
۳۴،۷۰۰/- روپے
۴۵ فیصد اوور ہینگ کی بنا پر آپ کو سامان کے لئے ۲۰ فٹ جگہ حاصل ہوتی ہے۔
اس کے علاوہ درجنوں خاص قابل تعریف خصوصیات موجود ہیں۔
کیا آپ اور خوبیاں جاننا چاہتے ہیں؟
Ford
علی آٹوموبائلز لمیٹڈ


دانتوں اور
مسوڑھوں کی کامل
حفاظت
TIBET
TIBET
DENTAL CREAM
تبت ٹوتھ پیسٹ
کے ذریعے یقینی ہے!
تبت ٹوتھ پیسٹ طبی اصولوں کے مطابق بہترین اجزائے تیار کیا جاتا ہے۔
یہ گھر کے ہر فرد کے دانتوں کو صاف اور صحت مند رکھنے کا بہترین ذریعہ ہے۔
کوہ نور کیمیکل کمپنی لمیٹڈ ۔ کراچی ۔ ڈھاکہ
United T.T.P. 1.68


مستقل مزاج
کیوینڈرز کو
پسند کرتے ہیں
CAVANDERS
MEDIUM
NAVY CUT
MAGNUM
کیوینڈرز سگریٹ، تمباکو کی بہتر
عمدہ معیار کے حامل ہونے کی وجہ سے
ہیں۔ یہ عام سگریٹوں سے مقابلتاً بڑے اور
تسکین حاصل ہوتی ہے۔ انہی خوبیوں کے سبب ان
آمیزش، اعلیٰ قوام اور اپنے روایتی
سگریٹ نوشی کا صحیح لطف بخشنے
مختلف ہیں۔ انہیں پینے سے دیرپا
کی مقبولیت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے
پریمیر ٹوبیکو کمپنی لمیٹڈ
گوڈفرے فلپس لمیٹڈ ۔ لندن
۳۸ پیسے میں ۱۰
CAV/8/7/66
UNITED



خوش نظر و باوقار
لٹھا ۹۵۰۰۰
رنگدار مرسرائزڈ پاپلین ۹۹۷۱
رنگدار مرسرائزڈ پاپلین نرگسی آنکھ
رنگدار مرسرائزڈ ڈریس نیلم
کالونی بھل ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ
اسماعیل پور
کالونی بھل کے پارچات • خوش نظر و باوقار

فتح محمد ملک

شاعری اور ناشاعری

انتظار حسین پر یہ راز ۱۹۵۷ء میں کھلا کہ "یہ اشاعر اپنے ہمنشینوں کے ساتھ ہی نہیں بلکہ اپنے پورے دَور کے ساتھ سائین والا قصّہ کرتا ہے۔ جو اس کی کنڈلی سے نکل جاتے وہی پچتاتے ہیں"[1]۔ ادھر یہ کشف ہوا ادھر انہوں نے ۱۹۳۶ء کے ادیبوں کی کنڈلی سے نکلنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنا شروع کر دیئے۔ اس مہم کا آغاز ۱۹۳۶ء کے ادیبوں کی پیروی میں ہوا یعنی انتظار حسین نے ان باغی ادیبوں کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے نام پایا اور یہ وہ لوگ ہیں جن میں سے راشد اور فیض کو انتظار حسین نے اپنے عہد کے میر و غالب قرار دے کر گویا میر و غالب کے سر احسان دھرا تھا۔ شنید یہ ہے کہ میرٹھ کالج کے نوجوان انتظار حسین نے راشد کی "ماورا" کی اشاعت پر بجنوری کے مشہور قول کی خاک یوں اڑائی تھی: "ہندوستان میں الہامی کتابیں دو ہیں۔ وید مقدس اور ماورا۔" اور وید کر ۱۹۴۷ء میں موصوف نے ن۔م۔ راشد اور فیض احمد فیض سے بیزار ہو کر عہد کی عظیم تخلیقی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی توقعات احمد ندیم قاسمی اور اختر الایمان سے وابستہ کر لیں[2] اور پھر سن چھپن کی وہ ساعت سعید آ پہنچی جب انتظار حسین اپنے عہد کے ہر اس لکھنے والے سے جنگ آزما ہوئے جسے وہ بڑا یعنی سائین تصور کرتے تھے۔ اس جنگ کو اردو دنیا کے لئے عالمی جنگ بنانے کی خاطر انتظار حسین کے ہاں ہر نئے لکھنے والے کو اپنی کنڈلی میں گھیرنے کا عمل شروع ہوا۔

جب سے لے کر اب تک انتظار حسین، ان کے دوستوں یا سابق دوستوں — جیلانی کامران اور افتخار جالب — اور ان کے نظریاتی حریف وزیر آغا نے خود کو جدیدیوں میں جوہر قابل کی "دریافت" اور پھر اس دریافت کو اپنے اپنے حدود دائرہ فکر میں پابند رکھنے پر مامور کر رکھا ہے۔ ہر چند یہ لوگ ترقی پسند تحریک کے پر زور مخالف ہیں مگر تحریک کی تنظیمی چمک دمک سے ان کی آنکھیں اس قدر خیرہ ہیں کہ اپنا حلقۂ حمایت وسیع کرنے کے شوق میں یہ لوگ ناشاعری تک کی حمد و ثنا کو اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ مزید یہ کہ یہ تحریک کے انتشار کے بعد کے فکری خلا کو پُر کرنے کے لئے نت نئی منصوبہ بندی میں مصروف ہیں۔ نئے لکھنے والوں سے یہ "سائین" والا قصّہ کر کے یہ لوگ جدید اردو ادب کے "بڑوں" میں اپنا شمار کرا سکے ہیں یا نہیں؟ — یہاں اس موضوع پر کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ اس سے حالیہ شاعری کی صورت حال پر کیا اثر پڑا۔

یہ ہر نئے لکھنے والے کو اپنے حلقۂ اثر میں لینے کی ہوس ہی کا شاخسانہ ہے کہ آج جدت کی اصطلاح فرسودگی کا مفہوم دینے لگی ہے اور ممتاز شیریں کا یہ قول سچ ثابت ہونے لگا ہے کہ "ادب میں نئی نئی تحریکیں اور ہر آن بدلتے ہوئے رجحانات بھی ایک خاص دائرے میں گھومتے رہتے ہیں۔ جو رجحان نیا معلوم ہوتا ہے وہ دراصل ایک گزشتہ رجحان یا تحریک ہی کی ایک نئی شکل ہوتی ہے۔" اردو شاعری کے تازہ ترین رجحانات کے مطالعہ سے یہی پتہ چلتا ہے کہ سوئی گھوم پھر کے واپس سن چھتیس پر آ رکی ہے۔ نئے شاعر کا ہر اجتہاد ۳۶ء کے جدید شاعر کی تقلید نظر آتا ہے۔ اور تو اور ۳۶ء کے جدید شاعر کو ہدف مذمت بنانے کی رسم بھی ۳۶ء کے باغیوں کی تقلید میں اپنائی جاتی ہے —

ن۔م۔ راشد نے کہا تھا:

"جدیدیت ایک خاص انداز نظر کا نام ہے، وہ انداز نظر جو روایت کو ہر حال رد کرنے پر آمادہ رہتا ہے"[3]۔ نئے شاعر نے یہ انداز نظر اس ٹھاٹھ سے اپنایا ہے کہ اب وہ راشد اور ان کے معاصرین کی شعری روایت سمیت اردو شاعری کی تمام روایات کو ہر حال میں رد کرنے پر اُدھار کھائے بیٹھا ہے — اور اس حد تک کہ خود کو جدید کی بجائے نیا کہتا ہے اور جدید کو از کار رفتہ گردانتا ہے۔

---

[1] "ایک حالی رہ گیا"، مطبوعہ ہمایوں۔ [2] "روایت اور تجربہ"، مطبوعہ ساقی۔ [3] "جدیدیت کیا ہے؟"، مطبوعہ سات رنگ۔

لارڈ میکالے کے تعلیمی اور سرسید کے اصلاحی پروگرام کے زیر اثر پہلے پہل تعلیم یافتہ اور اصلاح یافتہ ادیبوں کی جو نسل نمودار ہوئی، اسے حُسن سے بھی لگاؤ تھا اور زندگی بھی عزیز تھی یعنی ان کی زندگی میں اولیں اہمیت تو مادی ترقی کو حاصل تھی مگر فارغ وقت میں یہ لوگ بیکار نہ بیٹھ کچھ کیا کر کے مصداق شعر و ادب میں بھی دلچسپی لیا کرتے تھے جس طرح قوم کی معاشرتی اصلاح کی خاطر یہ جانباز نکٹائی اور پتلون پہنتے اور گردن اکڑا کر تصویر اتروا تے تھے، بالکل اسی طرح شعر و ادب میں اصلاح کی خاطر عروض و ہیئت اور لہجہ و آہنگ میں تجربے کرتے ہوئے "مونچھ اور چوٹی" کے منظوم مکالمے لکھا کرتے تھے عظمت اللہ خاں اور ان کے شعری فیشن کے گرویدہ حضرات کے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا، پھر بھی یہ لوگ سرگرمی سے نظمیں لکھتے رہے کیونکہ ان کا مقصد تو شاعری کو ترقی دینا تھا۔ یہ ہماری خوش بختی ہے کہ حالی سے اقبال تک مکتب کی تعلیم کے اثرات ہی قائم رہے اور چند دیوانے شاعری کو ترقی دینے کی بجائے قوم کے آشوب کو شاعری کی وساطت سے سمجھنے اور پیش کرنے میں مصروف رہے ورنہ آج ہمیں نکٹائیوں پتلونوں اور کیمروں کی طرح اعلیٰ ڈیزائن کی شاعری بھی ولایت سے آرڈر پر منگوانا پڑتی۔

لیکن ہماری یہ خوش بختی ہی جدید اردو شاعری کی بدبختی ہے۔ جس زمانے میں اقبال "شعر مرا کیا ہے، شاعری کیا ہے" کہتے ہوئے قومی مصائب پر دلسوزی سے غور و فکر میں مصروف تھے، ۳۶ء کا شاعر قوم سے قطع تعلق کرنے اور جدید بننے میں کوشاں تھا۔ مغربی استعمار سے نجات کی گھڑی جوں جوں قریب آ رہی تھی مغرب دشمنی کی لے مدھم پڑتی جا رہی تھی۔ زندگی اور فن کے بارے میں مغربی اندازِ نظر نوجوان نسل میں روز بروز زیادہ مقبول ہوتا جا رہا تھا اور یہ حقیقت فراموش ہونے لگی تھی کہ مغرب کا دانشور جب فن کی عالمگیریت کی بات کرتا ہے تو اس کی نظر میں دنیا صرف مغرب تک محدود ہوتی ہے۔ چنانچہ جدید شاعر عالمگیریت کی دھن میں قومی مصائب سے اقبال کی طرح نبرد آزما نہ ہوا بلکہ اس نے ان مسائل سے فرار کی راہ اختیار کی اور یوں میراجی، ن۔م۔ راشد، مغربی اور ترقی پسند شعراء مارکسی فضاؤں کی طرف مائل پرواز ہوئے۔ نتیجہ یہ کہ اقبال کی روایت سے انکار اور عظمت اللہ خاں کی روایت کے اثبات پر فخر ۳۶ء کے شاعروں کا طرۂ امتیاز ٹھہرا اور یہ لوگ ہیئت کے تجربات اور مغرب سے مستعار یا درآمد عالمگیریت کے پرچار میں اس جوش و خروش کے ساتھ محو ہوئے کہ قیام پاکستان کے بعد بھی انہوں نے خود کو اپنے اردگرد بسنے والوں کے حقیقی مسائل سے وابستہ کرنا ضروری نہ سمجھا۔ شاید اس خوف سے کہ ایسا کرنے میں کہیں ان کی جدیدیت ہی خطرے میں نہ پڑ جائے۔

یہ جدیدیت مسلمانوں کی فکری روایات کی نفی اور ہندی کی قدیم اور مغرب کی جدید شاعری کے اندازِ فکر و اظہار کے اثبات سے وجود میں آئی تھی اس لئے مغربی شاعری کی مختلف تحریکیں ہمارے ہاں مقبولیت اختیار کرتی گئیں۔ انتظار حسین نے اپنے مضمون 'روایت اور تجربہ' میں قرار دیا کہ:

> "جنس کی رو جس تلخ دھمک کے ساتھ آج ہمارے ادب میں در آئی ہے وہ کسی لذتی جذبہ کی پیداوار نہیں بلکہ ایک پیچیدہ اور روحانی مسئلہ ہے۔ جنس آج اتنا ہی سنجیدہ اور مقدس موضوع ہے جتنا جلال الدین رومی کے عہد میں تصوف تھا۔ آج جنس ایک زندہ، تلخ، روحانی تجربہ بنی ہوئی ہے۔ اس سے آج کے ادیب کو مفر نہیں۔"

یہ بات سن ۴۸ء کی ہے اور اس وقت بہت سے ادیبوں کو اس 'روحانی مسئلہ' سے مفر تھا۔ اس لئے کہ جس آزادی کے خواب وہ برس ہا برس سے دیکھتے چلے آ رہے تھے اس سے صرف پل بھر کی دوری باقی تھی اور زندگی میں اور بہت کچھ سوچنے اور کرنے کو موجود تھا۔

طلوعِ آزادی کے وقت ہمارے ہاں جدید شاعری کی جو روایت زوروں پر تھی، اس میں آزادی کی لگن کو بنیادی اور مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ ایک غیر ملکی استعمار سے آزادی، ایک پسماندہ معاشرے کے اخلاق اور جنسی توہمات سے آزادی، اصنافِ اظہار کی رسمی پابندیوں سے آزادی اور سب سے بڑھ کر جابر حکمران کے سامنے کلمۂ حق کہنے کی آزادی۔ مگر آزادی کے بعد اس روایت سے خود کو وابستہ رکھنا مسلسل دشوار سے دشوار تر ہوتا گیا۔ غیر ملکی حکمران رخصت ہو چکے تھے مگر وہ اپنے پیچھے جو انتظامی ڈھانچہ چھوڑ گئے تھے وہ بیحد حساس بھی تھا اور زیرِ زمین پنپنے والے سامراجی مقاصد کا نگہبان بھی۔ اس لئے سیاسی معاشرتی مسائل کی حد تک آزادیٔ اظہار کو جان کے لالے پڑ گئے۔ چنانچہ آزادی کے ابتدائی چند برسوں میں ہی ترقی پسند تحریک کچھ تو سرکاری احتساب و تعزیر کے باعث اور کچھ اپنے فکری تضادات کا شکار ہو کر منتشر ہونے لگی۔ مختلف وجوہ سے تحریکِ پاکستان کے استحکام اور فروغ سے قومی پیمانے پر غفلت اور علم و عمل کے ہر میدان میں مغرب کے مادی نظریات کے فروغ کے باعث نوجوان ذہن قومی اندازِ نظر سے گریزاں رہا۔ ایسے میں جدید شاعری کی روایت میں رسمی شاعری کا بازار گرم رہا۔

اس رسمی شاعری پر چند ذہین نوجوان برہم ہوئے۔ ان نوجوانوں کی برہمی پرانی شاعری کے نظریہ سازوں کو اتنا پیدا آیا کہ وہ اس برہمی کو جائز، مقدس اور اردو شاعری کی ترقی کے لئے از بس ضروری ثابت کرنے کے لئے میدان میں آ گئے۔ ان ادیبوں نے اس برہمی کو ادبی بے راہ روی کی آخری حد تک پہنچا دیا۔ وجہ یہ کہ اوّل تو ان ادیبوں کی تنقید ان کے اپنے فن پر

حاشیہ آرائی تک محدود رہی اور دوم یہ کہ ان سب کا فن ہمارے عہد کی زوال آمادہ قوتوں کا دستگیر ہے۔ ان میں سے ہر نظریہ ساز کے دوسرے سے شدید اختلافات ہیں ہر ایک اپنے ذاتی یا طبقاتی معیاروں سے نئی شاعری کا منشور پیش کرتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ نیا شاعر کبھی ایک کو اپنا امام سمجھتا ہے تو کبھی دوسرے کو اور کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ خود ہی امام بن بیٹھتا ہے ـــــ افتخار جالب کی طرح۔

نیا شاعر جس بحران سے دوچار ہے اسے سمجھنا ایسا مشکل بھی نہیں۔ اس بحران کی جڑیں ہمارے موجودہ تہذیبی بحران میں پوشیدہ ہیں۔ ہمارے تہذیبی سفر کے دوران کئی مرحلے ایسے بھی گزرے ہیں جو موجودہ تہذیبی اور فنی صورتِ حال سے گہری مماثلت رکھتے ہیں۔ مثلاً بیدل سے کر ناسخ بلکہ غالب کی شاعری کے ابتدائی دور تک ہماری تہذیب اور شاعری مسلسل بحران اور زوال کی ایسی ہی صورتِ حال سے دوچار رہی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس عہد میں دوسروں پر اپنی ذہنی اور علمی برتری کا رعب گانٹھنے اور شاعری میں نام پیدا کرنے کے لئے تصوف کا سہارا لیا جاتا تھا اور آج جنس کا، بقول انتظار حسین "آج جنس اتنا ہی سنجیدہ اور مقدس موضوع ہے جتنا جلال الدین رومی کے زمانے میں تصوف تھا" نئے شاعر نے اسی "سنجیدہ و مقدس" موضوع کو خوب خوب برتا ہے چنانچہ عباس اطہر کی جس خوبی پر اس کے مداحوں کو ناز ہے وہ یہ ہے کہ "ان نظموں کا کلیدی استعارہ جنس ہے۔" اور زاہد ڈار کہتا ہے:

لیکن جو ٹھیک پوچھو ـ لڑکی کا خوبصورت
یارو تو آسماں پر ـ ننگا بدن خدا ہے
کوئی خدا نہیں ہے ـ مہمل ہیں ساری باتیں
سارے خدا نہیں ہیں ـ سب گیت اور نظمیں
تیرا خدا جدا ہے ـ سب فلسفے، کتابیں
میرا خدا جدا ہے ـ لفظوں کے سلسلے ہیں
میرے لئے تو یارو ـ لفظوں کے سلسلے ہیں (لفظوں کا سلسلہ)

حقیقت اور عینیت کا ربط ٹوٹ جانے کے بعد زوال زدہ صوفی اور شاعر اگر فہمِ خلائق کو ناقص اور فطرتِ خلائق کو شر گردانتے ہوئے یہ قرار دیتا ہے کہ "عارف دعا میں کوئی تعلق ممکن نہیں"[4] تو آج کا زوال پسند شاعر اور نقاد یہ نعرہ لگاتا ہے: "قاری کو چاہئے الگ ہٹ بیٹھے، ماسوا کا خیال دل سے نکال باہر کیجئے، خود سے ہم آہنگ ہو جایئے، سب کچھ آپ کا ہے۔"[5] اگر اس عہد کا جھوٹا شاعر تمثیل نگاری، خیال بندی اور مناسباتِ لفظی کا کھیل کھیلتا ہے تو آج کا نا شاعر بھی انسانی جذبات سے حقارت برتتے ہوئے خالص کتابی، ذہنی اور عجیب و غریب واردات کو زبان و عروض اور ہیئت و آہنگ کی بازیگری کے ساتھ پیش کر کے خود کو شاعر منوانا چاہتا ہے۔ لیکن ٹھہریئے میں غلط کہہ گیا، منوانے شاعر کا نہیں، نئی شاعری کے نظریہ ساز کا مسئلہ ہے اس گروہ کا ذہین ترین فرد زاہد ڈار کہتا ہے:

اب وہ کہتے ہیں کہ یہ بھی شاعر ـ کوئی ایسا تو نہ کہتا یہ بھی ـــ
ایسی باتوں سے تو بہتر تھی خموشی مجھ کو ـ شرم آتی ہے مجھے (اجنبی)

لیکن نظریہ ساز کو شرم نہیں آتی، فخر محسوس ہوتا ہے۔ وہ زوال زدہ شاعری کے ان پیش پا افتادہ مظاہر کو فرسودگی کی بجائے جدت کا نام دیتا ہے۔ اب سے چند برس پہلے جب مادھو کے فرضی نام سے زاہد ڈار کی چند نظمیں منظر عام پر آئی تھیں تو انتظار حسین خوشی سے چلا اٹھے تھے:

"سرسید احمد خاں کے وقت سے اب تک ہماری جان کو مختلف وبال لگے پہلے مغرب کے وبال تھے، اب مغرب کے راستے مشرق کے وبال سر پر سوار ہیں۔ مادھو کی شاعری کی اچھائی برائی تو دوسرے لوگ پرکھیں، مجھے تو اس میں یہ بات زیادہ کھینچتی ہے کہ پچھلوں کے ہمارے سر پر لادے ہوئے وبالوں کو سر سے اتار دیا ہے۔" (پوچھتے ہیں وہ کہ مادھو کون ہے معلوم ما ت نگی) چند نظمیں لکھ کر غالب کی سی شہرت پانے والے نوجوان کی شاعری کی اچھائی برائی پرکھنے کا وقت آیا تو جیلانی کامران نے انکشاف فرمایا کہ زاہد ڈار کی نظمیں "زندگی، رہائی سے تعلق رکھتی ہیں۔" مزید یہ کہ:

"سیاسی آزادی کے ساتھ فرد نے جس نوع کی رہائی حاصل کی ہے، اس کا اظہار اردو شاعری میں اس تحریک کی نگارشات میں ملتا ہے جس میں سلیم الرحمٰن، افتخار جالب، اختر احسن، عباس اطہر اور دوسرے لکھنے والے شامل ہیں۔ اس رہائی کی اساس انکار پر ہے۔ اور انکار سے مراد روایت کا انکار ہے ـــ میرا مطلب اردو شاعری کی اس روایت سے ہے جو سترھویں صدی عیسوی میں جنوبی ہندوستان کے مغلئی صوبے حیدر آباد میں پیدا ہوئی اور ولی سے ہوتے ہوئے سردار جعفری اور محمد صفدر پر ختم ہوتی ہے (پیش لفظ۔ دروکا شہر)

---

[4] بحوالہ ڈاکٹر خورشید الاسلام   [5] 'نئی نظم شاعر' از افتخار جالب

جہاں تک دلی سے لے کر سردار جعفری تک کی اردو شاعری کی روایات کا تعلق ہے، اسے تو میرا جی، راشد اور سردار جعفری پہلے ہی سے رد کر چکے تھے۔ ہوئے شاعروں کے لئے اردو شاعری کی روایت سے مراد وہ روایت ہے جو نئی چھتیس کے باغیوں نے تشکیل دی۔ یہ روایت اردو کی پرانی شعری روایات کے انکار اور مغرب کی جدید شاعری کی روایات کے اثبات سے وجود میں آئی تھی۔ اس روایت کو مدنظر رکھا جائے تو نیا شاعر انتہائی روائتی اور فرسودہ ہے جتنا وہ بہ زوال قوتوں کا ہم نوا کوئی بھی شاعر ہو سکتا ہے۔ محمد صفدر کا مجموعۂ کلام "درد کے پھول" اس حقیقت کا شاہد ہے۔ جیلانی کامران نے نئی شاعری کی جس تحریک کا ذکر کیا ہے وہ "درد کے پھول" کے بطن سے ہی پیدا ہوئی ہے۔ اختر احسن کا سلسلۂ نظم "کالی پوجا" واضح طور پر صفدر کی "جنگ" اور "دعا" سے مربوط ہے تو زاہد ڈار کی بیشتر نظموں میں صفدر کی کسی نہ کسی نظم کی گونج سنائی دیتی ہے۔ بعض نظموں میں تو مصرعے کے مصرعے موجود ہیں۔ مثلاً محمد صفدر کی نظم "شام" کا مصرع "ہوا ہے عریاں ہوا، تلوار کی مانند چلتی ہے"۔ زاہد ڈار کی نظم "فقط موت مجھے بجاتی ہے" میں یوں جلوہ گر ہے: "پھر ہوا وقت کے ہاتھوں میں ہے تلوار کی مانند رواں"۔ — مگر نظریہ ساز حضرات کہتے ہیں کہ کتاب کا نام تک رکھنے کے لئے CITY OF PAIN سے ماخوذ ہے، حالانکہ "درد کا شہر" کی ترکیب فیض احمد فیض سے مستعار ہے۔ "جو نامہ" اور مجاز کی "آوارہ" میں وہی فرق ہے جو مجاز کے دور کی ذہنی بیداری اور آج کے ذہنی ابتذال میں ہے۔ منیر نیازی کے ہاں صفدر کی "دہشت کی تلوار کے سائے" لرزاں ہیں تو عباس اطہر اور زاہد ڈار وغیرہم کے ہاں صفدر کی "بھوکی راتوں کی خاموشی" وردِ حیری ہے۔ بقول ڈاکٹر اجمل "روحانی زندگی کی خانہ بدوشی اور تیرہ و تار دشت نوردی میں مرکز اور روشنی کی جستجو کے لئے صفدر نے دیو مالا سے مدد لینی شروع کی تھی۔ نیا شاعر بھی یہی نسخہ آزماتا ہے مگر تخلیقی طور پر نہیں تقلیدی طور پر۔ وہ وزیر آغا کے نئے شاعروں جن کے ہاں دیو مالا کا تعلق "فرد کے اس نسلی ورثہ سے ہے جو مذہب کی بجائے ثقافت سے وابستہ ہے" یا سلیم الرحمٰن یا اختر احسن جیسے لوگ ہوں جن کے ہاں مذہبی اور تہذیبی حوالہ جات کی بجائے صرف اور خالص انسانی حوالے ہوں، سب صفدر کی معنوی اولاد ہے مگر ذرا بگڑی ہوئی۔ بگڑی ہوئی اس لئے کہ صفدر کا ذہنی نشوونما صحیح سمت میں جاری رہا ہے اور اب ستمبر ۶۵ء کے بعد تو وہ بالکل نیا شخص اور شاعر نظر آتا ہے۔ مگر نئی شاعری کی یہ تحریک راشد، میرا جی اور صفدر کی لکیر کو روائتی طور پر پیٹتے ہوئے مغرب کی زوال پسند شاعری کے چربے اتارتے اتارتے ناشاعری کے صحرا میں غولِ بیابانی کے مانند سرگرداں ہو گئی۔

مغرب کے شاعر پر "خالص شاعری" کا رجحان جب ایک خبط کی طرح مسلط ہو گیا تھا تو وہاں کا شاعر ملارمے کے بقول جادوگر بن گیا تھا یا ایلن پو کی طرح عالمِ خواب و خیال میں ہی بسنے لگا تھا اور اس خالص نوعیت کی "جلا وطنوں کی سی شاعری کی تخلیق کا جویا ہوا تھا جو تنِ تنہا، اپنی ذات سے اور اپنی خاطر زندہ رہ سکے"۔ مذکورہ بالا تحریک کے شاعر بھی یہی کچھ کر رہے ہیں۔

فرانس کے رومانی شاعروں نے لوگوں کو متحیر و مرعوب کرنے کے لئے عروض کے قواعد توڑے تھے تو یہ لسانی تشکیلات میں مصروف ہیں۔ ان لوگوں نے انسان کے سماجی تصور کی نفی میں علامت نگاری کو موسیقی جیسے تاثرات پیدا کرنے کا وسیلہ بنا دیا تھا۔ یہ لوگ بھی کہتے ہیں "یہ کھیل لفظوں کا یہ کھیل جنت بخشے یا جہنم واصل کرے، اب تو بتیاں کھیلیں آشیاں نہیں"۔ — یہ افتخار جالب ہیں جو زبان کے مکمل افتخار سے "خوف زدہ" نہیں بلکہ "کھاگھی اور رنگا رنگی" کی خاطر "اپنے گرد و پیش سے متخاطب ہوتے وقت گنجلک لسانی رابطے" کام میں لاتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ:

روائتی اسلوبِ[1] زیست کی بنیادیں وقت نے ہم سے چھین لی ہیں۔ سیاسی، سماجی اور علمی مسائل نے ہمارے اعتقادات ہلا ڈالے ہیں" اس لئے روائتی زبان ہمارے کام نہیں آ سکتی لہٰذا نئے شاعر کا سب سے بڑا فریضہ ہے: "نام نہاد[2] لسانی حرمتوں کو چیلنج کرنا، قواعد والوں کو دعوتِ یلغار دینا" اس صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کی دو راہیں ہیں: "اولاً یہ کہ سکہ[3] بند زبان سے اجتناب کیا جائے۔ ثانیاً یہ کہ سکہ بند زبان پر تشدد کیا جائے"۔ مقصد اس جہاد کا یہ ہے کہ اردو میں "ولیم ماکفر جیسے بے شمار[4] شعر ستوں پر مشتمل قواعد سے منحرف، البا اوقات غیر مربوط اقتباس وغیرہ اس قسم کا ابہام رکھنے والے، جزئیات سے پُر، ضروری و غیر ضروری تفصیلات سے بھرے پُرے طوالانی جملے" لکھے جا سکیں۔ فائدہ ان جملوں کا یہ ہے کہ "فاش غلطیوں[5] کے باوجود یہ اسلوب بہ حیثیت مجموعی غیر معمولی طور پر کامیاب ہے۔ قاری جملوں کے بہاؤ میں ڈوبتا ہے ابھرتا ہے کہ ڈوب جاتا ہے" اس اندازِ نظر کو افتخار جالب شعور کی نئی میکینکس کا کرشمہ بتلاتے ہیں۔ اس میکینکس کی ضرورت اتنی ہی نئی ہے جتنا ن۔ م۔ راشد کی "ایران میں اجنبی" کا دیباچہ۔ راشد نے بھی جدید شاعری کے لئے نئے آہنگ کی تلاش کا جواز یہی پیش کیا ہے کہ روائتی اسلوبِ زیست کی بنیادیں ہم سے چھن چکی ہیں۔ راشد اور نئے شاعر میں فرق یہ ہے کہ راشد شاعری کو محض لفظوں کا کھیل نہیں سمجھتے اور ان کے نزدیک اظہار اور ابلاغ دونوں شاعر کے اہم فریضے ہیں جبکہ نیا شاعر ابلاغ کو اپنا دردِ سر نہیں سمجھتا۔ راشد جیسے باغی شاعر نے "ماورا" کی اشاعت پر لکھا تھا:

"اگر ان نظموں میں آپ کو کسی تخلیقی جوہر کی معمولی سی چمک، کسی قوت کا ادنیٰ سا شائبہ، کسی نئے احساس کی ہلکی سی جنبش نہ ملے تو انہیں قطعی طور پر رد کر دیجئے کیونکہ اجتہاد کا جواز صرف یہ نہیں کہ اس سے کس حد تک قدیم اصولوں کی تخریب عمل میں آتی بلکہ یہ کہ آیا تعمیری ادب اس میں سے کسی نئی صبح کی طرح نمودار ہوتا ہے یا نہیں؟ اگر یہ نہ ہو تو اجتہاد بے کار ہے۔ اجتہاد کا جواز صرف وہ خیالات و افکار ہی پیش کرتے ہیں جن کی خاطر یہ نیا راستہ اختیار کیا گیا ہو۔"

---

[1] [2] [3] ماخذ [4] [5] اوراق

میراجی نے اپنی نظم "میں" کے دیباچے میں کہا تھا:

"خیال ہی میری نظر میں بنیادی شے ہے، اس میں اگر کوئی نئی بات نہیں، اس میں اگر کچھ دو قدم آگے بڑھنے کی صلاحیت نہیں تو اظہار کی کوشش بے مصرف اور بیکار ہے۔"

بعض لوگ نئی شاعری کے سلسلے میں عہد کے عظیم مسائل کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ مثلاً محمد صفدر کہتے ہیں:

"ہمارا زمانہ ایک عظیم انقلاب کا زمانہ ہے۔ روح کائنات ایک ہمہ گیر تشنج اور دیوانگی کے عمل سے گذر رہی ہے۔ جدید تر شاعر اس عمل سے اپنا رشتہ لاشعور کے ذریعے ہی جوڑ سکتا ہے۔"

یا انور احسن اپنی شاعری پر بحث کرتے ہوئے مغرب کی ادبی فضا کے حوالے سے رقمطراز ہیں:

"البیر کامو نے کہا تھا ہر چیز بے معنی ہے۔ یہ سب چیزیں، میرا استدلال، میرا ذہن، خود میں، ہر چیز بے معنی، لایعنی اور فضول ہے۔ چنانچہ اتنی ڈھیروں فضولیت کے پیشِ نظر مجھ جیسے ایک باضمیر انسان کو خود کشی کر لینی چاہیے۔ لایعنیت کے اس طوفانِ بدتمیزی میں جب خود انسان سے ہر لحظہ انسانیت رخصت ہوتی ہو تو میری پناہ کہاں ہے؟"

یہ باتیں بھی دراصل فکر سے فرار اور تہذیبی خود کشی کے لئے بے راہ روی کی ضرورت پر ہی زور دیتی ہیں اور اس پر مجھے غالب یاد آتے ہیں اور یہ پتہ چلتا ہے کہ ہر زمانہ ایک عظیم انقلاب، ہمہ گیر تشنج اور دیوانگی کے عالم سے گذر رہا ہے ؎

بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق — بے کسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں
ہرزہ ہے نغمۂ زیر و بمِ ہستی و عدم — لغو ہے آئینۂ فرقِ جنون و تمکیں
لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم — دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے، چہ دنیا و چہ دیں

لیکن "نقشِ فریادی" لکھتے وقت بھی نئے شاعر کا خامہ ہذیاں تحریر غالب کی بجائے کامو کی طرف دیکھتا ہے۔ راشد اور میراجی کے زمانے میں ہم میں ابھی غالب کی طرف دیکھنے کی سکت باقی تھی۔ اب نہیں، اس لئے نیا شاعر ابلاغ کو شاعری کے "حقیقی منصب" کے خلاف سمجھتا ہے۔

نئے شاعر نے شاعری کا یہ حقیقی منصب حال ہی میں دریافت کیا ہے ورنہ ۱۹۵۷ء تک تو افتخار جالب "نیا سال" اور جیلانی کامران "مقبوضہ کشمیر" جیسی نظمیں کہہ رہے تھے۔ اسی سال جیلانی کامران ایڈنبرا گئے۔ وہاں جا کر پتہ چلا کہ اردو نظموں کا ترجمہ اہلِ یورپ کو متاثر نہیں کرتا۔ تب صوفی عبد القدیر نیاز کے تراجم کے حوالے سے یہ سوال پیدا ہوا کہ:

"اردو نظم کی شاعرات ایسی کیوں ہے کہ باوجود اپنی خوبیوں کے وہ پڑھنے والے کو مکمل طور پر چونکا دینے سے قاصر ہے۔"

اب جواب ملاحظہ فرمایئے:

"اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہماری زبان اپنے معانی کھو چکی ہے۔ "نادرا" سے ہماری شاعری کا تجرباتی دور شروع ہوا جو زبان استعمال کی گئی وہ پرانی شعری زبان سے کسی طرح مختلف نہ تھی۔ پچھلے بیس سالوں میں شاعری کی توجہ زبان کی بجائے مضمون پر تھی۔ آج کے شاعر کی ذمہ داری زیادہ ہے۔ اس کے مسائل پچھلی نسل کے مسائل سے کہیں زیادہ پیچیدہ اور اہم ہیں۔ ہماری شاعری کا مزاج شعر العجم کا مزاج رہا ہے۔ لسانی بنیادیں عجمی علم الشعر پر قائم تھیں۔"

چنانچہ جیلانی کامران نے انگریزی علم الشعر سے اکتساب آج کے شاعر کی ذمہ داری ٹھہرایا۔ نتیجہ یہ کہ:

"نقشِ کف پا کی اگر کوئی قیمت ہے تو وہ یورپی شعری روایت کے حوالے سے جانچی جا سکتی ہے اور یورپی علم الشعر کے معیاروں کے بغیر نقشِ کفِ پا کو اچھالنا ایک طرح کی بے انصافی ہوگی۔"

دلچسپ بات یہ ہے کہ اسی نئی شاعری اور نئی لسانی تشکیلات کی حمایت میں افتخار جالب، محمد حسین آزاد کی کتاب "فلسفۂ الٰہیات" پیش کرتے ہیں جس میں "زبان ریزہ ریزہ ہے۔ موضوع پر گرفت نہیں۔ جملوں کا آپس میں ربط نہیں۔ خالص بے ترتیبی اور انتشار کا عالم ہے۔" قطع نظر اس سے کہ محمد حسین آزاد اور ان کا عہد جس آشوب سے گذرے، اقبال کا زمانہ ان سے کم پُر آشوب نہ تھا اور اقبال روحانی زبان کو خیرو خوبی اور تخلیقی طور پر استعمال کرتے ہیں۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ محمد حسین آزاد نے مذکورہ کتاب عالمِ دیوانگی میں لکھی تھی اور نئی شاعری میں دیوانگی کی کیفیات وافر ہیں۔ اس دیوانگی کا تعلق ہمارے موجودہ تہذیبی بحران سے ہے جسے آزادی کے بعد سے اب تک کی نفسا نفسی، اعلیٰ انسانی اقدار کی پامالی اور بے سمت اجتماعی زندگی کے بنجر پن نے جنم دیا ہے۔ دیوانگی کی کیفیات کے بیان میں جہاں تشدد و تشنج اور رکاکت و ابتذال نہیں ہے وہاں آج کے نوجوان کی فکری اور روحانی تنہائی کا عکس صاف نظر آ رہا ہے۔ یہ حقیقت کس قدر المناک ہے کہ معاشرے میں ریاکاری، بزدلی اور ظلم کے نت نئے مظاہر دیکھ کر ہمارے ذہین ترین نوجوان انسانی اور اخلاقی رشتوں سے ہی منحرف ہو گئے ہیں اور انہوں نے قومی مسائل سے لاتعلقی کو اپنی برتری کے اظہار کا ذریعہ بنا لیا ہے۔ یہ بھی نہیں کہ ان میں سیاسی اور تہذیبی شعور کی کمی یا خامی ہو۔

ہم ہیں انسان، ہمارے دم سے — پھول کھلتے ہیں، ثمر پھلتے ہیں — ایشیا عقل کی، افریقہ توانائی کی، یورپ دھن کی
آدمی آج بھی آزاد، ہمارے دم سے — بھید کھلتے ہیں ہمارے — بھیک (سب جانتے ہیں) مانگتے ہیں
شہر آباد، ہمارے دم سے — ہم سے — وقت کی بات ہے ہم اس کو خدا مانتے ہیں (امریکہ کا خدا — از — زاہد ڈار)

[1] "جیسے ماہ روی کی ضرورت"

اس مختصر سی نظم میں جو جہانِ معنی آباد ہے اس کی وسعت کا اندازہ کیجیے، شاعر کے گہرے طنز بھرے لہجے کی کاٹ پہچانیے اور پھر اختر احسن کی نظم ملاحظہ کیجیے۔

مری شاعری — پھٹی آنکھ میں — لرزتے بدن پر
وقت کے ڈھول کی گھن گرج پر — نیلے آکاش کے ان گنت گھونسلے ہیں — خوف کے خوبصورت پسینے
خون میں ناچتی لاش ہے — دہن سے نکلتی ہوئی آگ — لٹکتی زباں
کٹی رگ میں رہ رہ کے بجتے ہوئے وقت کی گھنٹیاں — رنگین پھولوں کی جھالر — آنے والے معانی کا کچا بدن ہے۔

عالمی حالات کے پس منظر میں ایسی عمدہ، معنی خیز اور نادر نظمیں پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ کاش یہ نوجوان اپنے اردگرد بسنے والوں کے رنج و راحت میں بھی مثبت طور پر شریک ہو سکتے۔ اجتماعی تناظر سے بالکل کٹ کر غیر سماجی داخلیت پسندی اور شدید ہیئت پرستی کا شکار نہ ہوتے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہماری تہذیبی اور شعری روایات کی تخریب پر یوں کمربستہ نہ ہوتے۔

جہاں تک شعری روایات کی تخریب کا تعلق ہے، اس کی توجیہ اس حد تک تعبیری ہے کہ برسن چھتیس کی مغرب پسند نسل کی روایات کے امکانات کو کھنگالنے اور ان کے منطقی ارتقاء کا عمل ہے۔ اس عمل کے دوران نئے شاعر میں ان روایات کے تجربوں پر برگشتگی بڑھ رہی ہے۔ نئے لسانی رابطوں اور پیکروں کی تلاش اور سکہ بند زبان پر تشدد اس امر کا غماز ہے کہ نیا شاعر اردو شاعری کی کلاسیکی روایات کے علاوہ مغرب کی شعری اور تہذیبی روایات سے مایوس ہو کر علاقائی تہذیبی اور شعری روایات سے اکتسابِ فیض کا جویا ہے۔ قومی زندگی میں کسی اجتماعی نصب العین کے لیے جینے مرنے کی تڑپ پیدا ہوتے ہی یہی نا شاعر ایک نئی شعری روایت کے پودے کو پروان چڑھانے میں کھاد کا کام دے گی۔ یہ نئی شعری روایت اردو کی کلاسیکی شعری روایت، جدید مغربی شاعری کی روایت اور علاقائی شاعری کی روایات کے قیمتی عناصر سے مل کر صورت پذیر ہو گی۔ مگر مسئلہ تو یہی ہے کہ افراد اور طبقوں کی موجودہ جنگِ زرگری میں اجتماعی نصب العین اور اس کے لیے تڑپ پیدا کون کرے؟

وہ بیداری کیسے آئے — خود اپنا مستقبل دیکھیں — ہستی کا محور ٹھہرا
جب ساری بیدار نگاہیں — درد سے پہلے درد کا اپنے حاصل دیکھیں — زادِ سفر زر کا مشیت
مستقبل کے آئینے میں سب سے پہلے — اپنی اپنی ذات کا پیکر — منزل ـــ اپنا گھر ٹھہرا (زرکار مشیت ـ صلاح الدین محمود)

نئے شاعر کی ہستی کا محور بھی اس کی اپنی ذات ہے اور وہ انکشافِ ذات کے لیے علامتی شاعری کی وہ روش اپنا نا پسند کرتا ہے جو فرانس کے زوال پسندوں کو مرغوب رہی ہے۔ نظریہ سازوں کی داد و تحسین اس عمل پر تیل کا کام کرتی ہے۔ ہاں ایک ڈاکٹر وزیر آغا ہیں جنہوں نے اس رجحان کی مذمت میں زورِ قلم صرف کرتے ہوئے علامتوں کے استعمال میں آزاد تلازمۂ خیال کی بجائے تخلیقی عمل و ربط کی اہمیت واضح کی ہے۔ وزیر آغا کے ہاں ادب کا مقصد "گزرتے لمحے سے مسرت کا رس نچوڑنے اور زندگی کے حسین لمحوں سے محظوظ ہونے" تک محدود ہے۔ وہ اپنی مخصوص افتادِ طبع کے تحت کہتے ہیں:

> "میں ذاتی طور پر بڑے بڑے موضوعات کو نظم میں ڈھالنے کے خلاف ہوں۔ ایک تو اس لیے کہ ان موضوعات پر لکھتے وقت شاعر اپنی ذات کے خول سے باہر نکل آتا ہے اور اس کی ذات اور تخلیق کا ربط باہم برقرار رکھنے پر مجبور ہوتا ہے جو شعر کے لیے از بس ضروری ہے۔ آج نظم کا سارا تصور بدل گیا ہے۔ اب کسی خاص موضوع کو سامنے رکھ کر یا کسی نظریے کی تبلیغ کے پیشِ نظر نظم لکھنا مستحسن خیال نہیں کیا جاتا۔ اس لیے کہ ایک شعوری کاوش کے تحت شعر کی خود روانی کو ضرر پہنچتا ہے۔ اب نظم ایسے مقام پر آ پہنچی ہے جو دراصل نظم کی تخلیق کا مقام ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں شاعر اپنی ذات کے کنجِ خلوت میں غوطہ لگاتا ہے اور احساس و عرفان کی نازک ترین کیفیات کو گرفت میں لینے کی کوشش کرتا ہے۔" (سیپ نمبر ۹)

شعر اور شعور کی دشمنی اور نظم کی معطر تنہائی کے ان معیاروں کے سہارے وزیر آغا نے انکشافِ ذات کے سلسلے میں علامتوں کے صحت مند استعمال اور علامتی شاعری پر عملی تنقید کی خوبصورت مثالیں پیش کی ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ جنگل جیسی علامتوں کو نوعِ انسان کے بچپنے کی طرف مراجعت کی خواہش اور دیو مالائی اشاروں کو مشترکہ نسلی ورثے کی بازیافت کی تمنا قرار دے کر دھرتی پوجا کے رجحان میں جاگیردارانہ نشاط محسوس کرتے ہیں۔ ذاتی طور پر مجھے یہ رویہ اقبال کی نظم کے اس تبلیغی رویے سے زیادہ تبلیغی اور منفی نظر آتا ہے جسے وزیر آغا منفی قرار دیتے ہوئے نئے شاعر کو خبردار کرتے ہیں۔

وزیر آغا کی شاعری اور تنقید کے زیرِ اثر دھرتی پوجا کا رجحان، تہذیبِ انسانی کے ارتقاء کی نفی اور ہماری قومی تہذیب کی صورت مسخ کرنے کا باعث بن رہا ہے، چنانچہ اعجاز فاروقی اس بات سے انکار کرتے ہیں کہ ہمارے آباؤ اجداد نے اس سرزمین کو علم و دانش کا نور بخشا تھا۔

وہ لوگ آئے — دل تھے منجمد خوں
تو ان کے سر میں عقاب تھے — انہیں پہاڑوں کی ندیوں نے وہ ان کی آنکھوں کا خون دھویا
جسم ننگ تھے — اسی زمیں نے انہیں حسین چاندنی عطا کی — (تاریخ کا پہلا باب)

ہمیں اس طرح کے خیالات پر تو کوئی اعتراض نہیں کیونکہ ہمارے ہاں اعجاز فاروقی ہی نہیں غالب احمد بھی موجود ہیں اور دھرتی پوجا کے یہ دو تصورات متصادم ہیں۔

(بقیہ بر صفحہ ۲۴۹)

قاضی عبدالقادر

شعری تجربہ - اشاریت اور معنویت

شعری تجربے کے تصور کی جو تحلیل میں نے کی تھی[۱] اس کی صحت تسلیم کرنے کے بعد ہمارے شعری ادب کی حیثیت اور حقیقت کے بارے میں بعض گوشوں میں تشویش پیدا ہوتی ہے۔ سوال یہ کیا گیا ہے کہ اگر یہ تحلیل صحیح ہے تو شعر، نظم اور غزل کی کیا صورت ہوگی؟ لیکن ان وسوسوں اور سوالوں کے پیدا ہونے کا مسئلہ ہی نہ ہوتا اگر ہمارا بنیادی سوال ـــ شعری تجربہ اصول ہے یا واقعہ؟ ـــ قاری کے ذہن میں ہوتا یا اس سوال کے معنی و مفہوم کو پیشِ نظر رکھا گیا ہوتا۔

میں نے اس تصور سے آغاز کیا تھا اور کل تحلیل اس چیز کی تھی کہ ہماری گفتگو میں جو شعری تجربہ یا شاعرانہ تجربہ جیسی اصطلاحات آتی رہی ہیں ان سے کہنے والا کیا مراد لیتا ہے۔ اگر یہ اصطلاحات بے معنی نہیں اور بامعنی ہیں تو ان معنی کا تعین ان الفاظ سے جدا کسی واقعہ، وقوعہ یا عمل سے ہو رہا ہے؟ بہر حال واضح ہے کہ ایک لفظ کے کان میں پڑتے ہی اس کے معنی و مفہوم کا علم نہیں ہو جاتا اور اس سے بھی کسی کو انکار نہیں ہوگا کہ روزانہ کام میں آنے والے الفاظ میں سے بہت سے ایسے ہیں جن کے صحیح معنی سے ہم واقف نہیں مثلاً صداقت اور حسن وغیرہ۔ دور کیوں جائیے خود لفظ "میں" کے بارے میں سوال ہو سکتا ہے کہ یہ لفظ کس کے لئے، کن صفات کے لئے یا کن حقائق اور کیفیات کے لئے استعمال ہوتا ہے یا ہونا چاہیے۔

میں نے جب "شعری تجربہ" کے بارے میں سوال کیا تھا تو اس اہم تصور کے معنی و مفہوم کے تعین کے خیال سے کیا تھا۔ اس تصور کی تحلیل کی تھی اور متبادل معنی سامنے لا کر یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ اس تصور کے معنی کی یہ ساری صورتیں متناقض ہیں لہٰذا انہیں تسلیم نہیں کیا جا سکتا لیکن مسئلہ یہاں ختم نہیں ہو جاتا۔ ہمیں یہ بھی دریافت کرنا ہوگا کہ یہ متناقضات پیدا کیوں ہوتے ہیں؟ زبان مشتمل ہوتی ہے الفاظ پر اور مسئلہ ہے الفاظ کے معنی کا۔ خطا کس کی ہے؟ زبان کی یا معنی کی؟ اس سوال کے جواب میں ہمیں ایک طرف تو یہ بتانا ہوگا کہ زبان کیا ہے اور دوسری طرف "معنی" کے معنی و مفہوم کا تعین کرنا ہوگا۔ غرض کل بحث دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ (۱) زبان اور اشاریت میں اور (۲) معنی میں۔

زبان اور اشاریت

زبان علامتوں کا نظام اور انہیں برتنے کا وظیفہ ہے۔ علامت ہر وہ شے، وقوعہ یا نشان ہے جسے اپنے سوا کسی اور شے، وقوعہ یا خیال یا عمل سے نسبت ہو اور اس کی طرف توجہ دلاتی ہو۔ مثال کے طور پر "مشرق کی گھٹا" اس بات کی علامت ہے کہ کھل کر بارش ہوگی۔ "سردی دے کر بخار آنا" ملیریا کی علامت ہے۔ علامتیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک فطری اور دوسری مصنوعی۔ ـــ "مشرق کی گھٹا" کھل کر بارش آنے کی فطری علامت ہے۔ اسی طرح "سردی دے کر بخار آنا" ملیریا کی فطری علامت ہے کیونکہ علامت اور اس کے "منسوب" کے درمیان اس تعلق کو ہم نے قائم نہیں کیا ـــ یہ تعلق فطری ہے۔

---

[۱] "شعری تجربہ ـــ ایک فلسفیانہ تحلیل" ـــ فنون جنوری ۶۷ء۔

ہم نے زیادہ سے زیادہ یہ کیا کہ اس تعلق اور نسبت کو دریافت کر لیا۔

لیکن علامتیں، جیسا کہ اوپر ذکر کیا ہے، مصنوعی بھی ہوتی ہیں۔ یہاں ہم علامت اور اس کے منسوب کے درمیان تعلق قائم کرتے ہیں۔ ہم علامتیں وضع کرتے ہیں اور بناتے ہیں یا فیصلہ کرتے ہیں کہ ان کا منسوب کون ہے۔ انہیں کہاں کہاں اور کن کن صورت حالات میں استعمال کرنا چاہیے۔ مثال کے طور پر ملک کی کسی عظیم شخصیت کی موت پر قومی پرچم کا سرنگوں کرنا اس بات کا اشارہ ہے کہ قوم سوگوار ہے اور یہ ایک مصنوعی، ہماری وضع کردہ "علامت" ہے۔[1] سوگواری کے اظہار کے لئے قومی پرچم کو سرنگوں کرنے کے بجائے دوسرے طریقے بھی ہو سکتے ہیں اور دوسری "علامتیں" بھی ہو سکتی ہیں۔ مثلاً سیاہ کپڑے پہنے جائیں، صرف بائیں آستین پر سیاہ کپڑا لپیٹ لیا جائے، چار آبروؤں کا صفایا کرا دیا جائے وغیرہ۔ اب وہ ساری علامتیں جو فطری نہیں ہیں، بلکہ ہماری وضع کردہ اور مصنوعی ہیں "اشارہ" کہلائیں گی۔

لفظ اشارہ نیا نہیں۔ ادب کے طالب علم، اشاریت اور اشاری اظہار کی اصطلاحات استعمال کرتے ہی ہیں۔ ہم آئے دن کسی نہ کسی شاعر کا ذکر سنتے ہیں جس کی شاعری کو، اشاری، بتایا جاتا ہے۔ نقادانِ فن کے خیال میں ایسے شاعر کے کلام کو روایتی معنی پہنانا مضمون کا خون کرنا ہے۔ ان کے مطابق یہ شاعر الفاظ کو روایت سے ہٹ کر استعمال کرتا ہے اور روایتی تراکیب اور بندشوں کو وہ چند دوسری باتوں کے اظہار کے لئے بطور ذریعہ استعمال کرتا ہے۔ ہم یہ کہیں گے کہ یہ شاعر ایک نئی روایت کی بنا ڈال رہا ہے۔ بعض مثالوں میں نئی روایت کو قبولیتِ عام حاصل ہو جاتی ہے اور زبان کو اظہار کے نئے اسالیب مل جاتے ہیں اور بعض صورتوں میں ایسا نہیں ہوتا۔ پہلی صورت کی مثال فیض اور اُن کا کلام ہے۔ بہرحال فیض نے اردو شاعری کو نئی اشاریت دی ہے اور اسے لوگوں نے قبول بھی کیا ہے۔

شکسپیئر کے المیہ کھیلوں میں فوق الفطری کی اہمیت اشاری ہوتی ہے۔ اسی طرح، جیسا کہ ہم کہہ آئے ہیں "قومی پرچم کا سرنگوں ہونا" اشاری اہمیت رکھتا ہے۔ زبان جو ہم بولتے اور لکھتے ہیں اشاری ہے۔ الفاظ جو ضبطِ تحریر میں لاتے ہیں یا زبان سے ادا ہوتے ہیں ان کی نوعیت بھی اشاری ہوتی ہے۔ اب وہ الفاظ جو زبان سے ادا ہوں "صوتی اشارے" ہیں اور وہ جو تحریر میں آئیں "غیر صوتی اشارے" کہلائیں گے۔ تحریر و تقریر میں استعمال ہونے والے اشارے "مصنوعی یا روایتی علامت" کہے جائیں گے۔ گویا اشارہ اور "روایتی یا مصنوعی علامت" مساوی تصورات ہیں اور ایک دوسرے کے مترادف ہیں۔

زبان کے تحریر و تقریر میں لائے جانے والے الفاظ اشارے یا مصنوعی علامتیں ہیں جہاں ہم آوازوں اور نشانات کو ایک خاص معنی دیتے اور انہیں مخصوص انداز سے استعمال کرنے کی روایت ڈالتے ہیں۔ زبان گویا مصنوعی اور روایتی ہوتی ہے۔ معاشرتی ضروریات اور سہولت کے پیشِ نظر ہم ایک سے زیادہ زبانیں بنا سکتے ہیں۔ مثلاً سڑک پر آمد و رفت کی سہولت اور حادثوں سے محفوظ رکھنے کے لئے جگہ جگہ "روڈ سائن" نظر آتے ہیں۔ ٹریفک کی سرخ، سبز اور زرد روشنیاں شہر کے حسن میں اضافہ کے لئے چوراہوں پر نہیں لگائی جاتیں۔ ان کی اہمیت "اشاری" ہے۔ وہ بتاتی ہیں کہ کب آپ سڑک پار کریں اور کب نہ کریں۔

اس گفتگو سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ زبان سماج آفریدہ ہے۔ افرادِ سماج اپنی بہت سی ضروریات سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اشارات وضع

---

[1] اردو میں عام طور پر لفظ اشارہ اور علامت کو ہم معنی استعمال کیا جاتا ہے۔ میں نے جسارت کر کے ان کے معنی کی تجدید کی کوشش کی ہے اور روشِ عام سے ہٹتے ہوئے انگریزی لفظ sign کے لئے علامت اور سمبل کے لئے "اشارہ" اختیار کیا ہے۔ مزید تفصیل کے لئے، جدید اشاری منطق پر میری کتاب "تعارف منطق جدید" شائع کردہ جامعہ کراچی ۱۹۶۵ء ملاحظہ ہو۔

کرتے ہیں اور انہیں مختلف اعمال یا افعال سے وابستہ کر دیتے ہیں۔ ان سے مختلف کام لیتے ہیں۔ مصیبت پڑنے پر دوسروں کی مدد طلب کرنے کیلئے وہ خاص آوازیں نکالتے ہیں۔ زور زور سے ڈھول پیٹتے ہیں یا دھوئیں کے ذریعے پیغام رسانی کرتے ہیں۔ زبان گویا نہ صرف سماج آفریدہ ہے اور ایک سماجی صنعت ہے بلکہ دوسری مصنوعات کی طرح اس کی حیثیت عملی، افادی اور وظائفی ہے۔ وہ ایک سماجی آلہ ہے اور اس کی حقیقت اس کار آوری میں مضمر ہے جس کے لئے وہ وضع کی گئی ہے۔

اشارہ اور معنی

اشارات کی اسی عملیت، کار آوری اور وظائفیت سے اشارات، با معنی بنتے ہیں۔ کسی لفظ کے معنی کے بارے میں سوال کرنا دراصل اس کی عملیت، کار آوری اور اس کے وظیفہ کے بارے میں دریافت کرنا ہے۔ یہ پوچھنا کہ فلاں لفظ کے معنی کیا ہیں دراصل اس لفظ کا استعمال معلوم کرنا ہے۔ جب ہم نے سوال اٹھایا تھا کہ "شعری تجربہ کیا ہے" تو ہم نے یہی جاننا چاہا تھا۔ کیا شعری تجربہ کسی نفسیاتی یا طبعی یا عضویاتی وقوعہ کا نام ہے؟ جس طرح ناشگا پربت ایک ارضی طبعی وقوعہ کا نام ہے؟ اگر شعری تجربہ کسی نفسیاتی یا طبعی وقوعہ کا نام نہیں تو پھر کیا ہے؟ اس لفظ کی افادیت کیا ہے اور اسے کہاں کہاں استعمال کیا جا سکتا ہے۔

لیکن شعری تجربے کے معنی کا تعین یا اس کی توجیہ اس وقت نسبتاً آسان ہو جائے گی جب ہم پہلے یہ سمجھ لیں کہ اس سوال کے لئے کس قسم کے جواب کی توقع کی جا رہی ہے اور اس مسئلہ کا کیسا حل تلاش کیا جا رہا ہے۔ بالفاظ دیگر شعری تجربے کے معنی کے بارے میں جواب اسی وقت قابل فہم ہوگا جبکہ پہلے ہم خود معنی کے مفہوم سے واقف ہو جائیں۔ اور مسئلہ کا یہی دشوار گذار پہلو ہے۔ معنی کے بارے میں گفتگو دراصل "نظریہ معنی و مفہوم" دینا ہے اور ہم اب اسی چیز سے بحث کریں گے۔

نظریہ معنی

یہ تو ہم جانتے ہی ہیں کہ الفاظ بامعنی بھی ہوتے ہیں اور بے معنی بھی۔ ایک ہی زبان کے دو لفظ ہم معنی بھی ہو سکتے ہیں اور دو مختلف زبانوں کے بہت سے الفاظ آپس میں ہم معنی ہو سکتے ہیں مثلاً اردو اور بنگلہ میں آنا۔ آوا، جانا۔ جاوا، بیٹھنا۔ بوشا، قریب۔ کاچھے ہم معنی الفاظ ہیں لیکن بنگلہ لفظ کاچھے کا مطلب اس وقت تک سمجھ میں نہیں آسکتا جب تک کہ اردو لفظ قریب یا نزدیک کے معنی سے واقفیت نہ ہو۔ قریب یا نزدیک ایسے الفاظ ہیں جن کے معنی ہم جاننا چاہتے ہیں۔ اسی طرح 'معنی' ایک لفظ ہے اور اس کے معنی و مفہوم کے بارے میں دریافت کیا جا سکتا ہے بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ الفاظ کے معنی کے تعین سے پہلے لفظ معنی کی تعریف و تحدید ہونی چاہیے۔ کیونکہ 'معنی' کے صحیح تصور کے آنے کے بعد ہی دوسرے الفاظ کی صحیح تحدید ممکن ہوگی۔

لیکن یہاں یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ آج تک تو کسی نے یہ سوال اٹھایا نہیں۔ آج کیوں اٹھایا جا رہا ہے۔ ہماری رائے میں یہ ایک احمقانہ اعتراض ہوگا۔ اول تو اس قسم کے مسائل سقراط کے عہد سے زیر بحث رہے ہیں اور عصر حاضر کی علمی مباحث میں یہ مسئلہ مرکزی حیثیت حاصل کئے ہوئے ہے، لیکن ثانیاً ایک سوال بہر حال سوال رہیگا خواہ آج تک کسی نے اسے نہ اٹھایا ہو۔ یوں بہت سے مسئلے ایک خاص ذہنی عمر تک مسئلے معلوم ہی نہیں ہوتے، جبکہ غور و فکر کی اعلیٰ منزل پر وہ نہایت اہم ہو جاتے ہیں۔ جس طرح ایک بچہ بھی یہ پوچھ سکتا ہے کہ انعام میں ملی ہوئی اٹھنی سے وہ کیا کیا خرید سکتا ہے، لیکن اس سوال کا جواب ایک معاشیات کا طالب علم ہی دے سکے گا کہ "زر کی قوت خرید سے کیا مراد ہے" معنی کے بارے میں گفتگو بھی اسی نوعیت کی ہے۔ اس سلسلے میں کم و بیش دو نظریے سامنے آتے ہیں۔

۱۔ معنی کے ایک نظریہ کو شبیہی یا تصویری نظریہ کہا جا سکتا ہے۔ اس کے مطابق لفظ ایک تصویر ہے اور وہ جس کی تصویر لفظ ہے یا جس

کی اس طرح تصویر کشی ہو رہی ہے لفظ کے معنی ہیں۔ جملے الفاظ سے بنتے ہیں لہٰذا وہ بھی تصویریں ہوں گے لیکن یہ لفظ کی بہ نسبت زیادہ مکمل یا پیچیدہ تصویر ہوں گے۔ اب تصویر کی خوبی یہ ہے کہ اجزائے تصویر اور معروض تصویر کے ہر عنصر کے مابین مطابقت پائی جائے۔ فرض کیجیے کہ ایک تصویر میں ایک منظر دکھایا گیا ہے۔ منظر میں درخت ہیں، پہاڑ ہیں، چند جھونپڑیاں اور دریا ہے۔ یہ سب ایک دوسرے کے قریب یا دُور ہوں گے، ایک دوسرے سے بڑے یا چھوٹے ہوں گے وغیرہ۔ اب اس منظر کی تصویر اسی وقت اچھی تصویر کہلائے گی جبکہ منظر کے عناصر کی اور ان کے مابین تعلقات کی تصویر میں صحیح صحیح عکاسی کی گئی ہو۔ جو نسبت پہاڑ کو جھونپڑی سے ہے، وہی نسبت تصویر میں بھی دکھائی گئی ہو۔

یہی صورت لفظ بمعنی تصویر اور وہ جس کی یہ تصویر ہے کے تعلق کی ہے۔ یہی صورت گراموفون ریکارڈ اور اس میں چھپے نغمے کی ہے۔۔۔۔۔۔

معنی گویا لفظ کا منسوب ہے جو طبعی بھی ہو سکتا ہے اور عضویاتی بھی۔

جب ہم نے شعری تجربے کی تحلیل کی تھی اور اس کے معنی سمجھنے چاہے تھے تو ہم نے یہ دیکھنے کی کوشش کی تھی کہ آیا اس لفظ کو کسی طبعی یا عضویاتی حقیقت سے وابستہ کیا جا سکتا ہے۔ اور ہم نے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ ایسا نہیں کیا جا سکتا۔ کوشش کے باوجود ہمارے سامنے ایسی عضویاتی یا انفعالی صورتیں نہ آئیں جنہیں شعری تجربے کے لئے مخصوص کیا جا سکے۔ ہم نے سوال کیا تھا کہ کیا کوئی شعری حقیقت ہے جس سے شعری تجربے کو وابستہ کیا جا سکتا ہے اور ہم نے دیکھا کہ یہ ممکن نہیں۔ اگر الفاظ تصویریں ہیں اور وہ جن کی تصویریں الفاظ ہیں، الفاظ کے معنی ہیں تو لفظ "شعری تجربہ" کس کی تصویر ہے؟

اگر کوئی ایسی حقیقت بمعنی طبعی اور عضویاتی وقوعہ کے موجود نہیں جس کی تصویر کشی ممکن ہو، تو لفظ شعری تجربہ بے معنی قرار پائے گا، اور ہمارا یہی نتیجہ تھا۔

معنی کے بارے میں اس گفتگو سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نہ صرف ہم لفظ "شعری تجربہ" کو بے معنی قرار دینے میں حق بجانب ہیں بلکہ اگر اس تحلیل اور اس نظریے کو جس پر ہماری تحلیل قائم کی گئی ہے سنجیدگی سے آگے لے جائیں تو ادب و شعر میں بلکہ عام گفتگو میں آنے والے اور بہت سے الفاظ کی معنویت، یا لغویت سامنے لے آئیں گے اور یہ ایک اہم کام ہو گا کیونکہ اس طرح زبان بے سر و پا باتوں سے پاک ہو جائے گی اور زبان میں صرف ایسے الفاظ رہ جائیں گے جن کے معنی و مفہوم کے بارے میں کوئی شک یا ابہام نہ ہو گا۔

۲۔ لیکن یہاں بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کیا ضرور ہے کہ ہر لفظ کسی شے کی تصویر ہی ہو؟ اور حقیقت تو یہ ہے کہ یہ قطعی ضروری نہیں کہ ہر بامعنی لفظ کسی شے، واقعہ یا وقوعہ کی تصویر ہو۔ ہم بہت سے الفاظ روزانہ استعمال کرتے ہیں لیکن وہ کسی طبعی یا عضویاتی حقیقت کی عکاسی نہیں کرتے نہ ہی ان کی تصویر یا شبیہہ قرار دیئے جا سکتے ہیں اور اس کے باوجود ہم انہیں بے معنی اور لغو بھی نہیں کہتے۔ لفظ سرخ اور زرد کو ہی لیجیے۔ یہ بہر حال کہنا صحیح نہ ہو گا کہ یہ الفاظ کسی اعتبار سے زرد اور سرخ رنگوں سے مشابہت رکھتے ہیں۔ اسی طرح ریاضیاتی اور منطقی اشارات اور ترقیمات کیا کسی لحاظ سے کسی چیز کی تصاویر قرار دی جا سکتی ہیں؟ اب سوال یہ ہے کہ ان ترقیمات کے معنی کا تعین کس طرح ہو گا؟

اس طرف ہم پہلے ہی اشارہ کر چکے ہیں کہ الفاظ کی معنویت ان کی کارآوری اور وظیفہ میں ہے۔ یہ دریافت کرنا کہ ایک لفظ کے معنی کیا ہیں، دراصل یہ پوچھنا ہے کہ اس لفظ کا سماجی یا عملی زندگی میں کیا کام ہے۔ اور کیا وظیفہ ہے۔ الفاظ کی حیثیت گویا شطرنج کے مہروں کی سی ہے۔ شطرنج کھیلنے کے لئے آپ بساط پر کسی قسم کی چیزوں کو مہروں کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں۔ قمیض کا بٹن، ماچس کی ڈبیا، اب بساط کے مختلف خانوں میں رکھ کر بے تکلف شطرنج کھیل سکتے ہیں ان سے ساری چالیں چل سکتے ہیں اور مخالف کو شکست دے سکتے ہیں۔ "گھوڑا" قمیض کا بٹن بھی ہو سکتا ہے اور ماچس کی ڈبیا بھی ہو سکتی ہے اگر وہ "گھوڑے" کی طرح استعمال کی جائے۔ اب جب بھی کوئی چیز (مثلاً قمیض کا بٹن وغیرہ) شطرنج کی بساط پر

ڈھائی خانے چلے گی تو "شطرنج کا گھوڑا" کہلائے گی۔ اگر طولاً عرضاً سیدھی چلے تو "رخ" کہلائے گی۔ یہاں مہروں کو ان کی کسی طبعی خصوصیت یا شکل کی وجہ سے گھوڑا یا رُخ نہیں کہا جا رہا ہے بلکہ شطرنج کے کھیل میں ان کے رول اور کارآوری سے انہیں مختلف ناموں سے پکارا جا رہا ہے۔ اسی طرح الفاظ "سرخ اور زرد" طبعی خصوصیت کی طرف اشارہ نہیں کرتے اور ان کے معنی کا تعین کسی طبعی صفت سے نہیں بلکہ ان کی کارآوری اور عملیت سے ہو رہا ہے اور ان کی عملیت صرف اس میں مضمر ہے کہ ان الفاظ کی مدد سے ہم مختلف کام انجام دے سکتے ہیں۔

اب فرض کیجیے کہ دو الفاظ بعینہٖ ایک ہی کام انجام دیتے ہیں اور ان کے عملی نتائج کلیۃً ایک ہیں تو ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ یہ دو الفاظ ہم معنی یا مترادف ہیں۔ اس کے برخلاف اگر ایک لفظ کے استعمال سے کل صورتِ حال میں کسی قسم کے نمایاں تغیر کا تجربہ نہیں ہوتا اور اس کے استعمال کے باوجود صورت حال متاثر نہیں ہوتی تو پھر ایسا لفظ معنی سے کلیۃً عاری ہوگا۔ ایسے لفظ کو ہم بے معنی یا لغو قرار دیں گے۔

میرے خیال میں "شعری تجربہ" اس اعتبار سے بے معنی اور لغو لفظ ہے اور اس کے استعمال یا عدم استعمال سے شعری تنقید پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اور اگر ہم اسے اردو تنقید میں استعمال کرنے پر مصر ہیں تو اس لفظ کے معنی و مفہوم کی از سرِ نو تحدید ہونی چاہیے۔ اس لفظ کو نئے معنی پہنانے چاہئیں۔ اور اگر اس لفظ کو کسی اعتبار سے بھی بحث میں لائے بغیر شعر گوئی اور شعر فہمی کا سلسلہ جاری رکھا جا سکتا ہے تو بلا تکلف اس لفظ کو "زباں بند" کر دینا چاہیے۔

ڈاکٹر محمد اجمل

نفسیات میں تجرباتی طریق

نفسیات کے بعض تجربات تو فقط لیبارٹری میں ہو سکتے ہیں مثلاً آپ کو یہ معلوم کرنا ہے کہ کسی شخص کے اپنی صلاحیتوں کے اندازے اور اس کے عام معیار کار میں کیا فرق ہے تو اس کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اسے کوئی کام دیا جائے اور اس سے یہ پوچھا جائے کہ وہ کام کتنے عرصے میں کرے گا؟ اور جب وہ کام کر چکے تو اُس کے کام کرنے کی مدت دیکھ لی جائے۔ اس کے اندازے اور حقیقت کا فرق معلوم ہو جائے گا۔ مثلاً اسے ایک نظم دے دی جائے اور پوچھا جائے کہ یہ نظم کتنی مدت میں یاد کر لوگے یا کتنی مرتبہ دہرانے سے تمہیں یاد ہو جائے گی اور وہ کہے کہ پندرہ مرتبہ لیکن دراصل اسے بیس مرتبہ دہرانی پڑے تب کہیں جا کے اسے یہ نظم یاد ہو تو ہم کہیں گے کہ اس کا اپنی صلاحیت کے متعلق اندازہ مبالغہ آمیز ہے۔ اس مبالغے کی مقدار بھی ہم متعین کر سکتے ہیں کہ اس کا مبالغہ پانچ درجے کا ہے۔ اگر وہ کہتا کہ میں دس مرتبہ دہرانے سے یہ نظم یاد کر لوں گا۔ اور دہراتا وہ بیس مرتبہ تو یوں اُس کا مبالغہ دس درجے ہوتا۔

بظاہر یہ تجربہ بیکار سا معلوم ہوتا ہے لیکن ذرا اس کے شاخسانوں پہ غور کیجئے کہ یہ بات چل کے کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہے۔ آپ اس تجربے کو پھیلا کے وضاحتاً یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ایک شخص کو کاغذ کے پچاس ٹکڑے دیں اور ہر ٹکڑے پر کوئی اخلاقی اصول یا نصب العین لکھ دیں۔ ان میں کڑے سے کڑے اصول سے لے کر آسان سے آسان اصول لکھ دیں اور اس شخص سے کہیں کہ ان میں سے وہ ٹکڑے چن لے جن پر وہ اصول لکھے ہیں جن پر اُسے یقین ہے۔ اس کے بعد پچاس اور ٹکڑوں پر ان اصولوں کی پابندی یا عدم پابندی سے متعلق چند فقرے لکھ دیں اور اس شخص سے کہیں کہ وہ ایسے ٹکڑے چن لے جو اس کے حسب حال ہیں۔ ممکن ہے یہ شخص وہ فقرے انتخاب کرے جو اس کے اصولوں سے بالکل لگا نہیں کھاتے۔ مثلاً اخلاقی اصولوں میں تو وہ شخص یہ فقرہ چنتا ہے کہ انسان کو ہمیشہ سچ بولنا چاہیئے لیکن اپنے حسب حال یہ فقرہ مناسب خیال کرتا ہے۔ "سچ بیان تو جھوٹ بولنے سے شاذ و نادر ہی گریز کرتا ہے" یا یہ کہ "انسان کو ہمیشہ خوش رہنا چاہیے" یہ تو ہے اس کا اخلاقی اصول۔ لیکن درحقیقت وہ یہ فقرہ حسب حال سمجھتا ہے کہ "میں تو اکثر غموں کے بوجھ سے سر نہوڑائے رکھتا ہوں" وغیرہ وغیرہ۔ گویا اس کے نجی اصولوں اور اس کی روزمرہ زندگی کی حقیقت میں بہت فرق ہے۔ آپ کہیں گے تو پھر کیا ہوا؟ ہوا یہ کہ دیکھا گیا ہے کہ جن لوگوں کے اصولوں اور حقیقت میں زیادہ فرق ہوتا ہے وہ ذہنی مریض ہوتے ہیں اور جن میں یہ فرق نہیں ہوتا یا کم ہوتا ہے وہ ذہنی طور پر صحت مند ہوتے ہیں۔ ذہنی علاج کی کامیابی یا ناکامی کا اندازہ لگانے کا بھی یہ ایک مؤثر طریقہ ہے۔

اب اجتماعی نفسیات کے ایک تجربے پر غور کیجئے۔ آپ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ لوگ اجتماعی فیصلے تک پہنچنے سے پہلے کس طرح خیالات بدلتے ہیں۔ مثلاً آپ ایک شوہر اور بیوی کے درمیان مجموعی فیصلے تک پہنچنے کا اسلوب معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ اس کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ آپ

کوئی سو جوڑے چن لیں۔ ان میں سے بیوی اور شوہر سے الگ الگ چند اور جوڑوں کے بارے میں، جنہیں وہ دونوں جانتے ہیں، سوال کیجئے کہ وہ کیسے لوگ ہیں، پرہیز گار ہیں۔ دوست دار ہیں کہ نہیں وغیرہ وغیرہ۔ ان کے جواب رقم کرنے کے بعد آپ ان سے یہ کہیں کہ اب آپ دونوں مل کر یہ فیصلہ کریں کہ کونسی رائے بہتر ہے۔ میاں بیوی کو ایک کمرے میں بٹھا دیں اور آپ خود باہر نکل جائیں اور انہیں یہ نہ بتائیں کہ گفتگو ریکارڈ کی جا رہی ہے۔ اس کے بعد ان کے فیصلے معلوم کریں۔ امریکہ میں یہ دیکھا گیا ہے کہ اکثر مجموعی فیصلہ وہی ہوتا ہے جو پہلے بیوی کی رائے تھی۔ اس سے شاید آپ یہ نتیجہ نکالیں کہ عورتیں مردوں پر حاوی ہوتی ہیں۔ اور ان کی رائے غالب آتی ہے۔ لیکن یہی تجربہ آپ دوسرے تمدن کے لوگوں پر کیجئے، بعض دوسری تہذیب کے لوگوں میں مرد حاوی نظر آتے ہیں تو اس سے کوئی نتیجہ تو نہ نکل سکا، لیکن جب میاں بیوی کی گفتگو کا تجزیہ کیا گیا تو دیکھا گیا کہ جو شخص زیادہ بولتا ہے یا جس شخص کی شخصیت زیادہ کھلی ہوتی ہے اس کی رائے غالب ہوتی ہے۔ یہ نتیجہ محض شوہر اور بیوی کے تعلقات ہی کے لئے اہم نہیں بلکہ کسی اجتماعی فیصلے کے تجزیے کے لئے اہم ہے۔

اب میں ایک اور تجربے کا ذکر کروں گا اور بس۔ آپ نے اکثر یہ سنا ہوگا کہ ذہنی کیفیت کی وجہ سے پیٹ کی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ جب ذہنی کیفیت بہتر ہو جائے تو پیٹ کی خرابی دور ہو جائے گی، لیکن یہ کوئی سائنٹیفک توضیح نہیں، کیونکہ ممکن ہے کہ کسی اور وجہ سے پیٹ کی خرابی دور ہو گئی ہو۔ اس بات کی تہہ تک پہنچنے کے لئے بعض ماہرین نفسیات نے یہ تجربہ ایجاد کیا کہ انہوں نے کوئی ۱۲۰ چوہے لئے جو ہم عمر بھی تھے اور صحت مند بھی۔ ۶۰ چوہوں کو ایسے پنجروں میں رکھا، جہاں کھانا بھی تھا، پانی بھی تھا اور وہ کھاتے پیتے رہتے تھے۔ ۶۰ چوہوں کو بھوکا پیاسا رکھا اور وقتاً فوقتاً انہیں بجلی کے دھچکے بھی لگتے رہے۔ یہ دیکھا گیا کہ محض بھوک پیاس اور دھچکوں سے چوہوں کے معدوں کو زیادہ ضرر نہیں پہنچا، لیکن ان چوہوں کو "السر" (ULCER) کا مرض لاحق ہو گیا جو بھوکے تھے، کھانا سامنے تھا اور وہ کھانے تک نہیں پہنچ سکتے تھے جو پیاسے تھے، پانی سامنے تھا لیکن اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ تھی۔ یعنی جب ذہنی کشمکش بہت ہو گئی۔ تو ان کے معدوں میں "السر" کا مرض ہو جاتا تھا۔ اسی طرح چند تجربات دمہ پر بھی کئے گئے ہیں۔ دمہ بھی بعض اوقات نفسیاتی اسباب کی بنا پر ہوتا ہے۔

یہ میں نے چند تجربات گنوائے ہیں۔ مقصد اس کا یہ ہے کہ یہ بات واضح ہو جائے کہ نفسیات اپنے اسالیب میں زیادہ سے زیادہ سائنٹیفک بننے کی کوشش کر رہی ہے اور مفروضے وضع کرتی ہے اور ان کی صحت یا عدم صحت متعین کرنے کے لئے تجربات کر گزرتی ہے جن کے نتائج اکثر و بیشتر نہایت اہم ہوتے ہیں۔

پروفیسر محمد عثمان

جنگِ آزادی اور ادیب

میرے معزز ساتھیو!

میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ "جنگِ آزادی اور ادیب" ایسے موضوع پر مجھے اظہارِ خیال کی دعوت دے کر رائٹرز گلڈ کی صوبائی شاخ نے کوئی مستحسن قدم اٹھایا ہے۔ یہ اس لئے کہ اس سوال کے بارے میں میرے ذاتی خیالات ملک کے ادیبوں اور شاعروں کے سبھی طبقوں کے لئے خوش آئند ثابت نہیں ہو سکتے۔ تاہم آج کے تاریخی دن اور دانشوروں کے اس خصوصی اجتماع کا تقاضا ہے کہ میں کسی معذرت خواہی اور جھجک کے بغیر اپنے احساسات اور اپنی سوچ کے کچھ نتائج آپ کی خدمت میں پیش کر دوں۔

پہلا سوال یہ ہے کہ جن اصولوں اور جس نہج پر ہم نے اپنی آزادی کی تحریک چلائی، کیا ہمارے ادیب ان اصولوں پہ ایمان اور اس نہج سے اتفاق رکھتے تھے؟ مجھے اندیشہ ہے کہ میں اس سوال کا جواب کاملاً مثبت میں نہیں دے سکتا ـــــ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہئے کہ اگر تیس چالیس برس پیچھے مڑ کر دیکھیں تو برِ صغیر کے مسلمان ادیبوں میں آپ کو خاصی اختلافِ رائے اور انتشارِ ذہنی دکھائی دے گا۔ اس کا سبب محض ہمارے ادیبوں کی قومی تحریک سے عدم وابستگی، بے اعتنائی یا ناسمجھی نہیں تھا۔ متعدد متضاد اور باہم متخالف معاشرتی عوامل اُس دور میں اتنی قوت کے ساتھ ادب اور سیاست کے میدانوں میں کار فرما تھے کہ ایک اوسط درجے کا سوچنے اور لکھنے والا اپنی منزل صاف طور سے دیکھنے کے قابل نہ تھا۔ مثال کے طور پر جس زمانے (۱۹۳۰ء) میں علامہ اقبال نے الٰہ آباد میں اپنا مشہور صدارتی خطبہ ارشاد فرمایا، اس زمانے میں ایک نو انڈین نیشنل کانگریس زوروں پہ تھی اور اس کا سیاسی اور ادبی نقطۂ نظر بڑا پرکشش اور مدلل نظر آتا تھا۔ یہ نقطۂ نظر ادیب کو کل ہند سطح پہ سوچنے اور مسلمانوں کے مخصوص مسائل کو پس پشت ڈالنے کی زبردست ترغیب دیتا تھا۔ دوسرے اسی زمانے کے لگ بھگ برِ صغیر میں وہ ادبی تحریک اٹھی جسے ترقی پسند کا نام دیا گیا۔ یہ تحریک بلاشبہ انسان دوستی اور اصلاحِ احوال کے بعض سچے جذبات سے سرشار تھی۔ لیکن دانستہ یا نادانستہ طور سے یہ بھی بے شمار مسلمان ادیبوں کے لئے معاصرانہ حقائق کے کچھ بنیادی پہلوؤں سے اغماض کا باعث ہوئی۔

کانگریس میں حصولِ آزادی کا جوش و خروش، عوامی جدوجہد کی ہمہ ہمی، ایک قومی نظریے کی جدیدیت اور ترقی کے رہنماؤں کی شخصی اور ذاتی کشش شامل تھی۔

ترقی پسند تحریک کو ایک اعلیٰ بین الاقوامی نصب العین کی گرمی اور ایک جدید سائنسی نظریۂ حیات کی دولہ انگیزی حاصل تھی۔ جذباتی اور حساس طبیعتوں کو اپنی طرف کھینچنے والی ان دو تحریکوں کے درمیان ایک اور تحریک دھیرے دھیرے صورت پذیر

○ ۱۴ر اگست ۱۹۶۷ء کو گلڈ ہاؤس لاہور میں ایک مذاکرے کے آغاز میں پڑھا گیا۔

ہو رہی تھی، ابتدا میں یہ تحریک عوامی نہ تھی، اس کی قیادت میں غالباً وہ شخصی اور ذاتی کشش بھی موجود نہ تھی جو ایثار پیشگی اور کسی اعلیٰ نصب العین کی خاطر مسلسل تکلیفیں اٹھانے اور دکھ جھیلنے کی بدولت رہنما شخصیتوں میں پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے نظریے میں جدید کی لذت اور سائنس کا وزن بھی شامل نہ تھا، یہی نہیں اس میں دو ایک پہلو ایسے بھی تھے جن سے حساس طبیعتیں بدکتی اور شک میں پڑ سکتی تھیں۔ اس سے میری مراد یہ ہے کہ اس کی اگلی صفوں میں کچھ بڑے زمیندار اور کچھ سرکار نواز نمایاں دکھائی دیتے تھے۔ ایک مشکل اس کی یہ تھی کہ نشر و اشاعت کے بیشتر نئے وسائل اس کی طاقت سے باہر تھے۔ یہ تو تھیں اس تحریک کی کسریں اور خامیاں مگر اس میں جو خوبی تھی وہ یہ تھی کہ اس کا بنیادی خیال اور نظریہ صدیوں کے پرکھے پرکھائے حقائق و واقعات پر مبنی تھا جس کی صداقت پر کروڑوں انسانوں کے دل بے اختیار گواہی دینے کو مضطرب تھے اور جس کی سچائی کو کسی جدید نصب العین کی گرمی اور کسی نئے طرزِ استدلال کا زور جھٹلانے کے ہرگز قابل نہ تھا ـــــ یہ تحریک برصغیر کے مسلمانوں کے علیحدہ قومی تشخص، تقسیم ہند اور قیامِ پاکستان کی تحریک تھی۔

اب ہوا یوں کہ برصغیر کے مسلمان ادیبوں میں سے کچھ تو ابوالکلام آزاد، نہرو اور گاندھی کی وجہ سے کانگریس کی طرف کھینچے گئے۔ دہلی لکھنؤ، علی گڑھ اور بمبئی وغیرہ کے مسلمان لکھنے والوں کی ایک خاصی تعداد جن میں جامعہ ملیہ کے اساتذہ مثل ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر محمد مجیب اور علی گڑھ سے پروفیسر رشید احمد صدیقی، پروفیسر آل احمد سرور اور خواجہ غلام السیدین پیش پیش تھے، کانگریس کے ہمنوا بن گئے۔

سجاد ظہیر، جوش ملیح آبادی اور ایک حد تک فیض کی سرکردگی میں متعدد مسلمان افسانہ نگار، شاعر اور ادبی نقاد ترقی پسند تحریک میں شامل ہو کر، یوں کہنا چاہیے کہ ہماری تاریخ کے ایک نازک دور میں ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ کے مصداق عملاً ہم سے کٹ گئے :- احتشام حسین، علی سردار جعفری، - - - - - - - - - ، اختر حسین رائے پوری، خواجہ احمد عباس، پروفیسر احمد علی، معین احسن جذبی خورشید الاسلام، اختر الایمان، عصمت چغتائی اور بے شمار دوسرے مسلمان لکھنے والوں کو جن میں اس دور کا حسن عسکری اور سعادت حسن منٹو بھی شامل ہے، بآسانی اس فہرست میں درج کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد جو ادیب بچ رہے تھے ان میں کچھ تو ایسے تھے جو اگرچہ نہ کانگریس کے ہمنوا تھے اور نہ ترقی پسندوں کے ہم رکاب لیکن وہ تقسیم ہند اور آزادیٔ پاکستان کے بھی کچھ ایسے سرگرم حامی یا علمبردار نہ تھے۔ بے تعلق اہلِ قلم مسلمانوں کا یہ گروہ بھی خاصا تھا۔ اس زمرے میں افسانہ نگاروں میں ممتاز مفتی، شاعروں میں ن۔ م۔ راشد اور نقادوں میں پروفیسر احمد شاہ بخاری کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

اس مرحلے پر میرا جی چاہتا ہے کہ میں بالخصوص اردو کے نامور ادیبوں، شاعروں اور قلمکاروں میں سے ان لوگوں کے نام بیان گنواؤں جو تقسیم ہند کے مطالبے اور حصولِ پاکستان کی جدوجہد میں اسی طرح بہ دل و جان شریک ہوئے جس طرح مثلاً علامہ اقبال اور مولانا شبیر احمد عثمانی تھے۔ میرا خیال ہے مجھے "بہ دل و جان" کی مختصراً وضاحت بھی کر دینی چاہیے۔ اس سے ایسی شرکت مراد ہے جس میں سیاسی و معاشرتی شعور کی پختگی، علمی بصیرت اور عملی وابستگی شامل ہو ـــــ اور اب میں قدرے پریشان ہوں۔ اس لیے کہ میری سمجھ میں نہیں آتا یہاں میں کن لوگوں کے نام لوں۔

میں اس ضمن میں ایک ترکیب سے کام لینا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ ادیب اور قلمکار کی وسیع ترین تعریف آپ کے سامنے رکھ دوں اور پھر اس کی روشنی میں دو قدم آگے بڑھنے کی کوشش کروں۔ ادیب کی روائتی تعریف کی ذیل میں تو صرف وہی شخص آتا تھا جو تخلیقی ادب کی کسی صنف میں کام کر رہا ہو۔ اگر وہ شاعر، افسانہ نگار، ناول نویس، انشا پرداز یا ڈرامے لکھنے والا ہے تو ادیب ہے ورنہ

اس معزز برادری سے باہر۔ گزشتہ صدی کے آخر میں سرسیّد اور شبلی جیسے بزرگوں کی کوشش سے سیاست، تعلیم، مذہب اور تاریخ پر لکھنے والے بھی رفتہ رفتہ ادیبوں کی صف میں شمار ہونے لگے۔ اس صدی کے شروع میں تنقید نگاروں نے "زورِ بازو" سے اس برادری میں اپنے لئے جگہ پیدا کی اور اب جب سے انگریزی کا لفظ "انٹیلکچوئل" اور اردو میں دانشور رائج ہوا ہے، صحافی، معلم، محقق، تاریخ دان، سوجھ بوجھ رکھنے والا سیاسی کارکن، صاحبِ ذوق سرکاری افسر، علم دوست وکیل اور ذہین طالب علم بھی اس برادری میں شامل و شمار ہو رہے ہیں۔

ادیب کی اس جدید تعریف کی رُو سے میں سینکڑوں نہیں ہزاروں دانشوروں کے نام گنوا سکتا ہوں جو پاکستان کی تحریکِ آزادی میں دل و جان سے شریک تھے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، اسلامیہ کالج لاہور اور اسلامیہ کالج پشاور کے بیشتر اساتذہ اور طلباء کی بھاری اکثریت اس جدوجہد میں ذہناً اور عملاً شریک ہوئی۔ علی گڑھ کے سٹاف سے ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم، پروفیسر افضال حسین قادری اور پروفیسر ایم ایم۔ احمد اور اسلامیہ کالج لاہور سے پرنسپل عمر حیات ملک کے نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ ملک کے صحافیوں میں حمید نظامی مرحوم، مرتضٰے احمد میکش، فضل کریم خان درّانی، زیڈ۔ اے سلیری، الطاف حسین، میاں محمد شفیع (م۔ش) اور تعلیم کے میدان سے ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی۔ ڈاکٹر محمود حسین، قاضی سعید الدین اور پروفیسر اشفاق علی خاں مستحقِ تذکرہ ہیں۔ پُرجوش کارکن طلباء میں سے سید قاسم رضوی، آفتاب احمد قریشی اور سید احمد سعید کرمانی کے نام لئے جا سکتے ہیں۔

اس فہرست کو آپ جہاں تک چاہیں، بلا خوف تردید بڑھا سکتے ہیں لیکن میری مشکل غالباً اس ترکیب سے بھی حل نہیں ہوئی کیونکہ یہ سب لوگ ملک کے دانشور سہی تاہم میں نامور ادیبوں اور شاعروں کے نام ان کے ساتھ تاحال شامل نہیں کر سکا۔ لیجئے اب دو نام میرے ذہن میں آتے ہیں۔ مولانا ظفر علی خان اور مولانا حسرت موہانی۔ یہ دونوں نامور شاعر، نقاد اور ادیب ذہناً اور عملاً تحریکِ آزادیٔ پاکستان کے ساتھ تھے لیکن ان کے ضمن میں یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ حصولِ پاکستان کے وقت یہ دونوں بزرگ ساٹھ برس سے اوپر کے تھے۔ سوال یہ ہے کہ ایسے میں ادھیڑ عمر اور نوجوان ادیب اور شاعر اور افسانہ نگار کہاں تھے اور ان میں سے کتنے اپنے اپنے فن اور فکر اور جذبے کا اسلحہ لے کر قومی محاذ پر لڑنے کے لئے آ موجود ہوئے تھے؟

یہاں میرا ذہن محمد دین تاثیر، عابد علی عابد، صوفی تبسم، امتیاز علی تاج، حکیم احمد شجاع، عبدالمجید سالک، غلام رسول مہر، سر عبدالقادر، چراغ حسن حسرت، صلاح الدین احمد، عاشق حسین بٹالوی، سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی، حسن عسکری، ڈاکٹر سید عبداللہ، سید وقار عظیم، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، احسان دانش، حفیظ جالندھری اور حفیظ ہوشیارپوری جیسے بیسیوں حضرات کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ تاثیر مرحوم نے پاکستان بننے کے کچھ عرصہ بعد ہماری تحریکِ آزادی کے علمی و عملی پہلوؤں کو روشنی میں لانے کی کوشش کی۔ مہر و سالک نے اپنے اپنے رنگ میں اس تحریک کو تقویت پہنچائی (اگرچہ ۱۹۴۶ء کے انتخابات اور اس کے آس پاس کے زمانے میں "انقلاب" کا کردار متنازعہ فیہ ہے) عاشق حسین بٹالوی نے پنجاب میں مسلم لیگ کو مضبوط بنانے میں علامہ اقبالؒ کا ہاتھ بٹایا۔ حسن عسکری نے قیامِ پاکستان کے چند سال بعد کچھ ایسے مضامین لکھے جن سے قومی تحریک کو درست تناظر میں دیکھنے دکھانے کی ایک مخلصانہ کوشش کا سراغ ملتا ہے۔ لیکن میرا سوال یہ ہے کہ مذکورہ حضرات میں سے کس کس نے دو قومی نظریے، اسلامی قومیت، کانگریس کے عزائم، اقبال کے سیاسی موقف، قائداعظم کی زندگی اور مشن، اسلام کی بقا اور بہ حیثیت ایک قوم کے مسلمانوں کے مستقبل پر ڈرامے، افسانے، ناول، سوانحِ حیات یا مضامین (اس وقت یا اس کے بعد) لکھے؟ اور آزاد پاکستان کے لئے کتنوں کے جذبات و احساسات کی وہ کیفیت تھی جو آزاد بھارت کے لئے مثلاً کرشن چندر، اوپندر ناتھ اشک یا ملک راج آنند کی تھی؟

بلاشبہ ہماری صلاحیتوں کو کمزور کرنے اور ہماری بصیرتوں کو دھندلانے میں جہاں اور بہت سے معاشرتی اور سیاسی عوامل نے حصہ لیا۔ وہاں اُن انسانیت سوز واقعات کا بھی ہاتھ ہے جو تقسیم ہند سے کچھ عرصہ پہلے اور پھر فوراً بعد مشرقی پنجاب، دہلی، کلکتہ، جموں اور بھارت کے بے شمار دوسرے مقامات میں اور پاکستان کے بھی بعض حصوں میں روا رکھے گئے۔ مہاجرین کی بے پناہ اور دردناک آمد اور غیر مسلموں کی چھوڑی ہوئی جائداد کی بندر بانٹ نے ان عوامل کی طویل فہرست میں ایک سبب کا مزید اضافہ کر دیا!

لیکن اسباب، خواہ کچھ بھی ہوں (اور انسانی فکر و نظر کو دھندلانے کے اسباب ناپید کب تھے!!) میرے نزدیک امر واقعہ یہ ہے کہ ہمارے ادیبوں میں سے بہت کم ان تاریخی قوتوں کا صحیح فہم رکھتے تھے جو جنگِ عالمگیر اوّل کے بعد سے برصغیر میں کارفرما تھیں اور اس سے بھی کم تعداد ایسوں کی تھی جو بربنائے بصیرت اور ہوش مندی ان تاریخی قوتوں کے ساتھ اور ہم رکاب تھے!

اپنے اٹھائے ہوئے پہلے سوال کا جواب سمیٹتے ہوئے میں یہ کہوں گا کہ جن بنیادوں پر جن مقاصد کی خاطر اور جن کٹھنائیوں اور مشکلوں کے باوجود آزادیِ پاکستان کی جدوجہد ۱۴ اگست ۱۹۴۷ کو کامیابی سے ہم کنار ہوئی، ان بنیادوں کا صحیح فہم، ان مقاصد سے سچی لگن اور ان کٹھنائیوں اور مشکلوں کا مناسب شعور ہمارے ادیبوں میں سے بہت کم کو — بہت ہی کم کو نصیب ہوا۔۔۔ اور جب پاکستان بننے سے پہلے اس عظیم تحریک کی بنیادوں کا ادراک اس کے مقاصد سے لگن اور اس کی مشکلوں کا شعور ہی نصیب نہ ہوا تو پھر اس میں کیا عجب کہ پاکستان بننے کے بعد جو لامحدود امکانات اصلاحِ احوال، ترقی اور انسانیت کی خدمت کے پیدا ہوئے۔ ان کی طرف کسی کا دھیان نہ گیا، اس کی لَو سے ذہنوں میں چراغ روشن نہ ہوئے، دلوں میں ولولے نہ اٹھے، سینوں میں شعلے نہ بھڑکے!

آپ نے اکثر لوگوں کو یہ کہتے سنا ہوگا کہ گزشتہ بیس برس میں ہم نے ایک آدھ استثنائی یا متنازعہ صورتوں کو چھوڑ کر کوئی بڑا اور زندہ رہنے والا تخلیقی کارنامہ سرانجام نہیں دیا، کوئی بڑا ناول، کوئی بڑا ڈرامہ، کوئی بڑی سوانح حیات۔ کوئی بڑی خودنوشت سرگزشت یا بانگِ درا، بالِ جبریل، دیوانِ غالب کی سی عظمت کا کوئی مجموعۂ شعر، کوئی دیوان، کوئی کلیات ہم سے بہم نہیں پہنچا۔ میرے نزدیک اس صورتِ حال اور اس تخلیقی کال کی وجہ بھی وہی ہے جو میں نے اوپر کے پیرا میں عرض کی ہے۔ جب تک ادیب کا رشتہ اپنے لوگوں سے ان کی جدوجہد کے ماضی اور حال سے ان کی آرزوؤں اور تمناؤں سے ان کی تہذیبی اور روحانی قدروں سے بہت گہرا، بہت پختہ اور بہت مستحکم نہیں ہوتا اور جب تک رشتے کی پختگی اور گہرائی اس کی آنکھوں کو بصیرت اور اُس کے دل کو درد و محبت سے معمور نہیں کرتی، بڑا ادب، زندہ رہنے والا تخلیقی کارنامہ وجود میں نہیں آ سکتا۔ مستعار لیے ہوئے نصب العین اور ادھار پتے پر اٹھائے ہوئے نظریات اپنی جگہ پر خواہ کتنے ہی دلکش اور جاذب دکھائی دیتے ہوں، ان کی جڑیں زمین کی پاتال میں گڑی ہونے کی بجائے ریت کی سطح پر کھڑی ہوتی ہیں لہٰذا ان کے آس پاس سراب کی نظر فریبی تو پیدا ہو سکتی ہے۔ ان سے کشید کیا ہوا جوش و خروش عظیم ادب تخلیق نہیں کر سکتا۔

میری اس بات کی تصدیق ایک ناقابلِ انکار واقعہ سے ہو سکتی ہے، کیا وجہ ہے کہ ستمبر ۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران ہمارے شاعروں، ڈرامہ نگاروں اور دانشوروں کے تخلیقی سوتے جو برسوں سے یوں دکھائی دیتے تھے کہ کاملاً خشک ہو چکے ہیں، یکدم

ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دریاؤں کی طرح اُبل پڑے؟ کیا اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ جنگ کے دھماکے سے آناً فاناً وہ دیواریں گر گئیں جو قوم کی زندگی (قوم کی جدوجہد، قوم کے نظریۂ حیات) اور ادیب و شاعر کے درمیان کھڑی تھیں یا خود ادیب و شاعر نے اپنے گرد چن رکھی تھیں۔ ان دیواروں کا گرنا تھا کہ شاعر و ادیب کی آنکھوں پر سے گویا پردہ اٹھ گیا اور جن عوام سے وہ اب تک کھنچا کھنچا رہا تھا اور جن کے تصورِ حیات سے اس کو نہ ہونے کے برابر دلچسپی تھی، ان عوام اور ان کے تصورِ حیات پر وقت کے وقت اس کا ایمان کیا زندہ ہوا۔ اس کے اندر سے افکار و احساسات کے دریا اُمڈ آئے، تخلیق کے دھارے بہہ نکلے ——— اور پھر ——— اور پھر جونہی یہ احساس کم ہوا ہے اور وہ سرشاری دل و دماغ سے اتری ہے، معلوم ہوتا ہے تخلیق کے سوتے دوبارہ خشک ہو گئے ہیں!

کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ عوام کی محبت، ان کی جدوجہد اور نظریۂ حیات پر ایمان اور تخلیق ایک ہی سرچشمے کے دو نام ہیں؟ یہاں ایک آدھ بات کی کچھ وضاحت شاید ضروری معلوم ہوتی ہے۔ ترقی پسند مصنفین نے ایک وقت میں تقسیم ہند اور قیامِ پاکستان کی حمایت کی تھی اور جب ہم ان مصنفین کا ذکر تحریکِ پاکستان کے ضمن میں کریں تو اس واقعہ کو ہمیں نہیں بھولنا چاہیئے لیکن کوئی غیر جانبدار مبصر اس فرق کو بھی نہیں بھول سکتا جو کسی تحریک سے وابستہ ہونے اور بطور ایک حکمتِ عملی کے (ASAMATTER OF POLICY) کسی موقع پر اس کی حمایت کا اعلان کرنے میں ہے۔

اور جب میں یہ سوال کرتا ہوں کہ نامور مسلمان ادیبوں میں سے کس کس نے اسلامی قومیت، اقبالؒ کے سیاسی مؤقف، قائداعظمؒ کی زندگی اور مشن، اسلام کی بقا و فروغ اور ایک قوم کی حیثیت سے مسلمانوں کے مستقبل پر افسانے، ڈرامے، مضامین یا سوانح حیات لکھے تو اس سے میری مراد یہ نہیں کہ جس ادیب نے یہ موضوعات انتخاب نہیں کئے، اس کے پاکستانی یا محبِ وطن ہونے میں خدانخواستہ کوئی شبہ ہے لیکن یہ بھی امرِ واقعہ ہے کہ جس دانشور کو جو بات عزیز ہو، دل کے قریب، اس کے ایمان و یقین کا جزو اور اس کے تصورِ مستقبل کا حصہ ہوتی ہے، وہ اس کے اظہار سے قدرتاً بے نیاز یا بے تعلق نہیں رہ سکتا۔ اگر کسی موضوع سے عمر بھر آپ کا دامن پاک رہا ہے تو اس سے یہ تو ثابت ہوتا ہی ہے کہ اس موضوع کے لئے آپ کے دل میں کوئی جگہ نہ تھی۔ اقبالؒ خودی کے گیت کیوں گاتا رہا؟ اسی لئے نا کہ یہ خیال اس کے دل میں رچا بسا تھا۔ مجھے کہنا یہ ہے کہ موضوعات سیاسی، ادبی، قومی یا شخصی نہیں ہوتے۔ فن کار کی نسبت سے موضوعات کی فقط دو قسمیں ہیں، ایک وہ جو فنکار کے دل کے قریب اور اس کے ایمان کا جزو ہیں اور دوسرے وہ جو ایسے نہیں ہیں۔ آپ کے موضوعات، آپ کی آدمیت اور آپ کی حب الوطنی کا پیمانہ ہوں یا نہ ہوں، آپ کی دلچسپیوں، آپ کی رغبتوں، آپ کی محبتوں اور آپ کی ترجیحوں کا اعلان تو ضرور ہیں!!

ڈاکٹر ظہیر فتحپوری

اودھ، سماجی انقلاب اور مرزا رسوا

مرزا رسوا (۱۸۵۸ء ـــ ۱۹۳۱ء) کا زمانہ سیاسی، سماجی و معاشی لحاظ سے انتشار اور عظیم تبدیلیوں کا زمانہ تھا۔ جس طرح مسلمانوں کی فتوحات کے بعد برصغیر میں سماجی و تہذیبی لحاظ سے انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں اسی طرح غدر کے بعد بھی معاشرتی خدوخال بدلنا شروع ہو گئے تھے۔ یہی نہیں ہوا تھا کہ انگریز اس ملک کے مالک بن گئے تھے بلکہ یہ سیاسی تبدیلی زندگی کے تمام شعبوں میں ایک نیا موڑ لا رہی تھی، ایک نیا اندازِ فکر و عمل پیدا کر رہی تھی۔ یہ زمانہ قدروں کی تبدیلی کا زمانہ تھا۔ سرسیّد اور راجہ رام موہن رائے نئے حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لیئے اصلاحات و عقلی تصورات کے سہارے نئے سماج کی تشکیل میں منہمک تھے۔ مسلمانوں میں ۱۸۵۷ء کی سیاسی ہار کے بعد شدید اضمحلال، جھنجھلاہٹ اور اضطراب تھا۔ گو سرسیّد کی تحریک رفتہ رفتہ قوت حاصل کرتی جا رہی تھی تاہم سماج کی پرانی قدریں دلوں میں اسقدر گھر کر چکی تھیں کہ سرسیّد کے تمام نظریات کو قبول کر لینا خاصا مشکل نظر آ رہا تھا۔ دل ہزار قسم کے وسوسوں سے گھر گئے تھے۔ ایک جانب اس تحریک کی حمایت اور مخالفت پورے زور و شور سے جاری تھی، دوسری طرف انگریز مطمئن تھا کہ نئی تعلیم ایک ایسے طبقے کو جنم دے رہی ہے جو نسلاً ہندوستانی اور ذہنی لحاظ سے مغربی ہے۔ سرسیّد کی تحریروں میں مغربی تہذیب کی خوبیوں کا ذکر ہونے لگا اور قرآن سے حاکم کی وفاداری کا جواز تلاش کیا جانے لگا تھا۔ چنانچہ سماج میں بڑی سرعت کے ساتھ اقدار کی شکست اور تعمیر کا کام شروع ہو گیا تھا۔ یہ سب کچھ تھا مگر ماضی کی قدر دل سے نہ نکلتی تھی اور فرار کے نئے نئے میدان تلاش کر رہی تھی۔ مذہبی مناظرے اور مباحثے (اور کسی حد تک تاریخی ناول) اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ مرزا رسوا جیسی ذہین شخصیت پر اس تہذیبی اور سماجی انتشار کا اثر پڑنا لازمی تھا۔ چنانچہ خود رسوا کی شخصیت ہمیشہ انتشار اور برہمی کا شکار رہی اور وہ کبھی اپنی صلاحیتوں سے منظم طور پر کام نہ لے سکے۔ ان کی زندگی کا یہ سانحہ کم اہم نہیں ہے کہ ایک جینئس کا ذہن پانے کے باوجود وہ علم و فن کے کسی شعبے میں کوئی عظیم کام نہ کر سکے۔ بلکہ تمام زندگی مختلف خیالوں اور مقاصد کے پیچھے بھاگتے رہے۔ وہ نجوم، کیمسٹری، فلسفہ، شاعری اور ناول نگاری میں بہت بڑا کام کر سکتے تھے لیکن زیچے، مرزئی بنانے یا دھاتوں کے خمیر سے چاندی بنانے یا فلسفے کے چند رسائل یا کچھ اچھے ناولوں کے لکھنے کے سوا کچھ نہ کر سکے۔ اُن کے دَور کی معاشرتی فضا کا ان کی شخصیت پر گہرا اثر پڑا۔ چونکہ ان کی زندگی کا بیشتر حصّہ لکھنؤ میں گذرا اور یہیں کے تہذیبی نقوش ان کے ناولوں میں جھلملا رہے ہیں لہٰذا ان کے نظریۂ حیات کے مطالعے سے قبل لکھنؤ کے اس سیاسی و سماجی ماحول کا ذکر ضروری ہے جو رسوا کے پیشِ نظر تھا۔

لکھنؤ شمالی ہندوستان کے اس وسطی علاقے میں واقع ہے جہاں ابتداء ہی سے تہذیبی و مذہبی تحریکیں ابھرتی اور پھیلتی رہی ہیں۔ اسی دیار میں رام چندر جی کی ایودھیا ہے۔ یہاں برہمنوں کا اس حد تک وقار رہا ہے کہ شہنشاہ اکبر نے لکھنؤ کے باجپئی برہمنوں کو ایک لاکھ روپے کا چڑھاوا (نذرانہ) دیا تھا۔ مسلمان حکمرانوں نے بھی لکھنؤ کو بڑی اہمیت دی۔ اسے صوبہ اودھ کا دارالسلطنت بنایا۔ یہ شہر مشہور صوفی بزرگ شاہ مینا کی قیامگاہ

رہا اور اورنگ زیب نے یہیں کے ایک فرانسیسی تاجر کے مکانات ملا نظام الدین کو مذہبی درسگاہ بنانے کے لئے دے دیئے۔ یہ درسگاہ بعد میں "سلسلہ نظامیہ" کے نام سے مشہور ہوئی اور مکانات "فرنگی محل" کہلائے۔ رام چندر جی کے بھائی لچھمن سے منسوب "لچھمن ٹیلے" پر شاہ پیر محمد کا مزار تھا جس کے نواح میں بعد میں اورنگ زیب نے مسجد تعمیر کرائی۔ دورِ مغلیہ ہی میں مولوی شیخ عبدالرحیم کو لکھنؤ کے علاقے کی جاگیر ملی اور ان کی اولاد کا (جو شیخ زادے کہلاتی تھی) اقتدار اس حد تک بڑھ گیا کہ "شیخن دروازے" پر لٹکتی ہوئی ننگی تلوار کے سامنے ہر آنے والے کو سر جھکانا پڑتا تھا اور مغل صوبیدار بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھے۔ آخر ۱۷۳۲ء میں سلطنت اودھ کے بانی نواب سعادت خاں برہان الملک دہلی سے اودھ کے صوبیدار بن کے آئے تو اپنی حکمتِ عملی سے شیخ زادوں کو مطیع کیا اور شیخوں کی تلوار کو اپنی تلوار سے کاٹ کر گرا دیا۔

لکھنؤ کے تہذیب و تمدن کی کہانی ۱۷۳۲ء تا ۱۹۵۲ء سوا سو سال کی داستان ہے۔ اس تمدن کی بنا ایرانی اور اودھی کلچر کے ربط باہم سے پڑی۔ برہان الملک نیشاپور کے ایک سید زادے تھے جن کا سلسلہ نسب حضرت امام موسیٰ کاظم سے ملتا ہے۔ ان کے والد میر محمد نصیر ۱۷۰۶ء میں (بعہد بہادر شاہ) ہندوستان آئے اور عظیم آباد پٹنہ میں سکونت اختیار کی۔ دو سال بعد میر محمد امین بھی (جنہیں بعد میں برہان الملک کا خطاب ملا) ہندوستان آ گئے۔ اسی سال جب ان کے والد کا انتقال ہو گیا تو اپنے بھائی میر محمد باقر کے ہمراہ وہ دہلی پہنچے جہاں انہیں مغل شہزادوں کی جاگیر کا ٹھیکہ مل گیا۔ یہ کام انہوں نے اس قدر خوبی اور اہلیت سے انجام دیا کہ شاہی خاندان میں قدر کی نظر سے دیکھے جانے لگے اور کچھ عرصہ بعد دربارِ شاہی کے معزز اراکین میں شامل کر لئے گئے۔ جب آگرے کے صوبیدار نواب محمد تقی خاں کی دختر سے ان کی شادی ہوئی تو امرا میں شمار ہونے لگے۔ اپنی ذہانت و شجاعت سے میر محمد امین نے مغل دربار سے خاندانِ سادات کا زور توڑا جس کے صلے میں انہیں ہفت ہزاری منصب ملا "نواب برہان الملک بہادر جنگ" کا خطاب ملا اور آگرے کی صوبیداری ملی۔ ۱۷۳۲ء میں وہ اودھ کے صوبیدار ہو کر لکھنؤ آئے اور شیخ زادوں کو مطیع کرنے کے بعد فوجی مصلحتوں کے پیشِ نظر ایودھیا چلے گئے اور دریائے گھاگھرا کے کنارے کچھ مکانات بنوا کر قیام پذیر ہو گئے۔ یہ مکانات بعد میں "بنگلے" کے نام سے مشہور ہوئے، اور عہدِ صفدر جنگ میں یہ مقام "فیض آباد" کہلایا۔ بنگلے میں برہان الملک کے قیام پذیر ہونے کے باوجود صوبے کا دارالسلطنت لکھنؤ ہی رہا۔ ابھی برہان الملک کو اودھ میں آئے چند سال ہی گذرے تھے کہ نادر شاہ کے حملے کے وقت بادشاہ نے انہیں دہلی طلب کر لیا۔ اپنے بھانجے اور داماد صفدر جنگ کو اپنا قائم مقام بنا کر وہ دہلی گئے جہاں اسی سال ان کا انتقال ہو گیا۔

برہان الملک کے بعد صفدر جنگ ہی کو اودھ کی صوبیداری مل گئی۔ وہ بڑے منتظم رعایا پرور اور بلند حوصلہ حاکم تھے ۱۷۵۴ء میں ان کا انتقال ہوا اور دہلی میں ان کی قبر پر عالی شان مقبرہ تعمیر کیا گیا۔ صفدر جنگ کے بعد ان کے بیٹے شجاع الدولہ مسند نشین ہوئے۔ وہ ابتدا میں لکھنؤ ہی میں رہے مگر بکسر کی شکست کے بعد انہوں نے روہیل کھنڈ کے حاکم احمد خاں بنگش کے مشورے پر فوجی مصلحتوں کے پیشِ نظر فیض آباد کو دارالسلطنت بنا لیا۔ اس عہد میں فیض آباد نے جس سرعت کے ساتھ ترقی کی اس کی نظیر نہیں ملتی۔ مغل سلطنت کے زوال کی بدولت جن امراء، فنکاروں، تجار اور سپاہیوں نے دلی کو خیرباد کہا ان سب نے فیض آباد ہی کو آباد کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے فیض آباد ایک بارونق شہر بن گیا۔ شجاع الدولہ کو عورتوں کا قرب بہت پسند تھا۔ چنانچہ فیض آباد کے گلی کوچوں میں ڈیرے دار طوائفوں اور ناچنے گانے والی عورتوں کے جمگھٹے نظر آنے لگے۔ لکھنؤ کی سوسائٹی میں طوائف نے جو بلند مقام حاصل کر لیا تھا اس کی ابتدا شجاع الدولہ کے ہاتھوں فیض آباد میں ہوئی۔ ۱۷۷۵ء میں شجاع الدولہ کے انتقال کے بعد جب آصف الدولہ نے لکھنؤ کو مرکزِ حکومت بنایا تو فیض آباد کی تمام رونق لکھنؤ میں منتقل ہو گئی۔ آصف الدولہ کی ماں اور لکھنؤ کے شاہی خاندان کی سب سے زیادہ باوقار خاتون بہو بیگم صاحبہ البتہ فیض آباد ہی میں مقیم رہیں۔

آصف الدولہ کے ساتھ ہی لکھنؤ شہر کی ترقی اور سلطنت اودھ کی تنزلی کا دور شروع ہوتا ہے۔ آصف الدولہ اخلاقی لحاظ سے بلند کردار کے

مالک نہ تھے۔ انہوں نے انگریزوں کی شہ پر دولت چھیننے کے لئے اپنی والدہ بہو بیگم صاحبہ کے ساتھ جو ناروا سلوک کیا وہ بڑا دلگداز سانحہ ہے۔ انہوں نے انگریزوں کی مزید خوشنودی حاصل کرنے کے لئے فوج میں تخفیف کردی اور تمام دولت عیش و عشرت کے لئے وقف کردی۔ بقول مفتاح التواریخ

"نواب (آصف الدولہ) کے محل میں تقریباً پانچ سو حسین و جمیل عورتیں جمع تھیں۔ ان میں کئی ایسی بھی تھیں جن کو نواب نے حمل کی حالت میں محل سرا میں داخل کیا تھا۔ جب کوئی بچہ ان حاملہ عورتوں کے پیدا ہوتا تو نواب جشن مناتے اور اپنے فرزند کے طور پر اس کی پرورش کرتے۔ چنانچہ اس قسم کے ۲۰ بچے ان کے یہاں جمع ہو گئے تھے"[1] (بحوالہ بیگمات اودھ مصنفہ شیخ تصدق حسین مطبوعہ کتاب نگر لکھنؤ۔ طبع اول ۱۹۵۶ء)

آصف الدولہ کا دربار بڑی شان و شوکت کا تھا مگر ان کے عہد میں اودھ کے سر سبز اور زرخیز علاقے میں قحط پڑا۔ اپنے متبنّیٰ لڑکے وزیر علی خان (آصف الدولہ کی اپنی کوئی اولاد نہیں ہوئی) کی شادی میں انہوں نے جس قدر زرِ کثیر صرف کیا اس کا ذکر شرر کے الفاظ میں سنئے:

"وزیر علی خاں کی شادی میں انہوں نے ایسا حوصلہ دکھایا کہ برات کا تزک و احتشام تاریخ ارض کے تمام تکلفات سے بڑھ گیا۔ برات کے جلوس میں بارہ سو ہاتھی تھے۔ دولہا جو شاہی خلعت پہنے تھا اس میں بیس لاکھ کے جواہرات ٹنگے ہوئے تھے۔ محفل طرب کے لئے دو عظیم الشان اور پر تکلف خیمے بنوائے گئے جن میں ہر ایک ساٹھ فٹ چوڑا، بارہ سو فٹ لمبا اور ساٹھ فٹ بلند تھا۔ ان دونوں کی تیاری میں سلطنت کے دس لاکھ روپے صرف ہو گئے ہیں"[2]

تاہم آصف الدولہ میں کچھ خوبیاں بھی تھیں۔ انہیں عمارات کی تعمیر کا بہت نفیس ذوق تھا۔ دولت خانہ، عیش باغ، چوک، ریزیڈنسی اور رومی دروازے کے علاوہ انہوں نے ایک عظیم الشان امام باڑہ بنوایا جو "امام باڑہ آصف الدولہ" یا "بڑا امام باڑہ" کے نام سے مشہور ہے۔ اس امام باڑے کی چھت تمام دنیا میں لداؤ کی سب سے بڑی چھت ہے۔ تمام عمارت صرف اینٹ اور اعلیٰ درجے کے چونے سے بنائی گئی ہے اور لکڑی کہیں استعمال نہیں کی گئی۔ شہر کے متعدد محلے بھی عہدِ آصفی ہی میں تعمیر ہوئے، جن میں نخاس، کشمیری محلہ، حسن گنج اور رکاب گنج جیسے بڑے محلے بھی شامل ہیں۔ آصف الدولہ کی فیاضی کی دھوم تمام ملک میں تھی۔ مشہور تھا کہ "جسے نہ دے مولا اسے دے آصف الدولہ"۔

آصف الدولہ کے انتقال کے بعد ۱۷۹۸ء میں ان کی وصیت کے مطابق ان کے متبنّیٰ پسر وزیر علی خاں تخت پر بیٹھے مگر ایک تو ان کا حقِ وراثت مشتبہ تھا دوسرے انہوں نے جس پست اخلاق کا مظاہرہ کیا وہ کسی حکمران کے شایانِ شان نہ تھا لہٰذا مخالفت شروع ہو گئی۔ انگریزوں نے اس دفعہ پھر صورتِ حال سے فائدہ اٹھایا اور آصف الدولہ کے سوتیلے بھائی سعادت علی خاں کو (جو آصف الدولہ سے اختلافات کی وجہ سے بنارس میں سکونت پذیر تھے) اس پر آمادہ کیا کہ وزیر علی خاں کو تخت سے اتار کر اگر انہیں حکومت دلوا دی جائے گی تو وہ نصف ملک انگریزی عملداری میں شامل کر دیں گے۔ تمام امور انگریزوں کی مرضی کے مطابق انجام پا گئے اور نصف علاقہ کمپنی بہادر کو دیدیا گیا۔ انہوں نے انگریزوں کے ایما پر اپنی فوج میں مزید تخفیف کی اور ریذیڈنٹ کے علاوہ انگریزی فوج کے ایک حصّے کو لکھنؤ شہر میں قیام کرنے کی اجازت دیدی۔ پھر ۱۸۱۴ء میں سعادت علی خاں کے انتقال پر جب ان کے لڑکے غازی الدین حیدر فرماں روا ہوئے تو اودھ کے حکمراں انگریزوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن کر رہ گئے۔ گو بظاہر کمپنی بہادر کی نوازش سے وہ "بادشاہ" کہلانے لگے اور دربارِ دہلی سے جو برائے نام رشتہ باقی تھا وہ بھی ختم ہو گیا۔ غازی الدین نے "شاہِ زمن" کا لقب اختیار کیا لیکن درباری حالت اور انتظامِ سلطنت کی صورتِ حال بد سے بدتر ہو گئی۔ ذرا ایک منظر دیکھئے:۔

---

[1] ص ۳۸ [2] گذشتہ لکھنؤ ص ۳۶

"غازی الدین حیدر نے (آغا میر، وزیر سلطنت کو) گھونسوں اور لاتوں سے مارنے جس مار کو وہ خوشی سے کھا لیتا مگر اس کا بدلہ دیگر معززینِ دربار اور اعزائے شاہی تک سے لیا کرتا تھا۔"[1]

غازی الدین حیدر کے انتقال کے بعد ۱۸۲۷ء میں علم و فن کے دلدادہ نصیر الدین حیدر تخت پر بیٹھے۔ ان کے زمانے میں بھی نظامِ حکومت کی ابتری بدستور قائم رہی بلکہ اس میں کچھ اضافہ ہو گیا۔ دس سال بعد انگریزوں نے محلاتی سازشوں کی طرف پھر توجہ کی۔ نصیر الدین حیدر کو زہر دیا گیا۔ تخت نشینی کے لئے محمد علی خاں اور منا جان میں کشمکش شروع ہوئی اور انگریزوں کی مدد سے محمد علی خاں کامیاب ہوئے۔ تخت پر بیٹھنے کے بعد انہوں نے ایک معاہدے کی رُو سے لکھنؤ میں انگریزی فوج کی تعداد میں اضافہ کیا اور اسے یہ حق دیدیا کہ جس علاقے میں بدنظمی دیکھے اسے جب تک چاہے اپنے انتظام میں رکھے۔ اس طرح ایسٹ انڈیا کمپنی نے سلطنتِ اودھ کو پوری طرح اپنے شکنجے میں کس لیا۔ ۱۸۴۲ء تا ۱۸۴۷ء کا امجد علی شاہ کا عہد تو نسبتاً چین سے گذر گیا لیکن جب ۱۸۴۷ء میں واجد علی شاہ تخت نشین ہوئے تو ملک کی انتظامی حالت بیحد خراب ہو گئی۔ واجد علی شاہ موسیقی، ڈرامہ اور دیگر فنونِ لطیفہ کی طرف اس قدر مائل ہوئے کہ امورِ سلطنت سے بالکل بے نیاز ہو گئے۔ انہوں نے قیصر باغ کے محلات تعمیر کرائے جہاں عورتوں کے لئے رقص و موسیقی کی تربیت کا انتظام کیا۔ اسی قیصر باغ میں انہوں نے سالانہ میلے کی بنا ڈالی جس میں وہ خود جوگی بنتے اور کرشن کنہیا کا رول ادا کرتے اور محل کی عورتیں گوپیاں بنتیں۔ تسبیح موتیوں کو جلا کر بادشاہ کے جسم پر بھبھوت لگایا جاتا۔ عوام کو بھی میلے میں آنے کی اجازت ہوتی مگر اس شرط کے ساتھ کہ سب کے کپڑے گیروے ہوں۔ چنانچہ ان حالات کی اطلاع پر کمپنی بہادر نے ۱۸۵۶ء میں واجد علی شاہ سے بادشاہت کے اختیار سلب کر لئے اور اودھ کو انگریزی عملداری میں شامل کر لیا۔ لکھنؤ پر انگریزی فوج نے قبضہ کر لیا اور مملکت کے انتظام کے لئے ایک کمشنر تعینات کر دیا گیا۔ واجد علی شاہ کے اخراجات کے لئے بارہ لاکھ سالانہ پنشن مقرر کر دی گئی۔ وہ اپنے خاندان سمیت کلکتہ پہنچے۔ مٹیا برج میں قیام کیا اور اپنے ولی عہد کو اپیل کرنے کے لئے لندن بھیجا مگر طبیعت میں تن آسانی اور آرام طلبی تھی۔ پنشن اپیل کر دینے کی وجہ سے رک گئی تھی لہٰذا اپیل واپس لے لی اور پنشن وصول کر کے عیش و آرام کی زندگی دوبارہ شروع کر دی۔ کلکتہ ہی میں ۱۸۸۷ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔

اودھ کی بادشاہت میں اوّل اوّل وہ تمام خصوصیات موجود تھیں جو ایک عالی مرتبت دربار کے لئے ضروری ہیں۔ حکمران بہادر اور منتظم تھے، فوج مستعد اور تربیت یافتہ تھی اور رزم و بزم میں ایک توازن قائم تھا مگر بکسر کی شکست کے بعد دربار میں انگریزوں کا اثر و رسوخ بڑھتا گیا اور ان کی یہ کوشش رنگ لانے لگی کہ ذہنوں کو "رزم" سے ہٹا کر صرف "بزم" پر مرکوز رکھا جائے۔ شاہی دربار کی شان گو بظاہر بڑھتی رہی مگر در پردہ کم ہوتی چلی گئی۔ انگریزوں نے غازی الدین حیدر کو بادشاہت دے کر دراصل اختیارات کی بالادستی اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ چنانچہ اس دور کے نام نہاد مغل بادشاہوں کی طرح اودھ کے بادشاہوں میں بھی عیش پرستی روز بروز بڑھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ دولت، عزت، حکومت ہر چیز کو اس کے مقابلے میں ہیچ سمجھا گیا۔ نصیر الدین حیدر کی بیگم قدسیہ محل لوٹ کے تماشے سے محظوظ ہونے کی خاطر لاکھوں کے جواہرات لٹا دیتی تھیں[2]۔ حکمران طبقے کی خصوصیات رفتہ رفتہ عوام میں بھی پیدا ہو گئیں اور رقص و موسیقی سے لطف اندوز ہونا اور طوائف کی صحبت میں وقت گذارنا تہذیب و تمدن کی نشانی سمجھا جانے لگا۔ جب طوائفیں ملکہ کے رتبے تک پہنچ گئی ہوں اور ان کے رفقاء کا شمار قابلِ احترام درباریوں میں ہونے لگا ہو تو رئیسوں اور نوابوں کے لئے بھی ضروری ہو

---

[1] شرر : گذشتہ لکھنؤ۔ ص ۵۲ [2] رسوا نے "امراؤ جان ادا" میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ناول کے ایک کردار نواب سلطان مرزا ایک مقام پر بیان کرتے ہیں۔ "کیا کہوں! ایسی ہی مجبوری تھی۔ لکھنؤ کی جائداد بادشاہ نے ضبط کر لی تھی۔ لاٹ صاحب کے پاس کلکتے جانا ضروری تھا۔" (ص ۳۱۰)۔ [3] شیخ تصدق حسین : بیگمات اودھ (ص ۸۲)۔

گیا کہ وہ بھی طوائف کو ملازم رکھیں اور فنِ موسیقی کی سرپرستی کریں۔

لکھنؤ کے کلچر کا انحصار تین عناصر پر تھا۔ جنس، فنون اور مذہب۔ ایودھیا (فیض آباد) کی قربت کی وجہ سے ہندو مذہب کی اقدار یہاں پہلے سے مستحکم تھیں۔ اب برہان الملک کی بدولت اسلام کی مذہبی اقدار اور ایرانی تہذیب کے اثرات بھی سماج پر اثر انداز ہونا شروع ہو گئے۔ فنون کی آبیاری کے لئے کچھ تو اودھ کی سدا بہار وادیوں کے پرسکون ماحول نے ابتداء ہی سے سازگار فضا قائم کر لی تھی کچھ اودھ فرماں رواؤں کی عدیم المثال سرپرستی سے اس میں بے اندازہ ترقی ہوئی۔ اس علاقے کی زرخیز زمین ہُن برساتی تھی اور جب یہ ہُن لکھنؤ کے فیاض حکمرانوں کے ہاتھ آیا تو طبیعتیں عیش و آرام کی طرف خود بخود مائل ہو گئیں اور عورت کو معاشرے میں اہم مقام حاصل ہو گیا۔ عورت کے اس اقتدار نے کئی روپ اختیار کئے۔ شاہی خاندان کی عظیم المرتبت خواتین نے اکثر تاریخ کا رُخ موڑ دیا۔ روہیلوں سے شکست کھانے کے بعد جب صفدر جنگ دلّی میں مایوس زندگی گذار رہے تھے تو ان کی ملکہ صدر جہاں بیگم نے اپنا تمام اثاثہ (جو گیارہ لاکھ روپے اور چالیس ہزار اشرفیوں پر مشتمل تھا) شوہر کے قدموں میں ڈال دیا کہ وہ اسے فوجی اخراجات میں صرف کریں۔ چنانچہ اسی رقم سے دوبارہ فوج جمع کی گئی، اسلحہ اکٹھا کیا گیا اور اودھ پر دوبارہ قبضہ کیا گیا۔ آصف الدولہ کے زمانے میں ان کی والدہ (بہو بیگم صاحبہ) اس قدر اقتدار کی مالک تھیں کہ آصف الدولہ نے دار الحکومت کو لکھنؤ منتقل کر دینا ہی مناسب سمجھا۔ اسی طرح جب ۱۸۵۷ء میں واجد علی شاہ کلکتہ جا کر دوبارہ بادشاہت حاصل کرنے کے لئے کمپنی بہادر کی خدمت میں اپیل کر رہے تھے، ان کی ایک ملکہ (حضرت محل) لکھنؤ میں وطن کے سپاہیوں کو جمع کر کے غدر میں انگریزوں سے مقابلہ کر رہی تھی اور ایک طویل عرصے تک انگریز فوجیں ناکامی کا منہ دیکھتی رہی تھیں۔ لکھنوی سوسائٹی میں عورت کا اقتدار طوائف کی شکل میں بھی نمایاں ہوا۔ عورت اپنی جنسی کشش کی بدولت رقص و موسیقی میں زیادہ کامیابی و دلکشی حاصل کر لیتی ہے۔ پھر لکھنؤ کی طوائف میں اس لئے بھی زیادہ کشش پیدا ہو گئی کہ اسے موسیقی، بھاؤ اور نرت کے علاوہ ادب و شعر اور آدابِ مجلسی کی تعلیم دی گئی۔ رفتہ رفتہ لکھنؤ کی طوائف برّ صغیر کی طوائفوں سے علیحدہ ایک منفرد حیثیت کی مالک ہو گئی اور محض مرکزِ تفریح ہی نہیں بلکہ تہذیبی درسگاہ بھی بن گئی۔ چنانچہ اپنے کمالِ فن کی بدولت اکثر طوائفیں ملکۂ اودھ کے مرتبے تک پہنچیں جن میں عمدہ خانم ناکہ کی امراؤ بیگم (ملکہ واجد علی شاہ) بہت مشہور ہوئی۔[۵۱] عورت کے اس اقتدار نے شعر و ادب کو بھی متاثر کیا۔ عاشقانہ مضامین، حسن پرستی اور خارجیت کے فروغ کے علاوہ ریختی نے بھی اپنا رنگ چمکایا۔

جنس کے علاوہ اودھی تمدن کا دوسرا اہم ستون "فنون" ہیں۔ جس قدر تنوع اور کمال تمام فنون کو لکھنؤ میں نصیب ہوا اس کی مثال دُور دُور تک نہیں ملتی۔ تقریباً تمام فرمانرواؤں کو ان سے دلی وابستگی تھی بلکہ آخری بادشاہ کو تو عملی وابستگی بھی تھی۔ آصف الدولہ کے زمانے میں "اصول النغمات آصفیہ" تحریر کی گئی تھی مگر واجد علی شاہ نے موسیقی میں خود کئی راگنیاں (مثلاً جوگیا، کنٹر، جوہی) اور کئی نئی گتیں (مثلاً انعامی گت، سلامی گت) ایجاد کیں، نرت اور لَے میں کمال حاصل کیا اور اس فن پر کئی کتابیں (ناجو، بنی، دلہن) تصنیف کیں۔ ایودھیا اور بنارس کا کتھک ناچ پہلے سے مقبول تھا۔ اب طوائفوں کے بھاؤ اور کشمیری بھانڈوں کی نقل سے ایک نیا رنگ پیدا ہو گیا۔ چنانچہ رقص و موسیقی کا ذوق لکھنؤ میں اس قدر عام ہو گیا کہ ایسے لوگ کثیر تعداد میں نظر آنے لگے جو راگ راگنیوں کو پہچانتے تھے۔ موسیقی کے علاوہ اس دَور کے لکھنؤ میں شاعری کا بھی بڑا دور دورہ ہوا۔ یوں تو آصف الدولہ بھی شاعر تھے مگر واجد علی شاہ متعدد شعری تصانیف کے مصنف ہونے کے علاوہ اس فن میں مہارت بھی رکھتے تھے۔ شجاع الدولہ کے زمانے سے لے کر انتزاع سلطنت تک ہر دَور میں شعرا کی بڑی قدر افزائی کی گئی اور انہیں بکثرت انعامات و وظائف سے نوازا گیا۔ چنانچہ دہلی اور ملک کے دوسرے علاقوں سے ترکِ

---

[۵۱] شیخ تصدق حسین: بیگمات اودھ۔ ص ۲۵۳۔

سکونت کر کے شعرا فیض آباد اور لکھنؤ میں سکونت پذیر ہو گئے۔ میر و سودا سے لے کر آتش و ناسخ تک تقریباً ایک صدی تک لکھنؤ کے محلات اور گلی کوچوں میں اردو شاعری کا ڈنکا بجتا رہا۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ عوام تک کی زبان شستہ ہو گئی۔

لیلیٰ کی انگلیاں ہیں
مجنوں کی پسلیاں ہیں
کیا خوب ککڑیاں ہیں

عوام کی زبان میں ادبی شان پیدا ہوئی تو پھبتی، تک بندی اور ضلع جگت کو بھی فن کا مرتبہ مل گیا۔ خطاطی اور مصوری کو بھی لکھنؤ میں بڑا عروج ملا۔ نواب سعادت علی خاں اور نواب وزیر علی خاں شکست کے کامل خوشنویس تھے۔ ہوم اور مانٹز نامی دو (علی الترتیب) انگریز اور جرمن مصور لکھنؤ آئے اور شاہی خاندان نے ان کی بڑی قدر دانی کی۔

فنونِ لطیفہ کے علاوہ عملی فنون نے بھی لکھنؤ میں بڑی ترقی کی۔ شہزوری، تیر اندازی، بانک اور تیراکی کے بڑے بڑے استاد پیدا ہوئے جن میں علی الترتیب شہنشاہ دولہ، فیض بخش، منصور علی خاں اور میر مجھلی نے بڑا نام پیدا کیا۔ جب جنگی تیاریوں اور فوجی تربیت سے لاپرواہی برتی گئی تو اس کی جگہ جانوروں کی لڑائی نے لے لی اور ذوقِ شجاعت کی تکمیل کا یہ نیا طریقہ اختیار کر لیا گیا۔ جانوروں کی لڑائیاں بہت بڑے پیمانے پر لڑی جاتی تھیں۔ شیر، چیتے، تیندوے، ہاتھی، اونٹ، گینڈے، بارہ سنگھے، مینڈھے، مرغ، بٹیر، تیتر، گلدم، لال، کبوتر، طوطے، بیا وغیرہ کی لڑائیوں کے تماشے بہت بڑے پیمانے پر ہوا کرتے جن میں رؤسا و عوام یکساں دلچسپی لیتے۔

خیاطی میں نئی نئی تراشیں ایجاد ہوئیں۔ آرام طلبی کی وجہ سے ایسا لباس وضع کیا گیا جو موسم گرما میں آرام دہ ہو چنانچہ مغلیہ زمانے کے تنگ پائجاموں، نیم جاموں اور پگڑیوں کی جگہ کھلے پائنچوں کا پاجامہ، شیروانی اور دو پلی ٹوپی رائج ہوئی اور رفتہ رفتہ تمام ملک میں یہ لباس رائج ہو گیا۔ ابتدا میں زنانے اور مردانے پائجاموں میں زیادہ فرق نہ تھا، بعد میں زنانے پائجاموں کے پائنچوں کا گھیر اتنی چار گنا بڑھا دیا گیا اور وہ غرارہ کے نام سے موسوم ہو گیا۔ کھانے پینے کی چیزوں میں جس جدت، نفاست، لذت اور عمدگی کا خیال رکھا گیا وہ بڑی طویل داستان ہے۔ مختصر یہ کہ کھاتے پیتے گھرانوں میں ساٹھ ستر قسم کا کھانا زیبِ دسترخوان ہوا کرتا اور ان میں نت نئی جدتیں ہوتی رہتیں۔

لکھنوی تمدن کا تیسرا اہم رکن "مذہب" تھا۔ اودھیا ہندو مذہب کا بڑا تیرتھ تھا۔ مغلوں کے زمانے میں فرنگی محل میں درسگاہ نظامیہ قائم ہوئی تو لکھنؤ حنفی فقہ کا مرکز بھی بن گیا۔ شاہی خاندان کا مذہب شیعہ اثنائے عشری تھا لہٰذا بادشاہت قائم ہونے کے بعد یہ شہر شیعہ فقہ کا مرکز بھی بن گیا اور خاندانِ اجتہاد کو عروج حاصل ہوا۔ امجد علی شاہ کے زمانے میں تو مجتہدین ہی کو وزارت کا کام بھی سونپ دیا گیا۔ اس طرح لکھنؤ تہذیبی مرکز کے علاوہ برصغیر کا علمی مرکز بھی بن گیا اور مذہبی موضوعات پر بکثرت کتابیں تصنیف ہوئیں۔ شیعہ مذہب کی سرپرستی کے باوجود شاہانِ اودھ میں مذہبی تعصب بالکل نہ تھا۔ مملکت کے بڑے بڑے عہدوں پر سنی اور ہندو حضرات ہر دور میں بکثرت مقرر کئے جاتے اور محرم و عیدین کی طرح ہولی اور بسنت پر بھی شاہی دربار منعقد کیا جاتا۔ جب واجد علی شاہ نے قیصر باغ میں اردو اسٹیج کی بنا ڈالی اور پری خانہ سجایا تو کرشن جی اور ان کی گوپیوں کے افسانے کو ڈرامے کا موضوع بنایا۔ یوں کرشن جی کے انتخاب کی ایک اور وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ لکھنوی تمدن جن عناصر (جنس، فنون، مذہب) سے عبارت تھا وہ کنہیا کی شخصیت میں یکجا نظر آتے ہیں۔ شاہی کے خاتمے پر تنگ نظری اور انگریز کی حکمتِ عملی سے علم و ادب کا یہ مرکز مناظرہ اور طنز و تشنیع کا مرکز بن گیا۔ چنانچہ عبدالماجد دریابادی نے شیعوں کے خلاف مضامین کا سلسلہ شروع کیا اور مرزا رسوا نے "تحفہ اثنائے عشری"

کے جواب میں "ہدیۂ سنیہ" لکھی اور رسالہ "الحکم" جاری کیا۔

شاہی زمانے میں تہذیبی و مذہبی قدریں آپس میں اسقدر گھل مل گئی تھیں کہ انہیں علیحدہ علیحدہ خانوں میں تقسیم کرنا بہت مشکل ہے۔ مرزا رسوا کے اولین ناول "افشائے راز" کے ایک کردار نواب سلطان صاحب کو دیکھئے۔ شب عاشور کی چہل قدمی میں ملازم طوائف بھی ہمراہ ہے:

"نواب صاحب بھی شیعہ تھے مگر (سوز خوانی سننے میں) محتاط نہ تھے۔ نواب صاحب کے یہاں محرم میں تاشوں پہ ماتم ہوتا تھا۔ شب عاشور آپ چہل قدمی ضرور کرتے تھے۔ ننگے سر ننگے پاؤں، سبز کپڑے، دوست احباب و امراؤ جان (ملازم رنڈی) ساتھ، ایک مشعلچی ساتھ۔ سوز خوانی سے خود شوق تھا بلکہ موسیقی میں بھی معلومات اچھی تھیں"[1]

لکھنؤ کی معاشرت پر مذہب (خصوصاً مذہب شیعہ) کے گہرے اثرات پڑے۔ شاعری، موسیقی، لباس، فن تعمیر سبھی متاثر ہوئے۔ شاعری میں لفظی کاریگری اور خارجیت کو لکھنوی ماحول نے بہت اہمیت دے دی تھی مگر اس خار زار کے علاوہ مرثیہ نگاری نے حسن اخلاق اور حسن عمل کے جو پھول کھلائے اس کا احسان اردو ادب کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ غزل، مثنوی اور قصیدے کو حسن تکمیل دینے کے ساتھ ساتھ مرثیہ، سلام، سوز اور نوحہ کا گراں بہا اضافہ بھی ہوا۔ خصوصاً مرثیہ نگاری میں ہیئت اور موضوع کے کامیاب تجربے کئے گئے۔ مذہب کا اثر موسیقی پر بھی پڑا۔ تعزیہ داری کے لئے تاشہ، نوبت اور ڈھول میں کمال حاصل کیا گیا۔ خود واجد علی شاہ بہت عمدہ تاشہ بجاتے تھے۔ مذہبی اجتماعات میں بھی اب موسیقی کے اصول کو زیادہ برتا گیا۔ خصوصاً سوز خوانی، مرثیہ خوانی اور نوحہ خوانی میں راگوں کی مناسبت کا خیال رکھا جانے لگا۔ بڑے بڑے گویّے، استاد اور طوائفیں جب ایام عزا میں سوز خوانی کرتے تو ہزاروں کا مجمع جمع ہو جاتا۔ حیدر جان کے نوحے آج بھی لکھنؤ کے بوڑھوں کے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ لباس بھی مذہب سے متاثر ہوا۔ چوگوشیہ ٹوپی (جو چار حصوں کو ملا کر بنائی جاتی تھی) لکھنؤ میں پہلے بہت مقبول ہوئی۔ پھر پنجتن کی مناسبت سے اسے پنجگوشیہ بنا دیا گیا۔ اور وہ پانچ حصوں کو جوڑ کر بنائی جانے لگی۔ ایام عزا میں خواتین اپنے تمام زیور یہاں تک کہ چوڑیاں بھی اتار لیتی تھیں۔ ان کی جگہ نفاست پسند لوگوں نے سیاہ ریشم کے کرن پھول اور کڑے ایجاد کئے۔ مذہب کا اثر فن تعمیر پر بھی پڑا۔ ایسے رہائشی مکانات بکثرت تعمیر ہوئے جن میں ایک بڑا کمرہ، اس کے آگے دوہرے دالان اور دالان کے آگے صحن ہوتے۔ صحن کی نسبت دالان اور دالان کی نسبت کمرے کی نشست اونچی رکھی جاتی۔ اس طرح مکان کو محرم میں بڑی مجلسوں کے لئے استعمال کر لیا جاتا۔ صحن کی دوسری جانب حسب ضرورت کمرے بنا لیے جاتے جو رہائش کے کام آتے۔ آج بھی لکھنؤ کے اکثر پرانے مکانوں میں یہ خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

فروری ۱۸۵۸ء میں جب رسوا پیدا ہوئے تو لکھنوی تہذیب کا یہ محل متزلزل تھا۔ شہر میں غدر کا ہنگامہ برپا تھا۔ حضرت محل برجیس قدر کو اودھ کے تخت پر بٹھا کر مصروفِ جنگ تھیں۔ چاروں طرف مورچے بن رہے تھے۔ گومتی کے پار انگریزی فوجوں کا پڑاؤ تھا۔ ایک ماہ بعد مارچ میں حضرت محل کی فوج کو شکست ہو گئی اور انگریزی عملداری شروع ہوئی۔ جب رسوا نے ہوش سنبھالا تو شکستہ محلے پھر سے آباد ہونا شروع ہو گئے تھے۔ انگریزی اسکول، اسپتال اور گرجا گھر بن چکے تھے۔ اطراف میں ریل بچھائی جا رہی تھی۔ ڈاک گھر اور تار گھر بن رہے تھے۔ عدالتوں میں نیا قانون رائج ہو گیا تھا۔ نئی تہذیب نے اپنی جلوہ سامانی شروع کر دی تھی مگر لکھنؤ کی اپنی تہذیب بھی کسی نہ کسی حد تک ابھی باقی تھی۔

نہیں وہ بات لیکن رنگ سے رخسار جاناں پر ابھی باقی ہے کچھ کچھ دھوپ دیوار گلستاں پر

---

[1] ص ۵۴۔

اور رسوا کے ذہن پر بیک وقت ان دونوں نظریاتِ حیات نے اثر ڈالا۔ انہوں نے عربی، فارسی، طب اور فلسفہ کی تعلیم بھی پائی اور لا مارٹینیز اسکول میں انگریزی بھی پڑھی۔ فقہ اور علم الکلام کا مطالعہ بھی کیا اور سائنس کی بھی تعلیم حاصل کی۔ چنانچہ ان کا ذہن دونوں رنگوں کی ایسی آماجگاہ بن گیا جس میں پریشان خاطری اور انتشار تھا۔ ذہن میں مختلف رجحانات گڈمڈ تھے۔ اس طرح ان کی شخصیت اپنے پرآشوب تغیر پذیر زمانے کی نمائندہ بن گئی۔ انہوں نے معاشرتی اقدار کی تبدیلیوں کو محسوس کیا اور قدیم و جدید کے توازن کو موزوں سمجھا۔ یہ درست ہے کہ انہوں نے ناول اپنی مالی مشکلات پر قابو پانے کے لئے لکھے مگر انہوں نے ان سے سماج کی تصویر کشی اور اصلاح کا کام بھی لیا۔ ان تحریروں میں بین السطور تعمیر و ترقی کی لگن پائی جاتی ہے۔ سبک رفتاری سے بدلتے ہوئے حالات میں معاشرے کو سنبھالا دینے کے لئے انہوں نے ایک پریشان حال، بے عمل، شکست خوردہ نسل کے سامنے اپنا نظریہ حیات پیش کیا۔ وہ ایک بیدار مغز انسان تھے۔ انہوں نے صحیح اندازہ لگایا کہ تنزل کی سب سے بڑی وجہ متوازن کردار کا فقدان ہے۔ شاہی زمانے کی عطا کی ہوئی جاگیروں، وثیقوں، وظائف اور مصاحبت نے طبیعتوں کو محنت و مشقت سے منحرف کر دیا ہے۔ صنعت و حرفت زوال پذیر ہیں۔ علوم کی نہ اب قدر ہے نہ لوگوں میں اس کا ذوق و شوق ہے۔ ہر طرف جمود و اضمحلال چھایا ہوا ہے لہٰذا وقت کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ کردار کی تعمیر اس طرح کی جائے کہ نئے حالات سے نبھایا جا سکے۔ اس مقصد کے لئے مرزا رسوا نے ایک علیحدہ تصنیف "شریف زادہ" لکھی جس میں ناول کے مرکزی کردار عابد حسین کو انہوں نے محنت، ذہانت اور اخلاقی سربلندی کی بدولت غربت و جہالت پر قابو پاتے ہوئے دکھایا ہے۔ پیش لفظ ہی میں انہوں نے وضاحت کر دی کہ یہ کردار ان کے نزدیک ایک مثالی (IDEAL) انسان ہے۔ عابد حسین میں بڑی بڑی مصیبتوں اور حادثات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ انہیں محنت سے ایسی لذت حاصل ہوتی ہے جو دل کو اطمینان اور فراغت دیتی ہے۔ ان کے دل میں علوم کو سیکھنے کی لگن پائی جاتی ہے۔ وہ اپنی ذہنی و عملی صلاحیتوں سے انسانیت کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی طبیعت میں ایثار، شرافت، مروت اور سادگی رچی ہوئی ہے۔ وہ رؤسا کی مصاحبت کر کے اپنا پیٹ پالنا پسند نہیں کرتے بلکہ اپنی زندگی حصولِ علم سے سنوارنا چاہتے ہیں۔ انہیں اس بات کا احساس ہے کہ قوم کو اب کس تعلیم کی ضرورت ہے۔ وہ اپنے بچے کو فقہ و علم الکلام کی جگہ مذہب کے صرف بنیادی اصولوں کی تعلیم دلا کر فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم دلاتے ہیں۔ "امراؤ جان ادا" میں کانپور کے مولوی صاحب کی شخصیت پر انہوں نے جو طنز کیا ہے، دراصل وہ قدیم طرزِ تعلیم پر طنز ہے۔ وہ اس تعلیم کو نامکمل سمجھتے ہیں کیونکہ یہ نہ باعزت زندگی گذارنے کے لئے فرد کے کام آتی ہے، نہ علوم کے نئے در کھولتی ہے اور نہ قومی ضروریات کو پورا کرتی ہے۔ "شریف زادہ" میں عابد حسین کے کردار کے ذریعہ انہوں نے واضح کیا کہ تعلیم کا نصب العین کیا ہونا چاہیے۔ مقصد کے لحاظ سے اس ناول اور حالی کی مسدس میں بڑی حد تک یکسانیت پائی جاتی ہے۔ البتہ مرزا نے ماضی پرستی سے دامن بچاتے ہوئے، حال کی روشنی میں مستقبل پر روشنی ڈالی ہے۔ انفرادی و اجتماعی زندگی کو سنوارنے کے لئے وہ ظاہرداری کی جگہ سادگی و بے تکلفی اور جہالت کی جگہ علم و ہنر کا راج دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ لوگ حرفت و ہنر کی طرف مائل ہوں اور رؤسا صنعت کو اپنائیں کیونکہ ملک اب زراعتی دور سے نکل کر صنعتی دور میں قدم رکھ رہا ہے۔ محنت و جانفشانی سے کترانے کے جو مہلک نتائج نکلیں گے اس کی ہیبت ناک تصویر "ذات شریف" میں انہوں نے بڑی خوبی سے کھینچی ہے۔ وہ اہل لکھنؤ کے اس نظریے کی مخالفت کرتے ہیں کہ طوائف کو بیوی سے برتر سمجھا جائے۔ اور اس کی خوشنودی کے لئے گھر بار تباہ کرنے میں دریغ نہ کیا جائے۔ آوارگی میں زمانے بھر کی سیر کر لینے کے بعد امراؤ جان کہتی ہے:۔

"سچی چاہت کا مزہ اسی نیک بخت کا حق ہے جو ایک کا منہ دیکھ کے دوسرے کا منہ کبھی نہیں دیکھتی۔ تجھ جیسی بازاری شفتل کو یہ نعمت خدا نہیں دے سکتا۔" (امراؤ جان ادا، ص ۳۴۳۔)

وہ طوائف کو معاشرے کے زوال کی نشانی سمجھتے ہیں۔ امراؤ اور سلطان صاحب کے معاملات سے وہ یہ بات واضح کرتے ہیں کہ عورت کے دل میں باعزت زندگی گذارنے کا جذبہ ضرور ہوتا ہے۔ رسوا شاعری کو محض تبلیغی رنگ میں رنگنے کے قائل تو نہیں البتہ اسے زندگی کے حسن کا آئینہ بنانے کی لگن میں وہ زمانے کے مروجہ مذاقِ سخن میں اصلاح ضرور چاہتے ہیں۔ "امراؤ جان ادا" میں ایک مشاعرے کا منظر بھی ہے۔ اس میں اظہار الحق نامی ایک باہر کے شاعر سے جو نظم پڑھوائی ہے وہ لکھنؤ کے اس دور کے رنگِ شاعری پر مزیدار طنز ہے۔ البتہ اپنی افتادِ طبع کی بدولت وہ معاشرتی اصلاح کی تحریکوں سے عملی طور پر وابستہ نہ ہو سکے۔ لکھنؤ کی مخصوص مذہبی فضا کے زیر اثر انہوں نے محض آل انڈیا شیعہ کانفرنس کی اصلاحی کوششوں میں شمولیت کو کافی سمجھ لیا۔ چنانچہ بچپن میں انہیں جو مذہبی تعلیم دی گئی اس نے پختگی کے سن کو پہنچ کر مناظرے کا انداز اختیار کر لیا۔ مذہبی اقدار کے تحفظ کے اسی جذبے کے تحت انہوں نے سوشلزم کی شدت سے مخالفت کی۔ "خونی جورو" کے دیباچے میں انہوں نے صاف صاف کہا:

"........ یہ ہے ابتداء اس فرقے کی جس کو ناظمی یا مذہب اباحت یا قرمطی کہتے ہیں۔ اسی فرقہ کا دوسرا نام سوشلزم ہے جو نئے نئے پیرایوں سے دنیا میں ظاہر ہوا کرتا ہے۔ دراصل یہ فرقہ دشمن تہذیب و تمدن ہے۔ یہ لوگ انواع و اقسام کے فریب دیتے ہیں۔ خدا ان کے فریب سے محفوظ رکھے۔"[1]

اسی طرح منظوم ڈرامہ "مرقع لیلیٰ مجنوں" میں حقیقتِ کائنات کی بحث چھیڑ کر منکرین و ملحدین سے یوں خطاب کیا:

کھول تو آنکھ ذرا دیکھ تماشا کیا ہے	وہم ہے یا کہ حقیقت ہے یہ دنیا کیا ہے
ہم نے مانا کہ یہ سب وہم ہے اے منکرِ ذات	تو ہی کہہ دے کہ پھر اس وہم سے ہونا کیا ہے
تو یہ کہتا ہے ہیولیٰ کے یہ سب دھوکے ہیں	پھر ہیولیٰ بھی تو دھوکہ ہے یہ دھوکہ کیا ہے
پھر کہا تو نے کہ دیکھا نہیں خالق کو کبھی	تو ہی بتلا دے کہ تو نے ابھی دیکھا کیا ہے
یعنی دیکھا نہ ہو جس کو اسے ہم کیوں مانیں	اک ذرا غور تو کر جی میں تو کہتا کیا ہے
تو نے دیکھا ہے مزاجی و ہیولیٰ کو کبھی	پھر جو قائل ہے تو ان کا تجھے سودا کیا ہے
بے بنائے تو کسی کے نہیں بنتا کچھ بھی	تجربہ ہم کو بتا دے کہ بتاتا کیا ہے
مان لے تو کہ نہیں کوئی بنانے والا	پھر قیام اپنا ذرا دیکھ تو بنتا کیا ہے
اس کا ہونا نہیں واجب تو نہیں کچھ ممکن	پھر اگر کچھ بھی نہیں ہے تو یہ جھگڑا کیا ہے[2]

اس شدت کے ساتھ رسوا مغربی تہذیب کے مخالف بھی ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ مغربی علوم کے حصول کے ساتھ ساتھ نئی نسل مشرقی تہذیبی اقدار کو اپنائے رہے۔ انہیں لکھنؤ بہت عزیز ہے:

"لکھنؤ سے مجھ کو خاص محبت ہے نہ صرف اس سبب سے کہ میرا وطن ہے بلکہ اس لئے کہ اس گئے گذرے حال میں بھی یہاں ایک بات ہے ناظرین! اسی ایک بات کے سمجھانے کے لئے ہم نے یہ ناول لکھا ہے۔"[3]

رسوا کو لکھنؤ میں جو "ایک بات" نظر آتی ہے وہ اس شہر کی تہذیب ہے اور چونکہ اس شہر کو "مشرقی تمدن کا آخری نمونہ" کہا گیا ہے (شرر

---

[1] خونی جورو، ص ۷۔ [2] مرقع لیلیٰ مجنوں، ص ۱۲۳۔ [3] "افشائے راز"، صفحہ ۱۷۔

نے اسی نام سے لکھنؤ سے متعلق کتاب لکھی تھی۔) اس لئے انہیں اس شہر سے والہانہ محبت تھی۔ اس تہذیب میں حسنِ اخلاق، مروّت، وضعداری اور ذوقِ جمال خاص اہمیت رکھتے ہیں اور یہ باتیں رسوا کو بہت عزیز ہیں۔ رسوا لکھنؤ کے ابتدائی گریجوایٹس میں سے تھے مگر انہوں نے ہمیشہ دیسی لباس اور وطنی طرزِ معاشرت ہی اختیار کیا۔ وہ بچوں کو تعلیم کے لئے انگلستان بھیجتے وقت چاہتے تو یہی ہیں کہ یہ مشرقی تہذیب پر آنچ نہ آنے دیں لیکن انہیں اپنی آرزو کی تکمیل کی توقع نہیں۔ وہ وقت کے تیز دھارے کی روانی کا احساس رکھتے ہیں۔

ترک ان سے سب بزرگوں کا چلن ہو جائے گا

لکھنؤ چھٹ جائے گا لندن وطن ہو جائے گا [1]

قدیم و جدید کی آویزش میں ان کا اندازہ صحیح تھا کہ پسپائی قدیم کی ہی ہو گی۔ نئی نسل نئی تہذیب سے اپنا دامن نہ بچا پائے گی۔ "افشائے راز" کے دیباچے میں انہوں نے سچ کہا تھا:

"افسوس یہ زمانہ بہت جلد گذرنے والا ہے کیونکہ دنیا ایک نئی سمت میں حرکت کر رہی ہے" [2]

رسوا کا دل قومی درد سے لبریز تھا۔ وہ کانگریس کا ابتدائی دور تھا۔ رسوا وطنی تحریک سے متاثر ہوئے اور اس موضوع پر ایک طویل نظم "نوبہار" ۱۸۸۶ء میں لکھی جو کتابی صورت میں بھی شائع ہوئی اور بہت مقبول ہوئی۔ تاہم انہوں نے انگریز حکومت کی برکتوں کا اعتراف بھی کیا اور اس تلخ حقیقت کو بھی بیان کیا کہ بدیسی حکومت کا طوق ہماری اپنی نا اہلیت کا فطری نتیجہ ہے۔ وقت نہ کسی کا انتظار کرتا ہے نہ کسی کو معاف کرتا ہے ان کا خیال تھا کہ اجتماعی لحاظ سے انگریزوں کو اس برصغیر کے لوگوں سے ہمدردی نہیں لیکن انفرادی لحاظ سے قانون کی بالا دستی اب پہلے سے بہتر حال میں ہے۔ شاہی زمانے میں افراتفری تھی، ہمیشہ غیر یقینی فضا قائم رہتی۔ اب عوام کو نسبتاً سکون میسر تھا۔ ان چوروں اور ڈاکوؤں کا اقتدار کم ہو گیا تھا جن کی دستبرد سے شاہی زمانے میں تو امین بھی محفوظ نہ تھے۔ پہلے ہوس پرستی کی خاطر گلی کوچوں میں معصوم لڑکیاں فروخت کی جاتی تھیں، چوک کے کوٹھوں پر ہی نہیں، بلکہ روٴسا کے محلوں میں بھی۔ نئی حکومت میں اس کی گنجائش نہ رہی تھی۔ بادشاہی دور میں محکمے غیر منظم تھے اور فوج ناکارہ تھی:

"جی ہاں ڈونڈی تک (حضرت محل کے) ہمراہ گئی۔ راستے میں نمک حرام اور بزدل افسرانِ فوج کے غمزے اور بیگم صاحبہ کی خوشامد عمر بھر نہ بھولے گی۔ ایک صاحب کہتے ہیں کہ "حضور صاحب! ان کے راج میں ہم پیدل چلیں"۔ دوسرے صاحب فرماتے ہیں "بھلا کھانے کا تو انتظام درست ہوتا"۔ تیسرے صاحب افیم کو پیٹ رہے ہیں۔ چوتھے اپنی جان کو رو رہے ہیں کہ حقہ وقت پر نہیں ملا" [3]

اس سلطنت کا جو فطری انجام ہونا چاہیے تھا سو ہوا۔ رسوا نے انگریز حکومت کو خوش آمدید کہا، سرسید کی طرح مصلحت پسندی سے کام لیتے ہوئے انہوں نے بدیسی حکومت کی خوبیوں کو ابھارا اور علوم کے جو نئے اُفق نئے دور میں روشن ہوئے تھے ان کو نعمت و برکت قرار دیا۔ دونوں حکومتوں کے طریقِ کار کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا:

"اس طرح کے واقعے (دفعتاً امیر کا غریب اور غریب کا امیر ہو جانا) شاہی میں اکثر ہوا کرتے تھے اور ایسے ہی زمانے میں ان کا ہونا ممکن ہے جبکہ عنانِ حکومت ایک شخص کے ہاتھ میں ہو اور وہ کسی قاعدے اور قانون کا پابند نہ ہو۔ مُلک کو اپنی مِلک اور خزانے کو اپنا مال سمجھے۔ انگریزی عملداری میں ان فضول خرچیوں کی گنجائش نہیں ہے۔ اس زمانے میں تقدیر کا زور نہیں چلتا جو کچھ ہوتا ہے تدبیر سے ہوتا ہے...... وہ دن

---

[1] مثنوی "نوبہار"، ص ۱۷۔ [2] دیباچہ "افشائے راز"، ص ۱۰۔ [3] امراؤ جان ادا، ص ۲۴۳۔

گئے۔ خلیل خاں فاختہ اڑا چکے۔ سنتے چلے آئے ہیں کہ دولت اندھی ہے مگر اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی حکمت سے اس کی آنکھیں کھول دی گئی ہیں۔" (امراؤ جان ادا، ص ۳۳۶)

رسوا کا یہ زاویۂ نظر خوشامد پر نہیں بلکہ اقتضائے زمانہ اور حقیقت پسندی پر مبنی تھا۔ انہوں نے ہمیشہ غیر سرکاری ملازمت کی اور سرکارِ انگلشیہ سے کبھی کوئی واسطہ نہ رکھا اور حب الوطنی کے جذبات کا اظہار بڑے والہانہ پن سے کیا۔ انہیں نئی نسل سے یہ توقعات تھیں کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو قومی احیاء کے لئے وقف کر دے گی۔ "نوبہار" کے یہ اشعار دیکھئے:

"نوبہارِ ہند" پر دل ہے مرا آیا ہوا — آنکھ سے دیکھوں نہ یارب پھول کمھلایا ہوا

دیکھتا کیا ہوں کہ لڑکے ہیں سوئے مکتب رواں — دل یہ بول اٹھا کہ دیکھ ان نوبہاروں کا سماں

اکثر ان میں دولتِ علم و ہنر لے جائیں گے — گھر سے بھوکے آئے ہیں یہ سیر ہو کر جائیں گے

دیکھنا اللہ کی قدرت یہ کیا ہو جائیں گے — چار دن میں ملک کے حاجت روا ہو جائیں گے

کیا تعجب قوم کے حامی دیاور ان میں ہوں — کیا عجب اس ڈوبتی کشتی کے لنگر ان میں ہوں

ماں کا ارماں، باپ کی حسرت ہے ان کے ساتھ ساتھ

بلکہ ساری قوم کی عزت ہے ان کے ساتھ ساتھ

مرزا قوم کے مستقبل سے پر امید تھے اور وطنی تحریک کی کامیابی کا انہیں پورا یقین تھا۔ ان کی زندگی کے آخری ایام میں یہ تحریک بہت زور پکڑ گئی تھی مگر اب ان کے قویٰ مضمحل ہو چکے تھے اور وہ حیدر آباد دکن میں گوشہ نشینی کی زندگی گذار رہے تھے لہٰذا عملی دلچسپی کا اظہار نہ کر سکے۔

سید معین الرحمٰن

اُردو کی نثری داستانوں میں کردار نگاری

—— باغ و بہار تک ——

اردو میں افسانوی ادب کی داغ بیل سترھویں صدی عیسوی میں پڑی۔ ملّا وجہی کی "سب رس" (۱۶۳۵ء) کو اردو نثر میں افسانہ نگاری کا نقطۂ آغاز کہا جاسکتا ہے۔ یہ ایک دلچسپ، مسلسل اور نیم طبع زاد عشقیہ تمثیل ہے۔ تمثیل کا انداز یہ ہوتا ہے کہ اس میں بالعموم بعض مجرّد صفات کو مجسم بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ یعنی ان مجرد صفات کو ایسی شکل دی جاتی ہے کہ وہ بظاہر ہمیں ذی رُوح دکھائی دیتی ہیں۔ تمثیل میں ڈاکٹر) فرمان فتح پوری کے بقول:

"مسلسل تشبیہات و استعارات سے کام لیا جاتا ہے اور اصل موضوع پر براہِ راست بحث کرنے کے بجائے اسے تخئیلی و تصوراتی کرداروں کے ذریعے مسلسل کہانی یا واقعہ کی شکل میں بیان کیا جاتا ہے۔[۱]"

"سب رس" میں یہی انداز اختیار کیا گیا ہے۔ اس قصے کے سب کردار تخئیلی و تصوراتی ہیں۔ مثلاً اس میں ایک کردار ہمت ہے اور اس طرح غمزہ، کرشمہ، قامت وغیرہ بھی کردار ہیں۔

وجہی نے "سب رس" میں بڑی خوبی و خوبصورتی سے عشق و عقل اور حسن و دل کے معرکے بیان کئے ہیں۔ عقل نامی بادشاہ کا فرزند دل قصے کا مرکزی کردار ہے۔ وجہی نے اس کا تعارف اس طرح کرایا ہے:

"اس کا جوڑ دنیا میں کہیں نہ تھا۔ واصل کامل، عاشق عاقل، عالم عامل، ناؤں اس کا دل۔ دانشمندی، ترکش بندی، قبول صورتی، دلاوری سب عالم تے اسے حاصل .... تخت و تاج کا لائق، سب پر فائق۔ بات میں قابل، سب میں فاضل ——"

(سب رس، مرتبہ شمیم انہونوی (مکتبہ کلیاں، لکھنؤ فروری ۶۲ ۱۹ء) صفحہ ۲۴)

عقل بادشاہ نے اپنے اس بے عدیل، لائق فائق، دانشمند، قبول صورت اور دلاور شہزادے دل:

"کوں، اس ماہ زادے کوں، اس مستغنی کوں، اس سب علماں کے وَشنی کوں، تن کے ملک کی بادشاہی دیا۔ تن کے ملک کا بادشاہ کیا ——[۲]"

اس صاحبِ صفات شہزادے کا حال یہ ہے کہ ایک روز مجلس میں اپنے ایک قدیم رفیق کی زبانی آبِ حیات کا یہ وصف سن کر کہ:

"جکوئی یو نمانہ آبِ حیات پیوے گا، دوسرا خضر ہووے گا۔ اس جگ میں سدا جیوے گا ——" (سب رس، ۳۴)

آبِ حیات حاصل کرنے کے لئے بے چین ہو جاتا ہے اور اس درجہ کہ راج پاٹ کی فکر بھی نہیں رہتی:

"القصّہ دل بادشاہ، عالم پناہ، ظل اللہ، صاحب سپاہ، حقیقت آگاہ، بہوت بے دل ہوا۔ دل پر کام مشکل ہوا، شہر سب حیران، گھر گھر دکاں پریشان ——" (سب رس، ۳۷)

---

[۱] تحقیق و تنقید (ماڈرن پبلشرز، صدر کراچی طبع اول ۱۹۶۳ء) صفحہ ۱۸۵ [۲] سب رس، مرتبہ شمیم انہونوی (مکتبہ کلیاں، لکھنؤ فروری ۶۲ ۱۹ء) صفحہ ۲۴۔

وجہی نے دل کو سب پر لائق، سب میں فاضل، تخت و تاج کے قابل، مستغنی اور حقیقت آگاہ بتایا ہے لیکن اس کا عمل ان سب باتوں کی نفی کر رہا ہے یہ وجہی کی کردار نگاری کا نقص ہے۔

وجہی اپنے محبوب کردار کو تمام خیر بتاتے ہیں اور معتوب کردار کو مجسم برائی بنا کر پیش کرتے ہیں۔ "صفات" کا بیان وجہی کی کردار نگاری کا مخصوص ڈھنگ ہے۔ عشق نامی بادشاہ کی بیٹی حسن، وجہی کا محبوب اور قصے کا روشن ترین نسوانی کردار ہے۔ وجہی نے اس کا سراپا اور روپ اس طرح پیش کیا ہے:

"...... بہوت مقبول، بہوت خوش اصول، بہوت معقول، بہوت خوش رنگ، بہوت خوش ڈھنگ، نور میں سوئیں اس کے سم، نازک نرم جوں پھول جوں ابریشم بالاں کرناں دیکھتے، انکھیاں کو گھیرے آ کر کرناں، سدھ بدھ چھوڑ دیوانے ہو کر پھرناں۔ بیت:

گھری تے ہنستے نکلے آنگن منے پھولاں جھڑیں
عاشق ہو کر چاند اور سورج دروازے پر آ کر پڑیں

یہ نور نو آفتاب، اسے دیکھنے کا کسے تاب، عالم عالم اس کی خاطر خراب، ہر دل میں اس کا اضطراب۔ ہر طرف عاشق، ہزار مجنوں، ہزار فرہاد، برت دل ربا، بے پروا، بے داد ———" (سب رس، ۶۵)

کردار کا ذکر جب اور جہاں زبان پر آتا ہے وجہی بیک سانس اس کی خصوصیات بتانا اور صفات گنانا شروع کر دیتے ہیں۔ ایک دوسرے موقع پر حسن کے بارے میں کہتے ہیں:

"حسن نار، اوتار خوش دیدار خوش گفتار، خوش رفتار، دیدیاں کا سنگار، دل کا آدھار، پھول ڈال تے خوب نکلتی، چلنے میں ہنس کوں ہٹ کتی، مادیں تے میٹھی بولے بات، آواز تے قمری کوں کرے شہ مات، کنول کے پھول کے پنکھڑیاں جیسے ہات، چمن میں پھول شرم حضور، لاج تے آسمان پر چڑے چاند سور، مست مہنی تے مغرور، ماتی بھاتی، کسے خاطر میں نیاتی۔ بال جانو کالے ناگ، گال جانو عشق کی آگ ...... جوبن الماس تے گھٹ ادھر یاقوت تے اعلیٰ پنٹ۔ اس کی انکھیاں جانو لالے، جانو شراب کے پیالے۔ دانتاں دیکھ موتی کے دانے، گھرے گھر پھرتے دیوانے —" (سب رس، ۸۴)

حسن، رفتار گفتار، رنگ روپ، ادا ادا، ناز ساز، نفاست، نزاکت، لطافت، غمزہ عشوہ میں قہر ہے بلا ہے۔ وجہی کے طفیل، سارے جہاں کی خوب روئی اس پر ختم ہے:

"حسن ایسی نار ...... خوش گفتار، دو خوش رفتار، دو دیدان کا سنگھار، جیو کا ادھار، عالم کا مدار، عجب خوب خوبی کا سور، محبوبی کا نور چھند بھری بالی لطافت کے پھول کی ڈالی، نازاں ہیں کاری، غمزیاں میں کوں دیچاں ہاری، باتاں جیسیاں نباتاں، پھول کی پنکھڑیاں جیسے ہاتاں۔ کرناں جیسے بال، آفتاب جیسا جمال، کمر دیکھ شرزہ شرم حضور، اس کی چال نے کاڑی ہتی کی چال میں قصور۔ دیدا شیدا، شیدا من بی فرش جانو پھول کی بنی۔ تن پھول تے نرم، طبیعت آگ تے گرم۔" (سب رس، ۲۱۰ و ما بعد)

وجہی اپنے محبوب کردار میں بساط بھر خوبیاں جمع کر دینے میں بڑے تیز ہیں۔ وہ ہر آن اس فکر میں رہتے ہیں کہ کردار کے بارے میں کسی نت نئی صفت کا اعلان کرتے رہیں۔ وہ بڑے لسان ہیں۔ لیکن اس کاوش میں گاہ ان کا سانس پھول جاتا ہے، زبان ساتھ نہیں دیتی اور واضح طور پر یہ احساس ہوتا ہے گویا کوئی صفت مزید ان کے ہاتھ نہیں لگ رہی۔ ایسی بے بسی کا ایک موقع وہ ہے جب حسن کی صفات کے طویل اعلان نامے کے باوصف وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ جیسا چاہیے حق ادا نہیں ہو رہا تو اضمحلال کے عالم میں پکار اٹھتے ہیں کہ آخر:

"...... کتے بولوں اس کے گن۔" (سب رس، ۶۵)

معتوب کرداروں سے وجہی کا رویہ اسی مناسبت سے سخت مخاصمانہ ہوتا ہے۔ وہ ان کی بد تعریفی میں انتہا درجے کی سرگرمی دکھاتے ہیں اور اس رو میں انہیں سخت سست سنانا شروع کر دیتے ہیں۔ یہی نہیں وہ ان کے حق میں غیر شائستہ نا ملائم اور غیر معتدل کلمات تک کہہ گزرتے ہیں۔ قصے کے ایک کردار رقیب کے بارے میں وجہی کی بد لگامی ملاحظہ کیجیے:

"ایک دیو ہے پادشاہ، روسیاہ گمراہ بدکار، اس کا ناؤں رقیب نابرخوردار، دل آزار، پلشت، مردار، ہیچ کارا، بے پیرا ——"

(سب رس، ٦٨)

رقیب، صاحبِ سپاہ بادشاہ عشق کا پروردہ ہے۔ عشق نے اسے شہرِ دیدار کا نگہبان مقرر کیا ہے۔ وہ شہر کی نگہبانی کا حق نگہبانی کی طرح ادا کرتا ہے۔ خود وجہی کے بقول:

"اغیار کوں واں نیں دیتا آن۔ ہرگز کس تے نیں ڈرتا، جکوئی آتا اسے منع کرتا۔ اس کے ڈرتی نظر بھر کنے نا پادے، انداز کس کا جو کوئی واں آدے۔" (سب رس، ٦٨)

رقیب کے کردار میں اس اعتبار سے بڑی استقامت ہے کہ اسے ادائے فرض کا محض پاس ہی نہیں وہ اپنے فرض کی بجا آوری میں تمام و کمال پورا بھی اترتا ہے۔ لیکن وجہی، رقیب سے صاف نہیں۔ اس لئے وہ اسے ان ناہموار کلمات کا ہدف بناتے ہیں:

"جکوئی آتا اس سوں جھگڑتا، کتا ہو کر لڑ لڑ پڑتا۔ جاں ایسا آدمی اچھے نت، کتا رکھنے کی واں کیا حاجت۔ نہ بھلے تے ڈرے گا نہ بُرے تے ڈرے گا، ایک رقیب ہزار کتے کا کام کرے گا ——" (سب رس، ٦٨)

وجہی کی کردار نگاری میں واضح جانب داری ملتی ہے اس لئے ان کے کردار یک رُخے ہیں۔ کردار نگاری کے عمل میں وجہی فریق کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ ہر کردار کو "اپنی نظر" کی سان پر چڑھا کر پیش کرتے ہیں۔ وہ اسے آزاد نہیں چھوڑتے۔ خود سائے کی طرح اس کے ساتھ ہی نہیں اس پہ چھائے بھی رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ "سب رس" کا کوئی کردار اپنی زبان یا عمل سے قاری کے ذہن پر اپنا نقش نہیں جماتا بلکہ ہر کردار بالعموم وجہی کے "بیان" کی بیساکھی کا محتاج دکھائی دیتا ہے۔ ڈاکٹر سہیل بخاری نے ٹھیک کہا ہے کہ:

"سب رس میں جاندار تصویروں کی جگہ صرف دھندلے دھندلے سے خاکے ملتے ہیں...... اور یہ خاکے بھی بہت بڑی حد تک ...... کرداروں کے روپ میں وجہی کو پہلے سے بنے بنائے مل گئے تھے۔ (ورنہ)...... سراپا نگاری (وجہی)...... کے بس سے باہر ہے۔"[1]

وجہی کی کردار نگاری میں کوئی فن کارانہ اعجاز اور حسن نہیں۔ وہ اپنے کرداروں کے داخلی کوائف سے اکثر دامن بچا لے جاتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی کہا جا سکتا ہے کہ:

"وجہی میں کردار نگاری کی اوسط صلاحیت ہے۔ وہ کرداروں کی روح میں اتر کر نہاں خانۂ دل کے آئینوں کو جگمگا نہیں (سکتے) پھر بھی (وجہی) نے فن کے جو نمونے اور کردار نگاری کا جو آرٹ پیش کیا ہے وہ غنیمت (ہے)[2]"

---

[1] "سب رس پر ایک نظر" (آزاد بک ڈپو، لاہور طبع اول ١٩٦٧ء) صفحہ ٩٢ [2] "مثنوی قطب مشتری اور ملا وجہی کی کردار نگاری" از نسیم اختر یادی مطبوعہ: نگار پاکستان، کراچی، شمارہ جون ١٩٦٥ء، صفحہ ٥٠

وجہی کی کردار نگاری کی فنی اہمیت بہت زیادہ نہ سہی لیکن اس کی تاریخی حیثیت کو بہر حال نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

"سب رس" کی تصنیف کے تقریباً سو برس بعد تک ہمیں کوئی ایسا نثری قصہ نہیں ملتا، جسے افسانہ کہا جا سکے۔ ڈاکٹر محمود نقوی (سہیل بخاری) کے لفظوں میں:

"اس وقت تک کی تحقیق کے مطابق اردو میں افسانہ سو سال تک سوتا رہا اور صدی کے ختم ہونے پر طوطی نامے کے ترجمے کی شکل میں پھر بیدار ہوا۔"[1]

"طوطی نامہ" سنسکرت سے ماخوذ ہے اور ان چند کتابوں میں سے ہے جنہیں بے حد قبولِ عام نصیب ہوا۔ مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے اور خلاصے تیار ہوئے۔ اردو نثر میں غالباً پہلی بار اسے ۱۷۲۹ء میں ایک غیر معلوم باشندۂ دکن نے فارسی سے ترجمہ کیا۔

"طوطی نامہ" کے ایک نامکمل دکنی ترجمے کا ایک نفیس مخطوطہ برٹش میوزیم میں محفوظ ہے۔ (ڈاکٹر) سید محی الدین قادری زور نے "اردو شہ پارے" میں اس مخطوطے سے کچھ ٹکڑے نقل کیے ہیں[2] جن کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے کردار تمثیلی نہیں۔ مثلاً اس کا ایک کردار بڑھائی (بڑھئی) ہے۔ ایک سنار ہے، ایک درزی ہے۔ اس طرح چار کردار ہیں ـــــ اور یہ سب کے سب ایک عورت پر فریفتہ ہو جاتے ہیں۔ "طوطی نامہ" کا یہ ترجمہ بالکل لفظی ہے۔ اس کی زبان صاف نہیں۔ اکثر جگہ عبارت میں الجھاؤ پیدا ہو گیا ہے۔ ایسے میں کردار نگاری کی کتنی گنجائش رہ جاتی ہے۔ اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ پھر بھی "سب رس" کے مقابلے میں اسے یہ امتیاز ضرور حاصل ہے کہ اس میں مجرد صفات کو انسانوں کی جگہ نہیں دی گئی۔ اس کے کردار باقاعدہ گوشت پوست کے انسان ہیں۔

"طوطی نامہ" کے تراجم کے بعد میر محمد حسین خان تحسین کی "نوطرزِ مرصع" سامنے آتی ہے۔ یہ قصہ چہار درویش کا اردو ترجمہ اور شمالی ہند کا پہلا نثری افسانہ ہے۔ اس کا زمانۂ تالیف ۱۷۷۵ء سے ۱۷۸۱ء متعین کیا گیا ہے[3]۔ "نوطرزِ مرصع" کی زبان ادق، پُر پیچ اور اہتمامی ہے۔ اس میں عربی الفاظ، تراکیب اور تلازمات کی بھرمار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے قبولِ عام نصیب نہیں ہوا۔ اس کی اہمیت بہت کچھ ان وجوہ سے ہے کہ "باغ و بہار" کا ماخذ اور قصے کہانی کی کتاب ہونے سے قطعِ نظر یہ شمالی ہند میں اردو نثر کی چند اولین کتابوں میں سے ایک ہے۔

تحسین کی تحریر افسانوی حسن سے یکسر خالی ہے۔ ان کا بیان بالعموم بوجھل اور عبارت بے مزہ ہوتی ہے اور اس پر ستم مزید یہ کہ وہ بات کو طول دینے کے عادی ہیں۔ اس طرح بے لطف عبارت آرائی کے نتیجے میں نہ آنکھ کے سامنے کوئی تصویر آتی ہے اور نہ دل پر کسی تصویر کا نقش جمتا ہے ـــــ روم کا نیک دل بادشاہ فرخندہ سیر اولادِ نرینہ سے محرومی کے سبب رنجیدہ رہتا ہے۔ دیکھئے کہ اتنی سی بات کو وہ کتنا پھیلا کر اور کس قدر سنگلاخ پیرائے میں بیان کرتے ہیں:

"بیچ سرزمین فردوس آئین ولایت روم کے ایک بادشاہ تھا، سلیمان قدر فریدوں فر، جہاں بان، دین پرور، رعیت نواز، عدالت گستر، برآرندۂ حاجات بستہ کاماں، بخشندۂ مرادات امیدواراں، فرخندہ سیر نام کہ شعشعۂ شوارق فضلِ ربانی کا اور شعشعۂ بوارق فیضِ سبحانی کا ہمیشہ اوپر لوحِ پیشانی اس کے لمعاں و تاباں رہتا لیکن شبستانِ عمر و دولت اس کے کا، فروغِ شمعِ زندگانی کے سے کہ مقصد فرزندِ ارجمند سے ہے، روشنی نہ رکھتا تھا۔ اس سبب سے ہمیشہ غنچۂ خاطر اس کے کا بادِ سموم اس فکرِ دل خراش کے سے افسردہ رہتا اور اصلا گلِ عشرت اس کے کا شدتِ صرصرِ اس غم و الم کے سے بہارِ شگفتگی کی نہ لاتا ـــــ"

(نوطرزِ مرصع، مرتبہ: ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی، ہندوستانی اکیڈمی اتر پردیش، الٰہ آباد ۱۹۵۸ء صفحہ ۶۵)

بیان کے اس بوجھل پن اور بے مزہ عبارت سے خود پڑھنے والے کی طبیعت بوجھل اور بے کیف ہو جاتی ہے۔ جی یہ چاہتا ہے کہ وہ بات کو مختصر کریں۔ ایک موقع پر اپنی عبارت آرائی سے خود انہیں بھی اکتاہٹ کا احساس ہوتا ہے۔ بات کو بڑھا کر، پھیلا کر بیان کرتے کرتے دفعتاً رک کر کہتے ہیں:

---

[1] مخطوطہ: اردو کی نثری داستانوں کا تنقیدی مطالعہ، (مملوکہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری) صفحہ ۷۱ [2] اردو شہ پارے جلد اول (مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن، ۱۹۲۹ء) صفحہ ۳۲۶ تا ۳۳۱۔ [3] ڈاکٹر گیان چند، شمالی ہند کی اردو نثری داستانیں (مطبوعہ انجمن ترقی اردو پاکستان، طبع اول ۱۹۵۴ء) صفحہ ۱۴۶۔

"قصہ کوتاہ اور عبارت مختصر آخرش......" (نوطرزِ مرصع، ۷۵)

تحسین کے بیان میں طوالت کے علاوہ تکلّف و تصنّع کے عیب کی فراوانی بھی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ پڑھنے والا، پروفیسر سید وقار عظیم کے بقول "اس تکلّف میں الجھ کر رہ جاتا ہے[۱]" اور اس کا تصوّر کردار کی کوئی واضح تصویر نہیں بنا پاتا۔

تحسین کردار نگاری اور مرقع کشی کی مقتضیات سے یوں بھی بے خبر سے معلوم ہوتے ہیں۔ ایک خاص موقع پر کسی کردار کی کیا کیفیت ہونی چاہیے، اس پر ان کی نظر بالکل نہیں رہتی ــــــ فرخندہ سیر بوڑھا ہو چکا "امیدِ زندگانی بالکل منقطع" ہوئی، فرزند کی نعمت سے محروم ہے۔ اس آرزو کی حسرت میں بدل بریان و دیدہ گریاں، نہایت محزون و غمگین ہو کر آسائشِ دنیوی سے دست کش ہونے کا تہیّہ کر لیتا ہے۔ یہ وہ لمحہ ہے کہ طبیعت کے ملال کی بے اختیاری سے ہر ساعت اس کی زبان پر بڑے دردناک اور مایوسانہ اشعار آ رہے ہیں۔ تحسین کا بیان ہے کہ بالآخر اس طرح کے اشعار:

"کہتا ہوا خراماں خراماں، مضطر و متفکر خفگی طبیعت کی سے...... ایک گوشے میں تنہا جا بیٹھا۔" (نوطرزِ مرصع، ۶۸)۔

کتنا "ہمدردانہ" اندازِ نظر ہی کیوں نہ اختیار کر لیجیے یہاں "خراماں خراماں" کے محل کا کوئی جواز بہر طور پیش نہیں کیا جا سکتا۔

ڈاکٹر گیان چند نے ایک موقع پر ضمناً تحسین کے ایک "فنکارانہ کردار" کی طرف اشارہ کیا ہے۔ لیکن اس فنکاری کا سہرا تحسین کے سر نہیں باندھا جا سکتا۔ "نوطرزِ مرصع" فارسی متن کا پابند، رنگین اور دقیق لفظی ترجمہ ہے۔ تحسین کی اُپج کو اس میں مطلق دخل نہیں۔ اس لئے قصّے میں کردار نگاری کے اعتبار سے کوئی قابلِ ذکر بات ہے بھی تو اس سے تحسین کی تحسین واجب نہیں آتی۔ آنے والے داستان نگاروں کو اس کے ذریعے بعض کرداری نمونے ضرور میسّر آ گئے، اگرچہ ان "نمونوں" کا اثر بعد کی داستانوں میں کم ہی دکھائی دیتا ہے۔

باعتبارِ زمانی "نوطرزِ مرصع" (تحسین) کے بعد قصہ کہانی کی کتابوں میں شاہ عالم ثانی کی "عجائب القصص" کا نمبر آتا ہے۔ یہ ۱۲۰۷ھ مطابق ۹۳-۱۷۹۲ء کی تصنیف ہے لیکن گذشتہ پونے دو سو سال کے عرصے میں یہ ایک بار بھی شائع نہ ہو سکی۔ اب تک کی تحقیق کے مطابق دنیا میں اس قصّے کا صرف ایک ہی قلمی نسخہ محفوظ ہے اور یہ پنجاب یونیورسٹی کے کتب خانے میں موجود ہے۔ ۱۹۶۵ء میں مجلس ترقی ادب، لاہور کے اہتمام سے یہ کتاب پہلی بار شائع ہوئی۔ مجلس کا یہی نسخہ اس وقت میرے پیشِ نظر ہے۔

تحسین کے مرصّع اور مغلق انداز کے برعکس "عجائب القصص" کی زبان سہل، سلیس، سادہ اور عام فہم ہے۔ اس میں قصّہ بھی صاف، سیدھا اور ہموار ہے اور اخیر تک اسی طرح کی زبان میں بیان ہوا ہے۔ شاہ عالم کی زبان میں بڑی روانی، سلاست اور سادگی ہے۔ اس میں الجھاؤ اور تکلّف کا شائبہ تک نہیں، بایں ہمہ انہوں نے کردار نگاری کا کوئی اعلیٰ معیار پیش نہیں کیا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے ٹھیک کہا ہے کہ "شاہ عالم نے اپنے کرداروں کی جو ہم آہنگی دکھائی ہے اس میں ضعف کے آثار ہیں[۲]"۔

خطاء ختن کا شہزادہ شجاع الشمس اس قصّے کا ہیرو ہے۔ وزیر زادہ اختر سعید اس کا ہم سن و ہمراز ہے۔ دونوں نے محل معلّیٰ میں پرورش پائی ہے، دونوں ذہین، ذکی اور ہر علم و فن کے منتہی ہیں۔ شجاع الشمس کو حق تعالیٰ نے یہ حسن عطا کیا تھا کہ اسے:

"جو زن و مرد دیکھتے تھے ایک دل کیا ہزار دل سے عاشق ہوتے تھے بلکہ یہ آرزو کر کے التماس کرتے تھے...... اگر غلامی اور کنیزی میں ہمیں قبول کیجیے عین سرفرازی ہے...... (لیکن شجاع الشمس کو) مطلق کسو سے سروکار نہ تھا ــــ" (عجائب القصص، ۹۰)

---

[۱] ہماری داستانیں (مطبوعہ اردو مرکز، لاہور طبع دوم) صفحہ ۵۲ [۲] مقدمہ عجائب القصص، صفحہ ۲۷

اس کے مقابل روم کی بادشاہ زادی ملکہ نگار قصّے کا مرکزی نسوانی کردار ہے۔ وزیر زادی مشتری اس کی ہم سن و ہم دم اور شریکِ راحت و غم ہے۔ دونوں کی پرورش اور تربیت یک جا ہوتی ہے۔ دونوں کو حق سبحانہٗ تعالیٰ کی طرف سے ذہنِ عالی اور روانیٔ طبیعت کی مرحمت ہوئی ہے۔ ملکہ نگار کے حسن و جمال اور نزاکت کا یہ عالم تھا کہ:

"زبان / بیان اس کے اوصاف سے قاصر ہے۔ یہ شہرہ اس کا جا بجا پہنچا تھا ہر ایک بادشاہ زادہ خواستگاری کے نامے لکھتا تھا۔ بادشاہ زادی زنہار قبول نہ کرتی تھی۔ سوائے روزے نماز کے کسی امر سے سروکار نہ تھا ــــ" (عجائب القصص، ۵۷)

شجاع الشمس اور ملکہ نگار الگ الگ ایک دوسرے کو خواب میں دیکھتے ہیں اور دونوں کے خواب "عشق آثار" ثابت ہوتے ہیں۔ دونوں کی عمریں بارہ بارہ برس کی ہیں۔ شجاع الشمس کی عشق زدگی کا یہ حال ہے کہ آنکھ کھلنے پر جب دیکھتا ہے کہ نہ وہ رشکِ حور ہے، نہ وہ مکان ہے، نہ وہ قصرِ بلوریں ہے۔ بے اختیار آہ و فغاں لب پر لاتا ہے اور غش کھا کر پلنگ پر گرتا ہے:

"اسی عالم میں تین دن اور تین راتیں گذریں، مطلق بادشاہ زادے نے آنکھ نہ کھولی اور کسو کو جواب نہ دیا۔" (عجائب القصص، ۶۴)

مادر پدر نے شجاع الشمس کا جو یہ حال دیکھا، شورِ نوحہ و فغاں برپا کیا اور تمام محل میں قلق و اضطراب پیدا ہوا۔ ملکہ نگار سے نسبت کے لیے رقعہ بھیجا جاتا ہے۔ وہاں سے جوابِ ناصواب آتا ہے۔ بادشاہ زادے کو جو یہ معلوم ہوا تو اس نے:

"ایک نعرہ عشق کا بھرا اور غش کیا ...... تین دن اور تین رات عالم بیہوشی کا رہا۔ چوتھے روز بادشاہ زادے نے آنکھ کھولی۔ دیکھتا کیا ہے مادر و پدر مع اختر سعید گریبان اپنا چاک کیے ہوئے گرد پلنگ کے بے اختیار زار و نزار ہیں۔

یک مرتبہ مادر و پدر کو اس طور سے دیکھ کر پلنگ سے اترا اور آداب تسلیمات بجا لا کر دست بستہ کھڑے ہو کر عرض کی کہ پیر و مرشد برحق سلامت! اگر زندگانی غلام کی منظور ہے رخصت فرمائیے کہ سفر اختیار کروں۔ شاید کہ کامیاب اپنے مقصدِ دلی پر ہو جاؤں۔ بموجب حدیث شریف کے:

اَلسَّفَرُ وَسِیْلَۃُ الظَّفَرِ ــــ" (عجائب القصص، ۷۲ و بعد)

واقعہ نگاری اور سیرت کشی ہر دو کے اعتبار سے شاہ عالم کی پیش کردہ یہ تصویر حد درجہ ناقص ہے۔ بہتّر گھنٹے کی کامل غشی اور بیہوشی کے بعد اتنی سکت اور حواس اتنے مرتب کہ پلنگ سے اترا، آداب تسلیمات بجا لایا اور دست بستہ کھڑے ہو کر عرض کی ــــ اور "والدین" سے کس طرح کے مقصدِ دلی کی کیسی بے جھجک گذارش اور اس مقصد کے لیے حدیث شریف کی سند! ــــ والدین دل دہی کی خاطر آمادہ ہو جاتے ہیں، تسلّی و تشفّی آمیز گفتگو کرتے ہیں اور بادشاہ زادہ:

"کلماتِ عنایت اور تفضّلات، باپ سے سن کر آداب بجا لایا اور مشغول راگ و رنگ کا ہوا ــــ" (عجائب القصص، ۷۳)

کشتۂ "عشق" کردار کا، جیسا کہ شجاع الشمس کا پیش کیا گیا ہے "راگ و رنگ" میں مشغول ہو جانا قرینِ صواب اور شایانِ کردار نہیں۔ کردار کا یہ تضاد شاہ عالم کی کردار نگاری کا نقص ہے۔ تضاد کا یہ عیب شاہ عالم کی کردار نگاری کا ایک مستقل جزو ہے۔ بادشاہ زادہ، اختر سعید کے ہمراہ بحری بیڑے پر گوہرِ مقصود کی تلاش میں نکلتا ہے لیکن راہ میں اسے سیر و تفریح کی سوجھتی ہے:

"جہاز ایک جزیرے پر پہنچے کہ نام اس جزیرے کا گل رُخ تھا ــــ بادشاہ زادے کے تئیں آب و ہوا اس جزیرے کی بہت خوش آئی۔ حکم مانجھیوں کو فرمایا کہ لنگر جہازوں میں ڈال دو اور بادبانوں کو باندھ دو کہ چندے سیر یہاں کی کر کے پیشتر روانہ ہوں گے۔" (عجائب القصص، ۹۲)

ایک طرف عشق کا سودا اور دوسری طرف سیر کا ہوش۔ جذبے اور عمل کے اس تضاد کے علاوہ شجاع الشمس کے قول اور عمل میں بھی تضاد ہے۔ سفر کے دوران میں خود اس قافلے کی سرگرمی کی کیفیت یہ رہی ہے کہ:

"ہر ایک منزل پر جس وقت کہ پہنچتے تھے لنگر جہازوں کا دریا میں ڈال دیتے تھے اور بادبان اتار کر جہاز کو ایستادہ کرتے تھے اور وہاں سے اتر کر صحرا کی اور ساحل کی اور جو کوئی شہر متصل دریا کے آجاتا تھا سیر کرتے تھے ——" (عجائب القصص، ۹۰)

لیکن ایک موقع پر اسی سفر میں گل رُخ پریزاد، شہزادہ شجاع الشمس کو جزیرۂ روس کی سیر کی دعوت دیتی ہے تو بادشاہ زادہ جواباً یہ کہتا ہے کہ:

"اے ہمشیرہ! عالم خوشی میں سیر صحرا اور گل گشتِ باغ سب کو خوش آتا ہے۔ میرے تئیں غم فراق ملکہ نگار کا درپیش ہے۔ کیوں کر تیرے ساتھ چل کر مشغول سیر کا ہوں ——" (عجائب القصص، ۱۰۱)

اور پھر استقامت کا یہ حال ہے کہ:

"گل رُخ نے ہر چند مبالغہ کیا، بادشاہ زادے نے نہ مانا۔" (عجائب القصص، ۱۰۲)

ایک دوسرے موقع پر ایک منجّم بے بدل تماشا دکھانے کے لئے روکنا چاہتا ہے تو بادشاہ زادہ شجاع الشمس اسے بھی ایسا ہی جواب دیتا ہے:

"اے عزیز! ہم گرفتار اپنی مصیبت میں ہیں۔ تماشے سے کیا سروکار۔ مثل مشہور ہے کہ ردنے کو بھی دل خوش چاہیے ——" (عجائب القصص، ۱۰۶)

منجّم کہتا ہے کہ بیشک یہ صحیح ہے لیکن اس تماشے کا دیکھنا بھی نوادرات سے ہے۔ اس بار شجاع الشمس کی "استقامت" کا یہ عالم ہے کہ فوراً سپر ڈال دیتا ہے۔

"اگرچہ باعث مصیبت کے اور پریشانی کے کچھ خوش نہیں آتا مگر تیری خاطر سے کیا مضائقہ ——" (عجائب القصص، ۱۰۶)

اور پھر یہ تماشے میں اس طرح کھو جاتے ہیں کہ غم فراق اور گرفتاریٔ مصیبت کسی کا دھیان نہیں رہتا۔ شجاع الشمس کا عمل، اس کے جذبے اور قول ہی کی نفی نہیں کرتا پستیٔ اخلاق اور انتہا درجے کی پستیٔ کردار کا ثبوت بھی فراہم کرتا ہے ——

منجّم انہیں الگ الگ چار گنبدوں کی سیر کراتا ہے۔ شرط یہ ہوتی ہے کہ جس وقت:

"میں تمہیں بلوا بھیجوں، اسی وقت بلا توقف تم اور اختر سعید وہاں سے چلے آنا ——" (عجائب القصص، ۱۰۸)

دونوں یہ نصیحت اور شرط قبول کر کے پہلے گنبد میں داخل ہوتے ہیں:

"دیکھتے کیا ہیں کہ کئی سے (سو) عورتیں پریزاد بالباس ہائے رنگا رنگ سامنے سے چلی آتی ہیں۔" (عجائب القصص، ۱۰۸)

شجاع الشمس اور اختر سعید اس "سیر" سے حیران و متعجب، ان عورتوں کے جلو میں چلے جاتے تھے کہ لعل و یاقوت کے ایک قصر سے بادشاہ زادی "لعل بے بہا" نام، حسین و جمیل خواجہ سراؤں اور کئی سو، چہاردہ سالہ نازنینوں کے ہمراہ باادا و ناز تمام، بادشاہ زادے کے استقبال کے لئے آتی ہے جس کے نظارے سے:

"بادشاہ زادے کو عالم غش پیدا ہوا۔ چاہتا تھا کہ طمانچہ بیہوشی سے زمین پر گرے ——" (عجائب القصص، ۱۱۰)

لیکن اختر سعید نے سنبھالا —— شہزادی انہیں ہمراہ لے کر محل میں آتی ہے اور:

"باتیں عشوے اور ناز کی اور سراپا دل فریب کرتی ہوئی، متصل اپنی خوابگاہ کے پہنچی .... بادشاہ زادے کو .... ہاتھ پکڑ کر برابر مسند پر بٹھایا۔ ارباب نشاط آن کر حاضر ہوئے۔ کئی ایک دم صحبت راگ و رنگ کی رہی۔ بعد اس کے خاصہ نوش جان باہم کر کے متوجہ خواب گاہ کے ہوئے۔ اسی طور سے عیش و عشرت میں دن رات گذرتے تھے۔ بعد کتنے ایک دنوں کے معلوم ہوا کہ لعل بے بہا حمل سے ہے۔ ہر ایک خادمانِ محل کو اور بادشاہ زادے کے تئیں خوشی حاصل ہوئی ——" (عجائب القصص، ۱۱۱ و ۱۱۲)

شہزادے کو اپنے اس کارنامے اور کردار پہ تاسف نہیں، کمال خوشی ہے —— "بعد نو مہینے کے بادشاہ زادہ تولد ہوا اور تیاری چھٹی کی ہونے لگی۔" لعل بے بہا، چھٹی کا غسل کر کے صحن میں تارے دیکھ کر واپس خواب گاہ میں آتی ہے۔ شجاع الشمس کو پھر کھٹ پر رونق افروز پاتی ہے۔ لعل بے بہا اسے دیکھ کر،

"بہت سی خوشی ہوئی اور بادشاہ زادہ جو تولد ہوا تھا شجاع الشمس کی گود میں دیا اور مشغول راگ و رنگ مع شجاع الشمس کے ہوئی۔"
(عجائب القصص، ۱۱۲)

اسی عالم میں منجم کا بلاوا پہنچا کہ بلا توقف جس کام میں ہو اسے چھوڑ کر جلد مجھ تک پہنچو:

"بادشاہ زادے نے یہ پیغام منجم کا سن کر چاہا کہ ٹال دے اور اس سیر کو نہ چھوڑے۔" (عجائب القصص، ۱۱۲)

لیکن اپنا عہد اور قول قرار یاد کرکے بادلِ ناخواستہ منجم کے پاس دروازے پر آیا:

"دیکھتے ہی بادشاہ زادے نے منجم کو کہا کہ افسوس تو نے عین مزے میں ہمارے خلل کیا۔" (عجائب القصص، ۱۱۲)

یہ ہے اس ہیرو کا کردار جو مادر پدر، گھر در چھوڑ کر محبوب اور مطلوب کی تلاش میں نکلا ہے!! ــــ بات یہیں نہیں ختم ہو جاتی بقیہ گنبدوں کی سیر میں بھی ہمارے ہیرو سے اسی قبیل کے کارنامے سرزد ہوتے ہیں۔ دوسرے گنبد میں ایک بادشاہ زادی زعفران پری کے عشوہ و ادا کو دیکھ کر شجاع الشمس نے:

"تاب و طاقت کو ہاتھ سے دیا اور عالم بیہوشی کا غالب ہوا۔" (عجائب القصص، ۱۱۵)

آگے آگے وہی کچھ ہوتا ہے جس کی تصویر اور تفصیل پہلے گنبد کی سیر میں نظر سے گذری۔ یہاں بھی بالآخر لڑکے کے تولد کی نوبت آتی ہے۔ یہ کارگذاری بھی شجاع الشمس کے لئے کسی طرح کی پشیمانی کا موجب نہیں ہوتی۔ چھٹی کے غسل کی رات زعفران پری، لڑکا جو تولد ہوا تھا اس کی گود میں دیتی ہے:

"شجاع الشمس اسے گود میں لے کر شفقت پدری سے دم بدم دیکھتا تھا اور جی میں بہت خوش ہو کر لسان گل شگفتہ ہوتا تھا۔" (عجائب القصص، ۱۱۹)

اس لمحے منجم نے بلا بھیجا:

"بادشاہ زادے کو اگرچہ اس مزے کو چھوڑنے کو جی نہ چاہتا تھا، چاہا کہ ٹال دے کہ نہ جاوے۔" (عجائب القصص، ۱۱۹)

لیکن چار و ناچار بے اختیار ہو کر اٹھا۔ زعفران پری نے دامن پکڑا اور کہا کہ:

"اے بادشاہ زادے! سخت عجب ہے کہ اس عالم عیش کو یوں چھوڑ بلا تحاشا اٹھا۔" (عجائب القصص، ۱۱۹)

شہزادہ کہتا ہے:

"پھر آؤں گا، اب تجھے خدا کے سپرد کیا۔" (عجائب القصص، ۱۱۹)

بہر انداز اور پھر اسی شہزادے کے بارے میں جسے ملکہ مہر نگار کے فراق میں کوئی چیز خوش نہ آتی تھی جس نے ایک سے زیادہ مواقع پر اس کے غم میں تین تین دن اور تین تین راتیں عالم بیہوشی و غشی میں گذاری تھیں اور جو اسی مراق میں گھر در چھوڑ کر خاک بسر ہوا ہے۔

شاہ عالم کی سیرت کشی بڑی خام ہے اس میں کچھ بھی جان نہیں۔ انہوں نے شہزادہ شجاع الشمس کو مرکزی کردار کے طور پر پیش کیا ہے لیکن اس میں ہیروؤں والی کوئی بات نہیں۔ــــ اس کے کردار کا تناقض اور تضاد قدم قدم پر ظاہر ہوتا ہے۔ بحیثیت مجموعی بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ "عجائب القصص" کردار نگاری کے نقطۂ نظر سے بڑی مایوس کن کتاب ہے۔

"عجائب القصص" کے بعد مہر چند کھتری کے "نو آئین ہندی" المعروف بہ "قصہ ملک محمود و گیتی افروز" کا نمبر آتا ہے۔ ڈاکٹر گیان چند نے کئی جگہ اس کا ذکر کیا ہے[۱] محمود نقوی (سہیل بخاری) کے ڈاکٹریٹ کے مقالے میں بھی اس کا ذکر آیا ہے لیکن یہ صراحت کسی نے بھی نہیں کی کہ انہیں یہ قصہ کہاں دیکھنے کو

---

[۱] شمالی ہند کی اردو نثری داستانیں، صفحہ ۴۷۶، ۴۵۱، ۵۴۸۔

ملا؟ کب اور کہاں چھپا؟؟ محمود نقوی کا کہنا ہے کہ:

"مہر چند کھتری نے ایک انگریز کو اردو سکھانے کے لئے یہ قصہ ۱۷۹۴ء (۱۲۰۹ھ) میں فارسی قصہ "آذر شاہ و سمن رُخ بانو" سے ترجمہ کیا[۵۱]۔
اس کی زبان بالکل صاف، آسان اور سادہ ہے[۵۲]۔"

مجھے یہ قصہ مطالعے کے لئے میسّر نہیں آ سکا۔ اس لئے مہر چند کھتری کی کردار نگاری کے بارے میں وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

ان تصانیف کے علاوہ انیسویں صدی سے قبل اردو نثر میں قصہ کہانی کی اور کوئی کتاب نہیں ملتی۔ مولوی سید محمد نے حیدر بخش حیدری کی تصانیف کے تذکرے میں ان کی انیسویں صدی سے پہلے کی دو ابتدائی تالیفات "قصۂ مہر و ماہ" اور "قصۂ لیلیٰ مجنوں" کا نام ضرور لیا ہے۔ قصہ مہر و ماہ اوائل ۱۲۱۴ھ ۱۷۹۹ء میں لکھا گیا۔ قصہ لیلیٰ مجنوں، امیر خسرو کی فارسی مثنوی لیلیٰ مجنوں کا ترجمہ تھا جو ۱۲۱۴ھ / ۱۷۹۹ء — ۱۸۰۰ء میں تمام ہوا۔ لیکن یہ دونوں قصے اب بالکل ناپید مفقود اور نایاب ہیں[۵۳]۔

اس مرحلے پر اردو میں داستان نگاری کی ابتدائی کوششوں کا وہ دور جو ملا وجہی کی "سب رس" سے شروع ہوا تھا، ختم ہوتا ہے۔ زمانی اعتبار سے اس طویل دَور میں قصہ کہانی کی جو چند کتابیں لکھی گئیں اور کردار نگاری کے حوالے سے جن کا جائزہ لیا گیا، یہ ہیں:

۱- سب رس، وجہی ۱۶۳۵ء
۲- ترجمہ طوطی نامہ، ۱۷۲۹ء
۳- نو طرزِ مرصع، تحسین ۸۱-۱۷۷۵ء
۴- عجائب القصص، شاہ عالم ۹۳-۱۷۹۲ء
۵- نو آئینِ ہندی، مہر چند کھتری ۹۵-۱۷۹۴ء
۶- قصۂ مہر و ماہ، حیدری ۱۷۹۹ء (نایاب)
۷- قصۂ لیلیٰ مجنوں، حیدری ۱۸۰۰ء (نایاب)

اس دَور کی تمام داستانیں ڈاکٹر سید محمود نقوی (سہیل بخاری) کے بقول:

"انفرادی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ ان کا مقصد صرف تفنّنِ طبع تھا۔ دراصل اردو افسانے کی ترقی کے لئے ابھی قدرتی اسباب مہیا نہیں ہو پائے تھے۔ اسے اپنے بننے سنورنے کے لئے کسی بامقصد تحریک کا انتظار تھا جو فورٹ ولیم کالج سے شروع ہونے والی تھی[۵۴]۔"

انیسویں صدی کے آغاز یعنی فورٹ ولیم کالج کے قیام سے داستان طرازی کی ایک نئی مہتم بالشان شاہراہ قائم ہوئی، جہاں "باغ و بہار" کو سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ "باغ و بہار" کتاب کا تاریخی نام ہے جس سے بارہ سو سترہ ہجری کے عدد نکلتے ہیں۔ میر امّن نے یہ قصہ بارہ سو پندرہ ہجری کے اواخر مطابق اٹھارہ سو دو عیسوی میں لکھنا شروع کیا اور بارہ سو سترہ ہجری، اٹھارہ سو چار عیسوی کے اوائل میں مکمل کیا۔ خود انہوں نے خاتمۂ کتاب میں نام اور زمانۂ تالیف کی صراحت ان لفظوں میں کی ہے:

---

۵۱ و ۵۲ مخطوطہ: اردو کی نثری داستانوں کا تنقیدی مطالعہ، صفحہ ۷۸ و ۷۹ (علی الترتیب) ۵۳ (i) مولوی سید محمد، ارباب نثر اردو، (مکتبہ معین الادب، لاہور) صفحہ ۱۷ (ii) ڈاکٹر وحید قریشی، توتا کہانی (مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۶۳ء) صفحہ ۵۳ و ۵۴ (iii) ڈاکٹر محمد اسلم قریشی، آرائش محفل (مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۶۴ء) صفحہ ۸۲ ۵۴ مخطوطہ: اردو کی نثری داستانوں کا تنقیدی مطالعہ، صفحہ ۸۲۔

"جب یہ کتاب بفضلِ الٰہی سے اختتام کو پہنچی، جی میں آیا کہ اس کا نام بھی ایسا رکھوں کہ اس میں تاریخ نکلے، جب حساب کیا تو بارہ سو پندرہ ہجری کے آخر سال میں لکھنا شروع کیا تھا، باعث عدم فرصت کے بارہ سو سترہ سنہ کی ابتدا میں انجام ہوئی۔ اس فکر میں تھا کہ دل نے کہا "باغ و بہار" اچھا نام ہے کہ ہم نام و ہم تاریخ اس میں نکلتی ہے۔ تب میں نے یہی نام رکھا ؎

مرتّب ہوا جب یہ باغ و بہار
تھے سنہ بارہ سو سترہ مَد شمار
کرو سیر اب اس کی تم رات دن
کہ ہے نام و تاریخ "باغ و بہار"

میر امن کے اس مفصّل بیان سے قطع نظر انڈیا آفس کے مخطوطات کی فہرست اور محمد عتیق صدیقی کی تحقیق[1] پر بھروسا کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ "باغ و بہار" ۱۸۰۱ء کے اواخر میں مکمل ہو چکی تھی اور چھاپے خانے کے سپرد کی جا چکی تھی۔ ۱۲۔ جنوری ۱۸۰۲ء کو "باغ و بہار" (چار درویش کے نام سے) ہرکارہ پریس کلکتہ میں فارسی رسم الخط میں چھپ رہی تھی اور اس تاریخ تک اس کے ۵۸ صفحات چھپ چکے تھے۔ پہلی بار اس کے ۱۰۲ صفحات گلکرسٹ کے انتخابی مجموعہ "بیاضِ ہندی" (HINDEE MANUAL) میں شامل ہوئے۔ جس کا سالِ اشاعت ۱۸۰۲ء ہے۔ "باغ و بہار" الگ اور مکمل صورت میں ۱۸۰۳ء میں ہندوستانی پریس کلکتہ سے شائع ہوئی۔

فورٹ ولیم کی تحریک کے تحت لکھے گئے باغ و بہار کے آس پاس کے چند قصے یہ ہیں:

۱۔ توتا کہانی، سید حیدر بخش حیدری
۲۔ آرائشِ محفل، سید حیدر بخش حیدری
۳۔ مادھونل اور کام کندلا، مظہر علی خاں ولا و للو لال جی
۴۔ شکنتلا، کاظم علی جوان
۵۔ داستانِ امیر حمزہ، خلیل علی خاں اشک

حیدری، فورٹ ولیم کالج کے "منشیوں" میں سید محمد کے بقول[2] سب سے زیادہ کتابوں کے مؤلف اور بہت مشہور اہلِ قلم ہیں۔ ۱۸۰۱ء میں انہوں نے گلکرسٹ کی فرمائش پر "توتا کہانی" کے نام سے فارسی میں "طوطی نامہ" کا ترجمہ کیا۔ دیباچے میں لکھتے ہیں:

"یہ سید حیدر بخش متخلص بہ حیدری...... اگرچہ تھوڑا بہت ربطِ موافق اپنے حوصلے کے عبارت فارسی میں بھی رکھتا ہے لیکن بموجب فرمائش صاحب موصوف (جان گلکرسٹ) کے سن بارہ سے (سو) پندرہ ہجری مطابق اٹھارہ سو ایک عیسوی کے...... طوطی نامہ کا...... زبانِ ہندی میں موافق محاورۂ اردوئے معلّٰی کے نثر میں عبارت سلیس و خوب و الفاظ رنگین و مرغوب سے ترجمہ کیا اور نام اس کا "توتا کہانی" رکھا۔"

فورٹ ولیم کالج کی رودادوں سے معلوم ہوتا ہے کہ "توتا کہانی" ۱۲۔ جنوری ۱۸۰۲ء تک کلکتہ کے ٹیلیگراف پریس میں چھپنا شروع ہو گئی تھی[3] اور ۲۹۔ اگست ۱۸۰۳ء تک زیرِ اشاعت تھی۔[4] پھر بوجوہ اس کی اشاعت روک دی گئی اور بالآخر ۱۸۰۴ء میں پہلی مرتبہ بصورتِ مکمل کالج کی طرف سے شائع

---

[1] گلکرسٹ اور اس کا عہد (انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ طبع اوّل ۱۹۶۰ء) صفحہ ۱۵۴ [2] ارباب نثرِ اردو، صفحہ ۶۶ [3] گلکرسٹ اور اس کا عہد صفحہ ۱۴۲ تا ۱۴۶ [4] گلکرسٹ اور اس کا عہد صفحہ ۱۸۰ تا ۱۸۲۔

ہوئی۔ ڈنکن فاربس نے ۱۸۵۳ء میں لندن سے اس کا ایک خوبصورت ایڈیشن شائع کیا۔[۱]

حیدری نے ۱۸۰۱ء میں فارسی سے ایک اور کتاب "آرائشِ محفل" ترجمہ کی لیکن یہ "توتا کہانی" کی طرح فارسی نثر کا نرا ترجمہ ہی نہیں۔ حیدری نے اس میں اپنی "طبیعت سے" اضافہ کرکے اسے بہت کچھ اپنا لیا ہے۔ ابتداء میں کہتے ہیں:

"یہ قصہ عبارت فارسی میں زبانِ سلیس سے کسی شخص نے آگے لکھا تھا۔ اب اس سید حیدر بخش متخلص بہ حیدری دلّی کے رہنے والے نے ...... بموجبِ حکم ...... جان گلگرسٹ صاحب بہادر ...... کے سنہ بارہ سو سولہ ہجری مطابق اٹھارہ سو ایک عیسوی ...... زبان ریختہ میں موافق اپنی طبع کے اس کتاب سے (جو ہاتھ لگی تھی) ترجمہ نثر میں کیا، پر اکثر اس میں زدتیاں اپنی طبیعت سے بھی جہاں جہاں موقعہ اور مناسب پایا وہاں کیں تاکہ قصہ طولانی ہو جائے اور سننے والوں کو خوش آئے ـــــ"

"آرائشِ محفل" کتاب کا تاریخی نام ہے۔ حیدری نے کتاب کے آخر میں یہ قطعۂ تاریخ درج کیا ہے:

اس قصۂ پرلطف کے اتمام کی تاریخ
بس دل میں یہ سمجھا تھا نہایت ہے یہ مشکل
کر دور سر یاس کہا پیر خرد نے
کیوں کر نہ کہیں ہم اسے "آرائشِ محفل"

"آرائشِ محفل" ۱۸۰۱ء میں تالیف ہوئی لیکن ۹۔ اگست ۱۸۰۳ء تک طباعت کے مراحل میں تھی۔[۲] اس کے بعد یہ متعدد بار شائع ہوئی اور مختلف اوقات میں ایک سے زیادہ مطابع میں چھپتی رہی۔[۳]

"مادھونل اور کام کندلا" ایک عشقیہ قصہ ہے جسے مظہر علی خاں ولا نے للو لال جی کی مدد سے ہندی سے ترجمہ کیا۔ یہ قصہ آج تک کتابی صورت میں شائع نہیں ہوا۔ اس کا صرف ایک حصہ گلگرسٹ کی "بیاضِ ہندی" میں چھپا تھا۔ سید محمد کے بقول:[۴] "اس قصے کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ برٹش میوزیم میں محفوظ ہے۔ اس کے "خاتمۃ الکتاب" میں مترجم نے دو تاریخی قطعے لکھے ہیں۔ ایک سے ہجری سال ۱۲۱۵ اور دوسرے سے عیسوی ۱۸۰۲ نکلتا ہے۔

سنسکرت کے مشہور ڈرامہ نویس کالیداس نے "شکنتلا" نامی ایک ڈرامہ لکھا۔ ۱۸۰۱ء میں گلگرسٹ کی فرمائش پر مرزا کاظم علی جوان نے اسے اردو میں منتقل کیا۔ دیباچہ میں لکھتے ہیں:

"گلگرسٹ صاحب بہادر دام اقبالہٗ ...... نے نہایت مہربانی اور الطاف سے ارشاد فرمایا کہ شکنتلا ناٹک کا ترجمہ اپنی زبان کے موافق کر ...... ۱۸۰۱ء مطابق ۱۲۰۵ھ کے جناب جان گلگرسٹ صاحب بہادر ...... کے حسب الحکم کاظم علی جوان نے اسے زبانِ ریختہ میں بیان کیا۔"

اس ترجمے کے کچھ اجزا اوّل اوّل گلگرسٹ کی "بیاضِ ہندی" میں شائع ہوئے۔ کتابی صورت میں اس ترجمہ کی اشاعت کی نوبت ۱۸۰۴ء میں آئی۔ اس کے بعد دو چار مرتبہ یہ کتاب پھر شائع ہوئی[۵] لیکن ڈاکٹر عبادت بریلوی کے بقول:

---

[۱] اب ۱۹۶۳ء میں "توتا کہانی" مجلس ترقی ادب کے زیرِ اہتمام محمد اسماعیل پانی پتی اور ڈاکٹر وحید قریشی کے مقدمے کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ [۲] گلگرسٹ اور اس کا عہد صفحہ ۹۵-۱۹۴ [۳] ۱۹۶۴ء میں مجلس ترقی ادب نے اسے اپنے اہتمام میں شائع کیا۔ اس پر ڈاکٹر محمد اسلم قریشی کا مقدمہ ہے۔ [۴] ارباب نثر اردو، صفحہ ۱۷۴۔
[۵] ڈاکٹر عبادت بریلوی کو اس کہانی کا ایک قلمی نسخہ برٹش میوزیم کے کتب خانے میں ملا۔ ۱۹۶۴ء میں انہوں نے اسے "اردو دنیا" کراچی کی طرف سے حواشی اور مقدمے کے ساتھ شائع کیا۔

"اس کی اشاعت ہمیشہ محدود رہی ...... (اور) یہ کبھی بھی عام نہ ہو سکی ـــــ" (دیباچہ شکنتلا (از کاظم علی جوان) مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی)

"داستانِ امیر حمزہ" کا سالِ تالیف ۱۸۰۱ء ہے۔ یہ قصہ بھی گلکرسٹ کی فرمائش پر لکھا گیا۔ مؤلف خلیل علی اشک لکھتے ہیں:

"اب شاہ، عالی جاہ عالم بادشاہ کے عہد میں مطابق سن بارہ سو پندرہ ہجری اور سن اٹھارہ سو ایک عیسوی کے خلیل علی خاں جو متخلص بہ اشک ہے، حسب فرمائش مسٹر گلکرسٹ صاحب ...... اس قصہ کو اردوئے معلٰی میں لکھا ـــــ"

"داستانِ امیر حمزہ" کے سالِ اشاعت کے بارے میں گلکرسٹ کے ایک خط مورخہ ۱۹۔ اگست ۱۸۰۳ء سے کچھ روشنی پڑتی ہے۔ اس خط میں اسے مطبوعہ بتایا گیا ہے۔ ضخامت پانسو صفحات اور گلکرسٹ نے اس کے لئے کالج کونسل سے پانسو روپے انعام کی سفارش کی"[۱]

قصّے کہانی کی کتابوں کے بارے میں پیش کردہ ان تفصیلاتِ سنین سے ظاہر ہے کہ "توتا کہانی"، "آرائشِ محفل"، "مادھونل اور کام کندلا"، "شکنتلا" اور "داستانِ امیر حمزہ" کم و بیش "باغ و بہار" کے بعد یا ساتھ ہی ساتھ کی تالیفات ہیں۔ "مادھونل اور کام کندلا" آج تک مکملاً شائع بھی نہیں ہوئی۔ اس لئے کردار نگاری کے نقطۂ نظر سے ان قصّوں میں کوئی قابلِ ذکر بات ہے تو میر امّن کے سامنے وہ بہر حال نہیں رہی۔

میر امّن نے ان قصّہ گو مؤلفین یا مترجمین کی روایت سے استفادہ نہیں کیا۔ وہ اس سے یکسر بے خبر رہے ہیں۔ یوں بھی ان پانچ قصّوں میں کرداروں کی ریل پیل اور حرکت و حرارت کے اعتبار سے صرف داستانِ امیر حمزہ کو اہمیت حاصل ہے۔ سید محمد کے بقول:

"قصّہ امیر حمزہ کے رجالِ داستان میں عرب و عجم کی مشاہیر ہستیوں کی عجیب آمیزش ہے۔ ایک طرف امیر حمزہ، عمرو عیار اور مقبل کی سیرتیں عربی ہیں تو دوسری طرف بزرجمہر، بختک، قباد اور نوشیرواں وغیرہ خالص ایرانی ہیں۔ پھر تاریخی اور افسانوی شخصیتوں کو عجیب انداز سے مدغم کیا گیا ہے[۲] ـــــ"

"یوں تو اس قصّے میں اکثر و بیشتر رجالِ داستان میں فوق العادت اور بعض مرتبہ خلافِ عقل باتیں بھی دکھائی گئی ہیں مگر ساری داستان میں سب سے زیادہ اہم کردار عمرو عیار کا ہے۔ عمرو عیار اس قصّہ کی جان اور مرکز ہے۔ اس کے کردار میں عجیب عجیب گلکاریاں کی گئی ہیں اور اس کو ایسا چالباز، مبارز طلب اور مہم باز بنایا گیا ہے کہ اس کے آگے یورپ کے ازمنۂ وسطیٰ کے جنگ جو نائٹ اور اڈونچرز کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ مگر اس کے کردار میں شروع ہی سے بری خصلتیں اور طمع و چالبازی کے عناصر شامل کرکے اس کو نیکی سے دور بنایا ہے۔ غرض اس "سردارِ عیاراں" سے ایسے ایسے کارنامے منسوب کئے گئے ہیں کہ عقلِ انسانی سے باہر ہیں[۳]۔"

پروفیسر سید وقار عظیم "داستانِ امیر حمزہ" کے کرداروں کا تجزیہ کرنے کے بعد بجا طور پر اس نتیجے تک پہنچتے ہیں کہ خلیل علی خاں اشک نے:

"کرداروں کو قصے میں جگہ دیتے وقت یہ بات پیشِ نظر نہیں رکھی کہ ان کی شخصیت اور ان کی رفتار و گفتار میں مطابقت و مناسبت اور ہم آہنگی نہ ہو تو کردار کا نقش بگڑ کر رہ جاتا ہے[۴]۔"

یہاں تک اوائل انیسویں صدی کے ان پانچ قصّوں کا ذکر ہوا جو "باغ و بہار" کے ساتھ، قریب بعد کے زمانے میں تالیف ہوئے اور جو سب کے سب ایک منصوبے اور تحریک کے تحت فورٹ ولیم کالج میں لکھوائے گئے۔ اسی زمانے میں فورٹ ولیم کالج کی تحریک سے الگ اور کالج

---

[۱] گلکرسٹ اور اس کا عہد، صفحہ ۱۶۷، و ۱۷۰ [۲] اربابِ نثرِ اردو، صفحہ ۲۲۳ [۳] اربابِ نثرِ اردو، صفحہ ۲۲۵ [۴] ہماری داستانیں، صفحہ ۲۱۱۔

سے باہر "باغ و بہار" کے ساتھ ساتھ کچھ اور داستانیں بھی لکھی گئیں۔ یہ تعداد میں تین ہیں ——— ایک، غلام احمد دہلوی کی، دوسری الٰہی بخش شوق اکبر آبادی کی اور تیسری محمد غوث (عوض) زریں کی۔

غلام احمد اور زریں نے فارسی داستان کا ترجمہ کیا۔ الٰہی بخش کی داستان "فسانۂ عشق" کے بارے میں ڈاکٹر عبادت بریلوی کے دو جملوں کے علاوہ کہیں اور کوئی تفصیل نہیں ملتی۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کا کہنا ہے کہ :

"الٰہی بخش شوق اکبر آبادی کی کہانی (فسانۂ عشق)...... فورٹ ولیم کالج سے باہر آگرے کی سرزمین پر ۱۸۰۱ء میں لکھی گئی۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انیسویں صدی کے آغاز سے قبل فورٹ ولیم کالج سے باہر بھی اردو آسان اور سادہ نثر کی روایت موجود تھی"۔[۱]

(شگنتلا، مرتبہ : ڈاکٹر عبادت بریلوی، صفحہ ۱۱۲)

"ہشت گلشت" کو غلام احمد دہلوی نے ۱۲۱۷ھ (۱۸۰۲ء) میں فارسی نثر کی ایک داستان "ہشت گل گشت" سے ترجمہ کیا[۲] اور یہ تاریخ ترجمہ کہی :

چھوڑ کچھ اس جہاں میں ایسی یاد
خلق جس سے کرے یہ نیکی یاد
یہ صنم خانہ جب ہوا طیار
ہوئی تاریخ اس کی "باغ و بہار"

یہ داستان کبھی زیورِ طبع سے آراستہ نہ ہو سکی، اس کا ایک قلمی نسخہ انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہے۔ اس میں کردار نگاری کی کیفیت کیا ہے، اس کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے۔

کالج سے باہر لکھی گئی تیسری لیکن مقابلتہً زیادہ مشہور کتاب زریں کی "نوطرزِ مرصع" ہے۔ زریں نے نوطرزِ مرصع تحسین کے کوئی چوتھائی صدی بعد ۱۸۰۲ء میں چار درویشوں کے قصے کو سادہ زبان میں تحریر کیا۔ زریں اس قصے کو قبل ازیں "شگفتہ فارسی عبارت" میں ترتیب دے چکے تھے۔ اس کا اظہار انھوں نے قصے کے آغاز میں کیا ہے۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے اس فارسی قصے کا سنہ تالیف ۱۷۸۴ء بتایا ہے۔[۳]

زریں نے اپنی اردو کتاب قصہ چہار درویش موسوم بہ نوطرزِ مرصع کا سنہ تالیف "باغ و بہار" سے نکالا ہے :

بنا کر گلدستۂ روزگار
لکھی اس کی تاریخ "باغ و بہار"
۱۲۱۷ھ

زریں کی کتاب کا ایک پرانا نسخہ مملوکہ پروفیسر سید وقار عظیم صاحب، میرے پیشِ نظر ہے۔ "خاتمۃ الطبع" کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب کا تیسرا ایڈیشن ہے :

"توفیقِ توفیق بخش چار عنصر، فسانۂ رنگیں اثر، دل چسپ اور پسندیدۂ طبع قصہ چار درویش موسوم بہ نوطرزِ مرصع، مطبعِ آفاق مرجعِ عالی ہمت، صاحب شوکت و زور منشی نول کشور، مقام کانپور میں بہ ماہِ ستمبر ۱۸۸۶ء بارِ سوم بہ زیبائش طبع مقبولِ خاص و عام ہوا۔"

۱ے اگر یہ کہانی واقعی ۱۸۰۱ء میں لکھی گئی، جیسا کہ عبادت صاحب نے بیان کیا ہے تو اس بنیاد پر یہ "اندازہ" ہونا کہ انیسویں صدی کے "آغاز سے قبل" کوئی روایت کہیں موجود تھی، محلِ نظر ہے۔ ۲ے بحوالہ مخطوطہ : اردو کی نثری داستانوں کا تنقیدی مطالعہ (از سید محمود نقوی) (ڈاکٹر سہیل بخاری) صفحہ ۱۲۳)

۳ے محمد غوث زریں اور ان سے منسوب نوطرزِ مرصع، مطبوعہ ماہنامہ قومی زبان، کراچی جنوری ۱۹۶۷ء صفحہ ۱۱۔

زرّیں نے بہت اختصار سے کام لیا ہے۔ جس قصے کو تحسین اور امّن نے الگ الگ کم و بیش اڑھائی سو صفحات میں بیان کیا ہے، زرّیں نے اسے پچاس سے بھی کم صفحات میں تمام کر دیا ہے۔ ان پر بات کو جلد سے جلد ختم کر دینے کی فکر سوار رہتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ کسی واقعے یا کردار کی واضح تصویر پیش کرنے میں اکثر ناکام رہے ہیں۔

"جلد بازی" کے عیب سے قطع نظر زرّیں کو کردار نگاری کا یوں بھی سلیقہ نہیں۔ تحسین کے ہاں جو دمشق کی شہزادی ہے، زرّیں نے اسے شام کی شہزادی بتایا ہے لیکن اس میں شہزادیوں کا سا کوئی وقار ہے نہ رکھ رکھاؤ۔ وہ خود ہر رات سوداگر زادے کے پاس آتی ہے:

"ہر شب آتی دلداری کر جاتی۔ ایک شب تن تنہا آئی، نہایت مہربانی فرمائی۔ معلوم کیا وہ نادرۂ روزگار فقط میری صحبت کی نہیں طلبگار ——— حرص نفسانی غالب ہے اور کچھ اور بات کی بھی طلب گار ہے ———" (نوطرزِ مرصع، صفحہ ۸)

شام کی شہزادی اپنے سوانح میں یہ بھی بتاتی ہے کہ جوانی کا خمار تازہ ہی چڑھا تھا کہ وہ خواجہ سرا کے ذریعے ایک مسخرے چھوکرے پر جو "عجائب بولیاں بولتا، دل کی گرہیں کھولتا تھا ———" فریفتہ ہو گئی۔ اس نے اس "سبزہ آغاز" کو:

"ہر روز آنے کا حکم کیا ...... لباس فاخرہ دیا۔ آغازِ جوانی تھا۔ جمال نے جلوہ اور حسن نے بلوہ کیا۔ میرا دل طالب ہوا اور عشق غالب ہوا اس قدر فریفتہ ہوئی، اگر ایک روز ملاقات نہ ہوتی، شب کو نہ سوتی۔ آخر راز فاش ہوا ...... وہ بھی خوف سے نہ آیا۔" (نوطرزِ مرصع، ۹)

شہزادی کو اب بھی کان نہیں ہوئے۔ اس کی بے تابی اور کم سوادی کا حال یہ ہے کہ اپنے ہمراز خواجہ سرا کے ذریعے اس چھوکرے سے خفیہ راہ و رسم کی تدبیر کرتی ہے۔ خود شہزادی کا بیان ہے کہ:

"میں نے اپنی خواب گاہ کے نزدیک حویلی تیار کی اور نقب ترتیب دی۔ رات کو آتا اور صبح دم جاتا ———" (نوطرزِ مرصع، ۹)

شہزادی اس سے ہر رات ہم بستر ہوتی۔ گاہ وہ اختلاط سے باز رہتا، یہ اس کا سبب پوچھتی۔ وہ کوئی فرمائش کر دیتا۔ اور یہ اس کی "خاطر" سے اس فرمائش کو پورا کر دیتی۔ اپنا یہ سوانح مکمل کر کے، اپنے تازہ وارد، عاشق صادق سوداگر زادے کو سنا کر یہ وعید و نوید دیتی ہے کہ:

"جب فرصت پاؤں گی، تیرے پاس آؤں گی ...... شب کو آتی تسلّی کر جاتی ———" (نوطرزِ مرصع، ۱۰)

یہاں تک کہ بدرجۂ آخر فیصلہ کن انداز میں گھوڑے ہم راہ لے کر آتی ہے اور سوداگر زادے سمیت فرار ہو جاتی ہے:

"ایک بار آدھی رات کو آئی۔ دو گھوڑے تیار ساتھ لائی۔ ایک آپ لیا، دوسرا مجھے دیا۔ قلعے سے باہر آئی جس طرف راہ پائی جلوہ ریزی فرمائی۔ میں نے رات دن، راہ دراز کو طے کیا، کہیں دم نہ لیا ———" (نوطرزِ مرصع، ۱۰)

زرّیں نے شہزادی کا جو کردار پیش کیا ہے، اس میں شہزادیوں کی سی کوئی بات نہیں۔ تمکنت، وقار اور خودداری اسے چھو تک نہیں گئی۔ اس میں کوئی آن بان ہے نہ پاکیزگی اور عفت ہی۔ عزت نفس اور ناموس کا اسے مطلق پاس اور خیال نہیں۔ حیا اور لحاظ کا اس کے نزدیک گذر نہیں۔ ڈاکٹر گیان چند نے ٹھیک کہا ہے کہ زرّیں نے شہزادی کے کردار کو:

"بالکل خاک میں ملا دیا ہے[۵۱] ...... یہاں شہزادی کو گرا کر ایک بیسوا کی طرح کر دیا ہے ...... اس کی نازک مزاجی اور شاہانہ مزاج کا کہیں ذکر نہیں[۵۲] ———"

---

[۵۱] و [۵۲] شمالی ہند کی نثری داستانیں، صفحہ ۲۰۰، ۲۰۱ (علی الترتیب)

جب کہ شہزادی کا ہی کردار، زرّیں سے بہت پہلے تحسین اور خصوصیت سے قدرے بعد میں، میر امّن کے ہاں بڑا فنکارانہ، جاذب اور دلکش ہے۔ اس مختصر سے جائزے کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ زرّیں کی "نوطرزِ مرصّع" کردار نگاری کی روایت میں کچھ اضافہ نہیں کرتی۔

زرّیں کی "نوطرزِ مرصّع" کے ذکر پر "باغ و بہار" تک اردو کی نثری داستانوں میں کردار نگاری کی روایت کا مطالعہ تمام ہوتا ہے۔ اس جائزے کے ماحصل کے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ بہ اعتبارِ مجموعی "باغ و بہار" تک کی نثری داستانوں میں کوئی سیرت ایسی نہیں جسے کردار نگاری کا شاہکار نہیں تو کم از کم اچھا نمونہ ہی کہا جا سکے۔

ان داستانوں کے کسی کردار میں واضح ارتقاء موجود نہیں۔ ان میں تضاد عام ہے۔ کوئی کردار زندہ جاوید نہیں۔ کوئی کردار مستقل حیثیت کا مالک نہیں۔ ان میں کتنے کردار ہیں جو محض بے کار یا غیر ضروری ہیں اور قصہ پڑھ کر جنہیں ہم بھول جاتے ہیں۔ یہ غیر حقیقی فضا میں سانس لیتے ہیں۔ اس لئے خود اصلیت سے دور ہیں۔ یہ مثالی ہیں، اس لئے بالعموم یک رُخے ہیں۔

ان داستانوں اور قصوں میں صحیح، سچے، بھرپور اور جاندار کرداروں کے بجائے، کرداروں کے ہیولے ملتے ہیں۔ یہاں انتہاپسندی کی انتہا کا عالم ہے ——— حد درجہ خوب رُو، کم سن، حد درجہ دلیر، انتہائی سخی، نہایت رحم دل، بے انتہا ذہین و ذکی یا بے حد کریہہ الجثہ، کم رُو، مسّن، کم حوصلہ، ممسک، بخیل، جابر اور غبی ——— غرض زندگی کی دونوں انتہائیں اپنی انتہا تک پہنچی ہوئی دکھائی دیتی ہیں اور یہ وہ کیفیت ہے کہ بلندش بغایت بلند، پستش بغایت پست کا مضمون، عین بعین اس پر صادق آتا ہے!!

یہ داستانیں خارجی مظاہر کی تفصیل پیش کرتی ہیں۔ کرداروں کی خارجی تصویر کشی، داستان نگار کے لئے فن کا درجہ رکھتی ہے اور داخلیت کم و بیش معدوم ہے۔ جذبات سے محسوسات اور ذہنی کیفیات سے بس کہیں کہیں ہی واسطہ ہے۔ ورنہ بالعموم ان سے کہیں بحث نہیں۔ افراد کے اندرون اور بطون میں جھانکنے، اسے چھونے اور چھیڑنے کی کوئی کوشش نہیں۔

غرض "باغ و بہار" سے پہلے کردار نگاری کی روایت اس شکل میں ضرور موجود رہی ہے کہ اردو کی نثری داستانوں میں کردار کے بیرون اور خارج کے نقشے بکثرت ملتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں جب ہم "باغ و بہار" کے کرداروں پر نظر ڈالتے ہیں تو پروفیسر سید وقار عظیم کے بقول:

> "ہمیں ایسے کرداروں سے .... سابقہ پڑتا ہے جو کٹھ پتلی ہونے کے بجائے خود اپنی انفرادی خصوصیتوں کی بنا پر زندہ ہیں ——— اور ان کی زندگی کا دامن میر امّن کے فن کی زندگی کے ساتھ بندھا ہوا ہے ——" (ہماری داستانیں، صفحہ ۱۲۴)

"باغ و بہار" کے کرداروں کا جائزہ اور میر امّن کے فن کا مطالعہ ایک الگ اور مستقل موضوع ہے اور زیرِ نظر مضمون کے دائرے سے بہرحال خارج ——— اس لئے یہاں اس بحث سے صرفِ نظر کیا جاتا ہے۔ اسے میں کسی دوسری فرصت کے لئے اٹھا رکھتا ہوں۔

قاضی افضل حق قرشی

مکاتیبِ سرسیّد

سرسید کے مکاتیب کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ایک مختصر مجموعہ وحید الدین سلیم کا مرتب کیا ہوا ہے۔ دُوسرا نسبتاً ضخیم ہے۔ اس کے مرتب خود ان کے پوتے سر راس مسعودؔ ہیں۔ جس میں کئی سو خطوط موجود ہیں۔ تیسرے مجموعہ کے مرتّب شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی ہیں۔ اس مجموعہ میں سر راس مسعود کے مرتبہ خطوط کے علاوہ کچھ نئے اضافے بھی ہیں۔ لیکن ابھی ایسے خطوط کی تعداد کچھ کم نہیں جو منظرِ عام پر نہیں آئے اور قدیم خانوادوں کے ہاں مخفوظ پڑے ہیں یا قدیم مطبوعہ کتابوں اور پرانے اخبارات و رسائل کی جلدوں میں دفن ہیں۔

آج کی صحبت میں سرسید کے تین خطوط اور ایک غزل پیش کر رہا ہوں۔ یہ خطوط شمس العلماء مولوی سید ممتاز علی کے نام لکھے گئے اور رسالہ "کہکشاں"[1] میں شائع ہوئے۔ یہ رسالہ سید امتیاز علی تاج کی زیرِ ادارت دار الاشاعت پنجاب لاہور سے نکلتا تھا۔

شمس العلماء مولوی سید ممتاز علی ۲۷ ستمبر ۱۸۶۰ء کو دیوبند میں پیدا ہوئے۔ اور وہیں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانیٔ دار العلوم دیوبند کی زیرِ نگرانی عربی اور فارسی کی تعلیم پائی۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن آپ کے ہمدرس تھے۔ پھر آپ لاہور چلے آئے اور یہاں بی اے کا امتحان دیا مگر ناکام رہے۔ ۱۸۹۰ء میں آپ نے لاہور میں ایک چھاپہ خانہ "مطبع رفاہِ عام" کے نام سے جاری کیا۔ مطبع کے ساتھ ہی ایک بک ڈپو بھی قائم کیا جس کا نام "دار الاشاعت پنجاب" رکھا۔ ان دونوں کے ساتھ عورتوں کے لیے آپ نے ایک ہفتہ وار اخبار بھی شائع کرنا شروع کیا جس کا نام سرسید نے "تہذیب النسواں" تجویز کیا تھا۔

۱۹۰۹ء میں آپ نے بچوں کے لیے ہفتہ وار "پھول" جاری کیا۔ آپ کی تصانیف بہت سی ہیں لیکن آپ کا سب سے بڑا علمی کارنامہ "تفصیل البیان فی مطالب القرآن" ہے جو مضامینِ قرآنی کی بڑی ہی عجیب فہرست سات جلدوں میں ہے۔ آپ کی وفات ۱۵ جون ۱۹۳۵ء کو ہوئی۔

(۱)

مجبی و مکرمی:

آپ کا عنایت نامہ پہنچا۔ انبہ سہارنپور جو از راہِ عنایت بھیجے تھے وہ بھی پہنچے۔ دونوں عنایتوں کا شکریہ قبول ہو۔ انبہ نہایت عمدہ حالت میں پہنچے۔ اور نہایت خوشی سے حقیقت میں دل کی خوشی سے کھائے گئے اس خیال نے کہ وہ آپ کے بھیجے ہوئے ہیں ان کا لطف بہت زیادہ کر دیا تھا۔

---

[1] : رسالہ کہکشاں ج ۱، ش ۵ ص ۲۷ - ۲۹ جولائی ۱۹۲۰ء

تفسیر کے لکھنے کا کام شروع ہو گیا ہے اور بہت سی لکھ ڈالی ہے ۔ اس سورت میں مشکل مشکل مقام ہیں ۔ دنیا کی پیدائش چھ یوم میں، عرش و حاملانِ عرش کی بحث اسی میں ہے ۔ دونوں بحثیں عمدگی سے لکھی گئی ہیں ۔ مگر اب تک دو آیتیں حل طلب باقی ہیں ۔ جو متعلق عرش و حاملانِ عرش ہیں ۔ اُنکی نسبت کتابیں الٹ پلٹ رہا ہوں ۔ مجھے اُمید ہے کہ خدا کے فضل سے آپ کی طبیعت اچھی و خوش ہے ۔ کب تک آپ دیوبند میں رہیں گے ۔ اور لاہور کب جاویں گے ۔ آپ اس بات سے خوش ہوں گے کہ سجاد حسین خلف مولوی الطاف حسین صاحب حالی بی اے میں پاس ہو گئے ہیں ۔ مدرستہ العلوم میں سول سروس کلاس کھولنے کے لئے بروز یکشنبہ کمیٹی ہو رہی تھی وہ سب روئداد کل کے اخبار میں چھپے گی ۔ آپ کے پاس بھیجوں گا ۔ اگر فرصت ہو اور طبیعت اچھی ہو تو اس پر اپنی رائے لکھئے گا ۔ اور اخبار انجمن پنجاب میں چھپوا دیجئے گا ۔ محمد علی چشتی نے جو طریقہ اختیار کیا ہے مجھے نہایت رنج و افسوس ہے ۔ محرم علی ایک خلوص سے ہم لوگوں سے ملاقات رکھتے ہیں پس ان سے جو بات نامناسب ہوتی ہے ضرور ہے کہ ہم لوگوں کو اس کا رنج ہو ۔ مگر بجز افسوس و رنج کے اور کچھ چارہ نہیں ۔ والسلام

خاکسار سید احمد ۔ علی گڑھ ۴ جولائی ۱۸۸۴ء

(۲)

مجبی و مکرمی مولوی سید ممتاز علی صاحب ۔

تفسیر کا مسودہ لکھتے لکھتے ایک شعر کا مضمون اتفاقیہ خیال میں آیا ۔ اس وقت طبیعت اس طرف متوجہ ہو گئی ۔ چھ شعر حسب حال قلم سے نکلے ۔ آپ کو بھیجتا ہوں ۔ اُمید ہے کہ آپ پسند کریں گے ۔ اگر آپ کا دل چاہے تو ان کو اخبار انجمن پنجاب میں چھپنے کے لئے بھیج دیجئے ۔ والسلام

خاکسار سید احمد علی گڑھ ۷ جولائی ۱۸۸۴ء

فلاطون طفلکے باشد زیونانیے کہ من دارم
مسیحا رشک مے دارد ز رومانیے کہ من دارم

زکفر من چہ میخواہی ز ایمانم چہ می پرسی
ہماں یک جلوۂ عشق است ایمانے کہ من دارم

خدا دارم ولے بریاں ز عشق مصطفےٰ دارم
ندارد ہیچ کافر ساز و سامانے کہ من دارم

ز جبریلِ امین قرآں بہ پیغامے نمی خواہم
ہمہ گفتارِ معشوق است قرآنی کہ من دارم

فلک یک مطلع خورشید دارد با ہمہ شوکت
ہزاران مطلعہا دارد گریبانے کہ من دارم

ز برہان تا بہ ایمان سنگہا دارد رہ واعظ
ندارد ہیچ واعظ ہمچو برہانے کہ من دارم

(۳)

مجبّی مکرّمی مخدومی -

دو قطعہ عنایت نامجات پہنچے - اوّل شکریہ اس اصلاح[1] کا کرتا ہوں جو میرے شعر میں آپ نے کر دی - نہایت عمدہ اصلاح ہوئی - بلکہ لفظ اینچنیں سے تمام شعر میں جان تازہ آگئی ہے - دوسرا شکر اس آرٹیکل کا ہے جو نسبت بورڈنگ ہاؤس کے لکھا ہے - جس قدر وہ چھپا ہے وہ بھی بہت ہے منشی شمس الدین صاحب کا نہایت شکر ہے کہ اس قدر آرٹیکل انہوں نے اپنے اخبار میں چھاپ دیا - چار دیواری بورڈنگ ہاؤس کے گرد پوری ہوگئی - صرف ایک دروازہ آمد و رفت رہا جس پر پہرہ مقرر کیا جاوے گا - اور کسی لڑکے کا کسی وقت غیر حاضر ہو جانا ناممکن ہو جاوے گا - ابھی میں سوچ رہا ہوں کہ اس آرٹیکل کا ہمارے اخبار میں بھی چھاپنا مناسب ہو گا یا نہیں - اگر مولوی سمیع اللہ خاں صاحب کی رائے بھی متفق ہوگی تو چھاپوں گا - مجھے خیال ہے کہ ہمارے اخبار میں چھپنے سے اس کی قوت کم ہو جاوے گی اور لوگ سمجھیں گے کہ ہمارے لکھوانے سے لکھا گیا ہے - مجھے نہایت افسوس ہوا کہ سوسائٹی کا اخبار آپ کے پاس نہیں جاتا - مدّت ہوئی میں نے کہہ دیا تھا کہ ایک پرچہ بلا قیمت آپ کی خدمت میں روانہ ہوتا رہے - آج میں نے پھر تحریری حکم بھیجدیا ہے - آیندہ سے برابر ایک پرچہ آپ کے پاس پہنچا کریگا - اس پرچہ میں گو مضامین عمدہ نہ ہوتے ہوں مگر مدرسۃ العلوم کے ہر قسم کے حالات چھپتے ہیں اور ایسے دلی دوستوں کو اور مدرسۃ العلوم کے دلی خیر خواہوں کو جیسے کہ آپ ہیں اس کے حالات کا معلوم رہنا نہایت ضرور ہے - پس وہ پرچہ ہمیشہ برابر آپ کے پاس پہنچتا رہے گا -

تفسیر پر بہت مصروف ہوں - مگر ہودؑ - عاد - ثمود - صالح حضرات نے نہایت دق کر رکھا ہے - مفسرین و مورخین پر خدا رحمت کرے کیسی کیسی لغو و مہمل باتیں لکھی ہیں - چونکہ یہ واقعات خاص عرب کے لوگوں کے ہیں انکی صحت کی بہت کم مدد ملتی ہے - میں چاہتا ہوں کہ یہ واقعات بالکل صاف اور تاریخانہ طرز پر لکھ دیئے جائیں - ایک اور آفت یہ ہوئی کہ اصل مسودہ خطباتِ احمدیہ کا گم ہو گیا ہے - دستیاب نہیں ہوتا - خدا جانے منشی ذوالفقار علی مرحوم نے کہاں غارت کر دیا - اب یہاں محمد علی سب حالات انگریزی خطباتِ احمدیہ سے منتخب کر دیتے ہیں تو کام چلتا ہے - میری ٹانگ کا درد بالکل نہیں گیا - تخفیف ہے - ایک ہفتہ ہوا کہ درد میں شدّت ہو گئی تھی - تین دن شدّت رہی کچھ کام نہیں کر سکا - اب بہت تخفیف ہے - کسی قدر کسک باقی ہے - ایک جلد سفرنامہ پنجاب کی ہدیۃً آج آپ کی خدمت میں روانہ کی ہے - اس نذر کو قبول فرمانے سے مجھ کو عزت اور میرے دل کو خوشی بخشئے - والسّلام

خاکسار سیّد احمد - علی گڑھ - ۲۲ جولائی ۱۸۹۳ء

(حاشیے پر) نوروزِ نبوی خدا آپ کو اور تمام اُمّتِ محمّدیہ کو مبارک کرے - آمین

---

[1] : مولوی سیّد ممتاز علی صاحب نے "ہزاراں مطلعہا دارو گرِیبانے کہ من دارم" کی بجائے "ہزاراں اینچنیں دارو گرِیبانے کہ من دارم" تجویز کیا تھا۔

نصرت ممتاز شیخ

مفتی کے افسانے

کہا گیا ہے[1] کہ ممتاز مفتی کا بیان کچھ اس طور سے کرو کہ جو کچھ وہ عمر بھر لکھتا لکھاتا رہا ہے اس کی حقیقت سب پر واضح ہو اور سننے والے جان لیں کہ مفتی جو اپنے تئیں کہانی کہتا تھا اس فن میں کس حد تک یکتائے روزگار تھا۔ اور یہ جو کہتے ہیں کہ زندہ رہنے والے کو تاریخ اپنے صفحات میں بند کر لیتی ہے تو کیا مفتی کا شمار زندوں میں رہے گا؟ اور اگر رہے گا تو کیونکر؟ کیا لوگ اس سے مرنے کے بعد انصاف کریں گے؟ اس لئے کہ زندگی میں تو ہمارے یہاں ادبی عدالتیں کم ہی بیٹھتی ہیں۔ اور انصاف کا معاملہ موت تک التوا میں ڈال رکھتی ہیں ——— چنانچہ آج شام جو حضرات اس تمنا میں یہاں کھنچے چلے آئے ہیں کہ مفتی کے سلسلے میں کوئی نہ کوئی فیصلہ صادر ہوگا۔ یعنی یا تو وہ سرِ دار کھینچا جائے گا یا اس کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے جائیں گے اور پھر اسے درمیان میں بٹھا کر قوالی ہوگی تو ان کے لئے سوائے اس کے کیا عرض کیا جائے کہ وہ یہاں سے نامراد واپس لوٹیں گے ——— اس شخص کی طرح جو تماشا دیکھنے سڑک کے کنارے کھڑا ہو مگر مداری کی پٹاری میں سے سانپ نہ نکلے۔

واقعہ یہ ہے کہ مفتی نے کہانی کے فن میں سانپ نکالنے کی کبھی کوشش نہیں کی، اگرچہ اس نے لوگوں کو اکٹھا کرنے کے لئے ڈگڈگی ضرور بجائی۔ لوگ اکٹھے بھی ہوئے اور ڈگڈگی بھی سنتے رہے مگر سانپ کبھی نہیں نکلا۔ مفتی کے افسانے کی ساری لذت ڈگڈگی کی لذت ہے۔ وہ اپنی کہانی میں قاری کو بڑی چابکدستی سے متوجہ کرنا جانتا ہے۔ اس نے انسانی نفسیات کو اندر سے نکال کر سڑک پر لانے کا کام اردو افسانے میں اس دور میں شروع کیا جب اردو میں لکھنے والے انسانی لاشعور کی پیچ در پیچ گتھیوں کی طرف ابھی متوجہ نہیں ہوئے تھے۔ اردو افسانہ اس دور میں اجتماعی شعور اور اجتماعی ماحول کے کسی نہ کسی پہلو کو چھوتا تھا مگر یہ کہ فرد بحیثیت فرد کے کیا شے ہے؟ اس کے معاشرتی رشتوں پر اس کی ذات کیونکر اثر انداز ہوتی ہے؟ شخصیت کی تعمیر میں لاشعور کیونکر در آتا ہے؟ شخصیت کی تعمیر کیونکر ہوتی ہے؟ کردار کی تعمیر میں ذہنی الجھنیں کیسے کارفرما ہوتی ہیں؟ ——— فرد اور اس کی شخصیت کے یہ تمام پہلو مفتی کے فن کا حصہ بنے اور اردو افسانے میں تحلیل نفسی، جنسی گھٹن، جنسی محرومیاں، جنسی تلذذ اور ان سے پیدا ہونے والے مسائل پہلی مرتبہ ادب سے روشناس ہوئے ——— یوں بحیثیت افسانہ نگار مفتی کا فن افسانہ نگاری کی تاریخ میں اس کی بقا کی ضمانت ہے۔

مختصر افسانہ جو پریم چند کے ساتھ شروع ہوا تھا، مفتی تک پہنچتے پہنچتے اپنے خدوخال سنوار کر زندگی کے ہر پہلو کی تصویر کشی کرنے کا اہل ہو گیا۔ مفتی کا افسانہ فنِ افسانہ نگاری میں ایک نئے باب کا اضافہ تھا ——— اس کی وجہ سے نفسِ شعور اور تحت الشعور سے پیدا شدہ مسائل اور تحلیل نفسی ادب کا موضوع بنے۔ یہ دور وہ تھا جب فرائڈ ہمارے یہاں نیا نیا دریافت ہوا تھا اور شعورِ ذات کا چسکا نیا نیا پڑا تھا۔ جدید انقلابی دور میں جنسی، اشتراکی اور معاشی فلسفے کا طرح طرح سے چرچا تھا۔ مفتی نے نفسیاتِ انسانی کو فرائیڈ اور اس کے معاصرین کے حوالے سے سمجھا اور اس دریافت کو اپنی سرزمین میں رائج کرنے کی ٹھانی۔

---

[1] ممتاز مفتی کے ساتھ ایک شام منعقدہ راولپنڈی میں پڑھا گیا۔

یہ بڑا کٹھن کام تھا کہ نفسیاتی الجھنوں اور جنسی مسائل کو ادب کا موضوع بنانے میں یہ خطرہ ہوتا ہے کہ وہ مسئلے کہیں "کیس ہسٹری" بن کر نہ رہ جائیں۔ ادب کا موضوع بننے کے لئے ضروری ہے کہ نفسیاتی مسئلے کو ذہنی معالج کی آنکھ سے نہیں بلکہ احساس کی آنکھ سے دیکھا جائے۔ اور پھر نفسیاتی مسئلے سے پیدا ہونے والے اثرات کو اس نظر سے دیکھا جائے کہ انہوں نے کردار کی تعمیر یا تخریب میں کیا رول ادا کیا ہے؟ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ مفتی نے اردو افسانہ میں نفسیاتی مسائل کو معالج کی آنکھ سے نہیں ادیب اور فنکار کی آنکھ سے دیکھنے کی کوشش کی۔ اور اپنے کئی افسانوں کو "کیس ہسٹری" بننے سے بچا لیا۔

مفتی کے ہاں اقتصادی، تمدنی اور نفسیاتی شعور کے مسائل گڈمڈ انداز میں نظر آتے ہیں۔ وہ طبقاتی سماج، سرمایہ، جائیداد، مزدور اور قوتِ کار کو کہانی کا حصہ بناتا ضرور ہے لیکن ان سب پر نفسیات کی مہر لگا دیتا ہے ـــــ جنس اور نفسیات، دراصل یہی دو موضوع مفتی کے موضوع ہیں۔ وہ اس اعتبار سے اپنے دور کے ان اولین افسانہ نگاروں میں سے ہے جنہوں نے انسانی زندگی کے ایک انجانے پہلو کو متعارف کرایا۔ موضوع کا یہ نیا پن بجائے خود اردو ادب کے قارئین کے لئے ایک پرکشش بات تھی۔ یہ بات نہیں کہ جنسی مسائل یا انسانی نفسیات کا افسانے میں کوئی ذکر ہی نہیں تھا۔ مفتی کے معاصرین میں سعادت حسن منٹو بھی جنسی جذبے اور نفسیات کے موضوعات پر لکھ رہا تھا۔ مگر اس کا زاویہ بالکل دوسرا تھا اور لہجہ بھی یکسر مختلف یعنی بہت تیکھا۔

مفتی نے ذہنی پیچیدگیوں اور الجھنوں کا تجزیہ بڑی محنت سے کیا ہے اور اپنے نفسیاتی نظریئے کو قاری پر صادر کرنے کی کوشش نہیں کی۔ مفتی کا نظریہ، نظریہ برائے نظریہ کی ذیل میں نہیں آتا۔ اس سلسلے میں وہ پیچیدگیوں کو دور کرنے کے لئے منطق تخلیق کرتا ہے اور یوں اس کے الجھے ہوئے کردار اسے مجبور کر دیتے ہیں کہ وہ قاری کو سمجھانے کا انداز اختیار کرے اور اسی لئے اس کے افسانے میں بعض اوقات انشائیہ کے ٹکڑے چپ چاپ شامل ہو جاتے ہیں۔

مفتی نے افسانے میں نفسیاتی نظریات کی طلسم گاہ نہیں بنائی۔ ان میں اس کا اپنا مشاہدہ اور تجربہ شامل ہے۔ لیکن کبھی کبھی وہ اپنے ذاتی نظریات کو مسائل کے ساتھ ملا کر اس طرح پیش کرتا ہے کہ اس کا قاری مسئلے کی اہمیت کو جاننے کے باوجود اس سے بجا طور پر اختلاف کر سکتا ہے ـــــ میں اس سلسلے میں مفتی کا افسانہ "موقعہ" یاد دلاؤں گی جس میں جنسی دباؤ اور گھٹن کی شکار "شہزاد" ہسٹریا کی مریض ہے اور اس کا بھائی قاسم بہن کی صحت کے لئے ڈاکٹر کی تشخیص کے مطابق اس کی شادی تو نہیں کر سکتا مگر اس کی جنسی تسکین کے لئے دو شرابیوں کو اپنی غیر موجودگی میں وہاں جاتے ہوئے دیکھ کر منہ موڑ لیتا ہے اور بگٹٹ بھاگتے ہوئے یہ کہتا ہے کہ "خدا کرے وہ صحتمند ہو جائے، خدا کرے اس کی بیماری دور ہو جائے ـــــ" میں سمجھتی ہوں کہ افسانے میں موضوع جس معاشرے سے چنے جاتے ہیں، ان کے حل بھی اسی معاشرے کی اقدار کے پیشِ نظر ڈھونڈے جاتے ہیں۔ اور "موقعہ" ایسی کہانی ہے جس میں مسئلے کی مسلّم اہمیت کے باوجود ہمارا اپنا معاشرہ اس نفسیاتی حل کو کسی طرح قبول نہیں کر سکتا۔ "شہزادیں" تو ہمارے معاشرے میں یقیناً بہت سی ہیں لیکن قاسم جیسا بھائی کوئی نہیں ہو سکتا جو پاک و ہند کا باشندہ ہو مگر ذہن مغرب کا رکھتا ہو۔

اس میں شک نہیں کہ مفتی نے انسانی نفسیات کی باریکیوں کو سمجھنے کی بڑی کوشش کی اور پھر ان باریکیوں کو بڑا کر کے دوسروں کو بھی دکھایا۔ مفتی کی "آپا" کی سلگتی ہوئی جنسی محرومی جسے اس نے محرومی کی سطح سے اٹھا کر تنہا دکھ کی داستان بنا دیا، فنی گرفت اور شدتِ تاثر کے اعتبار سے بے مثال اور زور دار کہانی ہے مگر مفتی لاشعور کی باریک بھینیوں میں گھس کر جب شعور سے بے خبر ہوتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ شعوری حد تک لاشعور کو پیش کر رہا ہے۔ اس کے ایسے افسانوں میں جذبے کی گرمی اور آنچ بہت کم ہے ـــ جذبہ جو ادب کی اساس ہے اور جو فنی صلاحیتوں کو اجاگر کرتا ہے۔ بس یہ ایک آنچ کی کسر اگر نہ رہتی تو "آپا" کے معیار کے اور بہت سے افسانے بھی مفتی کی طرف سے ہمیں پڑھنے کو ملتے۔ "آپا" نے مفتی کے بہت سے افسانوں کا خون کیا ہے، اس میں قصور "آپا" کا کم اور مفتی کا زیادہ ہے کہ اس نے نفسیاتی ژرف بینی کے ساتھ جذبے کے اس نقطۂ نظر کو سنبھالے نہیں رکھا جو اسے "آپا" میں ہاتھ آیا تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بیدی، کرشن، منٹو، ندیم کے قوبے کا یہ آدمی کبھی کبھی اپنے تئیں بڑا تنہا محسوس کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ہم سب میں سے صرف بیدی بچا ہے، باقی سب چل بسے

ہیں ۔ بیدی کے بقول مفتی اس لئے زندہ ہے کہ ابھی تک لکھ رہا ہے اور اسی سادگی سے لکھ رہا ہے جو اس کی تحریر کا خاصہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے بیدی کا ذکر بھی وہ محض برائے بیت کرتا ہے ورنہ وہ خود سے مایوس ہو کر سب سے مایوس ہو چکا ہے۔

میرا خیال ہے ماضی میں مفتی کے ہاں جو تعمیری اضطراب تھا اسے برقرار رکھنا اس لئے ضروری ہے کہ اردو افسانے کو ایسے کہنہ مشق فنکاروں کی ابھی شدید ضرورت ہے۔ ابھی ان گھروں پر ویسی ہی ویرانی محیط و مسلط ہے جنہوں نے مفتی کو متاثر کیا تھا اور اس کی نفسیاتی حِس کو چیلنج کیا تھا ۔۔۔ وہ عورت ابھی تک چولہے میں پھونکیں مارتی، ٹماٹر کاٹتی اور یاس بھری تھکن میں چُور، غمزدہ اور اُداس، جسم اور ذہن کے طوفانوں کو چھپائے یہاں آس پڑوس ہی میں ایسے فنکاروں کی منتظر ہے جو اس کی نیم وا ڈولتی کشتیوں جیسی آنکھوں کو دیکھ کر انہیں سینے سے لگائے اور اس کی صدیوں کی پیاس کو بجھائے ۔۔۔ مفتی جن گلیوں، محلّوں، بازاروں میں پھرتا رہا ان کی گہما گہمی اسے آج بھی دعوت دے رہی ہے۔ "مفتی" کا افسانہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس نے محرومی، مایوسی اور بیزاری کو کرید کرید کر زندگی سے پیار کے احساس کو سلگایا ہے۔

پچھلے دنوں مفتی نے جنسیات اور نفسیات سے ہٹ کر تصوف اور روحانیات پر قلم اٹھایا اور پھر اسے خود سے شکایت ہو گئی کہ اس کی بات لوگوں تک نہیں پہنچی۔ اسے یہ بھی شک گذرا کہ اس موضوع پر اسے وہ فنی چابکدستی حاصل نہیں ہوئی جو جنسیات یا نفسیات کے موضوعات پر حاصل ہے اور یہ بھی کہ روحانیات کو لوگوں تک پہنچانے کے لئے کیا تکنیک اختیار کرنی چاہیے کہ لوگ اس کی باتوں کو غیر المعقول اور دقیانوسی کہہ کے نہ جھٹک دیں؟ میرا خیال ہے کہ روحانیات میں بھی اس کے ساتھ وہی ہوا جو اس کے اپنے موضوعات میں ہوتا ہے یعنی ایک آنچ کی کسر یہاں بھی رہ گئی ورنہ گمبھیر روحانی تجربہ جب خبر کے مقام پر آتا ہے تو وہ لوگوں تک یوں نہیں پہنچتا کہ وہ اسے غیر المعقول سمجھ کے جھٹک دیں ۔۔۔ وہ اسے بعید از عقل کہتے ہوئے بھی اس کی صداقت سے منکر نہیں ہوتے۔ جذبے سے کہی گئی بات اپنی خبر ضرور دیتی ہے ۔۔۔ اور مفتی تو ایسا فنکار ہے جس کے کردار برسوں گذرنے پر بھی ہمیں اپنی خبر دیتے رہتے ہیں۔

مفتی کے پورے افسانوی فن پر جو عورت چھائی ہوئی ہے وہ ایسی عورت ہے جسے آپ، میں ہم سب نے اپنے آس پاس چپ چاپ بغیر آواز کے چلتے پھرتے دیکھا ہے۔ اس کی چپ میں صدیوں کی پابندی اور گھٹن کے خلاف خاموش احتجاج ہے۔ دفتروں کے بابو، بستی کے مزدور، فیکٹری میں کام کاج کرنے والے، چھابڑی والے، پان فروش، سیٹھ اور نچلے درمیانے طبقے کے سبھی لوگ اپنے جنسیاتی، نفسیاتی مسائل لے کر مفتی کے پاس آتے ہیں۔ وہ انہیں دیکھتا ہے، غور کرتا ہے اور ان کے دلوں کی دھڑکن کو لفظوں میں بند کر دیتا ہے۔ یہ کردار بے خوف اپنے ذہن اور جسم کا بوجھ اتارتے ہیں ۔۔۔ مفتی اس بوجھ کی کیفیات کو وضاحت سے بیان کرتا ہے، جزئیات کی تفصیل سے اُسے پرلطف اور پرکشش بناتا ہے لیکن اس فضا میں ان کی نفسیاتی الجھنیں ایک سطح پر محض نفسیاتی الجھنیں لگتی ہیں مگر دوسری سطح پر ان پر کہانی کا شبہ بھی ہونے لگتا ہے۔ مفتی نے یہ شبہ اپنے تمام افسانوں میں بڑی کوشش اور محنت سے برقرار رکھا ہے یہی اس کی کامیابی ہے۔ آپ چاہیں تو اسے ناکامی بھی کہہ لیں۔ ناکامی میں نے اس لئے کہا کہ خود ممتاز مفتی کو کبھی کبھی یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ وہ صرف انسانی نفسیات کے رموز سے آگاہی رکھتا ہے اور جو کچھ اس سے مختلف ہے اس پر اس کی دسترس نہیں ۔۔۔ منٹو نے جنس کے موضوع کو مجذوب جانا گو اس کا "نیا قانون" اس کے بہترین افسانوں میں شمار ہوتا ہے۔ منٹو جب تحلیل نفسی کرتا ہے تو اس کے کردار کپڑے پھاڑ پھاڑ کر عریاں ہونے لگتے ہیں۔ وہ چیختے ہیں، چلاتے ہیں اور کہتے ہیں یہ دیکھو، میں کون ہوں، مجھے جانو مجھے پہچانو اور پھر جنس جسے ہمارے معاشرے نے ڈھانپ چھپا کر رکھا ہے کبھی کبھی ہماری آنکھ شرم سے جھکا دیتی ہے۔ لیکن یہی موضوع جب مفتی برتتا ہے تو اس کے کردار باوجود کتنی ایسے ہی جنسی مسائل کا شکار ہونے کے، اپنی محرومی، گھٹن اور دباؤ کا یوں دبے دبے اظہار کرتے ہیں کہ گھریلو فضا قائم رہتی ہے۔ بے جا جنسی پابندیوں کے خلاف مفتی نے بھرپور احتجاج کیا ہے لیکن اس احتجاج میں اس کے تخلیق کئے ہوئے کردار سر جھکائے، آنکھیں نیچے کئے، بظاہر کام کاج میں مصروف، آپ کے سامنے سے چپ چاپ گزرتے چلے جاتے

ہیں مگر ان کے وجود کو آپ کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔

مفتی کے ساتھ زندگی میں یوں تو کئی حادثے گذرے ہیں مگر اس کی افسانہ نگاری کے ساتھ یہ حادثہ ہوا کہ باوجود نامور ادیب ہونے کے کوئی نامور نقاد نہ ملا۔ پتہ نہیں اس کا قلق مفتی کو ہے یا نہیں۔ ویسے دیکھا جائے تو نہیں ہونا چاہیئے۔ اس لئے کہ بڑا ادیب، نقاد کا محتاج نہیں ہوتا بلکہ اس کے برعکس نقاد اپنے دور کے زندہ ادیبوں سے کسب فیض کرتے ہیں اور ان کی تخلیقات سے اپنی تحریروں کا پیٹ بھرتے ہیں۔ لیکن پچھلے کچھ عرصے سے مفتی کی رفتار میں جو کمی آ گئی ہے تو اس سے کبھی کبھی یہ غلط فہمی ہو جاتی ہے کہ کہیں وہ نقد ادب کو زیادہ اہمیت تو نہیں دینے لگ گیا۔ لکھنے والا اپنی زندگی کا ثبوت لکھ کے ہی دیا کرتا ہے، اس چیز سے بے نیاز ہو کے کہ اس کی تحریریں تنقید کا موضوع بنی ہیں یا نہیں۔ یوں لگتا ہے کہ وہ اپنے آپ سے مایوس ہے یا پھر جو کچھ اس نے عمر بھر لکھا ہے اس کی اہمیت کے بارے میں اسے کچھ کچھ شک سا ہونے لگا ہے۔

بہر حال یہ شام اگر مفتی کو ایک ہلکا سا جھٹکا دے سکے تو بڑی بات ہے۔ بہر حال اس کی شخصیت اور اس کا فن ایسے موضوعات ہیں جو فن اور زندگی سے ربط رکھنے والوں کی دلچسپی کا باعث ہیں اور لوگ اس کے افسانے پڑھ کے اس کے بارے میں سوچنے کی ہمت ابھی رکھتے ہیں۔ چنانچہ اسے تازہ دم ہو کر اپنے سفر کو بڑے عزم سے شروع کرنا چاہیئے۔ لوگ تو اب بھی حلقہ بنائے سڑک کے کنارے کھڑے ہیں ممکن ہے اب کے ڈگڈگی کے ساتھ سانپ بھی نکل آئے۔

زاہد فارانی

اِنتظار حسین کی کہانیاں

خدا کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے انتظار حسین کی نانی اماں کو جنہوں نے اپنے نواسے کو اچھی اچھی کہانیاں سنائیں۔ ان کہانیوں سے انتظار حسین کو فائدہ بھی پہنچا اور نقصان بھی۔ فائدہ تو یہ ہوا کہ انتظار حسین بیٹھے بٹھائے افسانہ نگار بن گیا اور نقصان یہ کہ اس نے اپنے پڑھنے والوں کے لئے جتنی کہانیاں لکھی ہیں ان میں سے اکثر انتظار حسین کی بجائے نانی اماں کی کہی ہوئی کہانیاں معلوم ہوتی ہیں یا یوں کہئے کہ اس کی طبع زاد کہانیاں سنتے ہوئے ہمیں یہ گمان ہوتا ہے کہ کہانیوں کا کوئی رسیا اپنے بچپن میں سنی سنائی کہانیوں کو ہمارے سامنے دہرا رہا ہے اور کچھ تو اپنے حافظے کی کمزوری کی وجہ سے اور کچھ مرورِ ایام کی بدولت اکثر کہانیاں اسے کئی جگہوں سے بھول گئی ہیں، اور اگر کوئی کہانی پوری یاد بھی ہے تو اس کی اصل ترتیب قصہ گو کے ذہن میں غلط ملط ہو گئی ہے۔ پھر اس کی طبیعت میں وہ اعتماد، خیالات میں وہ تسلسل اور بیان میں وہ روانی بھی نہیں جو اس کی نانی اماں اور ان کی ہم عصر، ہم وطن اور ہم عمر خواتین کا خاصا تھی۔ انتظار حسین کو داستان گوئی کا شوق تو ہے لیکن وہ ایسا داستان گو نہیں جو بقول خود "راہ چلنے والے مسافروں کو بھٹکا سکے" اس کی کہانیاں سن کر مسافر تو نہیں بھٹکتے البتہ وہ خود ضرور راستہ بھول جاتا ہے۔

اگر آپ کو میری ان باتوں پر شبہ ہے تو "گلی کوچے" اور "کنکری" کی اکثر کہانیاں، بالخصوص "چوک"، "بڑھیا"، "خریدو حلوہ بیسن کا"، "آم کا پیڑ"، "روپ نگر کی سواریاں"، "وہ آئے گی" وغیرہ دوبارہ پڑھ کر دیکھئے۔ ان کہانیوں میں آپ کو کہانی کا صرف ایک عنصر نظر آئے گا اور وہ ہے کہانی کی فضا۔ نوازیوں کی دکانوں، استادوں کے اکھاڑوں، جوئے کے اڈوں، مجمع بازوں، پتنگ بازوں اور کبوتر بازوں کی منڈیروں، عشرۂ محرم کے دوران جگمگاتے ہوئے سیاہ پوش امام باڑوں، مرثیہ خوانی اور قوالی کی محفلوں وغیرہ کی چلتی جاگتی حقیقی متحرک اور بھرپور فضائیں اور تصویریں اپنے تمام تر رنگوں کے ساتھ آپ کو انتظار حسین کی ان کہانیوں میں جا بجا بکھری ہوئی ملیں گی۔ عوامی ماحول کی اس حقیقت پسندانہ عکاسی کی بدولت انتظار حسین کو اگر جدید اردو افسانے کا نظیر اکبر آبادی کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

فضا کشی میں انتظار حسین کو کمال حاصل ہے۔ اور اس کا فن یہ ہے کہ وہ جس ماحول میں رہتا ہے اس کا حصہ بن جاتا ہے اور ماحول کو اپنی شخصیت کا حصہ بنا لیتا ہے۔ لیکن بعض مقامات پر وہ فضا کشی کی رو میں اس قدر بہہ جاتا ہے کہ اس کے ہاں کہانی کی بجائے فضا کشی مقصود بالذات معلوم ہونے لگتی ہے۔

انتظار حسین کی زیر بحث کہانیوں کی تمام فضائیں اس کی یادوں سے ترتیب پاتی ہیں لیکن یہ عجیب بات ہے کہ انتظار حسین کا حافظہ زیادہ تر اجتماعات کی یادوں کو محفوظ رکھنے اور انہیں زندہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

اس کے دل و دماغ میں افراد کے لئے بہت کم جگہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انتظار حسین کے ہاں زندہ اور ارتقا یافتہ کردار کم نظر آتے

ہیں۔ انتظار حسین کا سارا زور ماحول پر ہے، کردار پر نہیں، تاہم اس نے بعض حقیقی اور بھرپور کردار بھی تخلیق کئے ہیں جن میں عقیلہ خالہ، استاد اور بھولے کے کردار سرِفہرست ہیں۔ عقیلہ خالہ اپنی ازدواجی زندگی کی ناکامیوں کا انتقام لینے کے لئے دوسروں کی منگنیاں تڑوانے اور بیاہ شادیوں میں کھنڈت ڈالنے کا وطیرہ اختیار کر لیتی ہے۔ محلے کی عورتیں اس کی ظالمانہ حکمتِ عملی سے اس قدر مرعوب ہو جاتی ہیں کہ اس سے پیچھا چھڑانا ان کے لئے محال ہو جاتا ہے۔ ان کی کوئی ترکیب اس کے خلاف کارگر نہیں ہوتی لیکن ایک شادی کے موقع پر جب محلے کی کوئی عورت عقیلہ کے میاں کی داشتہ کے بیٹے کو جان بوجھ کر عقیلہ خالہ کے پاس بھیج دیتی ہے تو عقیلہ خالہ جیسی سنگدل عورت بھی اس جلاپے کی تاب نہیں لا سکتی اور جل کر راکھ ہو جاتی ہے۔

استاد کا کردار اس لحاظ سے بہت دلچسپ ہے کہ وہ خلافِ معاشرہ سرگرمیوں میں بھی "وفاداری بشرطِ استواری" کی شان رکھتا ہے۔ لیکن جوں جوں کہانی آگے بڑھتی ہے۔ استاد کا کردار ایک فرد کی بجائے ایک پورے معاشرتی طبقے کا کردار بن جاتا ہے اور اس مقام پر آ کر ہمیں استاد پر مثالی کردار ہونے کا شبہ ہونے لگتا ہے۔ انتظار حسین کا سب سے زیادہ ارتقا یافتہ اور حقیقی کردار "ان لکھی رزمیہ" کا بھولا ہے جو ایک پیشہ ور بدمعاش ہے۔ وہ شریفوں کی پگڑیاں اچھالنے، انسانوں کا خون کرنے اور دوسرے گھناؤنے جرائم کا ارتکاب کرنے میں بڑی دیدہ دلیری دکھاتا ہے۔ لیکن ہندو مسلم فسادات کے موقع پر اس کی منفی جرأت، بہادری اور صاف گوئی مثبت مقاصد کے حصول میں صرف ہوتی ہے اور اس طرح معاشرے کا یہ راندہ ہوا کردار بھی وقت پڑنے پر ایک عظیم انسان ثابت ہوتا ہے۔ اس کے کردار کی یہ ترقی ہمیں اچانک اور غیر فطری معلوم نہیں ہوتی کیونکہ اپنی بدمعاشی کے زمانے میں بھی بھولا نے بقولِ انتظار حسین "لڑتے وقت یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ وہ تو اندیشہ ہائے سود و زیاں سے بلند ہو کر لڑتا تھا (کیونکہ) لڑنا خود اس کے لئے ایک مقصد تھا"۔ لیکن پاکستان میں آکر بھولا کی دلبری اور استغنا جاتی رہتی ہے اور یہاں آکر بقولِ انتظار حسین "وہ پاؤں ٹکانے کے لئے جگہ اور پیٹ بھرنے کے لئے روٹی مانگتا ہے اور اس کے کردار کی ساری بلندی اور عظمت خاک میں مل جاتی ہے"۔

جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے "گلی کوچے" اور "کنکری" میں معاشرے کو فرد پر اور ماحول کو کردار پر ترجیح ہے۔ ان کہانیوں کے بعض کردار اپنے ماحول اور گرد و پیش کی معاشی، معاشرتی اور تہذیبی تبدیلیوں سے اسی طرح متاثر ہوتے ہیں جس طرح زندہ انسانوں کو ہونا چاہیے۔ تحریکِ پاکستان اور قیامِ پاکستان سے متعلق انتظار حسین کے افسانوں میں اس امر کی شہادت بخوبی مل سکتی ہے۔ ہندو اکثریت کے علاقوں میں صدیوں سے رہنے والے مسلمانوں کے اپنی زمین کو چھوڑتے ہوئے پہلے پہل ہچکچاہٹ محسوس کرنے اور بعد میں تحریکِ پاکستان پر ان کے صدقِ دل سے ایمان لانے کا صحیح اندازہ ہمیں اس وقت ہوتا ہے جب "شوقِ منزلِ مقصود" کا میرٹھ میں رہنے والا ایک ننھا منا کردار مشن اپنے باپ افو میاں کی باتیں سن کر کہتا ہے "بادا پاکستان میں چل کے قطب صاحب کی لاٹھ دیکھیں گے" افو میاں بولے "بیٹا قطب صاحب کی لاٹھ پاکستان میں نہیں ہے وہ تو دلی میں ہے" "اچھا بادا تاج بی بی کا روضہ دیکھیں گے" مشن نے ہاتھ کے ہاتھ دوسرا مورچہ تیار کر ڈالا لیکن افو میاں نے پھر ٹکا سا جواب دیا "ابے تاج بی بی کا روضہ آگرہ میں ہے"۔ پے در پے شکستوں نے مشن کی خود اعتمادی کا تو ڈھیر کر ہی دیا تھا اور اب اس نے پوچھا "تو بادا پاکستان میں کیا ہے"؟ اور افو میاں بیاسے بولے "بیٹا پاکستان میں قائدِ اعظم ہیں" ظاہر ہے کہ اس زمانے میں قائدِ اعظم برِصغیر کے مسلمانوں کی معاشی، معاشرتی اور تہذیبی اقدار کی سالمیت کی علامت تھے۔

دلیسی رشتوں کو تہذیبی اقدار پر قربان کر دینے کے بعد موجودہ بھارتی علاقوں کے مسلمان پاکستان میں ہجرت تو کر آئے لیکن ایک نوآزاد

ملک میں مفادات کے باہمی تصادم سے پیدا ہونے والے انحطاط کا شکار ہو کر رہ گئے۔ یہاں آ کر سب سے زیادہ مشکلات مہاجرین کے متحدہ گھرانوں اور افراد کو اٹھانا پڑیں "محل والے" جب بھارت میں تھے تو ایک ہی حویلی میں رہتے تھے ایک ہی وضع رکھتے اور ایک ہی قسم کی اقدار پر ایمان رکھتے تھے لیکن پاکستان پہنچ کر ان میں سے ہر کسی نے الاٹ منٹ اور امپورٹ ایکسپورٹ کو اپنا مطمح نظر بنا لیا۔ تہذیب کی جگہ تجارت نے لے لی اور اپنے لئے ایک مشترک مکان تعمیر کرنے کی تجویز پر بھی ان کا کسی طرح اتفاق نہ ہو سکا۔ ہوس زر نے ان کی انسانی اور تمدنی سالمیت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔

ہر چند کہ مہاجرین پاکستان میں آ کر نئے وطن کے ہنگامہ پرور حالات کا شکار ہو گئے لیکن آخر ہنگامے میں رونق کا پہلو بھی تو ہوتا ہے۔ اپنی مرضی سے بھارت میں رہ جانے والے مسلمانوں کو تو یہ رونق بھی نصیب نہ ہوئی۔ انہوں نے اپنے آبائی وطن سے جدائی گوارہ نہ کی۔ لیکن چند ہی برس میں یہ ناخوشگوار حقیقت کھل کر ان کے سامنے آ گئی کہ جس سرزمین کو وہ اپنا سمجھتے تھے وہ اب ان کی نہیں ہندوؤں کی سرزمین ہے۔ اور وہ قومی لسانی تمدنی، تہذیبی اور مذہبی اعتبار سے تنہا ہوتے جا رہے ہیں۔ "سانجھ بھئی چو دیس" بھارتی مسلمانوں کی اسی تنہائی کی دلگداز داستان ہے "گلی کوچے" اور "کنکری" کی بہترین کہانیاں وہی ہیں جن میں انتظار حسین کے ہجرت کے تجربے نے راہ پائی ہے۔ ہجرت کے اس تجربے کی بنیاد انتظار حسین کے سیاسی اور تہذیبی نظریات پر ہے۔ اس کے نزدیک وطن مٹی کے کسی تودے کا نام نہیں بلکہ ایک خاص تہذیب کے مسکن کا نام ہے اور زمین کی پہچان صرف قوموں کے دم قدم اور ان کی تہذیب کے وجود سے ہے۔ جب کسی قوم کی تہذیب مٹ جاتی ہے تو اس کی اپنی سرزمین ہی اس کا مدفن بن جاتی ہے اس کے گلی کوچے سنسان، حویلیاں ویران اور شہر کھنڈر ہو جاتے ہیں اور غلبہ پانے والی قوم اس کھنڈر پر اپنا نیا وطن تعمیر کرتی ہے لیکن اس سے یہ تاثر نہیں لینا چاہئے کہ انتظار حسین زمین سے محبت نہیں رکھتا۔ زمین سے محبت کا اظہار اس نے خود ان لفظوں میں کیا ہے: "جس مذہب سے میرا تعلق ہے اس کے متعلق میں نے بہت سن رکھا ہے کہ وہ مٹی سے بلند ایک طاقت ہے۔ مگر میں اسے کیا کروں کہ میں اپنے مذہبی احساس کا تجزیہ کرتا ہوں تو اس کی تہہ میں بھی مٹی جمی ہوئی ہے"۔

جہاں تک مذہب کا تعلق ہے وہ انتظار حسین کے ہاں دینی عقیدے سے زیادہ ایک تہذیبی اور جمالیاتی قدر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اسی درجہ سے وہ پیوریٹن نہیں بلکہ رسم پسند ہے اور اس کا جھکاؤ مذہب کے ایک ایسے مکتب فکر کی طرف ہے جس میں رسومات ایمان کا درجہ رکھتی ہیں۔ لیکن مشکل تو یہ ہے کہ اس کا یہ تشیع بھی برائے نام ہے اور محض رسومات کی حد تک ہے۔ وہ محرم کی مجالس حصولِ ثواب کیلئے نہیں بلکہ انیس و دبیر کے مرثیوں کا چٹخارا لینے کے لئے سنتا ہے۔ اس کے افسانوں کے شیعہ کردار مجلس میں جاتے تو ہیں لیکن ہزار کوشش کے باوجود مصائب کے بیان پر آنسو نہیں بہا سکتے۔ وہ امام باڑے میں جا کر ماتم کم اور زنان خانے کی چلمنوں کی نگرانی زیادہ کرتے ہیں۔ اسی لئے انتظار حسین سے نہ سنی ملا خوش ہے نہ شیعہ۔ اس کا یہ طرزِ عمل وقت کے ساتھ ساتھ پختہ ہو جاتا ہے اور آخر میں وہ ہمارے سامنے ایک صوفی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ انتظار حسین کے تیسرے مجموعے "آخری آدمی" کے افسانے اس کی اسی صوفیانہ حیثیت کے مظاہر ہیں۔ تصوف کی اصطلاح میں ہم انتظار حسین کے پہلے دو مجموعوں کو مشاہدے اور "آخری آدمی" کو مراقبے سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے "گلی کوچے" اور "کنکری" کے افسانے خارجی مشاہدے کے افسانے ہیں۔ اس لئے ان میں علامتی طریق کار کامیاب نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ علامت تو اس وقت بنتی ہے جب چیزیں اپنے ظاہر کو اپنے باطن میں سمیٹ لیتی ہیں۔ علامت گری انتشار کا نہیں انحصار کا عمل ہے اور ہمارے افسانہ نگار نے "آخری آدمی" میں یہ عمل بڑی کامیابی سے انجام دیا ہے۔ ان افسانوں کے واقعات فکر و خیال کے تابع اور کردار

مختلف افسانوی رجحانات کے نمائندہ ہیں۔

پہلے دو مجموعوں کی زبان کے برعکس جو معاشرتی رابطے کی زبان تھی "آخری آدمی" کی زبان فرد کی خود کلامی کی زبان ہے۔ اور زبان کے اعتبار سے "آخری آدمی" کے اکثر افسانے کسی صوفی کے ملفوظات یا کسی آسمانی کتاب کے اقتباسات معلوم ہوتے ہیں۔ انتظار حسین کو اس لحاظ سے اس کے ہم عصروں پر فوقیت دی جا سکتی ہے کہ اس کے ان افسانوں کی علامتیں اس کے اپنے تہذیبی شعور کی پیداوار ہیں اور دوسروں کی طرح وہ مغرب سے درآمد شدہ علامتیں استعمال نہیں کرتا۔ اسی لئے انتظار حسین کے علامتی کردار بھی ہمیں اپنی زندگی کے حقیقی اور اصل کردار معلوم ہوتے ہیں۔

"آخری آدمی" کا کردار الیاسف، "زرد کتا" کا "میں" "ہڈیوں کا ڈھانچ" کا مرکر زندہ ہونے والا آدمی "کایا کلپ" کا شہزادہ آزاد بخت، افسانہ "ٹانگیں" کا سید صاحب تمام کے تمام آج کے آدمی کی ذات کی مختلف اور متضاد جہتیں ہیں۔ آج کا انسان تشکیک، نفس پرستی، شکم پروری، منافقت اور اخلاقی بزدلی کی منفی قوتوں کے درمیان گھرا ہوا ہے اور اپنی ذات کو برقرار رکھنے کی تگ و دو میں مصروف ہے اور کون نہیں جانتا کہ استحکامِ ذات، عرفانِ ذات سے بھی زیادہ کٹھن مرحلہ ہے۔

میں آخر میں یہ وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ انتظار حسین کے جس تصوف کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں، اس تک انتظار حسین کی رسائی جذبے اور احساس کے ذریعے نہیں بلکہ تعقل (INTELLECT) کی وساطت سے ہوئی ہے اور اگر بغور دیکھا جائے تو "گلی کوچے" سے لے کر "آخری آدمی" تک انتظار حسین کے تمام افسانے تعقل (INTELLECT) کے افسانے ہیں اور اس کا مشاہدہ اور مراقبہ دونوں ذہنی نوعیت کے ہیں۔ یا یوں کہئے کہ انسان اور کائنات سے انتظار حسین کا رشتہ بھی سراسر ذہنی ہے جذباتی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں اس کے افسانوں میں ایسے عشق کا سراغ نہیں ملتا جو انسانوں کے باہمی جذباتی تعلق سے پیدا ہوتا ہے۔

انتظار حسین کے افسانوں میں ہمیں صرف کم سن بچے اور بچیاں ایک دوسرے سے کچا پکا عشق کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ انتظار حسین کے بالغ کردار کبھی عشق نہیں کرتے۔ وہ تو عشق کے بارے میں صرف سوچ سکتے ہیں اور وہ بھی کبھی کبھی۔ شاید انہیں بلوغت کی عمر کو پہنچ کر بھی بالغ ہونا نصیب نہیں ہوتا۔ اس لحاظ سے آپ انتظار حسین کو ایک ایسا غیر معمولی صوفی سمجھ لیجئے جو مجاز کی سیڑھی سے گزرے بغیر حقیقت کی منزل تک پہنچنا چاہتا ہے۔

صفی الدین صدیقی　　وارث میر　　شمیم احمد

اقبالؔ کا اصل کارنامہ

فنون کے شمارہ (۸) میں ایک مضمون بعنوان "اقبال کا اصل کارنامہ" شائع ہوا ہے جس کے مصنف کوئی ممتاز احمد صاحب ہیں۔ ارباب "فنون" کی نظر میں یہ مضمون نہ صرف مصنّف کے گہرے اور عمیق مطالعہ کا نتیجہ ہے بلکہ اس میں اقبال کے کارناموں کو نئے زاویے سے سمجھنے اور سمجھانے کی عالمانہ کوشش بھی کی گئی ہے۔ میں ادارے کی اس رائے کے بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ مقالہ نگار کے تبحرِ علمی کا اندازہ تو ہر اس قاری کو ہو سکتا ہے جس نے سنجیدہ نظری سے "فکرِ اقبال" کا مطالعہ کیا ہے اور جو مشرق کے اس نابغۂ عظیم کے پیغام کی اہمیت کو سمجھنے کا اہل ہے۔ جہاں تک اقبال کے کارناموں کا سوال ہے اس سے انکار کی گنجائش تو نہیں ہو سکتی البتہ ممتاز احمد صاحب کے عالمانہ مضمون کے مطالعہ کے بعد چند باتیں ہمارے سامنے آتی ہیں جن کو بلا مبالغہ موصوف کے اہم کارناموں سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

فاضل مقالہ نگار نے اپنے مبحث کا آغاز ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی سے کیا ہے جس کے نتیجے کے طور پر برِصغیر میں مسلمانوں کے بچے کھچے سیاسی اقتدار کا بھی خاتمہ ہو گیا اور انگریز سیاہ و سپید کے مختار بن گئے۔ ممتاز احمد صاحب کے نزدیک اصل المیہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کے اختتام اور انگریز کے سیاسی اقتدار کے آغاز کی درمیانی مدت میں مسلمانوں کے اندر کوئی رجلِ رشید پیدا نہیں ہوا۔ کافی غور و خوض کے باوجود میں اس درمیانی مدت کا تعین کرنے میں ناکام رہا کیونکہ مقالہ نگار کی رُو سے ۱۸۵۷ء ہی مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کے اختتام اور انگریز کے سیاسی اقتدار کے آغاز کا زمانی نقطہ ہے۔ یہ بات مصنّف رو میں لکھ گئے ہیں جس کو میں اہمیت دینا نہیں چاہتا۔ ان کا مقصد غالباً مسلمانوں کے سیاسی، مذہبی اور اخلاقی زوال کے اسباب کا پتہ چلانا ہے۔ واقعہ بھی یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء برِصغیر میں مسلمانوں کی سیاسی کشمکش کے ڈرامے کا منظرِ آخریں تھا جو المیہ پر ختم ہوا۔ ویسے تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو امتِ مسلمہ کے اندر ایسے تمام عوامل ایک عرصے سے کارفرما تھے جو اس کو زوال کی منزل کی طرف لے جا رہے تھے۔ چنانچہ اس کی بصیرت خود علامہ اقبال کو بھی تھی جس کا اظہار ان کی بعض تحریروں میں ہوا ہے۔ فی الحال ہمارا مقصد ان عوامل کی چھان بین نہیں ہے اور نہ ہی اس پر ہمارے فاضل مقالہ نگار زور دینا چاہتے ہیں۔ ہم کو تو یہ دیکھنا ہے کہ برِصغیر پر انگریز کے مکمل تسلط کے بعد امتِ مسلمہ کن حالات سے دوچار ہوئی۔ اس سیاسی قلبِ ماہیت کے نتیجہ کے طور پر برِصغیر کا جو طبقہ شدید طور پر متاثر ہوا وہ مسلمانوں کا تھا کیونکہ آٹھ سو سال سے وہ حکمران طبقہ چلا آ رہا تھا۔ اس کا سب سے بڑا حریف انگریز ہی تھا کیونکہ اسی کی وجہ سے مسلمانوں کی سیاسی برتری کا خاتمہ ہوا تھا۔ حکمران ہونے کے لحاظ سے انگریزوں کو اگر کسی سے خطرہ لاحق ہو سکتا تھا تو وہ مسلمان ہی تھے لہٰذا وہ ایسی تمام کوششوں کو کچل دینے کے لئے مستعد تھے جو مسلمانوں کی طرف سے اپنا کھویا ہوا اقتدار واپس لانے کے لئے کی جا سکتی تھیں۔ مغرب سے آنے والی ایک عیسائی قوم کے لئے مسلمانوں کا سامنا تاریخ کا کوئی نیا حادثہ نہ تھا۔ مسلمانوں کے اسلاف کے کارناموں سے انگریز خوب واقف تھے۔ ایشیا اور یورپ کے میدانوں میں لڑی جانے والی صلیبی جنگوں کی داستانوں کو انہوں نے بھلایا نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کا خمیازہ مسلمانوں کو بھگتنا پڑا اور وہ انگریز کے انتہائی ظلم و ستم کا نشانہ

بنتے چلے گئے۔ رہا برصغیر کے غیر مسلم افراد کے ردِ عمل کا سوال سو وہ اقتدار کی اس تبدیلی سے ناخوش نہیں تھے کیونکہ وہ خود بھی صدیوں سے محکوم چلے آ رہے تھے۔ اور ان کے درمیان ایک عرصے سے مذہبی و سیاسی احیاء کی تحریکیں چلی آ رہی تھیں۔ لہٰذا آغاز میں ان کی طرف سے انگریز کی کچھ زیادہ مخالفت نہیں ہوئی۔ برصغیر میں انگریز کی نافذ کی ہوئی تہذیبی و تعلیمی اصلاحوں سے بہرہ ور ہونے کے لئے وہ مستعد نظر آنے لگے۔ البتہ مسلمانوں کے نزدیک یہ تمام اصلاحیں ناقابلِ قبول تھیں کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ ان کے نفاذ کا مقصد مذہب اور کلچر کی بیخ کنی کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ ان حالات کا مقابلہ طاقت کے ذریعہ نہیں ہو سکتا تھا اور ویسے بھی مسلمانوں کی حد تک طاقت کے استعمال کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اب ان کے سامنے ایک ہی راستہ کھلا ہوا تھا وہ یہ کہ اپنے اطراف رونما ہونے والی تمام تبدیلیوں سے منہ موڑ کر کنارہ کشی کی زندگی پر قانع ہو جائیں۔ چنانچہ شروع شروع میں مسلمانوں کی طرف سے اس طرح کے ردِ عمل کا اظہار بھی ہوا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ زندگی کی دوڑ میں وہ غیر مسلم افراد سے بہت پیچھے رہ گئے۔ سوال صرف معدودے چند جاگیرداروں، زمینداروں یا والیانِ ریاست کا نہیں تھا بلکہ ان لاکھوں مسلم عوام کی زندگی کا تھا جو اپنی بے حسی اور جہالت کی وجہ سے امورِ ملکی کے لئے ناکارہ تصور کئے جا رہے تھے۔ تجارت پر مسلمانوں کا قبضہ نہیں تھا۔ معاشی ادبار بہت پہلے ہی سے ان پر سایہ کئے ہوئے تھا۔ چنانچہ یہ وہ حالات ہیں جن کے چوکھٹے میں ہمیں سرسیّد احمد خاں کی شخصیت اور اُن کی تحریک کا منصفانہ جائزہ لینا ہوگا۔

ممتاز احمد صاحب کا یہ خیال کہ سرسیّد احمد اور اُن کے رفقاء نے نہ صرف مسلمانوں کو انگریز کی سیاسی غلامی سے سمجھوتہ کرنے کا مشورہ دیا بلکہ تہذیبی دائرے میں بھی ہتھیار ڈال دینے کی تلقین کی ——— میرے نزدیک انتہائی گمراہ کن ہے۔ میں سمجھتا ہوں یا تو موصوف نے محولہ بالا حقائق سے عمداً چشم پوشی کی ہے یا پھر وہ اسی عصبیت کی رَو میں بہہ نکلے ہیں جو سرسیّد کے عہد کے اکثر بزرگ خود غلط ملاؤں کا وطیرہ رہا ہے جو اپنی حد سے متجاوز ہو کر انیسویں صدی کی ایک عظیم شخصیت کی تکفیر سے بھی باز نہیں رہے۔ چونکہ آج کے دَور میں فتاوائے کفر کی اہمیّت نہیں رہی اس لئے ممتاز احمد صاحب نے فقرہ بازی کو CHARACTER ASSASSINATION کا ذریعہ بنایا ہے۔ لارڈ میکالے کے نظامِ تعلیم پر تنقید کرنے کے بعد سرسیّد کے تعلق سے وہ کہتے ہیں ——— "سرسیّد نے کہا کہ ایک غیر قوم ہمارے نوجوانوں کا جھٹکا کیوں کرے ہم خود انہیں ذبح کئے دیتے ہیں" ——— پڑھنے میں یہ جملہ دلکش ضرور ہے لیکن حقیقت سے اتنا ہی دُور ہے۔ اس کے عقب سے مجھے وہی ذہن جھانکتا ہوا دکھائی دیتا ہے جو کسی زمانے میں سرسیّد کی تکفیر کے لئے آمادہ تھا۔

مگر وہ مردِ باہمت ہزار مخالفتوں، ہر قسم کے سبّ و شتم کی پروا نہ کرتا ہوا اپنے مشن کی تکمیل میں منہمک رہا۔ جہاں تک سرسیّد کے کیریکٹر کا سوال ہے، میں سمجھتا ہوں کہ ان کا بڑے سے بڑا حریف بھی اس کے بے داغ ہونے کی گواہی دیتا تھا اور ان کے خلوص پر قوم نے کبھی شک نہیں کیا۔ میں ممتاز احمد صاحب سے یہ گذارش کروں گا کہ سرسیّد کی شخصیت کے معروضی جائزے کے لئے وہ مولانا حالی کی "حیاتِ جاوید" کا مطالعہ نہ فرمائیں بلکہ اپنے ہی ہمعصر عالم شیخ اکرام کی تصنیف "موجِ کوثر" کی ورق گردانی کی زحمت گوارا کریں (کیونکہ "حیاتِ جاوید" مولانا شبلی کی رُو سے کذب و افترا کے دفتر کے علاوہ کچھ نہیں) یہ وہی سرسیّد تھا جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد مسلمانوں کی تباہی و زبوں حالی سے اس قدر متاثر ہوا تھا کہ اس غلام ملک سے وہ معہ متعلقین کے ہجرت کر جانا چاہتا تھا۔ ممکن ہے یہاں پر ممتاز احمد صاحب اور ان جیسی ذہنیت رکھنے والے بعض لوگ اپنی اس خواہش کا اظہار کریں کہ کاش سرسیّد اپنی ہجرت کے ارادے کو عملی جامہ پہناتے اور اس طرح امّتِ مسلمہ اس بڑے خطرے سے دوچار نہ ہوتی جو سرسیّد کے قیام کی وجہ سے اس پر مسلط کر دیا گیا! دوسرے لفظوں میں سرسیّد کے مخالف شاید یہ کہنا چاہیں گے کہ برصغیر میں ایسی تحریکیں موجود تھیں جو مسلمانوں کو انگریز کی سیاسی غلامی سے نجات دلا سکتی تھیں اور تہذیبی معاملات میں انگریز کی مقلد ہونے سے انہیں بچا سکتی تھیں۔ معلوم ہونا چاہیے کہ سرسیّد اسی ولی اللّٰہی تعلیمات کے آفریدہ تھے

جس کے ایک بزرگ نے بہت پہلے انگریزی تعلیم کے حصول کا فتویٰ دیا تھا۔ "جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے دہلی کالج قائم کیا اور وہاں لوگ تعلیم حاصل کرنے کے متعلق متامّل تھے تو شاہ عبدالعزیز نے ان سب کے شبہات کو رفع کیا اور علی گڑھ کالج قائم ہونے سے پچاس سال پہلے انگریزی درسگاہوں میں تعلیم حاصل کرنے کا فتویٰ دیا۔" (شیخ اکرام۔ رودِ کوثر ص ۵۶۹)۔

یہاں میں نے سرسید کی مذہبی اور علمی خدمات کا جائزہ نہیں لیا ہے کیونکہ اس کے لئے کئی صفحات درکار ہوں گے۔ مگر میں یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ علمی نقطۂ نظر سے سرسید کے بعض خیالات تنقید کی زد سے باہر نہیں ہیں لیکن نظریاتی اختلاف کے باوجود سرسید کی علمی حیثیت میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ اس طرح کی روایات تو اسلامی فکر کے کلاسیکل دور ہی سے چلی آ رہی ہیں۔ فارابی اور ابنِ سینا کی علمی حیثیت محض اس لئے کم نہیں ہو جاتی کہ غزالی نے ان کو تنقید کا ہدف بنایا ہے یا غزالی کم تر حیثیت کے اس لئے نہیں ہو جاتے کہ ابنِ رشد اور امام ابنِ تیمیہ نے ان کی تعلیمات کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا ہے مؤخر الذکر نے تو غزالی کے تعلق سے نوبت کفر و الحاد تک پہنچا دی تھی۔

ممکن ہے ممتاز احمد صاحب انگریزی تعلیم کے اتنے زیادہ مخالف نہ ہوں لیکن انہیں سب سے زیادہ شکایت علی گڑھ تعلیمی تحریک سے ہے۔ موصوف کا کہنا ہے کہ علی گڑھ تعلیمی تحریک نے جو نسل تیار کی وہ تخلیقی صلاحیتوں سے محروم اور زندگی کے ہر دائرے میں مغربی تہذیب کی مقلد تھی۔ میں اس دلیل کو "بری منطق" (BAD LOGIC) سے تعبیر کروں گا۔ کیونکہ مقالہ نگار نے کچھ برے نمونوں کو سامنے رکھ کر علی گڑھ تعلیمی تحریک کے خلاف فیصلہ صادر کیا ہے ورنہ سرسید نے جس تعلیم یافتہ انسان کا آئیڈیل اپنے سامنے رکھا تھا وہ تو ایسا تھا کہ جس کے سر پہ دین کا تاج ہوتا اور دل میں کائنات کی تسخیر کا جذبہ۔ حسنِ اخلاق کا سرسید نے ہمیشہ پرچار کیا اور اس مقصد کے لئے ایک الگ رسالہ "تہذیب الاخلاق" بھی جاری کیا۔ افسوس ہے کہ انہیں اس مقصد میں کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہوئی اور کالج کے نوجوان یورپی مادیت کی رَو میں اس قدر بہہ گئے کہ انہوں نے سرسید کے پیغام کے پہلے حصہ کو یکسر فراموش کر دیا۔ میں سمجھتا ہوں اگر سرسید بیسویں صدی کی پہلی یا دوسری دہائی تک زندہ رہتے تو علی گڑھ کی نئی نسل سے خوش نظر نہ آتے۔ خرابی دراصل نئے یا پرانے نظام کے اندر نہیں بلکہ افراد کے نفوس میں پائی جاتی ہے ورنہ دیکھا جائے تو پرانے نظام نے بھی ایسے افراد کو پیدا کیا ہے جنہیں ننگِ دین یا ننگِ قوم کہا جا سکتا ہے۔ واضح رہے کہ ہم کالج کی نئی پود کے بارے میں کوئی حسنِ ظن نہیں رکھتے۔ بہت سی باتوں میں وہ ہمارے ان علماء کی ہمسری نہیں کر سکتے جنہوں نے چٹائیوں پہ بیٹھ کر تحصیلِ علم کی اور کارہائے نمایاں کر گئے۔ مگر اس وقت کے تعلیمی نظام کے تقاضے کچھ اور تھے۔ اس کے برخلاف عہدِ جدید کے تقاضوں کے پیشِ نظر ایک نئے تعلیمی نظام کی ضرورت تھی جس کو سرسید اور ان کے رفقاء نے محسوس کیا۔ صنعتی انقلاب کے بعد یورپ میں سائنسی علوم بڑی تیز رفتاری سے ترقی کر رہے تھے اور ان کے کامیاب نتائج کی بنا پر نئی ایجادات کے لئے راستہ ہموار ہو گیا تھا جن کی وجہ سے یورپی اقوام کو ایشیائی اقوام پر برتری حاصل ہو رہی تھی۔ اس کے برعکس قدیم تعلیمی نظام میں سارا زور معقولات و منقولات کے حصول پہ دیا جاتا تھا۔ طبعی علوم جن کی بنیاد مشاہدہ اور اختبار پر رکھی جاتی ہے سرے سے ناپید تھے۔ معلوم ہونا چاہیے کہ عرب اور عجم کے حکمائے اسلام کا یہ نقطۂ نظر نہیں تھا۔ چنانچہ ان کی علمی و سائنسی خدمات کے جائزے کے لئے ایک علیحدہ کتاب کی ضرورت ہے۔

لہٰذا ہونا یہ چاہیے کہ مسلمان ایک ایسے نمونۂ سیرت کی تعمیر پر زور دیں جو سرسید کے محولہ بالا آئیڈیل کی نمائندگی کر سکے۔ اس قسم کے نمونۂ سیرت کا تحقق بڑی حد تک ہم اقبال کی ذات میں کر سکتے ہیں۔ اقبال خود مغربی تعلیمی اداروں کے تربیت یافتہ تھے (جس کا اعتراف ممتاز احمد صاحب نے بھی کیا ہے) اور انہوں نے کبھی مغربی علوم کی اہمیت کا انکار نہیں کیا بلکہ چاہتے یہ تھے کہ مسلمان زیادہ سے زیادہ ان علوم کی تحصیل کی طرف توجہ دیں اور ممکن ہو تو اس مقصد کے لئے یورپی جامعات میں بھی تعلیم حاصل کریں۔ یہ بتلانے کی ضرورت نہیں کہ حکمائے مغرب کا اقبال کی فکر پر کیا

اثر پڑا ہے۔ حکمت کے تعلق سے انہوں نے ہمیشہ اپنے ذہن کو کشادہ رکھا اور بعض علمائے مغرب کی خدمات کا کھلے دل سے اعتراف بھی کرتے ہیں ؎

خرد افزود مرا درسِ حکیمانِ فرنگ

سینہ افروخت مرا صحبتِ صاحب نظراں

ساتھ ہی ساتھ وہ ایسے تمام افکار پر کڑی تنقید بھی کرتے ہیں جو اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ نہیں۔ اقبال کا تو یہ کہنا ہے کہ حیات و کائنات کے اسرار کے سلسلے میں آج جو بصیرت علمائے مغرب کو حاصل ہے، اس کا سراغ قرونِ ماضیہ کے مسلمان حکما کے افکار میں مل سکتا ہے۔ آگے چل کر وہ کہتے ہیں کہ اسلام ہی کے بنائے ہوئے راستے پر چل کر مغربی اقوام نے مادی ذرائع کی تسخیر کی ہے اور مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنی کھوئی ہوئی دولت کی بازیافت کریں ؎

حکمتِ اشیا فرنگی زاد نیست

اصلِ اُو جز لذتِ ایجاد نیست

نیک اگر بینی مسلماں زادہ است

ایں گہر از دستِ ما افتادہ است

چوں عرب اندر اروپا پر کُشاد

علم و حکمت را بنا دیگر نہاد

دانہ آں صحرا نشیناں کاشتند

حاصلش افرنگیاں برداشتند

ایں پری از شیشۂ اسلافِ ماست

باز صیدش کن کہ اُو از قافِ ماست

پیرویٔ مغرب دو باتوں کی حد تک ہو سکتی ہے ایک تو یہ کہ حکمت اور سائنس کے ذریعہ ہم کائنات کے پوشیدہ خزانوں پر غلبہ حاصل کریں (جس کی ہدایت خود قرآن کریم میں بھی ملتی ہے) دوسرے یہ کہ مادیت ہی کو ترقی کی اساس سمجھ کر روحانی اقدار کی نفی کریں اور عادات و اطوار کی حد تک بھی یورپ کے مقلد بن جائیں۔ ظاہر ہے کہ اقبال کے نزدیک صرف پہلی بات قابلِ قبول ہے۔ اس طرح وہ "خذ ما صفا و دع ما کدر" کے زریں اصول پر کاربند رہنے کی تلقین فرماتے ہیں۔ مسلمانوں کے لئے اقبال نے جو لائحہ عمل تجویز کیا اس کا اظہار اس بلیغ شعر میں ملتا ہے ؎

جوہر میں ہو لا الٰہ تو کیا خوف

تعلیم ہو گو فرنگیانہ

میں سمجھتا ہوں سر سید احمد خاں کی تعلیمی تحریک کا بھی یہی مقصد تھا جس کا احیاء اقبال کی تعلیمات میں ہوا ہے۔

ممتاز احمد صاحب نے آگے چل کر روایتِ جہاد کی بحث بھی اٹھائی ہے۔ مگر وہ لفظ جہاد کو محض اصطلاح کے طور پر استعمال کرنے پر قانع ہو گئے اور یہ بتلانے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ آخر روایتِ جہاد کا مفہوم کیا ہے؟ ایک تو ہوتا ہے جہاد بالسیف اور دوسرا جہاد بالقلم۔ اس کے علاوہ جہاد کی ایک اور قسم جہاد فی النفس کہلاتی ہے جس کو صوفیائے کرام نے جہادِ اکبر بھی کہا ہے (ممکن ہے ممتاز احمد صاحب "تصوف" کے کچھ زیادہ

قائل نہ ہوں) اب رہا جہاد بالسیف کا سوال، سو برصغیر پر انگریزوں کے مکمل تسلط سے قبل اس کا انجام ہم دیکھ چکے ہیں۔ برصغیر کے مسلمانوں پر مغربی سیاسی افکار اور لادینی جمہوریت کا غلبہ رہا ہو یا نہ رہا ہو لیکن یہ بالکل طے ہے کہ آج کے حالات میں اس قسم کے جہاد کی کوئی گنجائش نہیں رہی ہے جس کا تصور ممتاز احمد صاحب نے اپنے ذہن میں قائم کر رکھا ہے۔ مدافعانہ جہاد تو ایک حد تک ممکن ہے لیکن اشاعت و توسیع اسلام کی غرض سے جہاد بالسیف کے امکانات اب باقی نہیں رہے۔ لہٰذا زیادہ زور جہاد بالقلم پر دینے کی ضرورت ہے۔ یہی کام امام غزالی، امام ابن تیمیہ، امام شاہ ولی اللہ نے قرونِ ماضیہ میں اور ہمارے اپنے زمانے میں مولانا آزاد اور علامہ اقبال نے سرانجام دیا ہے۔ جب جب اسلام کو اندرونی یا بیرونی طور پر بے دینی اور الحاد کا خطرہ لاحق ہوا تو ان برگزیدہ اصحاب کے ہاتھ میں قلم نے سیف کی شکل اختیار کر لی اور اس طرح گمراہی و الحاد کی دھجیاں فضا میں بکھیر دی گئیں۔ غالباً یہ وہی منصب ہے جس کو امام الہند شاہ ولی اللہ خلافتِ باطنی کا نام دیتے ہیں۔ لہٰذا آج کے زمانے میں جہاد کا مفہوم یہ ہونا چاہیے کہ دنیائے اسلام کو بے دینی اور الحاد کے اثرات سے بچایا جائے اور ایک ایسے صالح معاشرے کی تاسیس کی طرف قدم بڑھایا جائے جو اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ ہو۔

فاضل مقالہ نگار نے اس سوال کا جواب دینے کی بھی کوشش کی ہے کہ اقبال نے اپنی فکر کے اظہار کے لئے شعر ہی کو ذریعہ بنانا کیوں پسند کیا۔ ان کی رائے میں مسلمانوں کو اس وقت ایمان کی ضرورت نہیں تھی بلکہ سرچشمۂ ایمان سے زندگی کو متحرک کرنے والے پیغام کی ضرورت تھی۔ چنانچہ یہ پیغام جذباتی اپیل کے ذریعہ پہنچایا جا سکتا تھا اور جذباتی اپیل صرف شعر ہی میں ممکن ہے۔ اگر جذباتی اپیل ہی کو ابھارنے والے پیغام کی شرط مان لی جائے تو پھر میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح کی اپیل نثر یا خطابت کے ذریعہ بھی ممکن ہے۔ امام غزالی، امام ابن تیمیہ، امام شاہ ولی اللہ اور مولانا ابوالکلام آزاد نے گو شاعری کو اظہار کا ذریعہ نہیں بنایا اس کے باوجود ان کی تحریروں میں جذباتی اپیل موجود تھی۔ حسرت موہانی نے مولانا آزاد کی نثر کو دیکھ کر ایک مرتبہ کہا تھا ؎

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
نظمِ حسرت میں کچھ مزا نہ رہا

اقبال کے سامنے یہ سوال ہرگز نہیں تھا کہ انہیں اپنے پیغام کی اشاعت کے لئے شاعری کو ذریعہ بنانا چاہیے یا نثر کو۔ وہ بنیادی طور پر شاعر تھے۔ اقبال اس وقت بھی شاعر تھے جب انہوں نے اردو شاعری میں داغؔ کا تتبع کیا۔ لیکن وہ بہت جلد داغؔ کے اثر سے آزاد ہو گئے کیونکہ انہوں نے شاعری جزویست از پیغمبری کے نکتہ کو پا لیا تھا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ شعر کو اظہار کا ذریعہ بنانے میں کسی سوچے سمجھے منصوبے پر اقبال عمل پیرا نہیں ہوئے بلکہ شعر ان کے جذبۂ اظہار سے زیادہ ہم آہنگ تھا اور اس سے انہوں نے پیغمبری کا کام لیا۔

اقبال کا کوئی کارنامہ رہا ہو یا نہ ہو، لیکن ممتاز احمد صاحب کا ایک کارنامہ ضرور لائق توجہ ہے جو موصوف نے اپنے مضمون کے آخر میں سرانجام دیا ہے۔ حیرت ہے کہ اس کی طرف اقبالیات کے کسی ماہر نے آج تک توجہ نہیں دی۔ میں سمجھتا ہوں محض چند نتائج تک پہنچنے کے لئے ممتاز احمد صاحب نے یہ عالمانہ مضمون لکھنے کی زحمت اٹھائی ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ فقہ اور اسلامی الٰہیات کی تشکیل کے لئے اقبال، سید سلیمان ندوی، مولانا انور شاہ کاشمیری اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی خدمات حاصل (کرنے کی کوشش) کرتے ہیں۔ بعض الفاظ کو میں نے عمداً قوسین میں رکھا ہے اس لئے کہ ممتاز احمد صاحب کھل کر سامنے آنا نہیں چاہتے۔

جہاں تک سید سلیمان ندوی کا تعلق ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال ان کی تنقیدوں سے استفادہ کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں سید صاحب کے نام لکھے گئے ان کے بعض خطوط میں بھی حد درجہ ارادتمندی جھلکتی ہے۔ (شیخ اکرام ایک جگہ لکھتے ہیں کہ سید صاحب نے مسئلہ جہاد پر لکھے گئے اقبال

کہ ایک مضمون کو جوان کی رائے معلوم کرنے کی غرض سے بھیجا گیا تھا شائع نہ کرنے کی تلقین فرمائی تھی کیونکہ اس میں نئے زاویے سے روشنی ڈالی گئی تھی۔ دوسرے لفظوں میں وہ مضمون SUPRESS کر دیا گیا) بہرحال اس طرح کے ربط و ضبط سے یہ نتیجہ نکالنا کہ اقبال فقہ اور اسلامی الٰہیات کی تشکیل کے سلسلے میں سید سلیمان ندوی اور مولانا انور شاہ کے منت کش رہے کم از کم میرے نزدیک اقبال کے کارنامے کو گھٹا کر پیش کرنے کی ایک شعوری کوشش ہے۔ فقہ اور الٰہیات کی تشکیل کے لئے اقبال نے جو نقطۂ نظر اختیار کیا وہ ان بزرگوں سے بالکل مختلف ہے۔ سید صاحب اور مولانا انور شاہ؟ ایک الگ مکتبِ خیال کے نمائندہ تھے۔ سید سلیمان ندوی علی گڑھ کی تعلیمی تحریک کے سخت مخالف تھے اور تو اور انگریزی علوم و فنون کے اکتساب و انجذاب کے معاملہ میں وہ اپنے استاد مولانا شبلی کے بھی صحیح جانشین نہیں تھے۔ البتہ مولانا انور شاہ نے ان علوم کی اہمیت و ضرورت سے انکار نہیں کیا تھا۔

مولانا مودودی کے تذکرے کو میں نے جان بوجھ کر آخر کے لئے اٹھا رکھا ہے کیونکہ فاضل مقالہ نگار کی تان آخر میں اسی نام پر جا کر ٹوٹتی ہے۔ اس سے پہلے میں مسئلہ خلافت کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہوں گا جس پر موصوف بہت زیادہ زور دیتے ہیں۔ رہا اقبال کے چھٹے خلیفۂ راشد کہلانے کا امکان سو چونکہ یہ اقبال کے ایک عقیدتمند کی پرخلوص خواہش کا اظہار ہے اس لئے اس عقیدتمندی کو جھٹلا کر میں انہیں مایوس نہیں کرنا چاہتا۔ ورنہ جہاں تک اقبال کے کردار کا تعلق ہے انہوں نے کبھی کسی قسم کی دینی یا دنیوی پیشوائی کی خواہش کا اظہار نہیں کیا تھا۔ عملی سیاسیات میں بھی انہوں نے بڑھ چڑھ کر حصّہ نہیں لیا اور سیاسی امور کی حد تک مسلمانوں کو ہمیشہ قائد اعظم کے تتبع کا مشورہ دیا۔

ممتاز احمد صاحب کہتے ہیں کہ اس وقت اسلام کا سب سے بڑا مسئلہ ہی خلافت کی بازیافت ہے۔ آج مسلم ممالک میں بادشاہت، آمریت، جمہوریت سب کچھ ہے لیکن خلافت نہیں۔ ویسے ہماری رائے میں فی زمانہ ادارہ خلافت کے موثر طریقے پر کارگزار رہنے کے کوئی امکانات نہیں۔ اگر بالفرض اس کی بازیافت ممکن بھی ہو تو کیا عالمِ اسلام میں خلافت کو وہ مرکزی حیثیت حاصل رہے گی جو کہ اس کے قیام کا اصل منشاء ہے؟ اگر خلافت کی مرکزیت پر زور نہ دیا جائے تو عالمِ اسلام میں کئی خلافتوں کے وجود کو تسلیم کرنا ہوگا جو خلافت کے تصور کے عین منافی ہے (علامہ ابن خلدون نے اپنے مقدمۂ تاریخ میں خلافت کے مسئلہ پر قرآن اور احادیث کی روشنی میں سیر حاصل بحث کی ہے جس کی تفصیل میں جانے کی یہاں گنجائش نہیں)۔

اسلامی تاریخ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ اسلام کے دورِ اول میں خلیفۃ المسلمین کا اہلِ قریش میں سے ہونا ضروری تھا۔ بعد کے ادوار میں یہ صورتِ حال باقی نہیں رہی۔ اور تو اور خود عباسی خلافت کے دور میں اسپین کے امویوں نے بغداد کی مرکزیت کو تسلیم نہیں کیا۔ مصر میں فاطمیوں نے اپنی خلافت کا پرچم لہرایا اور برسہا برس تک عالمِ اسلام کے اس خطے کے حکمران رہے۔ (دلچسپ بات تو یہ ہے کہ جب علامہ جلال الدین سیوطی نے تاریخ الخلفاء تصنیف کی تو فاطمیوں کو مشکوک کہہ کر اپنی کتاب سے ان کے تذکرے کو بالکل خارج کر دیا۔) برصغیر ہند میں بھی مسلمان حکمرانوں نے خلافت کی مرکزیت کو خاص اہمیت نہیں دی۔ بہرحال غیر موثر طریقہ پر سہی، خلافت بیسویں صدی کی پہلی دہائی تک ترکی میں قائم رہی۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد، رہی سہی نام نہاد خلافت کا بھی تار و پود بکھر گیا۔ اقبال اس سے خوش نظر نہیں آتے اور کہتے ہیں ؎

چاک کر دی ترکِ ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی مسلم کی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ

لیکن مولانا شبلی اس واقعہ سے الگ طریقہ پر متاثر ہو کر لکھتے ہیں — "ترکی کی جدید زندگی نے اس کے ہوا خواہوں کو مخمور کر دیا ہے۔ ایران اور ترکی کی پارلیمنٹ یورپ کا اثر نہیں گو توارد ہے۔ آخر وہی شوریٰ کا معاویہ کی غلطی کا کفارہ عبدالحمید نے ادا کر دیا۔"

پہلی جنگِ عظیم میں ترکی خلافت کے خاتمہ اور روسی انقلاب کے بعد اقبال کی شاعری میں اسلامی رومانیت کے بجائے حقیقت پسندی زیادہ واضح ہوجاتی ہے۔
ممکن ہے خلافت کی بازیافت سے ممتاز احمد صاحب یہ مفہوم لیتے ہوں کہ کوئی ایسا ادارہ ہونا چاہیے جو اسلامی آئین کا نفاذ کرسکے۔ میرے خیال میں یہ کام ہر اسلامی ملک میں وہاں کی اسمبلی یا پارلیمنٹ ہی انجام دے سکتی ہے۔ ایسے اسٹیٹ کے سربراہ کو آپ جو چاہے نام دے دیں لیکن وہ خلیفۃ المسلمین ہرگز نہیں کہلائے گا۔ یہ قومی حکومتوں کا جمہوری دور ہے۔ اس دور میں ایک مسلمان قوم کسی دوسری مسلمان قوم کی حکومت قبول کرنے کو تیار نہیں اور نہ ہی کسی اسلامی ملک کے جمہور ایسے مطلق العنان آمر کی استبدادی حکومت گوارہ کرسکتے ہیں۔

میرے خیال میں ممتاز احمد صاحب پہلے عالم ہیں جنہوں نے مولانا مودودی اور اقبال کی تعلیمات میں اشتراک اور مطابقت ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اقبال فقہ اور اسلامی الہیات کی تشکیل کے سلسلے میں مولانا مودودی کی خدمات حاصل کرتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ ایک لایعنی کوشش ہے۔ یہ ایک دلچسپ اتفاق ہے کہ میں جس جگہ بیٹھ کر یہ سطور لکھ رہا ہوں اس کے عقب میں وہ مکتب اور اس سے ملحقہ اس مسجد کے آثار آج تک باقی ہیں جہاں لڑکپن میں مولانا مودودی قرآن کا درس لینے آیا کرتے تھے۔ اورنگ آباد (دکن) ہی کو مولانا صاحب کا مولد کہلانے کا شرف حاصل ہے۔ وہ لگ بھگ نو سال تک اس شہرِ خجستہ بنیاد میں مقیم رہے۔ مزید تعلیم کے لئے اپنے آبائی وطن دہلی تشریف لے گئے جہاں انہوں نے خالص مشرقی اصولوں پر تعلیم حاصل کی۔ نوعمری میں الجمعیت جیسے اہم اخبار کے ایڈیٹر بن گئے۔ جب اغیار کی طرف سے اسلام اور اس کی تعلیمات پر اعتراضات کئے جانے لگے تھے تو ان کے جواب میں مولانا مودودی نے الجہاد فی الاسلام لکھی جو خطابت اور منطقیت سے مملو نظر آتی ہے۔ اس طرح اسلامی ہند کی دنیا سے وہ پہلی بار متعارف ہوئے۔ اس وقت تک اسلامی الہیات کی تشکیلِ نو پر اقبال کے لکچر مرتب ہوچکے تھے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ اقبال نے اس سلسلے میں مولانا مودودی کی خدمات حاصل کیں صحیح نہیں ہے۔ مولانا مودودی کا رسالہ "ترجمان القرآن" ۱۹۳۳ء میں حیدرآباد دکن سے جاری ہوا اور وہ ۱۹۳۷ء کے آواخر تک حیدرآباد ہی میں مقیم رہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب حیدرآباد کا پڑھا لکھا طبقہ تعلیماتِ اقبال سے حد درجہ متاثر تھا۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے اندر اور اس کے باہر اقبالیات کے ماہرین کا ایک بڑا حلقہ موجود تھا۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر میر ولی الدین، ڈاکٹر یوسف حسن خاں، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی اور نواب بہادر یار جنگ کا شمار تعلیماتِ اقبال کے بہترین مفسروں میں ہوتا تھا۔ جہاں تک مطالعہ اقبال کا سوال ہے ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا مودودی "ترجمان القرآن" کے ابتدائی زمانے میں تو بیشک اقبال کے اشعار استعمال کرتے ہیں لیکن بعد میں یہ رجحان کم ہوتا گیا۔ بقول پروفیسر محمد سرور منطقیت پر شاعری کچھ بھاری ہوتی ہے۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ مولانا مودودی تحریکِ پاکستان کے سخت مخالف تھے مگر بعد میں وہ پاکستان ہجرت کر گئے۔ رہا اس امر کی طرف اشارہ کہ اقبال نے مولانا مودودی کو لاہور آنے کی دعوت دی تھی سو اسکی بنا پر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ فکری لحاظ سے اقبال مولانا مودودی کی تعلیمات سے متفق تھے۔ ایک مودودی صاحب پر کیا موقوف، اقبال نے تو اور اربابِ علم کو بھی لاہور بلانے کی کوشش کی تھی جن میں حیدرآباد کے ڈاکٹر سید عبداللطیف بھی شامل ہیں۔ مولانا مودودی کی دعوت اور ان کی تعلیمات کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا طریقۂ کار کیا ہے اور یہ سب اقبال سے کس حد تک مختلف ہے۔ پروفیسر محمد سرور کے الفاظ میں:۔

> "مودودی صاحب کے متعلق یہ جو خوش فہمی ہے کہ انہوں نے اقبال کی مہم کو سنبھال لیا اور مثبت طور پر اسلامی آئیڈیالوجی اور اسلامی نظام کے ایک ایک پہلو کو واضح کیا محض مبالغہ ہے کیونکہ جس چیز کو اسلامی آئیڈیالوجی کا نام دیا گیا ہے اس برعظیم میں سب سے پہلے آج کی زبان اور اصطلاحات میں پیش کرنے والے اور اسے اشاعت دینے والے مولانا آزاد تھے، اقبال نہ تھے۔ اقبال کا اسلامی سیاست کا تصور قریب قریب سیکولر ہے اور انگریزی زبان میں اسلامی فکر کی تشکیلِ نو پر انہوں نے جو لیکچر دیئے تھے ان میں کافی وضاحت سے موصوف نے اپنے اس تصور کو پیش کیا ہے۔ قانون سازی میں ان کا زور اجماع پر تھا۔ مولانا مودودی اجماع کے سرے سے قائل نہیں۔ اقبال مغرب کی مادیت کو اپنانے کے خلاف نہیں تھے۔"

چنانچہ محولہ بالا حقائق کو سامنے رکھنے کے بعد قارئین خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اقبال کی فکری تحریک سے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے احیائے اسلام کے کام کو کس حد تک آگے بڑھایا ہے۔

سرسید احمد خاں کا اصل کارنامہ

فنون کے شمارہ ۹ میں "اقبال کا اصل کارنامہ" کے زیرِ عنوان جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے، وہ ہرگز نئے یا چونکا دینے والے نہیں ہیں۔ البتہ سرسید احمد خاں کے خلاف شائع ہونے والی عام تحریروں کے مقابلے میں، یہ تحریر یوں متمیز نظر آتی ہے کہ اس میں سرسید احمد کے خلاف محض الزام تراشی کی کوشش کی گئی ہے اور اس الزام تراشی کی بنیاد میں بھی دلیل و منطق کی بجائے، ایک نیم مذہبی نیم سیاسی جماعت سے نظریاتی و جذباتی وابستگی کارفرما ہے۔ ادارہ فنون نے اس مضمون کے تعارف میں لکھا ہے "یہ مضمون یقیناً مصنف کے وسیع اور گہرے مطالعے کا نتیجہ ہے اور اقبال کے کارناموں کو ایک نئے زاویہ سے سمجھنے کی عالمانہ کوشش ہے" لیکن میں بڑے افسوس سے عرض کروں گا کہ اس "عالمانہ مضمون" میں، استخراجِ نتائج کے لئے حقائق و واقعات کی منطقی ترتیب کی بجائے، صرف "فیصلے" (JUDGEMENTS) نظر آتے ہیں جو کسی عالمانہ تحریر کی سب سے بڑی خامی ہوتی ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

(۱) اس دور میں مسلمانوں کے اندر سے جو افراد اٹھے، انہوں نے نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کو انگریز کی سیاسی غلامی سے سمجھوتہ کرنے کا مشورہ دیا بلکہ تہذیبی دائرے میں بھی ہتھیار ڈال دینے کی تلقین کی۔ سرسید اور ان کے رفقا کی کوششوں سے اس دَور کے مسلمان نوجوان کو ڈگری اور اس ڈگری کے نتیجے میں کلرکی اور پھر اس کے نتیجے میں ڈبل روٹی تو حاصل ہو گئی لیکن یہ نوجوان اس انقلابی رُوح سے محروم ہو گیا جو ستاروں پر کمندیں ڈالنے کے لئے مہمیز بنتی تھی

(۲) علی گڑھ تحریک نے جو نسل تیار کی، وہ تخلیقی صلاحیتوں سے محروم اور زندگی کے ہر دائرے میں مغربی تہذیب کی مقلّد تھی۔

(۳) ایران میں رضا شاہ اور افغانستان میں امان اللہ خاں کی آمریت مسلّط تھی، عرب دنیا مغرب کے سیاسی استحصال کے آگے دم توڑ رہی تھی اور ترکی میں مصطفےٰ کمال اوجِ ثریا کی قربت کا عزم رکھنے والی قوم کو مغرب سے قریب ہونے کا حکم دے رہے تھے۔ (گویا رضا شاہ اور امان اللہ خاں سے پہلے ان ملکوں میں جمہوریت کا بول بالا تھا ــــ!)

(۴) اقبال کی جذباتی اپیل سے قائداعظمؒ نے اور اقبال کی فکری تحریک سے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے احیائے اسلام کے کام کو آگے بڑھایا۔

آپ نے لکھا ہے کہ یہ مسئلہ مزید بحث کا مستحق ہے کہ اقبال نے فقہ اور اسلامی الٰہیات کی تشکیلِ نو کے سلسلہ میں سید سلیمان ندوی اور مولانا انور شاہ کے علاوہ مولانا ابوالاعلےٰ مودودی کی بھی خدمات حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ میرے خیال میں اس مسئلے پر فکری بحث کی قطعی طور پر کوئی گنجائش نہیں ہے کیونکہ اس بحث کا انحصار صرف مولانا مودودی کی ذاتی تصدیق یا تردید پر ہے اور یوں بھی مودودی صاحب کے علاوہ اس ملک میں دوسرے ایسے حضرات بھی موجود ہیں جو فقہ اور اسلامی الٰہیات کی تشکیلِ نو کے سلسلہ میں اقبال کے مدعوئین میں شریک ہونے کے دعویدار ہیں۔ جہاں تک اقبال کے فکر و فن کا تعلق مسلمانوں کے تہذیبی تشخص کے تحفظ سے ہے، اس پر میں ایک الگ مضمون میں روشنی ڈال رہا ہوں، ان سطور میں سرسید احمد خاں پر کئے گئے اعتراضات پر کچھ عرض کرنے کی کوشش کروں گا۔

سرسید احمد خاں کی شخصیت و کردار پر نقد و احتساب کا سلسلہ بڑے دلچسپ مراحل سے گذرا ہے۔ ان کی زندگی میں مخالفتوں اور طعن و تشنیع کا ایک طوفان اٹھا۔ کچھ عرصہ گذرنے کے بعد مسلمانوں کے باشعور طبقے نے ایک لحاظ سے سرسید احمد خاں کی تحریک کے مقاصد کو تسلیم کر لیا اور ایک مدت تک ہم لوگ سرسید مرحوم کو مسلمانوں کا نجات دہندہ تسلیم کرتے رہے۔ پھر وہ دور آیا کہ افریقی و ایشیائی ممالک نے مغربی استعماریت کی پہنائی ہوئی غلامی کی

زنجیروں کو توڑنا شروع کر دیا اور ان ملکوں کے اہلِ قلم نے ہر اس تحریک اور شخصیت کو ہدفِ تنقید بنانا شروع کر دیا جو ماضی میں (خواہ تعمیری اور مثبت مصلحتوں کی بنا پر ہی) کسی نہ کسی صورت میں انگریزوں سے مصالحت کی پالیسی پر عمل پیرا تھی۔ سرسید احمد کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اس آخری دور میں سرسید احمد خاں کو گالی دینا بھی ترقی پسندی اور قومیت پرستی کی دلیل بن گیا۔ اس حیرت آموز طرزِ فکر کی بنیاد اس اعتراض کو بنایا گیا کہ سرسید نے قوم کو اتنا تیز دوڑایا کہ وہ اپنے زور میں اپنی منزل سے کہیں آگے نکل گئی۔ سجاد باقر رضوی نے اس طرزِ فکر کی نمائندگی یوں کی ہے:

"سرسید احمد خاں چاہتے یہ تھے کہ مسلمان اپنے بعض تعصبات کو چھوڑ کر، فرسودہ خیالات ترک کر کے، ترقی کی راہ اختیار کریں۔ اس کام کے لئے انہوں نے ایک تو یہ کیا کہ انگریزی تہذیب کو، جو فاتحین کی تہذیب ہونے کی وجہ سے پہلے ہی سے مضبوط تھی، تقویت دی اور اس طرح اس کے حملوں کو کامیاب بنایا اور دوسری طرف ہندوستانی مسلمانوں کو ایک ایسے احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیا جس سے چھٹکارا آج تک ممکن نہیں ہو سکا ہے۔ وہ خود انگریزی طرزِ زندگی اور انگریزی تہذیب سے اتنا متاثر ہوئے کہ انگریزوں کے کتوں کو ہندوستانیوں سے برتر سمجھنے لگے۔ انگریزوں کی تہذیبی فتح صرف اس لئے نہیں ہوئی کہ وہ سیاسی فاتح تھے۔ سیاسی فاتح اکثر تہذیبی غلام بن جاتے ہیں۔ یوں کہیے کہ سیاسی طور پر مکمل فتح پانے کے بعد انگریز تہذیبی لڑائی لڑے اور سرسید اس جنگ میں انگریزی فوج کے کمانڈر تھے .... سرسید ایک بات اور بھول گئے کہ انگریزی تہذیب اور انگریزوں کا طرزِ معاشرت انگلستان کے معاشی حالات اور اقتصادی و مادی ترقی کا نتیجہ ہے۔ کسی قوم کی ترقی صرف دوسری قوم کی تہذیب کو اپنا لینے سے نہیں ہوتی جب تک کہ اس قوم میں ویسے ہی مادی وسائل نہ پیدا ہو جائیں جنہوں نے اس تہذیب کو پیدا کیا۔ مسلمانوں کو سرسید کی کوششوں اور علی گڑھ یونیورسٹی سے کیا ملا؟ اسلامی شلوار پر انگریزی ٹائی اور سرکارِ برطانیہ کی خیر خواہی اور ملازمتیں؟"

دلچسپ بات یہ ہے کہ باقر صاحب اسی مضمون کے شروع میں فرماتے ہیں۔ "میں سرسید کو مسلمانوں کا محسن سمجھتا ہوں اور علی گڑھ یونیورسٹی کو مسلمانانِ ہند کی بچی کھچی تہذیبی زندگی کا محافظ سمجھتا ہوں" ــــ علی گڑھ یونیورسٹی اور سرسید کی تحریک کے خلاف اکبر الٰہ آبادی کے مزاحیہ اور طنزیہ اشعار پیش کرنے کے بعد باقر صاحب لکھتے ہیں:

"دیکھا آپ نے؟ اکبر کے بقول سرسید نے انگریز سے مسلمانوں کی لاٹھی کا پروانہ لیا اور انگریزی تہذیب کے سانچے میں اپنی قوم کو اس طرح ڈھالا کہ نہ وہ مشرقی رہی نہ مغربی اور اس طرح ہماری بسم اللہ ہی غلط ہو گئی۔ مغربی تہذیب کے بٹن جب مشرقی تہمد میں لگے تو یہ کوئی معمولی سانحہ نہ تھا۔ اس کے ساتھ ہماری زندگی میں سادگی کی بجائے پیچیدگیاں آنی شروع ہوئیں۔ پہرے اور قانون نے ہمارے گلے میں اپنے پھندے سخت کرنے شروع کئے (تہذیب و تخلیق)

سرسید کی مخالفت اور مخالفوں کا ذکر آیا ہے تو ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہو جاتا ہے۔ سرسید کے موجودہ نقاد اپنے دل میں یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ سرسید کو مشرقی تہذیب پر حملہ آور قرار دے کر وہ علماء کے اس طبقے کی تائید کر رہے ہیں جنہوں نے سید مرحوم کی زندگی میں ان پر سخت تنقید کی تھی، حالانکہ یہ سمجھنا سراسر غلط ہے کہ اس وقت کے جید علماء نے انگریزی تعلیم کی مخالفت کی تھی۔ حضرت شاہ عبدالعزیز بھی فتویٰ دے چکے تھے کہ جدید تعلیم اور انگریزی زبان کی تحصیل ہرگز ناجائز نہیں۔ اس کے علاوہ علی گڑھ کالج میں مذہبی تعلیم کا انتظام بھی تھا۔ بات اصل یہ تھی کہ سرسید احمد خاں "تہذیب الاخلاق" میں بعض دینی مسائل کی تاویلات ایسے انداز سے کر چکے تھے کہ قدیم خیال کے راسخ العقیدہ مسلمان ان سے بدظن ہو گئے تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان نوجوانوں کی تعلیم کا کام ایسے شخص کے سپرد کیا جائے۔ چنانچہ اس سلسلے میں جتنے فتوے شائع ہوئے، ان میں انگریزی زبان اور جدید علوم کی مخالفت نہیں کی گئی بلکہ زیادہ تر سرسید کے عقائد کو پیش کر کے انہیں کافر و ملحد قرار دیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ ایسا شخص جو مدرسہ قائم کرے اس کی اعانت شرعاً جائز نہیں۔ سرسید کی تمام مجتہدانہ و مجددانہ تحقیقاتِ مذہبی کا نتیجہ "الاسلام ہو الفطرۃ والفطرۃ ہو الاسلام" تھا۔ اس لحاظ سے اس کے مضامین میں اکثر فطرت اور

نیچر کا لفظ زیادہ استعمال ہوتا تھا۔ اس لئے ان کے دوستوں اور معاونوں کو مخالفین نے نیچری کہہ کر پکارنا شروع کر دیا۔ سرسید کے متعلق مذہبی بدگمانیوں کا آغاز تو بنارس میں ایک انگریز کے یہاں کھانا کھانے سے ہی ہو گیا تھا۔ پھر تبیین الکلام کی اشاعت سے اس میں شدت پیدا ہو گئی۔ زاں بعد سائنٹفک سوسائٹی کی طرف سے الفنسٹن کی تاریخ ہند کے ترجمے اور رسالہ طعام اہل کتاب کی اشاعت نے سرسید کے "کفر" کو مستحکم بنا دیا اور لندن سے واپسی کے بعد "تہذیب الاخلاق" کے مضامین نے اس کفر کو مستحکم تر کر دیا۔ مشہور کیا گیا کہ مدرسۃ العلوم میں سید احمد خاں کا بت اور اُن کے معاونین کی تصویریں قدِ آدم یا نصف قدِ آدم رکھی جائیں گی۔ بعض نے شہرت دی کہ نیچریوں کے عقائد کے موافق لٹریچر کے علاوہ شیعہ مذہب کی کتابیں پڑھائی جائیں گی۔ بعض مخالفین نے اسی مخالفت کی غرض سے اخبار جاری کئے۔ ان میں "نور الانوار" کانپور بہت مشہور تھا۔ حاجی علی بخش خاں سب جج حرمین الشریفین جا کر فتادے کفر لائے۔ انہوں نے متعدد رسائل و کتب تالیف کیں اور دو اخبار "نور الآفاق" اور "نور الامداد" "تہذیب الاخلاق" کی مخالفت میں جاری کئے۔ ان میں سے ایک نے یہ خبر شائع کی کہ سید احمد خاں نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا اور گرجا میں جا کر بپتسمہ لیا۔ "نور الانوار" نے کفر و گناہ کے وجوہ میں لکھا کہ:

"اس مدرسہ کا بانی ملحد ہے۔ اس لئے مدرسہ میں الحاد کی باتیں سکھائی جائیں گی۔ منخنقہ مرغی کھلائی جائے گی۔ انگریزی طریقہ پر تعلیم ہو گی جس میں سکھایا جائے گا کہ زمین اپنے محور پر گھومتی ہے۔ گائے کے سینگ پر نہیں رکھی ہے۔ آسمان جسم کردی محیط الارض نہیں ہے۔ نہ کوئی آسمان سونے کا ہے نہ زمرد کا نہ چاندی کا۔ یہ سب خیالی اور جھوٹے قصے ہیں تو پھر اسلام کاہے کو باقی رہے گا۔"

ایک استفتاء یوں تھا:

"کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس میں کہ ایک شخص ان مدارس کو جن میں علوم دینی اور ان علوم کی جو علومِ دینی کی تائید میں ہیں تعلیم ہوتی ہے جیسے مدرسہ اسلامیہ دیوبند اور مدرسہ اسلامیہ علی گڑھ اور مدرسہ اسلامیہ کانپور کو لغو اور برا کہتا ہے اور ان مدارس کی ضد میں ایک مدرسہ اپنے طور پر تجویز کرنا چاہتا ہے اور اس شخص کا حال یہ ہے کہ صدہا امور کو جو آیات اور احادیث اور روایات و فقہ باتفاق اہلِ اسلام ہونا جائز ہیں، وہ کسے پیرایہ میں رواج دیتا ہے۔ اس لئے مسلمانوں کو اس شخص کے اعمال اور اعتقادات پر اعتماد نہیں ہے۔ پس اس مدرسہ کے لئے جو ایسا شخص کہ اہلِ اسلام سلف و حال کے امور مذہبی میں مخالف ہے اپنے طور پر ایک مدرسہ ضد میں مدارس اسلامیہ قدیم و حال کے تجویز کرنا چاہتا ہے اور اس میں کچھ علوم مذہبی اپنے طور پر تعلیم کرنا اس کو منظور ہے۔ مسلمانوں کو ایسے مدرسہ میں چندہ دینا درست ہے یا نہیں بیّنوا و توجروا"

سید احمد خاں کے مخالفین کے اندازِ فکر کی تفصیلات میں اس غرض سے تحریر کر رہا ہوں کہ نئی نسل کے نقادوں کی قائم کردہ اس ۱۸۷۲ھ کی اصلیت کو سمجھنے میں آسانی رہے کہ سید احمد نے مشرقی تہذیب کی لٹیا ڈبو دی اور ان کے مخالفین غیرتِ دینی کا آخری دفاعی حصار تھے۔ ان مخالفانہ تحریروں کے بغور مطالعہ سے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آتی ہے کہ اکثر نے سید احمد خاں کی طرف خلافِ واقعہ عقائد منسوب کئے اور بعض نے اصل دیکھنے اور تحقیق کرنے کی پروا کئے بغیر ان پر افترا و تلبیس کے تیروں کی بوچھاڑ کر دی اور ایک ایسی ذہنی فضا پیدا کر دی جس میں سر سید احمد خاں کو دین کا باغی اور قوم کا غدار سمجھا۔ صاحب دل کی دلیل قرار پایا اور وہ ذہنی فضا آج تک قائم ہے۔ اس سلسلے میں سر سید کے اس جواب کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جو انہوں نے حاجی علی بخش کے بہتانوں کے جواب میں "تہذیب الاخلاق" میں دیا۔ اپنے جواب کے آخر میں سر سید نے لکھا:

"کوئی میری اس تحریر کو دیکھے گا تعجب کرے گا کہ جناب سید الحاج نے کیوں ایسے سخت اور غلط بہتان مجھ پر کئے ہیں۔ ظاہراً اس کا سبب

یہ معلوم ہوتا ہے کہ جناب سید الحاج نے جب یہ رسالہ لکھا ہے قریب اسی زمانہ کے حج کو تشریف لے جانے والے تھے۔ انہوں نے خیال کیا ہوگا لاؤ حج تو جاتے ہی ہیں جتنے گناہ کرنے ہیں سب کر لیں۔ حج کے بعد تو سب پاک ہی ہو جائیں گے جیسا کہ بعض آدمی مسہل لینا چاہتے ہیں تو خوب بدپرہیزی کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مسہل سے سب کچھ کھایا پیا نکل جائے گا۔ مگر جناب سید الحاج کو معلوم کرنا چاہیے کہ گو حج میں سب گناہ آپ کے معاف ہو گئے ہیں اور شبلی دجنید کے مرتبہ پر آپ پہنچ گئے ہیں مگر حق العباد نہ حج سے بخشے جاتے ہیں نہ کسی بشارت سے۔ آپ نے جو اتہام مجھ پر کئے ہیں جب تک میں ہی نہ معاف کروں معاف نہیں ہو سکتے۔ پس مقتضائے ایمانداری یہ ہے کہ آپ رجح در احمد کا احرام باندھئے اور گناہوں کی معافی چاہیے ورنہ روزِ جزاء اپنے کرتوتوں کا مزا آپ کو معلوم ہو جائے گا"۔

(اس قسم کے مضامین نے معنی و اسلوب کے لحاظ سے اردو ادب کو ایک جدید اسلوبِ تحریر بھی بخشا ہے) سرسید نے اپنے ایک مضمون میں اپنی مخالفت کرنے والوں کو سات اقسام میں تقسیم کیا ہے:

اوّل: خبیث النفس و بدباطن جو ہماری ان تمام محنتوں کو اور ہمارے تمام کاموں کو جو ہم اپنی دانست میں اپنی قوم کی بھلائی کے لئے کرتے ہیں، ہماری ذاتی اغراض پر محمول کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جو کچھ ہم کرتے ہیں اپنی نام آوری اور شہرت کے لئے اور حکامِ وقت کے سامنے اپنا رسوخ پیدا کرنے اور ان کو دھوکا اور فریب دینے کو۔

دوم: حسد و عداوت: ہمارے پرانے یار ہماری ترقیات سے جو خدا نے صرف اپنی عنایت سے نہ ہمارے کسی استحقاق سے ہم کو دیں ہم پر خفا ہیں ...... ایسے وقت میں جب کہ سمند ناز پہ اک اور تازیانہ لگا کہ دارالعلوم مسلمانان کی بنیاد پڑی۔ حاسدوں نے خیال کیا کہ اب تو سید احمد نے بھوت بننے کا سامان کیا کہ مرنے پر بھی زندہ رہے گا۔

سوم: بعض متعصب وہابی جن کو میں یہود ہذہ الامت سمجھتا ہوں اور جن کے تمام افعال صرف دکھاوے کی باتوں پر منحصر ہیں اور انگریزی پڑھنے کو حرام سمجھتے ہیں، انگریزوں اور کافروں سے صاحب سلامت کرنا گناہ جانتے ہیں۔

چہارم: خود غرض یا خود پرست یعنی وہ لوگ جو سوائے بجز اپنی غرض کے اور اپنے حظِ نفسانی کے دنیا و مافیہا سے غرض نہیں رکھتے۔ وہ نہیں جانتے کہ قومی ہمدردی اور قومی عزت کیا چیز ہے؟

پنجم: ٹٹ پونجیے اخبار نویس جو یہ سمجھتے ہیں کہ اس قسم کے مضامین چھاپنے سے ہمارے اخبار کے دو چار پرچے زیادہ بک جائیں گے۔

ششم: بے تمیز یعنی وہ لوگ جو ہمارے ذاتی خیالات اور قومی معاملات میں تمیز نہیں کرتے اور ہمارے مقصد کو جو دارالعلوم کے قائم کرنے سے ہے نہیں سمجھتے۔

ہفتم: ناداں مسلمان جن کے دل میں پانچ قسم کے بزرگوں نے وسوسہ ڈالا ہے اور وہ اپنی ایمانداری سے تردد میں پڑ گئے ہیں۔

ملا جمال الدین افغانی بانی اسلام ازم تحریک کے علمبردار کی حیثیت سے مسلم ممالک میں خاص شہرت رکھتے تھے اور آج بھی ان کا نام غیرت و حمیتِ اسلام کی علامت کے طور پر احترام سے لیا جاتا ہے۔ جذبہ جوش و خلوص اپنی جگہ، ملا صاحب میں تحقیق کا مادہ نہیں تھا۔ انہوں نے ۱۸۸۴ء میں پیرس سے ایک رسالہ عروۃ الوثقیٰ کے نام سے عربی میں جاری کیا۔ اس میں ایک مضمون "ہندوستانی نیچری" لکھا۔ فرماتے ہیں:

احمد خاں نے انگریزوں سے کچھ فائدہ حاصل کرتے اور ان کو خوش کرتے اور مسلمانوں کو برباد کرنے کے لئے دہریت اختیار کی۔ وہ نیچریوں اور دہریوں کے روپ میں ظاہر ہو کر یہ ثابت کرنے لگا کہ دنیا میں ذہنی فطرت اور نیچر کے علاوہ اور کسی چیز کا وجود نہیں اور اس کھلی ہوئی گمراہی کا اعلان

کرنے لگا کہ دنیا کا کوئی پیدا کرنے والا نہیں۔ اس کے خیال میں تمام انبیاء دہریے تھے اور اس معبود کے بالکل قائل نہ تھے جس کا ذکر شرائع میں آیا ہے۔ انگریزوں نے اس کی عزت و تکریم شروع کر دی اور علی گڑھ میں ایک مدرسہ قائم کرنے میں اس کی مدد کی جس کا نام محمڈن کالج رکھا گیا۔ یہ ایک جال تھا جو مسلمان بچوں کو شکار کر کے احمد خاں کے افکار کے مطابق تربیت دینے کے لئے پھیلایا گیا۔ احمد خاں نے اور اس کے پیروؤں نے دین کا لباس خود اتارا اور مسلمانوں میں فتنہ ڈالنے اور ان کی آواز کمزور کرنے کے لئے انہیں بھی دین چھوڑنے کی طرف دعوت دی۔ پھر ان کی سب سے بڑی گمراہی یہ ہے کہ ہندوستانیوں اور دیگر ممالک کے مسلمانوں میں مخالفت کا بیج بوتے ہیں۔ ان کے سامنے اجنبی تسلط کے بوجھ کو معمولی کر کے دکھاتے ہیں۔ دینی اور نسلی حمیت کے آثار کو مٹانے کی جدوجہد کرتے ہیں ...... یہ سب کچھ وہ کسی بڑے اجر کی خاطر نہیں کرتے اور اس میں ان کو مدنظر کوئی عالی مرتبت شرف نہیں صرف معمولی درجہ کی زندگی اور کوڑیوں کے فائدے کے لئے یہ خدمات سرانجام دی جاتی ہیں بقول نواب صدیق حسن خاں بھوپال، "احمد خاں آخری زمانہ کا دجّال ہے"۔

ملاّ جمال الدین افغانی نے یہ تمام الزامات بغیر کسی تحقیق و جستجو کے عاید کئے جواں کی جوشیلی اور سیماب صفت طبیعت کا تقاضا تھا۔ شعرا کا بھی ایک طبقہ تھا جو سرسید اور علی گڑھ کالج کی ہجو میں اپنا زورِ کلام دکھاتا تھا۔ ان میں اکبر الٰہ آبادی کے ہزل و مسخر کا خاص مقام ہے۔ کالج کے انتظامی معاملات میں بعض رفقائے کار کی شدید مزاحمت کا سامنا بھی سرسید کو کرنا پڑا اور سول سروس کے بعض انگریز افسروں کو بھی سرسید ایک آنکھ نہ بھاتے تھے اور آخری عمر میں تو آپ کو مولانا شبلی کی مخالفت کا صدمہ بھی برداشت کرنا پڑا ــــ لیکن سید احمد خاں کی طبیعت کے تحمل اور استقلال کی داد دینی پڑتی ہے کہ قوم کی مخالفت ان کے جوشِ عمل کو مہمیز ثابت ہوتی تھی۔ وہ خود کہا کرتے تھے۔ "جوں جوں لوگ گالیاں دیتے ہیں، جوں جوں لوگ تکلیف دیتے ہیں میرا جوشِ (عمل) بڑھتا جاتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ نہیں سمجھتے"۔ جمال الدین افغانی آگ لگاتے تھے، سرسید احمد خاں خود آگ میں جلتے تھے۔ ایک مرتبہ کہا۔ "اے عزیزو! شاید یہ نتیجہ میری شامت اعمال کا ہو۔ مگر اس کام میں مجھ کو ایک قلی کا سا درجہ ہے۔ مگر کیا تمہاری مسجد خانقاہ امام باڑے میں چمار اور چوہڑے چھتری نہیں ڈھوتے۔ اور اس مقدس عمارت کو پاک نہیں کرتے۔ تم مجھ کو بھی ایسا ہی سمجھو اور اپنی قومی بھلائی کے کام میں مدد دو۔" قومی مقاصد کے حصول میں اپنے نفس کی اس حد تک ذلت برداشت کر لینے والے شخص کے بارے میں اگر "فنون" کا مضمون نگار یہ کہتا ہے کہ ــــ سرسید نے کہا کہ ایک غیر قوم ہمارے نوجوانوں کا جھٹکا کیوں کرے، ہم خود ہی انہیں ذبح کر دیتے ہیں"۔ تو یہ کس قدر افسوس ناک ہے اور محسن کشی کی کتنی "نادر" مثال ہے۔ سرسید کے مذہبی عقاید اور ان کی تعلیمی پالیسی سے اختلاف کوئی گناہ نہیں ہے لیکن میرا یہ ایمان ہے کہ سرسید کی نیّت پر حملہ کرنا شقاوتِ قلبی اور شپرہ چشمی کا ثبوت دینا ہے۔ تنقید کرنے والے اور سرسید احمد خاں کی حسن نیّت پر حملہ کرنے والے حضرات یہ کیوں فراموش کر دیتے ہیں کہ "مسلمانوں کو اپنے ہاتھوں ذبح کرنے والے" اسی سید احمد خاں نے "اسبابِ بغاوتِ ہند" لکھ کر انگریزوں کی سیاسی حکمتِ عملی پر زبردست تنقید کی۔ ان کی حق گوئی کا اندازہ لگانے کے لئے "اصلِ سوم" کا اقتباس ملاحظہ کیجیے

"کسی کو سچی بات علی الخصوص وہ کہ مخالف طبع اور مزاج حاکموں کے ہوتی تھی کہنے کا مقدور نہ تھا۔ ہر شخص ملازم اور درباری رئیس سب ڈر کے مارے خوشامد کی بات کہتے تھے اس سے حالات رعایا کے ہمیشہ ہماری گورنمنٹ سے مخفی رہے جو نیا قانون گورنمنٹ سے جاری ہوا اس سے جو مضرت رعایا کے حال اور رفاہ اور فلاح کو پہنچی۔ اس کا رفع کرنے والا اور اس کی خبر دینے والا کوئی نہ تھا۔ اس قسم کے امور میں کوئی غمخوار رعایا کا نہ تھا۔ بجز ان کے لہو کے جو جل جل کر ان کے بدن میں رہتا تھا اور بجز ان کی بے کسی کے جس پر وہ آپ رو کر چپ رہتے تھے"

"ہندوستان کے اشراف آدمی کی ایک چھوٹے سے یورپین کے سامنے ایسی بھی قدر نہیں ہے جیسی کہ ایک چھوٹے یورپین کی ایک بہت بڑے

ڈیوک کے سامنے ۔ یوں تصور کیا جاتا تھا کہ ہندوستان میں کوئی جنٹل مین نہیں ہے ۔ کیا ہماری گورنمنٹ کو نہیں معلوم ہے کہ بڑے سے بڑا ذی عزت ہندوستانی حکام سے لرزاں اور بے عزتی کے خوف سے ترساں تھا اور کیا یہ بات چھپی ہوئی ہے کہ ایک اشراف اہل کار کے سامنے مثل پڑا رہا ہے اور ہاتھ جوڑ جوڑ کر باتیں کر رہا ہے اور صاحب کی بدمزاجی اور سخت کلامی بلکہ دشنام دہی سے دل میں رو رہا ہے اور کہتا ہے "ہائے افسوس روٹی کہیں اور نہیں ملتی اس نوکری سے تو گھاس کھودنی بہتر ہے"۔

سرسید کی قوم پرستی پر حرف رکھنے والے "اسباب بغاوت ہند" کو صدق دلی سے پڑھیں تو ان پر سرسید کی آہنی جی کا راز کھل جائے گا۔ اکثر انگریزوں نے اس کتاب کی بنا پر سرسید کو غدار اور مفسد قرار دیا اور حکومت سے مطالبہ کیا کہ سرسید کو سزا دی جائے ۔

وہ لوگ کتنی بڑی تاریخی غلط فہمی میں مبتلا ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ سرسید محض ایک معلّم تھے اور وہ بھی انگریز کے "وفادار معلّم"۔ آپ کی زندگی کے حالات کا طالب علم حیران ہوتا ہے کہ ایک ہی شخص بیک وقت راہنما، مصلح، عالم دین، عالم سیاسیات، قانون دان، مصنّف، مقرر، معلّم، منتظم اور ایک عظیم تحریک کا بانی کیسے ہو سکتا ہے ۔ سرسید نے ہر میدان میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ آپ کا ایک بڑا کارنامہ وہ خطبات ہیں جو انہوں نے پیغمبرِ اسلامؐ کی ذات پر سر ولیم میور کے نازیبا اعتراضات کے جواب میں لکھے ۔ ان خطبات میں ناقابلِ تردید دلائل کی روشنی میں سر ولیم میور کی جہالت اور تعصب کے چہرے پر سے پردہ اٹھا دیا گیا ہے ۔ اسلام اور پیغمبرِ اسلامؐ کے ساتھ آپ کے لگاؤ کا اندازہ اس امر سے بخوبی ہو جاتا ہے کہ سرسید کے بعض دوستوں اور سر ولیم میور کے ماتحتوں نے "لائف آف محمدؐ" کا جواب نہ لکھنے کا مشورہ دیا لیکن سرسید نے ان کی ایک نہ سنی اور انگلینڈ پہنچتے ہی اس کی فکر میں مصروف ہو گئے۔ انڈیا آفس اور برٹش میوزیم کے کتب خانوں کو کھنگال ڈالا، عربی کی کتابیں مصر و فرانس و جرمنی سے منگائیں اور انگریزی کی پرانی نایاب کتابیں گراں قیمت پر لندن سے خریدیں ۔ شب و روز محنت کر کے بارہ مقالات لکھے اور ایک انگریز سے انگریزی میں ترجمہ کرائے اور لندن ہی میں "خطباتِ احمدیہ" کے نام سے ۱۸۷۰ء میں چھپوا کر شائع کرائے ۔ خطباتِ احمدیہ لکھتے وقت آپ کس جذبۂ ایمانی سے سرشار تھے اس کا اندازہ ان خطوں سے ہوتا ہے جو انہوں نے ولایت سے مولوی سید مہدی علی خاں (نواب محسن الملک) کو لکھے تھے ۔ لکھتے ہیں :

"ولیم میور صاحب کی کتاب کو دیکھ رہا ہوں ۔ اس نے دل کو جلا دیا اور اس کی ناانصافیاں اور تعصبات دیکھ کر دل کباب ہو گیا اور مصمم ارادہ کیا کہ آنحضرت صلعم کی سیرت میں جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا کتاب لکھ دی جائے ۔ اگر تمام روپیہ خرچ ہو جائے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے ...... لکھنے میں شب و روز مصروف ہوں ۔ اس کے سوا اور کچھ خیال نہیں ۔ جانا آنا ، ملنا جلنا سب بند ہے ۔ کسی مہاجن سے میرے لئے ہزار روپیہ قرض لیجئے ، سود اور روپیہ میں ادا کروں گا ۔ ہزار روپیہ بھیجنے کے لئے دلی لکھا ہے اور لکھ دیا ہے کہ کتابیں اور میرا اسباب یہاں تک کہ میرے ظروف مسی تک فروخت کر کے ہزار روپیہ بھیج دو ۔ کیا کہیے اس کتاب کے پیچھے خواب و خورد حرام ہو گیا ہے ، خدا مدد کرے ۔"

ایک اور خط میں لکھتے ہیں :

"میری کتاب خطبات احمدیہ ایک مسلمان عالم متبحر نے پڑھی جو قسطنطنیہ سے یہاں آیا ہے جو الفاظ کہ اس نے کہے اور مجھے لکھے اور جس طرح میرے ہاتھ چومے ، اس کی لذت میں ہی جانتا ہوں ۔"

اس کتاب کے بارے میں خود انگریزوں کی رائے پڑھنے کے قابل ہے ۔ ریورنڈ ہوپر پرنسپل ڈوِنٹی کالج لاہور کہتے ہیں :-

"مسلمانوں سے نہایت تعجب ہے کہ وہ سرسید احمد خاں کو کافر، ملحد اور بدمذہب سمجھتے ہیں ۔ ہمارے نزدیک جو کام سید احمد خاں نے اسلام کی حمایت میں کیا ہے وہ آج تک کسی مسلمان سے بن نہیں آیا ۔ میں نہیں جانتا کہ تیرہ سو برس میں سید احمد خاں سے پہلے کسی مسلمان نے

بھی ایسا کام کیا ہو۔"

مسٹر آرنلڈ مصنف "پریچنگ آف اسلام" نے لکھا:

"ایسی مثالیں تو پائی جاتی ہیں کہ کسی مسلمان نے بمقابلہ عیسائیوں کے اپنی زبان میں اپنے ہی ملک میں بیٹھ کر اسلام کی حمایت پر کوئی کتاب لکھی، اور اس کا ترجمہ کسی یورپ کی زبان میں ہو گیا لیکن مجھے کوئی ایسی مثال معلوم نہیں کہ کسی مسلمان نے یورپ ہی کی کسی زبان میں اس مضمون پر لکھ کر شائع کی ہو۔"

لندن کے ایک اخبار میں ایک انگریز نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

"عیسائیوں کو ہوشیار ہو جانا چاہیے کہ ہندوستان کے ایک مسلمان نے انہیں کے ملک میں بیٹھ کر ایک کتاب لکھی ہے جس میں اس نے دکھایا ہے کہ اسلام ان تمام داغوں اور دھبوں سے پاک ہے جو عیسائی اس کے خوشنما چہرے پر لگاتے ہیں۔"

انگلینڈ سے واپس ہو کر سر سید نے خطباتِ احمدیہ کو اردو میں ترتیبِ نو کے ساتھ مفصل صورت میں شائع کیا۔ لندن ہی میں سر سید کو معلوم ہوا تھا کہ ایک مصنف جان ڈیون پورٹ نے عیسائیوں کے خلاف اسلام کی حمایت میں ایک کتاب "اپالوجی فار محمد اینڈ قرآن" لکھی ہے۔ سر سید نے اس کے مضامین سنے اور اس قدر پسند کیا کہ اس کتاب کی اشاعت کا فوراً بندوبست کرایا۔ اس کی کئی سو جلدیں ہندوستان بھجوائیں۔ یہاں اس کتاب کے دو ترجمے شائع ہوئے۔ انگلستان کے ایک اور مشہور مصنف گاڈفری ہگنز کی کتاب جو اس نے اسلام کی تائید میں لکھی تھی، نایاب ہو گئی تھی۔ سر سید نے لندن میں ایک جرمن کتاب فروش کی دکان سے دس گنا قیمت پر خریدی اور ہندوستان میں آ کر اس کا اردو ترجمہ کرایا۔ سر سید کی دوسری بڑی جسارت تفسیر القرآن تھی جس میں انہوں نے اسلامی تعلیمات و عقاید کو عقلِ انسانی اور فطرت کے قوانینِ مسلّمہ کے موافق ثابت کرنے کی کوشش کی اور جو عقائد و روایات اس کسوٹی پر پورے نہ اترے، انہیں ناقابلِ تسلیم قرار دیا۔ یہ بات صحیح ہے کہ جملہ مذاہبِ عالم میں صرف اسلام ہی ایسا مذہب ہے جس کی حقانیت و صداقت عقل و تجربہ کی کسوٹی پر پورا اترتی ہے لیکن قرآنی فرمودات کی مبہم تاویلات میں بہ تقاضائے بشریت سر سید نے اکثر مقامات پر ٹھوکریں بھی کھائی ہیں۔ انہوں نے تمام معجزات اور خلافِ قوانینِ فطرت باتوں سے انکار کیا۔ ایمان بالغیب کی ایک انوکھی تاویل کی (جبکہ مذہب میں بعض ان دیکھی اور بن سمجھی باتوں کے مانے بغیر کام نہیں چلتا) اور جنّوں سے صحرائی اقوام مراد لیا۔ تفسیرِ قرآن میں سر سید نے جس انتہا پسندی سے کام لیا ہے، اس سے ان کے بہترین اور قابلِ اعتماد ساتھی حالی نے بھی اختلاف کیا۔ کہتے ہیں:

"آخر عمر میں سر سید کی خود رائی یا خود وثوق کہ ان کو اپنی رایوں پر تھا، وہ حدِ اعتدال سے متجاوز ہو گیا تھا۔ بعض آیاتِ قرآنی کے وہ ایسے معنی بیان کرتے تھے جن کو سن کر تعجب ہوتا تھا کہ کیونکر ایسا عالی دماغ آدمی ان لغو اور بودی تاویلوں کو صحیح سمجھتا ہے۔"

حالی آج زندہ ہوتے تو انہیں سر سید کی اس جسارت پر اتنی حیرانی نہ ہوتی کیونکہ سر سید سے لے کر آج تک ایسے تجدد پسند علماء کا سلسلہ جاری ہے جو مسائلِ قرآنی کی تاویل و تشریح میں سر سید کو بھی کوسوں دور چھوڑ آتے ہیں۔ لیکن سر سید کی اس تفسیر نے قصصِ قرآنی پر عیسائیوں کے متعدد اعتراضات کی کمر توڑ کر رکھ دی اور ارکان و فرائضِ اسلام کے علاوہ جہاد کی تشریح اتنے دلکش اور مدلل انداز میں کی کہ عقل و ایمان کے رنگا رنگ پھولوں کا ایک چمن کھلا دیا۔ (جبکہ ہمارے فاضل دوست ممتاز احمد صاحب نے لکھا ہے کہ "مسلمان قوم کی سب سے زندہ، جاندار، بھرپور اور عمل کے میدان میں سرگرم رکھنے والی روایت جہاد کی تھی جسے انگریزوں کے اقتدار کے مستقل تحفظ کی خاطر ختم کرنے کی کوشش کی گئی"۔ سر سید پر یہ اعتراض کرنے سے پیشتر فاضل مضمون نگار کو جہاد کی اس عالمانہ و مفکرانہ تشریح کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے تھا جو محترم مودودی صاحب نے کی ہے) فطرت و قرآن کے سلسلے

میں سرسید کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ فطرت WORK OF GOD (خدا کا فعل) ہے اور قرآن (WORD OF GOD) خدا کا کلام ہے اور صداقت کے معنی یہ ہیں کہ دونوں میں مکمل ہم آہنگی اور مطابقت ہو۔ انہوں نے یکم فروری ۱۸۸۴ء کو لاہور میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

"میں نے مذاہب کی صداقت دریافت کرنے کے لئے اور مذہب کی جانچ کے لئے یہ اصول قرار دیا ہے کہ وہ فطرتِ انسانی کے مطابق ہے یا نہیں...... اور مجھ کو یقین ہوا ہے کہ اسلام اس کی فطرت کے مطابق ہے۔"

سرسید کی تاویلات و تشریحات سے اختلاف کے باوجود ہم ان کے دینی کارناموں کے مثبت پہلو کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ مولانا عبدالحلیم شررؔ لکھتے ہیں:

"سید صاحب کے پاس بعد کے زمانے میں متعدد انگریزی (خواں) طلباء کے ایسے خطوط آتے جن کا ماحصل یہ تھا کہ اگر آپ نے ہماری رہبری نہ کی ہوتی تو ہم مذہبِ اسلام کو چھوڑنے کے لئے تیار تھے۔ یہ خطوط سید صاحب کو اس قدر عزیز تھے کہ ان کو احتیاط سے رکھ چھوڑا تھا۔ ان کو اپنی ہمدردیٔ اسلام اور اپنی کوشش خیر کی سند اور انہیں کو دینی نجات کا ذریعہ خیال کرتے تھے۔"

اس میں شک نہیں کہ سرسید کی تحریک نے آگے چل کر بعض ایسے اثرات بھی چھوڑے جو سزاوارِ تحسین و آفریں نہیں ٹھہرتے لیکن دنیا میں اٹھنے والی وہ کون سی تحریک ہے جو صاف ستھرے چشمے کی صورت چلی ہو اور "میدانی علاقوں" میں پہنچ کر اس کا شفاف پانی گدلا نہ ہو گیا ہو۔ ذہن میں رکھنے والی چیز تو تحریک کے علمبردار کی نیت اور منتہائے مقصود ہوتا ہے اور اگر ہم ایمانداری سے سوچیں تو معلوم ہوگا کہ اسلام میں انقلابی اور اصلاح پسند خیالات کی ترویج کے "مجرم" ہمارے بڑے بڑے اکابر اور مجتہد بھی ہوئے ہیں اور چونکہ ان کے خیالات عام مولویوں اور عوام کی سمجھ سے بالا تھے اس لئے کافر، زندیق اور ملحد ٹھہرے۔ شیخ عبدالقادر نے "مخزن" کے ایک شمارے میں سرسید کے متعلق بڑی متوازن اور بالغ نظری کی بات لکھی ہے:

"سید کا معاملہ فہم اور تجربہ کار دماغ انہیں مناسب تغیرات کے ساتھ ہندوستان میں رواج دینا چاہتا تھا...... سرسید نے اس جداگانہ زمانے میں حکمران گروہ کی رفاقت کی کیونکہ اس وقت قوم کے لئے چند فوائد انہی تدبیروں میں مضمر تھے ...... سرسید کا مزاج آزادی اور اطاعت کا ایک مجموعہ تھا جس میں دونوں چیزیں مناسب مقدار میں موجود تھیں اور اپنے اپنے وقت پر دونوں ظاہر ہوتی تھیں...... آج اگر سرسید مرحوم ہوتے تو میرا عقیدہ ہے کہ وہ خود کوئی نئی پالیسی کی بنیاد رکھتے جو اس پالیسی سے بالکل اور ہوتی جو انہوں نے آج سے بیس بائیس برس پہلے مسلمانوں کے لئے تجویز کی تھی۔ اس وقت مسلمانوں کی حالت اور تھی اب اور ہے...... اس زمانے میں حکام کا رویہ اور تھا اب اور ہے۔ ضرورت ہے کہ سید مرحوم کے دل و دماغ کے ایک شخص کی جو ان سب تغیرات کو مدِ نظر رکھ کر اپنی قوم کے لئے ایک نیا دستور العمل قائم کرے تاکہ مسلمانوں کی ترقی بھی جاری رہے اور ان پر بے جا خوشامد اور حد سے بڑھی ہوئی اطاعت کا الزام بھی نہ آئے۔ حکام سے بھی ان کی رسم بنی رہے اور ہمسایوں سے بھی نہ بگڑے ...... سرسید کے کام کا اصل جانشین وہی شخص ہو سکتا ہے جو تقلید کی بندش سے آزاد ہو کر وقت کے حالات کے مناسب سیاسی رائے قائم کر سکے۔"

اس میں شک نہیں کہ اقبال کی جذباتی اپیل سے قائدِ اعظم نے احیائے اسلام کا کام لیا لیکن مجھے یہ کہنے کی بھی اجازت دیجئے کہ سرسید ہی کے سیاسی مشن کو قائدِ اعظمؒ نے آگے بڑھایا۔

فاضل دوست ممتاز احمد صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ "المیہ یہ تھا کہ مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کے اختتام اور انگریزوں کے سیاسی اقتدار کے آغاز کی درمیانی مدت میں مسلمانوں کے اندر سے کوئی ایسا رجلِ رشید پیدا نہ ہوا جو ایک کی تعمیر اور دوسرے کی تخریب کے اصل وجوہ سے باخبر ہوتا اور تہذیبی انتشار کی اس فضا میں مسلمانوں کے لئے ایک ایسا لائحہ عمل تجویز کرتا جو انہیں غیر ملکی استحصال کے خلاف سینہ سپر ہونے اور دینِ حق کا علمبردار ہونے کی راہ دکھاتا۔"

میں یہاں ممتاز صاحب سے ایک جزوی سا اختلاف کروں گا۔ میرے نزدیک مسلمانوں کے زوال اور انگریزوں کے سیاسی اقتدار کا آغاز اورنگ زیب کی وفات کے بعد ہوگیا تھا اور تہذیبی و سیاسی انتشار اپنے عروج پر پہنچ چکا تھا۔ تمام ہندوستان میں طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی۔ مسلمان ایک طرف افلاس و ناداری کا شکار تھے اور دوسری طرف علماء و مشائخ کی ہوس کے پنجوں میں اسیر تھے اور اسلامی شعائر یا اسلامی نظام کا کوئی تصور مسلمانوں میں باقی نہیں رہا تھا۔ جو حالت امام ابن تیمیہؒ کے عہد میں مصر و حجاز کی تھی، وہی کیفیت اس وقت ہندوستان کی تھی۔ شاہ ولی اللہؒ نے اس پرفتن دور میں اسلام کی تجدید اور اس کے نصب العین کے احیاء کی تحریک شروع کی۔ شاہ صاحب نے معاشرت، سیاست، اقتصادیات، شرائع و قوانینِ اسلامی اور جہاد کے مسئلہ پر کئی کتابیں تصنیف کیں۔ مسلمانوں کی ظاہری و باطنی خرابیوں کو بیان کیا اور انہیں ترویجِ علمِ دین و تہذیبِ سیرت کے ساتھ ساتھ سیاست دانی اور نظم و نسقِ ملکی کا درس بھی دیا۔ حتیٰ کہ مرہٹوں کا زور ختم کرنے کے لئے انہوں نے احمد شاہ ابدالی کو بھی دعوت دی۔ شاہ ولی اللہ کے بعد ان کے چاروں صاحبزادے علم و دین کے آفتاب بن کے چمکے اور انہوں نے اپنے اپنے دائرے میں احیائے دین کی انتھک کوششیں کیں۔ شاہ عبدالعزیز علماء میں اپنی دیانت داری اور روشن خیالی کے اعتبار سے بہت ممتاز تھے۔ آپ کے زمانے میں انگریزوں کا تسلط دہلی سے کلکتہ تک ہو چکا تھا اور اسی زمانے میں آپ نے فتویٰ دیا تھا کہ ہندوستان کے جتنے حصے غیر مسلم طاقت کے قبضے میں آچکے ہیں وہ سب دارالحرب ہیں یعنی ان میں مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کے درمیان حالتِ جنگ قائم ہے اور مسلمانوں کو اپنا نظم قائم رکھنے کے لئے جدوجہد کرنی چاہیے۔ شاہ ولی اللہ کے دوسرے اور تیسرے بیٹے شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر تھے جنہوں نے قرآن مجید کا اردو میں ترجمہ کر کے، قرآنی مطالب کو عوام تک پہنچانے کی سعادت حاصل کی۔ شاہ صاحب کے چوتھے فرزند شاہ عبدالغنی اگرچہ گوشہ نشین بن کر درس و تدریس میں مصروف رہے لیکن ان کے بیٹے شاہ اسماعیل، شاہ ولی اللہ کے علوم پر حاوی ہو کر عوام کی ہدایت میں عمر بھر مصروف رہے بلکہ سید احمد شہیدؒ کی "تحریکِ جہاد" میں شریک ہو کر پشاور کے علاقے میں خلافتِ راشدہ کی طرز پر حکومت قائم کی۔ سید احمد شہیدؒ کی حکومت میں شراب، افیم، بھنگ وغیرہ کی دکانیں بند ہو گئیں۔ فاحشہ عورتیں اپنا پیشہ چھوڑ کر بھاگ گئیں، دختر فروشی کا سدِ باب ہوا اور قرونِ اولیٰ کا نقشہ نظر آنے لگا لیکن پشاور کے سردار کی غداری نے سید احمد شہیدؒ کو اپنا مستقر تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا اور اسی منتقلی میں آپ بالاکوٹ میں شہید کر دیئے گئے۔

خاندانِ ولی اللّٰہیؒ کی داستان صرف یہ بتانے کے لئے بیان کرنی پڑی کہ مسلمانوں کے زوال اور انگریزوں کے اقتدار کے آغاز کے وقت کئی شخصیتیں اور کئی تحریکیں پیدا ہوئیں جو مسلمانوں کو ان کی نکبت و پستی کا احساس دلانا چاہتی تھیں۔ مسلمانوں کی حکومت ابھی قائم تھی لیکن یہ شخصیتیں اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ سرسید احمد خاں کے وقت تو حکومت بالکل چھن چکی تھی۔ اس وقت اگر کوئی مجاہدانہ عزائم رکھنے والی شخصیت پیدا ہو بھی جاتی تو اس کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ مادی وسائل تو رہے ایک طرف، قوم کا اخلاقی سہارا اور تعاون حاصل ہونا بھی ناممکنات میں سے تھا۔ قومی و ملی فکر اور احساس منتشر ہو چکا تھا۔ اجتماعیت ٹکڑے ٹکڑے ہو چکی تھی، مختلف محاذوں پر پے در پے شکستیں ہوئی تھیں۔ بالاکوٹ میں اسلام کے گنے چنے مجاہدوں اور حریت پسندوں کو تو تمام کر ہی دیا گیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے خونیں حادثے نے مسلمانوں کا رہا سہا دم خم بھی ختم کر دیا۔ اسلام کے نام لیواؤں کا نام تک برصغیر کی سرزمین سے مٹانے کے لئے طویل المیعاد منصوبے بنائے گئے۔ ترقی کے تمام دروازے ان پر بند کر دیئے گئے۔ بڑے بڑے عہدوں کے حصول میں ہندو پیش پیش تھے۔ عیسائی مشنریوں نے کھلم کھلا، بزعم خویش، اسلام کی بنیادوں کو مسمار کرنا شروع کر دیا۔ اور نتیجتاً مسلمانوں کی انگریزوں سے نفرت بڑھتی گئی اور انگریز حکام اور مسلمانوں میں اختلاف و تعصب کی خلیج گہری ہوتی چلی گئی اور ہندو اس سنہری موقعہ سے فائدہ اٹھاتا رہا۔ مسلمان کچھ دن اور اسی خوابِ غفلت میں رہتے تو یقیناً ایک قوم کی حیثیت سے اسی گوشہ بدنامی میں دم توڑ دیتے لیکن افلاس و بیکسی

کے اس دور میں سرسید احمد خاں آگے بڑھے اور عملی حیثیت سے مسلمانوں کے لئے منتہائے زندگی متعین کرنے کی کوشش کی ـــــــ یہ درست ہے کہ سید احمد شہیدؒ کی تحریک ہندوستان میں احیائے اسلام کی غالباً پہلی عملی تحریک تھی جو ایک نظام کے ماتحت عوام کو ساتھ لے کر شروع کی گئی تھی جو اگرچہ ناکام ہو گئی لیکن اس ناکامی سے ایک سبق ملا کہ سب سے پہلے عوام کی ذہنیتوں میں انقلاب پیدا کرنا ضروری ہے (مولانا حالیؔ اور رام بابو سکسینہ دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ "سرسید کی جرأت اور بلند ہمتی کا سرچشمہ سید احمد شہیدؒ کی تحریریں اور تقریریں ہیں") اور اس غرض کے لئے سرسید احمد نے تعلیم کا راستہ منتخب کیا۔ انہوں نے قوم کی اندرونی سیرت میں انقلاب پیدا کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ وقتی طور پر اور مصلحت کے تحت انہوں نے انگریزوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات بھی قائم کئے۔ یورپ کا سفر کیا اور بحرِ علم و حضارت میں غوطہ لگانے کے بعد جب وہ کنارے پر آئے تو ان کی مٹھیاں لعل و مرجان سے بھری ہوئی تھیں۔ سرسید مغربی قوموں کی ترقی اور اپنی قوم کے زوال کے اسباب تلاش کر کے لائے۔ انگریزوں کے گھر کا بھیدی بن کر، انہوں نے مسلمانوں کو ان راستوں پر چلایا جو انہیں کامیابی و کامرانی اور فلاح و بہبود کی منزل کی طرف لے جا سکتے تھے۔ اس کے لئے سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کے مذہب، سیاست، معاشرت اور ادب میں انقلابی رُوح پیدا کرنے کی کوشش کی۔ زنگ خوردہ عقیدوں کی کال کوٹھڑیوں پر پڑے بھاری تالوں کو توڑا اور مسلمانوں کو جدید تعلیمی تقاضوں کی اہمیت سے آگاہ کیا۔ سرسید کی خدمات پر سیاہی پھیرنے والے لوگوں کو "یک بیں اور یک اندیش" ہی کہا جا سکتا ہے جو ان سیاسی و معاشرتی حالات کو پیشِ نظر نہیں رکھتے جن کا ان دنوں مسلمانوں کو سامنا تھا۔ اگر تعصب کی پٹی آنکھوں سے اتار دی جائے تو صاف نظر آئے گا کہ سید صاحب کی ساری زندگی انگریزی استعماریت کی عمارت کی بنیادیں کمزور کرنے میں صرف ہوئی ہے لیکن اس کے طریقے انہوں نے ذرا عام روش سے ہٹ کر اختیار کئے تھے ـــــــ انہیں کے قائم کردہ کالج سے تحصیلِ علم کرنے والوں نے انگریزی استعمار کے ایوانوں میں زلزلہ پیدا کر دیا ـــــــ قدیم علماء کی تحریکوں نے انگریزی سیاست کا بال تک بیکا نہ کیا۔

مسلمان محض مجاہدانہ نعروں اور کشت و خون سے اپنا مقصد تا قیامت حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ ان کو قانونی اور فکری تربیت کی ضرورت تھی کہ انگریز کی عیار سیاست کا انہی کے ہتھیاروں سے قلع قمع کر سکیں۔ سرسید نے مسلمانوں کو انگریزوں کے جال میں پھنسانے کی بجائے انہیں ایسے ذرائع بتائے جن کے استعمال سے وہ ذلت آمیز غلامی سے نجات حاصل کر سکیں۔ انہوں نے مسلمانوں کو ہندوؤں کی سیاسی چالوں سے آگاہ کیا اور کانگرس کی سیاست میں ملوث ہونے سے بچایا (غدر میں کیا ہوا؟ ہندوؤں نے شروع کیا، مسلمان دل جلے تھے وہ بیچ میں کود پڑے۔ ہندو تو گنگا نہا کر جیسے تھے ویسے ہی ہو گئے مگر مسلمان اور مسلمانوں کے خاندان تباہ و برباد ہو گئے" (سرسید) اپنی تحریروں اور تقریروں سے انگریزوں پر دو قومی نظریہ کی اہمیت واضح کی۔ حقیقت میں جداگانہ انتخاب کا ابتدائی تصور سرسید ہی نے پیش کیا۔ مسلمانوں کو سرکاری ملازمتوں میں حصہ دینے کا مطالبہ کیا اور انہیں من حیث القوم کانگرس سے الگ رکھا۔ اس کے برعکس انہیں تعلیمی طور پر اس قابل بنانے کی کوشش کی کہ اپنی بساطِ سیاست الگ بچھا سکیں۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام علی گڑھ تحریک کا منطقی نتیجہ تھا اور پاکستان دراصل سرسید کی تحریک کا انتہائی مقام ہے۔ سرسید احمد خاں جس زمانے کی پیداوار تھے اس کو دیکھتے ہوئے یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ مشرقی تہذیب کے نہ دشمن تھے نہ مضحکہ اڑانے والے، بلکہ وہ مشرقی اور مغربی تہذیب کے بہترین عناصر کو ایک دوسرے میں سمو دینا چاہتے تھے تاکہ مسلمان مستقبل کے تقاضوں کا ساتھ دینے کے ساتھ ساتھ اپنے ماضی سے بھی وابستہ رہیں۔ حالات نے انہیں ایسا کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ پھر بھی انہوں نے ہنگامی حالات کے پیشِ نظر جو کچھ کیا وہی بعد میں مسلمانوں کی زندگی کی اساس قرار دیا۔ "شعرِ اقبال" کے مصنف نے ایک جگہ اسلام اور جدید تقاضوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی ضرورت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے ـــــــ

"ذرا غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اقبال نے دراصل سرسید اور حالیؔ کے کام کی تکمیل کی۔ سرسید نے جس جدید علم کلام کی بنیاد رکھی تھی اور جس

کے خلاف شدید قسم کا ردِ عمل پیدا ہوا تھا اس کو ملحوظ رکھ کر اقبال نے یہ محسوس کیا کہ دینی معاملات میں فکر کے اندازِ جدید کی ضرورت ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال وجدان کو عقل پر ترجیح دیتے ہیں لیکن وہ یہ بھی نہیں کہتے کہ وجدان اور فکر میں کوئی بنیادی تضاد ہے یا کوئی ناقابلِ عبور خلیج ہے، در اصل عقل اور وجدان مل کر مشاہدۂ حقیقت کا نہایت اچھا وسیلہ بن جاتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اقبال نے اسلام کے مذہبی افکار کی تشکیلِ جدید پر جو خطبات دیئے ہیں وہ در اصل جدید علمِ کلام کا کامل ترین نمونہ ہیں۔ دیباچہ میں اقبال نے تصریح کی ہے کہ میرا مقصد یہ ہے کہ دینِ اسلام کی حقیقتوں کو اس طرح پیش کیا جائے کہ اسلام کی روایات بھی محفوظ رہیں اور جدید افکار سے ان حقیقتوں کا اثبات بھی ہوتا ہے قدیم اور جدید کا امتزاج ہی سرسید کے پیشِ نظر تھا اور یہی بات اقبال کے ملحوظِ خاطر تھی۔ فرق یہ ہے کہ سرسید مغربی فلسفہ سے ناآشنا ہونے کے باعث جدید علمِ کلام کی فلسفیانہ بنیاد استوار نہ کر سکے۔"

ممتاز احمد صاحب نے مسلمانوں کی طرف سے تہذیبی دائرے میں ہتھیار پھینک دینے پر بڑے افسوس کا اظہار کیا ہے اور سرسید کو مطعون کرنے کی سعی فرمائی ہے۔ اس امر پر تو بحث ہو چکی ہے کہ انگریزوں سے تعاون میں سرسید کی کیا مصلحتِ قومی پوشیدہ تھی البتہ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آسکی کہ اس وقت کی تنگِ قوم تہذیب کے وہ کون سے حسین پہلو ہیں جو ممتاز صاحب کے دل کو بھا گئے ہیں اور ان کی بربادی پر وہ یوں بے کلی محسوس کر رہے ہیں۔ جہاں تک مذہب کا تعلق ہے اس کا احترام مسلمانوں کے دل میں ہمیشہ رہا ہے اور سرسید کے وقت بھی اللہ اور اس کے رسول کے نام سے وابستگی نے مسلمانوں کے ملی شعور کی بنیاد کو یکسر مسمار ہونے سے بچایا ہوا تھا۔ خود سرسید نے ایک دوست کو لکھا: "خدا سب مسلمانوں کا خاتمہ "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ" پر کرے۔ صرف یہی ایک چیز تمام مشکلوں کی مشکل کشا ہے۔" لیکن مسلمانوں کی عملی زندگی میں مذہب کی صحیح روح کو کس قدر عمل دخل حاصل تھا؟ اور پھر دین کے اصلی مدعا و مفہوم کا شعور کہاں موجود تھا؟ عام مسلمان شرک و بدعت اور اوہام پرستی کی دلدل میں غرق تھے۔ معاشرتی اور تمدنی زندگی کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ مسلمان اپنی قدامت پرستی اور جھوٹی عصبیتوں کی بنا پر ہر نئے خیال اور ہر نئی تحریک سے بدکتے تھے۔ حکمران طبقہ کے شب و روز شراب اور عورت کی ہوس ناکیوں میں ڈوبے ہوئے تھے ۔۔۔ کیا یہی اسلامی تہذیب کے دائرے تھے جن میں اصلاح کی کوشش کرنے پر سرسید کو مجرم ٹھہرایا جاتا ہے؟ زوال پذیری کے اس عہد میں ہماری ملی روایات اور قومی عظمتیں کیا تھیں؟ ـــــ دلی، اودھ اور لکھنؤ میں بالخصوص مسلمانوں کے بانکپن، وضعداری، بہادری اور عالی حوصلگی نے دم توڑ دیا تھا اور توجہ شمشیر و سناں سے ہٹ کر طاؤس و رباب کی طرف مبذول ہو رہی تھی۔ "شعرِ اقبال" میں اس اسلامی تہذیب کے بڑے عبرتناک نقشے جمع کئے گئے ہیں۔ ایک آدھ نقشے سے آپ بھی محظوظ ہو سکتے ہیں۔ نواب ذوالقدر نے "مرقعِ دہلی" کے نام سے فارسی میں ایک کتاب لکھی ہے جس میں محمد شاہ کے عہد کی دہلی کا نقشہ بڑی تفصیل سے کھینچا ہے۔ میر جعفر علی خاں ناظمِ بنگالہ کے فرزند ارجمند میرن کے ہاں مہینے کی گیارہویں تاریخ کو ایک محفل منعقد ہوتی تھی۔ حکیم سید مظفر حسین نواب ذوالقدر کی زبانی اس محفل کا ذکر یوں کرتے ہیں:

"تمام شہر کی زہرہ جبین نامور طوائفیں اور امارد ہائے رنگین کے ہجوم سے موصوف کا مکان گویا نمونۂ بہشتِ شداد بنا رہتا تھا۔ غرض اس محفل کا مرقع کھینچتے ہوئے اولاً میرن کی منکسر مزاجی، وسعتِ اخلاق، کثرتِ تواضع، مہمان نوازی، سلیقۂ بزم آرائی، اربابِ رقص و نشاط سے ربط و ضبط حسینوں، مہ جبینوں کی تسخیر اور اس خصوص میں موصوف کی بزاقی اور وزیر الممالک کے مزاج میں در خور اور رسوخ پانے کا اظہار کرتے ہوئے وزیر الممالک کی بادہ خواری اور حسن پرستی کا صاف صاف الفاظ میں تذکرہ کیا ہے۔"

واضح رہے کہ نواب ذوالقدر کی کتاب میں میرن کی محفل کا ذکر مشائخ کے ذکر کے سلسلے میں آیا ہے۔ مشائخ کی محفل کا یہ حال تھا تو عام لوگوں کی کیا حالت ہوگی، اس کا آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ دہلی کی "سرائے عرب" ربیع الاول کی بارہویں کو مولود کی محفل منعقد ہوتی تھی۔ محمد شاہ کے عہد تک یہ مقام عربوں ہی کی بود و باش کے لئے مخصوص تھا۔ نواب صاحب اس محفل کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"شوقین مزاج علی سلیمان عرب کی نظارہ بازی کے لئے حاضر ہوتے تھے۔"

اربابِ طرب کا ذکر کرتے ہوئے نواب صاحب نے جہاں مختلف سازنوازوں کا ذکر کیا ہے وہاں نقالوں، امردوں اور طوائفوں کا ذکر بھی موجود ہے۔

"قابلِ لحاظ یہ امر ہے کہ جو بھی جس فن کا ماہر ہے وہ اس فن میں کامل اور یگانۂ روزگار ہے ــــ مثلاً ایک طوائف کے حالات میں لکھا ہے کہ جب محفل میں آتی پاجامہ نہیں پہنتی تھی، بجائے اس کے ...... بدن کو اس خوبی سے رنگنی اور نقش و نگار سے آراستہ کرتی گیا گلبدن یا کمخواب کا پاجامہ پہنے ہوئے ہے۔"

محمد شاہ سے بہادر شاہ ظفر تک جتنے سال گذرے وہ روز افزوں انحطاط کے تھے۔ قدیم تمدن اور معاشرت کی بساط بالکل تہ ہو چکی تھی اور دہلی والے زندگی سے لذت کا آخری قطرہ تک نچوڑ لینا چاہتے تھے۔ راشد الخیری کی "نوبت پنج روزہ" ناصر نذیر فراق کی "لال قلعے کی ایک جھلک" ــ اور وزیر حسن دہلوی کی "دلی کا آخری دیدار" ــــ ان سب کے مطالعہ سے یہی پتہ چلتا ہے کہ اور سب کچھ تھا لیکن اسلام باقی نہیں رہا تھا۔ اسلام محدود تھا مزاروں اور قوالیوں تک اور وہ بھی ہندوؤں کے اشتراک کے ساتھ۔ وزیر حسن دہلوی لکھتے ہیں:

"بارہ وفات کے آتے ہی جابجا قوالی کی دھوم مچی، مزاروں پر قوال بیٹھے گا رہے ہیں ...... رمضان شریف آیا، اس کا پوچھنا ہی کیا۔ یہ تو ایک مہینے، کچھ دن کا تہوار تھا ...... دیوالی آئی، جابجا نوبت، نقارے، روشن چوکی بج رہی ہے۔ بادشاہ سونے چاندی میں تلے ..... رہی ہولی تو یہ بھی بھانت بھانت کے سانگ سے دل لگی کی چیز بن جاتی ہے۔ جابجا طائفے ناچ رہے ہیں۔ بادشاہ تشریف فرما ہیں چار کا فرادائیں بھر بھر پچکاریاں ایک دوسرے پر ڈال رہی ہیں۔ چار ناچ گا رہی ہیں:

ندی کنارے دھوبی دھوئے چولی کے دو بند — رنگ میں کیسے ہولی کھیلوں گی سانوریا کے رنگ
رنگ میں کیسے ہولی کھیلوں گی سانوریا کے سنگ — کسی پاپی کی نجر پڑی تو چولی ہو گئی تنگ

ظہیر دہلوی، دہلی کی ایک صبح کی تصویر کھینچتے ہیں:

"لاہوری دروازے نگر موت کے گھاٹوں تک حسن کا دریا لہریں لے رہا ہے۔ چاندنی چوک کی سڑک کہکشاں بنی ہوئی ہے، ہزاروں چاند کے ٹکڑے ستاروں کی طرح جگمگاتے چلے آتے ہیں۔ جس کو دیکھو آفت کا پرکالہ ہے، ایک سے ایک اعلیٰ ہے۔ سینکڑوں پرستان کی پریاں، سو تواں نقشے، چاند سے چہرے، چھریرے بدن، نازک اندام، گلفام، سرو قامت، سیاہ پتلی، سیاہ بال، ابھرے ابھرے ہوئے سینے، ہرن کیسی آنکھیں، چیتے کیسی کمریں، سر سے پاؤں تک چاندی سونے میں لدی پھندی چلی آتی ہیں۔ کامدانی اور تن زیب کے دوہرے دوپٹوں میں سے کندن سی بدن کی رنگت پھوٹی پڑتی ہے ؎

کیا بدن کا رنگ ہے، تہ جس کی پیراہن پہ ہے — کیا تن نازک ہے جاں کو بھی حسد جس تن سے ہے

اودی اور سرمئی اطلسوں کے گھیر دار لہنگے، جوڑی چوڑی ٹھپے کی سنجاف، پور پور طلائی انگوٹھی، چھلے، نازک نازک پتلی حنائی انگلیوں میں چھوٹی چھوٹی گنگا جلیاں ؎

جس بیگنہ کے خون میں چاہیں ڈبو لیاں — کیا چاہیے انہیں سرِ انگشت پر حنا

گوری گوری پیشانیوں پر کچھ کچھ بکھرے ہوئے بال، نیند بھری آنکھوں میں پھیلا ہوا کاجل، پتلے پتلے سرخ سرخ ہونٹوں پر

پھیکی پھیکی مستی کی دھیمی دھیمی دکھ بنا دے رہی ہے:

یہ شہر وہ ہے کہ غنچہ تھا حسن والوں کا — یہ شہر وہ ہے کہ تختہ تھا نونہالوں کا

یہ شہر وہ ہے کہ مجمع تھا مہ جمالوں کا — یہ شہر وہ ہے کہ مرجع تھا ذی کمالوں کا

یہ وہ زمیں ہے زمیں جس کی زر اگلتی ہے — یہ خاک وہ ہے کہ اکسیر ہاتھ ملتی ہے"

منشی فیض الدین مرحوم نے دہلی کے آخری دو بادشاہوں کا طریقِ معاشرت بیان کرتے ہوئے کھانوں کے نام کی جو فہرست دی ہے وہ دو صفحات میں سمائی ہے۔ اس طرح رنجگے کے سلسلے میں مسالحہ، رنگ، گہنے اور جوتیوں کی تفصیل نے بھی دو صفحے گھیرے ہیں۔

نواب اودھ سعادت علی خاں بڑے سنجیدہ مزاج فرمانروا تسلیم کئے جاتے ہیں لیکن انشاء نے سعادت علی خاں کے جو لطیفے "لطائف السعادت" کے نام سے جمع کئے ہیں، ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جن کے نقل کرنے سے تہذیب مانع ہے۔ رنگیلے پیا جانِ عالم کو جب معلوم ہوا کہ انگریزوں کے ایما کے بغیر اودھ کا بادشاہ کچھ نہیں کر سکتا تو وہ بھی فنونِ لطیفہ کی تربیت میں لگ گئے۔ "گذشتہ لکھنؤ" کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحبِ سیف و قلم خاندان بھی مرغ بازی، بٹیر بازی، کبوتر بازی، پتنگ بازی میں مصروف ہو گئے۔ فسانۂ آزاد، شامِ اودھ اور امراؤ جان ادا اس معاشرت کا صحیح نقشہ پیش کرتی ہیں۔ جاگیرداروں، نوابوں اور ان کے مصاحبوں کا محبوب ترین شغل یہ تھا کہ چوک کی کسی خوبرو اور خوش گلو ڈیرے دار طوائف سے آنکھیں لڑائیں اور پھر اس کے عشق میں مبتلا ہو کر گھر بار گنوائیں۔ سرشار کے ناول "جامِ سرشار" میں چوک کی نازنینوں نے شرفا کو جس طرح تباہ کیا ہے اس کی بڑی عبرت انگیز تفصیلات ملتی ہیں۔ نواب مرزا شوق کی مثنویوں کے مطالب پر غور کیا جائے کہ ان مقامات سے کیا کام لیا جا رہا ہے جن سے مذہبی تقدس اور احترام کے تصورات وابستہ ہیں۔ اس مثنوی کے مطالعے سے یہ نظر آتا ہے کہ لکھنؤ کا مرد ہی تماش بین نہ تھا بلکہ کھاتے پیتے متوسط گھرانوں کی عورتیں بھی تماش بین تھیں۔ لکھنؤ کی عورتوں میں عشقِ یک جنسی کا مرض بھی راہ پا گیا تھا۔ ریختی مختلف جنسی کج رویوں کے اظہار کا وسیلہ تھا۔ غالب جیسے دو ایک بڑے شعراء کو چھوڑ کر ہندوستان کے باقی تمام شعرا جنسی عوامل اور محرکات کی تصویریں کھینچتے تھے۔

یہ تھیں وہ تہذیبی قدریں جن کی اصلاح و تجدید کا بیڑہ بعد میں سر سید احمد خاں نے اٹھایا۔ ان کی تطہیری مہم مسلمانوں کی اجتماعی اور انفرادی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی تھی۔ سر سید معصوم نہ تھے ان سے غلطی کا احتمال بھی تھا لیکن حالی کے اس خیال سے اتفاق کرنا ہی پڑتا ہے کہ "سر سید کا کوئی کام سچائی سے خالی نہ تھا۔" میں سمجھتا ہوں کہ سر سید کا یہ ایک کارنامہ ہی ان کی عظمت کو دوام بخشنے کے لئے کافی ہے کہ انہوں نے اردو زبان کو عشق بازی سے نکال کر جدید افکار کی اشاعت کا ذریعہ بنایا اور مسلمانوں کو سمجھایا اور عمل کر کے دکھایا کہ اردو ہی تمہاری قومی زبان ہے اور اسی زبان کے ذریعے وہ علمی کارنامے سرانجام دے سکتے ہیں۔ "تہذیب الاخلاق" کے ایک شمارے میں سر سید نے اپنی تحریکِ اصلاح و تجدید کے مقاصد کی تفصیل یوں بیان کی ہے:

اوّل: آزادیِ رائے۔ مسلمانوں کی رائے اور ان کے خیالات ہر ایک امر میں تقلید کرتے کرتے ایسے پست و پامال ہو چکے ہیں جس کے سبب کسی قسم کی ترقی کی تحریک ان میں نہیں ہوتی۔ پس جب تک رائے کی آزادی ان میں پیدا نہ ہو گی اس وقت تک ان میں تہذیب نہیں آنے کی۔

دوم: درستیِ عقایدِ مذہبی۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے عقاید مذہبی جو ان کی کتابوں میں لکھے ہیں وہ اور ہیں اور جو ان کے دلوں میں ہیں اور جن کا یقین انہیں بیٹھا ہوا ہے، وہ اور ہیں۔ ہزاروں عقائدِ شرکیہ ان کے دلوں میں ہیں۔ پس ان کی تہذیب کرنا اور اپنے عقاید کو ہیئتِ اسلام کے مطابق کرنا اور اسی پر یقین رکھنا تہذیب و شائستگی حاصل کرنے کی اصل جڑ ہے۔

سوم: خیالات و افعالِ مذہبی۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں صدہا خیال اور توہمات ایسے موجود ہیں جن کو وہ عمدہ افعال مذہبی سمجھ کر ادا کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کو مذہب اسلام سے کچھ علاقہ نہیں ہے۔ یا تو وہ خود بدعت ہیں یا رسومات و خیالاتِ کفر و شرک ہیں جو باعث ہمارے نامہذب ہونے کے ہیں پس ہم کو مہذب ہونے کے لئے ان کی تہذیب درکار ہے۔

چہارم: تدقیق بعض مسائلِ مذہبی۔ ہمارے مذہب کے بعض صحیح اور اصلی مسائل ایسے ہیں جن کی پوری پوری تحقیق و تدقیق اب تک نہیں ہوئی ہے۔ اور اگرچہ مسائل فی نفسہٖ صحیح اور درست ہیں۔ الّا بیان واضح اور تحقیق کامل نہ ہونے کے سبب علومِ عقلیہ کے برخلاف تہذیب و شائستگی کے مخالف معلوم ہوتے ہیں۔ پس ہم کو ان کی تشریح و تفسیر میں تہذیب کرنی چاہیے۔

پنجم: تصحیح بعض مسائلِ مذہبی۔ ہم کچھ شک نہیں کرتے کہ بعض مسائل ایسے بھی ہیں یا یوں کہو کہ بعض ایسے مسائل کا ہونا ممکن ہے جن میں متقدمین نے غلطی کی ہو۔ پس ان کو بحث میں لانا اور ایک امرِ منقح ٹھہرانا ہمارے لئے ضروری ہے۔

ششم: تعلیم اطفال۔ مذہب کے بعد جو چیز سب سے زیادہ ضروری ہے، وہ تعلیم ہے۔ ہم کو زمانہ گذشتہ و حال پر نظر کر کے ایک ایسا طریقۂ تعلیم معین کرنا چاہیے جس سے علومِ دینی و دنیوی دونوں قسم کی تعلیم کا اعلیٰ درجے تک ہم کو قابو ملے۔

ہفتم: سامانِ تعلیم۔ ہمارے لئے صرف طریقۂ تعلیم کا سبق معین کرنا کافی نہ ہوگا بلکہ آپس کی محبت اور مجموعی ہمت اور فیاضی سے اس کا سامان بھی مہیا کر نا دینا ضروری ہوگا۔

ہشتم: عورتوں کی تعلیم۔ کچھ شبہ نہیں کہ قومی تہذیب اور شائستگی کے لئے عورتوں کا تعلیم یافتہ ہونا ضرور ہے پس ہم کو اپنی لڑکیوں کی تعلیم کے لئے اور ان کو دستکاری سکھانے کے لئے عمدہ بندوبست کرنا چاہیے۔

نہم: ہنر و فن و حرفہ۔ اپنی قوم میں ہر قسم کے ہنر اور صنعت اور فن و حرفہ کو پھیلانا اور ترقی دینا قومی تہذیب کا ایک بہت بڑا جزو ہے۔

اس کے بعد اخلاق، معاشرتی اور معاشی زندگی کی بیس اور شقوں کا ذکر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سرسید علمی اعتبار سے شاہ ولی اللہؒ کے مقابلے میں کوئی خاص حیثیت نہیں رکھتے تھے، احوال و ظروف کی مجبوری کے علاوہ انگریزی علم و تمدن سے بھی مرعوب تھے لیکن اصلاح و تجدید کا جو پروگرام سرسید احمدؒ نے پیش کیا وہ شاہ ولی اللہ کے پروگرام سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھا اور اس میں بھی شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ سرسید نے ڈوبتی ہوئی قوم کو سہارا دیا اور مسلمانوں کو غیر مسلم اکثریت اور غیر مسلم حکومت دونوں کے مقابلے کے قابل بنایا۔ مسلمانوں پر سرسید کے احسانات کا اعتراف ساری دنیا نے کیا ہے۔ سر طامس نے ایک تقریر میں کہا۔ "یہ شخص جسے آپ رو رہے ہیں۔ نہ اس کے پاس رہنے کو گھر تھا نہ مرنے کو۔ پھر بھی اس نے آپ کے لئے ایک دولت اور ایک مثال ایسی چھوڑی ہے کہ اگر آپ نے اس کی پیروی کی تو وہ آپ کے اور آپ کی اولاد کے قبضہ میں سب سے بڑی دولت ہوگی۔" انگریزی روزنامہ پائنیر نے لکھا۔ "سرسید کی وفات کے ساتھ نہایت مفید اور بار آور اور زبردست پولیٹکل طاقت کا خاتمہ ہوگیا۔ جس نے موجودہ صدی کے اخیر ربع میں ہندوستان کی اسلامی دنیا کو متحرک کر دیا۔" ٹائمز آف انڈیا نے لکھا۔ "ان کا خیال تھا کہ اسلام کو دوبارہ اس درجہ پر پہنچایا جائے جو بارہ صدی عیسوی میں علم و حکمت کا مرکز ہونے کی حیثیت سے اس کا تھا۔" لندن ٹائمز نے لکھا۔ "کسی اور نے ان کے کاموں کا دسواں حصہ بھی نہیں کیا۔" فرانس کے اخبارات کی رائے تھی کہ "اگر ہندوستان، انگلستان کے خون آشام استبداد کے آہنی چنگل میں نہ ہوتا تو سرسید کی بے نظیر اور بے لوث عام سیاسی خدمات کے بعد جمہوریہ ہو جاتا۔ اور سید احمد اس کا پہلا اور شاید سب سے بہتر پریسیڈنٹ ہوتا۔" سرسید کی وفات پر مصر، جرمنی، آسٹریا، اٹلی، امریکہ، چین اور ایران کے اخبارات بھی ماتم سے گونج رہے تھے۔ خود قائداعظمؒ نے مارچ ۱۹۴۱ء میں کہا تھا۔ "علی گڑھ

مسلم ہند کا اسلحہ خانہ تھا اور اس کے طلبا بہترین سپاہی۔" حقیقت یہی ہے اور تمام سلیم الطبع اکابر نے اس امر کو تسلیم کیا ہے کہ تحریکِ پاکستان کا ابتدائی سرا تحریکِ علی گڑھ سے جا ملتا ہے۔ اس تحریک نے سرسید کی قیادت میں ہندوستان کے مسلمانوں کو ان کی شکست خوردہ ذہنیت اور بے عقلی سے نجات دلائی جو ۱۸۵۷ء کے بعد ان پر طاری تھی۔ مولوی عبدالحق کا خیال ہے کہ " حق یہ ہے کہ قومیت کا خیال بھی سرسید کا پیدا کیا ہوا ہے مگر اس کی زندگی کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قصرِ پاکستان کی بنیاد میں سب سے پہلی اینٹ اسی پیرِ مرد نے رکھی۔" مولانا ابوالکلام آزاد نے کہا۔" جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، بلا خوف اور ڈر کہا جا سکتا ہے کہ اس فیصلہ کن جنگ کا مردِ میدان وہی شخص تھا جو اس یونیورسٹی کے ایک گوشہ میں مدفون ہے۔ یہ جنگ اسی علی گڑھ میں لڑی گئی اور یہی علی گڑھ اس کی فتح مندی کا یادگاری منارہ ہے۔...... جدید ہندوستان کے بہترین مسلمان مصنف اسی حلقہ کے زیرِ اثر پیدا ہوئے اور یہیں نئے قسم کی اصلاحی تحقیق و تصنیف کی راہیں پہلے پہل کھولی گئیں۔ اردو کی نئی شاعری کی بنیاد اگرچہ لاہور میں پڑی تھی مگر اسے نشوونما یہیں کی آب و ہوا میں ملی اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ جلسوں میں نئی قسم کی نظمیں پڑھی جانے لگیں، اردو خطابت کی بھی پہلی درسگاہ یہی تھی۔ اس دَور کے تمام مشہور مقرروں کو اسی حلقہ نے پیدا کیا تھا۔ اور اگر پیدا نہیں کیا تو ان کے لئے پلیٹ فارم یہیں مہیا کیا گیا تھا۔" ایچ۔ اے۔ آر۔ گب علومِ شرقیہ کے مستند سکالر سرسیّد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔" ان کا اٹھایا ہوا خمیر پھیل چکا ہے اور آج اس مکتبِ خیال کے کتنے ہی لوگ ہیں جنہوں نے جدید باتوں کو اپنایا ہے۔ اور ماضی کی اہم چیزوں سے بھی رشتہ قائم کر رکھا ہے...... وہ یہ دکھاتے ہیں کہ اسلام ایک محدود اور غیر ترقی پسند عقیدہ نہیں ہے بلکہ ایک عالمگیر اپیل اور عملی دنیا سے ہم آہنگ ہونے کی قوت رکھتا ہے۔" خالدہ ادیب خانم نے اپنی کتاب INSIDE INDIA میں لکھا ہے۔" سرسید کے نقادوں کی تعداد ان کے مداحوں کی تعداد سے زیادہ ہے لیکن اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا اثر کتنا گہرا رہا ہوگا اور اب بھی ہے۔ سرسیّد نے اپنی تحریروں میں برطانوی حکومت پر کھلم کھلا تنقید کی ہے اور بتایا ہے کہ یہ حکومت احساسِ برتری کا شکار ہے۔" ایچ۔ جی۔ رالنسن سرسید پر ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔" بدنامی، مخالفت، گالیاں، جان لینے کی دھمکیاں کوئی چیز بھی ان کو اپنے ارادے سے باز نہ رکھ سکی تھی۔ انہوں نے مکمل غیر جانبداری سے انگریز افسروں کو ان کی بے نیازی اور اپنے ہم وطنوں کو ان کی تنگ نظری پر ملامت کی۔" سی۔ ایف اینڈریوز اور گریجا مکرجی کی مشترکہ کتاب " کانگرس کا ارتقاد فروغ" میں ایک جگہ یہ تحریر ہے " جب سرسیّد علی گڑھ کالج کی مسجد میں اپنی آخری آرامگاہ میں پہنچائے گئے تو ان کے ایک پرانے دوست نے مجھ سے کہا۔" ایک پوری قوم کو تنزل سے بچا لینا ایک پیغمبر کا کام ہے جبکہ دوسرے لوگوں نے صرف کتابیں لکھی ہیں اور تعلیمی ادارے قائم کئے ہیں۔ میرے خیال میں یہ رائے سرسید کی شخصیّت اور ان کے کام کا صحیح اعتراف ہے۔ میرا اپنا خیال ہے کہ میں ان سے بڑے آدمی سے نہیں ملا۔"

سرسیّد کے کارناموں پر "حیاتِ جاوید" میں مولانا حالی نے مفصل بحث کی ہے لیکن "حیاتِ جاوید" کا زیادہ ذکر ہم نہیں کرنا چاہتے کیونکہ حالی پر "مدلل مداحی" کرنے اور "کتاب المناقب" لکھنے کا الزام عاید کیا گیا ہے لیکن سرسیّد کے ایک بہت بڑے دشمن مولوی سیّد صدیق حسن خاں (جنہوں نے سرسیّد کو آخری زمانے کا دجال قرار دیا تھا) کے سگے بھائی کی رائے ضرور پڑھنی چاہیے۔ لکھتے ہیں: " اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ یورپ کے علوم جدیدہ کے مقابل میں سرسیّد مرحوم نے ایک جدید علم کلام کی بنیاد ڈالی اور انگریزی خواں تعلیم یافتہ گروہ کو ہاویۂ کفر و ارتداد میں گرنے سے بچا لیا" پروفیسر آرنلڈ کی رائے ہے کہ " ہندوستان میں ہم کو ایسے شخص کی مثال، جیسا کہ وہ تھا کہاں مل سکتی ہے کہ نہ جاہ و مرتبہ تھا، نہ دولت تھی۔ باوجود اس کے ہندوستان میں مسلمانوں کی قوم کا سردار بن کر ظاہر ہوا۔ یہ وہ رتبہ ہے جو اس سے پہلے کسی شخص کو بغیر تلوار کے زور کے حاصل نہ ہوا۔" سرسیّد کے ایک عقیدتمند جے کینڈی نے انہیں " عقل مند، معتدل، صاف گو، نڈر اور مضبوط" کے القاب سے یاد کرتے ہوئے لکھا ہے۔" جب سید صاحب نے کانگرس کی ایجی ٹیشن کے

خلاف مسلمانوں کی راہنمائی کی تو ان کی مقبولیت انتہائی نقطۂ عروج پہ پہنچ گئی۔ کانگرس کے تجویز کردہ بعض مطالبات مثلاً حکومت میں دیسیوں کو اور زیادہ حصّہ دینا وغیرہ ایسے تھے جن کے لئے کانگرس کے عالمِ وجود میں آنے سے پہلے خود سید صاحب کوشاں تھے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ کانگرسی تحریک ان کی طبیعت کے قطعی خلاف تھی۔ انہوں نے صاف طور پہ دیکھ لیا تھا کہ جمہوری پروگرام کے تحت مسلمانوں کو کیا کیا نقصانات پہنچیں گے کیونکہ وہ ایک ایسی اقلیت تھے جس کے اکثریت میں آنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ سید صاحب نے یہ امر بڑی شدت کے ساتھ اپنے ہم مذہبوں کے دل میں اتارا"

سالہا سال تک کانگرس کے پلیٹ فارم پر کام کرنے کے بعد، قائدِ اعظم کے دل میں اور اس سے پہلے اقبال کے دل میں یہی حقیقت اتری کہ کانگرس میں ہندوؤں کی اکثریت، مسلم اقلیت کو کسی صورت پنپنے نہیں دے گی۔ ہمارا تو علی وجہ البصیرت یہ ایمان ہے کہ سرسید نہ ہوتے تو علامہ اقبال اور قائدِ اعظم نہ ہوتے اور علامہ اقبال اور قائدِ اعظم نہ ہوتے تو ہم ایک آزاد قوم کی حیثیت سے عالمی نقشے پر کبھی نہ ابھر سکتے۔ اور یوں ہم سرسید کی تحریک کو جنگِ آزادی اور حصولِ پاکستان کی ایک نہایت اہم کڑی تسلیم کرتے ہیں۔

وارث میر

کہ چشمِ تنگ شاید ــــ!

اس بار فنون میں دو مباحث[1] پڑھ کر سانپ اور نیولے کی لڑائی کا مزا آگیا اور خصوصیت سے ممتاز احمد صاحب کے مضمون پر جو دو اختلافی مضمون نیچے شائع ہوئے ہیں ان سے تو یہ بات اور بھی واضح ہو جاتی ہے کہ فنون میں ایک دلچسپ بحث کا باب کھلنے والا ہے۔ ایک طرف جماعت اسلامی کا رکن اور دوسری طرف اشتراکیت کو حرفِ آخر سمجھنے والے حضرات اور جماعت اسلامی کے کٹر حریف ٹکرگئے ہیں۔ بحث کا آغاز دراصل مدیرِ فنون کے اس اختلافی نوٹ سے ہوتا ہے جو انہوں نے ممتاز احمد صاحب کے مضمون پر لگا کر دوسروں کو دعوت دی تھی کہ اس مسئلہ پر اظہارِ رائے کریں۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں مجھے اس جھگڑے کا دور ہی سے نظارا کرنا چاہیے تھا مگر ان دونوں تاثرات کو پڑھ کر جو ممتاز احمد صاحب کے مضمون کے سلسلے میں شائع ہوئے ہیں مجھے یہ خطرہ لاحق ہو گیا ہے کہ کہیں یہ مفید علمی بحث محض الزام تراشی یا من ترا حاجی بگویم ــــ تک نہ آجائے۔ اس سلسلہ میں کچھ گذارشات کرنا چاہتا ہوں تاکہ اس بحث کی کچھ حدود متعین ہو جائیں اور کہیں آخر میں خدانخواستہ روایت کے مطابق ایک امریکی ایجنٹ اور دوسرا روسی ایجنٹ نہ قرار دے دیا جائے۔

ممتاز احمد صاحب نے اپنے مضمون میں چونکہ سرسید کا ذکر پہلے کیا ہے اس لئے مجھے بھی انہیں کے بارے میں کہنا چاہیے گو کہ اس بحث میں سرسید کے سلسلہ میں جوابی تاثرات بعد میں چھاپے گئے ہیں۔

ریاض صدیقی صاحب کی خدمت میں پہلی عرض تو یہ ہے کہ سرسید سے اختلاف کوئی ممتاز احمد صاحب کی پہلی اور ذاتی اختراع نہیں ہے بلکہ یہ اختلاف سرسید کی زندگی ہی میں شروع ہو گیا تھا اور اختلاف کرنے والوں میں عام درسی خیال کے مطابق صرف و محض ملائے محض یا خالص علمی اداروں کے علماء نہ تھے بلکہ ایسے لوگ بھی تھے جو جدید علوم سے نہ صرف بخوبی آشنا تھے بلکہ ان کے پرجوش حامی بھی تھے اور ان میں بعض ایسے اور ممتاز اہلِ فکر بھی شامل تھے جو انگریزی زبان و ادب اور مغرب کی فکری تحریکوں سے نہ صرف سرسید سے زیادہ اور براہِ راست واقف تھے بلکہ انہوں نے یورپ میں تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ اسی کے ساتھ حکومتِ برطانیہ

---

[1] دوسری بحث کے سلسلے میں مصنف کے تاثرات "اختلافات" کے زیرِ عنوان ملاحظہ فرمائیے ــــ (ادارہ)

کے بڑے معزز اور وفادار عہدے دار بھی شمار کیے جاتے تھے اور صرف یہی نہیں کہ یہ اختلاف صرف وقتی ہو بلکہ پوری ایک صدی ہونے کو آئی مگر سرسیّد سے یہ اختلاف ہر دور میں جاری رہا اور ہنوز جاری ہے۔ ظاہر ہے کسی فکر یا شخصیت سے اتنا گہرا اور مسلسل ذہنی اختلاف محض ازراہِ تفنّنِ طبع نہیں ہو سکتا۔ یقیناً اس فکر میں کوئی نہ کوئی ایسی خامی یا تضاد ضرور ہو گا جس کی بنیاد پر پوری ایک صدی سرسید کی فکر سے اختلاف ہو رہا ہے۔ اور اسی بنا پر ہم اس تضاد یا ذہنی اختلاف کو غیر مخلص قرار نہیں دے سکتے۔

بنیادی سوال یہ ہے کہ وہ کونسا اساسی نکتہ ہے جس سے یہ اختلاف یا تضاد پھوٹتا ہے۔ اگر ریاض صدیقی صاحب زحمت کر کے سرسید کے حامیوں اور مخالفین کی تحریروں کا باقاعدہ اور غائر مطالعہ کریں تو سینکڑوں تاویلوں، متضاد طرزِ فکر، مختلف رویوں اور اس کے دلائل و براہین میں صرف ایک ہی سراغ ملتا ہے اور وہ یہ ہے کہ سرسید کی طرزِ فکر سے ایک صدی تک یہ حذر اس لئے ممکن ہو سکا کہ بنیادی طور پر سرسید نے اسلام کی ترقی کی بہت کم اور مسلمانانِ برصغیر کی ترقی کی بہت زیادہ کاوش کی تھی۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جہاں تک صرف مسلمانوں کا من حیث القوم تعلق ہے، سرسیّد نے ان کی فلاح و بہبود اور ترقی کا جو راستہ متعین کیا تھا وہ برصغیر کے مخصوص حالات میں ایک نقطۂ نظر کی روشنی میں سب سے زیادہ فائدہ مند ثابت ہوا اور یہی نکتۂ نظر آج تک سرسیّد کے حامیوں کی شکل میں موجود ہے۔ لیکن اہلِ نظر یہ خوب جانتے ہیں کہ اسلام کی ترقی اور مذہب کا فروغ برصغیر کے مسلمانوں کی ترقی کے ہم معنی نہیں ہے۔ فکری سطح پر سرسیّد کے پورے مشن میں یہی وہ تضاد ہے جو متضاد زاویۂ نظر رکھنے والوں کو برابر نظر آ رہا ہے اور آج بھی اسی طرح برقرار ہے۔ اگر سرسیّد کی طرزِ فکر کسی تضاد یا الجھاؤ سے خالی ہوتی تو آج اتنا زمانہ گزر جانے کے بعد اور سرسیّد کے مشن کی اتنی کامیابی کے بعد یہ فکری تضاد اصولی طور پر باقی نہیں رہنا چاہیے تھا۔ گویا اسلام کو نظریۂ حیات ماننے والے حضرات (خواہ اسلام آپ کی یا میری نظر میں کتنا ہی کار از رفتہ ہو چکا ہو) سرسیّد کی اسلامی تاویل کو مذہبی یا صحیح اسلامی فکر نہیں سمجھتے۔ وہ سرسید کی تمام اسلامی اور مذہب کی جدید تاویلات کو برصغیر کی ایک ایسی قوم کے بچاؤ کے لئے جو خود کو مسلمان کہتی ہے۔ مغربی تہذیب میں پیوند کرنے کی ایک سوچی سمجھی اسکیم کا نتیجہ سمجھتے ہیں نہ کہ اسلامی فکر کی کامیابی۔ جس سے نظریاتی سطح پر یقیناً اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ جب بھی اسلام کو ایک حرکی تصوّر ماننے والوں نے اسلامی نظریہ پر سوچا ہے، انہیں سرسید سے اختلاف ہوا ہے اور یہ ایک اتنا واضح اور فطری ذہنی عمل ہے جو سرسیّد کی زندگی سے لے کر آج تک ایک زندہ موضوع اور مسئلہ بنا ہوا ہے ــــــ یہی وہ اہم بنیادی نکتہ ہے جو آج کل کی جدید مذہبی تاویلوں اور مباحث میں بھی مشترک ہے کہ وہ اسلام کی صحیح اور اصل فکر سے کام لے رہے ہیں یا کسی خاص خطّے کے مسلمانوں کے مخصوص مسائل اور تضادات کو صرف جدیدیت کا جامہ پہنانے کی کوشش کر رہے ہیں ــــــ؟

دوسرا نکتہ اس سلسلے میں ممتاز احمد صاحب اور ریاض صدیقی صاحب کے سوچنے کا یہ ہے کہ ان دونوں حضرات نے سرسیّد کی تحریک کے نتائج سے اس کی بنیاد یا اصل تک پہونچنے کی کوشش کی ہے جو فکری سطح پر ہمیشہ یک طرفہ استدلال کی محتاج ہوتی ہے اور اس میں غلطی کا احتمال بہر صورت رہ جاتا ہے۔ مثلاً ممتاز احمد صاحب مسلمانوں کی اور خصوصاً تعلیم یافتہ مسلمانوں کی بے عملی اور مذہب کے بنیادی ارکان سے پہلوتہی کو بعض دوسرے اہلِ قلم کی طرح سرسیّد کی اسی طرزِ فکر کا نتیجہ سمجھ کر اسے اسلامی فکر کے لئے ایک مہلک غلطی قرار دیتے ہیں۔ اور ریاض صدیقی صاحب اس کے برخلاف مسلمانانِ ہند کی بیداری، جدوجہد، تعلیم اور حصولِ پاکستان کی تحریک کو اس کا ثمرہ قرار دے کر سرسیّد کے مشن کی کامیابی پر مہرِ صداقت ثبت کر دیتے ہیں حالانکہ فکری سطح پر یہ دونوں نظریات نصف صداقت کے حامل ہو سکتے ہیں۔ اس لئے ان دونوں طرز ہائے فکر کی غلطیوں سے بچنے کے لئے اصل اور بنیادی سوال اٹھانا چاہیے۔ کہ سرسیّد کا نظریہ اسلامی قرار دیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ (اسلامی سے مراد یہاں مذہب کا وہ اصل تصوّر ہے جو نظریہ اور عمل کی مطابقت مطابق بر اصل قرار دیتا ہے جس طرح ایک اشتراکی نظام میں اشتراکی فکر کی اصلیت اور اس سے کامل ہم آہنگی ضروری قرار دی جاتی ہے)۔ بات صرف اتنی ہے کہ اگر سرسیّد نے

صرف قومی سطح پر مسلمانوں کو برِصغیر کی دیگر اقوام کے مقابلہ پر ترقی یافتہ بنانے کی کوشش کی ہے تو وہ قومی سطح پر بہت بڑا کارنامہ کہی جاسکتی ہے اور یقیناً سرسید ایک بہت بڑے لیڈر قرار پاتے ہیں لیکن ایسی صورت میں صحیح اسلامی فکر یا بنیادی اسلامی تصور کا واسطہ حقیقتاً اس سے ہونا ضروری نہیں اور اسی طرح اس بحث سے اگر یہ ثابت کیا جاسکے کہ سرسید نے اسلامی فکر کو آگے بڑھایا ہے اور انہیں اسلام کے بنیادی تصور کے نظریاتی مقصد کا درجہ حاصل تھا تو پھر ان کی قومی خدمات اس کے تابع ہو جائیں گی اور اس صورت میں اس کا نتیجہ اگر اسلامی نظریۂ فکر کے خلاف برآمد ہوگا تو پھر ان کی خدمات بھی اسلامی ثابت نہیں ہو سکتیں۔ میرا خیال ہے کہ اب تک اس بات کی وضاحت بہت اچھی طرح ہو چکی ہے کہ سرسید کی فکر میں مذہب اور قوم کے بارے میں کوئی ایسا تضاد ضرور موجود ہے جس کے نتیجے میں یہ دو متضاد ذہنی رویّے پیدا ہوتے رہے ہیں اور آج بھی اسی طرح تر و تازہ ہیں جس طرح سرسیدؒ کے اپنے عہد میں تھے —— اس پوری بحث کا نتیجہ دراصل یہ نکل سکتا ہے کہ مذہب کی ضرورت ہے یا نہیں؟ اور اگر یہ ممکن ہو تو اس کا اظہار یقیناً جرأت سے اور ریاکاری کے بغیر ہونا چاہیے ورنہ یہ تمام مباحث فضول اور بے کار ثابت ہوں گے۔

تیسری بات مجھے صرف ان دونوں حضرات ہی کے ضمن میں نہیں بلکہ ان حضرات تک بھی پہونچانی ہے جو اس بحث میں آئندہ شرکت کرنے والے ہیں اور وہ یہ ہے کہ عموماً بحث کرنے والے اس موضوع پر سرسیّد کے عہد کے تمام مکاتیبِ فکر اور اہلِ قلم کا مطالعہ مناسب حد تک نہیں کرتے ہیں اور صرف چند معروف باتوں پر ہی تکیہ کر کے بحث میں شرکت کرنے کے لئے بیقرار ہو جاتے ہیں جبکہ سرسید کا دَور اتنے متضاد اور گوناگوں مسائل اور زاویہ ہائے نظر سے پٹا پڑا ہے کہ جس کا گہرا مطالعہ کئے بغیر اس اہم مسئلہ کا حل ممکن نہیں۔ اس کی اہمیت ہمارے لئے اس سبب سے اور بڑھ جاتی ہے کہ یہی مباحث ایک نئی مملکت کی ذہنی اساس اور اس کے مستقبل سے گہرا تعلق رکھتی ہیں۔ اس سلسلہ میں ریاض صدیقی صاحب نے اوروں کی طرح یہ غلطی کی ہے کہ سرسید کے طرزِ فکر کو انہوں نے ان کے عہد کا واحد جدید طرزِ فکر خواہ مخواہ سمجھ لیا ہے اور ان کے مخالفین کو محض تنگ نظر مولوی یا خالص دینی طرزِ فکر کا داعی جبکہ حقیقتِ احوال یہ ہے کہ وہ دور صرف سرسیّد اور خالص دینی طرزِ فکر کے حامل افراد کے درمیان بٹا ہوا نہیں تھا بلکہ ان کے بیچ میں ایک ایسا طبقہ بھی تھا جو ایک طرف سرسیّد سے نظریاتی اور شدید اختلافات رکھتا تھا تو دوسری طرف خالص دینی نقطۂ نظر سے بھی مختلف تھا۔ اگر اس طبقہ کے چند چیدہ ناموں ہی کا ذکر کیا جائے تو مولوی عبدالسمیع (سب جج) مولوی نذیر احمد، منشی سجّاد حسین، اکبر الٰہ آبادی اور مولانا شبلیؔ جیسے کتنے ہی اور نام مل سکتے ہیں جن کو خالص مذہبی علماء کسی طرح بھی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ان کے علاوہ ایسے لوگوں کی تو کثیر تعداد ہے جو چند مضامین اور نظموں کی حد تک اپنے نظریات کا اختلاف کر کے ہمیشہ کے لئے گوشۂ گمنامی میں چلے جاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ سرسید سے نظریاتی اختلاف رکھنے والوں میں ان حضرات کے علاوہ اس عہد کی جدید نسل کے افراد بھی شامل ہو جاتے ہیں جو سرسیّدؒ سے زیادہ مغربی علوم سے واقف اور جدید طرزِ فکر کے حامل بھی تھے اور سرکارِ برطانیہ کے ثناخواں بھی اور برٹش مشینری کے معزز عہدے دار بھی۔

فی الوقت میں سرسیّد کے عہد کے دو ایسے نمائندوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو اس عہد کی پرانی اور نئی نسل قرار پاتے ہیں —— میری مراد اکبر الٰہ آبادی اور امداد امام اثرؔ سے ہے۔ جہاں تک اکبر الٰہ آبادی کا ذکر ہے کون نہیں جانتا کہ وہ اس عہد کے تمام معروف و ممتاز لکھنے والوں مثلاً سرسیّد، نذیر احمد، حالیؔ اور شبلیؔ کے مقابلہ پر مغربی علوم اور ترقی سے کچھ زیادہ ہی واقف تھے اور وہ بھی انگریزی سلطنت کے ایک معزز عہدے پر فائز تھے۔ انہوں نے اپنی اولاد کو انگریزی تعلیم سے پوری طرح بہرہ ور کرایا تھا بلکہ ان کے صاحبزادے اسی عہد میں کلکٹر مقرر ہو چکے تھے۔ مگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اکبر الٰہ آبادی فکری طور پر سرسیّد کے سب سے بڑے نقّاد اور مغربی اثرات کے بہت بڑے مخالف تھے۔ اکبر الٰہ آبادی کی اس روش پر اب تک اردو کے تمام نقّادوں نے پوری سفاکی سے حملے کئے ہیں لیکن مجھے یہ کہنے دیجئے کہ ان میں سے کسی نے بھی اپنی فکر کو تعصب سے خالی کر کے اور ہوش مندی سے استعمال کرنے کی کوشش نہیں

کی جس کی وجہ سے اکبر کے خلاف ایک ایسی غیر منصفانہ رائے قائم ہو گئی ہے جس کی تلافی عرصہ تک ممکن نہیں۔ اس سلسلہ میں یہ حقیر ایک جگہ اور بھی اس بات کا اظہار کر چکا ہے۔ فی الوقت میں چند اشارات ہی کر سکتا ہوں اور اگر فرصت ملی تو انشاء اللہ یہ موضوع میرے لئے ایک منصوبے کی حیثیت رکھتا ہے۔

اکبر الٰہ آبادی کوئی معمولی درجہ کے شاعر نہیں تھے۔ وہ اس درجہ کے شاعر تھے کہ ایک طرف انہوں نے اردو شاعری میں طنز و مزاح کا ایسا معیار قائم کر دیا جس سے برصغیر کی دوسری زبانیں آنکھ نہیں ملا سکتیں اور دوسری طرف ان کی شاعری نے ایک ایسی صداقت کو پچھتر سال پہلے اتنی قوت، اعتماد، وضاحت اور تیقّن کے ساتھ پیش کیا ہے جو آج ان کے ایک ایک حرف کی صداقت پر علم الغیب کا ثبوت دیتی ہوئی نظر آتی ہے (خواہ ہمیں اس سے کتنا ہی شدید اختلاف کیوں نہ ہو) ان کا یہ اندازِ نظر کتنا حیرت انگیز ہے کہ موجودہ معاشرہ نہ مولانا حالی کی قومی شاعری سے کوئی واسطہ رکھتا ہے اور نہ شاعرِ مشرق اقبال کی عظیم شاعری کا آدرشی نمونہ بنتا ہے بلکہ اس پر صرف ایک شاعر کی کامل گرفت نظر آتی ہے اور وہ ہیں اکبر الٰہ آبادی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شاعری کا ایک ایک لفظ مجسّم ہو کر ہمارا معاشرہ بن گیا ہے۔ یہ صحیح اندازہ انہیں کیسے ہو سکا؟ یہی وہ بنیادی سوال ہے جس پر سر سید کے عہد کی چند نظریاتی صداقتیں پرکھی جا سکتی ہیں۔ نتائج سے قطعِ نظر بدقسمتی سے اکبر الٰہ آبادی کو اب تک ایک رجعت پسند شاعر اور ان کی شاعری کو ردِ عمل کی شاعری کہا جاتا رہا ہے لیکن یہ بہت بڑا جھوٹ ہے کیونکہ اثباتی شاعری کبھی ردِ عمل کی شاعری نہیں ہوا کرتی۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ہر بڑا طنز نگار صرف محض منفی طرزِ فکر کا حامل نہیں ہوتا بلکہ ایک بڑی سطح پر اس کے پاس ایسا مثبت طرزِ فکر اور پیمانہ فکر بھی ہوتا ہے جس کی بنیاد پر بہت سے ادبی فکری نظام اور ذہنی تبدیلیاں مضحک نظر آنے لگتی ہیں۔ اور اس بات کو اس وقت تک نہیں سمجھا جا سکتا جب تک خالص ظریفانہ اور طنزیہ شاعری کا فرق ذہن میں واضح نہ ہو۔

ظریفانہ شاعری ہر چیز اور خیال میں ایک تضاد اور کمزوری کو ڈھونڈ کر اس کے سقیم پہلو کو نمایاں کرتی ہے اور اس کی مضحکہ خیزی پر قہقہے لگواتی ہے۔ یہ کمزوری عموماً انسان اور فطرت کی کسی فطری خامی کا مظہر ہوتی ہے۔ ظریفانہ شاعری اپنے اور غیر دونوں کے لئے یکساں سلوک کرتی ہے کیونکہ اس میں کائنات، قدرت، فطرت، عقل، جسم اور معاشرہ کا کوئی ایسا پہلو نمایاں ہوتا ہے جس میں کوئی خامی یا نقص فطری طور پر پایا جاتا ہے۔ مگر طنزیہ شاعری زاویۂ نظر سے پیدا ہوتی ہے جو ظریفانہ اسلوب میں کسی چیز کو ایک مخصوص زاویۂ نظر سے پیش کر کے اس کے تضاد، خامی، برائی یا مضحکہ خیزی کو واضح کرتی ہے (یہی طنزیہ شاعری اصلاحِ معاشرہ کا بھی مفید کام انجام دے سکتی ہے) ظاہر ہے کہ ہر ظرافت نگار کا کام طنز نہیں ہوتا جبکہ ہر طنز نگار کے لئے ظرافت کی کسی نہ کسی مقدار کا ہونا ضروری ہے ورنہ وہ سیدھی سیدھی تضحیک یا تبلیغ بن سکتی ہے جیسے مولوی نذیر احمد نے ابن الوقت میں سر سید کی طرزِ فکر کا خاکہ اڑانے کی جو علامتی کوشش کی ہے وہ اس لئے ناکام ہو گئی کہ ظرافت کا عنصر کافی نہ ہونے کے باعث ابن الوقت کا کردار محض ایک "ٹائپ" بن جاتا ہے۔ اور اس کا تضاد حجۃ الاسلام محض ایک مبلغ ـــــ طنزیہ شاعری کے لئے اہلیت اور زاویۂ نظر کی گہرائی بہت ضروری ہوتی ہے۔ عام طور پر معمولی طنز نگار وہ ہوتا ہے جو کسی چیز کو اپنے نقطۂ نظر سے برا سمجھتا ہے لیکن یہ برائی پیش کرتے وقت اس کا زاویۂ نظر نمایاں نہیں ہوتا۔ اس کے طنز کا ہدف عموماً ہم عصر حقائق و واقعات اور شخصیات ہوتی ہیں۔ اس صورت میں اگر اس کے طنز کا رُخ ماضی یا قدیم کی طرف ہے تو وہ ایک سفاک رویّہ کا اظہار کرتا ہے جس میں ظرافت شگفتگی کھو کر زہریلی ہو جاتی ہے اور وہ بغیر زاویۂ نظر ابھارے اسے ایک قاتل کی طرح نشانہ بنا لیتا ہے۔ اور اگر اس کا رُخ جدید کی طرف ہوتا ہے تو وہ اس کی مضحکہ خیزی پر اتنے اوچھے انداز میں روشنی ڈالتا ہے کہ اس کے اندازِ نظر کی گہرائی یا رخ کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ ایسا طنز عموماً جدید کے سامنے چونکہ خود سکڑتا نظر آتا ہے اس لئے اس کا وار کاری نہیں ہوتا۔ البتہ وہ ایک سطحی اور اوپری اندازِ نظر کو پیش کرتا رہتا ہے جس کی مدد سے جدیدیت کا کوئی کمزور یا ظریف رخ سماعلامت بن کر سامنے آ جاتا ہے۔ ان دونوں اقسام کی شاعری اردو میں اکثر مل جاتی ہے۔ جوش ملیح آبادی، ظریف لکھنوی، مجید لاہوری،

ظریف جبلپوری اور سید محمد جعفری تھوڑے بہت فرق کے ساتھ ایک ہی کام کرتے نظر آتے ہیں کہ وہ اپنے موضوع کا منفی پہلو اس طرح نمایاں کر دیں کہ وہ مضحکہ خیز نظر آنے لگے۔ یہ زاویہ نظر خود کسی حد تک منفی ہو جاتا ہے لیکن اس سے بلند طنزیہ سطح وہ ہوتی ہے جب ایک زاویہ نظر واضح ہو کر اپنے موضوع کے نتائج کو مضحک علامتوں، حقائق اور صورتوں میں پیش کرتا ہے۔ یہاں اس کا رویہ بظاہر منفی نظر آتا ہے مگر وہ جس چیز کو اپنا نشانہ بنا رہا ہے اس سے ایک نتیجہ نکلتا ہے اور یہ نتیجہ خود زاویہ نظر بن کر طنز نگار کے مقصد کو وضاحت کے ساتھ پیش کرتا ہے اور پڑھنے والے کی نظر میں اس طنز کے عواقب کھل جاتے ہیں۔ ایسا طنز سودا کے یہاں بھی نظر آتا ہے اور سرشار نے تو اسے حدِ کمال کو پہنچا دیا ہے۔ خوجی "قدیم" کی وہ مضحکہ خیز شکل ہے جو پوری کائنات کو صرف اپنی خیالی اور تصوراتی سطح پر دیکھتا ہے۔ یہاں منفی نقطۂ نظر اثبات کا انداز پیدا کرتا ہے۔ طنز کی یہ سطح اردو میں بڑے ناموں کو پیدا کر سکی ہے۔ اس میں مولانا ظفر علی خاں کی سیاسی علامتوں سے لے کر فرحت اللہ بیگ، پطرس، رشید احمد صدیقی اور مشتاق احمد یوسفی تک سب آ جاتے ہیں۔ لیکن اکبر الہ آبادی کی شاعری ان دونوں اقسام میں کسی جگہ بھی نہیں رکھی جا سکتی۔ جبکہ اب تک ان کو دوسرے قسم کے طنزیہ ادب میں بہت فخر کے ساتھ پیش کیا جاتا رہا ہے حالانکہ اکبر الہ آبادی کی طنزیہ شاعری اس لئے اس سطح سے بلند تر ہو جاتی ہے کہ ان کا زاویہ نظر صرف ذاتی نظریہ سے نہیں ابھرا ہے بلکہ وہ ایک مکمل نظامِ فکر سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ نظامِ فکر شاعر کے تخلیقی عمل میں اتنا کامل اور مثبت ہے کہ اس سطح پر سر سید جیسے مفکرؔ اپنی فکری سطح پر بہت ہی خام اور ناقص نظر آتے ہیں۔ اکبر نے سر سید کی مضحک شخصیت کی تعمیر میں ان کے صرف ذاتی کردار اور وقتی پہلوؤں کے منفی رویہ کو نہیں پیش کیا ہے بلکہ انہیں سر سید اس لئے مضحک نظر آتے ہیں کہ وہ ایسے نظامِ فکر کے نمائندے ہیں جسے اکبرؔ خام، سطحی اور تضادات سے پُر دیکھتے ہیں۔ یہاں اکبرؔ کی شاعری ردِ عمل کی شاعری نہیں رہتی بلکہ وہ اتنی قوت سے اپنی مثبت فکر کے ہتھیاروں سے سر سید پر حملہ آور ہوتے ہیں کہ سر سید اور ان کی فکر ان کے سامنے خود سکڑنے کا عمل کرنے لگتی ہے۔ یہ چند اشعار دیکھئے جن میں صرف محض ظرافت اور طنز ہی نہیں بلکہ ایک کامل نظامِ فکر کا اثبات ملتا ہے اور یہی قوت اور نظامِ فکر سر سید کے مقابلہ پر اکبر کے زاویہ نظر کو مثبت اور کاری بنا دیتا ہے۔

ہے کامہ ہی کامہ جو پڑھے دہر کا نامہ
جز مرگ کہیں اس میں فل اسٹاپ نہیں ہے

نئی نئی لگ رہی ہیں آنکھیں یہ قوم بیکس پگھل رہی ہے
نہ مشرقی ہے نہ مغربی ہے عجیب سانچے میں ڈھل رہی ہے

مچھلی نے ڈھیل پائی تو لقمے پہ شاد ہے
صیاد مطمئن ہے کہ کانٹا نگل گئی

شیخ مرحوم کا قول اب مجھے یاد آتا ہے
دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

مریدِ دہر ہوئے وضع مغربی کر لی
نئے جنم کی تمنا میں خودکشی کر لی

میں نے مانا کہ کلیں تیز چلی ہیں لیکن
آپ شہتیر نہیں ہیں کہ چرے جاتے ہیں

پرانی روشنی میں اور نئی میں فرق اتنا ہے
اسے کشتی نہیں ملتی اسے ساحل نہیں ملتا

مشرقی تو سرِ دشمن کو کچل دیتے ہیں
مغربی اس کی طبیعت کو بدل دیتے ہیں

سیکھ لو بدلی سے تم طرزِ عمل اے عالمو
جو سمندر سے لیا تھا ہم پہ برسا ہی گئی

کچھ خاک میں ملیں گے کچھ ہوں گے جزوِ غیر
یہ مسئلہ صحیح ہے گو دل خراش ہے

تجربہ خود بنے گا واعظِ دیں
نیک بعد از خرابیٔ بسیار

گرچہ رک سکتی نہیں یہ نقلِ وضعِ مغربی
پھر بھی کامل طور پر ممکن نہیں ہم قالبی

اور بھی دورِ فلک ہیں ابھی آنے والے
ناز اتنا نہ کریں ہم کو مٹانے والے

متحد احساس سے ہم کو معرّا کر دیا ٹکڑوں کے ریزے کئے ریزوں کو ذرّہ کر دیا
ذرہ ہائے خاک کس ترکیب سے جکڑے گئے جینے مرنے کے تماشے کے لئے پکڑے گئے

یہ اور اس قسم کے سینکڑوں اشعار اکبرؔ کی شاعری سے پکار پکار کر یہ اعلان کر رہے ہیں کہ اس زاویۂ نظر کے پیچھے ایک مبسوط نظامِ فکر ہے، ایک مثبت رویہ ہے جس کے معیار پر سرسیدؔ اور ان کی تحریک مضحک سے مضحک تر نظر آتی چلی جاتی ہے اور ان کے کلام میں سرسیدؔ کی مضحک شکل و صورت جس نظامِ فکر کی علامت بن کر آتی ہے وہ اکبرؔ کے زاویۂ نظر سے خواہ کتنی بھی جدید ہو مگر اس کے منفی ہونے میں ان کو پوری طرح یقین کامل ہے۔ یہ منفی اثرات کن کن چیزوں سے مل کر بنے ہیں، ان کا اندازہ کلامِ اکبرؔ کا پورا اور گہرا مطالعہ کرنے سے ہو سکتا ہے۔ یہاں چند اشعار ملاحظہ کے لئے پیش کئے جاتے ہیں۔

واہ کیا راہ دکھائی ہے ہمیں مرشد نے کر دیا کعبہ کو گم اور کلیسا نہ ملا
رنگ چہرے کا تو کالج نے بھی رکھا قائم رنگِ باطن میں مگر باپ سے بیٹا نہ ملا

عشق و مذہب میں دو رنگی ہو گئی دین و دل میں خانہ جنگی ہو گئی

کر گئے تھے حضرتِ سیدؔ عقیدوں کو درست چرخ نے رسموں کا بھی آخر صفایا کر دیا

سردی ہوئی پیدا اس انتشار کے بعد ہزار حیف کہ فالج گرا بخار کے بعد

کہیے کوئی شیخ سے یہ جا کر کہ دیکھئے آ کے بزمِ سیدؔ یہ رد و قدح اور یہ چہل پہل ہو تو کیا برا ہے گناہ کرنا

ہم ہوں جو کلکٹر تو وہ ہو جائیں کمشنر ہم ان سے کبھی عہدہ برآ ہو نہیں سکتے

شیخ مائل ہوئے ہیں ساغرِ مینا کی طرف برکتیں لائیں گی نشّہ کی کلیسا کی طرف

کیا جانئے سیدؔ تھے حق آگاہ کہاں تک سمجھے نہ کہ سیدھی ہے مری راہ کہاں تک
کچھ صنعت و حرفت پہ بھی لازم ہے توجہ آخر یہ گورنمنٹ سے تنخواہ کہاں تک

نظر ان کی رہی کالج میں بس علمی فوائد پر گرا کیں چپکے چپکے بجلیاں دینی عقائد پر

اب تک تو کوئی بہتری ظاہر نہ ہوئی گذرے جاتے ہیں ہم پہ سال و مہ و یوم
شاید کہ یہی ترقیٔ قومی ہے ہر شخص بجائے خود بنا ہے اک قوم

اوروں کی کہی ہوئی جو دہراتے ہیں وہ فونوگراف کی طرح گاتے ہیں
خود سوچ کے حسبِ حال مضمون نکال انسان یونہی ترقیاں پاتے ہیں

رغبت جو دلائی وسعتِ مشرب کی شامل اس میں غرض ہے بیشک سب کی
لیکن تبدیلِ وضع و نقلِ فاتح ہے بغض کی بات اور اپنے ہی مطلب کی

چیخے چلائے کودے اچھلے ٹہلے پھر پھر کے وہیں رہے جہاں تھے پہلے

بار بار آتا ہے اکبرؔ میرے دل میں یہ خیال حضرتِ سیدؔ سے جا کے عرض کرتا کوئی کاش
درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہٗ باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

ہر قدم ان کا شہیدِ لغزشِ مستانہ تھا سر میں تھا سیدؔ کے قرآں زیرِ پا میخانہ تھا

سرسیّد کو فلک نے تنفنے نہ دیا تہذیب کو پھر دوبارہ جنے نہ دیا
ملت کی شکست میں مدد دی حالی بننے لگی جب قوم تو بننے نہ دیا

یہاں اکبر ایک ایسے طنز نگار نہیں رہ جاتے جو منفی اندازِ نظر سے اپنے ہدف کو دیکھ رہا ہو بلکہ اسے اتنا کاری وار جو قوت بنا رہی ہے وہ دراصل ایک مثبت زاویہ نظر کا ارتکاز ہے جو شاعر کے زاویہ نظر کو فریقِ ثانی کے زاویۂ نظر پر فوقیت دیتا ہے اور اس اعتبار سے اگر ہم سرسید اور حالی کی تحریر کو دیکھیں تو وہ اکبر کے رویہ کے بالکل برخلاف اتنا ملائیت اور رقت لئے ہوئے ہے کہ اس کے اثبات میں خود شک و شبہ ہونے لگتا ہے مجھے بڑی حیرت ہے کہ اب تک سرسیّد کے مخالفوں کو قدیم کی طرف لوٹنے کا داعی بتایا گیا ہے اور تمام تر ترقی پسند نقّادوں نے ان کی تحریروں پر سب سے بڑا اعتراض یہ کیا ہے کہ وہ قوم کو ماضی کے شاندار کارناموں سے بہلانے اور تسکین کا سامان کر رہے تھے مگر بغیر پڑھے ہوئے اگر کوئی بد دیانت شخص یہ بات کہے تو مجھے حیرت نہ ہوگی۔ مگر ان حضرات پر ضرور تعجب ہے جنہوں نے ایک سفید جھوٹ بولا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ماضی کے ترانے سنا کر قوم کو بہلانے والے اور انہیں احساس کمتری میں مبتلا کر دینے والے خود سرسیّد اور حالی کی طرزِ فکر کے حامی تھے۔ ان کے وہ مخالفین جو اس وقت میرا موضوع ہیں، انہوں نے ماضی کی طرف لوٹنے کے اس منفی رویّہ کی کبھی تائید نہیں کی جس کا اندازہ آپ کو ان چند اشعار سے ہو سکتا ہے۔

نہیں ہاتھ آتی دولت نام رٹنے سے بزرگوں کے
بجا ہے جد کے ترکیب زیرِ جد ہو نہیں سکتی

اے جدِ بزرگ کے نواسو ہو تو
تو زمین کو تہ کرو زمینیں ہو تو

کیا رٹتے ہو اپنی ہسٹری کو ہر وقت
اللہ مدد کرے گا ویسے ہو تو

اعلیٰ مقصود چاہیئے پیشِ نظر
کوشش تری ہو گو لطفِ ذاتی کیلئے

فرہاد پہاڑ پر عمل کرتا تھا
شیریں کے لئے کہ ناشپاتی کے لئے

ادراک نے آنکھیں شبِ اوہام میں کھوئیں
واقف نہ ہوا روشنیٔ صبحِ ازل سے

نئی تہذیب میں بھی مذہبی تعلیم شامل ہے
مگر یونہی کہ گویا آبِ زمزم مے میں داخل ہے

ایمان بیچنے پہ ہیں اب سب تلے ہوئے
لیکن خرید ہو جو علی گڑھ کے بھاؤ سے

سیّد کی روشنی کو اللہ رکھے قائم
بتی بہت ہے موٹی روغن بہت ہلکا ہے

قلعی بھی ریا کار کی کھلتی رہے اکبر
طعنوں سے مگر طرزِ تہذیب بھی نہ چھوٹے

اور ذرا یہ پر یقین لہجہ دیکھئے ؎

آپ ناحق پہ اور ہم حق پر
آپ سے ہم کبھی نہ ہاریں گے

غالباً اب ہمیں اپنی بحث کی طرف لوٹنا چاہیئے یہ تو بہرحال طے ہے کہ اکبر کا نقطۂ نظر منفی اور کم فہمی کا ہرگز نہیں تھا اور اکبر اس طبقے کے نمائندے کسی طرح بھی نہیں تھے جو ہر جدید چیز کو حرام قرار دیتا ہے اور جس پر سرسیّد نے کفر کے فتوے لگائے تھے۔ اکبر اس متوازن، صاحبِ الرائے خوددار اور حریتِ فکر کے حامل طبقے کے سب سے بڑے نمائندہ شاعر تھے جو جدید کو اس کی خوبیوں کے لئے قبول کرنا چاہتا تھا اور اپنے منفرد کردار، طرزِ احساس اور زاویۂ نظر کو برقرار رکھنا چاہتا تھا اور ان خامیوں سے حذر چاہتا تھا جو قوم کو احساسِ کمتری کا شکار بنا کر غلامانہ ذہنیت میں مبتلا اور مستقبل سے مایوس کر دے اور وہ صرف حکمران طبقے کا ایک نقّال محض رہ جائے۔ اس سلسلہ میں اکبر کا شعور اتنا ترقی یافتہ اور بالغ تھا

اصان کی فکر اتنی صحیح تھی کہ انہوں نے انگریزی حکومت کی پوری ذہنیت، اس کی سیاست کے فریب، اس کے تعلیمی منصوبوں کے اغراض و مقاصد اور ان کمزوریوں کا سی وقت بھانپ لیا تھا لیکن انہوں نے سائنسی ترقی یا مغربی فکر کی قوتوں سے انکار ایک لمحے کے لئے نہیں کیا ہے۔

شیخ در گور قوم در کالج
رنگ ہے دورِ آسمانی کا
انجن آیا نکل گیا زن سے
سن لیا نام آگ پانی کا
بات اتنی اور اس پہ یہ طومار
غُل ہے یورپ پہ جانفشانی کا
علم پیدا ہمیں سکھائیں اگر
تب کریں شکر مہربانی کا

حاصل کرو علم طبع کو تیز کرو
باتیں جو بُری ہیں ان سے پرہیز کرو
قومی عزت ہے نیکیوں سے اکبرؔ
اس میں کیا ہے کہ نقلِ انگریز کرو

تکمیل میں ان علوم کے ہو مصروف
نیچر کی طاقتوں کو جو کردیں مکشوف
لیکن تم سے امید کیا ہو کہ تمہیں
عہدہ مطلوب ہے دطن ہے مالوف

مخلوط کرو نہ نفس و نیچر کو بہم
گو نفس نے بھی لیا ہے نیچر سے جنم
جو بھوک لگے زباں کو وہ ٹھیک نہیں
ناغذہ وہ طعام ہے کہ طالب ہو شکم

لامذہبی سے ہو نہیں سکتی فلاحِ قوم
ہرگز گذر سکیں گے نہ ان منزلوں سے آپ
کعبہ سے بت نکال دیئے تھے رسول نے
اللہ کو نکال رہے ہیں دلوں سے آپ

لاکھوں کو مٹا کر جو ہزاروں کو ابھارے
اس کو تو میں دنیا کی ترقی نہ کہوں گا
جس روشنی میں لوٹ ہی کی آپ کو سُوجھے
تہذیب کی میں اس کو تجلی نہ کہوں گا

علم اگر ہوتا زیادہ اور ہوتی حرص کم
صلح رہتی بیشتر لوگوں میں کم ہوتی نزاع

کہا جو اس نے کہ اب میں پھروں گا بے پردا
منہ اس کا دیکھ کے بس رہ گئے نقاب فروش

اور کچھ اس کے سوا کر نہیں سکتے ناصح
بس چلی جاتی ہے تعلیم کی تاکید ہنوز
کس قدر جاد تھے سید کے وہ اجزائے ریفارم
علماء دے رہے ہیں قوم کو تبریدہ ہنوز
دل تو مدت سے تھا خاکِ درِ دَیر اے اکبرؔ
ہاں زباں پر ہے مگر کفر کی تردید ہنوز

مغربی رنگ و روش پر کیوں نہ آئیں اب قلوب
قوم ان کے ہاتھ میں تعلیم ان کے ہاتھ میں

بھولتا جاتا ہے یورپ آسمانی باپ کو
بس خدا سمجھا ہے اس نے برق کو اور بھاپ کو
برق گر جائے گی اک دن اور اڑ جائے گی بھاپ
دیکھنا اکبرؔ بچائے رکھنا اپنے آپ کو

مذہب کی کہوں تو دل لگی میں اُڑ جائے
مطلب کی کہوں تو پالسی میں اڑ جائے
باقی بہر قوم میں ابھی ہے کچھ ہوش
غالب ہے کہ یہ بھی اس صدی میں اڑ جائے

آخر میں اکبرؔ نے جس احساس کمتری کو اور نئی نسل کو پیش نظر رکھ کر جو کچھ کہا ہے اس کا بنیادی نکتہ یہ ہے :

سوچو کہ آگے چل کر قسمت میں کیا لکھا ہے   دیکھو گھروں میں کیا تھا اور آج کیا رہا ہے
ہشیار رہ کے پڑھنا اس جال میں نہ پڑنا   یورپ نے یہ کہا ہے یورپ نے وہ کہا ہے

ان اشعار کی روشنی میں دیانت داری کا تقاضہ تو یہ ہے کہ آپ بھی تسلیم کر لیں کہ اکبر کا نقطۂ نظر سرسید کے طرزِ فکر سے کہیں زیادہ بالغ اور صحت مند تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ سرسید کا طرزِ فکر چونکہ برطانوی سیاست اور حکومت کے لئے زیادہ سود مند تھا اسی لئے اس نے اپنی پوری قوت سے اس کے اثر و نفوذ کو پھیلنے کے مواقع بہم پہنچائے اور ہر ممکن امداد کی۔ سرسید کی طرزِ فکر کو کامیابی کی دلیل بنانے والے حضرات اگر ایمانداری سے اس پوری تحریک کے پس منظر کا مطالعہ کریں تو انہیں خود یہ معلوم ہو جائے گا کہ اس طرزِ فکر کی کامیابی میں نظریہ کی صداقت کو بہت کم اور اس دور کی صاحبِ اقتدار قوت اور حکومت کی مصلحتوں اور امداد کا بہت بڑا دخل تھا جس کا ثبوت اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ سرسید کی مخالفت صرف و محض (جدید ادیبوں کے نقطۂ نظر سے) صرف ملاؤں اور دینی اداروں کے مدرسوں کی اور بقول سرسید "قل اعوذیوں" کی طرف سے نہیں ہوئی تھی بلکہ اس کی شدید مخالفت اس طبقہ کی طرف سے ہوئی تھی جس نے سرسید کی طرح خود مغربی تعلیم اور انگریزی حکومت کو ہندوستان کے لئے ایک نعمت قرار دیا تھا اور یہ سب سرسید کے ہم عصر اور ان کے شریک کار قرار دیئے جا سکتے ہیں ـــــ اسی جگہ یہ بات بھی صاف کر دینے کی ہے کہ ہم یک آواز اور یک سانس جن علماء کو ملا اور قدامت پسند کہہ کر سرسید کو جدید فکر کا نمائندہ قرار دیتے ہیں، وہ علماء وہ ہیں جنہوں نے ہندوستان کو غلامی سے نجات دلانے کی ایسی طویل جدوجہد کی اور ایسی قربانیاں دی ہیں جن کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور یہ بات آج کے تمام مفکرین کے لئے ان کی دیانت کا سب سے بڑا امتحان ہے کہ تحریکِ آزادی مثبت ہوا کرتی ہے یا نہیں؟ تاریخ میں غلامی سے نجات حاصل کرنے اور آزادی کی جدوجہد کو کبھی منفی قرار نہیں دیا گیا ہے۔ (یہ شرف بھی ہمیں کو پہلی بار حاصل ہوا ہے) اس لئے اس سوال کا جواب جدید مفکرین پر قرض ہے کہ ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے بچانے کے لئے تحریکِ آزادی کو تیز تر کرنے کے لئے علماء برکف میدان میں اترے ہوئے تھے یا سرسید احمد خاں؟ میں یہ ماننے کے لئے تیار ہوں کہ ہندوستان کے پیچیدہ اور مخصوص حالات میں شاید سرسید کی طرزِ فکر ہی اس وقت کی سب سے مفید طرزِ فکر ہو مگر ایک آزاد قوم اور ملک کی تعمیر کے پہلے مرحلے میں ہمیں سرسید کے عہد کی پیچیدہ اور "مفید" طرزِ فکر سے نہیں بلکہ اس مثبت طرزِ فکر سے رشتہ جوڑنے کی ضرورت ہے جس نے حریتِ فکر کو تحریکِ آزادی کو اور غلامی سے نجات کو اپنا مقصود و مطلوب بنایا تھا نہ کہ ان سے جنہوں نے غلامی کی طرف بلایا تھا اور اس پر صبر و شکر کرنے پر مجبور کیا تھا۔

سرسید کے ہمعصر مگر اس زمانے کی نئی نسل ان بزرگوں سے بھی دو ہاتھ آگے تھی اور اسی نسل کے لوگ سرسید کے مقابلے پر انگریزی علم و ادب سے براہِ راست واقف تھے اور مغربی علوم کی ان خوبیوں اور اس کے پیچھے کام کرنے والی اس قوت کے معترف تھے جس نے سائنس کی عظیم فتوحات کو جنم دیا تھا اور صرف یہی نہیں بلکہ یہی وہ لوگ تھے جنہیں پیدا کرنا انگریزی تعلیم کا مقصد بھی تھا اور وہ حکومت کے ذمہ دار عہدیداروں میں شمار ہوتے تھے مگر پھر بھی یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوتی ہے کہ ان میں سے تمام قابلِ ذکر اہلِ قلم سرسید کی طرزِ فکر کے سب سے بڑے مخالف اور ناقد ہیں۔ ان میں سے میں صرف ایک ہی صاحب کا ذکر کروں گا۔ نواب امداد امام اثر مصنف "کاشف الحقائق" جن کی یہ کتاب اردو ادب میں جدید مغربی طرزِ فکر کی غالباً سب سے پہلی اور باقاعدہ کتاب شمار ہوتی ہے۔ یہ اس لئے کہ مولانا حالی خود انگریزی سے اصلاً واقف نہیں تھے جن کا مقدمہ اردو ادب میں سنگِ میل مانا گیا ہے۔ مقدمہ دیوانِ حالی ۱۸۹۳ء میں پہلی بار شائع ہوا اور کاشف الحقائق اس کے بعد چھپنے والی وہ پہلی اور مکمل تصنیف ہے جو ۱۸۹۷ء میں شائع ہوئی۔ ان صاحب نے جدید طرزِ فکر کو، تاریخ کے شعور کو، اس

وقت کے مغربی تعلیم کے مذاقِ سخن کو سامنے رکھ کر اردو ادب پر ایک گہری نظر ڈالی ہے۔ اس کے نامقبول ہونے کا ایک سبب اس کتاب میں ان کے شیعی نقطۂ نظر کا بہت واضح اور تبلیغی اندازِ فکر ہو سکتا ہے یا شاید تحریکِ سرسید کی کامیابی۔ نواب امداد امام اثر کے خیالات کی تلخیص انہی کے کم سے کم الفاظ میں درج ذیل ہے:

"یورپ کی تعلیم عجیب ملحد خیز انداز رکھتی ہے۔ عیسائی عیسائیت سے آزاد اور مسلمان مسلمانیت سے دور ہو جاتا ہے۔" (کاشف الحقائق، صفحہ ۵۱۹، جلد دوم)

اس نقطۂ نظر کا وضاحتی بیان اگر سامنے نہ ہو تو بھی یہ اندازہ نہیں ہو سکتا کہ امداد امام اثر سرسید کے نظریے سے کس قدر مختلف ہیں اور کیوں ہیں:

"یورپین تعلیم کے مسلمان سو میں ایک دو ہی ایسے نظر آتے ہیں جو پنج وقتی نماز کے پابند ہیں ورنہ پنج وقتی نماز تو درکنار عید کے نمازی بھی تعلیم یافتہ مسلمانوں میں قریب قریب نادار ہیں۔ یورپین تعلیم جو عیسائی اور مسلمان دونوں کو اپنے اپنے مذہب میں ضعیف کر دیتی ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ یہ تعلیم خس کے برابر بھی روحانی انداز نہیں رکھتی۔ یہ تعلیم سراسر مادیت سے تعلق رکھتی ہے۔ اس تعلیم کو معاد سے کوئی تعلق نہیں۔ اس تعلیم کی غرض معاش ہی معاش ہے۔ تعجب ہے کہ اس نقصانِ عظیم پر بھی یہ تعلیم بنی آدم کے لئے مفید سمجھی جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابنائے زمانہ کے نزدیک انسان بے روح بنا ہے اور جب بے روح اس کی خلقت واقع ہوئی ہے تو اس کو روحانی تعلیم کی کیا حاجت ہے" (کاشف الحقائق صفحہ ۱۶۴ / ۱۶۵)

یہ نقطۂ نظر سرسید سے زیادہ ان کے ناقدین سے قریب ہے۔ چونکہ نواب امداد امام اثر کی یہ کتاب ایک تاریخی، تنقیدی اور فکری تصنیف ہے اس لئے ان کے عہد کے لئے اس کتاب کے نظریات و خیالات ریاض صدیقی صاحب کے خیالات سے زیادہ مستند ہو سکتے ہیں۔ اسی لئے ان کا ذکر یہاں بے محل نہیں ہوگا۔

"مگر اس زمانے میں ایک نئی بیماری پیدا ہوئی ہے اور وہ یہ کہ اکثر ادھورے انگریزی خوانوں کے دماغ میں اس خیالِ فاسد نے جگہ کر لی ہے کہ ساری خوبیاں یورپ پر ختم ہو گئی ہیں۔ ایشیا کو خوبی کا کوئی حصہ ملا ہی نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس زمانے میں یورپ نے مادیات میں بڑی ترقی کی ہے یہاں تک کہ اکابر علمائے یورپ خدا سے بھی مستغنی نظر آتے ہیں۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ علوم مادیات کا یہی تقاضا ہے کہ انسان تدہر اختیار کرے چنانچہ یہ امر محقق ہے کہ انسان جس قدر مادیات میں ترقی کرتا جاتا ہے روحانیات سے دور پڑتا جاتا ہے حتیٰ کہ آخر کار خدا اور تمام روحانیات سے منکر ہو بیٹھتا ہے۔ خیر جو کچھ یورپ تدہر کی حالت میں مبتلا ہو رہا ہے اس کی مادی ترقیوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے مگر اس سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی ہے کہ اگر یورپ ساری خوبیوں سے معمور ہے تو ایشیا ساری خوبیوں سے محروم ہے۔ قصور معاف اکثر ہماری نئی روشنی والے حضرات کا تو ایسا ہی خیال معلوم ہوتا ہے۔ وہ ایشیائی خیالات، اوضاع اور معاملات کو یک قلم قابلِ نفرت سمجھتے ہیں۔ یورپ کے ہر امر پر، عام اس سے کہ معقول ہو یا غیر معقول، جان دیے دیتے ہیں اور اپنے اقوال و افعال سے عجیب طرح کی نادیدگی ظاہر کرتے ہیں۔ جا و بیجا ہر قدم پر اہلِ یورپ کے تتبع پر مستعد رہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہر ماخذ مَا صَفَا وَدَعْ مَا كَدَرْ کا مضمون ان کے گوشِ مبارک تک کبھی پہنچا ہی نہیں۔ ان حضرات کی دلدادگیاں معاملاتِ یورپ کی نسبت اس درجہ کو پہنچ گئی ہیں کہ ایشیائی شاعری بھی ان کی نظر میں ذلیل اور محقر معلوم ہوتی ہے۔ اہلِ یورپ اس کے مقر ہیں کہ ابھی تک انہیں ایشیائی خیالاتِ شاعرانہ سے آشنائی پیدا نہیں ہوئی ہے اور بہت کچھ ان کو معلوم کرنا ہے۔ چنانچہ اس وقت تک ان کو ایشیائی شاعری سے اطلاع کی شکل پیدا ہوئی ہے وہ پایۂ اعتبار نہیں رکھتی ہے .... بدانستِ راقم اس تنگ چشمی کا سبب نادیدگی ہے یا یہ کہ یورپین

شاعری بسبب ایک امر جدید ہونے کے پُر لذت معلوم ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یورپین شاعری کی آگاہی سے ہم ایشیائیوں کی شاعری کو بہت کچھ فائدہ حاصل ہو سکتا ہے نئے نئے مضمون دستیاب ہو سکتے ہیں مگر یہ فائدہ یورپین شاعری کو ہماری ایشیائی شاعری سے پہونچ سکتا ہے۔ اس واسطے کہ بہت نازک خیالیاں ایشیائی شاعری میں ایسی ہیں جن سے شعرائے یورپ کے دماغ کو ابھی آشنائی پیدا نہیں ہوئی ہے۔ اس امر سے اعتراف خود اہل یورپ اور اہل امریکہ کو ہے۔ بہر حال اہل یورپ کو ایشیائی خیالات سے مناسبت پیدا کرنے کے لئے ضرور ہے کہ یا پوری طرح عربی، فارسی، اردو سیکھیں یا ان زبانوں کے شعراء کی تصانیف کو بہایت صحت کے ساتھ ترجمہ کر ڈالیں۔ اس طرح ہم لوگوں کو ترقیٔ فنِ شاعری کے لئے دو امر درکار ہیں۔ ایک یہ کہ جو معائب ایشیائی شاعری کے ہیں ان سے متنبہ ہو کر ان کے ازالہ کی فکر کریں۔ دوم یہ کہ جو جو خوبیاں یورپین شاعری میں ہیں ان کو حسبِ ضرورت اپنی شاعری میں داخل کرنے کی صورتیں نکالیں"۔ (صفحہ ۸۴-۸۸)

مولانا حالیؔ نے جن سنی سنائی باتوں پر اردو شاعری کا بیج مارنے کی کوشش کی تھی اور پوری قوم کو جس درجہ احساس کمتری میں مبتلا کر دیا تھا وہ اپنے ہم عصر ناقد کی نظر میں کیا درجہ رکھتا تھا اس کا اندازہ آپ کو مندرجہ ذیل اقتباس سے ہو سکتا ہے:

"اب غزل سرائی کے مادے میں آخر عرضِ راقم یہ ہے کہ اس زمانہ میں تقاضۂ سلطنت سے انگریزیت نے ایسی تاثیر پھیلائی ہے کہ ہر شئے جو ملکی وضع، ترکیب، ساخت، روش وغیرہ کی ہے تنگ چشموں کی آنکھوں میں ذلیل و خوار نظر آتی ہے۔ جن حضرات نے علوم یورپ حاصل کئے ہیں ان کا انقلابِ مذاق چنداں جائے حیرت انگیز نہیں ہے مگر تعجب ان حضرات سے ہے جو انگریزی جانتے ہیں نہ فرانسیسی مگر صحت و عدم صحتِ مذاق پر بحث کرنے کو مستعد ہو جاتے ہیں اور ہندوستانی علوم و فنون کی مذمت بے دھڑک کرنے لگتے ہیں۔ ایسے حضرات کے نزدیک ہر شے جو ہندوستان سے تعلق رکھتی ہے بفحوائے یقین مترو ح و مذموم ہے۔ من جملہ دیگر اشیائے ملکی کے ملکی شاعری بھی ان کے خیال میں پر از عیوب متصور ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ملکی شاعری میں معائب ہیں مگر یورپین شاعری بھی عیوب سے پاک نہیں ہے۔ یورپین شاعری کے عیوب ایسے حضرات کو سجھائی نہیں دیتے اور حقیقت یہ ہے کہ انہیں یورپین شاعری کے عیوب کیونکر نظر آئیں جب ان کی اطلاع، کوٹ پتلون، کرسی، میز، چھری کانٹے وغیرہ کے اندر ہے۔ ایسے حضرات کو ہومر، ورجل، ہارس، دانتے، شکسپیئر، ملٹن، شیلے، بائرن، اور ٹینی سن وغیرہم کے حسن و قبح سے کیا خبر ہے جو یورپین شاعری کا دم بھرتے ہیں اور شاعری جیسے امرِ اہم میں رائے زنی کرنے کو مستعد ہو جاتے ہیں۔ ایسے حضرات غزل سرائی کے مادے میں جو جو صورتیں اصلاح کی بتاتے ہیں اس کی نسبت یہی کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے غزل سرائی کی خوبیوں کو عجزِ طبیعت کے باعث درک نہیں کیا ہے یا ان پر انگریزی کا جہل مرکب ایسا سوار ہو رہا ہے کہ جب تک ان کے خیال کے مطابق انگریزی مذاق کے ساتھ غزل سرائی نہ کی جائے تب تک غزل سرائی مطبوع پیدا نہیں کر سکتی۔ ان حضرات سے بعض فرماتے ہیں کہ غزل میں ہمیشہ عشقیہ مضامین باندھے جاتے ہیں جو مخربِ تہذیب ہوا کرتے ہیں۔ لازم ہے کہ ایسے مضامین کے عوض وعظ، پند، نصیحت، اخلاق، تمدن اور نیچرل سینریاں کی باتیں موزوں کی جائیں۔ نیچرل سینریاں عبارت ہیں جبال، بحور، صحرا، میدان، کشت زار، حیوانات، نباتات، ہوا، برق، باراں وغیرہ وغیرہ کی نمود سے۔ ایسے معترضین کی خدمت میں عرضِ راقم یہ ہے کہ غزل وہ صنفِ شاعری ہے کہ جو مضامینِ عشقیہ کے لئے موضوع کی گئی ہے۔ اس کا تقاضا ہی یہ ہے کہ اس میں اعلیٰ درجہ کے وارداتِ قلبیہ، معاملاتِ روحیہ اور امورِ ذہنیہ حوالۂ قلم کئے جائیں۔ اگر واقعی کسی غزل سرا کو ایسے مضامین کی بندش کی قدرت ہے تو اس کی غزل سرائی مخربِ تہذیب ہو نہیں سکتی بلکہ اس کی غزل سرائی سے بہت کچھ اصلاحِ قلب و روح کی امید کی جا سکتی ہے .... اسی طرح وعظ و پند کی نسبت یہ عرض ہے کہ غزل سرائی کو پند و موعظت سے عداوت نہیں ہے البتہ بھونڈے طور کی پند گوئی اور وعظ فرمائی کو غزل جیسی نازک صنفِ شاعری سے کیا علاقہ"۔ (صفحہ ۶۴-۶۶)

یہ خیالات ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے آج لکھے گئے ہوں اور اس متوازن زاویۂ نظر کو پیشِ نظر رکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ بہتر[۷۲] سال پہلے اس مذاقِ سخن کا بیج اگر سرسید کی تحریک اور حالی کی مقبولیت نہ مار کر رکھ دیتی تو آج ہماری فکرِ صحیح میں کچھ زیادہ ہی اضافہ ممکن ہوتا۔ مولانا حالی پر جو صحیح اندازِ نظر آج بھی پیدا نہیں ہو سکا ہے اس کو ان کا ایک ہم عصر ۱۸۹۷ء میں کتنے صحیح زاویہ سے دیکھ رہا تھا، اس کا اندازہ اگر جدید نقادوں کو ہو سکے تو شاید وہ اردو ادب کے زوال اور اس کی موجودہ حالت پر زیادہ بہتر طور پر سوچ سکیں۔ تو لیجئے ملاحظہ کیجئے اور فیصلہ کیجئے کہ یہ صداقت زیادہ مثبت اور متوازن تھی یا حالی کا منفی نقطۂ نظر:

"ایسی تنگ چشمی کا عارضہ انہی حضرات کو لاحق دیکھا جاتا ہے جن کی وسعتِ نظر بہت کم ہے اور اس کمیِ وسعتِ نظر کے ساتھ اپنے کو بلند نگاہ، بالا بیں اور حقیقت آگاہ سمجھتے ہیں۔ نعوذ باللہ اس زمانہ میں شائستگی کا مرض ایسا پھیلا ہے کہ خدا تیری پناہ۔ ایسے حضرات جہاں کچھ ادھوری یورپین وضع کے پابند ہو گئے اپنے کو شائستہ سمجھنے لگے۔ اگر ظاہری وضع نہیں بدلی تو اپنے نکمے خیالات کو عین حکماء و علمائے یورپ کے خیالات جاننے لگے۔ یہ مرض طاعون، چیچک، ہیضہ، سیاہ بخار وغیرہ سے زیادہ مضرِ قوم ہے اور کیوں نہ ہو ایسے لوگ زبان و علوم سے بے بہرہ رہ کر فضل و کمالاتِ یورپ کی راہ کے خضر اپنے آپ کو بتاتے ہیں۔" (صفحہ ۳۶۵-۳۶۶)

بقول اکبر ؎

دوستوں نے انہی حضرت کو خضر سمجھا ہے ان کی چالیں تو لئے جاتی ہیں اعدا کی طرف

غالباً مندرجہ بالا حقائق کے بعد یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ سرسید کو ان کا ہمعصر زمانہ بھی جس میں اس زمانے کے جدید اہلِ فکر بھی شامل تھے، جس نظر سے دیکھ رہے تھے اور سرسید کی تحریک جس بنا پر کامیابی سے ہمکنار ہوئی اس کا بنیادی نکتہ ایک ہی تھا اور وہ یہ ہے ؎

زبانی کہتے ہیں سب کچھ مگر حقیقت میں وہ صرف قوتِ فرمانروا کو مانتے ہیں

اور یہ خیالات دیوبند، لکھنؤ، بریلی اور پنجاب کے غریب "ملاؤں" کے نہیں یا بقول آپ کے دینی مدارس اور اداروں کے "قل آعوذیوں" کے نہیں بلکہ سرسید کے عہد کی ان ممتاز شخصیتوں کے تھے جن سے اس وقت کی جدید فکر اور جدید شعور عبارت تھا ــــ دراصل سرسید کی فکر بھی خالص علماء کی فکر کی طرح منفی فکر تھی۔ جس طرح علماء جدید فکر، جدید علوم اور سائنسی ترقی سے اپنی قوم کو محروم رکھنا چاہتے تھے اسی طرح سرسید اس کے برخلاف انگریزی حکومت کی غلامی اور مغرب کی نقالی پر اپنا سب کچھ اور خصوصیت سے مذہب کو قربان کر دینا چاہتے تھے۔ ان دونوں انتہا پسندانہ رویوں کے درمیان ہمیں ایک متوازن، محبِ وطن، خوددار اور باغیرت قوم کے ایسے سوچنے والوں کا طبقہ ملتا ہے جس کی نظر میں تعلیم کے معنی نہ ذہنی غلامی تھے اور نہ جہالت بلکہ وہ اس کو ایک قوم کی ترقی اور آزادی کے لئے ایک آلۂ کار سمجھتا تھا اور جانتا تھا کہ اپنے قومی ورثہ اور انفرادیت کے بغیر کوئی قوم صحیح معنی میں ترقی نہیں کر سکتی۔ یہی وہ تعلیم تھی جس کو اس نے براہِ راست مغربی علوم اور مغربی فکر سے اخذ کیا تھا مگر آج کے ایم۔ اے تک پڑھے ہوئے طالبِ علم صرف نصابی کتابوں میں لکھے ہوئے حروف کو ہی حرفِ آخر سمجھتے ہیں اس لئے ریاض صدیقی صاحب سے عرض ہے کہ وہ پہلے اپنے موضوع کا غیر جانبداری اور دیانتداری سے پورا مطالعہ کریں۔ یک طرفہ معلومات پر ایمان رکھنا ویسے بھی کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ اب صرف اتنی بات رہ جاتی ہے کہ آخر سرسید ہی کی طرزِ فکر کو غلبہ اور کامیابی کیوں حاصل ہوئی تو یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اگر کسی نظریہ کی پشت پناہی کوئی صاحبِ اقتدار طبقہ یا حکومت کر رہی ہو تو اس کے مقابلہ پر ایسے افراد کی کاوشیں جو حکومت کے مفاد کے خلاف اور اس کے مقاصد کے لئے مضر ہوں یقیناً کس مپرسی کے عالم میں سسک سسک کر دم توڑ دیتی ہیں۔ سرسید کو انگریزی حکومت جس لئے استعمال کر رہی تھی اس کا مقصد ذہنی غلامی کو ایک صاحبِ کردار اور جرأت مند قوم میں اس طرح پیدا

کرنا تھا کہ اس کی تمام انفرادی قوتیں مفلوج ہو کر رہ جائیں۔ اس لئے برٹش گورنمنٹ نے اس مہم میں ہر اس تحریک کی پشت پناہی کی جس کا مقصد حکومت سے مرعوبیت اور مغرب کی برتری ثابت کرنا ہو، اسی کے ساتھ علی گڑھ کالج اور یونیورسٹی کو نہ بھولئے جس نے اپنی قوم کو حکومت برطانیہ کے ان مقاصد کے لئے بڑی حد تک تیار کیا۔ اگر علی گڑھ یونیورسٹی سے تحریک آزادی کے چند بڑے نام بھی وابستہ ہیں تو یہ علی گڑھ یونیورسٹی کی کسی خوبی کا ثبوت نہیں بلکہ یہ اس قوت کا اظہار ہے جو باطنی طور پر سرسید تحریک کے خلاف پورے معاشرے میں جاری و ساری تھی۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ انگلیوں پر گنے ہوئے چند ناموں کے علاوہ علی گڑھ یونیورسٹی کے تیار کئے ہوئے ننانوے فی صد ذہن آخر حکومت کی ملازمت اور محض کلرکی کے کام ہی آئے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کی کامیابی کے اس نتیجہ کو دیکھ کر آج پاکستان میں بھی سرسید فکر کے ایک جدید مفسّر مسٹر غلام احمد پرویز کی تعلیمات کے لئے سنا ہے کہ ایک ایسی ہی یونیورسٹی کی اسکیم زیرِ غور ہے۔

اگرچہ پولٹیکل بحث میں ہوئے ہیں شریک — جناب پنڈت جے چند و بابو آشوتوش
مگر ہمیں تو ہے بالکل سکوت اس مد میں — سُجھا گئے ہیں یہ مضمون سیدِ ذی ہوش

رموزِ مملکتِ خویش خُسرواں دانند
گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

(۲)

جہاں تک اس بحث کے دوسرے پہلو کا سوال ہے مجھے یاد پڑتا ہے کہ ابو شہاب رفیع اللہ کے یہی خیالات میں کسی اور جگہ کسی اور ضمن میں پڑھ چکا ہوں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ابو شہاب رفیع اللہ وہاں پروفیسر رفیع الدین گئے ہیں اور انہوں نے اپنی پہلی تمہید کو بدل کر ممتاز احمد صاحب کے مضمون کی تمہید کو اس بحث کے ساتھ منسلک کر دیا ہے۔ گویا اصل مقصد مولانا مودودی کے خلاف چھپوانا ہے۔ بحث سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ بات یقیناً "فنون" جیسے رسالے اور احمد ندیم قاسمی جیسے مدیر کے شایانِ شان نہیں کہ وہ ایک علمی بحث میں ایک شخصیت کے سیاسی کردار سے اختلاف رکھنے کے سبب اسے اپنی مخالفت کا نشانہ بنائیں۔ یہی نہیں بلکہ اس شمارے کے مختلف اوراق میں مولانا مودودی کے خلاف کئی جگہ یہی ردِ عمل دکھائی دیتا ہے جس کی نوعیت خالص سیاسی ہے۔ صفحہ ۲۳۹ پر ایک اور صاحب رقمطراز ہیں۔ "تحریکِ پاکستان کے زمانے میں موصوف نے نظریۂ پاکستان کو سراسر غیر اسلامی قرار دے دیا تھا" یہ ایک خالص متنازعہ اور سیاسی اختلاف ہے جس کا کسی علمی بحث سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ حیرت اس بات پر ہے کہ ایک ہی سانس میں اسی رسالے کے اوراق پر متعدد جگہ اقبال کی فکر کو ترقی پسند فکر اور جدیدیت کا حامل بھی قرار دیا گیا ہے جبکہ ان کا مسئلہ بھی اتنا ہی متنازعہ رہا ہے۔ بعض ترقی پسند ان کی شاعری میں سرمایہ داری کے خلاف بیانات اور "لینن کو خدا کے حضور میں" دیکھ کر انہیں ترقی پسند قرار دیتے رہے ہیں اور بعض انہیں بدتر رجعت پسند اور نازیت کا حامی قرار دیتے ہیں۔ میٹھا میٹھا ہپ اور کڑوا کڑوا تھو کے مصداق اقبال کی سرمایہ دشمنی کی بنا پر اشتراکی خیالات سے جذباتی ہمدردی ہی کو ترقی پسند قرار دینے کے لئے ایک منظم اور سوچی سمجھی ہوئی تحریک شروع کی گئی تھی اور یادش بخیر صرف یہی نہیں بلکہ ایک زمانہ میں اقبال کے (منہ زبانی) بیان کو بہت ہوا دی گئی تھی کہ آخری زمانہ میں اقبال اشتراکی خیال کے حامی ہو گئے تھے۔ ان مفروضات کی ساری قلعی اس جگہ کھل جاتی ہے کہ اقبال کی پوری شاعری میں جس نظریہ اور نظامِ فکر کی تبلیغ ملتی ہے اور جس فلسفہ کا نفاذ انہوں نے اپنی شاعری میں ہر جگہ کیا ہے اس میں ایک جگہ بھی اشتراکیت کے بنیادی نظریات اور اس کے جدلیاتی نظامِ فکر کی تائید میں ایک مصرعہ بھی کوئی آج تک پیش نہیں کر سکا ہے جبکہ اقبال کے بارے میں غالباً کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ انہیں اشتراکیت کے بنیادی نظریات کا علم نہیں تھا اس لئے صرف و محض لینن اور روس کی تعریف و توصیف کے معنی اشتراکی نظریات کے حامی ہونے کے کب سے ہو گئے ہیں؟ یوں تو اقبال نے ایک سے ایک بادشاہ (نادر شاہ امان اللہ) کی بھی تعریف و توصیف کی ہے تو کیا ہم انہیں اس بنا پر بادشاہت اور جاگیرداری

کا حامی سمجھ لیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اقبال کی شاعری کے اس پہلو پر لکھتے ہوئے جان بوجھ کر اس سب سے بڑی صداقت کو نظر انداز کیا جاتا رہا ہے کہ اقبال کی نظر میں اشتراکی فلسفہ نہیں بلکہ روس میں ایک ایسی حکومت کی کامیابی ضرور اہم بات تھی جو ایک طرف مغربی استعمار کی دشمن تھی تو دوسری طرف مشرق کی تمام آزادی کی تحریکوں کی پشت پناہ۔ دراصل ۱۹۱۸ء سے ۱۹۴۵ء تک روس کی اہمیت سارے مشرق میں اس لئے مسلّمہ قوّت کی حیثیت رکھتی تھی کہ وہ ایشیا کی تمام تحاریکِ آزادی کا سب سے بڑا مددگار تھا۔ جو لوگ اس زمانے کے مخصوص سیاسی حالات اور مشرق کی غلامی، انقلابی تصورات اور آزادی کی تحریکات کے پیچیدہ پس منظر میں، روس میں اشتراکی حکومت کی کامیابی کو نظر انداز کر دیتے ہیں وہ کبھی بھی اس پورے دور کی تاریخ اور نفسیات سے واقف نہیں ہو سکتے۔ اس بات کو اس طرح بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ اگر روس کی جگہ اس سے بالکل متضاد کوئی اور نظریہ اور حکومت اس وقت ایسا موجود ہوتا جو مغرب کے خلاف مشرق کو ہر سطح پر آزادی کی نعمت سے بہرہ ور کرنے کی سعی کرتا اور مغربی استعمار اور سرمایہ داری پر حملے کرتا تو وہ بھی روس کی طرح سارے مشرق میں مقبول ہو جاتا۔ بنیادی سوال تو یہ ہے کہ مشرق کے آزاد ہوتے ہی روسی اور اشتراکی اثرات ایشیا میں اتنی بری طرح کیوں پٹ گئے اور بین الاقوامی اشتراکیت کیسے ۱۹۵۴ء کے بعد سے اثر کھونے لگی۔ اور ۱۹۶۰ء میں خود اشتراکی حکومتوں میں کیوں تضاد اور دھڑے بندی پیدا ہو گئی ــــ اگر مندرجہ بالا باتوں پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو ذہن میں بہت سے گوشے خود بخود واضح ہو جاتے ہیں اور یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ مشرق کی تحریکِ آزادی کی جدوجہد میں یہ ناممکن تھا کہ ایک ایسے نظریہ اور ایک ایسی حکومت کو نظر انداز کیا جاتا جس کی ضرورت پورے ایشیا کو سیاسی طور پر اپنی تحریکات کی کامیابی کے لئے تھی۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا بھی بالکل غلط ہوگا کہ مشرق میں فکری سطح پر خالص اشتراکی یا مارکسی نظریات پورے طور پر قبول کر لئے گئے تھے۔ اگر کوئی صاحب اقبال کی پوری شاعری سے ایک سطر بھی ایسی نکال دیں جو اسلام کے مقابلہ پر اشتراکیت کی فکر اور اس کے بنیادی نظریہ کی تبلیغ کرتی ہو تو مجھے اپنی غلطی مان لینے میں ہرگز کوئی عذر نہ ہوگا۔ اسی طرح اقبال کی تمام نثری تحریریں جن خیالات کی حامل ہیں ان میں اس دور کے مخصوص حالات سے پیدا شدہ بعض خیالات اور اس کی تاویل ضرور مل جاتی ہے مگر وہ محض اسی دور کے سیاسی حالات کے مخصوص اثرات ہیں۔ ان سے اقبال کے بنیادی نظریہ کی کہیں بھی تردید نہیں ہوتی۔ اس روشنی میں اگر بے چارے ممتاز احمد صاحب نے یہ لکھ دیا کہ مولانا مودودی کی تحریک اقبال کی فکری تحریک کے ایک عنصر کو آگے بڑھاتی ہے تو انہوں نے کون سا غضب کیا اور کون سا ٹھور مار دیا ہے؟ کیا اسلام اقبال کی بنیادی فکر کا عنصر نہیں؟ اور کیا مولانا مودودی اسلامی فکر کے ایک داعی نہیں؟ جس طرح اقبال کی بعض تعبیرات ان کے عہد کا منطقی اور فطری اظہار کہی جا سکتی ہیں اسی طرح مولانا مودودی کے نظریات موجودہ عہد کی فکر کے اثرات کا نتیجہ ہو سکتے ہیں (جب کہ بقول ترقی پسند حضرات یہ عہد اقبال کے بعد ہی پیدا ہوتا ہے)

ذاتی طور پر مجھے مولانا مودودی کے نظریات سے سخت اختلاف ہے مگر ان کی تحریروں کو اسی ذوق و شوق سے پڑھتا ہوں جس طرح مادّے تنگ کی تحریروں کو۔ کیونکہ فکری سطح پر ان کے خیالات اپنے اپنے فکری نظام سے متعلق ہیں۔ ان کے نظریات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے ان کی تعبیرات میں اختلاف ممکن ہے مگر ان کی اہمیت سے فکری سطح پر منکر ہونا ایک سیاسی کارکن کو تو زیب دیتا ہے مگر ایک پڑھنے والے کو نہیں ــــ بنیادی سوال تو یہ ہے کہ اسلام ایک نظریہ اور ایک نظامِ فکر ہے یا نہیں ہے ــــ اور یہ بحث دیانتداری سے ان خطوط ہی پر آگے بڑھ سکتی ہے ورنہ محض سانپ اور نیولے کی جنگ ہو کر رہ جائیگی ــــ اگر اسلام ایک باقاعدہ نظامِ فکر اور نظریہ حیات کو پیش کرتا ہے تو اس کا ہر داعی اتنا ہی اہم ہو جاتا ہے جتنے دیگر نظریات فکری نظام اور نظریہ حیات کے داعی ہو سکتے ہیں جن سے اگر فکری سطح پر اختلاف کیا جا رہا ہو تو اس کو کسی شخص کے سیاسی کردار یا عمل سے منتھی نہیں کرنا چاہیے۔ یہ تو بالکل ایسی بات ہوگی جیسے فیض صاحب کے نظریہ اشتراکیت پر اس لئے حملہ کیا یا اس سے مخاصمت باندھا کہ وہ ایک بورژوا کی طرح رہتے ہیں اور ایک مفلس ملک میں جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی بود و باش اور طرزِ رہائش رکھتے ہیں۔

(شمیم احمد)

آغا سہیل

اثر لکھنوی

بات اثر صاحب کے باب میں شروع کیجئے تو لکھنؤ کا ذکر خود بخود چھڑ جاتا ہے۔ نہ لکھنؤ کی بات کے بغیر اثر صاحب کا ذکر مکمل ہوتا ہے نہ اثر صاحب کے بغیر لکھنؤ کا۔ لکھنؤ کی وہ تہذیبی زندگی جو اپنی حشر سامانیوں اور گوناگوں کیفیتوں کے باعث شمالی ہند کی تمدنی اور ثقافتی زندگی پر آج بھی گہرا اثر ڈال رہی ہے عرصۂ دراز تک مسلمانوں کی نمائندہ تہذیب رہ چکی ہے (جس کے باب میں عموماً کم سوادی کو دخل رہا ہے اور متعصب مورخوں اور ادیبوں نے اسے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی ہے۔ اگر مسلمان اسلامی تہذیب کا احیاء چاہتے ہیں تو انہیں دلی، لکھنؤ، حیدرآباد، بھوپال اور رامپور وغیرہ کے صحت مند تہذیبی اقدار کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔) اثر صاحب اسی تہذیب کے روحِ رواں تھے۔

اثر صاحب کا زمانہ جانِ عالم کے لکھنؤ کا نہیں تھا (جانِ عالم کے لکھنؤ کو بھی انگریزوں نے بربنائے مصلحت بدنام کیا تھا۔ آج جدید تاریخ جو تحقیق کی اساس پر استوار ہے ان تہمتوں کو جھٹلاتی ہے جو انگریزوں نے تراشی تھیں۔ نگاہِ بصیرت کی ضرورت ہے) لیکن ۱۸۵۶ء کے بعد بھی لکھنؤ پر عرصے تک اسی تہذیب کا سایہ رہا۔ انگریزوں کا تسلط صرف جاگیرداروں اور نوابوں پر تھا۔ عوام الناس انہیں نوابوں اور جاگیرداروں کی رعیت تھے لہٰذا بڑی حد تک لکھنؤ کی تہذیبی زندگی میں ایرانی عنصر جو سلاطینِ اودھ کا خصوصی وصف تھا، غالب رہا۔ ایران کا محرم جو لکھنؤ میں ایک نئے انداز سے شروع ہوا صرف خواص تک محدود نہ تھا۔ گھر گھر تعزیہ داری، ماتم داری، نوحے خوانی، مرثیے خوانی نے یہاں کے عوام پر گہرا اثر ڈالا تھا اور مسلمانوں کے دوسرے فرقوں کا کیا ذکر کیجیے، ہنود نے بھی یہ اثرات قبول کئے تھے۔ غم اور خوشی کے اظہار کے تمام اجتماعی پہلو اور ان کے تمام اسالیب اسی تہذیب کے منت کش تھے۔

نوابوں اور جاگیرداروں نے انگریزی زبان سے سمجھوتا کچھ مصلحتِ وقت کی بنا پر کر لیا تھا اور کچھ سرسید کی تحریک سے متاثر ہو کر۔ لکھنؤ میں اودھ پنچ جیسا رسالہ جو سرسید کے خلاف تھا، موجود تھا اور اکبر الٰہ آبادی کی سرسید مخالفت بھی اخیر اپنا کچھ اثر و رسوخ رکھتی تھی۔ فنونِ لطیفہ میں عوام و خواص دونوں کا مزاج و مذاق مشرقی تھا لہٰذا اثر صاحب کا خانوادہ بھی اسی مشرقی تہذیب و تمدن کا نمونہ تھا۔ جہاں انگریزی تہذیب کی ایک شعاع تک نہ پہنچی تھی۔ نوجوانوں کو عربی فارسی کی تعلیم کے ساتھ انگریزی کی تعلیم بھی دلا دی جاتی تھی چنانچہ اثر صاحب نے بھی حاصل کی لیکن صرف حصولِ اقتدار اور حصولِ اعزاز کے لئے نہ یہ کہ اسے مقصدِ حیات سمجھا جاتا ہو۔

اثر صاحب کچھ اوپر اسّی سال جئے۔ ۶ جون ۱۹۶۷ء کو ان کا انتقال ہوا اور اس دورِ حیات میں انہوں نے کئی زمانے دیکھے۔ یہی وہ دور ہے جب اردو شعر و ادب نے بھی کئی زمانے دیکھے اور گلستانِ اردو کی آبیاری کے نتیجے بہت سے شعراء و ادباء پیدا ہوئے، بہت سی تحریکیں اٹھیں، سینکڑوں انجمنیں بنیں، لاتعداد رسالے اور اخبار نکلے اور لکھنوی تہذیب کے پرسکون سمندر میں بھی کئی بار طغیانیاں آئیں، بھنور پیدا ہوئے، ان گنت غواص ڈوب گئے اور سینکڑوں ڈوب کر نکلے تو گہر ہائے آب دار ساتھ لائے۔ اثر صاحب نے یہ تمام ادوار دیکھے۔ تاریخی اور عمرانی عوامل نے اردو کے مزاج و مذاق میں جو جو

تبدیلیاں کیں، اثر صاحب یہاں بھی خاموش تماشائی نہیں رہے بلکہ انھوں نے ان تمام باتوں کو بغور دیکھا، سمجھا اور ان کا بخوبی مطالعہ کیا۔ ان تمام انقلابات اور تبدیلیوں کا تدریجی طور پر پتہ چلانے کے لئے اثر صاحب کی شروع سے آخر تک تمام تحریروں کا بالاستیعاب مطالعہ ناگزیر ہے۔ اس کے بغیر کوئی رائے قائم کرنا محض بددیانتی ہے۔

نواب مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی کی موت ایوانِ ادب کے ایک اہم ستون کے گرنے کے مترادف ہے۔ راقم الحروف کو اس فقرے کی معنویت کا بخوبی علم ہے اور یہ فقرہ جذبات اور احساسات سے علیحدہ ہو کر لکھا جا رہا ہے۔ جو محض ایک ادنیٰ اعتراف ہے اُن کے اُن خدماتِ شعر و ادب کا جو مرحوم نے بڑی لگن اور خلوص سے انجام دیئے۔ ذیل میں جو چند سطریں مرحوم کے باب میں سپردِ قلم کی جا رہی ہیں ان میں اس مقدمے سے بھی بحث کی جائے گی۔

اثر صاحب لکھنؤ کے اس علاقے سے تعلق رکھتے تھے جو زبان و ادب میں ہمیشہ معزز اور محترم سمجھا جاتا تھا۔ فرنگی محل اور کٹرہ ابو تراب خاں کے ثقہ حضرات سارے شہر میں مشہور تھے۔ ان کی زبان کا سکہ چلتا تھا۔ ان کے تلفظ کو بطور سند پیش کیا جاتا تھا۔ کہتے ہیں کہ کاروبارِ حیات نے اجتماعی زندگی کو بہت تیز کر دیا ہے اور اب نہ زبان کی نوک پلک دیکھنے کی ضرورت ہے اور نہ وقت ہے۔ زبان کو زیادہ فطری بنانے کے لئے مناسب ہے کہ یوں ہی چھوڑ دیا جائے۔ لسانی نقطۂ نظر سے یہ بات بڑی اچھی معلوم ہوتی ہے لیکن غور کیجئے تو اس میں سہل انگاری بھی ہے اور کم سوادی بھی۔ اس جملہ معترضہ کو دو باتوں کے اضافے کے ساتھ ختم کرنے کی اجازت چاہتا ہوں[1]۔ بعض لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ پاکستانی اور ہندوستانی اردو میں دھیرے دھیرے فرق رونما ہو رہا ہے جو فطری ہے۔ ہندوستانی اردو ہندی کی طرف اور دوسری مقامی بولیوں کی طرف جھک رہی ہے اور پاکستانی اردو عربی فارسی کی طرف اور دوسری مقامی بولیوں کی طرف مائل ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا ہونا بالکل ایک فطری عمل ہے لیکن جو حضرات اس بات پر اصرار کر رہے ہیں کہ تلفظ میں معیار بھی انہیں مقامی بولیوں کے "زیرِ اثر اردو" کو بنا دیا جائے جو ہمارے پاکستان کے علاقوں میں رائج ہیں، صحیح نہیں ہے خواہ بادی النظر میں یہ بات کتنی ہی حسین کیوں نہ ہو۔ اس بات کا مطلب تو یہ ہوگا کہ اردو کو جس میں ارتقاء کا عمل بتدریج ہوا تھا اور جس نے صدیوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا تھا اور بہت سے مقامات کے اچھے اثرات کو قبول کر لیا تھا، رجعتِ قہقری پر مجبور کیا جائے اور ساری ترقی پر پانی پھیر دیا جائے اور اسے ملیا میٹ کر دیا جائے۔ میں عرض یہ کرنا چاہتا ہوں کہ زبانوں کے نظامِ اصوات کو اگر مدِ نظر رکھئے اور یہ دیکھئے کہ کن اصوات کا عمل خوشگوار اور حسین ہے تو لکھنؤ کی زبان کو اس اعتبار سے برتری حاصل ہوگی کہ یہاں اودھی اور پوربی کے لب و لہجہ کے ساتھ ایرانی فارسی کا نہایت شیریں لب و لہجہ بھی شامل ہو کر تلفظ میں نرمی اور لوچ اور مٹھاس پیدا کر دیتا ہے جو بہر حال پسندیدہ ہے۔ لسانی نقطۂ نظر سے بھی PHONEMICS اور PHONETICS کے تجربات جو یورپ کی جدید تجربہ گاہوں میں ہو رہے ہیں تلفظ میں اصوات کے اس عمل کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس کسوٹی پر بھی صرف لکھنوی اردو کا تلفظ سب سے زیادہ شیریں اور مؤثر ٹھہرتا ہے۔ علاوہ اس کے صرف قومی زبانوں ہی میں نہیں بین الاقوامی زبانوں میں بھی معیار کا مسئلہ جذبات سے الگ ہو کر طے کیا جاتا ہے۔ انگریزی زبان کے بارے میں بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگر فلاں صاحب کو پردے میں بٹھا دو تو انگریزی زبان سن کر تم یہ نہیں سمجھ سکتے کہ وہ انگریز نہیں ہے۔ لیکن جب اردو کا معاملہ آتا ہے تو معیار کے لئے کسوٹیاں بنائی جاتی ہیں اور اپنی بات منوانے کے لئے نت نئے ڈھنگ ایجاد ہوتے ہیں۔

---

[1] اس ذیل میں ماہنامہ نصرت شمارہ دورِ جدید: چودہ دسمبر ۶۶ء جنوری ۶۷ء میں صفحہ ۹ پر "پاکستانی اردو اور ہندوستانی اردو" قابلِ ملاحظہ ہے جس کا لب لباب اور حاصل زبردست مغالطے پر مبنی ہے (آغا سہیل)

یوں تو ساری دنیا میں انگریزی بولی جاتی ہے لیکن جب معیار کا مسئلہ سامنے آتا ہے تو آخر بی بی سی ہمارے لیے معیار کیوں بن جاتا ہے؟ بہر حال لکھنؤ کو یہ شرف حاصل تھا کہ وہ تمام شمالی ہند میں بھی منفرد، متنوع اور وقیع حیثیت کا مالک بنا اور جنوبی ہند میں بھی۔ کٹرہ ابوتراب خاں ثقہ حضرات خصوصاً علماء و متقیانِ دین سے مملو تھا جہاں علوم کے خزانے اور فنون کے ذخیرے موجود تھے۔ اثر لکھنوی نے اسی علمی ماحول میں آنکھ کھولی اور اسی گہوارۂ تہذیب میں تربیت پائی۔ عربی و فارسی کی تعلیم کے ساتھ ساتھ جوبلی کالج لکھنؤ میں (جو اس وقت ہائی اسکول تھا) تعلیم پائی۔ بعدہٗ کیننگ کالج لکھنؤ سے انٹر اور بی۔ اے کیا۔ ۱۹۰۶ء میں تمام تعلیمی سفر ختم ہو گیا۔ قانون پڑھنا چاہتے تھے لیکن ڈپٹی کلکٹری مل گئی جو مسلمانوں میں معراج سمجھی جاتی تھی۔ خوش اسلوبی اور دیانت داری سے کام کرتے رہے۔ خطابات بھی ملے۔ ترقیاں بھی کیں۔ قیامِ پاکستان سے قبل کشمیر کی ریاست کے وزیرِ اعظم بھی رہے لیکن خود اثر صاحب ان چیزوں کو اپنا میدانِ عمل نہیں سمجھتے تھے۔ جس شیفتگی سے انہوں نے اپنے ادبی مشن کو اس مقطع میں واضح کیا ہے اسی پر آخر وقت تک عمل پیرا رہے:

اثر ہے نام، وطن لکھنؤ، عزیز استاد　　　نکالتا ہوں نئے راستے زباں کے لئے

لکھنؤ کا اہم ادبی مقام لکھنؤ کے باہر بھی تھا اور اس کے معیار کو تسلیم کیا جاتا تھا (لکھنؤ نے زبان کی جس طرح خدمت کی ہے اور جس قدر کی ہے وہ دوسرے مقامات کے خدمات پر بھاری ہے ــــ لفظوں کے مزاج اور تلفظ کے اصوات کے ذیل میں جب کبھی کوئی قابلِ لحاظ کام کیا جائے گا تو اہلِ علم کو اس بات کا علم ہو جائے گا) بہر حال لکھنؤ میں شعر و شاعری کا مذاق عام تھا۔ جگہ جگہ بکثرت مشاعرے ہوتے تھے۔ اثر صاحب نے ان عام مشاعروں میں عدم شرکت ہی کو مناسب سمجھا۔ اہلِ علم کی نگاہیں صفی اور عزیز جیسے شعرا پر لگی تھیں جو لکھنؤ کے بدنام دبستان شاعری کی پیروی کرنا باعثِ ننگ و عار سمجھتے تھے اور میر و غالب کو غزل کے فن کا استاد سمجھتے تھے۔ یہی وہ دور تھا جب زبان و بیان کی تمام خوبیوں، لطافتوں اور نزاکتوں کے ساتھ میر و غالب کا تتبع کیا گیا۔ ناسخ کے معیارِ زبان کو تسلیم کیا گیا۔ مصحفی و انشا کے علاوہ آتش کے حسنِ بیان پر سر دھنا گیا۔ میر حسن، نسیم اور مرزا شوق کے فن کو سمجھا گیا۔ انیس و دبیر کا مرتبہ متعین ہوا اور اسلاف پر کھل کر تنقیدیں ہوئیں، چنانچہ اس کا نتیجہ "انجمنِ معیار" کی شکل میں برآمد ہوا۔ صفی و عزیز کے علاوہ فانی، یگانہ، اصغر، شاد، آرزو، شوق اور بعدہٗ جوش، اثر، جگر، فراق، ثاقب، محشر اور چکبست وغیرہ پیدا ہوئے۔ اثر صاحب اس روشن خیال نوجوان طبقے سے تعلق رکھتے تھے جو اہلِ علم کی محنتوں پر بھی نگر رکھتا تھا اور مغربی تہذیب میں انگریزی شعر و ادب سے جو صحت مند اقدار پیدا ہوئے تھے ان سے بھی صرفِ نظر نہیں کر سکتا تھا۔ حالی اور آزاد کو بھی نظر انداز نہیں کرتا تھا۔ اور نہ مغربیت کی اندھی تقلید پر راضی تھا۔ دونوں کے بین بین جو راستہ ملا اس پر اکثر شعراء نے عمل کیا اور میدانِ ادب میں رخشِ فکر کو گرم رَو کیا۔ اس تمام طبقے میں اثر صاحب سب سے زیادہ صاحبِ بصیرت، صاحبِ ذوق، صاحبِ نظر، صاحبِ دل اور صاحبِ علم تھے۔ لیکن بعض مستثنیات کے ساتھ۔ کیونکہ انفرادی طور پر، ہر صاحبِ فن کا ذوقِ جمال اور شعری وجدان یکساں نہیں ہوتا۔ مثلاً فراق اور اثر دونوں میں بیشتر قدرِ مشترک ہیں لیکن نقاطِ نظر کے فرق نے دونوں کی شعری شخصیتوں کی تربیت و تہذیب الگ الگ اصولوں کے تحت کی ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔

اثر صاحب نے نظم و نثر دونوں کو وسیلۂ اظہار بنایا ہے اور نظم و نثر کے مختلف اصناف کو نہ صرف یہ کہ اظہار کا ذریعہ بنایا بلکہ بعض کی تربیت بھی کی ہے اور ان کو ایک لہجہ عطا کیا ہے۔ ان کے متفرق مضامین، غزلوں اور نظموں کے علاوہ منضبط شکل میں مندرجہ ذیل مجموعے راقم الحروف کی نظر سے گذرے ہیں:-

(۱) بہاراں　　　دیوان

(۲) اثرستان	دیوان
(۳) لالہ و گل	قطعات و رباعیات
(۴) چھان بین	تنقیدی مضامین کا مجموعہ
(۵) مزامیر	میر کا مطالعہ
(۶) میر انیس کی مرثیہ نگاری	میر انیس کا مطالعہ
(۷) فرہنگِ اثر	فرہنگِ امثال
(۸) لیڈی از یوُر	منظوم ڈراما
(۹) رنگ بست	مشرق و مغرب کی شاہکار نظموں کے ترجمے

لیکن ادبی حیثیت سے اجمالاً ان تمام کتب کا جائزہ لینے سے قبل مناسب یہ ہے کہ ان کی پرکشش اور دلآویز شخصیت کے بارے میں چند فقرے لکھے جائیں۔ جن لوگوں نے انہیں دیکھا ہے وہ گواہی دیں گے اور جنہوں نے بدقسمتی سے شمالی ہند کی مشرقی تہذیب کے اس نمونے کی زیارت نہیں کی وہ افسوس کریں گے کہ اثر جیسی شخصیت بھی اب پیدا نہیں ہو گی۔ فلک برسوں پھرتا ہے تب کہیں خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں۔ اثر ایسے ہی انسانوں میں تھے جو صدیوں کے طول و عرض میں کبھی پیدا ہوتے ہیں۔

اونچا قد، متوسط جسم، گوری رنگت، اونچی مسکراتی ہوئی پیشانی جو ہر آنے والے کا خیر مقدم کرتی۔ سنہری عینک میں من موہنی آنکھیں، غضب کی جامہ زیبی، کبھی مغربی لباس زیبِ تن، کبھی صمرو کی شیروانی پیجامہ اور ایرانی ٹوپی اور سیاہ پمپ، موٹر سے اترتے تو ایک ہاتھ میں پانوں کی ڈبیا دوسرے میں بیاض۔ گھر کے ڈرائنگ روم میں دیدار ہوتا تو جاڑے میں ڈریسنگ گاؤن، گرمی میں چکن کا قیمتی لکھنوی کرتا پہنے ہوئے برآمد ہوتے۔ آتے ہی گلے سے لگاتے، کلیجے میں بٹھاتے اور صاحب سلامت مزاج پرسی کے بعد، کبھی شکوے شکایات کے بعد ادبی گفتگو کا آغاز ہو جاتا اور کبھی چھوٹتے ہی کوئی شعر زبان پر آجاتا جو قلبی احساسات کا ترجمان ہوتا۔ میں اس حکایت کو لذیذ تر بنانے کے لئے بہت کچھ لکھتا اور بڑے دفتر سیاہ کرتا لیکن کیا کروں یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔ میرے ان سے جو ذاتی تعلقات بر بنائے قرابت تھے ان کو اس لئے نظر انداز کر رہا ہوں کہ لوگوں کو خودستائی کا گمان گذرے گا اور معلوم نہیں لوگ کن ظنون میں مبتلا ہوں۔ علاوہ بریں مجھے خود بھی یہ اندیشہ ہے کہ کہیں ذاتی لگاؤ کی بنا پر میں جذباتی نہ ہو جاؤں اور معروضی نقطہ نظر داخلی نہ ہو جائے جو نقد و تبصرے میں بھی خارج ہو سکتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اثر صاحب کی ظاہری وجاہت سے ہر شخص متاثر ہوتا تھا۔ شخصیت کا یہ حصہ بڑا جاذبِ توجہ تھا۔ ٹھہر ٹھہر کر سکون سے گفتگو کرتے تھے۔ لہجہ بڑا مستعلیق اور تلفظ بڑا نرم اور میٹھا ہوتا تھا۔ حفظِ مراتب کا لحاظ رہتا تھا۔ مجھے ایسا کوئی اتفاق نہیں ہوا جب میں نے اثر صاحب کو ان کے بزرگوں کے ساتھ دیکھا ہو لیکن قرینہ یہ کہتا ہے کہ بزرگوں کے سامنے زانوئے ادب تہہ کر کے نگاہیں جھکا کر بیٹھتے ہوں گے۔ برابر والوں اور خوردوں کے سامنے بھی اور کسی ادبی محفل میں بھی یہی انداز رہتا تھا۔ صرف صحیح اور معقول شعر کی مناسب لفظوں میں تعریف کرتے تھے۔ لوگوں کو شکایت بھی رہتی تھی۔ بعض لوگ انہیں مغرور اور خود پسند سمجھتے تھے اور ان کی خاموشی پر فقرے چست کرتے تھے کہ صاحب وہ تو "پنبہ دہن" بنے بیٹھے رہتے ہیں نہ منہ سے بولتے ہیں نہ سر سے کھیلتے ہیں ـــــ نہ گڑ کھٹا نہ میٹھا ـــــ لیکن اثر صاحب نہ تحسین ناشناس سے خوش ہوتے تھے اور نہ فضول تعریف کرتے تھے بلکہ نقد و نظر سے کام لیتے تھے خواہ اس کا اظہار کریں یا نہ کریں لیکن ذہن اسی امر کا عادی تھا چنانچہ ایک بار بڑی مزیدار بات ہوئی۔

لکھنو ریڈیو اسٹیشن سے ایک مشاعرہ نشر ہوا۔ اثرؔ، جگرؔ اور یگانہؔ جیسے بزرگ بھی اس میں شامل تھے۔ یگانہ صاحب نے رباعیاں سنائیں، بات آئی گئی ہو گئی۔ مشاعرہ ختم ہوا۔ اثرؔ صاحب نے گھر پہنچ کر یگانہؔ مرحوم کو خط لکھا کہ حضرت فلاں رباعی جو آپ نے پڑھی تو وہ مروجہ بحور سے خارج ہے۔ آخر وہ کس بحر میں ارشاد ہوئی ہے؟ یگانہؔ صاحب بھی آخر ایک ہی استاد تھے جنہوں نے غالب کو نہ بخشا، اثرؔ صاحب کے استاد عزیزؔ کو معاف نہ کیا، بھلا اثرؔ صاحب کو کیا خاطر میں لاتے۔ لکھا، صاحبزادے یہ کسی مروجہ بحر میں نہیں ہے۔ میں نے طبلے کی تھاپ پر کہی ہے۔ تقطیع منظور ہو تو ترتالے[1] کا تجزیہ کر لیجیے۔ اثرؔ صاحب اکثر اس واقعے کو دہراتے تھے اور یگانہؔ صاحب کے باب میں یہ لطیفہ سناتے تھے۔ خیر حاصلِ کلام یہ کہ اثرؔ صاحب مشاعروں میں بھی کافی محتاط رہتے تھے اور چھپے ہوئے کلام کے بارے میں بھی ان کا یہی انداز تھا۔ کوئی ہو، کیسا ہی ہو وہ کسی کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ اپنے نزدیک جو صحیح بات سمجھتے تھے وہ کہہ گزرتے تھے۔ "چھان بین" کی ابتدائی سطروں میں گزارش کے عنوان سے سطر نمبر ۱۱ صفحہ ۲ سے صفحے قبل پر فرماتے ہیں

"...... منشاء اولین اپنی ذہنی آسودگی بعد ازاں دوسروں تک تبلیغ ہوتی ہے تاکہ ذوق ادب عام ہو اور کھوٹے کھرے کا پردہ کھل جائے۔ حاشا کسی سے ذاتی عناد یا پرخاش نہیں، البتہ شخصیت سے مرعوب ہونا مجھے نہیں آتا ؎

منصور ہوں فرقہ "انا" کا
حق امر زباں سے فاش نکلا

اثرؔ ــــــــ"

فرقہ انا کے وہ منصور تو تھے لیکن صرف ادبی معاملات میں۔ ویسے بڑے صاحب مروت اور مرنجاں مرنج، حلیم الطبع اور سلیم المذاق تھے۔ تنقید میں ان کے اپنے چند وضع کردہ اصول تھے جن پر وہ نقد و نظر کی عمارت استوار کرتے تھے اور اپنے ذوقِ سلیم کو ہادی و رہنما تسلیم کرتے تھے۔ کسی مدرسۂ فکر سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ عملی اور نظری تنقید کے ذیل میں زیادہ مفصل گفتگو کا یہ موقع نہیں ہے۔ صرف اس قدر کہنا کافی ہے کہ انہوں نے اردو فارسی اور انگریزی ادب کے مطالعے سے جو کچھ حاصل کیا تھا اور جس کو ان کے ذہن نے قبول کر لیا تھا اسی پر تنقید کی اساس تھی۔ خواہ یہ طریقِ کار صحیح ہو یا غلط، اثرؔ صاحب بہر حال اس پر عمل پیرا رہے۔ "چھان بین" ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس میں انہوں نے بعض مقامات پر اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے۔ میں ان کے متفرق تنقیدی مضامین کے مطالعے سے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مرحوم کسی بات کا فوری اثر قبول کر کے اس کا ردِ عمل ظاہر کر دیا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ غم و غصے کی کیفیت بھی ظاہر ہو جاتی تھی اور بعض اوقات لہجے کی تندی و تیزی بھی۔ اگرچہ یہ بات ان کی ذات کا ایک لازمی جزو تھی لیکن صرف تحریر میں ظاہر ہوتی تھی، عام گفتگو میں نہیں۔ عام گفتگو میں موضوع تو ادبی ہی ہوتا تھا لیکن محبوب ترین ادبی موضوع میرؔ تھا۔ مرحوم کو میرؔ کی شاعری سے عشق کی حد تک

---

[1] اہلِ فن بخوبی جانتے ہیں کہ ترتالے میں سولہ رکن ہوتے ہیں یعنی

۱ تھاپ	۲	۳	۴ یہی رباعی کے اوزان
۵ تھاپ	۶	۷	۸ ہیں۔
۹ خالی	۱۰	۱۱	۱۲
۱۳ تھاپ	۱۴	۱۵	۱۶ آغا سہیلؔ

شیفتگی تھی۔ خود ہی نقل کرتے تھے کہ جوش ملیح آبادی نے ایک روز بالآخر زچ ہو کر کہا۔ "اثر صاحب! اب تو یہ جی چاہتا ہے کہ آپ میر کا مرثیہ پڑھیں ہم سینہ کوبی کر کر کے کہیں ہائے میر وائے میر ـــــ" اور خود ہی متبسم ہوتے تھے گویا انہیں خود بھی معلوم تھا کہ میر سے ان کا عشق یہ سارے گل کھلا رہا ہے لیکن اس کے باوجود آخر وقت تک میر سے شیفتگی میں کوئی کمی نہ آئی۔

اردو شعر و ادب میں بقول شخصے یہ تغزل کا دور ہے اور غالب کا دور ہے۔ غالب کو پسند کیا جاتا ہے۔ اس کا سلسلہ بیسویں صدی کے آغاز اور انیسویں صدی کے آخر سے شروع ہوتا ہے۔ اثر صاحب کے استاد عزیز تک تغزل پسند تھے لیکن اثر صاحب نے میر کو پسند کر کے اپنے مزاج اور مذاق کو ظاہر کیا اور اپنی انفرادیت کا ثبوت مہیا کیا۔ شعر کو جذبے سے قریب رکھنے اور جذبات کو تحریک دینے کے لیے غالباً میر سے زیادہ داخلیت پسند کوئی دوسرا اردو شاعر اب تک نہیں ہوا۔ اثر صاحب کے مزاج میں اور میر کی درون بینی میں ضرور کوئی نہ کوئی قدر مشترک ہے جس کا مفصل ذکر کسی دوسرے موقع کے لیے اٹھا رکھتا ہوں۔ یہاں پر صرف یہ ذکر مقصود ہے کہ اگر جھوٹ موٹ بھی کوئی شخص اثر صاحب کے سامنے میر کے خلاف کوئی بات کہتا تو بگڑ جاتے تھے۔ دوسرے ڈھنگ سے کوئی شخص بات کرتا تھا یعنی غالب جیسے باکمال کے اشعار سناتا تھا تو اثر صاحب اس کے متوازی میر کے ایک سے ایک آب دار اشعار سنانا شروع کر دیتے تھے اور اگر خوش قسمتی سے کوئی "میری" مل جاتا تھا تو پھر نہ پوچھیے کہ کس کس مزے سے باتیں ہوتی تھیں۔

میں اپنے باب میں کوئی بات کہنا نہیں چاہتا محض ایک واقعہ نقل کرنے کی اجازت چاہتا ہوں جس میں ایک آدھ جگہ پر میرا نام آئے گا۔ ہوا یوں کہ لکھنؤ کی ایک ادبی انجمن نے "یومِ میر" کے انعقاد کا اعلان کیا جس کا پروگرام بڑا وسیع تھا۔ پہلا اجلاس اثر صاحب کی صدارت میں ہوتا تھا اور ایک صوبائی وزیر کو اس کا افتتاح کرنا تھا۔ شہر کے اچھے اچھے ادیب اور شعرا بھی اس میں مدعو تھے لیکن اتنے بڑے جلسے کے لیے اس انجمن کے پاس رقم کی کمی تھی جو اس نے چندہ کر کے فراہم کی تھی وہ بہت کم تھی۔ اجلاس کا دوسرا حصہ ڈرامے پر مشتمل تھا۔ "میر" کی زندگی کا خلاصہ ڈرامے کی شکل میں ڈاکٹر محمد حسن نے لکھا تھا۔ اس سب چیزوں کے لیے معقول رقم کی ضرورت تھی۔ بعض احباب نے اثر صاحب سے چندہ وصول کرنے کا پروگرام بنایا۔ مجھے یقین تھا کہ کمی تو ضرور پوری ہو جائے گی لیکن خود اثر اس مروت اور میر سے مودت میں خواہ مخواہ زیر بار ہوں گے۔ لہٰذا میں دوسرے دن صبح صبح خود ان کے پاس پہنچ گیا تاکہ صورت حال سے اُن کو آگاہ کر سکوں۔ بڑے صبر و سکون سے سب کچھ سننے کے بعد اُٹھے اور چیک بک لا کر میرے سامنے رکھ دی، بولے۔ "میاں انجمن کو یوم میر کے لیے جس قدر ضرورت ہو رقم کا اندراج تم خود اپنے ہاتھوں کر لینا، میں دستخط کیے دیتا ہوں۔" میں تو ظاہر ہے کہ اثر صاحب کو لٹنے سے بچانا چاہتا تھا لہٰذا میں نے کہا۔ "جناب ہم تو تبرکاً آپ کی رقم کی شرکت چاہتے ہیں، آپ صرف صدارت کر دیجیے گا۔" غرض کہ بڑی حجت کے بعد کم رقم کا اندراج قبول کیا۔

میر سے ان کے عشق کے واقعات بہت ہیں۔ طوالت کے خوف سے نظر انداز کرتا ہوں بلکہ چند مضامین کے حوالے پیش کرتا ہوں جن سے اس بات پر روشنی پڑتی ہے کہ وہ میر کے خلاف ایک حرف سننا پسند نہیں کرتے تھے۔ چونکہ انتہائے عشق میں بدگمانی کو دخل رہتا ہے۔ لہٰذا میر کے پرستاروں سے بھی ان کو شکایتیں ہو جاتی تھیں اور وہ میر کی وکالت شروع کر دیتے تھے۔ ابھی کوئی آٹھ سال پہلے کی بات ہے کہ ڈاکٹر سید عبداللہ کا ایک مضمون پڑھ کر "نقوش" کے دسمبر ۱۹۵۹ء کے شمارے میں جوابی مضمون بعنوان "کیا میر کی شاعری میں فکر و نظر کی کمی ہے؟" چھپوا دیا۔ اور میر کی زبردست وکالت کی حالانکہ سید صاحب موصوف بھی میر کے عاشقوں میں ہیں اور میر کے کلام کے ہزار ہا پہلو اپنے مضامین میں پیش کرتے رہتے ہیں لیکن اثر صاحب غالب کو میر کا مدمقابل تک دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے لہٰذا جہاں کسی نے میر کے شعر کو غلط سمجھا اور غالب کو پیش

گیا اور انہیں نادؔ آیا۔ لیجئے اب اس کی خبر نہیں۔ سیّد صاحب کے بعض تسامحات پر جس خوبی سے انہوں نے گرفت کی ہے ملاحظہ ہو:-

ہوتا ہے یاں جہاں میں ہر روز و شب تماشا　　　دیکھا جو خوب تو ہے دنیا عجب تماشا

عزیب میرؔ لفظ تماشا اس کے فارسی معنی دیدن و ہنگامہ میں استعمال کرتا ہے ؎

در بزمِ وصال تو بہنگامِ تماشا　　　نظارہ زجنبیدنِ مژگاں گلہ دارد

ڈاکٹر صاحب (مراد ڈاکٹر سیّد عبداللہ صاحب) غالبؔ کے اتباع میں بازیچۂ اطفال کے معنی لیتے ہیں، جیسے مداری کا تماشا۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا میرے آگے　　　ہوتا ہے شب و روز تماشا میرے آگے

اور تھوپ دے میرؔ کے سر میں حالانکہ اس کے یہاں "دیکھا جو خوب" کا ٹکڑا موجود ہے جس کا یہ مطلب ہوا کہ دن رات کے مناظر و مظاہر پر غور کرنے کے بعد یہ راز کھلا کہ ہر شے دعوتِ نظارہ اس لئے دے رہی ہے کہ میرے متعلق غور و فکر کرو اور میرے پس پردہ جو کچھ ہے اس کے سمجھنے کی کوشش کرو۔

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے میرؔ کے کلام میں یہ فی نکالی ہے کہ میرؔ کے حواسِ باطنی میں کسی خاص چیز کی کمی تھی جس کے باعث وہ حقائق کو اچھی طرح سمجھ نہیں پاتے تھے۔ کچھ ایسے جیسے شور و غوغا کے درمیان کوئی بات ہی سمجھ میں نہ آئے کہ کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے۔ ان کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی حسِ سماعت خاصی الجھی ہوئی تھی وہ اکثر بیکار سی گونجیں سنتے رہتے ہیں اور پتہ نہیں چلتا کہ یہ آوازیں کیا ہیں اور کہاں سے آ رہی ہیں۔ انہوں نے اس کیفیت کو خود بھی کئی اشعار میں بیان کیا ہے ؎

عالم سیاہ خانہ ہے کس کا کہ روز و شب
یہ شور ہے کہ دیتی نہیں کچھ سنائی بات

گستاخی معاف! جب سیاہ خانے کے معنی ہی معلوم نہ ہوں تو شعر کے مطلب تک رسائی معلوم۔ اس کے مندرجہ ذیل معنی ہیں:-

سیاہ خانہ = خیمۂ صحرا نشینانِ عرب

جامیؔ ؎　　سیہ خانہ دید ناگہ ز دور　　　خوش آئندہ چون خال بر روئے حور

سلیم ؎　　بوادی کہ من از شوق گم کنم کعبہ　　　سیاہ خانہ نشینے ازاں بیابانست

سیاہ خانہ　کنایہ از بندی خانہ خصوصاً دہر خانہ کہ یمن نداشتہ باشد

درویش والہ ہروی ؎　　از لفظ کشیدہ بر کرانہ　　　بر اسم عرب سیاہ خانہ

صائبؔ　　مباش زیر سیاہ خانۂ فلک صائبؔ　　　برائے خویشتن از دودِ دل سما میساز

(منقول از بہارِ عجم)

تو صاحب "سیاہ خانہ" سے میرؔ کی مراد یہ دنیا ہے جس میں یمن و آسودگی کا نام نہیں۔ ہر طرف نفسی نفسی کا شور ہے، ہائے وائے ہے، نالہ و فریاد ہے، ایک ہنگامہ برپا ہے اور زندانی حیات منشائے حیات سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔

(صـ۲۲۲ تا صـ۲۲۳ نقوش دسمبر ۱۹۵۹ء "کیا میرؔ کی شاعری میں فکر و نظر کی کمی ہے"۔ از اثرؔ لکھنوی)

کچھ ڈاکٹر عبداللہ ہی پر منحصر نہیں ہے۔ "چھان بین" کے جملہ مضامین ملاحظہ فرمایئے، اثرؔ صاحب کسی نہ کسی سے کسی نہ کسی مقام پر میرؔ کے معاملے

میں ضرور الجھے ہوئے نظر آئیں گے۔ مجھے اس بات پر اصرار نہیں ہے کہ ان کا ہر جگہ موقف صحیح ہوتا تھا اور وہ غلطی یا نسیان سے پاک تھے۔ ظاہر ہے کہ انسان تھے۔[1] "چھان بین" تو ۱۹۵۰ء میں چھپی ہے لیکن اس میں مضامین و مقالات پرانے پرانے بھی ہیں، بعض میں بڑی عالمانہ باتیں ملتی ہیں جو ان کے سالہا سال کے مطالعے کا نتیجہ ہیں اور جن سے اردو ادب کے طلبہ بیش از بیش فائدہ اٹھا سکتے ہیں نیز بعض اساتذہ نے جو غلطیاں کی ہیں ان کے بارے میں بھی علم ہو سکتا ہے۔

زبان کے بارے میں اثرؔ صاحب کو بڑا خیال رہتا تھا۔ اس سلسلے میں ان کو "ناسخیت" کے طعنے بھی دیئے گئے لیکن انہوں نے بدستور احتیاط جاری رکھی اور کسی شخصیت سے مرعوب ہوئے بغیر انہوں نے اس مشن کو جاری رکھا۔ زبان کا معاملہ دراصل ہے بھی بہت نازک۔ ہمارے ادبا و علما جس سہل انگاری کا شکار ہیں اس سے زبان کی صحیح خدمت نہیں ہو سکتی۔ لکھنوی شعرا نے اس طرف توجہ دی اور اس پر سختی سے عمل کر کے شاہکار ادب پیش کر کے دکھا دیا۔ اثرؔ صاحب اسی معیار کے عادی تھے اور الفاظ کے دروبست ہی پر غور نہیں کرتے تھے بلکہ ایک ایک حرف کے آہنگ پر غور کرتے تھے اور حروف جب الفاظ میں ڈھل کر مختلف اصوات پیدا کرتے اور دوسرے الفاظ سے ہم آہنگ ہوتے تو فصیح اور غیر فصیح کا فیصلہ آسان ہو جاتا۔[2] سماعت اور حسن سماعت صرف راگوں اور گیتوں کے سروں تک محدود نہیں لفظوں کی آہنگ میں بھی ہے۔ یہی تو وجہ ہے اثرؔ صاحب کا احساس جمال ایسی خرادتھا جس پر غیر فصیح لفظ چڑھتا ہی نہیں تھا اور غیر فصیح جملے فقرے اور مصرعے جو کچھ بھی ان پر از ڈالتے اس کا فوری ردِ عمل ظاہر ہوتا۔ جوشؔ ملیح آبادی جو اثرؔ صاحب کے پیر بھائی بھی ہیں، اپنی معرکہ آرا نظم انقلاب سنا کر اٹھے ع

انقلاب و انقلاب و انقلاب

تو اثرؔ صاحب کو انقلاب + و (انقلابو) کی تکرار سے صرف گلابو شتابو کی یاد آکر رہ گئی۔[3] اب ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ کیا نکلتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ جوشؔ صاحب کا کلام برصغیر کے طول و عرض میں پھیلا ہوا تھا اور مقبول ہو رہا تھا اور اثرؔ صاحب کے منتقض ہونے سے اس کی مقبولیت کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا لیکن معاملہ تو سارا احساس جمال کا ہے کہ جوشؔ نے انقلاب کے لفظ کو فارسی کے حرف جار کے ساتھ جو مکرّر استعمال کیا وہ بجائے خود لطیف نہیں رہا، ثقیل بن گیا اور سماعت پر بار بنا۔ اثرؔ صاحب شاعری کے دائرے میں "حسن" اور "جمال" کے بڑے قائل تھے۔

فراقؔ گورکھپوری کے مجموعہ رباعیات پر ان کے تنقیدی مضامین بھی اسی ذیل میں آتے ہیں اس سلسلے میں چھان بین کے صفحات ۲۸۹، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۹۶-۲۹۵ اور ۳۲۰ تا ۳۲۸ قابل ملاحظہ ہیں۔

"اثرستان" "بہارستان" ان کے دیوان ہیں جن میں زیادہ تر غزلیں ہیں۔ اہل علم و فضل اس کا مطالعہ فرمائیں اور خود فیصلہ کریں۔ میں "بہاراں" سے (جو ان کا ذاتی نسخہ ہے) فارسی کی وہ آخری غزل نقل کئے دیتا ہوں جو مرحوم نے دیوان کے آخر میں اپنے ہاتھ سے شامل کی ہے۔ مذکورہ دیوان میں صرف ۴۷۹ صفحات ہیں۔ ۴۸۰ صفحہ پر غزل موجود ہے یہ صفحہ بھی مرحوم نے خود ہی قائم کیا ہے:-

نہاں را چوں عیاں بینم چہ می بینم چساں گویم — دگر جمعیت خاطر نہ ایں گویم نہ آں گویم

دل آگاہ دارم دل بدنیا وا نمی بندم — کجا فرصت کہ با ایں سرخوشیہا داستاں گویم

---

[1] وہ بھی الانسان مرکب من خطا و نسیان کے قائل تھے [2] "موازنہ انیس و دبیر" میں شبلی کی بحث بسلسلہ فصاحت و بلاغت ملاحظہ ہو۔
[3] کٹھ پتلیوں کا ناچ گلابو شتابو یا اختو بختو کہا جاتا ہے۔ اہل لکھنؤ کٹھ پتلیوں کے اس ناچ کے کرداروں کے نام سے اس کھیل کو یاد کرتے ہیں۔

چنیں طاعت اگر کفر است من باکفر خورسندم ۔۔۔ درے از سجدہ بکشایم جبیں را آستاں گویم

ہزاراں نکتۂ رنگیں کہ من در دل گرہ دارم ۔۔۔ سخن نشنو چو دریابم برائے امتحاں گویم

جنونِ ہرزہ گردی تا بگردِ خویش آساید ۔۔۔ نگاپوئے دو عالم را سراغِ بے نشاں گویم

بگفتا شوخ چشمے "حسن را حسنِ نظر باید" ۔۔۔ "نظر بر حسن افزاید" من حیراں چساں گویم

نمی گویم شبنم را ہمکنارِ صبحِ عشرت کن ۔۔۔ دمے با لطف بنشیں تا غمت را جاوداں گویم

دراں معمورۂ حیرت کہ مارا راہ افتادست ۔۔۔ جرس از شور ماند چوں حدیثِ رفتگاں گویم

اثرؔ طبعِ رواں دارم کہ چوں دریاست طوفاں زا ۔۔۔ سزد موجِ تخیّل را اگر گوہر فشاں گویم

احساس جمال کے سلسلے میں ایک آخری بات اور بھی سنتے چلیے اور خود اندازہ کیجئے کہ "روپ" کے سلسلے میں جو کچھ اثرؔ صاحب نے لکھا ہے اس میں وہ کس حد تک حق بجانب ہیں۔ فراقؔ صاحب نے ایک جگہ کچھ تصرفات کر کے بعض اساتذہ کے اشعار پر اصلاح دی اور اپنا نقطہ نظر پیش کیا۔ اس سلسلے میں ثاقبؔ لکھنوی کا یہ مشہور شعر بھی آیا:-

نشیمن پھونکنے والے ہماری زندگی یہ ہے ۔۔۔ کبھی روئے کبھی سجدے کئے خاکِ نشیمن پر

فراقؔ صاحب نے اصلاح فرمائی:

نشیمن پھونکنے والے ہماری زندگی یہ ہے ۔۔۔ کبھی روئے کبھی بیٹھے رہے شاخِ نشیمن پر

اثرؔ صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں رائے دی:

"تو کیا کوئی اُلّو تھے ــــ؟"

ظاہر ہے ہماری مشرقی تہذیب اور اسلامی تمدن میں "سجدے" کی جو حیثیت ہے اور اس ایک سجدے میں جو خود سپردگی اور DEVOTION ہے اسے نہ ہندو تہذیب کے زیر سمجھا جا سکتا ہے اور نہ یورپی تہذیب کے ذیل میں۔ فراقؔ صاحب ان روایات کو سمجھ ہی نہیں سکے جن کے زیر اثر شاعر کے اس سجدے میں اس کی ساری شخصیت کھنچ آئی ہے اور "خاکِ نشیمن" کی معنویت نے شعر کے حسن کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ اب اگر اس چاند کو گہن لگ جائے اور خاکِ نشیمن پر سجدے کے بجائے شاخِ نشیمن آ جائے تو احساس جمال کو کیسے چوٹ نہ لگے۔

سب سے آخر میں، میں اثرؔ مرحوم کے تنقیدی نقطۂ نظر کو واضح کرنے کے لئے ان کے مضمون "نشاطِ روح پر ایک نظر" (۱۹۲۶ء) سے خود انہیں کی ترجمہ کردہ ڈرائڈن اور رائمر (DRYDEN AND RYMER) کی سطریں نقل کئے دیتا ہوں: (ملاحظہ ہو ص۸۱ تا ص۸۴، چھان بین)۔

"وہ لوگ تنقید کی حقیقت نہیں سمجھے جن کا یہ خیال ہے کہ اس کا خاص منصب خوردہ گیری ہے۔ تنقید کا موجد ارسطو ہے۔ اس کا مقصد تھا کہ کلام کی خوبیاں ذہن نشین کرنے کا ایک معیار قائم ہو جائے جس کا فرضِ اولین یہ ہو کہ کلام کے محاسن پڑھنے والے پر آئینہ ہو جائیں اور موجب انبساط ہوں۔ اگر کسی نظم کی ترتیب تخیل اور انداز بیان اچھے ہیں جو ایک حقیقی شاعر کے طغرائے امتیاز ہیں تو نقاد کو چاہیے کہ مصنف کے موافق رائے قائم کرے۔ معمولی اغلاط پر ناک بھوں چڑھانا خباثت نفس اور نامردی کی دلیل ہے کیونکہ ایسے تسامحات سے ورجل (VERGIL) کا کلام بھی پاک نہیں۔ ہاریس (HORACE) تسلیم کرتا ہے کہ مستعد اور کیل کانٹے سے لیس ہومر (HOMER) بھی بعض اوقات اونگھ جاتا ہے۔ لانگینس (LONGINUS) جو ارسطو کے بعد یونانیوں میں عظیم ترین نقاد ہوا اس گراں پایہ شاعری کو جس میں لغزشیں

ہوں اس خشک یا معتدل شاعری پر ترجیح دیتا ہے جس میں اغلاط تو نہیں ہیں مگر علو بھی نہیں۔ قسم اول کو اس نے ایسے شخص سے مشابہ کیا ہے جس کی دولت کثیر ہے اور اتنی فرصت نہیں کہ چھوٹے چھوٹے مصارف کی نگرانی کرے۔ اس کے واسطے جزئیات کی نگہداشت کسرِ شان ہے اس کی کفایت شعاری کے بہترین نمونے فردعات میں نہیں مل سکتے بلکہ ان میں اسراف پایا جاتا ہے لیکن اپنی مجموعی دولت کی محافظت میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتا۔ برخلاف اس کے وہ شاعری جو حدِ اعتدال سے آگے قدم نہیں بڑھاتی اس کی مثال ایسے شخص کی ہے جو اپنا اندوختہ نہایت احتیاط بلکہ بخل سے صرف کرتا ہے اور اس خوف سے کہ مبادا اسراف کا مرتکب ہو شاندار زندگی نہیں بسر کرتا۔ ایسا شخص صحیح عبارت ضرور لکھتا ہے۔ وہ صرف ونحو سے چاق وچوبند، متروکات کا ماہر، ممنوعات سے واقف اور بال کی کھال کھینچنے والا ہوتا ہے۔ کوئی اس سے بہتر نہیں جانتا کہ کیا نہیں لکھنا چاہیے۔ وہ کبھی اتنا دوڑ کر نہیں چلتا کہ گر پڑے بلکہ پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہے اور جیسا کہ ایک سنجیدہ شخص کے شایان ہے پہلے عصا ٹیکتا ہے، پھر پاؤں جماتا ہے۔ ایسے شخص کی نہ تو کوئی تعریف کرتا ہے نہ مذمت۔ لانگینس کہتا ہے کہ مجھے ہومر میں معمولی اغلاط مل سکتے ہیں لیکن انصاف سے دیکھو تو وہ محض انسانی کمزوری کی نشانیاں ہیں، ادنیٰ فروگذاشتیں ہیں جو جوشِ تحریر میں نظرانداز ہو گئیں۔ مگر اس کی روح کی جلالت باوجود ان تسامحات کے مجھ پر غالب آجاتی ہے اور اگرچہ دیگر مصنّفین کا کلام نسبتاً اغلاط سے پاک ہے مگر شاید ہی کوئی شخص ایسا کج فہم ہو جو مثلاً اپولونیس (APPOLONIUS) یا تھیاکریٹیز (THEOCRITIES) کو ہومر پر ترجیح دے۔"

آگے چل کر مزید وضاحت کے لئے رائمر (RYMER) کا سہارا لیتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:۔

"کوئی صنّاع ہیرے کی جلا نہ کرے اگر اسے یقین ہو جائے کہ اس کے سوا جوہر پر کسی کی نظر نہ پڑے گی اسی طرح شاعر بے پرواہ ہو جائیں اگر نقّاد نکتہ چینی پر نہ تلے رہیں۔"

آج سے تقریباً اکتالیس سال پہلے ان خیالات کا اثرؔ صاحب نے اظہار فرمایا تھا۔ اب تو ہمارے تنقیدی ادب میں مارکس، ایلیٹ اور سارتر وغیرہ کے رجحانات و میلانات غالب ہیں لیکن پچاس سال پہلے تو بالکل سناٹا تھا اور تنقید میں تحسین یا تنقیص کا رجحان غالب تھا۔ اثرؔ صاحب نے اس زمانے میں جو تنقیدی مضامین لکھے وہ اپنے دور میں سب سے زیادہ ترقی پسندی کے حامل تھے۔ یوں ترقی پسند تحریک کے بارے میں انہیں کتنے ہی مغالطے ہوں لیکن سید سجاد ظہیر تک اثرؔ صاحب کی بہت سی خوبیوں کے معترف اور مقر رہے ہیں۔

عبد العزیز فطرت

○

یارو! کیوں رنج سیہ روزی رہے
آؤ ۔ شغلِ ساعت افروزی رہے

چلیے زخم آتے ہیں ، آنے دیجیے
کون جویائے جگر دوزی رہے ؟

ہم نے پھر اقلیمِ غم تسخیر کی
اس خوشی میں جشنِ فیروزی رہے

اپنی خوشیوں کی بہاریں غم سے تھیں
غم متاعِ لذّت اندوزی رہے

نورِ غم کم کم میسّر ہے ہنوز
اور چندے ظلمت آموزی رہے

فطرتؔ اپنے ظرفِ عالی کے طفیل
آبرو دارِ سیہ روزی رہے

جمیل ملک

فطرت، آئینۂ فطرت میں

جب میں نے فطرت کو تلاش کرنے اور پرکھنے کی کوشش کی تو اس کام کے لئے مجھے اُس کی غزل سے بہتر کوئی پیمانہ نظر نہ آیا اور جب خود فطرت نے چاروں طرف نظر دوڑائی تو آئینۂ فطرت میں اپنا عکس دیکھ کر بے پایاں مسرت اور طمانیت کے ساتھ بے ساختہ کہہ اٹھا ؎

بس ہر غنچۂ تازہ، پس ہر شاخِ کہن
مے فطرت کے ہیں لبریز پیالے موجود

جس عبادت کے لئے قید عمارت کی نہیں
اُس عبادت کے لئے بھی ہیں شوالے موجود

نظامِ فطرت کے انتشار اور تفارق میں جو تطابق اور ہم آہنگی موجود ہے، ظاہر ہے اُس کے لئے غزل سے موزوں تر اور کون سا سانچہ ہو سکتا تھا۔ پھر فطرت کی فطری بے قراری، سیماب پائی اور آوارگی کا تقاضا بھی یہی تھا کہ وہ اپنے لئے ایسے ریگزارِ سفر منتخب کرتا جو واماندگی، گمرہی اور پاشکستگی کے کٹھن مراحل میں اُس کو تھام تھام لیتے چنانچہ اِدھر غزل کی منتشر فضا میں فطرت کی لخت لخت شخصیت مربوط ہو گئی اور اُدھر مظاہرِ فطرت نے بڑھ کر اُسے یوں سینے سے لگا لیا کہ اُس کی دیوانگی، پاشکستگی، خود نگری اور خود آگہی میں ڈھل گئی۔

فطرت نے ایک سچے فن کار کی طرح آغوشِ فطرت میں آنکھیں کھولیں، مظاہرِ فطرت ہی میں ڈوب ڈوب کر ابھرتا رہا اور حیرت خانۂ فطرت کے اسرار و رموز منکشف کرتا رہا۔ یہیں سے اُس نے اپنی نظروں کو بھی صیقل کیا اور یہی کو حسنِ تخیل کا مرکز بنا کر ازل اور ابد کے فاصلوں کو بھی سمیٹ لیا ؎

جو لوگ نظمِ جہاں سے ہیں باخبر فطرت
ازل کو معنیٔ شعرِ ابد سمجھتے ہیں

فطرت کا یہ عرفانِ نظر درسی اور مکتبی نہیں بلکہ روحانی اور وجدانی ہے اور اس کے پس منظر میں تجربہ اور ریاضت کا لق و دق صحرا ہے جس میں وہ برسوں بھٹکتا رہا۔ پیاس کی شدت سے اُس کی زبان لبوں تک آ گئی تب کہیں وہ زندگی کے سرچشموں اور فن کے نخلستانوں کا سراغ لگا سکا ہے ؎

ہم نے دیوانگیٔ شوق کے سیکھے انداز
رہ کے ویرانۂ گلزارِ تمنا کے پابند

فطرت نے عمر بھر اپنے فنی اور شخصیت کو کسی مخصوص نظریے یا مکتبِ فکر سے وابستہ نہیں کیا۔ اُس نے کارزارِ حوادث میں ہمیشہ اپنی شخصیت کو ڈھال بنایا اور ہر چوٹ اپنے دل پر کھائی۔ اگر کسی نے اُس کے زخموں پر مرہم رکھا تو وہ حسنِ فطرت تھا اور اگر وہ سچ مچ کسی کو اپنا دل دے بیٹھا تو وہ عروسِ بہار تھی جو کبھی شفقِ شام میں جلوہ افروز ہوتی ہے اور کبھی سپیدۂ سحر میں۔ اُس کے پاس خلوص و وفا کا جوہرِ نایاب ہے، روحانی پاکیزگی، طبعی شرافت، رواداری اور وضعداری اُس کی شخصیت کے خاص زیور ہیں۔ وہ تو ایسا رندِ باصفا ہے کہ مجلسِ اربابِ صفا تو کیا خود کائنات بھی بسا اوقات بصد ادب اُس کے راستے سے ایک طرف ہو جاتی ہے ؎

ہم اور کائنات کو خاطر میں لائیں گے
دل جیسی کائناتِ وفا اپنے پاس ہے

میں نے ابھی ابھی عروسِ بہار کا ذکر کیا ہے۔ یہ تو صرف زندگی کا اشارہ ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ وہ زندگی کی گوناگونی اور رنگا رنگی پر مرتا ہے۔ اُس کی مرتعش شخصیت کو زندگی کے رقصاں، تاباں، خنداں اور گریاں لمحات سے عشق ہے۔ اُس نے وقت کے انھیں اُڑتے ہوئے لمحات کو اپنے خونِ جگر میں ڈبو کر فطرت کے ازلی اور ابدی رنگوں میں آمیز کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ عشق بلا خیز دیا ہے جس کے لئے اگرچہ اُسے قدم قدم پر اپنی زندگی بھینٹ دینا پڑی ہے، لیکن اس کا یہ ایثار اُس کی یہ ریاضت رائیگاں نہیں گئی۔ اس کا دل، اُس کے عشق کی ایسی آماجگاہ بن گیا ہے، جہاں مسرت و غم ہم رنگ ہو جاتے ہیں، جنون و خرد کی گتھیاں سلجھتی ہیں۔ وجود و عدم کی روشنیاں جھلکتی ہیں۔ تخریب و تعمیر کی آویزش جاری رہتی ہے ذرّے اور انسان کی حقیقت ایک ہو جاتی ہے۔ حیات و مرگ کے فاصلے سمٹ جاتے ہیں۔ تضادات کی کشمکش کے باوجود شاعر کی نظر ان میں ایک ایسا توازن اور اتحاد تلاش کر لیتی ہے جس کا نام زندگی ہے۔ جو اُس کا دل بن کر ہر لحظہ اُس کی غزل میں دھڑکتی رہتی ہے ؎

بن کے دل کیسے قرینے سے دھڑکتی ہے غزل
یہ گماں ہوتا ہے خود دل بھی سکتی ہے غزل

یہ ماتمِ خزاں ہے کہ جشنِ بہار ہے
گل سینہ چاک ہو کے گلستاں میں آئے ہیں

یہ زندگی ہے کہ ایک صورتِ عدم ہوگی
کہ رقصِ موجِ صبا ہے مزاجِ گل پہ گراں

خرد ہے مثلِ جہانِ سمن براں محدود
جنوں ہے صورتِ طبعِ سخنوراں آزاد

شکستِ آئینہ سے آئینے بنے کتنے
لُٹی جو دلی تو اُبھرے کئی جہاں آباد

ذرّہ دنیا کی توجہ کا ہے مرکز نظرت
تو ہی ذرّے میں کہیں انجمن آرا تو نہیں

یقینِ مرگ کے باوصف تیری بزم میں جاکر
کمال بانکپن سے شمع کی لَو جھلملاتی ہے

میں نے عرض کیا تھا کہ نظرت کا فن ایک ذوقی اور وجدانی چیز ہے۔ اُس نے اپنے فن کی بنیادیں زمینِ دل پر استوار کی ہیں۔ وہ میر کی طرح دلی کا مرثیہ خواں نہیں۔ اُس کے دل کا نگر بھی سو بار اُجڑتا ہے مگر اُس کی نظر میں زندگی پھر بھی امکانات سے بھرپور رہتی ہے۔ جو ہر بار اُجڑنے کے بعد نئے نئے جہان آباد بسا لیتی ہے لیکن اس میں بھی کلام نہیں کہ شہرِ غزل کو آباد کرتے کرتے نظرت کو بھی کتنی ہی بار دل کی بسیط تنہائیوں کا سامنا کرنا پڑا ہے، برسوں کو وہ دشت کی خاک چھاننا پڑی ہے۔ اُس کی آوارگی اور درماندگی میں بھی محبوبہ نظرت ہی نے اُسے راستہ سجھایا جو اُسی کی طرح تنہا ہے، اکیلی ہے۔ جو تنہا قرن سے کسی آنے والے مسافر کی راہ تک رہی ہے۔ یہی جذبہ مشترک، یہی آوارہ خیالی، یہی احساسِ تنہائی اور یہی اُلجھاؤ میں سلجھاؤ کی کیفیت ہی تو ہے جو نظرت اور محبوبۂ نظرت کے وِزال عشق کی بنیاد ہے۔ جو عاشق و محبوب، شاہد و مشہود، دونوں کو فن کار بنا دیتی ہے، جن کا دل بھی ایک، احساس بھی ایک اور منزل بھی ایک ہے۔ ایک ایسی منزل جس کی طرف ہر فن کار ازل سے ابد تک گرمِ سفر رہتا ہے ؎

خلوتِ دل ہے انجمن تیری
مَیں تری انجمن میں تنہا ہوں

ساری رونق ہے چمن کی رونق   غنچہ تنہا ہے، صبا ہے تنہا

اُلجھاؤ زندگی کا قرینہ سا بن گیا   ہر راستے کو آرزوئے پیچ و خم ہوئی

آوارہ پھرائے گی اُسے شامِ ابد تک   خاکسترِ فطرت سے یہ پیمانِ صبا ہے

لیکن ہم نے دیکھا ہے کہ فطرت کی خلوت میں بھی جلوت کے انداز ہیں۔ اُس کے رومان میں بھی ہنگامہ ہے۔ اُس کا سکوت بھی آواز ہے کیونکہ وہ اپنی ذات میں انجمن ہے۔ وہ زمانے کے سخت و سست کو اپنی مسلسل کاوش اور لگاتار ریاضت سے اس طرح ہموار کر چکا ہے کہ اُس کے لئے غم و خوشی کا امتیاز مٹ گیا ہے۔ وفا و جفا کا فرق جاتا رہا ہے۔ فراق و وصال کے پردے اُٹھ چکے ہیں۔ اُس نے حدودِ کائنات کے تمام تعینات توڑ ڈالے ہیں۔ وہ مظاہرِ فطرت کی طرح آزاد رہنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے خود میں مذہب کا خالق بھی خود ہے اور اپنے فن کا ناقد بھی آپ ہے۔ حدود و کونین کا وہ اس لئے پابند رہنا نہیں چاہتا کہ وہ تجربات کے جنگل سے گزر کر خود بخود زندگی کی صداقتوں پر ایمان لے آیا ہے اور اب اُس کو کسی آموختہ کی ضرورت نہیں۔ وہ تو تسلسلِ غم دنیا کے باوجود ہنسی خوشی زندگی بسر کر کے تقدیر پر ایک مستقل طنز بن چکا ہے۔ وہ اپنے اندازِ فکر و نظر میں مجموعۂ فطرت کی طرح ہر جائی سہی مگر جب عبدالعزیز فطرت اور مجموعۂ فطرت ایک ہی چیز کے دو نام ہوں تو پھر یہ ہمہ جائیت بھی ایک مثبت علامت بن جاتی ہے ؎

اے حُسن تری عشوہ گری بھی ہے قیامت   مری ہوس خوش نظری بھی ہے قیامت
ہم بھی تجھے بہت دامنِ صد پارہ پہ نازاں   اے پھول تری جامہ دری بھی ہے قیامت

لاکھ ناقوس و اذاں نے ہمیں مجبور کیا   ہم تھے فطرت جرسِ دل کی صدا کے پابند

یکجائیاں نگاہ کی فطرت نہ جائیں گی   آوارگیٔ فکر و تمنا کے باوجود

سوال یہ ہے کہ فطرت کا زندگی سے یہ والہانہ عشق، آزاد اور کھلی فضاؤں میں اپنی امیدوں اور امنگوں کو پروان چڑھانے کی فطری تمنا، اُس مجبوری اور محکومی کا ردِ عمل تو نہیں جس میں فطرت نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ گزار دیا۔ فطرت کی آغوش میں پناہ لینا کہیں زندگی کے حقائق سے فرار کے مترادف تو نہیں۔ سوچ کے ایسے مرحلوں پر فطرت ایک مجسمۂ انکسار بن کر آپ ہی اپنا نقاد بن جاتا ہے اور ہمارے اندیشوں کو جھٹلانے میں کامیاب ہو جاتا ہے ؎

مرے دوستوں نے جانچا جو مری ہنروری کو   نہ میں صاحبِ ہنر تھا، نہ میں خادمِ ہنر تھا
کبھی ظلمتوں کا شیدا، کبھی نور کا تھا جویا   کبھی شب پرست تھا میں، کبھی کشتۂ سحر تھا
نئی منزلوں کے رستے مرے پاؤں چھو رہے ہیں   میں حریفِ رہ گزر ہوں۔ میں حریفِ رہ گزر تھا

ہم نے فطرت کی غزل میں زندگی کے تنوع کی جھلکیاں دیکھی ہیں۔ اگرچہ اس نے فطرت کی رنگینیوں کو نظم کے پیکر میں ڈھالنے کی کوشش بھی کی ہے لیکن اختصار اور تعمیم کے عمل سے، نظم کی نسبت غزل میں، یہ رجحان فطرت کے مزاج سے ہم آہنگ ہو کر اس کی اپنی آواز اور اپنا رنگ بن گیا ہے۔ عبدالعزیز فطرت نے قرینے کے ساتھ زندگی کے تنوع کو مظاہرِ فطرت میں تلاش کیا ہے۔ اس اعتبار سے اگر اس کے اس رجحان کو فطرت پرستی سے تعبیر کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ لیکن فطرت کے فنی محاسن

کا کھوج لگائے بغیر فطرت کی غزل کے اس نمایاں فکری رجحان کا محاکمہ ادھورا رہے گا۔ یہ بات قطعی ہے کہ فطرت اپنے فن کے سلسلے میں اظہار و ابلاغ کو شدت سے قائل ہے۔ وہ غزل کی سنگنائے سے عاجز نہیں بلکہ اسی میں اظہار و بیان کی نئی وسعتیں پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اُس کے نزدیک غزل ایک ایسی میزان ہے جہاں شاعر کی افتادِ طبع کے ساتھ ساتھ ہر موضوع بھی موتیوں اور جواہر ریزوں کی صورت تل جاتا ہے ؎

نئے انداز، نئے حسن، نئی شان کے ساتھ　　نئے ایوانوں کے در کھول بھی سکتی ہے غزل
حرف پاکیزہ ہو یا معنیٔ رنگیں فطرتؔ　　اپنی میزان میں اسے تول بھی سکتی ہے غزل

شاید اسی لئے اُس نے انکار کا رشتہ اقرار کے حیرت خانوں سے استوار کیا ہے اور اپنے اشعار کو میٹھے نغموں اور رنگوں کا مجموعہ قرار دیا ہے۔ اُس کی فطرت پرستی کا اندازہ لگائیے کہ جب وہ اپنی شاعری پر بھی تبصرہ کرتا ہے تو "خندۂ یاسمن اور رقصِ سمن کی زبان میں"—گل و لالہ کے ساتھ ساتھ وہ اشعار میں کہیں کہیں کانٹے کی چبھن بھی رکھ دیتا ہے کہ اس سے اُس کے میٹھے روگ کی قیمت دوچند ہو جاتی ہے ؎

راہِ گفتار میں گلزار کھلے جاتے ہیں　　خندۂ یاسمن و رقص سمی ہے مری بات
اس میں نرمیٔ گل تر کی ہے چبھن کانٹے کی　　یہ قرینہ ہے کہ رہتا دچمن ہے مری بات

حقیقت یہ ہے کہ اس ساعت سرشاری میں فطرتؔ کا جان فزا اسلوب اور اس کی دلپذیر باتیں وقت کی پیشانی پر عظمت کی شکن بن کر ابھرتی ہیں، روشنی بن کر بکھرتی ہیں اور خوشبو بن کر مشامِ جاں میں بس جاتی ہیں ؎

زمانہ کھائے گا قسمیں ہماری عظمت کی　　یہ دورِ غم جو ذرا سازگار اور ہوا

کسی کی یاد آئی تو کنول سے دل میں کھل گئے　　کسی کا ذکر چھڑ گیا تو بات جگمگا اٹھی

فطرتؔ کو در بارِ سخن میں بار ملا تو بہرِ سپاس　　شعر کے نکھرے سلجھے روپ میں اُس نے نذر گزارے پھول

وَلی دکنی نے غزل میں سراپا نگاری کو رواج دے کر بت پرستی کے جس رجحان کو ابھارا تھا اور بہاری جس بامرہ کو بیدار کیا تھا حسرت موہانی تک پہنچتے پہنچتے وہ رجحان حواس خمسہ کی جادوگری میں ڈھل کر ایک طلسمِ اظہار و معنی بن گیا۔ فراقؔ گورکھپوری نے اس طلسماتی فضا سے نکل کر حسنِ فطرت پر نظر دوڑائی اور اُس کی ساری رنگینیاں محبوب کے پیکر میں سمو کر اس کے ازلی اور ابدی لمس میں کھو گیا۔ عبدالعزیز فطرت نے جب فطرت پرستی کا چلن اختیار کیا تو اس کی رنگینیوں اور نغموں کی اس حد تک پرستش کی کہ فطرت محض ارتفاع پا کر مجبوبِ فطرت کے بلند درجے تک پہنچ گئی جسے عبدالعزیز فطرت کے اندر چھپے ہوئے فن کار نے اپنا آدرش اور اپنا آئیڈیل مان لیا اور پھر اس کے واسطے سے اُسے ساری دنیا عزیز ہو گئی، اُس نے ہر بولتی صورت کو غور سے دیکھا۔ حُسن کی ہر ادا پر اُسے پیار آیا اور زندگی کی تمام خوبصورتیاں اُس کے نظریۂ حسن میں سمٹ آئیں۔ ریاضت کے ان تمام مراحل میں زبانِ شعر شاعر کی ادائے خاص بنی۔ اِسی زبان کو بھی عبدالعزیز فطرت کی زبان سے زیادہ حسیاتِ فطرت کی زبان کہنا مناسب ہوگا۔ اب اُس کے ہاں شامہ، سامعہ اور باصرہ ایسے البیلے گل کھلانے لگی کہ اگر غالب زندہ ہوتے تو خوشبوؤں اور رنگوں کے وفور سے اُن کے بھی ناک میں دم آجاتا۔ فطرتؔ ایک طفلِ حیراں کی طرح فطرت کی جلوہ پاشیاں قدرت کی بسیط فضاؤں میں چاروں طرف منتشر پاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے ہاں زیادہ تر باصرہ ہی متحرک رہتی ہے۔ تاہم اُس کی دوسری حسیات بھی اندر ہی اندر جھکتی رہتی ہیں۔ اگر کسی چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے تو وہ حِس لامسہ ہے۔ شاید وہ محبوبۂ فطرت کے لطیف پردوں اور اڑتے ہوئے رنگوں کو جان بوجھ کر چھونا نہیں چاہتا، اُسے اندیشہ ہے کہ

پیکر اس نے اپنا سب کچھ لٹا کر برسوں کی ریاضت سے ڈھالا ہے، کہیں چھونے سے وہ میلا نہ ہو جائے یا ہاتھوں ہی میں تحلیل ہو کر نہ رہ جائے۔ وہ تو بس اس ذوقِ نظر، اس آئیڈیل کو تکتا۔ اور مسلسل تا دمِ آخر ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا چاہتا ہے لیکن کیا یہ کم ہے، اُس نے بکھرتی ہوئی خوشبوؤں کی یوں تجسیم کی ہے کہ انھیں زندہ اور متحرک پیکر بنا دیا ہے ؎

پردہ لطیف، پردہ نشیں ہے لطیف تر
خوشبو دلہن ہے، برگِ گلِ تر لباس ہے

شفق کا رنگ اور موجِ ہوا کی مست خوشبوئیں
طبیعت جم نہیں پاتی کہ پھر لہرا ہی جاتی ہے

تم تو ہر ایک حسن کو پہچانتے ہو خوب
گل کی چٹک میں کیا مرا حسنِ بیاں نہ تھا

فطرت نے اظہار و ابلاغ کے لئے بھی علامتوں کا انتخاب بیشتر مظاہرِ قدرت ہی سے کیا ہے۔ وہ اسلوب میں ابہام کا قائل نہیں۔ اسی لئے اُس کے ہاں علامتوں کے رنگ اور نام بھی بڑے مانوس ہیں۔ ابرِ سیاہ، آخرِ شب، شبِ مہتاب، گلِ صحرا، شفقِ شام، موجِ ہوا، شاخِ گل افشاں، برگِ گلِ تر، رقصِ صبا، غنچۂ تازہ اُس کے فن کی بعض مخصوص تراکیب اور علامات ہیں۔ وہ ان علامتوں سے اپنی حیات کا رشتہ جوڑ کر محبوبۂ فطرت کو اپنی زبان اور اپنا اندازِ گفتگو مستعار دے دیتا ہے۔ اسی تلازمۂ خیال سے اُس کے ہاں تشبیہ و استعارہ کی کارفرمائی کا آغاز ہوتا ہے۔ تخلیق کے لمحات میں ڈوب کر وہ انکشافِ ذات کا مظاہرہ یوں کرتا ہے جیسے وہ اپنے آنسوؤں اور مسکراہٹوں کی سوغات محبوبۂ فطرت کی نذر کر رہا ہو جو گاہے خنداں گاہے گریاں مسرت و غم کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اس ارمغاں کو سینے سے لگا رہی ہو ؎

پھیلے جاتا ہے ایسے ابرِ سیاہ
کھل پڑیں گیسوؤں کے خم جیسے

سرشت دونوں کی تھی دل کشی و بے تابی
فلک پہ تاروں میں گھل مل گئے مرے آنسو

مجھ سے لے گلِ صحرا سینکڑوں امیدیں تھیں
ہر امید کا عنواں، اک تیری مہک تنہا

شفق جب گل بکھیرے اور لالہ زخمِ دل کھولے
ہمیں اُس وقت خونِ حسرتِ دل یاد آتا ہے

میں ہر اُس حسنِ دل آویز کا شیدائی ہوں
جس کا جلوہ ہو شریکِ شفقِ شام اے دل

یہ مصرعِ تنہا ہوں مرا کچھ نہیں مفہوم
ہاں تم بھی جو آ جاؤ، غزل ہو شبِ مہتاب

فطرت ان بے صدا نغموں کی زبان خوب خوب سمجھتا ہے۔ اسی سے تو اس کے جسم و جان میں ہر وقت ایک ارتعاش، ایک لطیف ہنگامے کی سی کیفیت جاری و ساری رہتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے اُس کے لئے ساری دنیا ایک لہلہاتا ہوا گلستان بن گئی ہے اور ہر رات اُس کے لئے شبِ مہتاب کی چادرِ سحاب اوڑھ کر آتی

پہ یوں اترا آئی ہے کہ نظرت خود بھی اسی کا ایک حصہ، ایک کنایہ بن گیا ہے شاید اسی چمنستان کو نظرت نے میٹھے رنگوں کا نام دیا ہے اور اسی شبِ مہتاب کو وہ انداز کے حیرت خانوں سے موسوم کرتا ہے۔ وہ زندگی کے چمنستانوں اور شبِ مہتاب کے چھیتالوں کی تصویریں کچھ اس انداز سے بناتا ہے کہ شاعری مصوری کا روپ بدل لیتی ہے اور شاعر کا قلم مصور کا موقلم بن جاتا ہے۔ یہ مصوری مناظرِ فطرت کی خارجی ہیکل تراشی تک ہی محدود نہیں رہتی بلکہ فطرت کا تخیل ایسے ہیکل تراشتا ہے اور ان کے اردگرد خوشبوؤں اور اُجالوں سے دھوئی ہوئی ایسی خوابناک فضا کا تانا بانا بنتا ہے کہ سچ مچ ایک بار تو اسی فضا میں مرنے کو جی چاہتا ہے ؎

یہ چاند جو دامن سے جھٹکتا ہے ستارے — اک پھول ہے گویا گہر افشاں شبِ مہتاب

دینا اُسے اک خانۂ ویراں کی خبر بھی — اُترے جو گلستاں بہ گلستاں شبِ مہتاب

پاکیزہ و رنگیں و سکوں بخش و دل آویز — کہتے ہیں کہ فطرت کی ہے منزل شبِ مہتاب

خوابِ تزئینِ بستاں میں کھویا ہوا — سو گیا زیرِ شاخِ گل افشاں کوئی

قدم قدم پہ ہے گلریزئ عروسِ بہار — یہیں کہیں دلِ فطرت کو نیند آئے گی

نظرت نے احساس و وجدان، تجربہ و ریاضت کو ہی اپنے فن کی جولانگاہ بنایا ہے اور میں نے اسی کسوٹی پر نظرت کی غزل کو پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ مشہور ناقدین اور حکماء کے مقولے نقل نہیں کیے۔ نظرت نے زندگی بھر حوصلۂ یک گام کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا، اور اسی کے سہارے اس نے زندگی کی اتنی جانگسل اور کٹھن منزلیں ہنستے کھیلتے سر کی ہیں۔ یقین مانیئے، وہ موت کی اس بہانہ آزیں خواہش کے باوجود مرنا نہیں چاہتا کیونکہ اسے زندگی سے عشق ہے اور اس کی نظرت پرستی کا دوسرا نام زندگی ہے، رقصاں، تاباں، خنداں، گریاں، مرتعش اور سیماب پا زندگی بالکل فطرت کی طرح ؎

مدتوں تک خونِ دل صرفِ صنعت ہوتا رہا
پھر تعجب کیا 'وہ تاباں' کہاں سے آ گئے!!

("جشنِ نظرت" منعقدہ راولپنڈی میں پڑھا گیا)

عبد العزیز فطرت

پندارِ نغمہ

غزل فطرت کی تم نے گنگنائی — قیامت تھا یہ اعجازِ غنائی
مرے ہر حرف کو موتی بنایا — مرے معنی کو رنگینی دکھائی
وہ مدھم سر میں نغموں کا بم و زیر — وہ ہلکی زیرِ لب نغمہ سرائی
مری اپنی نظر میں آج تم نے
مری عزت، مری وقعت بڑھائی

تمھاری دلنشیں لَے نے عطا کی — مرے افکار کو رنگیں قبائی
اب آیندہ سے فخر و ناز اس پہ — کرے گا میرا ذوقِ خود ستائی
کہ میرے عزم میں تم نے خود کو کھو کر
غزل میری، فسردہ لَے میں گائی

ارے یہ کیا؟ یہ کیوں گھبرا گئے تم — یکایک اس قدر بے اعتنائی
معاً یہ بے وفاؤں کا سا انداز — یہ صورت، صورتِ نا آشنائی
ہُوا گستاخ میں شاید زیادہ — ذرا سی بات تھی، میں نے بڑھائی
مبارک تم کو ہو اے جانِ نغمات — دیارِ نغمہ کی فرماں روائی
ہوا شاید ملوث گیت کا حسن
سخن میرا تھا ننگِ خوش نوائی

تمھیں کیونکر یقیں اس کا دلاؤں — کہاں فطرت کہاں فکر آزمائی
غزل ہو گی کسی معجز نوا کی — جو تم نے بیخودی میں گنگنائی
تمھیں باور کرا دے کوئی یہ بات
تو اس کی نذر رہے ساری خدائی

عزیز ملک

فطرت ماضی اور حال کے آئینے میں

میں نے بزرگوں سے روایات میں یہ بات سنی تھی کہ جس طرح پتھر کے کبھی جونک نہیں لگتی اسی طرح پنڈی کی یہ ریت رہی ہے کہ یہاں علمی اور ادبی تحریکیں مشکل ہی سے پروان چڑھتی ہیں۔ شاید اس آب و گل کی جبلّی نہاد اور فطری افتاد کچھ ایسی ہے کہ مٹی کے اندر پودوں کی جڑوں کو چاٹنے والے دیمک زیادہ اور قوتِ نامیہ کا کیمیائی عنصر کم اور پانی میں آکسیجن کی جگہ مٹی کا نیل داز مقدار میں پایا جاتا ہے۔ دامنِ کوہ میں واقع ہونے کی وجہ سے شہر میں نزلہ زکام کی وارداتیں کثرت سے ہوتی ہیں اور لوگ اس وبا کا تدارک کرنے کے لئے "حقہ تمباخو" کا بڑا شوق رکھتے ہیں۔ اسی کارن منشیات کا دھندا سارا سال پورے جوبن پہ رہتا ہے۔ تاجرانِ حقہ تمباکو نہ صرف خود طبعی طور پر محقق پائے جاتے ہیں بلکہ ان کے نگارخانوں سے پنجابی چھوڑے۔ لکھنؤ کے مداریے۔ سنگ پیچواں۔ رنگارنگ گڑگڑیاں اور کھڑے پیچے کی گردن دراز پشاوری "چلمیں" بھی بالعموم مل جاتی ہیں —— ان میں سے ہر نوع بجائے خود ایک تمدنی عنصر کی موجودگی کا پتہ دیتی ہے کہ جب مارچ ۱۸۴۹ء میں خطہ پوٹھوہار فرنگی کی یلغار اور مغرب کی گرمیٔ بازار کا نشانہ بنا تو برصغیر کے طول و عرض سے مختلف اہلِ حرفہ اور تاجر پیشہ لوگ پنڈی میں آکر آباد ہونے لگے۔ ان میں سے ہر فرد اپنی امنگوں کا پشتارہ لاد کر لایا اور منزل پر پہنچتے ہی نگر نگر کے باسیوں نے اپنی اپنی لیلا رچادی۔ اسی ملغوبہ سے آگے چل کر ایک باغ و بہار معاشرہ نے جنم لیا۔ جن میں بیت بازوں کی ٹولیاں شامل تھیں اور پورب پچھم کی بولیاں ٹھولیاں بھی —— دھیرے دھیرے ایک نیا افق نمودار ہوتا چلا گیا اور ہوتے ہوتے سرداروں کے باغ میں پنجابی اردو کے مخلوط گنگا جمنی مشاعرے برپا ہونے لگے۔

گذری ہوئی نصف صدی کا کسی قدر احوال میری شنید اور کچھ دید میں آیا ہے۔ میں نے خوش نصیبی سے اردو اور پنجابی کے کم و بیش ان تمام بزرگ شاعروں کو دیکھا ہے جو بیسویں صدی کے ربع اوّل کے بعد تک کی ادبی اور مجلسی سرگرمیوں کی روحِ رواں تھے۔ انہی محفلوں کی کوکھ سے ۱۹۲۷ء میں ایک "بزمِ سخن" نے جنم لیا۔ ڈاکٹر طاہر مرحوم اس کے بانیوں اور کارپردازوں میں سے تھے۔ پھر ایکا ایکی طاہر مرحوم کا ایک شاگرد منصۂ شہود پہ آگیا۔ اس نے اپنے استاد کے ادبی مشاغل کو سنبھالا دیا —— یہ شاگرد عبدالعزیز فطرت تھا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب فطرت جوان تھا۔ وہ اپنی معیشت کے لئے ڈاک کے محکمے سے متعلق تھا۔ تقدیر نے اس کو

○ یہ مضمون دو برس پہلے جشنِ فطرت میں پڑھا گیا تھا۔

ڈاک ہی کے شعبہ کی مناسبت سے اس کام پر مامور کیا کہ وہ نہ صرف مشاعرے، مذاکرے اور مناثرے جوڑتا بلکہ اہلِ ذوق اصحاب کے گھروں پر جاکر دعوت نامے بھی بانٹتا پھرتا تھا۔ اس میں بلا کا جوشِ خروش اور جنون کی حد تک پہنچی ہوئی لگن تھی۔ وہ خود ہی ان اجتماعات کے لئے سٹیج بناتا، کرسیاں لگاتا اور محفلیں جماتا۔ یہی نہیں بلکہ روٹھے شاعروں کو مناتا، چائے پلاتا۔ تب کہیں جاکر ان سے شعر پڑھواتا تھا۔ ۱۹۲۹ء میں اس کی "بزمِ سخن" نے "بزمِ ادب" نام پایا اور اب اس کے اہتمام سے مقامی کالجوں اور تعلیمی درسگاہوں میں التزام کے ساتھ جلسے اور مشاعرے ہونے لگے۔ لوگوں کو شعروسخن کی چاٹ پڑنے اور دم بدم بڑھنے لگی۔ نئی پود کے بہت سے نوجوان شعراء نے فکرونظر کی اسی قندیل سے روشنی پائی۔ گویا فطرت کی اخلاص مندی اور ان تھک کوششوں سے اس شہر کے ادبی مزاج کا وجود قائم ہوا۔ لیکن آس پاس کے ماحول میں بڑے بڑے زندہ دل معاملہ فہم اور ولولہ انگیز قسم کے لوگ بھی تھے۔ انہیں شعروادب سے اتنا ہی واسطہ تھا کہ ان ہنگاموں میں وقت گذاری کے لئے آنکلتے اور محفل میں گرمیٔ حیات پیدا کرنے کے لئے برّی شاہ لطیف کے نعرے داغتے اور کچھ باکمال ایسے بھی تھے جو اگرچہ شاعر نہ ہوتے لیکن "بزمِ ادب" کے معاملات میں دراندازہوجاتے اور پوری دیانت داری کے ساتھ ہر خادمِ فن کو مقامِ عزت بخشنے کے لئے پہلے زینہ کا راستہ دکھاتے پھر زینہ کھینچ لیتے تاکہ ان کے حسنِ عمل پر موجودہ نسل تحسین کا غلغلہ بلند کرے اور آفرین کا ڈونگرا برسائے تاکہ آنے والی نسلوں کے لئے سرمایۂ عبرت جمع ہوجائے۔ یہ سب ماجرے فطرت کے ساتھ بھی گذرے لیکن وہ اپنی دھن میں مگن چلتا چلاگیا۔ وہ اپنی تنخواہ کا ایک حصہ اپنے شوق اور ذہنی بھٹی میں ایندھن کی طرح برابر جھونکتا رہا۔ اس نے عمر بھر کے ریاض کی بدولت شعر کے فن میں بصیرت تو ضرور حاصل کرلی۔ کاش وہ جعلی نوٹ بنانا بھی سیکھ لیتا۔ کیونکہ عمر کے اس حصے میں جبکہ اسے اپنا مجاہدہ ختم کرکے آرام کی زندگی بسر کرنے کی ضرورت ہے وہ اپنی اور اپنے متعلقین کی معیشت کی خاطر اخبارات اور ریڈیو کے لئے مسودات کا پلندہ اٹھائے بس اسٹینڈ پر کھڑا نظر آتا ہے ——— وہ فطرت کے ماضی کا زمانہ تھا۔ یہ فطرت کے حال کا آئینہ ہے!

اگرچہ وہ زمانہ بیت گیا جب ملک ہندو کا اور حکم برٹش کا تھا۔ اس عہد میں تو فطرت نے پرزور آندھیوں کے درمیان اس سنگلاخ خطہ میں اردو کا چراغ روشن کئے رکھا۔ لیکن ایک یہی سخن شناس حالیہ دور ہے جس میں قلمکاروں کو نانِ شبینہ کی خاطر دماغ سوزی اور سینہ کاوی کے ساتھ ساتھ بنولوں کی تجارت بھی کرنا پڑتی ہے۔

چنداں زمانہ نہیں گذرا ——— قیامِ پاکستان کے ہنگام جب ہر شخص لوٹ کھسوٹ اور الاٹ منٹوں کے چکر میں مبتلا تھا۔ فطرت اپنی دیرینہ لگن کے ہاتھوں مجبور، قائد اعظم ریلیف فنڈ کے لئے مشاعرے ترتیب دے رہا تھا۔ انہی مشاعروں کو اس کی ادبی زندگی کی آخری تگ و دو کہنا چاہیئے۔ کیونکہ اس کے بعد وہ اس محاذ کے کسی مورچے پر ہمیں نظر نہیں آیا۔ اس نے چپکے سے دوسروں کے لئے جگہ خالی کردی اور آج شاید گنتی کے چند افراد کے سوا اس کی "بزمِ ادب" کا نام تک کوئی نہیں جانتا۔ اگرچہ ع

بزم کو برہم ہوئے مدت نہیں گذری بہت
اُٹھ رہا ہے گل سے شمعِ بزم کے اب تک دھواں

احسان دانش

○

رازِ دل ہے یہ محبت تو پھر افشا کیوں ہو
عرضِ غم ، درد کی غیرت کو گوارا کیوں ہو

کیوں سرِ شام جلیں ذہن کے طاقوں میں چراغ
وحشتِ خلوت میں کوئی انجمن آرا کیوں ہو

سینۂ مقتل گہِ ارمان و وفا ہے تو رہے
ہم پہ ہر حال میں ہنسنے کا تقاضا کیوں ہو

کوئی احسان نہیں حسن پہ ، ایثار و وفا
اُن پہ اس قرضِ محبت کا تقاضا کیوں ہو

رات بھر ذہن پہ کیوں طائرِ مہتاب اُڑے
صبح تک حشر یہ احساس میں برپا کیوں ہو

جوق در جوق چلے آتے ہیں شب زاد خیال
تیرا جلوہ ترا جلوہ ہے ، تماشا کیوں ہو

عظمتِ غم کی روایت کا لہو کیا معنی؟
اس قدر بھی کوئی مجبورِ تمنا کیوں ہو

خیر و شر بزمِ خرابات کے افکار نہیں
فکرِ امروز میں تخمینۂ فردا کیوں ہو

ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا یارو!
شامِ تنہائی سہی ، اتنا اندھیرا کیوں ہو

اب ہے آزادئ افکار و نظر کا موسم
کوئی اس فصل میں محرومِ تمنا کیوں ہو

وارثانِ گُل و لالہ کی شریعت کے خلاف
اجنبی دیس کے پھولوں کی تمنا کیوں ہو

خوش ہوں زنداں میں مگر یہ کوئی انصاف نہیں
تیرا نغمہ مری زنجیر سے پیدا کیوں ہو

شہ پر ناز ہے؟ لو شہر سنبھالو اپنا!
بندۂ اربابِ جنوں پہ رہِ صحرا کیوں ہو

مسکرائے ہیں یہاں خونِ شہیداں کے چراغ
سُونا سُونا مری بستی کا سویرا کیوں ہو

خاک سے کیوں نہ اُگیں گرد کے چھتنار منار
دھوپ کے رنگ ہیں ڈوبا ہُوا صحرا کیوں ہو

تشنہ کاموں کو سرابوں کی چکا چوند نہ دے
رہرووں کو تری جانب سے یہ دھوکا کیوں ہو

ہم تو بے پردگیٔ عشق کے قائل ہی نہیں
غم کو الفاظ میں لانے کی تمنا کیوں ہو

بینگے چاند سے کیوں صبح کی کرنوں کی جلن
دن کے برتاؤ کا راتوں سے مداوا کیوں ہو

کوئی بھیجے مجھے کیوں شعر کے پردے میں پیام
مری خاطر کوئی اخبار میں رسوا کیوں ہو

میری یادوں میں ہے تو اس کے چہروں کی مٹھاس
تتلیوں کا مرے آنگن میں تماشا کیوں ہو

کیوں مری روح میں لہرائے گلستاں کی شمیم
ابر گرجے تو مرے دل میں دھماکا کیوں ہو

بے اثر شورِ مناجات ہے توہینِ طلب
بے صدف دیدۂ خونبار کا دریا کیوں ہو

اُگ رہے ہیں سرِ کہسار جو بادل کے درخت
اُن کی شاخوں کا مری رُوح پہ سایا کیوں ہو

کچھ حسینوں میں پرستارِ جنوں ہیں تو رہیں
شہر کی آگ سے روشن مرا صحرا کیوں ہو

عبد و معبود کا رشتہ ہے تو پھر اے دانش
آدمی حشر کے میدان میں رسوا کیوں ہو

باقی صدیقی

○

کہتا ہے ہر مکیں سے مکاں، بولتے رہو

اس چپ میں بھی ہے جی کا زیاں، بولتے رہو

ہر یاد، ہر خیال ہے لفظوں کا سلسلہ

یہ محفلِ نوا ہے، یہاں بولتے رہو

موجِ صدائے دل پہ رواں ہے حصارِ زیست

جس وقت تک ہے منہ میں زباں، بولتے رہو

اپنا لہو ہی رنگ ہے، اپنی تپش ہی بو

ہو فصلِ گل کہ دورِ خزاں، بولتے رہو

قدموں پہ بار ہوتے ہیں سنسان راستے

لمبا سفر ہے ہمسفراں! بولتے رہو

ہے زندگی بھی ٹوٹتا ہوا آئنہ تو کیا

تم بھی بطرزِ شیشہ گراں بولتے رہو

باقی جو چپ رہو گے تو اٹھیں گی انگلیاں

ہے بولنا بھی رسمِ جہاں، بولتے رہو

ادا جعفری

○

جب دل کی رہگزر پہ ترا نقشِ پا نہ تھا
جینے کی آرزو تھی مگر حوصلہ نہ تھا

آگے حریمِ غم سے کوئی راستہ نہ تھا
اچھا ہوا کہ ساتھ کسی کو لیا نہ تھا

دامانِ چاک چاک گلوں کو بہانہ تھا
ورنہ نگاہ و دل میں کوئی فاصلہ نہ تھا

کچھ لوگ شرمسار، خدا جانے کیوں ہوئے
اُن سے تو روحِ عصر! ہمیں کچھ گلہ نہ تھا

جلتے رہے خیال، برستی رہی گھٹا
ہاں نازِ آگہی! تجھے کیا کچھ روا نہ تھا

سنسان دوپہر ہے، بڑا جی اُداس ہے
کہنے کو ساتھ ساتھ ہمارے زمانہ تھا

ہر آرزو کا نام نہیں آبروئے جاں
ہر تشنہ لب جمالِ رُخِ کربلا نہ تھا

آندھی میں برگِ گُل کی زباں سے ادا ہُوا
وہ راز جو کسی سے ابھی تک کہا نہ تھا

قتیل شفائی

○

اب تو کچھ اور ہی اعجاز دکھایا جائے
شام کے بعد بھی سورج نہ بجھایا جائے
(ندیم)

زیست کی گرمی بیدار بھی لایا سورج
کھل گئی آنکھ مری سر پہ جو آیا سورج

پھر شعاعوں نے مرے جسم پہ دستک دی ہے
پھر جگانے مرے احساس کو آیا سورج

کسی دلہن کے جھمکتے ہوئے جھومر کی طرح
رات نے صبح کے ماتھے پہ سجایا سورج

شام کو روٹھ گیا تھا مجھے تڑپانے کو
صبحدم آپ مجھے ڈھونڈنے آیا سورج

لوگ کہتے رہے سورج کو دکھائیں گے چراغ
اور ہی رنگ تھا، جب سامنے آیا سورج

ڈالتے اس پہ کمندیں، وہ کوئی چاند نہ تھا
سو جتن سب نے کیے، ہاتھ نہ آیا سورج

خوب واقف تھا وہ انسان کے اندھے پن سے
جس نے یونان کے اجالے میں جلایا سورج

کم نہ تھا اس کا یہ احسان کہ جاتے جاتے
کر گیا اور بھی لمبا مرا سایا سورج

شب کو بھی روح کے آنگن میں رہی دھوپ قتیلؔ
چاند تاروں نے بھی اگر نہ بجھایا سورج

شہزاد احمد

○

رات کی نیندیں تو پہلے ہی اُڑا کر لے گیا
رہ گئی تھی آرزو، سو بھی وہ آ کر لے گیا

تتلیاں آئیں گی کیا اب کانچ کے گلدان پر
پھول جتنے تھے وہ بالوں میں لگا کر لے گیا

دن نکلتے ہی وہ خوابوں کے جزیرے کیا ہوئے
صبح کا سورج مری آنکھیں چرا کر لے گیا

دور سے دیکھو تو یہ دریا ہے پانی کی لکیر
موج میں آیا تو جنگل بھی بہا کر لے گیا

اُس نے تو اِن موتیوں پر خاک بھی ڈالی نہیں
آنکھ کی تھالی میں، میں آنسو سجا کر لے گیا

غور سے دیکھا تو دل کی خاک تک باقی نہ تھی
مجھ کو دعویٰ تھا کہ میں سب کچھ بچا کر لے گیا

فارغ بخاری

○

نشاطِ رنگ بھی، سنگِ رہِ وفا ہے مجھے
شدید جذبے نے مجروح کر دیا ہے مجھے

چلو یہ عشرتِ احساس بھی غنیمت ہے
کہ جس کو یاد کروں، وہ بھی سوچتا ہے مجھے

میں عکس ہوں تو یہ پھر دردِ نارسائی کیا
وہ آئینہ ہے تو کیوں ہمسفر کیا ہے مجھے

میں چاندنی کی حسیں سیج سے اٹھوں کیونکر
یہ کون بامِ فلک سے پکارتا ہے مجھے

ہر ایک داغ پہ غنچے سجائے بیٹھا ہوں
سوائے میرے یہاں کون جانتا ہے مجھے

یہ آرزو ہے کہ چھو کر بھی میں اسے دیکھوں
وہ ایک جلوہ جو محسوس ہو رہا ہے مجھے

میں قربتوں کی تھکاوٹ سے چور ہوں فارغ
عزیز اب تو نگاہوں کا فاصلہ ہے مجھے

فارغ بخاری

○

اس اوج پر نہ اچھالو بس مجھے ہوا کر کے
کہ میں جہاں سے ہوں اُترا خدا خدا کر کے

ازل سے مجھ سے ہے وابستہ خیر و شر کا نظام
نہ دیکھو مجھ کو مری ذات سے جدا کر کے

یہ جانتا ہوں، مقفل ہیں سارے دروازے
مجھے جنوں ہے کہ گزروں مگر صدا کر کے

میں کیا کہوں یہ ستم ہے کہ بارِ احساں ہے
جو جا رہا ہے مجھے درد آشنا کر کے

میں اپنے دور کے اس کرب کا ہوں آئینہ
جو پیشرو ہوا رخصت مجھے عطا کر کے

شکستِ ضبط پہ میں بھی بہت خجل ہوں مگر
کھُلا ہے اس کا بھرم میرا سامنا کر کے

یہ فخر کم نہیں فارغؔ، ہے دل غریب تو کیا
کہ آبرو تو نہیں کھوئی التجا کر کے

ظہور نظر

○

وہ درد کہ آرام سا تھا، اور مجھے دے
ہر وقت تڑپنے کی دعا اور مجھے دے

کچھ نقشِ طرب ذہن پہ باقی ہیں ابھی تک
اے وقت! غمِ صبح دما اور مجھے دے

ہاں اس سے بڑا جرم نہیں کوئی جہاں میں
ناکردہ گناہی کی سزا اور مجھے دے

بے ہوش ہوں، اے یار کے دیدار کی ساعت!
کچھ دیر تو دامن کی ہوا اور مجھے دے

کہنے کو نہیں کچھ بھی تو نظریں ہی ملا لے
خالی ہی سہی جام، اٹھا اور مجھے دے

دل اب بھی دھڑکتا ہے تو لیتا ہے ترا نام
کچھ روز ابھی زہرِ جفا اور مجھے دے

گرنے ہی کو ہے گنبدِ ماضی مرے اوپر
بس ایک صدا — ایک صدا اور مجھے دے

سو جاؤں تو پھر اٹھ نہ سکوں روزِ ابد تک
یہ قدر، یہ توفیقِ خدا اور مجھے دے

پردہ نہ اٹھا شرمِ تعلق کا نظر سے
دھوکا ہی بہ اندازِ وفا اور مجھے دے

ظہور نظر

○

گو اپنا راستہ مجھے ازبر کبھی نہ تھا
میں اپنے راستے کا تو پتھر کبھی نہ تھا

قدموں میں آگرا ہے مرے اپنے بوجھ سے
جھکتا کسی کے در پہ بھی جو سر کبھی نہ تھا

دیتا نہیں دکھائی مجھے اپنا آپ بھی
تاریک اتنا گنبدِ بے در کبھی نہ تھا

وحشت میں خود ہی مار نہ دوں اپنے آپ کو
تھے اور لاکھ خوف، پہ یہ ڈر کبھی نہ تھا

کیا ہو گیا ہے، کوئی بتا دے مجھے کہ میں
یوں آپ اپنی ذات کا محور کبھی نہ تھا

میں کون ہوں کہاں ہوں یہ کیسی صدائیں ہیں
مقتل کے موڑ پر تو مرا گھر کبھی نہ تھا

چشمے تو پھوٹتے تھے کئی آئے دن، مگر
آنکھوں میں آنسوؤں کا سمندر کبھی نہ تھا

وہ آشیاں بھی برقِ غمِ جاں کی زد پہ ہے
سایہ بھی جس کا شاخِ طرب پر کبھی نہ تھا

حیراں ہوں جی رہا ہوں تو کیوں جی رہا ہوں میں
تھا — لیکن اس قدر بھی تو ششدر کبھی نہ تھا

سورج کے ساتھ ڈوب گیا میرا دل بھی آج
اتنا اداس شام کا منظر کبھی نہ تھا

تیرے وجود ہی سے مجھے عشق تھا، مگر
نظروں میں تیرے جسم کا پیکر کبھی نہ تھا

اچھا ہوا کہ وہمِ سکوں تک بھی مٹ گیا
یہ حرف لوحِ جاں پہ مکرّر کبھی نہ تھا

کیوں مضطرب ہو رفتہ دنوں کے لیے نظرؔ
ماضی تمہارا حال سے بہتر کبھی نہ تھا

احمد فراز

○

کہا تھا کس نے تجھے، آبرو گنوانے جا
فرازؔ اور اُسے حالِ دل سنانے جا

کل اک فقیر نے کس سادگی سے مجھ سے کہا
تری جبیں کو بھی ترسیں گے آستانے جا!

بہت ہے دولتِ پندار، پھر بھی دیوانے!
جو تجھ سے روٹھ گیا ہے اُسے منانے جا

اُسے بھی ہم نے گنوایا تری خوشی کے لیے
تجھے بھی دیکھ لیا ہے، ارے زمانے جا!

سنا ہے اس نے سوئمبر کی رسم تازہ کی
فرازؔ تو بھی مقدّر کو آزمانے جا

احمد فراز

○

گلہ نہ کر دلِ ویراں کی ناسپاسی کا
ترا کرم ہی سبب بن گیا اداسی کا

ملول کر گئی ویران ساعتوں کی صدا
چمن میں جی نہ لگا جنگلوں کے باسی کا

بھرم کھلا ہے کہ جب اُس سے ہمکلام ہوئے
ہمیں بھی زعم تھا کیا کیا سخن شناسی کا

شکستِ عہد کوئی ایسا سانحہ تو نہیں
تجھے بھی رنج ہُوا، بات اک ذرا سی کا

فرازؔ اب کہ فقط راستے کا پتھر ہوں
میں دیوتا تھا کبھی ایک دیوداسی کا

خلیل الرحمٰن اعظمی

○

سوتے سوتے چونک پڑے ہم، خواب میں ہم نے کیا دیکھا
جو خود ہم کو ڈھونڈھ رہا ہو، ایسا اک رستا دیکھا

دور سے اک پرچھائیں دیکھی، اپنے سے ملتی جلتی
پاس سے اپنے چہرے میں بھی اور کوئی چہرا دیکھا

سونا لینے جب نکلے تو ہر ہر ڈھیر میں مٹی تھی
جب مٹی کی کھوج میں نکلے، سونا ہی سونا دیکھا

سوکھی دھرتی سن لیتی ہے پانی کی آوازیں
پیاسی آنکھیں بول اٹھتی ہیں، ہم نے اک دریا دیکھا

آج ہمیں خود اپنے اشکوں کی قیمت معلوم ہوئی
اپنی چتا میں اپنے آپ کو جب ہم نے جلتا دیکھا

چاندی کے سے جن کے بدن تھے، سورج کے سے مکھڑے تھے
کچھ اندھی گلیوں میں ہم نے ان کا بھی سایا دیکھا

جن سے مل کر لوٹے ہیں اب ان کی بات نہیں کرتے
جن کا نام بہت سنتے تھے، ہم نے ان کو جا دیکھا

رات وہی پھر بات ہوئی نا، ہم کو نیند نہیں آئی
اپنی روح کے سناٹے سے شور کوئی اٹھتا دیکھا

سرور بارہ بنکوی

○

یہی نہیں کہ مرا دل ہی میرے بس میں نہ تھا
جو تو ملا تو میں خود اپنی دسترس میں نہ تھا

بنامِ عہدِ رفاقت بھی ہم قدم نہ ہوا
یہ حوصلہ مرے معصوم ہمنفس میں نہ تھا

نہ جانے قافلۂ اہلِ دل پہ کیا گذری
یہ اضطراب کبھی نالۂ جرس میں نہ تھا

خبر تو ہوگی تجھے، تیرے جاں نثاروں میں
کوئی تو تھا سرِ مقتل جو پیش و پس میں نہ تھا

سرور اپنے چمن کی فضا ہے، کیا کہیے
سکوت کا تو وہ عالم ہے جو قفس میں نہ تھا

حبیب اشعر

○

نہ دلبروں ہی میں دیکھی، نہ شہریار میں ہے
وہ شانِ ناز، جو تیرے گناہگار میں ہے

نہ جانے اہلِ فطنہ کا مآل کیا ہوگا؟
تری نگاہ کی گردش بھی روزگار میں ہے

کسی سے حل نہ ہُوا عقدۂ وفا اب تک
زمانہ، میری توجہ کے انتظار میں ہے

بس ایک طرزِ نظر کا فریب ہے، ورنہ
خزاں میں بھی تو وہی کچھ ہے، جو بہار میں ہے

تمام سوزِ تمنّا، تمام سازِ نشاط
عجیب لطف محبت کے کاروبار میں ہے

جو راہِ شوق سے گزرا نہ ہو، وہ کیا جانے
شکستہ پائی بھی شاملِ تلاشِ یار میں ہے

وہاں قبول نہیں نذرِ دو جہاں، اشعرؔ
یہ تیرا دل، یہ تری جان کس شمار میں ہے

افضل پرویز

○

صدمے دُکھڑے جھیل کے، دل کو پتھّر کر لیا
انہونی کیا دیکھتے، ہاتھ آنکھوں پر دھر لیا

آپ کی بات بجا سہی، ہم ہی گرے تھے تیغ پر
اپنے قتل کا جُرم بھی، ہم نے اپنے سر لیا

آنے والے راہیو، اب تو رستہ صاف ہے
ماضی کے ہر خار سے، ہم نے دامن بھر لیا

اپنا یہی گناہ ہے، اُن جیسے بے حِس نہیں
بستی کے ہر شخص نے، مارنے کو پتھّر لیا

یہ بازی جو پریت ہے، اس کی ہار ہی جیت ہے
مات کی گھات اُچوک تھی، پاپی من بھی ہر لیا

حسن کا ظلم و جور بھی، ہم کو جاں سے عزیز ہے
دل میں رکھا سینت کے اور سر آنکھوں پر لیا

عشوے غمزے ہر طرف، عشق پہ لیکن قدغنیں
کس برتے پر آپ نے اس کوچے میں گھر لیا

منیر نیازی

○

ہری ٹہنیوں کے نگر پر گئے
ہوا کے پرندے شجر پر گئے

اک آسیب لرزاں مکانوں میں ہے
مکیں اس جگہ کے سفر پر گئے

بہت دھند ہے اور وہ نقشِ قدم
خدا جانے کس رہگزر پر گئے

کہ جیسے ابھی تھا یہاں پر کوئی
گماں کیسے خوابِ سحر پر گئے

کبھی رنگ پیدا ہوئے برق سے
کبھی عکس دیوار و در پر گئے

وہی حسنِ دیوانہ گر ہر طرف
سبھی رخ اسی کے اثر پر گئے

منیر آج اتنی اداسی ہے کیوں
یہ کیا سائے سے بحر و بر پر گئے

منیر نیازی

○

چمن میں رنگِ بہار اُترا تو میں نے دیکھا
نظر سے دل کا غبار اُترا تو میں نے دیکھا

میں نیم شب آسماں کی وسعت کو دیکھتا تھا
زمیں پہ وہ حسن زار اُترا تو میں نے دیکھا

گلی سے باہر تمام منظر بدل گئے تھے
جو سایۂ کوئے یار اُترا تو میں نے دیکھا

خمارِ مے میں وہ چہرہ کچھ اور لگ رہا تھا
دمِ سحر جب خمار اُترا تو میں نے دیکھا

اک اور دریا کا سامنا تھا منیر مجھ کو
میں ایک دریا کے پار اُترا تو میں نے دیکھا

زہرا نگاہ

○

لب پر خموشیوں کو سجائے، نظر چرائے

جو اہلِ دل ہیں، بیٹھے ہیں چپ چاپ سر جھکائے

کہدو کوئی صبا سے ادھر آجکل نہ آئے

کلیاں کہیں چٹک نہ اُٹھیں، پھول کھل نہ جائے

اب دوستی وہ فن، کہ جو سیکھے وہی بنھائے

اور ہے وفا تماشا، جسے آئے وہ دکھائے

کچھ کہنا جرم ہے تو خطاوار میں بھی ہوں

یہ اور بات، میرا کہا وہ سمجھ نہ پائے

زہرا نگاہ

○

آندھیاں آئیں کئی رنگ اُبھرے
آگ برسی، تو بہت پھول کھلے
نغمے آنکھوں سے ابھر آئے ہیں
تیر پیوستِ گلو جب بھی ہوئے
اک اشارے پہ نصیبہ جاگا
ایک جنبش پہ بنے گھر بگڑے
آپ سمجھیں جنھیں، وہ سب سے جدا
آپ چاہیں جنھیں، وہ سب سے بھلے
ہم سے کتنوں کا سفر جاری ہے
جانے ہم کیوں سرِ منزل پہنچے

○

غم بھی اس دل کا آسرا نہ ہُوا
تیرا احسان تھا، ادا نہ ہُوا

لب گویا تو بل گیا تھا ہمیں
صرفِ اظہارِ مدعا نہ ہُوا

نارسائی مزاجِ دل ٹھیری
ختم کوئی بھی سلسلہ نہ ہُوا

یہ ہے انعامِ آبلہ پائی
ساتھ چلنے کا حوصلہ نہ ہُوا

زخم بھی اب تو ڈھے رہے ہیں صدا
ذوقِ پرسش مگر سوا نہ ہُوا

رضا ہمدانی

○

ہر عکس خود ایک آئینہ ہے
ہر سایہ زباں سے بولتا ہے
احساس کی تلخیوں میں ڈھل کر
دل درد کا چاند بن گیا ہے
گویا تھے تو کوئی بھی نہیں تھا
اب چپ ہیں تو شہر دیکھتا ہے
عاجز ہے اجل بھی اس کے آگے
جو مثلِ صبا بکھر گیا ہے
احساس کی لَو ہے یا بدن کے
صحرا میں چراغ جل رہا ہے
تو سلسلۂ سوال بن کر
کیوں ذہن کے بن میں گونجتا ہے
قربت تری کس کو راس آئی
آئینے میں عکس کانپتا ہے
جیتے ہیں روایتاً رضا ہم
اس دور میں زندگی سزا ہے

اطہر نفیس

○

دل کی مسرتیں نئی، جاں کا ملال ہے نیا

میری غزل میں آج پھر ایک سوال ہے نیا

اب جو کھلے ہیں دل میں پھول، اُن کی بہار ہے نئی

اب جو لگی ہے دل میں آگ، اس کا جلال ہے نیا

اُس کے لیے بھی غمزہ و ناز و ادا کا وقت ہے

اپنے لیے بھی موسمِ ہجر و وصال ہے نیا

اُس میں بھی خود نمائی کے رنگ بہت ہیں ان دنوں

اپنے لیے بھی عرصۂ خواب و خیال ہے نیا

جاگ اُٹھا ہے اک چمن میری حدودِ ذات میں

اُس کے قریب ہی کہیں، دشتِ ملال ہے نیا

لذّتِ قرب کے چراغ روح میں جل اُٹھے ہیں آج

سوز و گدازِ ہجر بھی شاملِ حال ہے نیا

جھوم اُٹھے ہیں برگ و بار، پھول کھلے ہیں بے شمار

اے میری روحِ بے قرار، تیرا تو حال ہے نیا

شاذ تمکنت

○

عمر بھر حسرتِ تعمیرِ نشیمن میں رہوں
میں جہاں جاؤں ترے درد کی انجمن میں رہوں

میں تو آنسو ہوں مرے بخت کا کیا کہنا ہے
تری آنکھوں میں رہوں یا ترے دامن میں رہوں

کیا ہوئی تیری دُعائے سحر و شام کہ میں
روزِ روشن کی طرح زلفِ شب افگن میں رہوں

تُو خدا ہے مرے حق میں تو مجھے آس بہت
میں اسی آگ، اسی وادیٔ ایمن میں رہوں

سر بہ سجدہ ہی کٹے زیرِ کمانِ ابرو
ڈور کی طرح تری سانس کی سمران میں رہوں

تیز ہے بادِ مخالف، مرے گلشن سے نہ جا
کہ میں گر شاخ سے ٹوٹوں، ترے دامن میں رہوں

دل تو سینے میں وہی ہے تری یادوں کا حرم
میں بیاباں میں رہوں شاذ کہ مدفن میں رہوں

شاذ تمکنت

○

کیا کروں، رنج گوارا نہ خوشی راس مجھے
جینے دے گی نہ مری شدتِ احساس مجھے

میں کسی بزم کے قابل نہ رہا ترے بعد
ہنس پڑا ہوں تو ہُوا جرم کا احساس مجھے

ہم نے اک دوسرے کو پُرسۂ فرقت نہ دیا
میری خاطر تھی تجھے اور ترا پاس مجھے

ایک ٹھہرا ہُوا دریا ہے مری آنکھوں میں
جانے کس گھاٹ پہ مارے گی تری پیاس مجھے

جیسے پہلوئے طرب میں کوئی نشتر رکھ دے
آج تک یاد ہے تیری نگہِ یاس مجھے

ریزہ ریزہ ہُوا جاتا ہے مرا سنگِ وجود
یوں صدا دے نہ پسِ پردۂ انفاس مجھے

شاخ سے برگِ چکیدہ کا تقاضا جیسے
کچھ اسی طرح ابھی تک ہے تری آس مجھے

روح کے دشت میں اک ہُو کا سماں ہے اے شاذؔ
دے گیا کون بھرے شہر میں بن باس مجھے

ظفر اقبال

○

منظر، ظفرؔ! کھُلیں ہی کھُلیں آفتاب کے
اُڑنے لگے ہوا میں کنارے نقاب کے

ہونٹوں سے چھُو بھی لے، مگر آنکھوں کو بند رکھ
طغیانیوں میں ہیں یہ سمندر سراب کے

کالج سے اُس کو کام بہت تھا ملا ہُوا
میں نے بھی کچھ سوال نکالے حساب کے

کچھ بھر دیا ہے خواہشِ خالی میں رنگِ دل
کچھ پڑ گئے ہیں بیٹھ کے نقشے نصاب کے

نشّہ تھا ٹنڈ منڈ درختوں کے آر پار،
تھے اُس کے شارٹ کوٹ پہ چھینٹے شراب کے

بتّی بجھی تو گدلے اندھیرے میں اور بھی
چمکے حروفِ گرم و گداز اُس کتاب کے

اس شوقِ بے مُہار کا انجام ہو بخیر
اچھے نہیں لہو میں بھنور ماہتاب کے

اُلجھی ہوئی ہیں سر میں صداؤں کی گُتھیاں
یا پاؤں میں چُبھے ہُوئے ٹکڑے ہیں خواب کے

آنکھوں میں سرخیوں کا سفر رک گیا، ظفرؔ
دیکھا تو ہم اسیر تھے نیلے گلاب کے

ظفر اقبال

○

پتوں کی طرح زرد بکھرنا تو چاہیے
شہرِ شبِ خزاں سے گزرنا تو چاہیے

ڈوبے ہوؤں کو طرۂ طوفاں نے یہ کہا:
سیلِ سفر کے ساتھ اُبھرنا تو چاہیے

کچھ زندگی کا ذائقہ بدلے کسی طرح
یعنی کسی کے نام پہ مرنا تو چاہیے

ویسے ہی مریں گے کچھ نہ کچھ، اپنا زیاں ہے کیا
کچھ روز در پہ اس کے پسرنا تو چاہیے

ہو جس کے گھر بھی چور ہمارا چھپا ہوا
الزام سارے شہر پہ دھرنا تو چاہیے

آنکھوں میں رنگِ تیرگی، آب سبز ہو
آخر وہ نقشِ ناب نکھرنا تو چاہیے

ساحل سے موج موج بدن کا شمار کیا
اُس بحرِ بے صدا میں اُترنا تو چاہیے

ہو گا وہی جو دل نے کہا بابِ وصل میں
ڈرنے کی اور بات ہے، ڈرنا تو چاہیے

بگڑے گئے تو وہ بھی بھگت لیں گے، اے ظفر
فی الحال اُس کے آگے نکھرنا تو چاہیے

صہبا اختر

○

خود نہاد روحِ قصرِ جسم ڈھاتی ہے میاں
موت باہر سے نہیں اندر سے آتی ہے میاں

جب تبدّل زیست میں ممکن نہیں تو فکر کیا
رات کیوں آتی ہے اور کیوں صبح جاتی ہے میاں

دل کے دامن میں چھپالو کندنی چہروں کی آگ
آگ یہ انسان کو کندن بناتی ہے میاں

پھول مرجھاتے ہیں لیکن، یہ ہے دستورِ چمن
جب کلی کھلتی ہے کوئی، مسکراتی ہے میاں

روشنیِ طبع کے مارے کہاں پاتے ہیں چین
یہ بلا کب اہلِ فن کے سر سے جاتی ہے میاں

عنبریں زلفوں کے سائے بخشتے ہیں روشنی
کوثریں ہونٹوں کی مے، صہبا بناتی ہے میاں

صہبا اختر

○

سپرد یاس کیا، حاصل تمنا نے
مجھے صلیب پہ کھینچا، مرے مسیحا نے

سراب شوق نے شاداب کر دیا آخر
ڈبو دیا مجھے تشنہ لبی کے دریا نے

لیے پھری مجھے نیرنگیٔ جہاں ہر سُو
کہیں سکوں نہ دیا حسرتِ تماشا نے

اندھیرے لے گئے سایہ بھی چھین کر مجھ سے
نگل لیا مجھے تنہائیوں کے صحرا نے

میں کارِ فن میں تھا، یکتائے فن مگر صہبا
مجھے تباہ کیا، کاروبارِ دُنیا نے

بشیر احمد بشیر

○

(نذرِ غالبؔ)

گاہے گماں، کسی سے بھی کمتر نہیں ہوں میں
گاہے یقیں، خود اپنے برابر نہیں ہوں میں

ہر چند میں عمیق بھی ہوں، بے کنار بھی
پھر بھی یہ اعتراف، سمندر نہیں ہوں میں

موجود ہوں میں صورتِ آیاتِ محکمات
کوئی خیال و خواب کا پیکر نہیں ہوں میں

اوجھل نہیں ہے میری نظر سے مزاجِ دہر
تیرے سلوک پر متحیر نہیں ہوں میں

اور اک ہیں جھلک جو دکھائے، وہ عکس ہوں
اُترے جو کاغذوں پہ، وہ منظر نہیں ہوں میں

اک حرفِ آگہی ہوں، میری آبرو ہی کیا
"گنجِ زمرّد و زر و گوہر نہیں ہوں میں"

حائل ہے درمیاں مرے تیرے، ہزار موج
سیلِ بلا ہے اور شناور نہیں ہوں میں

پھیلا ہے میرے چار طرف چرخِ نیلگوں
وہ چرخ، جس کا مرکز و محور نہیں ہوں میں

روزِ ازل سے میں ترے زندانیوں میں ہوں
کیا اس حصارِ جبر کے اندر نہیں ہوں میں

پھر کیوں یہ حشر و نشر و سزا و جزا کا ذکر
اذنِ سوال دے مجھے، پتھر نہیں ہوں میں

کیوں لطفِ چشمِ دوست سے گھبرا گیا ہے دل
شاید اس التفات کا خوگر نہیں ہوں میں

گزرے ہیں دن خیال میں چہرے تراشتے
کیسے کہوں بشیرؔ، صنم گر نہیں ہوں میں

صادق نسیم

○

نرگس کی نگاہیں ہیں نہ غنچوں کی زباں ہے
صدیوں سے مگر قافلۂ رنگ رواں ہے

یہ کون گزرگاہِ تمنّا پہ رواں ہے
تا حدِ نظر جشنِ چراغاں کا سماں ہے

کچھ داغ ہیں ایسے کہ مٹائے نہیں مٹتے
اک عمر سے دل کارگہِ شیشہ گراں ہے

اعزاز ملا مجھ کو وہاں نغمہ گری کا
جس بزم میں اک جنبشِ مژگاں بھی گراں ہے

ق

کوئی مرے حیرت کدۂ شوق میں آکر
آئینے کی صورت مری جانب نگراں ہے

دوری ہے تو اتنی کہ شناسا ہی نہیں وہ
قربت ہے تو ایسی کہ شریکِ رگِ جاں ہے

ق

ہر شے نظر آتی ہے یہاں درد کی تصویر
کیا جانئے یہ کون سی منزل کا نشاں ہے

نکہت کی ردا کو جو ہٹایا تو یہ دیکھا
ہر پھول میں رستا ہُوا اک زخم نہاں ہے

پھر آج خیالوں کے سرابوں میں رواں ہوں
وہ تشنہ لبی ہے کہ نظر شعلہ فشاں ہے

امکاں کی حدوں پر بھی نہیں تجھ سے رہائی
زندانِ تمنّا، تری دیوار کہاں ہے؟

آگے نکل آیا ہوں حدِ سود و زیاں سے
اب اپنا فسانہ بھی حدیثِ دگراں ہے

کشور ناہید

○

سب شکلوں کی ایک ہی صورت، سب باتوں کا ایک ہی رنگ
دن رنگوں کے چولے بدلے، پر راتوں کا ایک ہی رنگ

ہر آہٹ، ہر سایہ آخر ذہن کا پاگل پن نکلا
قریہ قریہ ویرانی ہے، سب گھاتوں کا ایک ہی رنگ

دو سائے جب آگے سر کیں ایک ہی سایہ رہ جائے
سات رنگ سے دھنک بنے پر سب شکلوں کا ایک ہی رنگ

خون میں شعلۂ غم کی حدت، جسم میں چھپ کے رہ نہ سکے
آنکھ سے ٹپکے لہو کی صورت، سوغاتوں کا ایک ہی رنگ

میرے اندر کی تنہائی، میری ذات کا دوھرا پن
دیمک بن کر چاٹ رہا ہے، سب ذاتوں کا ایک ہی رنگ

دھوپ چڑھی تو سونا چمکا، دھوپ ڈھلی تو سرسوں بھی
چاروں کھونٹ جمی ہے کائی، برساتوں کا ایک ہی رنگ

گھاس اُگی اُس پگڈنڈی پر جس سے گزر کے ملتے تھے
کنج اماں بھی سڑکیں بن گئیں، سب باتوں کا ایک ہی رنگ

ہنستے چہروں کی آنکھوں میں خون جما ہے یادوں کا
سب شکلیں ہیں حیلۂ حسرت، باراتوں کا ایک ہی رنگ

عرش صدیقی

○

آنکھوں میں کہیں اُس کے بھی طوفاں تو نہیں تھا
وہ مجھ سے جُدا ہو کے پشیماں تو نہیں تھا

کیوں مجھ سے نہ کی اُس نے سرِ بزم کوئی بات
میں سنگِ ملامت سے گریزاں تو نہیں تھا

ہاں حرفِ تسلی کے لیے تھا میں پریشاں
پہلو میں مرے دل تھا، کہستاں تو نہیں تھا

کیوں راستہ دیکھا کیا اس کا میں سرِ شام
بے درد کا مجھ سے کوئی پیماں تو نہیں تھا

جلوہ تھا ترا آگ میں ہر لحظہ ہویدا
ورنہ مجھے جل مرنے کا ارماں تو نہیں تھا

کیوں مجھ سے توقع تھی اُسے جاہ و حشم کی
میں بندۂ نادار، سلیماں تو نہیں تھا

تھا دل بھی کبھی شہرِ تمنا سے مماثل
صحرا یہ ہمیشہ سے بیاباں تو نہیں تھا

کیوں میں نے اُسے خالقِ قرآں کی قسم دی
وہ رہزنِ ایمان، مسلماں تو نہیں تھا

طوفانِ الم! کیوں مجھے ساحل پہ اُتارا
میں شورِ تلاطم سے ہراساں تو نہیں تھا

رکھا تھا چھپا کے جسے الفاظ میں، میں نے
پردے میں سخن کے بھی وہ عریاں تو نہیں تھا

شب بھر مری پلکوں پہ دمکتے رہے تارے
کل رات یہاں جشنِ چراغاں تو نہیں تھا

کہتے ہیں کہ ہے عرش نگوں پائے بتاں پر
ایسا وہ کوئی صاحبِ ایماں تو نہیں تھا

جلیل حشمی

○

میری جاں تیرے سرہانے کوئی آیا نہ گیا
تجھ سے احسانِ مسیحا بھی اُٹھایا نہ گیا

قافلے جلتی ہوئی شمعوں کے گزرے کتنے
دل کی دیوار سے لیکن تیرا سایا نہ گیا

چڑھ کے سُولی پہ بھی آغوش کو کھولے رکھا
ہم سے مر کر بھی محبت کو بھُلایا نہ گیا

تُو نے کر دی ہے مری شمعِ سرِ شام ہی گُل
اور گجر دم بھی دیا مجھ سے بجھایا نہ گیا

نہ پیمبر ہیں نہ فرہاد نہ ساحر کوئی!
ہم سے پتھر میں بھی شیشے کو چھپایا نہ گیا

محشرستاں لیے پھرتے ہیں ہر اک سانس میں ہم
تم سے اک گونج کو سینے میں دبایا نہ گیا

ہم تو خود اپنے تعاقب میں ہوُے خاک بسر
تھا جو پہچاننے والا ہمیں، پایا نہ گیا

گونجتا ہے میری سانسوں میں ـــ مغنّی سے کہو
پردۂ ساز میں جو نغمہ سمایا نہ گیا

حادثہ کہتے ہیں شاید کہ اسی کو حشمی
تم سے پوچھا نہ گیا ہم سے بتایا نہ گیا

جلیل حشمی

○

پیچھے پیچھے، حشمی! کون یہ آیا، دیکھو!
چڑھتے سورج پہ پڑا ہے مرا سایا، دیکھو!

تھے بہت سادہ مگر اتنے بھی نادان کہاں
ہم نے دھوکا بھی سمجھ بوجھ کے کھایا، دیکھو!

نہ چھتری ہے نہ کہیں پیڑ کی چھاؤں اب کے
اور مقدّر نے پہاڑوں پہ چڑھایا، دیکھو!

سامنے سنگ بھی آیا جو سرِ راہِ وفا
ہم نے بیساختہ اک پھول دکھایا، دیکھو!

رات چمکے ہیں بہت چاند ستارے پھر بھی
ہم نے اپنا ہی دیا گھر میں جلایا، دیکھو!

چھاؤں نے ہم کو غریب الوطنی میں ڈھونڈا
دشت کی دھوپ نے دیوار بنایا، دیکھو!

کج کلاہی سے مچا رکھی تھیں دھومیں جس نے
آج خود اپنے ہی سائے میں سمایا، دیکھو!

ہم ہی انجان نہیں اپنی نظر میں تنہا
دل بھی پہلو میں دھڑکتا ہے پرایا، دیکھو!

حشمی اب یہ گلہ ہے کہ خود آزار تھے ہم
جاں پہ کیا کیا نہ ستم ہجر میں ڈھایا، دیکھو!

سیف زلفی

○

داغِ شعور، درد کے لمحات سے ملا — مجھ کو یہ چاند چشمۂ ظلمات سے ملا

اتنا اُداس کیوں ہے، اگر ہاتھ کٹ گئے — اس سانحے کو اپنی روایات سے ملا

اوروں کے دکھ میں سوچ کی گہرائیاں نہ تھیں — مجھ کو یہ اوج، صرف مری ذات سے ملا

اترا میں اپنے دل میں تو خود سے کیا کلام — اپنا سراغ، اپنی ملاقات سے ملا

میرے سوا کوئی بھی نہیں ہے مرا عدو — مجھ کو ملا جو زخم، مرے ہات سے ملا

میرا بدن زمیں کے گھروندوں میں ہے مگن — مجھ کو نہ آسماں کے محلّات سے ملا

سوچوں اُسے تو ذہن کے پردے جھلس اُٹھیں — وہ شعلہ صدا — جو تری بات سے ملا

لَو دے اُٹھیں نہ تیرے بدن کی بھی خوشبوئیں — تو یوں نہ اپنا ہات میرے ہات سے ملا

ہم نے اُسے ادب کی نمائش میں رکھ دیا — دل کو جو زخم، پیار کے جذبات سے ملا

زلفی یہ مسکراتا ہوا روشنی کا پھول

ہم کو دُکھوں کی ڈھلتی ہوئی رات سے ملا

سیف زلفی

○

لہجے کا رنگ، لفظ کی خوشبو بھی دیکھ لے
آ، مجھ سے کر کلام، مجھے تو بھی دیکھ لے

میں چودھویں کا چاند، سمندر ترا بدن
میری کشش کا بولتا جادو بھی دیکھ لے

کھلتا ہوں تیرے رخ کی سجل چاندنی کے پاس
پہچان لے مجھے، مری خوشبو بھی دیکھ لے

تو خارزار، اور میں ابرِ برہنہ پا،
میرے سفر کا کرب کبھی تو بھی دیکھ لے

اک شب ردائے ابر سے باہر نکل کے آ!
کس کس کو ہے نگاہ پہ قابو بھی، دیکھ لے

میرے لہو کی گونجتی فریاد پہ نہ جا
آنکھوں میں اپنی، تیرتے آنسو بھی، دیکھ لے

منزل پہ صرف جلتے ہوئے چاند ہی نہ دیکھ
چمکے کہیں جو راہ میں جگنو بھی، دیکھ لے

گھیرے میں آسماں نے مجھے لے لیا، تو کیا!
اس دام سے فرار کا پہلو بھی، دیکھ لے

سچائی کا علم تو اٹھاتا ہے تو ــــــ مگر
کٹتے ہیں اس جہاد میں، بازو بھی، دیکھ لے

برہم ہے روز و شب کا مزاجِ سکوں پسند
بکھرا دئیے ہیں وقت نے گیسو بھی، دیکھ لے

کنجان پانیوں پہ برسنے سے فائدہ
اے ابر! تشنگانِ لبِ جو بھی دیکھ لے

زلفی جو میری طرزِ ادا کا اسیر ہے
وہ کاش میرے شعر کا جادو بھی دیکھ لے

گوہر ہوشیارپوری

○

دل تمام آئینے، تیرہ کون، روشن کون
اب یہ آنکھ ہی جانے، دوستوں میں دشمن کون

یا جگر میں خوں کم تھا یا ابھی جنوں کم تھا
دشت کے عوض کرتا، ورنہ قصدِ گلشن کون

اک نشاط آرائی، اک سکونِ تنہائی
ہجر یا وصال اچھا، حل کرے یہ الجھن کون

سلسلے محبّت کے، نام سے نہیں چلتے
اپنی ذات جو تج دے، شیخ کیا برہمن کون

اک نئی لگن بخشے، اک فقط تھکن بخشے
مردم آزما نکلا، رہنما کہ رہ زن کون!

عشق تب بے خبر گزرے، خیر و شر کے عقدوں سے
آرزو کی سیتا کو، رام کون، راون کون

خامۂ سخن دریا، جذبِ اندروں گوہرؔ
فن کے سر پہ رکھتا ہے، تاجِ عظمتِ فن کون

گوہر ہوشیار پوری

○

(نذرِ غالبؔ)

یہ صحرائے طلب یا بیشۂ آشفتہ حالی ہے
کوئی دریوزہ گر اپنا، کوئی تیرا سوالی ہے

حوادث سے نبردآرائیوں کا کس کو یارا تھا
جنوں اپنا سلامت جس نے ہر افتاد ٹالی ہے

ترے اغماض کی خو سیکھ لی اہلِ مروّت نے
کہ محفل درد کی اب صاحبِ محفل سے خالی ہے

حضوری سے بھی مہجوری میں رغبت کم نہیں اُس سے
تب اپنا بخت عالی تھا، اب اپنا ظرف عالی ہے

نمو کا جوشش کچھ نظّارہ فرما ہو تو ہو — ورنہ
بہار اب کے برس خود پائمالِ خشک سالی ہے

کسی کے لطفِ کم کو دیر لگتی ہے رسوا ہوتے
چٹکنے تک تو ہر گُل کی جبلّت انفعالی ہے

شرف اتنا کہ غالبؔ کی زمیں میں ہے غزل گوہرؔ
وہ مضموں آفرینی ہے نہ وہ نازک خیالی ہے

اسلم انصاری

وہ لفظ کیا جو معنیٔ گویا نہ ہو سکے
وہ عکس کیا جو نقشِ ہویدا نہ ہو سکے

وہ زخم دیجیے جسے رسوا نہ کہہ سکیں
وہ راز کھو دیجیے کہ جو افشا نہ ہو سکے

گُل بھی کھلے تو یوں کہ شگفتہ نہ کہہ سکیں
منظر کھلا تو وہ کہ تماشا نہ ہو سکے

خلوت میں اپنے آپ سے ہیں محوِ گفتگو
جو انجمن میں انجمن آرا نہ ہو سکے

دل چاہتا ہے پھر اسی دشمن سے دوستی
جو ساتھ تو رہے مگر اپنا نہ ہو سکے

سنتا ہے یوں کہ سن نہ سکے حرفِ آرزو
ملتا ہے یوں کہ عرضِ تمنا نہ ہو سکے

ظلمت ہی کیا جو ایک کرن سے بکھر سکے
سورج وہ کیا کہ جس سے اُجالا نہ ہو سکے

رنگِ چمن غبارِ تمنا سہی، مگر
گل برگ تیرا نقشِ کفِ پا نہ ہو سکے

اسلم انصاری

○

میں اُس کے بعد کوئی بات سوچتا بھی نہیں
مگر وہ شخص بُھلائے سے بھولتا بھی نہیں

اسی کی یاد سے دامن بچا رہا ہوں میں
کہ دل کو جس کے بھلانے کا حوصلہ بھی نہیں

عجب تو یہ ہے کہ تُم کو ملال ہے اس پر
ستم تو یہ ہے کہ مجھ کو سرِ وفا بھی نہیں

کوئی صدا نہیں اُتری کسی دریچے سے
درِ خیال سے اب کوئی جھانکتا بھی نہیں

چراغِ درد کی لَو آج کیوں لرزتی ہے
وہ گہری چپ بھی نہیں آج وہ ہوا بھی نہیں

ہر ایک شاخِ شجر سے لہو ٹپکتا ہے
یہ راز کیا ہے، کوئی مجھ سے پوچھتا بھی نہیں

مجھے بھی نغمۂ بے صوت راس آیا ہے
صدائے دل سے یہاں کان آشنا بھی نہیں

سحر، طلسمِ ہوائے طرب جگائے گیا
کہ شب وہ سحر گراں ہے کہ ٹوٹتا بھی نہیں

بہار نے نقشِ تحیّر، خزاں نے شکستِ نظر
ابھی تو شاہدِ مقصود رُونما بھی نہیں

کسی کا نقشِ قدم بھی نہیں کہ مل جاؤں
چراغ لے کے کوئی مجھ کو ڈھونڈتا بھی نہیں

جون ایلیا

○

آج کے بعد، عشرتِ مجلسِ شامِ غم کہاں
دل نہ لگے گا تیرے بعد، پر تیرے بعد ہم کہاں

شوقِ فزوں کو آج شام صاف جواب مل گیا
اب وہ معاشِ خدمتِ گیسوئے خم بہ خم کہاں

دست بہ دست، دف بہ دف، دوش بہ دوش، صف بہ صف
نعرۂ دم بہ دم کے ساتھ رقصِ قدم قدم کہاں

اب تری جلوہ گاہ میں خود نگروں کا ذکر کیا
اب تری سیر گاہ میں عشوگیانِ رم کہاں

پرتوِ سوزِ سینہ میں داغ ہی دیکھ لوں کہیں
تیرہ و تار ہے نگاہ، لوح کہاں قلم کہاں

میری متاع لٹ گئی، میرے خیام جل گئے
اب وہ مرے نشاں کہاں، اب وہ مرے علم کہاں

بینشِ سامعہ کو اب میرے لبوں سے کیا غرض
پیکرِ نغمہ سرد ہے، شعلۂ زیر و بم کہاں

نکہتِ یاسمن قبا! بھول نہ جائیو ہمیں
صبح کے بعد تو کہاں، شام کے بعد ہم کہاں

یہ جو نواگری کے ساتھ چیخ نہیں رہا ہوں میں
سینۂ نے نواز میں آخر اب اتنا دم کہاں

اب یہ جبین و چشم و لب تجھ کو نظر نہ آئیں گے
غور سے دیکھ لے ہمیں، آج کے بعد ہم کہاں

سیم بُرا! یہ جونؔ کا حجرۂ بے فروغ ہے
حجرۂ بے فروغ میں مایۂ بزمِ جم کہاں

رفعت سلطان

○

ابتدا ہوں کہ انتہا ہوں میں
عمر بھر سوچتا رہا ہوں میں

لفظ و معنی سے ماورا ہوں میں
ایک خاموش التجا ہوں میں

ناتواں ہو کے عدل چاہتا ہوں
واقعی قابلِ سزا ہوں میں

دل میں کوئی خوشی نہیں، لیکن
عادتاً مسکرا رہا ہوں میں

دیکھ کر رنگ بزمِ عالم کا
نقشِ دیوار بن گیا ہوں میں

صبح کے انتظار میں رفعتؔ
رات بھر جاگتا رہا ہوں میں

اقبال عظیم

○

دل میں محرومی کا غم، آنکھوں میں نم باقی نہیں
اب وہاں ہیں ہم جہاں کوئی الم باقی نہیں

آنکھ مجبورِ تماشا، دل گریزانِ حیات
اب نگاہ و قلب میں ربطِ بہم باقی نہیں

زندگی کی اور ساری تلخیاں باقی سہی
کم سے کم اندیشۂ چشمِ کرم باقی نہیں

پرسشِ احوال پر کس کس کو دوں کیا کیا جواب
غم بظاہر ہے مگر احساسِ غم باقی نہیں

اپنا سب کچھ لٹ چکا اقبالؔ لیکن شکر ہے
دل میں اب خوفِ زیاں تو کم سے کم باقی نہیں

○

شکستِ ظرف کو پندارِ رندانہ نہیں کہتے
جو مانگے سے ملے ہم اُس کو پیمانہ نہیں کہتے

جنوں کی شرطِ اوّل ضبط ہے اور ضبط مشکل ہے
جو دامن چاک کر لے اُس کو دیوانہ نہیں کہتے

نہایت شکریہ اس پرسشِ احوال کا لیکن
ہمیں عادت نہیں ہم اپنا افسانہ نہیں کہتے

جہاں ہر وقت محفل سی سجی ہو تیری یادوں کی
اُسے عشرت کدہ کہتے ہیں، غم خانہ نہیں کہتے

نہ جانے کچھ بھی ہو، ہم کو یاد تو رہتا ہے ہر لحظہ
عدو کو اپنے، ہم اقبالؔ بے گانہ نہیں کہتے

سیّد علی عبّاس جلالپوری

ڈرامہ

تمکنت

ایک تمثیل

افرادِ تمثیل

ڈاکٹر اکبر خاں

ناصرہ — ڈاکٹر اکبر خاں کی بیوی

تمنّا — ڈاکٹر اکبر خاں کی بیٹی

تمکنت

شاہ رُخ — ایک نوجوان

[ڈاکٹر اکبر خاں کے خانہ باغ کا ایک کونا۔ شام کے سائے پھیل رہے ہیں۔ شاہ رُخ ایک گھنے درخت کے نیچے کھڑا کوٹھی کے عقبی برآمدے کی طرف دیکھ رہا ہے۔ دور سے صرف اس کی ٹانگیں ہی دکھائی دیتی ہیں۔ معاً سامنے سے ایک نوجوان لڑکی نمودار ہوتی ہے اور ادھر ادھر دیکھتی سمٹی سمٹائی درخت کی طرف آتی ہے۔ قریب آتی ہے تو شاہ رُخ بیتابی سے آگے بڑھتا ہے۔]

شاہ رُخ: (شوق بھری نگاہوں سے دیکھ کر مسکراتے ہوئے) یہاں مارے انتظار کے جان پر بنی ہے اور تم ہو کہ کس مزے سے مٹکتی مٹکاتی ہوئی آ رہی ہو۔ تمنّا! یوں لگتا ہے جیسے تم مجھ تک کبھی نہ پہنچ پاؤ گی۔

تمنّا: (ٹھٹک کر رندھی ہوئی آواز میں) سچ کہتے ہو میں تم تک کبھی نہ پہنچ سکوں گی۔

شاہ رُخ: (حیرت سے) کیا مطلب؟

تمنّا: (تنک کر) میں نے کوئی ایسی مشکل بات تو نہیں کہی کہ تم سمجھ بھی نہ سکو۔

شاہ رُخ: (سنجیدگی سے) کچھ بھی ہو تمہاری بات میں ایک پُراسرار قسم کا الجھاؤ ضرور ہے۔

تمنّا: (افسردہ لہجے میں) الجھاؤ کچھ بھی نہیں۔ اس سے زیادہ صاف بات کون سی ہو گی۔

شاہ رُخ: (جوش میں آ کر) خدا کے لئے کھل کر بات کرو تمنّا! تم نہ پہنچ سکو گی تو کیا ہوا۔ میں پہاڑوں کا جگر چیر کر تم تک پہنچ جاؤں گا۔

تمنّا: (طنزیہ) ایسی باتیں کہی جاتی ہیں کی نہیں جاتیں۔

شاہ رُخ: (سینے پر دایاں ہاتھ رکھ کر) تمنّا! تمہارے ایک ادنےٰ اشارے پر جان پر کھیل جاؤں گا۔

تمنّا : (تمسخر سے) بس رہنے دو۔ یہ باتیں صرف سینما ایکٹروں کو زیب دیتی ہیں۔

شاہ رُخ: (حسرت آمیز لہجے میں) کیا مجھے اس بات کا حق بھی نہیں پہنچتا کہ تمہاری افسردگی کی وجہ معلوم کر سکوں؟ آج تمہارے رخساروں کے گلاب کیوں مرجھا گئے ہیں۔ کہیں ڈاکٹر صاحب کو تو پتہ نہیں چل گیا ان ملاقاتوں کا۔

تمنّا : (آہستہ آواز میں) بس یہی بات ہوئی۔

شاہ رُخ: تو کیا ہوا۔ اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے۔ امی جان آج ہی تمہارے یہاں آ رہی ہیں۔

تمنّا : ہے! انہیں روک لینا۔ غضب ہو جائے گا۔

شاہ رُخ: وہ کیوں؟

تمنّا : امی جان نے تمہارا ذکر ابا جان کے سامنے کیا تو نہ معلوم کیوں، وہ ایک دم لال بھبوکا ہو گئے اور لگے گرجنے اور برسنے۔

شاہ رُخ: (فیصلہ کن انداز میں) تو کیا ہوا؟ ہم دونوں بالغ ہیں۔

تمنّا : (چیں بجبیں ہو کر) جس بات کی طرف تم اشارہ کر رہے ہو وہ قیامت تک نہ ہوگی۔

شاہ رُخ: (متانت سے) اس کے بغیر اور کوئی صورت بھی تو نظر نہیں آتی۔ ایک نوجوان ایک حسین لڑکی پر دل و جان سے فدا ہے۔ وہ بھی..... وہ بھی اس پر..... جان چھڑکتی ہے.....

تمنّا : (شرما کر) ہے! کیا جھک مار رہے ہو۔ میں تو..... میں تو..... صرف تمہیں پسند کرتی ہوں۔

شاہ رُخ: (مسکرا کر) چلئے یوں ہی سہی۔ وہ اسے پسند کرتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے دونوں روزِ ازل سے ایک دوسرے سے محبت کرتے آئے ہیں۔

تمنّا : کیا بہک گئے ہو۔ تمہیں اس بات کا علم کیسے ہوا؟

شاہ رُخ: (جوش سے) میرا دل کہتا ہے۔ میرا رواں رواں پکارتا ہے۔ ہم ایک دوسرے سے پیار کرنے کے لئے ہی پیدا کئے گئے ہیں..... اور لڑکی کے والد مکرم جو ساری عمر چیر پھاڑ کرتے رہے ہیں اپنے بے رحم نشتر سے ان کے ملے ہوئے دلوں کو بھی چیر کر جدا کر دینا چاہتے ہیں۔ (بلند آواز میں) میں اس نشتر چلانے والے ہاتھ کو کچل کر رکھ دوں گا۔

تمنّا : (خفگی سے) تم بھول گئے ہو کہ یہ ہاتھ میرے ابا جان کا ہے

شاہ رُخ: جو شخص تم کو مجھ سے چھین لینا چاہتا ہے، کیا میں اسے بے رحم بھی نہیں کہہ سکتا؟

تمنّا : وہ اس میں میری کوئی بہتری ہی سمجھتے ہوں گے۔

شاہ رُخ: (اذیت ناک لہجے میں) یعنی مجھ سے جدا کرنے میں وہ تمہاری بہتری سمجھتے ہیں؟

تمنّا : (آہستہ آواز میں) ہاں۔

شاہ رُخ: (حسرت بھرے لہجے میں) اور تمہیں بھی ان سے اتفاق ہے؟

تمنّا : (بدستور آہستہ آواز میں) یہ میں نہیں کہہ سکتی۔ تم جانتے ہو کہ میں..... میں..... مگر باپ تو اولاد کی بہتری ہی سوچ سکتا ہے۔ اس کی رائے غلط ہو سکتی ہے لیکن اس کی نیت پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

شاہ رُخ: (مایوس ہو کر) تمنا۔ تم منطق بگھار رہی ہو اور میری آنکھوں کے سامنے دنیا اندھیر ہو رہی ہے۔ کیا میں قطعی مایوس ہو جاؤں؟

تمنّا : (تھوڑی دیر خاموش رہ کر قطعی۔

شاہ رُخ : (جوش سے) تم کس اطمینان سے یہ بات کہہ رہی ہو۔ آخر سخت دل باپ کی بیٹی ہونا۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تمہارا ارادہ کیا ہے؟

تمنّا : (مستقل مزاجی سے) جو بھی ہوگا تم دیکھ نہ سکے تو سن ضرور لوگے۔ عورت مرد کی طرح ڈینگیں نہیں مارتی، کر گذرتی ہے۔

[شاہ رخ کچھ کہنا چاہتا ہے مگر قدموں کی آہٹ سے متوحش ہو جاتا ہے۔ سر اٹھا کر دیکھتا ہے کہ تمنا کی امی آ رہی ہیں وہ دیوار پھاند کر باہر نکل جاتا ہے۔ تمنا سر جھکائے اپنی جگہ چپ چاپ کھڑی رہتی ہے۔ اس کی امی ناصرہ قریب آجاتی ہے]

ناصرہ : (دکھ بھری آواز میں) بیٹی یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا۔ تم خود فہمیدہ ہو اور جانتی ہو کہ رجّو نوکرانی نے تمہارے ابا جان کو سب کچھ بتا دیا ہے اور وہ سخت جز بز ہو رہے ہیں۔ مجھے بیشک تم سے ہمدردی ہے لیکن دیکھ رہی ہو میں کس طرح مجبور اور بے بس ہوں۔

(تمنا پلو سے منہ ڈھانپ لیتی ہے۔ اس کی امی شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی ہے)

ناصرہ : (دلدہی سے) حوصلہ کرو میری بیٹی۔ میں پھر ایک بار کوشش کروں گی، تمہاری خاطر شیر کے بھٹ میں جاؤں گی۔ یاد رکھنا، شریف زادیاں اپنے ماں باپ کی عزت کی محافظ ہوتی ہیں۔

(تمنا چپکی کھڑی آنسو بہاتی رہتی ہے)

(پردہ گرتا ہے)

دُوسرا منظر

[ڈاکٹر اکبر خاں کی نشست گاہ۔ قالین۔ صوفہ سیٹ سے آراستہ۔ کارنس پر تازہ پھولوں کے گلدان۔ اکبر خاں میز کے سامنے کرسی پر چپ چاپ بیٹھا سگرٹ کے کش پر کش لگا رہا ہے۔ سامنے سگریٹ کا ڈبہ اور ایش ٹرے رکھے ہیں۔ وہ ادھیڑ عمر کا وجیہہ خوش پوش آدمی ہے۔ کسی سوچ میں غرق ہے اس کی بیوی ناصرہ جھانک کر اندر دیکھتی ہے اور پھر آہستہ آہستہ قدم بڑھاتی ہے۔ لباس سادہ۔ لبوں پر خوشامدانہ مسکراہٹ۔]

ناصرہ : (صوفے کے کنارے پر بیٹھ کر) میں نے کہا آج تم خلافِ معمول سست دکھائی دے رہے ہو۔ چائے بھی واپس بھیج دی۔ خیر تو ہے؟

ڈاکٹر : (لاپرواہی سے) کچھ ایسی ہی بات ہے۔

ناصرہ : مجھے نہیں بتاؤ گے؟

ڈاکٹر : (غصے پر ضبط کرتے ہوئے) کل شام شاہ رُخ پھر باغ میں آیا تھا۔ کیا یہ سچ ہے؟

ناصرہ : (تردّد سے) ہاں سچ ہے۔

ڈاکٹر : (غضبناک ہو کر گرجتا ہے) تم جان بوجھ کر میری عزت و ناموس کو غارت کر رہی ہو۔ یہ چوری چھپی کی ملاقاتیں تمہارے ہی ایما سے ہو رہی ہیں۔

ناصرہ : (آواز میں غصے کی لرزش) یہ غلط ہے۔ البتہ اتنا صحیح ہے کہ میں شاہ رخ اور تمنا دونوں کو خوش دیکھنا چاہتی ہوں اور جب تک مجھے اس بات کا یقین ہے کہ یہ ملاقاتیں بے ضرر ہیں، میں ان کے راستے میں حائل نہیں ہوں گی۔

ڈاکٹر : (حقارت آمیز زہر خند کر کے) بے ضرر!؟ ایک نوجوان چوری چھپے شام کو ایک جوان لڑکی سے ملنے آتا ہے اور لڑکی کی ماں کہتی ہے کہ یہ

ملاقاتیں بے ضرر ہیں۔ چہ خوب! لیکن میں تمہیں آخری بار کہہ دوں کہ میں بے غیرت نہیں ہوں، دیوث نہیں ہوں۔ اگر اس کے بعد میں نے انہیں اکٹھا دیکھ لیا، اور میں نے انتظام کر لیا ہے کہ میں انہیں اکٹھا دیکھ سکوں گا، تو...... تو...... میں انہیں گولیوں سے چھلنی کر دوں گا۔ سن لیا تم نے بگڑی ہوئی بیٹی کی بگڑی ہوئی اماں؟

ناصرہ : (غصے سے تھرتھراتے ہوئے) جو گولی تمنا کے جسم کو چھلنی کرے گی وہ اس کی ماں کے سینے سے نکل کر جائے گی۔ کان کھول کر سن لو ڈاکٹر، تم ساری عمر مجھے دھمکاتے رہے ہو اور میں تمہارے سامنے کانپتی رہی ہوں۔ اپنے لئے نہیں، تمہاری عزت و ناموس کے لئے کہ کہیں برادری میں تمہاری ہیٹی نہ ہو۔ لیکن اب تم میرے ارمانوں کی طرح میری بیٹی کے ارمانوں کو بھی پاؤں تلے کچل دینا چاہتے ہو......

ڈاکٹر : (طنزیہ) اخاہ! چیونٹی کے بھی پر نکل آئے۔ مجھے تسلیم ہے کہ ہمیں ایک دوسرے سے چنداں لگاؤ نہیں رہا لیکن بیس برس کے ساتھ سے تم اتنا تو جان گئی ہو گی کہ میں جو کچھ کہتا ہوں کر بھی دکھاتا ہوں۔

ناصرہ : (غصے سے کانپتے ہوئے) مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔ اس زندگی سے موت ہزار درجے بہتر ہے۔ جب تک میری جان میں جان ہے میں اپنی بیٹی کی مسرت کی حفاظت کروں گی۔

ڈاکٹر : (لہجہ دھیما ہو جاتا ہے) آج تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ کیسی پاگلوں جیسی باتیں کر رہی ہو!

ناصرہ : (محکم آواز میں) آج سے زیادہ میرے حواس کبھی بھی بجا نہیں تھے۔

ڈاکٹر : تم چاہتی ہو کہ میں تمنا کا رشتہ اپنے دشمن کے بیٹے کو دے دوں؟ اس خبیث کے بچے کو...؟

ناصرہ : ہاں میرا منشا یہی ہے اور شاہرخ ایک شریف باپ کا شریف بیٹا ہے۔

ڈاکٹر : (دانت پیستے ہوئے) ذلیل باپ کا ذلیل بیٹا!

ناصرہ : کچھ بھی ہو، مجھے اس بات کا یقین ہے کہ شاہرخ میری بیٹی کو وہ تمام مسرت بخش سکے گا جس سے میں عمر بھر محروم رہی ہوں۔

ڈاکٹر : وہ کون سی آسائش ہے جو تمہیں میرے گھر میں میسّر نہیں آ سکی؟

ناصرہ : (حزنیہ لہجے میں) ظاہری آسائش بے معنی ہے جب دل غمزدہ ہو۔ میں شروع سے ہی جانتی تھی کہ میں تمہارے ساتھ خوش نہیں رہ سکوں گی کیونکہ شادی سے پہلے تم کسی اور کو دل دے چکے تھے۔ لیکن میں نے نوشتۂ تقدیر کے سامنے اپنا سر جھکا دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ جس لڑکی کو تم چاہتے تھے وہ تمہاری نہ ہو سکی۔ اس محرومی کا بدلہ تم نے مجھ سے لیا اور اچھی طرح دل کھول کر لیا۔ قصور کسی اور کا تھا سزا مجھے دی گئی۔ خطا اوروں کی تھی عذاب مجھے دیا گیا اور میں چپ چاپ پڑی جھیلتی رہی۔ میرا خیال تھا کہ میں اپنی اولاد کو دلشاد و بامراد دیکھ کر خوش ہو لوں گی مگر تم ان کو بھی یاس کے گڑھے میں دھکیلنا چاہتے ہو۔

ڈاکٹر : یہ تم کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو؟

ناصرہ : (چمک کر) میں سب کچھ جانتی ہوں۔ وہ تمکنت کون تھی جس کی جدائی کا داغ آج بھی تمہارے سینے میں سلگ رہا ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ شاہرخ کے باپ نے تمہارے اور تمکنت کے رشتے میں رخنہ اندازی کی تھی آج اس کا انتقام اس کے بیٹے سے لینا چاہتے ہو؟

ڈاکٹر : (غصے سے) میں اس مردود کو اپنی بیٹی کا رشتہ دوں؟ یہ ہرگز ہرگز نہ ہو گا۔ اور اگر تم نے میری مخالفت جاری رکھی تو نتائج کی ذمہ دار

خود تم ہوگی۔

ناصرہ : تم بخوبی جانتے ہو کہ آج تک تمہاری رضامندی کو میں اپنا فرض سمجھتی رہی ہوں لیکن یہ بات میں منوا کر رہوں گی۔ تمنا میری بھی بیٹی ہے اور اس کی قسمت کے فیصلے کا حق مجھے بھی پہنچتا ہے۔

ڈاکٹر : (بیزاری سے اٹھ کھڑا ہوتا ہے) خیر اب تو تکرار بیکار ہے۔ میں اس بحث کو طول نہیں دینا چاہتا لیکن میری بات یاد رکھنا کہ تم اپنی ضد پر پچھتاؤ گی۔

ناصرہ : (فیصلہ کن لہجہ میں) میں اپنے فیصلے پر زندگی بھر نہیں پچھتاؤں گی۔

[یہ کہہ کر وہ باوقار انداز سے کمرے سے نکل جاتی ہے۔ ڈاکٹر غصے اور نفرت کی نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہتا ہے۔ جب وہ چلی جاتی ہے تو اپنے آپ سے کہتا ہے۔]

ڈاکٹر : کم بخت! پاگل!!

(پردہ گرتا ہے)

تیسرا منظر

[ڈاکٹر اکبر خاں کے کلینک کا آرام کا کمرہ۔ درمیان میں چھوٹی سی میز جس کے گرد کرسیاں رکھی ہیں۔ ڈاکٹر سامنے بیٹھا اخبار دیکھ رہا ہے۔ میز پر سٹیتھوسکوپ اور سگریٹ کا ڈبہ رکھا ہے۔]

آواز : ڈاکٹر صاحب!

ڈاکٹر : کیا ہے؟

آواز : ایک خاتون مشورے کے لئے آئی ہیں۔

ڈاکٹر : ان سے کہو زنانہ کمرے میں بیٹھیں۔

آواز : وہ نہیں مانتیں۔ کہتی ہیں میں ڈاکٹر صاحب سے ان کے آرام کے کمرے میں ہی ملوں گی۔

ڈاکٹر : (بڑبڑا کر) عورت بھی کیا مصیبت ہے (بلند آواز سے) اچھا بھیج دو۔

[ایک دبلی پتلی کشیدہ قامت عورت نمودار ہوتی ہے۔ عمر ۴۰ کے لگ بھگ۔ چہرے پر نقاہت کے آثار۔ کسی زمانے میں حسین رہی ہوگی۔ دروازے میں کھڑی ٹکٹکی باندھے ڈاکٹر کی طرف دیکھتی رہتی ہے۔ پھر کھانسنے لگتی ہے اور کھانستے کھانستے نڈھال ہو جاتی ہے۔]

ڈاکٹر : (کھڑے ہو کر) آئیے۔ تشریف رکھئے (عورت بدستور کھڑی رہتی ہے۔ ڈاکٹر حیرت سے کہتا ہے) آئیے آئیے، بیٹھئے۔ آپ کو کھڑے نہیں رہنا چاہیے۔ اس کرسی پر آجائیے۔

[عورت لڑکھڑاتی ہوئی آگے بڑھتی ہے اور ایک سرد آہ بھر کر کرسی پر بیٹھ جاتی ہے۔ ڈاکٹر ماہرانہ نگاہ سے اس کے چہرے کا جائزہ لیتا ہے۔]

ڈاکٹر : فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟

(عورت کوئی جواب نہیں دیتی اور دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیتی ہے)

ڈاکٹر : (ہمدردانہ لہجے میں) گھبرایئے نہیں۔ مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ حوصلہ کیجئے۔ میری طرف دیکھئے۔

(عورت سر اٹھا کر غمزدہ انداز میں ڈاکٹر کی طرف دیکھتی ہے)

ڈاکٹر : (سٹیتھوسکوپ پکڑتے ہوئے) ذرا میں آپ کو دیکھوں۔

عورت : (یک لخت چلا کر) اکبر! اکبر!

(ڈاکٹر چونک کر اس کے چہرے پر نگاہیں گاڑ دیتا ہے اور بھونچکا رہ جاتا ہے۔ پھر زیر لب بڑبڑاتا ہے)

ڈاکٹر : یہ آواز! یہ صورت!! (آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا ہے) یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟

عورت : (اس کی طرف گھورتے ہوئے) تم تمکنت کا سایہ دیکھ رہے ہو ڈاکٹر۔

ڈاکٹر : (اپنی جگہ اچھل کر) خداوندا! تمکنت! تمکنت!! (اس کے چہرے کا رنگ فق ہو جاتا ہے اور بت کی طرح بے حس و حرکت اسے دیکھتا رہتا ہے۔ پھر سنبھل کر)

ڈاکٹر : تمکنت! تم..... یہاں......؟

تمکنت : (بدستور ہموار لہجے میں) تمہارا خیال تھا میں مر کر مٹی میں مل چکی ہوں گی۔

ڈاکٹر : ہاں مجھے کچھ ایسا ہی شک تھا۔ میں نے آج سے کئی برس پہلے سنا تھا کہ تم لوگ تجارت کے سلسلے میں ہانگ کانگ میں مقیم تھے۔

تمکنت : (کھانسی کو بمشکل روکتے ہوئے) ہاں۔ نادر وہیں پیوندِ زمین ہوا۔

ڈاکٹر : نادر کی موت کی خبر میں نے سنی تھی۔ تم نے خود مجھے اطلاع دی ہوتی۔

تمکنت : (آنکھیں نیچی کر کے) کس منہ سے اطلاع دیتی۔ میرا خیال تھا تم مجھے بھول چکے ہو گے۔

(ڈاکٹر اٹھ کر اس کے دونوں ہاتھ تھام لیتا ہے اور جھک کر کہتا ہے)

ڈاکٹر : تمکنت! تم جانتی ہو ایسا نہیں ہو سکتا۔ تم جانتی ہو اکبر تمہیں قیامت تک نہیں بھولے گا۔

تمکنت : (حسرت کے لہجے میں) بس یہی بات تمہارے منہ سے سننے کے لئے میں اب تک زندہ رہی ہوں (کھانستی ہے)

(ڈاکٹر اس کے ہاتھ چھوڑ کر پھر کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

ڈاکٹر : (متفکرانہ) تمہاری کھانسی اندیشہ ناک سی ہے۔

تمکنت : تمہارا خیال صحیح ہے۔ میں تپ دق کی مریضہ ہوں اور شاید چند ہی دنوں کی مہمان ہوں۔

ڈاکٹر : (دل ہی دل سے) خدا نہ کرے۔ ایسا نہ کہو۔ تم زندہ رہو گی۔ میں تمہارے مرض پر قابو پا لوں گا۔ آہ! وہ تمہارا چاند سا دمکتا ہوا چہرہ۔ تمہاری جادو بھری کٹیلی آنکھیں۔ تمہارا طوفان پرور شباب۔ خدایا! کیا تباہی اتنی مکمل بھی ہو سکتی ہے؟

تمکنت : (غمزدگی کے لہجے میں) ہاں اکبر، خزاں مسکراتے ہوئے پھولوں کو آناً فاناً مسل کر رکھ دیتی ہے۔ زمانے کے برفیلے جھونکے کونپلوں کو ٹہنیوں سے نوچ نوچ کر پھینک دیتے ہیں۔ جدائی کی طویل راتوں میں آرزوؤں کے چراغ جھلملا جھلملا کر گل ہو جاتے ہیں۔ (سنبھل کر) اکبر!

ماضی مرچکا۔ اب صفِ ماتم بچھانے سے حاصل ؟ (کھانستی ہے) میری دلی خواہش تھی کہ مرنے سے پہلے ایک نگاہ تمہیں دیکھ لوں۔ خدا کا شکر ہے کہ ہزاروں خواہشوں کا خون ہونے کے بعد ایک خواہش تو پوری ہوئی۔ اب میں سکون سے مر سکوں گی .... اچھا یہ تو بتاؤ تمہارے کے بچے ہیں ؟

ڈاکٹر : ایک لڑکا ہے آصف، آج کل انگلستان میں ہے۔ لڑکی کالج میں پڑھتی ہے، تمنا نام ہے

تمکنت : میں تمہاری بیٹی کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گی

ڈاکٹر : آج شام کا کھانا میرے ہاں کھانا۔ لیکن تم ٹھہری کہاں ہو ؟

تمکنت : ممانی کے ہاں قیام کیا ہے۔ اب وہیں جاؤں گی۔ کل دوپہر کے قریب تمہارے ہاں چکر لگاؤں گی۔ لیکن ناصرہ مجھے دیکھ کر بدمزہ ہوگی

ڈاکٹر : اونہہ! وہ کون ہے بدمزہ ہونے والی ؟

تمکنت : معلوم ہوتا ہے ناصرہ سے تمہاری بنی نہیں

ڈاکٹر : بن کیسے سکتی تھی۔ لیکن چھوڑو اس قصے کو۔ آپ بیتی نہیں سناؤ گی ؟

تمکنت : (کھانستی ہے) میری آپ بیتی دیکھو میرے زرد چہرے پر، میری بجھی ہوئی آنکھوں میں، میرے سراپا پر ہر کہیں لکھی ہوئی ہے۔ زبان سے سن کر کیا کروگے۔ اور وہ کچھ طویل بھی نہیں۔ امنگوں کا خون، حسرتوں کا ہجوم۔ یہ ہے میری آپ بیتی۔

ڈاکٹر : کاش اس وقت تم ہمت سے کام لیتیں اور ایک دفعہ میرے پاس آجاتیں۔ میں معاشرے کے تمام بندھنوں کو توڑ کر رکھ دیتا اور دنیا کو بتا دیتا کہ ہماری مسرت کو برباد کرنے کا کسی کو کوئی حق نہیں ہے۔

تمکنت : (حسرت سے) میں ماں باپ کے حکم کو نہ ٹھکرا سکی (کھانستی ہے)

ڈاکٹر : لیکن میں نے تمہارا معائنہ تو کیا ہی نہیں۔ (سٹیتھوسکوپ اٹھاتا ہے)

(پردہ گرتا ہے)

چوتھا منظر

[ڈاکٹر اکبر خاں کی کوٹھی۔ نشست کے کمرے میں ناصرہ اور تمنا بیٹھی باتیں کر رہی ہیں۔ دونوں کے چہروں پر پریشانی کے آثار نمایاں ہیں۔ تمنا کے چہرے پر زردی کھنڈ رہی ہے۔]

ناصرہ : بیٹی! تم اپنے باپ کی طبیعت سے واقف ہو۔ اس صورتِ حالات سے کوئی نہ کوئی سمجھوتا کرنا ہی پڑے گا۔

تمنا : (افسردگی سے) امی جان! مجھے اپنا راستہ صاف دکھائی دے رہا ہے۔

ناصرہ : تمہارے دل میں کیا ہے ؟ مجھے نہیں بتاؤ گی ؟

تمنا : جو بھی ہوا، میں ابا جان کی عزت و ناموس پر حرف نہیں آنے دوں گی۔

ناصرہ : یہ تو میں جانتی ہوں۔ تمنا! کاش میں تمہارے لئے کچھ کر سکتی۔

تمنا : امی آپ کتنی اچھی ہیں، کس قدر نرم خو، شیریں زبان، ہمدرد۔ خدا جانے ابا جان کو کیا ہو گیا ہے ؟

ناصرہ : سنتی ہوں کہ شروع شروع میں بڑے ہنس مکھ اور زندہ دل تھے۔ شادی کے بعد ان کی طبیعت میں درشتی سی آگئی۔

تمنّا : میرے ساتھ تو ہمیشہ شفقت سے پیش آتے رہے ہیں۔ شاہ رُخ کا نام سن کر البتہ برہم ہو جاتے ہیں۔ معلوم نہیں کیوں؟

(دروازے پر دستک کی آواز۔ ماں بیٹی چونک اٹھتی ہیں)

ناصرہ : آجائیے۔

[دروازہ کھلتا ہے اور تمکنت نمودار ہوتی ہے۔ آج اس کا چہرہ نسبتاً زیادہ بارونق ہے۔ اسے دیکھ کر ناصرہ اور تمنّا کھڑی ہو جاتی ہیں اور حیرت سے اس کی طرف دیکھتی ہیں۔]

تمکنت : (مسکراتے ہوئے) میں آسکتی ہوں؟

ناصرہ۔تمنّا : (بیک زبان) تشریف لائیے (تمکنت داخل ہوتی ہے۔ تمنّا اسے کرسی پیش کرتی ہے)

تمنّا : تشریف رکھیے۔

(تمکنت تمنّا کے سر پر ہاتھ رکھ کر غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھتی اور کرسی پر بیٹھ کر کہتی ہے)

تمکنت : بیٹی تم کو آنکھیں باپ کی ملی ہیں، گہری سیاہ، پُر اسرار (ناصرہ کی طرف مڑ کر) ناصرہ! تم نے واقعی مجھے نہیں پہچانا؟

ناصرہ : (جھجک سی ہو کر) تمکنت آپا! ہائے اللہ!!

تمکنت : (سکون سے) گھبراؤ نہیں بہن۔ میں زندگی سے کنارہ کش ہونے والی ہوں۔ اب مجھے دنیا اور اس کی الجھنوں سے مطلق کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ مجھے اپنی دشمن نہ سمجھو۔ میں ہمدردی کی مستحق ہوں۔ میں تم سے بھی ہمدردی کی بھیک مانگ رہی ہوں۔

تمنّا : امّی جان! آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ یہ گم سم بیٹھی کیا دیکھ رہی ہیں؟ کیا مہمان کی پذیرائی ہمارا فرض نہیں ہے؟

ناصرہ : (سنبھل کر) مہمان؟ سچ کہتی ہو تمنّا! تمکنت آپا۔ معاف کیجئے میں کچھ گھبرا سی گئی تھی۔ آپ کب آئیں اور ادھر......

تمکنت : میں کل ہی سمندر پار سے یہاں پہنچی ہوں۔ میری طرف نفرت کی نگاہوں سے نہ دیکھو ناصرہ! میں ایک نیم جان مریضہ ہوں جس کی زندگی کے بس گنتی کے چند دن باقی رہ گئے ہیں (کھانستی ہے) وطن کی خاک مجھے یہاں کھینچ لائی ہے۔ میں نے سوچا آخری سفر پر روانہ ہونے سے پہلے یہاں کے در و دیوار کو ایک نظر دیکھ لوں۔ اکبر خاں گھر میں نہیں ہیں؟

ناصرہ : (تنک کر) اپنے کمرے میں ہوں گے۔ آپ ان سے ملنے آئی ہیں؟

تمکنت : میں اُن سے مل چکی ہوں۔

ناصرہ : (اپنی جگہ اچھل کر) ہائیں! کب؟

تمکنت : کل ان کے کلینک میں ملی تھی

ناصرہ : انہوں نے آپ کو مدعو کیا ہوگا؟

تمکنت : ہاں! انہوں نے مدعو بھی کیا تھا اور میں خود بھی تم سے اور تمہاری بیٹی سے ملنا چاہتی تھی۔

تمنّا : امّی جان! آپ نے ان سے میرا تعارف تو کرایا ہی نہیں۔

ناصرہ : یہ ـــــ یہ ......

تمکنت : بیٹی میں تمہاری خالہ ہوتی ہوں

ناصرہ : ہاں بیٹی یہ تمہاری خالہ ہیں۔ جاؤ ذرا چائے بنوا کر بھجواؤ۔

(تمنّا جاتی ہے)

تمکنت : ناصرہ مجھے دیکھ کر تم کبیدہ خاطر ہو گئی ہو۔

ناصرہ : نہیں آپا! میں صرف بوکھلا گئی تھی۔ آپ بھی تو بیس برس کے بعد اچانک وارد ہوئی ہیں اور کس قدر بدل گئی ہیں۔ نادر کی وفات کا تو ہم نے سنا تھا۔ اس کے بعد معلوم نہ ہو سکا آپ پر کیا بیتی۔

تمکنت : اس قصے کو سن کر تم ناحق پریشان ہو گی۔ بس کسی نہ کسی طرح کٹ گئی۔ کہو تم تو خوش ہو؟ خفا نہ ہونا۔ میں ہمیشہ تمہاری خوش نصیبی پر رشک کرتی رہی ہوں۔

ناصرہ : (نمناک آواز میں) خوش نصیبی کیسی۔ میں تو اپنے آپ کو دنیا کی سب سے بدقسمت عورت سمجھتی ہوں تمکنت آپا! خدا کا شکر کرو تمہاری شادی اکبر سے نہ ہو سکی۔ ان میں انسانی ہمدردی کا شائبہ تک نہیں ہے، لگاؤ اور الفت تو بڑی بات ہے۔

تمکنت : (حیرت سے) ناصرہ یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ وہ تو بڑے مخلص آدمی ہیں۔

ناصرہ : ہوں گے۔ میرے ساتھ تو انہوں نے ہمیشہ حقارت کا برتاؤ ہی روا رکھا ہے۔ اپنی من مانی کرتے ہیں اور میرے جذبات کو کچلنے میں ذرا بھی باک محسوس نہیں کرتے۔ خیر میری تو جوں توں کٹ گئی۔ اب تمنّا کو تباہ کرنے پر تلے بیٹھے ہیں۔

تمکنت : وہ کیسے؟

ناصرہ : تمنّا چاہتی ہے کہ......... میرا مطلب ہے میں تمنّا کا رشتہ حبیب علی۔ آپ جانتے ہیں وہی سنہرے بنگلے والے کے بیٹے شاہ رُخ سے کرنا چاہتی ہوں لیکن ڈاکٹر نہیں مانتے۔ بہن! میں اپنی بیٹی کی طبیعت سے ڈرتی ہوں۔ وہ جان پر کھیل جائے گی (ناصرہ کی آواز گلوگیر ہو جاتی ہے)

تمکنت : اچھا یہ بات ہے! میں نے شاہ رُخ کو دیکھا تھا جب وہ ایک ننھا سا گل گوتھنا بچہ تھا۔ اس کا خاندان بھی اچھا ہے۔ آخر اکبر خاں کو کیوں وہ رشتہ منظور نہیں ہے؟

ناصرہ : سچ سچ کہہ دوں آپا! آپ خفا تو نہ ہوں گی؟

تمکنت : اب میرے خفا ہونے کی کوئی وجہ نہیں رہی۔

ناصرہ : (جھینپتے ہوئے) تو سنئے۔ ان کا خیال ہے کہ شاہ رُخ کا باپ ان کے اور آپ کے رشتے میں حائل ہوا تھا۔ وہ اسے کبھی معاف نہیں کر سکیں گے۔

تمکنت : (بے اختیار ہو کر) اکبر! اکبر!! (دیر تک سر جھکائے بیٹھی رہتی ہے، پھر سنبھل کر) معاف کرنا ناصرہ، میں کچھ بہک سی گئی تھی۔ لیکن ایسے شخص کو بے رحم کیسے کہا جا سکتا ہے؟

ناصرہ : میں کیا جانوں؟ میرے ساتھ ان کا سلوک کچھ ایسا ہی رہا ہے۔

تمکنت : خیر جو ہوا سو ہوا۔ اب اکبر کو اپنی بیٹی کے جذبات کا لحاظ کرنا چاہیے۔ اچھا ناصرہ! مجھے ان سے بات کرنے دو۔ شاید میں اس گتھی کو سلجھا سکوں۔

(تمنّا واپس آ کر اپنی کرسی پر بیٹھ جاتی ہے۔ اس نے آخری الفاظ سن لئے ہیں)

تمکنت : تمنا بیٹی! مجھے امید ہے میں تمہارے لئے کچھ کر سکوں گی۔ ذرا میری طرف مسکرا کر دیکھو۔

(تمنا مسکراتی ہے لیکن اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے ہیں)

تمکنت : تمنا! تمہارا چہرہ مسکرانے کے لئے ہے منہ بسورنے کے لئے نہیں۔

تمنا : اچھی خالہ جان!

ناصرہ : آپا آپ یہ کھکھیڑ نہ اٹھائیں۔ وہ کسی کی بات نہیں مانیں گے۔ مجھے اندیشہ ہے آپ کی بھی سبکی ہوگی۔

تمکنت : اکبر کے ہاتھوں میری سبکی!........

تمنا : لیکن خالہ جان میں تو کہنے آئی تھی کہ چائے تیار ہے (تینوں اٹھ کھڑی ہوتی ہیں)

(پردہ گرتا ہے)

پانچواں منظر

(پردہ اٹھتا ہے تو اکبر کے کمرے میں اکبر اور تمکنت باتیں کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں)

تمکنت : (کھانستے ہوئے) اکبر! تم بھی کیسی باتیں کرتے ہو۔ کیا مجھے اس بات کا رنج نہیں تھا کہ شاہ رُخ کا باپ ہمارے راستے میں حائل ہوا تھا۔ خدا معلوم میں نے کتنی بار اس کی تباہی کے لئے بددعا کی ہے اور کتنی بار اس کا نام لے لے کر کوستی رہی ہوں۔ مگر اب میں اپنے ماضی پر نگاہ ڈالتی ہوں تو مجھے سب کچھ بدلا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس وقت میں اپنے دل میں اس سے نفرت کا شائبہ تک نہیں پاتی۔

اکبر : (طیش میں) تمکنت، میرا معاملہ مختلف ہے۔ کاش میں اپنے ہاتھوں سے اُس ملعون کا گلا گھونٹ سکتا۔ اس کا جگر چاک کر سکتا۔

تمکنت : تم کس قدر جذباتی ہو گئے ہو۔ ذرا ٹھنڈے دل سے اس بات پر غور کرو۔ قصور کسی کا بھی نہیں تھا۔ نہ اس کا نہ میرے ماں باپ کا۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ میرے مقدر میں یہی کچھ لکھا تھا کہ میں مسرت سے کبھی بہرہ ور نہ ہو سکوں گی۔

اکبر : (تیز لہجے میں) اور ہم نے ایک دوسرے سے جو والہانہ محبت کی تھی وہ ہمارے مقدر میں نہیں تھی؟ تھی اور ضرور تھی۔ لیکن اس ناہنجار نے ہمارا سرچشمۂ حیات اپنی سازشوں سے مسموم کر دیا۔ اب کیا میں اپنے ہاتھوں سے تمنا کو اس کے بیٹے سے بیاہ دوں گا؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

تمکنت : (منت آمیز لہجے میں) جب میں اسے معاف کر سکتی ہوں تو تم بھی اسے معاف کر سکتے ہو۔

اکبر : (دانت بھینچ کر) سراسر ناممکن۔

تمکنت : تم چاہتے ہو کہ تمنا بھی میری طرح سسک سسک کر جان دے اور ساری عمر اپنی حرماں نصیبی پر ماتم کرتی رہے؟

اکبر : میں اسے سسک سسک کر دم توڑتے دیکھ سکتا ہوں لیکن اس مردود کی بہو بنتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا

[تمکنت کھانستی ہے اور نڈھال ہو کر کرسی سے ٹیک لگا لیتی ہے۔ اس کی سانس اُکھڑی اُکھڑی ہے۔ اکبر لپک کر اسے سہارا دیتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ سنبھل جاتی ہے۔]

اکبر : تمہیں مکمل سکون اور آرام کی ضرورت ہے۔ چھوڑو اس قضیئے کو اور ناصرہ کی خواب گاہ میں جا کر تھوڑی دیر لیٹ جاؤ۔ میں ابھی دوا لاتا ہوں۔

تمکنت : (اسے آستین سے پکڑ کر کرسی پر بٹھا دیتی ہے) نہیں رہنے دو۔ اس کی ضرورت نہیں ہے اکبر! بس پانچ منٹ کے لئے بیٹھ جاؤ۔ غور سے

سنو۔ ہو سکتا ہے یہ میری آخری باتیں ہوں۔

اکبر : خدا کے لئے ایسا مت کہو۔ تمہاری صحت بحال ہو جائے گی۔

تمکنت : (نقاہت سے مسکرا کر) میں بچہ ہوں جو بہل جاؤں گی؟ میں دیکھ رہی ہوں کہ موت اپنے بے رحم پنجے میرے سینے میں گاڑ رہی ہے اور آج ہی کل میں مجھے آخری بلاوا آنے والا ہے۔

اکبر : تمکنت! تم بہت دن زندہ رہو گی۔ دیکھ لینا، تشویش کی ایسی کوئی بات نہیں ہے۔

تمکنت : تشویش کس بات کی؟ میں تو موت کا انتظار کر رہی ہوں۔ اس وقت جب کہ میں زندگی اور موت کے دوراہے پر کھڑی ہوں، گذرے ہوئے مصائب و آلام میری آنکھوں سے اوجھل ہو گئے ہیں اور ماضی کی خوشگوار یادیں ہجوم کر آئی ہیں۔ اکبر! میں اس سرمئی شام کو کبھی نہیں بھولی جب افق پر شفق پھوٹ رہی تھی اور قرمزی بدلیوں نے ہر طرف آگ سی لگا رکھی تھی۔ میں اس لمحے درختوں کی چوٹیوں پہ کانپتی ہوئی سرخیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں۔ اس لمحے کو میں نے ہمیشہ کے لئے اپنے سینے میں محفوظ کر لیا تھا جب تم نے گل مہر کے درخت کے نیچے میرا ہاتھ تھام کر کہا تھا، تمکنت! میں مرتے دم تک تمہاری پرستش کروں گا۔ اس وقت مجھے اپنی تمام محرومیاں بھول چکی ہیں اور میں اپنے آپ کو دنیا کی سب سے خوش نصیب سمجھنے لگی ہوں۔ مجھے تو صرف یہی بات یاد رہ گئی ہے کہ ایک باوفا چاہنے والے نے مجھ سے ابدی محبت کا پیمان باندھا تھا۔ کوئی بھی عورت اس سے زیادہ کی آرزو نہیں کر سکتی۔ اور اکبر! تمہیں یاد ہوگا کہ اس پاک شام کو تم نے مجھ سے کہا تھا میں تمہاری ادنےٰ سی آرزو کو بھی اپنا فرض سمجھ کر پورا کروں گا۔

اکبر : (بھرائی ہوئی آواز میں) تمکنت! ایسی باتیں کبھی بھلائی بھی جا سکتی ہیں؟

تمکنت : تم ڈاکٹر ہو اور اچھی طرح جانتے ہو کہ میں صرف چند ہی دن کی مہمان ہوں۔ طفل تسلیاں فضول ہیں۔ کیا مرنے سے پہلے میری ایک آرزو پوری نہیں کرو گے اکبر؟

اکبر : تمکنت، میں اپنا سب کچھ تمہارے قدموں پر نثار کرنے کو تیار ہوں۔ تم اچھی طرح جانتی ہو میں بات سے پھرنے والا آدمی نہیں ہوں۔

تمکنت : مجھے تمہارے خلوص پر پورا اعتماد ہے! میں چاہتی ہوں کہ تم میری خاطر تمنّا کا ہاتھ شاہ رُخ کے ہاتھ میں دے دو۔

اکبر : (چلّا کر) تمکنت! تمکنت!! خداوندِ جلیل!

[اٹھ کر بے تابی سے کمرے میں اِدھر سے اُدھر ٹہلنے لگتا ہے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام رکھا ہے۔ تمکنت حسرت بھری نگاہوں سے اسے دیکھتی رہتی ہے۔ پھر کھانستی ہے اور کھانستے کھانستے نڈھال ہو جاتی ہے۔ اکبر لپک کر اسے سہارا دیتا ہے۔ اس کی طبیعت بحال ہوتی ہے تو جھک کر اس کا ہاتھ چومتا ہے۔]

اکبر : جانِ من! تمہاری خاطر۔ محض تمہاری خاطر ——

[تمکنت شوق اور پیار کی نگاہوں سے اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں مسرت کے آنسو چھلک پڑتے ہیں]

تمکنت : میرے اچھے اکبر! اب میں سکون سے جان دے سکوں گی۔ جس مسرت سے مجھے محروم ہونا پڑا تھا وہ تمنّا کے دل میں جگمگاتی رہے گی۔ میں تمہاری بیٹی کے دل میں زندہ رہوں گی۔

(قدموں کی آہٹ پر اکبر ہٹ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ دروازے پر دستک دے کر ناصرہ داخل ہوتی ہے)

ناصرہ: میں آسکتی ہوں؟

اکبر: (نرمی سے) آجاؤ ناصرہ

[ناصرہ باری باری دونوں کے چہروں کو غور سے دیکھتی ہے۔ دونوں کے بشرے پر شہادت کے آثار دکھائی دیتے ہیں اور دونوں کی آنکھوں میں ایک عجیب روحانی چمک پیدا ہو گئی ہے]

ناصرہ: میں...... میں کہنے آئی تھی ڈاکٹر اکہ...... شاہ رُخ کی...... امی آئی ہیں۔

(ڈاکٹر چپکے سے اپنی فیلٹ اٹھا کر کمرے سے باہر نکل جاتا ہے)

ناصرہ: تمکنت آپا! دیکھا آپ نے کس طرح بھاگ گئے ہیں؟

تمکنت: (مسکراتے ہوئے) کوئی مرد اپنی بیوی کے سامنے اپنے غرور کو خاک میں ملتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔

ناصرہ: میں آپ کی بات سمجھ نہیں پائی آپا!

تمکنت: میں نے ان سے تمنّا کو شاہ رُخ کے لئے مانگ لیا ہے۔ مبارک ہو ناصرہ۔

ناصرہ: (جوشِ مسرت سے چیخ کر) میرے کان یہ کیا سن رہے ہیں۔ آپا! تمنّا! تمنّا!!

(تمنّا باہر کھڑی سن رہی تھی۔ دوڑ کر اندر آتی ہے)

تمکنت: ادھر آؤ میری بچی۔ میرے قریب آؤ۔ میری طرف دیکھو۔ لو اب مسکراؤ۔ خدا کرے تم ہمیشہ مسکراتی رہو۔

[تمنّا دوڑ کر تمکنت سے لپٹ جاتی ہے اور اپنا سر اس کی گود میں چھپا لیتی ہے۔ تمکنت دونوں بازو اس کے گلے میں حمائل کر دیتی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد تمنّا سر اٹھانا چاہتی ہے لیکن تمکنت کے اکڑے ہوئے بازوؤں کی گرفت کے باعث نہیں اٹھا سکتی۔ وہ گھبرا کر سر جھٹک دیتی ہے۔ تمکنت کرسی سے نیچے لڑھک جاتی ہے ناصرہ لپک کر اسے سہارا دینا چاہتی ہے مگر وہاں کیا رکھا ہے۔]

تمنّا: (گھبرا کر) ہائیں امی جان! انہیں کیا ہو گیا ہے؟ بلاؤں ابا جان کو؟

ناصرہ: (تمکنت کے جسم کو سیدھا کرتے ہوئے رندھی آواز میں) اب یہ تمہارے ابا جان سے بے نیاز ہو چکی ہیں۔ بیٹی آؤ انہیں بستر پر لٹانے میں میری مدد کرو۔ (تمنّا آگے بڑھتی ہے)

(پردہ گرتا ہے)

عصمت چغتائی

نوالہ

پوری چال میں ایک ہُلّڑ مچا ہوا تھا ـــــــــ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی کھولی میں سانپ نکل آیا ہے، یا کسی کے ہاں بچہ ہو رہا ہے۔ عورتیں ایک کھولی سے دوسری میں گھس رہی تھیں۔ شیشیاں، تولیں، ڈبے بٹے سب کی سب سرلا بین کی کھولی کی طرف لپک رہی تھیں، جیسے سرلا بین کا آخری وقت ہو اور ساری پڑوسنیں اپنی سی کرنے پر تُلی ہوں۔

ایک طرح سے تو سرلا بین کا واقعی آخری وقت تھا۔

ان کی ٹرین بس چھوٹنے ہی والی تھی۔ وہ پورے تینتیس برس کی ہوتیں، اگر اُن کے دُور اندیش والدین نے پربھاکر کے سارٹیفکٹ میں ان کی عمر کے پورے پانچ سال نہ ہڑپ کر لئے ہوتے۔

مگر کاغذ کی عمر ایسا زبردست سہارا نہیں ہوتی۔

وہ یو پی کے کسی گم نام سے گاؤں کی پیداوار تھیں، مگر بمبئی میں اتنے سال رہیں کہ وطن کو بھول بھال کے بمبئی کی ہی ہو گئی تھیں۔ اُن پر کسی صوبے کا ٹھپّا نہیں تھا، کوئی انہیں گجراتی سمجھتا، کوئی مارواڑی اور سندھی، بس جگت سرلا بین ہو گئی تھیں۔

سرلا بین کے۔ ای۔ ایم ہاسپٹل میں نرس تھیں، مہنگائی الاؤنس ملا کے دو سو چالیس روپے ملتے تھے۔ بارہ روپے کمرے کا کرایہ دے کر اتنا بچ جاتا تھا کہ بڑے ٹھاٹ سے رہتی تھیں۔ ہاسپٹل سے مرہم پٹی کا سامان' اے۔ پی۔ سی کی گولیاں، مرکیوری کروم، اصلی گلیسرین اور پیٹنٹ دواؤں کے سیمپل لا کر مفت تقسیم کیا کرتی تھیں۔ ان کا کمرہ آس پاس کے علاقے کے لئے اچھا بھلا ہسپتال تھا۔

سرلا بین بڑے کام کی چیز تھیں، اوپر سے شکل صورت کے ساتھ ساتھ چال چلن ایسا تھا کہ کبھی کسی کی گرہستی پر شب پڑنے کا خدشہ نہیں ہوا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بے انتہا ہر دل عزیز تھیں، جدھر نکل جاتیں ان کے جنائے ہوئے بچے کلبلاتے روتے بسورتے نظر آتے۔ لوگ ان کے قدموں میں آنکھیں بچھاتے، ہر سودے والا، ہر دوکاندار انہیں رعایت سے مال دیتا۔ وہ مول تول کرتی جاتیں اور مریضوں کے حال چال بھی پوچھتی جاتیں۔

"کیوں رے تلسی، بہو کی کمر کا درد کیسا ہے۔ ارے شاکر میاں آمنہ بی کے پیروں کی سوجن اُتری کہ نہیں۔ شام کو لے آنا۔ انجکشن دے دوں گی۔ ارے او رجنی تیرے گھٹنوں کے درد کا کیا ہوا؟ تیرا مرد پھر دارو پی کر آنے لگا ہے؟"

وہ خیر خبر پوچھتی، کام دیوی کے ٹکڑ والے بس اسٹاپ پر پہنچ جاتیں اور اُن کے مریض اُن کو دُعائیں دیتے رہ جاتے۔

بس سب کو یہی دکھ تھا کہ سرلا بین اب تک کنواری بیٹھی تھیں۔ اگر شادی کے بعد وہ بیوہ ہو گئی ہوتیں۔ یا میاں چھوڑ کر چلا جاتا تو بھی صبر آ جاتا مگر یہ تو نرا اندھیر تھا کہ ان کی ریل چھوٹ رہی تھی اور جیون ساتھی کا دُور دُور نشان نہ تھا۔ سب کے سر ان کے احسانوں کے بوجھ سے جھکے ہوئے تھے۔

وہ سب کے لئے کرتی تھیں، لیکن اُن کے لئے کوئی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ یہ شہر بمبئی ہے، یہاں زندگی سرپٹ دوڑتی ہے۔ یہاں مشاطہ اور نائن کا فیشن ختم ہوچکا ہے۔ یہاں تو بس آنکھ لڑ جاتی ہے اور بیاہ ہو جاتا ہے۔

سرلا بین فلم ہیروئن نہ سہی، ڈراؤنی بھی نہ تھیں کہ کوئی اللہ کا بندہ اُن پر عاشق ہی نہ ہو پائے۔ آدمی کا بچہ تھیں۔ باپ بچپن ہی میں مر گئے۔ ماں ہمیشہ کی روگی۔ سنگر مشین کے بل بوتے پر انہیں پالتی رہیں۔ پھر جب بیٹی کمانے لگی تو وہ بالکل ہی ٹوٹ گئیں۔ دو ایک بار اٹھتا ہوا انہیں بیٹی کے بیاہ کا خیال آیا۔ مگر اس خیال کے کوئی معقول صورت اختیار کرنے سے پہلے ہی وہ چل بسیں۔ وہ دن اور آج کا دن سرلا بین ایسی اپنے کام میں جٹیں کہ شادی کا خیال تک نہ آیا۔ خیال آیا بھی ہوگا تو انہوں نے کسی سے تقاضا نہیں کیا۔ اور تھا بھی کون جس سے تقاضا کرتیں کہ بھئی ہمارا بیاہ کرا دو؟

کہتے ہیں اگر کوئی کنواری کنیا بیٹھی رہے تو دھرتی کی چھاتی پہ بوجھ ہوتا ہے اور دھرتی کے اس کرب کا پاپ سب کو لگتا ہے۔ کم از کم سرلا بین کے جان نثاروں کا تو یہی عقیدہ تھا۔ ان کی نیکی اور پارسائی قابلِ ستائش تھی، مگر نیکی کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ یہ تو ان سے کوئی نہیں کہتا تھا کہ بابا کسی بھی ایرے غیرے نتھو خیرے کے گلے میں باہیں ڈال کر جھول جاؤ۔ مگر عورت کے چند گُر ہیں جنہیں اگر سلیقے سے استعمال کیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ آج کل تو بر پھانسنا اکیلے ماں باپ کے بس کی بات بھی نہیں۔ اچھی شریف زادیاں بھی اب تو چڑیا خود ہی گھیرتی ہیں، پھر شرما کر سر جھکا کر ڈور والدین کے ہاتھ میں تھما دیتی ہیں، کوئی داغ نہیں لگتا۔ کسی کو پتہ بھی نہیں چلتا۔ والدین بھی سرخرو دولہا دلہن بھی مگن۔ یوں ہوا کرتی ہیں شادیاں۔ مگر نہیں ہو پاتیں تو بے چاری سرلا بین جیسی سمسی کایوں کی، جو دنیا کے زخموں پر پھاہا رکھنے میں ایسی گم ہیں کہ اپنا کچھ ہوش نہیں۔ سب کے دُکھ بانٹتی ہیں، راتیں آنکھوں میں کاٹ دیتی ہیں، نوزائیدہ بچے ہتھیلیوں پر جھیلتی ہیں ——— اور پھر اپنی نیم تاریک کھولی میں اُلٹا سیدھا نگل کر سونی کھاٹ پر پڑ جاتی ہیں، کوئی اتنا نہیں جو ان کی تنہائی کے رِستے ہوئے زخموں پر پھاہا رکھے۔

یہ اتنا بڑا چیختا چنگھاڑتا بمبئی، کیا یہاں کوئی اکیلا کوئی عورت کے پیار کا بھوکا نہیں؟ کسی کو عورت کے لمس کی چاہت نہیں۔ سرلا بین کسی کی محتاج نہیں، اپنا کمائی کھاتی ہیں، ساری چال میں ایک نگینہ سا کمرہ ہے جو کسی فلیٹ سے کم نہیں ——— صوفہ کرسی بھی ہے اپنا الگ سنڈاس بھی۔ اب اور کیا چاہیے اس دُنیا میں۔

لوگوں کا کیا ہے، کنوارے تو آنکھوں میں کھٹکتے ہیں۔ ہر دم شادی کی دعائیں، شادی کے تقاضے۔ دلہن شادی کر لو تو بچے کی فرمائش۔ ایک بچہ ہوا تو یہ الاہنے کہ اسے ہے بس ایک ہی۔ چلئے دوسرا پیدا کیجئے ——— مگر سُرلا بین کو بھی یقین نہ ہوا تھا کہ وہ سدا کنواری ہی رہیں گی، کوئی تو ہوگا۔ اس یہاں سے وہاں تک پھیلی دُنیا میں ——— کوئی ایک اللہ کا بندہ جسے خدا نے ان کی زندگی کا حصہ دار بنایا ہوگا، یہ اور بات ہے کہ وہ اسے ڈھونڈ نہیں پائیں۔ لوگوں کے کہنے سے انہیں اور بھی خیال آنے لگا۔ مگر جب بھی انہوں نے کسی کو اس خیال سے دیکھا وہ شجرِ ممنوعہ ثابت ہوا اور اپنی بیوی کی پوشیدہ بیماریوں کا رونا لے بیٹھا۔ کچھ وقت ساتھ گزارنے کو تو بہت سے تیار ملے، مگر ہاتھ پکڑ کے نبھانے کے خیال سے بارات لے کر چڑھنے کا ارمان کسی کے دل میں نہ جھانکا۔ ہاسپٹل میں بھی کبھی کسی نے گہری گہری پُراسرار آنکھوں سے انہیں نہ دیکھا، کبھی کسی نے انہیں ہٹ کر راستہ دینے کی ضرورت تک نہ محسوس کی۔ لوگ دندناتے نکل جاتے اور وہ آڑی ہو کر دیوار سے لگ جاتیں۔

کام دیوی کے ناکے سے وہ روز صبح کو پونے آٹھ بجے والی بس پکڑا کرتی تھیں۔ بس میں سب ہی روز کے جانے پہچانے ہوا کرتے تھے سب کی سیٹیں کچھ مقرر سی ہو گئی تھیں۔ اس دن وہ بے خیالی میں اپنی سیٹ کی طرف بڑھیں۔ ایک اجنبی کو وہاں بیٹھا دیکھ کر انہوں نے لباب بھری

ہوئی بس پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور بس کے بیچ میں لٹکی ہوئی رکاب پکڑ کر کھڑی ہو گئیں۔ اجنبی نے انہیں سر سے پیر تک دیکھا اور کھڑا ہو گیا۔

"بیٹھ جائیے ———" وہ رکاب پکڑ کر کھڑا ہو گیا اور اخبار پڑھتا رہا۔

انہوں نے پہلے تو بوکھلا کر جھٹ سے اپنا بٹوا دبوچا کہ کہیں کوئی چور اچکا تو نہیں۔ پھر سمجھیں کسی پیشنٹ کا شوہر ہو گا اور ابھی پیروں کے ورم اور کمر کے دکھ درد کا قصہ شروع کر دے گا۔ مگر وہ رکاب پکڑے کھڑا جھولتا رہا اور اخبار پڑھتا رہا۔ جب انہیں یقین آ گیا کہ وہ خود بھی کسی مہلک مرض میں بتلا نہیں تو وہ سناٹے میں رہ گئیں۔ ایسا تو کبھی ہوتا نہیں!

مگر دوسرے دن جب پھر وہی ہوا کہ وہ بس پر چڑھیں اور اس نے اپنی جگہ چھوڑ دی اور کھڑا ہو گیا تو وہ بیٹھنے کو تو بیٹھ گئیں مگر بڑی کسمسائیں ان کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کریں، جی چاہا اسے مٹھی بھر سلفا کی گولیاں ہی دے دیں۔ کہیں زخم تلاش کر کے مرکیوری کروم کا پھاہا رکھ کے سفید جھک سی پٹی باندھ دیں، مگر اس کی مکمل صحت سے ان پر اوس پڑ گئی۔ ایک کھرونچے تک کا نشان نہ تھا۔ وہ بس میں بے تعلق سے کھڑا جھولتا رہا اور اخبار پڑھتا رہا۔

تیسرے دن جب یہی حادثہ ہوا تو سرلا بہن کے چھکے چھوٹ گئے ———

"نگوڑے کا ہے کو مجھے روز روز سیٹ دیتا ہے کیا تیرے اماں بہنیں نہیں کلموہے"۔ ان کا جی چاہا اسے کسی بات پر خوب جلی کٹی سنائیں مگر وہ ایسا بے تعلق سا کھڑا جھول رہا تھا کہ انہیں بات بے تکی سی لگی۔

جب ہفتہ بھر یہی دستور چلتا رہا تو سرلا بہن بالکل اتھل پتھل ہو گئیں۔ خدمت گزاریوں کی تو وہ عادی ہو چکی تھیں۔ کسی کا احسان اٹھانے کی ان میں عادت نہ تھی، ان کے دل پر بوجھ بڑھنے لگا۔ ڈیوٹی پر انہیں بار بار خیال آتا کہ کیا کریں۔ دوسری بس سے چلیں تو وقت پر پہنچنا ناممکن۔

سرلا بہن کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ دنیا سے روٹھی روٹھی رہنے لگیں، جیسے کوئی ان کے ساتھ سخت زیادتی کر رہا ہو۔ ان کا مزاج بڑا نازک ہو گیا، اب وہ بات بات پر الجھ پڑتیں۔ بے بات کے رونے لگتیں۔ ڈیوٹی سے لوٹتیں تو آنکھیں بند کر کے کھاٹ پر پڑ جاتیں، نہ کھانے کی سدھ بدھ، نہ کچھ۔ کسی کو کچھ دکھ درد بھی ہوتا تو پاس آتے ڈرتا ———

"سرلا بہن کو عشق ہو گیا ہے ———" ستو گرہ کٹ نے رام دئی کو بتایا ———

"ڈر موئے، تیری کھاٹ کٹے۔ سرلا بہن تو دیوی ہے دیوی۔" رام دئی نے ستو کی سات پشتیں تو م ڈالیں۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں"۔

"کیا کہہ رہا ہے، تیرے منہ میں بھوبل۔

مگر جب ستو گرہ کٹ نے بتایا کہ گام دیوی کے ناکے پر اس کی بزنس ہوتی ہے۔ ہر ایک کو تولنا پرکھنا، اس کی جیب کے بوجھ کو ہلکا کرنا اس کا روز کا کام ہے۔ ایک عدد بابو روزانہ اپنی سیٹ سرلا بہن کو دے دیتا ہے اور خود کھڑا سفر کرتا ہے۔ آج سے نہیں ہفتوں سے یہ قصہ چل رہا ہے اور معاملہ قطعی پٹتا نظر آ رہا ہے۔

"ہائے میں مر جاؤں!" رام دئی نے چھاتی کوٹ لی اور دوڑی دوڑی شنتو کے پاس گئی۔ شنتو بھی سناٹے میں رہ گئی۔ پھر دونوں مل کر سعادت کی بہو کے یہاں گئیں۔ سعادت کی بہو منڈیر پر لونڈے کو لٹکائے اجابت کرا رہی تھی۔

"خدا کی قدرت!" لونڈا موری میں گرتے گرتے بچا۔

پھر یہ بات آگ کی طرح ساری چال میں گھوم گئی۔

"ایسا ہی ہوتا ہے،" لکشمی گھاٹے نے کہا۔ وہ ریڈی میڈ کپڑوں میں کاج، بٹن بناتی تھی اور بڑی جہاں دیدہ تھی، اس کا میاں لاپتہ تھا۔ ایک لڑکی تھی وہ اس نے مشن اسکول میں دے دی تھی، سب اسے گالیاں دیتے تھے کہ اس نے لونڈیا کو عیسائی بنوا دیا۔" لیکن لکشمی ایک کان سنتی تھی۔ دوسرے کان اڑا دیتی تھی۔ کاج بٹن سے کہیں پیٹ پلتے ہیں؟ سب جانتے تھے، وہ راتوں کو جایا کرتی ہے، لالہ کے ڈر سے گاہکوں کو چال پر نہیں لاتی، مگر کسی کو کیا؟ اُس نے دارو پی کے کبھی لفڑا نہیں کیا۔ جیسے آئے دن رنبھری کیا کرتی تھی۔ نام اس کا ایڈیتھ تھا۔ مگر اینبھری ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ کھلے بندوں دارو کا دھندا کرتی تھی، لالہ کو ڈٹ کر بخشش دیتی تھی، پولیس سے بھی ہفتہ مقرر تھا، کوئی اس کے موہنہ نہیں لگتا تھا، کیونکہ وہ آئے دن دارو چڑھا کر انگریزی میں گالیاں بکا کرتی تھی۔ کم سے کم چال والوں کا تو یہی خیال تھا۔ کئی بار جھونپڑ میں آ چکی تھی، اور سرلا بین کی شکرگزار تھی کہ انہوں نے اس کی بیا پار لگائی تھی۔ چال میں کئی آبرو باختہ عورتیں رہتی تھیں، مگر کسی کو طعنہ دینے اور اعتراض کرنے کی فرصت نہ تھی، ہر ایک کی کوئی نہ کوئی رگ دبتی تھی۔

"تو بیاہ کیا چال میں ہی رچے گا؟"

"اور کیا؟ سامنے کے میدان میں تنبو تن جائے گا۔ بمبئی میں تو بڑی بڑی شادیاں تنبو تان کے کی جاتی ہیں،" بنتو نے فیصلہ کیا۔

"ہائے مزہ آئے گا۔ اپنی سرلا بین دلہن بنے گی۔" ——— رام دئی کو شادیوں کا بڑا شوق تھا۔ وہ ہر موسم میں نئی شادی رچاتی تھی۔ کچھ دن بعد دولہا اس کی ٹھکائی کر کے کبھی کبھی کپڑے لتے تک چرا کے بھاگ جاتا۔ ابھی پچھلی شادی تو اس نے باقاعدہ کی تھی۔ تنبو تاننے میں بہت خرچہ آتا۔ اس لئے بس کھولی ہی میں پنڈت لوہے کی انگیٹھی جیسا ہون لے کر آ گیا، اور پھیرے ڈال دئے۔ رام دئی خوب سج کر دلہن بنی۔ چالی پر عجیب عروسانہ موڈ چھا گیا۔ خوب سی مہندی گھول کر سب نے تھوپی۔ ٹین بجا کر فلمی گانے گائے گئے۔ رخصتی کے وقت جو ہاتھ لگ گیا رام دئی اس سے گلے لگ لگ روئی "ہائے میرا بیرن ——— ہائے میرا بابل۔ ہائے مجھے مت اپنی ڈیوڑھی سے نکالو" وہ کسی فلمی سین کی یاد میں چنگھاڑتی رہی۔ پنواڑی نے تیز تیز آواز میں گراموفون لگا دیا۔ کاہے کو بیاہی بدیس،" گو نہایت سر سپاٹ چیختی آوازیں بے حد بے سُری عورتیں گا رہی تھیں، مگر یہ کم بخت گیت ہی کچھ ایسا ہے کہ جی بھر آتا ہے۔ بیٹی کی رخصتی کا سماں بھی عجیب ہوتا ہے، حالاں کہ رام دئی رخصت نہیں ہوئی۔ اس کا بھلنگا دولہا بھی بیاہ کر چال ہی میں آ گیا۔

کئی دن رام دئی شرمائی لجائی پایل بجاتی پھرتی رہی، پھر دولہا نے اُس کی پٹائی شروع کر دی۔ روز دارو پی کر ہڈیاں توڑتا۔ مہینے بھر کے اندر اندر وہ اس کے چاندی کے کڑے اور ناک کی لونگ لے کر بھاگ گیا۔ رام دئی تھوڑا سا جہیز کئی دن تک لنگڑاتی رہی اور اس کی جان کو کوستی رہی۔

ان تلخ تجربوں کے باوجود لفظ 'شادی' سے رام دئی کے دل میں لڈو پھوٹنے لگتے۔ اپنے علاوہ بھی کسی کی شادی ہو تو مضائقہ نہیں، موقع خوشی کا ہے۔

ڈرتے ڈرتے سرلا بین کو چھیڑا گیا اور جب وہ ذرا جھینپ گئیں تو بس دھر لیا گیا۔

"سرلا بین بیاہ کر ڈالو ———"

"ہاں جی ابھی عمر ہے کھیلنے کھانے کی۔"

"تمہارے ماتا پتا کی آتما کو بھی شانتی ملے گی۔"

"ہائے رام، ہم تو خوب بلبل مچائیں گے۔"

"چوک میں جنبو تنے گا۔"

"دولہا گھوڑے پر چڑھ کے آوے گا۔"

"سرلا بہن گھونگٹ کاڑھو گی؟"

"اے بھلا کیوں نہ کاڑھیں گی، کہیں بنا گھونگھٹ کے دلہن بنی ہے" رام دئی نے رائے دی۔ وہ اس لائن میں ایکسپرٹ مانی جاتی تھی۔

"ہائے چال سونی ہو جائے گی۔"

"سعادت کی بہو کا بچہ کون جنائے گا؟ ہر سال سعادت کی بہو کو سرلا بہن کی خدمات کی ضرورت پڑتی تھی۔

"سوت نہ کپاس کولھو سے لٹھم لٹھا" سرلا بہن چڑ گئیں "کس نے کہہ دیا تم سے شادی بیاہ کا؟"

"اے ہے تو پھر روز بس میں سیٹ کیوں دیتے ہیں؟" شبو تنتنائی ——

"یہ تو ان کی بھل منساہت ہے۔" سرلا بہن نرمی سے مسکرائیں۔

"اے تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو آج سیٹ دیتے ہیں، کل دل بھی دیں گے۔" سعادت کی بہو نے گود کے لونڈے کو کولہے پر پٹھک کر فیصلہ کیا، اس پر سب چہک اٹھیں۔

ان پیاری پیاری باتوں سے سرلا بہن کی آنکھوں میں بھی خواب جھوم اٹھے۔ انہیں ان مدقوق، آبرو باختہ خرافہ عورتوں پہ پیار آگیا۔ دل شکر گزاری کے احساس سے لبریز ہو گیا۔

"اب کی بار دودھ کم اترنے کی تو شکایت نہیں ——" وہ بات بدلنے کو ایک دم نرس بن گئیں۔

"ابھی تک تو نہیں۔" سعادت کی بہو منمنائی۔

"اور دیکھ ایڈیتھ، اب کے جو کچھ لفڑا ہوا تو کسم سے پولیس میں دے دوں گی۔ ٹوپ کیوں نہیں لگوا لیتی؟"

"بابا وہ لوگ ہسبینڈ کا نام پوچھتے۔" ایڈیتھ بھنائی۔

"اے نرطی صدیک بابو کا نام دے دے ——" رام دئی نے مشورہ دیا۔

"بٹ، وہ لچا ...."

"تو سرما جی کا نام دے دے۔"

"چپ رہو چڑیلو ——" سرلا بہن نے سب کو ڈانٹا، اور سعادت کی گود کے لونڈے کو چپ کرنے کے لئے چمچہ بھر سیرپ اسے چٹا دیا۔ "دور ہو یہاں سے۔"

"پہلے یہ بتاؤ شادی کب ہو گی۔" شبو اڑ گئی۔

"ہاں تاریخ مقرر ہو جائے۔" لکشمی نے مطالبہ کیا۔

"کس کی شادی؟ کیسی تاریخ؟ کوئی بات نہ چیت۔" سرلا بہن بگڑ گئیں۔

"بات نہ چیت، یہ کیسے؟ کیا دولہا گونگا ہے؟" قہقہہ پڑا۔

اور پھر سب نے بوکھلائی ہوئی سرلا بین کو سمجھایا کہ اُن کی ڈھیل سے ہی یہ بدڑا ہوا ہے کہ ان جیسی گنوتی کنواری بیٹھی ہے۔ مرد کی ذات تو تھلوا ہوتی ہے، جب تک منہ میں نوالہ نہ ٹھونسو بات نہیں بنتی۔ سب سرلا بین کے بہی خواہ ہیں، دشمن نہیں کہو تو اپنی جانیں بھی تمہارے لیے دے دیں۔ یہ چڑیا اب ہاتھ سے نہ جانی چاہیے۔"

"کہو تو ان سے بات کرنے کو بولوں ——" سعادت کی بہو نے پوچھا۔

"ارے ہم خود بات کرنے کو تیار ہیں ان سے کہ بابا ٹ کی پسند ہے تو ایسا بات کرو۔" مگر رام دئی کی اس رائے سے سب کو اختلاف پیدا ہو گیا۔ اسے مردوں کو پھانسنے میں ملکہ حاصل ہے۔ مگر کم بخت کو شادی کا چسکا پڑ چکا ہے۔ اگر امانت میں خیانت کر گئی تو؟ نہ بابا رام دئی سے اللہ بچائے۔

"شاید بے چاروں کی ہمت نہیں پڑتی۔ یہ رعب داب کے کپڑے پہنے چشمہ چڑھا کے جاتی ہیں۔ وہ سوچتے ہوں گے بیٹھی نظر سے دیکھا اور جوتے پڑے۔" شبلو نے تشخیص کی۔

"کپڑے لتے کا اثر تو پڑتا ہے۔"

"ڈیوٹی کی اور بات ہوئی، پر یہ ہر گھڑی ڈاکٹرنی بنی رہتی ہیں ——"

"عورت کو کچھ سنگار تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ ارے یہ مکھڑا اُس پہ میک اپ ہو تو قسم سے شری مان کے چھکے چھوٹ جائیں۔"

"اور کپڑے بھی بھڑک دار ہوں۔"

"تھوڑا بہت تیل پھلیل۔"

"ہاتھوں میں چوڑیاں۔"

"کانوں میں آویزے —— پھر دیکھتے ہیں بابوجی کہاں جاتے ہیں۔"

سرلا بین نے اس وقت تو سب کو جھڑک دیا، مگر سوچ میں پڑ گئیں۔ یہ دنیا کا دستور ہے۔ بمبئی میں ایک سے ایک بھڑک دار عورت گھومتی ہے۔ سوئی سادی عورتوں پر نظر ہی نہیں ٹکتی —— جیسا موقع ویسا بھیس۔

مگر ان کے پاس تو سادی سوتی کنی کی ساڑیاں تھیں۔ دو چار بدرنگ سی کھٹاؤ کی ہوں گی۔ گلے میں تار سی زنجیر تو پڑی ہی رہتی ہے۔ اگرچہ اسے زیور کہنا زیادتی ہے، ماں کی یادگار ہے۔

رات کے سناٹے میں ان کے دماغ میں رنگ برنگے کپڑے اور زیور تھرکتے رہے۔

"شاید بیاہتا ہے۔" دوسرے دن شبلو نے فکر مند ہو کر کہا۔

"نہیں بیاہا ہے تو نہیں۔"

"کیسے معلوم؟"

"بس میں کوئی دوست ملے تو پوچھ رہے تھے، گھر ملا۔ وہ بولے ہاں ملا۔ کہنے لگے اب شادی کر ڈالو۔"

"پھر کیا بولے؟" رام دئی قریب کھسک کر بولی۔

"ہنسنے لگے۔"

"چلو ادھر سے تو اطمینان ہوا۔ ذات کے تو ٹھیک ہیں؟"

"ہاں، بیگ پر رام سروپ بھٹناگر لکھا ہے۔ وہ تو پہلے ہی دن دیکھ لیا تھا۔"

"بس پھر کیا بات رہ گئی ہے جو ٹال مٹول کر رہی ہو؟"

"مونہہ سے جو نہیں بولتے۔"

"کچھ میٹھی نظروں سے کہتے ہوں گے؟"

"نہیں ——" جو کہتے بھی ہوں گے تو سرلا بہن کے کاہے کو پلّے پڑے گا۔ رام دئی ہوتی، ایڈتھ ہوتی، شبّو ہی ہوتی تو فٹ سمجھ جاتی وہ دن میں بابو جی مٹھی میں ہوتے۔

"ٹھنڈی سانس بھری؟"

"نہیں ——"

"توبہ! مردوا کون سی مٹی کا بنا ہے ——" سعادت کی بہو بگڑ گئیں۔

بڑی کائیں کائیں کے بعد طے ہوا کہ سرلا بہن دور اندیشی پر تیار ہوں۔ تیر تفنگ سے لیس ہو کر مونہہ میں نوالہ دیں، تب ہی نیّا پار لگے گی۔

بس اسی کارن عورتیں اپنے اپنے ترکشوں سے سامان نکال نکال کر سرلا دیوی کی کمک کو پہنچنے لگیں۔ شبانہ کبھی فلموں میں ایکسٹرا کا کام بھی لے لیتی تھی۔ وہ وہاں سے نہ جانے کیا کیا اٹرم سٹرم لایا کرتی تھی۔ ہیر لیبن اسنو تو سعادت کی بہو کے پاس بھی سال بھر پرانی پڑی تھی۔ ایڈتھ کے پاس تو تمام اسمگل کیا ہوا کاسمیٹک تھا۔ وہ ایک ہیر ڈریسر کو بھی جانتی تھی اور خود بھی فسٹ کلاس غبارے نما اونچے تو بنی جیسے بال بنا لیتی تھی۔ اس کے پاس ایسے ایسے چھوٹے بڑے کپڑے تھے جو اگر کیچپی کو پہنا دو تو بُت کافر بن جائے۔

بس سب کی سب مرمت پر جُٹ گئیں۔ سرلا بہن نے بہت نا نا کی مگر شبّو نے اپنی پیازی نائیلان جارجٹ کی ساڑی، جس پر سیکوئنس کا کام بنا تھا، انہیں پہنائی۔ بلاؤز پر بہت جھگڑا پڑا۔ شبّو کہتی تھی تازہ ترین فیشن کے مطابق سرخ بلاؤز اور سرخ پیٹی کوٹ ہونا چاہئے، نیچے سے جھلکا مارے گا۔ اور لال ہی سینڈل ہوں تب آئے مزہ۔ سرلا بہن نگوڑی کو نہ فیشن کا پتہ نہ میچنگ کے راز معلوم۔ ان کے ہاتھوں میں کھیل بنتی رہیں مونہہ پر پیلے کریمیں تھوپی گئیں، مع سعادت کی بہو کی ہیر لیبن اسنو کے، جو سوکھ چکی تھی، کیونکہ وہ بڑا زمانے جا رہی تھی۔ پھر رُوژ اور پاؤڈر کے پلستر چڑھے تو سب سا سیاہ سوت لے کر تو بنی کی شکل کا جوڑا بنا۔ پھر زیور کی باری آئی، اس پر خانہ جنگی ہوتے ہوتے بچی۔ ہر شخص یہی چاہتا تھا کہ اس کا چندہ زیادہ سے زیادہ ہو۔

جب اونچی ایڑی کے کارچوبی سینڈل پہن کر سرلا بہن بس اسٹاپ پر لہراتی ڈگمگاتی پہنچیں تو ان کی بغیر عینک کی آنکھوں میں ترمرے ناچ رہے تھے، پسینے کے شرارے چھوٹ رہے تھے۔

"کیا عورت ہونا کافی نہیں، ایک نوالے میں اتنا اچار چٹنی، مربّہ کیوں لازمی ہے۔" ان کی آنکھوں میں آنسو کھٹکنے لگے۔

اور پھر اس نوالے کو بچانے کے لئے ساری عمر کی گھس گھس۔

جب تھوڑی ہی دیر بعد لوگوں نے سرلا بہن کو شتم شتم واپس لوٹتے دیکھا تو سب کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ وہ بغیر دولہا کے ڈگمگاتی لرزتی چلی آرہی تھیں، گالوں پہ کاجل کی لکیریں بہاتی وہ گٹھڑیں گرتے گرتے بچیں۔

تو الہ تھوک دیا گیا!

یہ کیسے ہوا؟ کیوں ہوا؟ سرلا بہن سوالوں کی بوچھار سے بے دم ہو کر پلنگ پہ گر پڑیں۔

وہ جب بس میں داخل ہوئیں تو وہ ان سے قطعی غافل اخبار پڑھتا رہا۔ وہ رکاب پکڑے سیٹ کے پاس کھڑی جھولتی رہیں اور وہ بس کے دروازے کی طرف بار بار دیکھتا رہا، جیسے کسی کے چڑھنے کا منتظر ہو۔

انہوں نے نظروں کے سارے تیر اس کے کلیجہ میں جھونک دیے مگر وہ ان کی طرف سے مونہہ موڑے دروازے کو تکتا رہا۔

انہوں نے کاسنی مہک میں بسا ہوا گلابی آنچل ڈھلکایا، مگر اس نے اخبار سے نظریں نہ اُٹھائیں۔

انہوں نے ایک بھرپور انگڑائی لی، مگر اس کی آنکھوں میں مستیاں نہ لہرائیں۔ اس نے ایک پتھرائی ہوئی سی نظر ان پر ڈالی اور ان کے دھوم دھڑکے کو بے اعتنائی سے ٹکراتا ہوا اخبار پر جھک گیا۔

سامنے کی ایک سیٹ خالی ہو گئی اور وہ اس پہ ڈھے گئیں۔ سارے تیر سنسناتے ہوئے وار خالی دے گئے، اور خالی ترکش لرزتا رہا، کانپتا رہا۔

ڈرتے ڈرتے انہوں نے اپنی سیٹ سے مڑ کر دیکھا۔ وہ بس سے اُتر کر جا رہا تھا۔ اُترتے وقت اس نے بس اسٹینڈ پر دھندا چلاتے ہوئے ستو گرہ کٹ سے پوچھا "کیوں رے پاجی، آج سرلا دیدی نہیں آئیں؟"

ستو گرہ کٹ ہکلاتا رہ گیا، اور اجنبی لمبے لمبے ڈگ بھرتا سامنے گلی میں گم ہو گیا۔

اشفاق احمد

یارِ مَن بیا

سلیم ایک بہت ہی اچھا لڑکا تھا اور ہم سب اس کی دل سے قدر کرتے تھے۔ میری ماں، میری بیوی، میرے بچے سب اُس کے دیوانے تھے اور میں اس کو ملک بھر کے نوجوانوں پر اس لئے ترجیح دیتا تھا کہ وہ بڑا سعادت مند تھا اور میری ذہانت کا بہت قائل تھا۔ اس کا قد لمبا، بدن چھریرا اور بال بھورے تھے۔ اس پر پتلون، کوٹ اور شیروانی دونوں بہت سجتے تھے اور اس کی آواز بڑی خوب صورت تھی۔ مجھے پتہ نہیں کہ سلیم گاتا بھی تھا یا نہیں۔ لیکن اگر وہ گا سکتا تو بہت ہی اچھا گاتا۔ اس نے بی اے کر لیا تھا اور اب وہ دن کا بیشتر وقت ہمارے گھر پر گزارتا تھا۔ رضیہ ایف اے کا امتحان پاس کر کے جاپانی گڑیا بنانے کا فن سیکھ رہی تھی اور وہ بھی اپنے دن کا دو تہائی وقت ہمارے گھر پر گزارتی تھی۔ یہ دونوں حسین اور جوان روحیں بظاہر میرے بچوں سے ملنے آتی تھیں اور بظاہر ان کے لئے روز روز نئی نئی کہانیاں ڈھونڈ کر لاتی تھیں لیکن ان کہانیوں کا سننے والا کوئی اور ہوتا تھا۔ جبھی تو بچے بار بار کہتے تھے "سلیم بھائی شہزادہ بیچ میں انگریزی کیوں بولنے لگتا ہے؟"۔ اور "رضیہ باجی! شہزادی بیچ میں شعر کیوں پڑھنے لگتی ہے اتنے مشکل مشکل؟"

اس دن میں غسل خانے میں ٹیپ ریکارڈر پر جھینگر کی صدا ٹیپ کر رہا تھا لیکن یہ جھینگر اس قدر جھینپو قسم کا آدمی تھا کہ جونہی میں غسل خانے میں مائیکروفون رکھنے جاتا، وہ خاموش ہو جاتا اور جونہی میں وہاں سے نکلتا، وہ پھر بولنے لگتا۔ میں نے ایک لمبا تار لے کر مائیکروفون اس سے کنکٹ کیا۔ پھر الماری میں روئی کا ایک گھونسلا سا بنا کر مائیکروفون اس میں کبوتر کے بچے کی طرح بٹھایا اور اس کا منہ اندازاً آواز کی طرف کر کے اپنے کمرے میں آ گیا۔ یہاں آ کر میں نے ٹیپ ریکارڈر چلایا تو جھینپو جھینگر بڑے مزے سے گا رہا تھا کیونکہ غسل خانے میں اب میں نہیں رہا تھا۔ مشکل سے ایک ڈیڑھ منٹ گزرا ہو گا کہ جھینگر کی صدا پھر بند ہو گئی اور میرے ہیڈ فون میں ہولے سے آواز آئی "رضیہ" اور پھر جیسے سرسراتے ہوئے، کلف لگے کپڑے الماری کے پاس آ گئے "جی" اس نے آہستہ سے کہا اور سلیم نے رندھے ہوئے گلے سے کہا "میرا تو اشفاق انکل سے بھی کہنے کا حوصلہ نہیں پڑتا۔ بتاؤ میں کیا کروں؟" رضیہ نے شاید سر جھکا کر کہا "میں کیا بتاؤں۔"

الماری کی کھڑکی ذرا چوں کر کے بولی شاید سلیم نے اس کی کنڈی پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ کہنے لگا۔ "میرا ساتھ دو گی"؟ رضیہ نے سر جھکا لیا کیونکہ ٹیپ خالی چلنے لگا تھا۔ پھر وہ اسی طرح سر جھکائے ہوئے بولی "تپتے ہوئے صحراؤں میں اور اونچے سرد پہاڑوں پر جہاں بھی تم جاؤ گے۔ میں تمہارا ساتھ دوں گی۔ اور اگر ——— اگر ———" سلیم نے کہا "ہمارے درمیان کچھ لوگ، کچھ خاندان، کچھ روائتیں آ گئیں تو میرے ساتھ چلو گی؟" ٹیپ، خاموشی سے چل رہا تھا۔ میرا خیال ہے رضیہ نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ اس کے بعد میرے تینوں بچے دھڑ دھڑ بھڑ بھڑ کرتے ادھر آ گئے اور "کہانی کہانی" کا شور مچاتے ہوئے سلیم بھائی اور رضیہ باجی کو پکڑ کر لے گئے۔ میں نے ٹیپ ری وائنڈ کر کے چلایا تو آخری نقرہ

تھا "کچھ روز اُتیں آ گئیں تو میرے ساتھ چلو گی؟" اس کے بعد سات سیکنڈ کا وقفہ تھا اور پھر نزاکت سلامت کے ترانے کی آواز آئی تھی۔ "تبہ بہم رسیدہ جانم تو بیا کہ زندہ مانم ـــــ یار من بیا ـــــ بیا، یار من بیا" بڑے مزے کا ٹکڑا تھا اور نزاکت سلامت نے بڑے دل سے گایا تھا۔

شام کو سیر پر نکلنے سے پہلے میں رضیہ کے ابا جی سے ملا اور ان کے سامنے کسی سے کچھ سنے بغیر سلیم کی درخواست گزار دی۔ انہوں نے اپنی بیوی کو ڈرائنگ روم میں بلا لیا۔ کوئی آدھ گھنٹہ اس موضوع پر گفتگو ہوئی اور پھر انہوں نے ہامی بھر لی۔ دوسرے دن میں سلیم کے والد کے پاس ان کے دفتر پہنچا۔ انہوں نے رضیہ کو تین چار مرتبہ سے زیادہ نہیں دیکھا تھا لیکن وہ بھی اپنے بیٹے کی طرح میری صائب رائے کے بڑے قائل تھے۔ اس لئے انہوں نے بھی میری درخواست پر ہمدردانہ غور کرنے اور اپنی بیوی سے مشورہ کرنے کا وعدہ کر لیا۔ جب میں ان کے دفتر سے نکلا تو انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا "اس معاملے کو آپ اسی فیصد طے ہی سمجھئے"۔

آدھی رات کو اپنا سکرپٹ لکھ چکنے کے بعد میں نے مدھم آواز میں ٹیپ ریکارڈر لگایا تو مجھے بڑی خوشی ہوئی.... پہلے سلیم.... پھر رضیہ..... پھر سلامت اور اس کے بعد نزاکت ـــــ یار من بیا..... بیا..... یار من بیا...

ایک ہفتہ بعد جب میری وساطت سے دونوں بزرگوں کی ملاقات ہو چکی تو سلیم کو منگلا ڈیم پر سٹیشنری سپلائی کرنے کا ایک بڑا سا ٹھیکہ مل گیا۔ وہ لاہور، کراچی، پشاور سے سٹیشنری حاصل کرتا اور ڈیم کے ٹھیکیداروں کو ان کی ضرورت کے مطابق مال سپلائی کرتا۔ اس کے حسن کارکردگی سے غیر ملکی ٹھیکیدار اتنے مرعوب ہوئے کہ اسے سٹیشنری کے علاوہ دوسرے ٹھیکے بھی ملنے لگے۔ وہ ایک فلائیٹ سے لاہور آتا اور دوسری سے کراچی چلا جاتا۔ ایک بنک سے پیسے نکلواتا، دوسرے میں جمع کراتا۔ ایک سے اوور ڈرافٹ لیتا دوسرے میں ایڈجسٹ کراتا۔ اس نے مجھے پشاور سے ٹیلیفون کیا کہ "انکل میں زندگی بنا رہا ہوں۔ انشاءاللہ جس دن میری زندگی بن گئی میں سرخرو ہو کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔" میں نے پوچھا "بنک بیلنس کتنا بنا لیا؟" کہنے لگا "سات ہزار کم ایک لاکھ روپیہ ہو گیا ہے" میں نے کہا "ایک دن شکل دکھا جاؤ، بچے تمہیں یاد کرتے ہیں" کہنے لگا "ان کے لئے تحفوں کے پیکٹ بھیج رہا ہوں۔ خود جب بھی وقت ملا آؤں گا" میں نے فون بند کر دیا۔ اس وقت رضیہ میرے بچوں کو بیمار شہزادی کی کہانی سنا رہی تھی اور ساتھ ساتھ جاپانی گڑیا کو کپڑے بھی پہنائے جاتی تھی۔

ہم نے سلیم کا بہت انتظار کیا لیکن وہ اتنا مصروف تھا کہ اس سرزمین پر ہوتے ہوئے بھی ہم سے نہ مل سکا۔ ہر روز ہر رات ہمارے سروں پر سے اڑتا ہوا گزر جاتا لیکن ہم سے نہ مل سکتا۔ اس کے ٹیلیفون البتہ آتے تھے اور ٹرنک کالوں میں وہ رضیہ سے بھی کئی مرتبہ گفتگو کر چکا تھا۔ وہ ابھی زندگی بنا رہا تھا اور زندگی کمبخت ایک لاکھ دو لاکھ میں ٹھیک سے بنتی نہیں تھی۔ اسے بنانے کے لئے کم از کم پانچ لاکھ کی ضرورت تھی کیونکہ بڑا ٹھیکیدار بننے کے لئے اتنا چھوٹا سٹارٹ لینا بہت ضروری تھا۔ اس ایک سال کی مدت میں وہ ایک گھنٹے کے لئے ہمارے یہاں ضرور آیا۔ لیکن برآمدے میں بیٹھ کر بے ان سلیس، ٹی ٹی فارم، ای آر اور ڈیمانڈ ڈرافٹ کے کاغذ بھرتا رہا۔ بچے اور رضیہ اس کے گرد گھیرا ڈالے رہے اور وہ اپنے بریف کیس کو بار بار کھول کر اس میں سے رنگ برنگی فائلیں نکالتا رہا۔ بچوں کا خیال تھا۔ ان فائلوں میں پریوں کے شہزادوں کی کہانیاں ہیں جو سلیم بھائی نے خاص ان کے لئے جمع کی ہیں۔ رضیہ کا خیال تھا ان فائلوں میں وہ خط ہیں جو سلیم وقت نہ مل سکنے کی وجہ سے اُسے پوسٹ نہیں کر سکا۔ میں دور اپنے کمرے میں کیس گھٹنوں پر ڈالے ان کو دیکھتا رہا۔

رضیہ کی شادی پر سلیم نے تہران سے روٹسری کا تحفہ بھیجا۔ یہ بجلی کا ایک چولہا تھا جس کے سامنے شیشہ لگا تھا اور جس کے اندر ایک

لٹھ گھومتی تھی۔ اس لٹھ میں مرغ پرو کر اسے گھمایا جاتا تھا اور شیشے میں سے مرغ بریاں کی بدلتی ہوئی رنگت نظر آتی تھی۔ سلیم تہران سے اپنے غیر ملکی ٹھیکیداروں کے لئے جنز یٹر لینے گیا تھا جن کی ڈیلیوری ایران کے راستے سے ہو رہی تھی۔

ابھی چند دنوں کی بات ہے رضیہ میرے گھر سلام کرنے آئی تھی۔ میں حسبِ عادت پیر مونڈھے پر رکھے، کرسی میں سر پیچھے ڈالے پرانے ٹیپ سن رہا تھا۔ رضیہ نے اپنے لڑکے کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا "انکل اسے گھوڑا گلی داخل کروا دیجئے" میں نے آہستہ سے پوچھا "کیوں"؟ کہنے لگی "اس کی زندگی بن جائے گی، انکل یہ بڑا ڈفر ہے"۔

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا تو وہ کرسی میرے قریب کھینچ کر بولی "ہائے کیسا خوب صورت ترانہ گا رہے ہیں نزاکت سلامت" انکل ذرا پیچھے سے لگائیے نا شروع سے، میں نے جان بوجھ کر اس کی بات سنی ان سنی کر دی۔ سلامت نے ایک لٹکری بھر کر اونچے اونچے کہنا شروع ..... یار سن بیا ..... بیا، یار سن ..... یار من بیا .....

جوگندر پال

تیسرا شخص

پروفیسر دت اپنی لائبریری میں بیٹھا سوچ ہی رہا تھا کہ یہ خاتون کون ہو سکتی ہے۔ کہ اسے دروازے سے داخل ہوتی ہوئی ایک بڑی مانوس شکل دکھائی دی۔ رنڈدے پروفیسر نے اسے اپنی دو آنکھوں سے دیکھنے کے لیے عینک اتار لی۔

"مانی!"

وہ اٹھ کر بے اختیار اس کی طرف بڑھا۔

جوانی میں بائیس برس کے بعد اچانک یوں لوٹ کر سامنے آجائے تو ادھیڑ عمر ہو چکنے کے باوجود جوان نظر آتی ہے کہ ہے تو جوانی ہی۔ مانی بھی پروفیسر کی نوعمری کی ایک پرانی غیر تکمیل شدہ خواہش تھی جو ماہ و سال کی اوٹ سے برآمد ہوئی تو پروفیسر کو جوں کی توں لگی۔

پروفیسر دت نے اپنی زندگی میں ایک ہی محبت کی اور ایک ہی شادی۔ مانی سے محبت کی تو وہ شادی کر کے اپنے شوہر کے ساتھ انگلینڈ چلی گئی اور اپنی بیوی سے شادی کی تو چند سال میں ہی وہ کسی عام خواہش کی طرح مر گئی۔

"ارے دُت، تم تو اپنا بھوت بن کر رہ گئے ہو۔ کیا بوڑھا ہونے کی ایکسرسائز کیا کرتے ہو؟"

پروفیسر دُت مسکرانے لگا۔ "ہاں مانی، انتظار بڑھاپے کی ہی ایکسرسائز ہے —— آؤ!"

وہ آگے بڑھ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ "کس کا انتظار؟ —— میرا؟ گڈ اولڈ بوائے! —— میں نے تمہیں اس لئے اپنی آمد کا نہ لکھا کہ مجھے یوں اچانک اپنے پاس پا کر تم بڑی خوشگوار حیرت میں مبتلا ہو جاؤ گے —— تمہاری بیوی کہاں ہے —— اور بچے؟

اسی اثناء میں نوکر نے آکر اطلاع کی کہ اس نے مادام کا سامان رکھوا دیا ہے۔

"جاؤ چائے تیار کر کے لے آؤ۔" پروفیسر اپنے نوکر سے نظر ہٹا کر پھر مانی کی طرف دیکھنے لگا۔ "میرے پندرہ بچے ہیں مانی۔"

"ارے باپ رے! —— آئی ایم ساری! کہاں ہیں تمہارے بچے؟"

"وہ!" پروفیسر نے اپنے سامنے کتابوں کے شیلف کی طرف اشارہ کیا۔

مانی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "جب مرد سوچ سوچ کر ماں اور باپ کے دونوں رول خود ہی ادا کرنا چاہے تو بچوں کی بجائے کتابیں پیدا ہوتی ہیں۔ تم نے دوسری شادی کیوں نہیں کی؟ کیا ——؟

ہاں، مانی میں نے یہ بیس برس تنہا گزار دیئے ہیں۔ گھر میں باتیں کرنے کے لئے کوئی ہے نہیں اور یونیورسٹی کلاس میں بھی ہجوم سے ہی باتیں کرتا ہوں، یعنی وہ بھی ایک طرح اپنے آپ سے باتیں کرنا ہے ——"

"تم ــــــ تم پاگل ہو!" مانی نے بے چین ہو کر اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور سگرٹ نکال کر سلگا لیا۔

"تم سگریٹ بھی پینے لگی ہو مانی؟"

"زہر بھی پینے لگی ہوں۔" اس نے دو تین تیز تیز کش کھینچے۔ "ایک مرگئی تھی ہو رکھ تو کیا؟ دوسری کر لیتے، وہ بھی نہ رہتی تو تیسری، چوتھی۔ اپنے دیش کی کروڑوں عورتوں میں سے کیا تم دو چار کے بھی اہل نہ تھے؟ تم نے خود کشی کی ہے ووت۔ ناحق اپنی بھلی چنگی زندگی تلف کر کے رکھ دی ہے۔"

"وہ تو بہر صورت تلف ہونی تھی!"

وہ دونوں چپ ہو گئے اور ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے اور پھر ان سے رہا نہ گیا۔ اور وہ تیز تیز اپنے اپنے ذہن کے غار میں جاتے اور گھٹا ٹوپ اندھیرے میں دوڑ دوڑ کر اپنے مشترک ماضی میں پہنچ کے ایک دوسرے کو بے اختیار بازوؤں میں جکڑ لیا اور ــــــ

کچھ دیر بعد جب وہ ان غاروں سے باہر آئے تو بڑے مطمئن نظر آتے تھے، جیسے دولہا دلہن سہاگ رات کے بعد صبح آنکھیں کھلنے پر۔

"لو چائے آگئی۔" پروفیسر ووت نے نوکر کو چلا جانے کا اشارہ کر کے مانی سے کہا۔ "بتاؤ۔"

"تمہیں ایک ایسی عورت کی ضرورت ہے جو ــــــ"

"جو تمہاری طرح ہو۔" پروفیسر نے کہا۔ "مگر کیا فائدہ؟" وہ عورت بھی تمہاری طرح مجھے چھوڑ کر انگلینڈ چلی جائے گی۔ پھر ــــــ"

"ووت، ایک بات کہوں؟" مانی نے انجانے میں چائے میں شکر زیادہ گھول دی۔ "تم بھی ہمارے ساتھ انگلینڈ چلے آؤ۔ ہمارے ساتھ رہنا۔" ہمارے ساتھ، یعنی مانی اور اس کے شوہر کے ساتھ۔ وہ دونوں ہم ہیں۔ پروفیسر سوچنے لگا اور مانی اور میں، ہم اور تم ہیں۔ کیا مانی اس لئے اتنا لمبا سفر طے کر کے آئی ہے کہ میرے ذہن سے اپنا عکس بھی نکال کر لے جائے۔

"ووت پچھلے کئی دن میں تمہارے ہی خیال میں ڈوبی ڈوبی رہی۔ نہ جانے کیوں؟"

"تم ہمیشہ میرے ذہن میں رہی ہو مانی، اور مجھے لگ رہا ہے کہ اس وقت تم انگلستان سے نہیں، میرے ذہن سے نکل آئی ہو۔" ووت نے گرم گرم چائے منہ سے لگائی اور ہونٹوں ہی جلن محسوس کر کے کہنے لگا۔ "مجھے ڈر ہے کہ میں اب خالی الذہن ہو جاؤں گا۔" اس نے چائے کی پیالی میز پر رکھ کر سگار سلگا لیا۔ ــــــ "مانی، مجھے ایک عجیب سا خیال آرہا ہے۔ تم ہی میری ساری کاغذی اولاد کی ماں ہو اور میں اس کا باپ۔ جیسے شوہر اور بیوی کے رشتے سے بچے پیدا ہوتے ہیں، ویسے افلاطونی رشتے کتابوں کی پیدائش کے باعث ہیں ــــــ اگر تم مجھے خالی الذہن کر کے چلی گئیں مانی، تو میں اپنے اس فکری اختلاط سے بھی محروم ہو جاؤں گا۔"

"یو! یو! ــــــ" وہ ہنس ہنس کر گویا ووت کے بدن میں انستھیسیا انجکٹ کر رہی تھی تاکہ اسے کرب کا احساس نہ رہے ــــــ ارے! میں کیسی ماں ہوں کہ اپنے بچوں کو ساری عمر ایک نظر بھی نہیں دیکھا!"

پروفیسر ووت اٹھ کر بک شیلف کے قریب آگیا اور اپنی سب کتابوں کو اٹھا کر مانی کے پہلو میں صوفے پر لٹا دیا۔ مانی نے چند ایک کو اٹھا کر گود میں ڈال لیا اور جو سب سے چھوٹی تھی، اسے ہاتھوں میں لے کر اس کے نوزائیدہ چہرے پر آنکھیں گاڑ لیں اور بقیہ جو بڑی بڑی تھیں صوفے پر اپنی ماں کی طرف سر اٹھائے پڑی رہیں۔ ان سب کی طرف پدرانہ شفقت سے دیکھتے ہوئے بچوں کے باپ کی نظر سے ننھے کی پرسرور گٹ گٹ سنائی دیتی رہی۔

ایکا ایکی مانی بے اختیار ہنس دی۔ "تمہاری ہر کتاب سٹل بے بی ہے مائی ڈیئر ووت۔" ننھے کی پرسرور گٹ گٹ بند ہو گئی۔ "آئی ایم ساری ووت لیکن میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں کہ زندہ بچے ذہنی ملاقاتوں سے پیدا نہیں ہوتے۔"

پروفیسر دوت نے بوکھلا کر سگار کا ایک لمبا کش لیا اور منہ سے دھواں خارج کرنے کے بعد بھی باہر کی طرف سانس چھوڑتا رہا گویا بدستور دھواں نکال رہا ہو۔

"جانتے ہو ڈارلنگ میری تمہاری شادی کیوں نہ ہو پائی؟ اس لئے کہ میں تمہارے پاس بیٹھی ہوتی لیکن مجھے دیکھنے کے لئے تم اپنے ذہن میں دیکھنے لگتے۔ یہیں بیٹھے بیٹھے کر تنگ آجاتی کہ عجیب عاشق سے پالا پڑا ہے۔ عشق مجھ سے کرتا ہے پر متوجہ میرے تصور کی طرف رہتا ہے۔ تم نے میرا ایک تصور بنا رکھا تھا، اپنی مرضی کا تصور، اور اپنی اس پسند کو میری ذات پر محمول کر لیا تھا۔ دراصل تم اپنی ذات سے، اپنے تخیل سے، اپنے آپ سے پیار کرتے تھے، مجھ سے نہیں۔" مانی نے گویا اپنی بات کو ڈبونے کے لئے چائے کے کئی گرم گرم شکر آمیز تلخ جرعے حلق میں گرا لئے۔ "جب میری شادی ہوئی تو میں چاہتی تھی تم دیوانے ہو جاؤ، پر تم ٹس سے مس نہ ہوئے اور پھر میں انگلینڈ جانے لگی تو تم میرے شوہر سے اتنی محبت سے گلے ملے گویا وہ مجھے تم سے چھین کر تم پر احسان کر رہا ہو۔ تم ذرا بھی بے چین نہ ہوئے اور میں نے بے چین ہو کر سوچا کہ تم سے کبھی نہ ملوں گی، تم سے کوئی واسطہ نہ رکھوں گی، اپنے شوہر کی شکل اور خصلت کے بچے جن جن کر انہیں بڑا کرنے میں اپنی ساری عمر صرف کر دوں گی ——— مگر ——— مگر ———" مانی کی آنکھیں خشک تھیں، کچھ یوں، جیسے ابھی پانی سے بھر جائیں گی۔ "——— مگر گذشتہ سال سے کئی بار کئی جگہ تمہاری شکل میری آنکھوں کے سامنے گھوم گھوم گئی ہے۔ ایک بار تو کسی پارک میں ایک آدمی کا سایہ دیکھ کر یہی لگا کہ تم ہی ہو اور میں اپنے بچوں کو بھیڑ میں چھوڑ کر اس سائے کی طرف بھاگی اور اس شخص کے کندھے کو جا پکڑا اور وہ مجھے شاید ایسی ویسی سمجھ کر ہنسنے لگا ——— دوت، تمہارا جادو یا نامعلوم کیا میرے سر چڑھا رہتا ——— شاید اس لئے کہ میرے متعلق لگاتار سوچ سوچ کر تم نے اتنے فاصلے پر بھی میرے وجود کو اپنی ساحرانہ گرفت میں لے لیا تھا۔ آخر میں نے فیصلہ کر لیا کہ تم جہاں بھی ہو مجھے فوراً تم سے ملنا چاہیے۔ اگر میں تم سے نہ ملی تو ———" اس نے ایک نیا سگریٹ لبوں میں سیٹ کر لیا۔ "تو نہ جانے کیا ہو جائے گا۔" اس نے دیا سلائی جلائی تو آگ اتنی بیقراری سے نکلی جیسے فوراً بجھ جانا چاہتی ہو اور سگریٹ سلگا کر وہ مسکرانے لگی۔

"آؤ، مانی ڈیر، باہر لان میں بیٹھتے ہیں۔"

وہ کمرے سے نکل کر باہر باغ میں چلے آئے اور سائے میں رکھی ہوئی کرسیوں پر آبیٹھے۔

وہ اپنے آس پاس کے پودوں کی طرح اپنی اپنی جگہ ٹیکے ہوئے تھے اور اُگ اُگ کر لحظہ لحظہ بڑے ہو رہے تھے اور ان کا جی چاہ رہا تھا کہ ان کی شاخیں بڑھ بڑھ کر ایک دوسرے میں دھنس جائیں اور اپنی اپنی جگہ پر علیحدہ علیحدہ ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے مل جائیں۔ ان کا نچلا دھڑ دُور دُور ہی، پر ان کے سر ایک دوسرے پر جھک جائیں۔

"میں سوچتی ہوں دُوت، تم آدمی نہیں ہو، بس ایک خیال ہو۔"

دُوت کا اوپری دھڑ کسی مصنف کے رف اسکرپٹ میں تیزی سے رقم کئے ہوئے خمیدہ فجائیہ نشان کے مانند متحرک سی ایستادگی کا تاثر پیش کر رہا تھا۔

"اور اپنے خیال کو محسوس کر کر کے وجود پذیر ہوئے ہو ——— کاش تم اپنی کسی کتاب میں پیدا ہوتے، اور ہم ایک دوسرے کی پہچان کی صعوبت سے بچے رہتے، کیونکہ کتابیں میری دانست اور خواہش میں نہیں آتیں ——— کیا تمہارے لئے یہ ممکن نہیں دُوت کہ مجھے بھول جاؤ، اپنے ذہن میں میرے خیال کا گلا گھونٹ دو؟ ——— تمہارے خیال کے گورکھ دھندے سے نجات پا کر میری مکتی ہو جائے گی ———"

سادھو بدستور اپنا سگار پھونک رہا تھا اور اس کا وجود مانی کی طرف جھک جھک کر استفہامیہ خمیدگی میں منتقل ہو رہا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو دوت؟ میں یہاں ہوں، تمہارے خیال میں نہیں، یہاں اپنے جسم میں۔ ادھر دیکھو!"

دت سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور اس کی طرف دیکھنے لگا — "میں تمہاری طرف دیکھ رہا ہوں مانی، مگر مجھے لگ رہا ہے کہ اپنے ذہن میں جھانک رہا ہوں۔ میں تمہیں وہیں دیکھنے کا عادی ہو چکا ہوں۔"

"مگر ڈارلنگ، اس وقت میں تمہارے سامنے بیٹھی ہوں — یہاں! اپنے تصور سے نظر ہٹا کر میری طرف دیکھو، مجھے سمجھو! — سمجھو!"

دت نے اس کے چہرے پر اپنی نظریں جما لیں۔ یہ مانی! اس کی نوعمر خواہش کا پیکر، سراپا التجا! — نہیں، مانی اب وہ نہیں رہی جو تھی۔ اس کے چہرے کی تشنہ تازگی مرجھا رہی ہے، تشنگی سے بدحواس ہو ہو کر اپنا منہ بڑھاپے کے دامن میں چھپا لیا چاہتی ہے۔ اپنی محبوبہ میں اس تغیر کے شعور سے بے تاب ہو کر دت نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

"مانی!"

"ڈارلنگ!"

"مانی!" گویا ساری عمر مانی کو یاد کر کے اسے مانی تو یاد ہو پر مانی سے اپنی خواہش بھول چکی ہو۔

"کہو ڈارلنگ!"

دت کے ذہن میں بھونچال آ رہا تھا اور وہ سر و سامان کو تباہی سے بچا لینے کے لیے اپنا ذہن خالی کر رہا تھا۔ اپنی سب سوچوں کی گانٹھ اٹھا کر باہر رکھ دی تھی اور یہ تصویر بھی، مانی کی تصویر، یہ!

"مانی!"

"کہہ بھی چکو نا، ڈارلنگ!"

"تمہارے شوہر کا کیا حال ہے مانی؟" پروفیسر دت نے یکسر خالی الذہن ہو کر پوچھا:

محمد خالد اختر

زندگی کی کہانی

LIE DOWN, LIE DOWN YOUNG YEOMAN,
THE SUN GOES DOWN TO THE WEST.
THE ROAD ONE TREADS TO LABOUR
WILL BRING ONE HOME TO REST
AND THAT WILL BE THE BEST.

A. E. Housman.

یہ خزاں کی ایک پیلی اُداس شام تھی۔ ہم تین دوست ـــــ احسان، ثناء الحق اور میں مقامی میونسپل پارک میں ایک بنچ پر بیٹھے زرد پتوں کو ہوا میں کھڑکھڑاتے اور اُڑتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ وہ باغ کے قطعے میں سونے کے سکوں کی طرح ہر سو بکھرے پڑے تھے۔ سورج ڈوب رہا تھا اور اس کی آخری اٹکتی ہوئی کرنیں لمبے درختوں میں سے چھنتی ہوئی ہمارے بنچ پر اپنی مرتی ہوئی دمک پھینک رہی تھیں۔

شام کی اداسی ہمیں چھونے لگی۔ احسان اور میں ہم عمر اور ہم جماعت تھے۔ مقامی کالج میں سیکنڈ ایر کے طالب علم۔ ثناء الحق ہم سے دو تین سال بڑا تھا اور بی۔ اے فائنل میں پڑھ رہا تھا۔ ایک سینئر ہونے کی حیثیت میں ہم اسے قدر اور عزت سے دیکھتے۔ وہ ایک چھریرا، دراز قامت، خوبصورت نوجوان تھا ـــــ صحیح معنوں میں جوانِ رعنا، رنگ سرخی کی لہک لئے، آنکھیں نشیلی اور بڑی، ستواں ناک، قلمیں نیچے وکٹورین وضع میں کانوں کی لو تک آتی ہوئی۔ ہم کالج میں آکر پتلون کوٹ پہننے لگے تھے مگر ثناء الحق ہمیشہ اپنی اچکن، اونچے شملے کی پگڑی اور اپنے گاؤں کے موچی کی سلی ہوئی طلّے کی جوتی میں چلتا نظر آتا۔ وہ، سج سج کر ایک شاہزادے کے وقار سے چلتا اور فی الواقع کہانیوں کا شہزادہ لگتا ـــــ ان البیلے جوانوں میں سے ایک جن کے لئے لڑکیاں آہیں بھرتی ہیں اور غمِ محبت میں جلتی ہیں۔ ثناء الحق ایک مضبوط کردار کا نوجوان تھا۔ ہاں اسے اپنے آپ سے کچھ محبت تھی ـــــ اور اٹھتے ہوئے شباب کے کس لڑکے کو نہیں ہوتی؟ اس کی باتوں میں واقعی پھولوں کی سی باس تھی اور ایک موہنے والا سبھاؤ اور زندگی کا سوز و ساز ـــــ اور جب وہ موج میں ہوتا تو اپنے ہوسٹل کے بستر پر لیٹا پہروں ایسی باتیں کرتا رہتا جو سننے والے کے دل کو مسحور اور بے چین کر دیتیں۔ وہ ہر طبقے اور ہر عمر کے شخص سے آسانی سے گھل مل جاتا اور اسے اپنا دوست بنا لیتا۔ احسان اور میں ابھی معصوم الہڑ گدھے تھے۔ ثناء الحق زمانے کا سرد و گرم چشیدہ تھا اور وہ ہمیں اپنے انسانی نفسیات کے وسیع علم سے ششدر کر دیتا۔

اس شام وہ بالکل خاموش تھا اور ہوسٹل سے یہاں تک چلتے ہوئے اس نے ایک بھی بات نہ کی تھی۔ اس خاموشی پر ہم نے کوئی توجہ نہ دی۔

اس کی بہترین گفتگو کے فوارے ہوسٹل کے کمرے میں اس کے بستر پر سے چھوٹتے تھے اور باہر چلتے ہوئے وہ اکثر چپ ہو جاتا اور کسی گہرے خیال میں کھو جاتا۔ پھر اس کی زبان کی بجائے اس کی بڑی بڑی آنکھیں کام کرتیں اور وہ ایک پیدائشی جاسوس کی طرح زندگی کی رنگارنگی کو چپکے سے دیکھتا رہتا۔

احسان ان دنوں اس منزل میں تھا جب کسی کی محبت میں گرفتار ہونے کے لئے جی بے قرار ہونے لگتا ہے۔ دراصل اس عمر میں ہماری امنگیں کچی اور بے باک نہیں ہوتیں اور ہمارے جذبات خود ہماری اپنی ہی ذات میں مرتکز ہوتے ہیں۔ ہم اپنے آپ کو بے مثل سمجھتے ہوئے ایک اونچی خودرحمی سے خدا کی دھرتی پر پھرتے ہیں۔ احسان نے کالج کی لائبریری میں آسکر وائلڈ کی کہانیوں کی ایک کتاب لے کر پڑھی تھی اور یہ رُلا دینے والی میٹھی جذباتی کہانیاں اس کے دماغ میں تیز شراب کی طرح چڑھ گئی تھیں۔

"آسکر وائلڈ سب انگریز لکھنے والوں میں میرا محبوب ہے۔ اوہ! اس کی "ڈی پروفنڈس" اور ــــ وہ گلاب اور بلبل کی کہانی۔" احسان بولا

وائلڈ مجھے ان دنوں بھی اچھا نہیں لگتا تھا ــــ جھوٹے جذبات اور ذہین ضلع جگت کی ظرافت جو جلد باسی ہو جاتی تھی۔ وہ میری قسم کا مصنّف نہ تھا اور میں احسان سے اس معاملے پر جھگڑنے لگا۔ احسان نے کہا کہ تم محبت کے جذبات سے کبھی آشنا نہیں ہوئے اور اس لئے آسکر وائلڈ کی خوبصورتی کو محسوس نہیں کر سکتے۔ اس پر ہم میں تیز جھڑپ ہو گئی اور ہمارے مزاج برہم ہو گئے۔

ثناء الحق اس دوران میں اپنے پُراسرار طریق پر مسکراتا رہا۔ میں جانتا تھا کہ اس کا دماغ آسکر وائلڈ اور ہماری بحث سے ہزار میل دور ہے اور وہ کچھ اور سوچ رہا ہے۔ اس نے وائلڈ کو نہیں پڑھا تھا۔ اور اگر طوعاً کرہاً پڑھتا بھی تو بھی اس سے کچھ حاصل نہ کرتا۔ وہ کتابوں کے زیادہ پڑھنے پر یقین نہ رکھتا تھا۔ اگرچہ ٹیگور کی گیتانجلی کے انگریزی ترجمے کو اس نے بیسیوں بار پڑھا تھا اور اس کے کئی بند اسے ازبر تھے۔

جب احسان اور میں خوب لڑ چکے تو ہم برہمی کے انداز میں ایک دوسرے کو بیوقوف سمجھتے ہوئے خاموش ہو گئے۔ ہمارے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف شدید نفرت تھی اور آنسو تقریباً ہماری آنکھوں میں رکے ہوئے تھے۔ شام اب گہری ہونے لگی تھی اور نیلا جھٹپٹا درختوں کی چھدری ویران ٹہنیوں میں پھیلنے لگا تھا ایک پپیہا کسی باغ کے کونے میں سے بولنے لگی "تو دت تو دو"۔

ثناء الحق نے کہا "کیا تم ایک سچ مچ کی کہانی سنو گے؟"

"ہاں! ہاں!" میں نے کہا۔ "سناؤ"

احسان کا چہرہ بھی چمک اٹھا "ثناء الحق ضرور سناؤ کہانی۔"

ثناء الحق نے اپنی بڑی آنکھوں سے دُور درختوں کے دھندلکوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "اچھا سنو۔ یہ کسی کتاب کی کہانی نہیں۔ یہ وہ کہانی نہیں جسے آسکر وائلڈ یا کسی اور نے گھڑ لیا یا لکھا ہو۔ یہ ایک عام انسان کی کہانی ہے جسے قدرت نے خود اپنے قلم سے اڑتی ہواؤں میں لکھا۔ اس میں ایک سادگی اور ہمہ گیری ہے اور یہ ہر ایک کی کہانی ہو سکتی ہے۔ تمہاری یا میری۔ تم کہو گے کہ ہمارے مزاج اور طبیعتیں اور ستارے مختلف ہیں مگر حقیقتاً ایک ہی نوع کے حادثات ہم سب کو پیش آتے ہیں اور وہ ایک ہی سڑک ہے جس پر ہم اپنی منزل کی جانب سفر کرتے ہیں......"

ثناء الحق کچھ رکا ــــ گہرے استغراق میں احسان اور میں ہمہ تن گوش ہو گئے۔ باغ میں ایک مکمل سنّاٹا تھا ــــ گاہے گاہے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ کی آواز آتی اور جھینگر اور رات کے رفیق کیڑے اپنی مدھم مستقل الاپ سے سنّاٹے کو معمور کئے ہوئے تھے۔

"غالباً ۱۹۲۵ء کی بات ہے" ثناء الحق بولا۔ "میری عمر اس وقت کوئی ساڑھے چار پانچ برس کی ہوگی۔ میرے والد ان دنوں شجاع آباد میں نائب تحصیلدار تھے۔ وہ ہر سال ایک ماہ کی رخصت ضرور لیتے اور اسے اپنے آبائی گاؤں کھوہار میں گذارتے۔ زمینوں کی دیکھ بھال کرتے اور ایک

دہقانی سفید پوش کی طرح۔ سر پہ صافہ لپیٹے اور لٹھے کی چادر باندھے گاؤں کی گلیوں میں چلتے اور اپنے چوبارے کی بیٹھک میں دیہاتیوں کے مسئلے مسائل سلجھاتے۔ شجاع آباد میں تو وہ بالکل رعب داب والے سرکاری افسر ہوتے۔ ہمیشہ جامہ زیب، چست اور کوڑے کی طرح کرّا کردار۔ یہاں گاؤں میں آکر اپنے قرابت داروں اور عزیزوں کے ساتھ وہ بالکل بدل جاتے۔ ان کا ہی جیسا سادہ لباس پہنتے اور دیسی ہی پرسکون دیہاتی زندگی گذارتے۔ نائب تحصیلداری کی فوں فاں اور ٹیپ ٹاپ شجاع آباد میں ہی رہ جاتی۔ میرے دادا تب بقیدِ حیات تھے۔ ان کو ہمارے آنے کی اطلاع ہوتی اور جوڑا کریانہ کے چھوٹے برانچ لائن ریلوے اسٹیشن پر سواری کے لئے گھوڑیاں پہنچ جاتیں۔ مجھے یاد ہے کہ گھوڑیاں سواریوں سے کہیں زیادہ ہوتیں۔ تب سائیکل ابھی دیہات میں نامعلوم تھا۔ ایک عجوبہ۔ کوئی کام کی سڑکیں بھی نہ تھیں۔ ہر ایک گھر میں ایک دو گھوڑیاں ضرور ہوتی تھیں اور بیشتر لوگ ان پر ہی اپنے کاموں پر آتے جاتے۔ ریل پلیٹ فارم پر کھڑی ہوتی تو مراسی اور کمی ڈبے کے پاس دوڑے آتے۔ ہم بچوں اور سامان کو اتارتے۔ گھوڑیاں ہنہناتی ہوئی مسافر خانے کے باہر بندھی ہوتیں اور سامان کے لئے ایک دو خچر جتنے بڑے گدھے ہوتے۔ میرے دادا کی ایک گھوڑی تھی۔ برف کی طرح سپید۔ امیرانہ خو بو والی۔ بڑی نخریلی اور آتشیں مزاج۔ وہ اس کی لاڈلی تھی۔ اس کا نام ساوی تھا۔ میرے والد اس پر بیٹھتے۔ آدھ گھنٹہ کمیوں میں بحث ہوتی کہ کونسی گھوڑی اصیل ہے اور کونسی کھچری، اور جب ہم سب اصیل گھوڑیوں پر کسی ہوئی دیسی کاٹھیوں میں بٹھا دیئے جاتے تو گاؤں کی سمت لمبے اور آہستہ سفر کا آغاز ہوتا۔ سوائے ساوی کے ہر ایک گھوڑی کی باگ آگے آگے چلتے ہوئے کمی کے ہاتھ میں ہوتی۔ کھوہار جوڑے سے چار پانچ کوس ہے مگر اس سفر میں کوس ختم ہونے میں نہ آتے تھے۔ دوپہر کے چلے ہم کھوہار میں گہری شام پڑے پہنچتے۔ جب تنگ کاٹھیوں میں بیٹھے بیٹھے ہماری کمریں درد کرنے لگتیں اور کولہے چھلنی ہونے لگتے تو یہ چھوٹا قافلہ ستانے اور ٹانگیں سیدھی کرنے کے لئے سڑک کے کنارے رک جاتے۔ اس کافی خوفناک سفر کی کچھ تلافیاں بھی تھیں۔ ڈلہیانی سے آگے گذرتے ہوئے ہمیں پبی کی نیلی پہاڑیاں نظر آنے لگتیں اور ہمارے دل اچھلنے لگتے۔ ان کی طرف بڑھتے ہوئے ایک عجیب مسرت میرے دل کو گرفت میں لے لیتی۔ دوستو! تم کیا جانو میرے دیس کی پہاڑیاں کتنی خوبصورت ہیں۔ دنیا میں ایسی پہاڑیاں اور کہیں نہیں جیسی یہ پبی کی پہاڑیاں۔ بعض دفعہ اس سفر میں حادثے بھی ہو جاتے۔ کسی گدھے کی تنگ ڈھیلی ہو جاتی اور اس پر دھرے ہوئے بکس اور ٹوکرے نیچے سڑک پر لڑھک گرتے۔ تنگ کو کسنے اور اس پر پھر سے سامان جمانے میں آدھ گھنٹہ لگ جاتا اور ایک یار تو وہ گھوڑی جس پر میرا بھائی اور میں دونوں سوار تھے، بڑی کھچری نکلی۔ میرا بھائی آگے لگام پکڑے بیٹھا تھا (کن خوشامدوں سے ہم نے نور علی میراثی کو تیار کیا تھا کہ وہ لگام ہمیں پکڑا دے) میں اس کے پیچھے ہاتھ میں ایک چابی سے چلنے والے انجن کو پکڑے بیٹھا تھا۔ یکلخت گھوڑی بدکی اور سرپٹ بھاگ کھڑی ہوئی۔ میں تو دھکا لگنے سے نیچے زمین پر آرہا ـــ اسی طرح چابی والے انجن کو ہاتھ میں پکڑے۔ مجھے تھوڑی دیر کے بعد ہی پتہ چلا کہ میں گھوڑی سے گر گیا ہوں اور پھر میں رونے لگا۔ حالانکہ مجھے ذرا بھر بھی چوٹ نہیں لگی تھی۔ میرے بھائی کو گھوڑی کودتی پھلانگتی دور کھیتوں میں لے گئی اور اسے ایک کنوئیں کی منڈیر پر جا گرایا۔ اس کی پیشانی پھٹ گئی اور اس میں سے خون بہنے لگا۔

مگر اتنی صعوبتوں کے بعد جب ہم کھوہار میں اپنے آبائی مکان میں پہنچتے تو کیسی آؤ بھگت ہماری منتظر ہوتی۔ گھر کے سب دیئے روشن ہوتے اور نچلے دہیڑے میں ہماری دادی، خالائیں اور پھوپھیاں چمکتے چہروں سے ہماری بلائیں لیتیں۔ ڈیوڑھی سے گذرتے ہی دیوار کے پاس اوپلوں کی آگ پر دودھ کی پیتل کی مٹکی میں دودھ ہمیشہ کڑھتا رہتا تھا۔ ہماری دادی ہمارے پہنچتے ہی ہمیں کڑھے میٹھے دودھ کے گلاس پلاتی۔ ہمارے باپ کی گردن میں ہاتھ ڈال کر وہ اس کی پیشانی کو چومتی اور خوشی اور محبت سے رونے لگ جاتی۔ وہ بوڑھی اور کبڑی تھی مگر اس کے خدوخال پتلے اور تیکھے تھے اور میں نے اپنے بڑوں سے سنا ہے کہ وہ اپنی جوانی میں بڑی خوبصورت عورت تھی۔۔۔۔۔"

"ہاں" ثناء الحق نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا ...... "میں کھوہار میں پچھلی گرمیوں میں گیا تھا اور وہ گھر وہ گھر نہیں رہا جسے میں اپنے بچپن میں جانتا تھا۔ اب کے دیئے میرے جانے پر نہیں جلے اور آبائی حویلی تباہ اور شکستہ حالت میں تھی۔ صرف ہمارا پرانا میراثی نور علی وہاں طویلے میں اپنی کوٹھڑی میں رہتا ہے۔ خمیدہ اور بگلے جیسے سفید بالوں کے ساتھ۔ اس کی چہلیں اور مخول بھی اب وہ نہیں رہے۔ میں بعض دفعہ سوچنے لگتا ہوں کہ وہ سب اچھے مہربان چمکتے ہوئے محبت کرنے والے چہرے کہاں غائب ہو گئے — سب چلے گئے۔ وقت کے دھندلکے میں۔"

ثناء الحق اب خاموش ہو گیا، شاید گئی گذری چیزوں اور ہستیوں کو یادوں کے پردے پر دیکھتا ہوا۔ ایک بڑا زرد سا چاند درختوں کی اوٹ میں سے طلوع ہو رہا تھا اور اپنی آسیبی دمکاہٹ سے ٹہنیوں اور پتوں میں ضیا پاشی کر رہا تھا۔ ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا آیا اور زردیائے خزاں کے پتے ہماری طرف تیرتے ہوئے آئے۔ "میرا دماغ غیر حاضر ہو جاتا ہے اور میں کہیں کا کہیں نکل جاتا ہوں۔" ثناء الحق بولا "میں کیا کہہ رہا تھا؟"

احسان اور میں مسکرائے۔ یہ ہمارے دوست ثناء الحق کی پرانی عادت تھی۔ وہ ہمیشہ ایک واقعہ بیان کرنا شروع کرتا اور پھر بات سے بات نکل آتی اور وہ دور بھٹک جاتا۔ یوں اصل واقعے کا سرا کھویا جاتا اور ہم اس کی ان طولانی ڈائی گریشنز "DIGRESSIONS" ہی کی وجہ سے اس سے محبت کرتے تھے۔ اگرچہ ہم بھی کبھی کبھی غیر حاضر دماغ اور نیم خوابیدہ سے ہو جاتے اور قطعاً بھول جاتے کہ وہ ہمیں اصل میں کونسا واقعہ بتانے چلا تھا۔

"بولتے جاؤ میک ڈف" میں نے کہا "رات ابھی جوان ہے۔ ویسے تم ہمیں اپنی اور ایک انسان کی کہانی سنانے کا ارادہ رکھتے تھے۔"

"ہاں دوستو! اس بہک جانے کے لئے مجھے معاف کرو۔" ثناء الحق ہنسا "میں اب اپنی کہانی سے نہیں بھٹکوں گا — اگر میں بھٹکوں تو تم میرے کان کھینچ سکتے ہو اس طرح میں پھر سیدھی ڈگر پر آ جاؤں گا ...... ہاں تو اس ۱۹۲۵ء کے سال میں ہم اپنے والد کے ہمراہ کھوہار میں آئے ہوئے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میں ڈیوڑھی میں کھڑا لشن چند کھتری کی دوکان سے خریدی ہوئی چاند تارے والی رنگ دار کھٹ مٹھی ٹکیاں کھا رہا تھا۔ میرا بڑا بھائی میری منت کر رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ ابھی یہ ٹکیاں مجھ سے چھیننے کی کوشش کرے گا اور میں اتنا زور زور سے رونے لگوں گا کہ میری دادی اور اماں بھاگتی آئیں گی اور مجھے چپ کرانے کے لئے لشن چند کھتری سے دو آنے کی اور ٹکیاں مجھے لے دیں گی۔ دہیڑے میں ہماری چھوٹی پھوپھی سنگر مشین پر کھٹ کھٹ سلائی کا کام بڑے سگھڑاپے سے کر رہی تھی۔ وہ سارے گاؤں میں واحد سلائی کی مشین تھی اور میری چھوٹی پھوپھی اپنے سنگر کی مالک ہونے کے امتیاز کی وجہ سے کسی کو خاطر میں نہ لاتی۔ اتنے میں بھاگ بھری مصلن تیزی سے آئی اور دروازے میں کھڑی کھڑی کہنے لگی۔ "اے جیناں بی بی۔ شرپھودے گھر جاتک ہویا ای۔"

میری چھوٹی پھوپھی نے مشین پر اپنا ہاتھ روک کر پوچھا "ہیں! جان دے نی بھاگو۔"

"بی بی جینا۔ رب میرے دی سوں۔ بالکل سچ ہے۔ میں ابھی ابھی وہاں سے ہو کر آ رہی ہوں — آدھی رات کو شیر کی بچی نے جاتک جنا ہے اور نور ظہور کے وقت کرمے موچی نے خود مسیت جاتے ہوئے اسے بھینس کو دوہتے دیکھا۔"

میری پھوپھی بولی۔ "دفع اسے اس آفت دا ...... پر میں کچھ اور سوچ رہی ہوں۔ اس کا مرد اللہ داد پچھلے سال چھٹی پر کب آیا تھا؟"

بھاگ بھری مصلن نے کچھ سوچ کر حساب لگایا۔ "چدھرانی، مجھے چنگی طرح پتہ ہے کتنے پوہ میں۔ وہی مہینہ تھا جب ہاڑ آئے تھے اور یاد ہے مصلی کا کوٹھا ڈھ گیا تھا۔ اس مہینے تو چدھرانی ساقی ہماری گائے کالے سانپ کے ڈسنے سے مر گئی تھی۔ یہ منحوس بچو جب بھی گاؤں میں قدم دھرتا ہے کوئی نہ کوئی آفت ضرور آتی ہے۔"

"کتنیں۔ تو کتنے مہینے ہو گئے؟" میری پھوپھی انگلیوں پر گننے لگی۔ "ہن چانگن چڑھیا اے۔ چار اوپر دس مہینے ہوتے ہیں اور بچو بیاں کوئی پندرہ بیس دہاڑے رہا۔ ہائے نی بھاگو۔ یہ جاتک ہو کیسے گیا۔ پہلی وار بچے کو چار اوپر دس مہینے پیدا ہوتے سنا ہے۔ مرد کے بغیر جاتک اچاچی شرہبو تو دوسری حضرت مریم ہو گئی ...... توبہ توبہ!" میری پھوپھی نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"ہائے نی چدہرانی" مصلّن نے ناک پر انگلی دھری۔ "میں نے تو یہ سوچا ہی نہ تھا۔ مگر چدہرانی۔ شرہبو کے پاس اور کون مرد گیا ہوگا؟ مردوں کا تو اس سے بول نکلتا ہے۔"

"چپ کر رہو" میری پھوپھی مشین سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ "چل شرہبو دے جاتک نوں دیکھ آئیے۔"

وہ جانے لگیں تو میں بھی ضد کر کے ان کے ساتھ ہو لیا۔ ایک بچے کی پیدائش گاؤں میں ایک اہم واقعہ ہوتا ہے۔ راستہ بھر میں سوچتا رہا کہ پھوپھی کا دنوں کا حساب لگانے سے کیا مطلب تھا اور مرد کا عورت کے پاس جانے سے بچہ کیسے پیدا ہوتا ہے۔ ان دنوں مجھے پورا یقین تھا کہ بچے آسمان سے گرتے ہیں۔ جب بھی میں اپنی ماں سے پوچھتا کہ میں کیسے پیدا ہوا تو وہ پراسرار طریقے پر مسکراتی اور کہتی "لال! میں تمہیں ہزار بار بتا چکی ہوں کہ تمہاری بوڑھی دائی مائی بھاتاں تمہیں اپنی گود میں لٹائے آسمان پر سے ہمارے گھر میں کود گری تھی۔" ہمارے بعض بڑے مجھ سے اکثر سنجیدگی سے کہتے کہ مجھے میرے باپ نے مصلّیوں سے پانچ دس روپے میں خریدا ہوا ہے۔" ان بیانات میں تضاد مجھے حیران سا کر دیتا۔ پیدائش کا مسئلہ مجھ پر تب کھلا جب میں کافی بڑا لڑکا تھا، تم یقین کرو۔

ہم پھیرے کے پاس شرہبو کے کوٹھے میں گئے۔ وہاں کالے رنگ کے تہبند اور کالے کرتوں میں گاؤں کی بہت سی عورتیں شرہبو کے جاتک ہونے کی خبر سن کر آئی ہوئی تھیں۔ ایک لیپے پوتے کمرے میں جس میں سب دیہاتی کوٹھوں کی طرح ایک طاق پر تانبے اور المونیم کے چمکتے دمکتے برتن ایک دوسرے کے اوپر چنے تھے، شرہبو ایک کھاٹ پر بیٹھی بیٹھی ہوئے کپڑے میں لپیٹے اپنے بچے کو چھاتی سے دودھ پلا رہی تھی۔ شرہبو ایک چوڑے ہڈ کاٹھ کی خوفناک عورت تھی ـــ توے کی طرح کالی بھوت۔ موٹے اور بھدے خدوخال اور بال کھلے اور پریشان۔ وہ زیادہ لفظوں کی عورت نہ تھی اور جب وہ بولتی تو اس کی آواز کی کرختگی ایک کوے کی طرح لگتی اور اس کی ہمسائنیں کانوں پر ہاتھ دھرنے لگتیں۔ سب اسے اس کی کڑوی کسیلی زبان درازی سے ڈرتے ہوئے اسے اس کے حال پر رہنے دیتے اور اس طور اس سے بچتے جیسے وہ طاعون ہو۔ اس کے خاوند بجو اللہ داد نے اس کی بدکلامی اور درشت مزاجی سے تنگ آ کر لاہور میں چپکے سے ایک اور شادی کر لی تھی اور ہر کوئی کہتا تھا کہ اس نے ٹھیک ہی کیا ہے۔ کون سا مرد ایسی عورت کے ساتھ زندگی بھر نباہ کر سکتا ہے۔

شرہبو نے کوہی بھٹی آنکھوں سے ہمیں دیکھا اور بچے کو دودھ پلانے میں مشغول رہی۔

میری پھوپھی نے کہا "شرہبو! جاتک کی مبارک ہو۔ چن جیسا ہے، ماشاءاللہ۔ اس کے باپ کو اطلاع دے دی تھی؟"

شرہبو نے جل کٹ کر اپنے خاوند بجو اللہ داد کو ایک موٹی سی گالی دی "دادے داڑھی بگیا۔ وہ اس بھوتنی حرامزادی لاہورن کے ساتھ جھک مار رہا ہے اور اس کی جوتیاں اٹھاتا ہے۔ چٹی داڑھی اور آٹا خراب۔ اس بھوتنی کے گھٹنے چھوڑ کر وہ کیوں آئے گا۔ یہاں آئے تو سہی وہ کنجر۔ میں اس کے منہ پر چھتر نہ ماروں تو شرہبو نام نہیں۔"

"لیکن شرہبو۔ آخر وہ اس کا باپ ہے۔ اسے چٹھی تو لکھوا دو۔" میری پھوپھی نے کنکھیوں سے مصلّن بھاگ بھری کو دیکھا۔

"چٹھی لکھوائے میری جوتی" شرہبو بولی اور گالیوں اور پھٹکاروں کی ایک ندی اس کے موٹے ہونٹوں سے نکلی۔ دو تین عورتیں

توبہ توبہ کرنے لگیں

پھر جاگ بھری مصلّن سے نہ رہا گیا۔ وہ ٹھٹھکنے لگی۔ اس نے پوچھا۔ "نی سرفراز بیگم اللہ داد چھلیے کتے میں آیا آیا نا"۔

شرپھو تلملا کر اٹھی اور چیخنے لگی۔ "بھونے۔ تیرے وادے داڑھی ہگیا۔ تیرے خصم کو چوڑے جائیں۔ میں تیرا مطلب سمجھتی ہوں۔ تو میرے بچے کو حرامی بتاتی ہے۔ تو حرامی، تیری بے بے حرامی۔ تیری سات پیڑھیاں حرامی۔ وے اسمٰعیل۔ اس چڑیل کو بتا۔ تیرا باپ کتنیں کے کے بعد پوہ میں رات کی رات مجھ سے معافی مانگنے آیا تھا یا نہیں اور جانتے ہوئے میں نے اس کی کیسی گت بنائی تھی۔ تو مجھے نہ پکڑتا او دیچ میں پڑتا تو میں اس کی داڑھی کا بال بال نوچ لیتی اور وہ اس بھونی لاہورن کے پاس کھودا کھسرا بن کر جاتا۔ وے اسماعیل تونے اپنی بے بے کو اس دن پکڑ کر بڑا ظلم کیا!"

اسماعیل بجو اللہ داد کا بڑا کوئی سترہ سال کا ایک اکھڑ، ہونق سا لڑکا تھا۔ کچھ کچھ باؤلا اور بالکل اپنی ماں پر گیا تھا۔

اسماعیل نے کہا "چاچا پوہ میں آیا تھا اور بے بے کو میں نہ روکتا تو وہ اس کی جن بچہ کہانی کر دیتی......"

شرپھو نے پھر مصلّن اور سب عورتوں پر ایک نفرت بھری، زہریلی، جھلسا دینے والی نگاہ ڈالی۔ اتنے میں کسی نے کہا کہ مولبی ہو دیں آئے ہیں۔ بدویٹوں والی مسجد کا امام مسجد میاں غوث محمد اندر آیا۔ وہ ایک امام مسجد کی بجائے ایک کرویل دہقانی پھیرباو لگتا تھا اور اس وقت بھی ہاتھ میں ایک گڈریے کی لاٹھی لئے ہوئے تھا۔ میاں غوث محمد کی عملیت کی سارے گاؤں میں بڑی دھاک تھی۔ اسے پکی روٹی کے سارے شعر ازبر تھے۔

غوث محمد نے لاٹھی کھٹکھٹاتے ہوئے اپنے کرخت دیہاتی لہجے میں عورتوں کو ہٹنے کے لئے کہا۔ "کڑیو۔ ایک طرف ہو جاؤ۔ شرپھو۔ اللہ کی تم پر رحمت ہوئی ہے۔ اللہ تعالے فرماتے ہیں" اور اس نے پنجابی کے کچھ اشعار بچوں کی برکت کے بارے میں پڑھے۔ "ابھی اس کے کان میں کسی نے اذان تو نہیں دی؟"

شرپھو نے کہا۔ "مولوی جی۔ آپ کے سوا اذان کون دیتا"۔

"بھینے" مولوی غوث محمد رینگا "حضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے کان میں پہلی آواز کلمہ کی جانی چاہیئے........"

مولوی غوث محمد نے نومولود کے کان میں اذان دی اور اذان سے فارغ ہونے پر شرپھو اٹھی اور بھڑولی میں سے ایک رومال میں دو روپے مولوی کو گذرانے اور مولوی غوث محمد کچھ مزید مسئلے مسائل سمجھا کر اور دونوں لڑکیوں کے سروں پر ہاتھ پھیرنے کے بعد چلا گیا۔ اس کے بعد ہم بھی زیادہ دیر نہ ٹھہرے اور میری پھوپھی کے ایک روپیہ شرپھو کی ہتھیلی پہ رکھنے کے بعد ہم گھر کو لوٹے۔ مجھے واپسی پر اپنی پھوپھی سے یہ پوچھنا یاد ہے کہ اگر بچہ آدھی رات کو آسمان سے گرا تھا تو وہ چھت میں سے کیسے شرپھو کی گود میں آگیا۔

"ثنا دل۔ کیا الٹے پلٹے سوال تم پوچھتے رہتے ہو" میری پھوپھی نے کہا۔ "جب تم بڑے ہو گے تو تمہیں خود بخود معلوم ہو جائے گا۔" اور اس نے جاگ بھری مصلّن کو کہنی ماری، آنکھ میں شرارت لئے ہوئے۔

میری چھوٹی پھوپھی ایک ہنس مکھ لاابالی طبیعت کی عورت تھی ——— زندگی کی رنگینی اور کھیل کود سے معمور۔

ثنا دالحق پھر کچھ دیر کے لئے گم سم ہو گیا اور کچھ توقف کے بعد بولا۔ شرپھو نے اس بچے کا نام عبداللہ رکھا گیا۔ مجھے یہ خبر بھی

بھاگ بھری مصلّن نے آکر دی۔ یہ نام بچے کے نانا بوڑھے اور درشت کلام رضی اکبر نے تجویز کیا تھا جو ایک پنشن یافتہ معلم تھا اور اب کھوبار کے دیہاتی ڈاک خانے میں ٹکٹوں کی فروخت اور ڈاک کی ترسیل کی ذمہ داری اسے سونپی گئی تھی۔ سب پوسٹ ماسٹر اس کے عہدے کے لئے کچھ زیادہ ہی اونچا نام ہے۔ اسے اس کام کے لئے ڈاک کے محکمے سے صرف پندرہ روپے تنخواہ ملتی تھی۔ کچھ وہ گاؤں والوں کی چٹھیاں لکھ کر کما لیتا۔ خوب کیریکٹر تھا۔ کڑوا اور زہریلا، اپنی بیٹی ستر بھو کی مانند۔ اس کا ایک بیٹا جس کا نام عبداللہ تھا اوائل شباب میں فوت ہو گیا تھا اس لئے اس نے اپنے بیٹے کی یاد میں اپنے نواسے کا نام بھی عبداللہ رکھا۔

بجّو اللہ داد بچے کی پیدائش کے کوئی تین چار دن بعد گاؤں آیا۔ غالباً اس کے خسر نے اسے پوسٹ کارڈ سے اطلاع دے دی ہو گی۔ اسے دیکھ کر اس شخص کو داد دینی پڑتی تھی جس نے پہلے پہل اسے بجّو کا لقب دیا تھا۔ یہ نام اس پر ٹوپی کی طرح فٹ بیٹھتا تھا۔ میں نے اسے گاؤں میں کئی بار دیکھا ہے اور ایک بار اس کے ہاں کسی کام سے لاہور جانے کا اتفاق بھی ہوا —— ہو بہو بجّو کی شکل —— موٹے خدوخال کا ماتمی چہرہ۔ مہندی سے رنگی بوسیدہ داڑھی۔ سر پہ کھڑکی دار میلے چکٹ کلاہ پر بندھی پگڑی اور بدن پہ ایک پرانی دقیانوسی اچکن پہنے جسے اس نے کئی برسوں میں نہ بدلا تھا۔ اس کی ساری ذات کرم خوردہ تھی۔ جب میں لاہور میں دل محمد روڈ پہ اس کے بالکنی والے غلیظ مکان پر اس سے ملا تو اپنی دوسری بیوی سے اس کا ایک بچہ ہو چکا تھا اور گھر میں اس کی حیثیت ایک بچے کو کھلانے والی دائی کی تھی۔ مجھے بیچارے بجّو پر رحم آیا اور اسے بچے کو ہاتھوں میں لوری دیتے ہوئے دیکھ کر ہنسی بھی —— آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا......

"میں تمہارے کان کھینچنے لگا ہوں ثناء الحق!" میں نے کہا۔

ثناء الحق ہنسا...... " ہاں بجو اللہ داد گاؤں میں آنے اور ستر بھو کے استقبال کا منظر ایسا تھا جسے گاؤں والے برسوں میں نہیں بھولے۔ مصلن بھاگ بھری خود وہاں موجود تھی۔ بجو ایک بھوری مریل گھوڑی پر سوار کچی سڑک پر ٹخ ٹخم آتا تھا گاؤں سے تھوڑے فاصلے پر ستر بھو اسے مل گئی جو اپنے گدھے پر بیٹھی ہاتھ میں کلہاڑی اٹھائے بدھوں میں سے لکڑیاں کاٹتے جا رہی تھی۔ ذرا اس سین کا تصور کرو۔ بجو کا چہرہ اپنی خوفناک بیوی کو آتے دیکھ کر فق ہو گیا اور اس نے باگ موڑ کر درختوں کی اوٹ میں سے نکل جانے کی کوشش کی لیکن ستر بھو اس کے سر پہ آ پہنچی۔ کلہاڑی ہاتھ میں لئے۔ روکھے بال پھیلائے وہ گدھے پر سے پھلانگ کر اتری اور سڑک کے بیچ گھوڑی کے رستے میں اپنی ٹانگیں پھیلا کر کھڑی ہو گئی۔ بجّو کے لئے بچنا مشکل تھا۔ اس نے موت اپنے سامنے دیکھی۔ ستر بھو نے کلہاڑی کو بڑے وحشیانہ طریقے سے ہلایا اور موٹی گالیوں اور لعن طعن کی ایک نہ ختم ہونے والی بوچھاڑ اس کے موٹے ہونٹوں سے چھوٹی۔ اس منظر کو دیکھنے والے اس عورت کی زرخیز دماغی پہ حیران ہو گئے اور کانوں کو ہاتھ لگانے لگے —— یہ عورت کوئی انسان کی بچی نہیں تھی یہ تو کوئی چڑیل تھی

"دادے داڑھی لگیا۔ بجو یا کھوہ دیا۔ خدا تیری بیڑیوں میں وٹے ڈالے۔ تو نے مجھ پہ سوکن ڈالی ہے؟ میرے گھر کی چوکھٹ کے اندر قدم تو دھر۔ تیری بوٹی بوٹی نہ کر دوں تو میں رضی اکبر کی دھی سرفراز نہیں......"

بیچارے بجّو نے کچھ دیر تو یہ صلواتیں سنیں۔ پھر اپنی جان کو خطرے میں دیکھ کر اس نے گھوڑی کو ایڑ لگا کر بھگا دیا اور ستر بھو اپنے گدھے پہ سوار ہو کر اپنے ننگے پاؤں نیچے لٹکائے اپنے فرار ہوتے ہوئے خاوند کے پیچھے گئی —— گالیاں اور طعنے بکتی اور اپنے چوڑے مردوں کے سے سینے پہ دوہتڑ مارتی / اور اپنے بال نوچتی۔ اس طرح بجّو اور اس کی بیوی گاؤں کی گلیوں میں سے گذرے۔ اور جس کسی نے بھی دیکھا بعد میں کہا کہ کھوبار میں خاوند کی ایسی خاطر پہلے کسی جنانی نے نہ کی تھی۔ بجو رات کو اپنے ایک شریک کے گھر رہا۔ میں نہیں جانتا کہ اس نے نومولود کو دیکھا

یا نہیں۔ مگر دوسرے دن منہ اندھیرے اس نے گاؤں کو چھوڑ دیا۔ جب تک شربھو جیتی رہی اس نے گاؤں میں قدم رکھنے کی جرأت نہیں کی۔"

چاندنی درختوں کی چوٹیوں کے اوپر اٹھ آیا تھا اور اس کی سفید نقرئی روشنی ہم بنچ پر بیٹھے ہوئے دو تین دوستوں کو نہلا رہی تھی۔

میں نے پوچھا "کیا شربھو کا بچہ حرامی تھا؟"

"میں نہیں کہہ سکتا" شاد الحق نے کہا "وہ حرامی تھا یا نہیں۔ میری پھوپھی جیسا اور بعض دوسری عورتوں کو اس کے حرامی ہونے کا یقین تھا۔ (مگر بعد میں مَیں نے اس بات کی کافی کھوج کی)۔ بجو اللہ داد پوہ میں رات کی رات آیا ضرور تھا۔ وہ اپنی بیوی کے پاس گیا یا نہیں، کوئی نہیں جانتا ــــ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ حرامی تھا یا نہیں۔ وہ خدا کی اس دنیا میں بعینہٖ اس طریقے سے آیا جس طریقے سے ہم سب آئے ہیں ــــ ایک عورت کے بطن سے ــــ اور شادی کیا ہے۔ مصطفےٰ کمال کہا کرتا تھا کہ ایک ملکر گدا ملاؔ کے چند فقرے پڑھنے سے ایک عورت اور مرد کو اکٹھے ہونے کا لائسنس مل جاتا ہے اور اس اتحاد کو برکت اور پاکی مل جاتی ہے۔ جب ان فقروں کے بغیر ایک عورت مرد کے پاس جاتی ہے تو لوگ شور مچاتے ہیں کہ یہ بدکاری ہے۔ یہ گناہِ کبیرہ ہے۔ اور دیکھو تو بات ایک ہی ہے۔ کتنے ہی بچے بے محبت شادیوں کے ذریعے پیدا ہوتے ہیں مگر کوئی انہیں برا نہیں جانتا ــــ میں نے کئی باپوں کو دوسری عورت کے ساتھ گھر بسانے کے بعد اپنی پہلی بیوی کی اولاد سے قطعاً لاتعلق ہوتے دیکھا ہے......"

احسان اور میں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے۔ شاد الحق اپنے خاص قدرتی عقیدوں کو ہوا دے رہا تھا اور ہم جانتے تھے کہ اگر ہم نے اسے ٹوکا تو مروجہ اخلاق کے خلاف اس کی تقریر گھنٹے بھر تک جاری رہے گی۔

"تم کہانی سے بھٹک رہے ہو میک ڈف" میں نے کہا۔

"معاف کرنا ــــ میں کہاں تھا؟" اس نے پوچھا۔

"شربھو کے بچے کے حرامی ہونے یا نہ ہونے پر تم ہمیں فطرتی اخلاقیات کا درس دینے لگے تھے" میں نے کہا۔

"ہاں۔ ہاں ــــ" شاد الحق نے یاد کیا "اس طرح عورت شربھو کے پیٹ سے عبداللہ اس رات پیدا ہوا.......... ایک پھول کی مانند کھلتا ہوا۔ وہ اس چمکتے دن اور اندھیری رات کی دنیا میں آیا......

"......سال گذرتے گئے۔ والد صاحب کی تبدیلی وہاڑی ہوگئی اور میں چوتھی جماعت میں چڑھ گیا۔ ہر سال مئی یا جون میں ہم اپنے وطن اپنے دادے دادی کے پاس آتے۔ اپنی پھوپھیوں اور خالاؤں سے ملتے۔ گاؤں کے بچوں کے ساتھ دیہاتی کھیل کھیلتے۔ گھوڑیوں کی سواری کرتے۔ اپنے پنکھے نما داڑھی والے ماموں جلال کے ساتھ بیتی کے دامن میں ڈھاکوں سے پٹے ہوئے میدان میں خرگوش کے شکار پر جاتے ــــ

میرا ماموں جلال اب فوت ہوچکا ہے ــــ کیسا ہی عجیب آدمی وہ تھا۔ اس کی حویلی کی ڈیوڑھی میں ہمیشہ دو اونچے کانوں والی، پتلی اور باریک خاکستری رنگ کی کتیائیں بندھی رہتی تھیں۔ ان کی وہ وہ خاطر داری ہوتی تھی کہ الامان و الحفیظ۔ تین چار مراثی ان کی خدمت کے لئے وقف تھے۔ کوئی انہیں نہلا رہا ہے اور رگڑ رہا ہے۔ کوئی بیٹھا چمٹے سے ان کے کانوں کے اندر سے چیچڑ نکال رہا ہے۔ ان کے لئے خاص بوٹیوں سے مرکب طاقت کے کھانے پکتے تھے اور دن میں ایک بار یہ کتیائیں گھی اور شکر کی چوری کھاتی تھیں۔ میں نہیں جانتا کہ میرے ماموں کے دوسرے شوق کیا تھے۔ وہ مسئلے مسائل بتانے میں کافی شہرت رکھتا تھا اور گاؤں والے اس سے مسئلے پوچھنے آتے تھے۔ "مولبی جی۔ وضو کے بعد تمباکو

چھلکنے سے وضو ٹوٹتا ہے یا نہیں؟ مولبی جی۔ آج میں نے غصّے میں اس نیک بخت رشیدہ کو تین دفعہ طلاق کہہ دی۔ ہمارا نکاح ٹوٹا یا نہیں۔" ہم جب بھی جاتے اسے کتیاؤں کی دیکھ بھال، علاج معالجے میں مصروف پاتے۔ اپنی بیوی اور اپنے لمبے گھامڑ سے اکلوتے لڑکے ربّو سے وہ قطعاً لاتعلق تھا۔ میری چھوٹی پھوپھی زینب بی بی اس کے گھر تھی۔ وہ سارا دن بیٹھی سنگر مشین پر کھٹ کھٹ کرتی رہتی اور گاؤں کے لئے ایک ٹیلرنگ شاپ کا مقصد پورا کرتی۔ وہ ایک ہنس مکھ، لاابالی اور باتونی عورت تھی۔ ورنہ ماموں جلال کو نانی یاد آجاتی ——— ہم اس ماموں کو "کتیاں والا ماموں" کہا کرتے تھے۔ اور ان کے دنوں میں گاؤں کی آدھی آبادی، پیدل اور گھوڑیوں پر سوار سب اِدھر اُدھر کے کتوں کو لئے ماموں جلال کی سرکردگی میں خرگوش کے شکار پر نکل آتی تھی۔ وہ شکار کے منظر مجھے نہیں بھولتے ——— کتیوں کا خرگوش کی بو پاکر رک جانا اور کان کھڑے کر لینا۔ سراغیوں کا بھربھری ریت پر جانور کے پنجوں کو دیکھ دیکھ کر اس کی چھپنے والی جگہ دریافت کرنا اور اس میں گھس کر زور زور سے "ہو ہو سیڑ ہو ہو" چلاّنا۔ سہمے ہوئے خرگوش کا جھاڑی میں سے تیر کی طرح بھاگ پڑنا اور کتوں کی فوج کا ڈھاکوں کی بھول بھلیوں میں سے اس کا تعاقب کرنا۔ اکثر ماموں جلال کی کتیاں جو پاؤں کی تیز تھیں اور خاص اس کام کے لئے سدھائی ہوئی تھیں، خرگوش کو دبوچنے میں دوسروں سے بازی لے جاتیں۔ اوہ۔ وہ ڈھاکوں اور پبّی کی پہاڑیوں میں پھرنے کا لطف اور تعاقب کی دھڑکن اور گرماہٹ ——— دوستو! وہ کیا مسرت اور بے فکری کے دن تھے ...... وہ اچھے لوگ، وہ ان کے اشغال اور باتیں اب وقت کی اوٹ میں چھپ گئے ہیں اور فنا کی حدود میں ہمارا ——— اپنے۔ بیٹوں اور پوتوں کا ——— انتظار کر رہے ہیں۔ میں پچھلے ایک سال سے وطن نہیں گیا۔ اب وہاں کوئی ہے جس کے پاس آدمی جائے۔ مگر کسی وقت یوں ہی بیٹھے بیٹھے میرے دل میں ہوک اٹھتی ہے اور میری بستی کی نیلی رنگین پہاڑیاں مجھے ایک طاقتور مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ یہ قوم کی یا ملک کی محبت جسے حب الوطنی کا بلند بانگ نام دیتے ہیں کہیں بے معنی تو نہیں؟ آدمی دراصل اپنے مولد و مسکن، اپنے خطّے سے محبت کرتا ہے جس کی مٹی کی بو اس نے سونگھی، جس کی ہواؤں میں اس نے سانس لیا، جہاں سے اس کا خمیر اٹھا۔ کوئی حقیقت میں ایک ملک سے محبّت نہیں کرتا۔ سکاٹ لینڈ والے اپنے قبیلے اور اپنی ہیدر سے سرخ ہوتی ہوئی پہاڑیوں کے گیت گاتے ہیں۔ دولتِ برطانیہ کے نہیں جس پر سے سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ ایک صحرائی بدّو صرف اپنے صحرا کی ریتوں، کھجوروں اور خیموں سے محبّت کرتا ہے۔ قوموں اور ملکوں کی باتیں کرتے ہوئے کہیں ہم اپنے آپ کو دھوکا تو نہیں دیتے؟

"یار کہانی سناؤ جو تم نے شروع کی تھی" احسان نے کہا "اگر ثناء الحق تم ایسے ہی بھٹکتے رہے تو یہ کبھی ختم نہ ہوگی۔ گیارہ بجے کے بعد ہوسٹل کا پھاٹک بند ہو جائے گا اور ہمیں دیواریں پھاندنی پڑیں گی۔"

"ہاں میک وِٹ" میں بولا۔ "مجھے تمہارا یہ بھٹک جانا اچھا لگتا ہے مگر اب کافی دیر ہو چلی ہے اور مجھے کچھ سردی سی لگ رہی ہے۔"

"ہا۔ ہا" ثناء الحق نے ہونکا بھرا ...... "میں کہاں تھا؟"

ہم نے اسے بتایا اور وہ پھر اپنی کہانی کی طرف لوٹا۔

"ہاں ...... میری عمر تب نو سال کی ہوگی۔ میں چوتھی میں تھا اور ہم گاؤں میں آئے ہوئے تھے۔ ایک دن میری چھوٹی پھوپھی جس کے ہم بڑے دوست تھے مجھے چھپڑے سے پرے ایک شادی کے گھر لے گئی۔ جب ہم واپس آرہے تھے تو ہم شرفو کے باپ بوڑھے سنگی رضی اکبر کے پوسٹ آفس کے پاس سے گذرے۔ پوسٹ آفس کیا تھا ——— مکان کے باہر ایک سرخ لیٹر بکس لٹکا تھا۔ نیچے ایک چٹائی پر ایک صندوقچی اور قلمدان سامنے رکھے پوسٹ ماسٹر صاحب بیٹھے تھے اجلے بھلے اور دنیا جہان سے بیزار۔ گٹھیلا میانہ جسم، سر پر پگڑ، مہندی لگی بھرواں داڑھی مونچھ سے سجا درشت ہدہدی چہرہ۔ کتنی لمبی ناک تھی رضی اکبر کی۔ وہ صندوقچی میں سے ایک عورت کو دینے کے لئے کارڈ نکال رہا تھا مگر ان

بد دلی سے۔ چٹائی کے سرے پر جوگئے رنگ کے کرتے میں ایک آدھ ننگا چار سال کا بچہ لیٹا تختی پر اب ت گھسیٹ رہا تھا۔ اس کے بال کٹے ہوئے تھے۔ چہرہ گول اور دلچسپ اور اس کی آنکھوں میں قدرتی شرارت اور ہنسی تھی۔

"دے شاول۔ تمہیں پتہ ہے یہ جاتک کون ہے؟" میری پھوپھی نے پوچھا۔

"نہیں۔ مجھے پتہ نہیں پھوپھی جی" میں نے کہا۔ "اس کا کیا نام ہے؟"

"یہ شرپھو بلا کا لڑکا ہے عبداللہ" میری پھوپھی نے کہا "تمہیں یاد ہے چار درجے کی بات ہے۔ تم یہاں تھے اور میں شرپھو کے گھر تمہیں لے کر آئی تھی۔"

"مجھے اچھی طرح یاد ہے ـــــ" اور پھر میں نے عبداللہ کو دیکھتے ہوئے زور سے کہا "پھوپھی جی۔ پھوپھی جی۔ یہ تو کھچو ہے۔"

عبداللہ کانے کا قلم اپنے بائیں ہاتھ میں پکڑے اپنی طرف سے خوش خلقی کی کوشش کر رہا تھا۔

عبداللہ نے کھچو کے لفظ پر اپنی آنکھیں تختی پر سے اٹھائیں اور منہ کھول کر مجھے ایک چمکیلی مسکراہٹ دی مگر رضی اکبر جس نے اپنے نواسے کے متعلق یہ لفظ سن لیا تھا بھلا اس ہتک کو کیسے جانے دیتا۔

اس نے ایک رینگتی آواز میں کہا "تے تسیں ملوانیا۔ کچھ ہو دو گے"۔

میری پھوپھی نے وار کو بڑی مضبوطی سے سنبھالا اور پھر بظاہر بڑی خوش طبعی سے ہیں ہیں کر بولی۔ "یہ میرا بھتیجا سچ کا ہے اور ہمارے دادکے سب سچے ہیں۔ صراط مستقیم پر چلنے والے اور سیدھے کام کرنے والے۔ حلال کے سب سچے ہوتے ہیں میاں رضی اکبر"۔

"کرنے۔ جاجا۔ راہ لے" رضی اکبر نے نفرت اور حسد کی آنکھیں اٹھائیں اور گھیں گھیں لفظ اس کے موٹے ہونٹوں سے جلتے ہوئے انگاروں کی طرح نکلے۔ "میں تجھے بھی جانتا ہوں اور تیرے دادکوں کو بھی۔ یہیں گھاس مارا کرتے تھے۔ میری زبان نہ کھلوا"۔

ایک اور عورت کو کارڈ دیتے ہوئے رضی اکبر کہنے لگا۔ "راجو مصلّن! تو روز آ کر ایک تین پیسے کا کارڈ لے جاتی ہے۔ تو کارڈ نہ لکھے تو تیری مصلّی کے دٹ نہیں پڑنے لگیں گے۔ تو سمجھتی ہے سرکار نے ڈاک خانہ تیرے لئے کھولا ہوا ہے؟

عبداللہ نے اپنے نانا کے خفگی بھرے الفاظ کو بڑے لطف اور مزے سے سنا۔ یہ اس کے لئے باقاعدہ تفریح تھی۔ اس نے میری طرف مسکرا کر مجھے اپنا ہمراز بنایا جیسے کہہ رہا ہو۔ "دیکھو راجو مصلّن کی کیا گت بن رہی ہے"۔

جب میری پھوپھی اور میں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اس خشگیل بوڑھے آدمی سے رخصت ہوئے تو میری پھوپھی نے کہا۔ "عبداللہ خدا جانے ان خشکی چوڑوں کے گھر کیسے پیدا ہو گیا۔ وہ ان میں سے نہیں لگتا۔ مزاج یا شکل کوئی بھی چیز تو اس کی ماپیا پہ نہیں۔ پتہ نہیں پھوں شرپھو اس کو کہاں سے لے آئی"۔

میں بعد میں اکثر وہاں سے گذرا کرتا۔ میری دو بیوہ خالائیں اس طرف رہتی تھیں اور وہ مجھ سے بےحد پیار کرتیں۔ سیاہ گاڑھے کے لیے چولے اور سیاہ تہبند میں یہ خالائیں جب بھی میں جاتا گھی اور شکر کا شیرہ گھول کر مجھے کھلاتیں۔ کتنا مزیدار وہ ہوتا تھا! ان دنوں بس کافی بیٹو تھا۔ ان کی البتہ پوپلے موہنوں سے میری بلائیں لینا مجھے ناپسند تھا۔ میرے وہاں سے بار بار گذرنے کی ایک وجہ ایسی تھی کہ تم ہنسو گے۔ میں لیٹر بکس کو دیکھنا چاہتا تھا۔ سرخ اور چمکیلا لیٹر بکس! جو ایک آدمی کی طرح گول مٹول تھا اور جس کا ایک وچھتے دار منہ تھا جس میں سے وہ کارڈ اور لفافے ہڑپ کر جاتا تھا۔ لیٹر بکس گاؤں کے ملگجے پھیکے رنگوں میں ایک بھڑکتی ہوئی آگ کی مانند تھا ـــــ تم پھر ہنسو گے۔ شاید بچپن

میں میری اس سرخ گول ڈبے سے شیفتگی کا اثر ہے کہ میں اب بھی جب ایک لیٹر بکس کے پاس سے گذرتا ہوں میرا دل تھوڑا سا اچھلتا ہے اور زندگی چمکیلی اور پُرمسرت لگنے لگتی ہے —— اور پھر یہ خیال کہ تم اس لیٹر بکس میں خط ڈالو تو وہ کئی سو میل سفر کرتا جاتا ہے! لیٹر بکس۔ ہا۔ کتنے بچھڑے۔ دور دراز پڑے ساتھی اس کی بدولت ملتے رہیں ——

"یہ لیٹر بکس پر بڑا اچھا ایسّے ہے میک ڈف۔ اس کے متعلق تمہاری شاعری ہم پھر کبھی سنیں گے —— اب کہانی سناؤ.....!"

باغ کے پاس ہی پولیس اسٹیشن میں گھنٹے پر ضربوں کی آواز آئی۔ ایک۔ دو۔ تین —— دس۔ ابھی سے دس! اور ہوا میں خنکی تھی۔

اچھا میں مختصر ہونے کی کوشش کروں گا۔ مجھے لیٹر بکس کے نیچے بیٹھے ہوئے خشکیل خمیدہ پوسٹ ماسٹر اور ننھے منے تختی لکھتے ہوئے یا پاس ہی کھیلتے ہوئے لڑکے میں کچھ کشش سی لگتی تھی۔ میں دور سے انہیں دیکھتا گذر جاتا۔ عبداللہ سے دوستی کرنے کو میرا دل چاہتا تھا مگر میں بڈھے کی بدمزاجی سے ڈرتا تھا۔ دوسرے میری دادی کو رضی اکبر اور اس کے خاندان کے خلاف کچھ پرانے گلے تھے اور اس نے مجھے ہدایت کی تھی کہ میں ان کے گھر نہ جایا کروں۔ جب کوئی لفافہ یا پوسٹ کارڈ منگوانا ہوتا تو میری دادی ہمیشہ نورے مراثی یا کسی اور سے منگواتی۔ اسی طرح جو خط آتے ان کو لینے کے لئے بھی کوئی کمی بھیجا جاتا۔ اسے دو تین چکر کاٹنے پڑتے کیونکہ میری دادی سے بدلہ لینے کے لئے بوڑھا رضی اکبر پہلے پھیرے پر کسی کو یہ کہہ کر جھڑک دیتا کہ "میں نے ابھی چھانٹی نہیں کی" یا "میرے کام میں ہرج ہوتا ہے میں اپنے وقت پر چھانٹی کروں گا۔" حالانکہ گاؤں میں بہت کم چٹھیاں آتی تھیں اور وہ بھی ہفتے میں دو بار۔

ایک دفعہ میں نے عبداللہ کو لیٹر بکس کے نیچے اکیلے بیٹھے ہوئے پایا —— اپنے نانا کی نقالی میں پوسٹ ماسٹر بنے ہوئے۔ بوڑھا آدمی غالباً باہر بروٹیوں میں گھاس چھیلنے گیا ہوا تھا یا کسی شریک کے ہاں کوئی جائداد کا جھگڑا طے کرنے۔ عبداللہ تختی پر آڑے ترچھے حروف میں قلم پر زور دے دے کر ابجد کی مشق کر رہا تھا۔ مجھے شرارت سوجھی۔

میں اس کے پاس گیا۔ "پوسٹ ماسٹر۔ مجھے دو پیسے کا کارڈ تو دینا۔"

عبداللہ نے اوپر مسکراتے ہوئے دیکھا۔

"تمہارا نانا کہاں ہے؟"

"دانتے....."

میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔ "تمہیں الف ب لکھنی آتی ہے؟"

"کیوں نہیں" میں نے فخر سے کہا۔ یہ تو میں نے پہلی جماعت میں سیکھی تھی۔ مجھے سو تک پہاڑے بھی آتے ہیں اور انگریزی میں اے۔ بی۔ سی لکھ سکتا ہوں۔ سی۔ اے۔ ٹی کیٹ۔ آر۔ اے۔ ٹی ریٹ...... اور میں تمہاری طرح کھچو نہیں ہوں۔"

وہ یک لخت زور زور سے پکارنے لگا۔ "بے بے۔ بے بے۔ میاؤں کا لڑکا مجھے کھچو کہتا ہے۔"

میں نے اسے منت کرکے چپ کرایا اور پھر اس کی تختی پر خوشخط الف ب لکھنے لگا۔ پھر میں نے اسے بتایا کہ اے۔ بی۔ سی کیسے لکھتے ہیں اور کیٹ کیسے۔

"میرا نام لکھو۔"

میں نے اس کا نام لکھا۔ وہ بڑی خوشی اور تعجب سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں بے بے کو جاکر دکھا آؤں۔"

"ٹھہرو بے بے کو پھر دکھا دینا۔ یہ میرا نام ہے —— ثناء الحق —— دیکھو کتنا شاندار" اور میں نے اس کے نام کے ساتھ اپنا نام لکھ دیا۔

پھر خیال آنے پر میں نے آگے یہ الفاظ لکھے ...... "دوست بیلی"۔

میں نے اسے آدمی اور خرگوش اور گھوڑے کی بھدی الٹ سلٹ تصویریں تختی پر بنا دیں۔

"یہ گناہ ہوتا ہے" اس نے کہا "میاں جی کہتے ہیں کہ آدمی کی تصویر بنانا گناہ ہوتا ہے اور اللہ میاں اس پر بڑے خفا ہوتے ہیں ــــ تم نے اللہ میاں دیکھے ہیں؟"

"ابھی تک تو نہیں دیکھا۔ بڑے نیک لوگ ہی اللہ میاں کو دیکھ سکتے ہیں"۔

"بے بے کہتی ہے اللہ میاں ہر جگہ ہوتے ہیں۔ میں انہیں درختوں اور چھپرے کے پاس ڈھونڈتا ہوں۔ مجھے تو نظر نہیں آتے ــــ اُن کی داڑھی ہوتی ہے؟"

"اللہ میاں کی شکل نہیں ہوتی ......"

"شکل نہیں ہوتی!" یہ بات عبداللہ کو بڑی عجیب لگی پھر اس نے کہا "ہماری بہیں نے کٹی دی ہے چلو تمہیں دکھاؤں۔ بہیں پر میاں جی نے کہا تھا تم یہیں بیٹھے رہنا۔ کوئی لفافے لے جائے اور پیسے نہ دے ...... اور مودھے پانڈی کا لوکا ہے نا نانا۔ کل شام کو وہ اس لاڑے بکس میں روڑے ڈالتا رہا۔ میاں جی نے اسے خوب مارا۔"

اس طرح ہم باتیں کرتے رہے جواب مجھے یاد نہیں۔ وہاں صندوقچی کے پاس ایک کاغذ میں سوراخ کرنے والی مشین تھی۔ عبداللہ نے اس سے مجھے سوراخ کر کے بتایا۔ یہ مجھے بڑی عجیب و غریب بات لگی اور ہم پوسٹ ماسٹر کے ایک نئے نویلے سفید کاغذ کو مشین چلا چلا کر سوراخوں سے چھلنی کرتے رہے۔ سوراخوں کی جو گول گول کترنیں نکلتی تھیں وہ ہمارے لئے سونے سے زیادہ قیمتی تھیں۔ ہم ان کو بعد میں بانٹنے کے لئے سنبھال سنبھال کر رکھتے جاتے۔ وقت اڑتا گیا۔ اتنے میں میں نے نظر اٹھائی تو سامنے سے ہاتھ میں مڑے ہوئے سرے والا عصا لئے کھوہار کا پوسٹ ماسٹر اپنی گھٹتی چال سے چلتا آ رہا تھا۔ میری تو جان نکل گئی۔ وہ وہیں سے ریتکا۔ "یہ میانوں کا لڑکا آج کیا لینے آیا ہے؟" ممکن ہے اس نے اسے اپنی طرف سے خوش طبعی ہی سے کہا ہو اور خوش آمدید کے طور پر۔ مگر میں اتنا ڈرا کہ وہاں سے سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگا ــــ اپنی قیمتی کترنوں کو بھول کر۔ بعد میں مجھے یقین ہے کہ عبداللہ نے اسے بتایا ہوگا کہ مشین سے اس کے کاغذ میں سوراخ بھی میں نے کئے ہیں اور تختی پہ جاندار چیزوں کی تصویریں بھی میں نے بنائی ہیں۔ بوڑھا ضرور بڑبڑایا ہوگا مگر میرا خیال ہے اس نے عبداللہ کو معمولی سرزنش کی ہوگی۔ وہ دوسروں کے لئے بڑا اکھڑ اور کھردرا تھا، اپنے خون پوست کے لئے نہیں اور اپنے چھوٹے خوبصورت نواسے کے لئے تو اس کا دل خاص طور پر نرم تھا۔

لیکن ایک بار میں بوڑھے رضی اکبر کی سخت خفگی کا سبب بنا اور وہ بھی مفت میں۔ عبداللہ چند دوسرے بچوں کے ساتھ چھپرے پر شیدان کھیل رہا تھا۔ میں وہاں سے گذرا تو ان کے ساتھ کھیل میں شامل ہو گیا۔ شیدن تم نے کھیلی ہوگی۔ زمین پر ایک لکیر سے ایک مستطیل کھینچ لیتے ہیں جسے خانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ کوئی چھوٹا کوئی بڑا۔ خانوں کے نام بھی عجیب و غریب ہوتے تھے۔ ایک خانہ نانی ہوتا تھا۔ ایک ٹاپو۔ ایک گھر گھراؤ اور چھوٹا سمندر اور اس سے آگے بڑا سمندر۔ کھیلنے والا پہلے پہلے خانے میں گیٹی پھینکتا ہے اور وہ ایک ٹانگ پہ پھدکتا ہوا پاؤں سے گیٹی کو باہر سرکاتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ گیٹی لکیر کے اوپر نہ آئے اور نہ ہی پاؤں لکیر پہ پڑے ورنہ کھلاڑی آؤٹ ہو جاتا ہے اور دوسروں کی باری آ جاتی ہے۔ نانی کے اوپر سے پھلانگ کر گذرنا پڑتا ہے اور اس میں گیٹی چلی جائے تو پھر پہلے خانے سے شروع ہونا پڑتا ہے۔ میں نے اپنی باری پر پہلے خانے کلیئر کر لئے۔ نانی میں پھینکی اور خانوں میں سے پھدکتا ہوا چلا تو عبداللہ نے شور مچایا کہ میرے پاؤں کی ایڑی لکیر پہ آ گئی ہے۔ میں نے اس سے

انکار کیا اور عبداللہ کہنے لگا کہ تم روند مارتے ہو ہم تم سے نہیں کھیلتے۔ اس نے گتی اٹھائی اور گھر کی طرف چل دیا۔ میں نے اس کی بڑی منت کی اور اسے یقین دلاتا چلا کہ میرا پاؤں لکیر پر نہیں لگا تھا۔ مجھے کھیل میں مزا آ رہا تھا..... اور میں جیت رہا تھا۔ عبداللہ بھی ضدی بلا تھا۔ نہیں مانا۔ آخر میں نے غصے میں چڑ کر کہا "نہیں کھیلنا تو چڑھ ......" سب گاؤں کے بچے لڑکے اور بڑے ایسے لفظ بغیر سوچے سمجھے استعمال کرتے ہیں مگر عبداللہ نے تو بات کا بتنگڑ بنا لیا اور گھر اپنے نانا اور بے بے سے جا کر میری شکایت کی کہ ثناء الحق نے اسے گندی گالی دی ہے۔ میں تو وہاں سے چلا آیا مگر بوڑھے رضی اکبر اور شر بھوپنے بڑا طوفان مچایا..... "کون جمیا اے ساڈے دُتے نوں گالیاں دینے والا۔ اب یہاں آئے تو سہی۔" پوسٹ ماسٹر نے اس پر ہی اکتفا نہ کی بلکہ شام کو اپنے نواسے کے ہمراہ چوبارے پر میرے دادا کے پاس آیا — برسوں میں شاید پہلی بار۔ اس نے میرے دادا کو کہا کہ ثناء الحق نے عبداللہ کو یوں یوں کہا ہے۔ جب دادا نے مجھ سے پوچھا تو بات سچ تھی اس لئے میں انکار نہ کر سکا۔ میرے دادا نے مجھے خوب جھڑکا کہ تو نے یہ گندی باتیں کہاں سے سیکھیں اور یہ کہ اسے علم نہیں تھا کہ مجھے بری عادتیں پڑ گئی ہیں۔ میں بڑا شرمندہ ہوا اور اس شرارت کی ساری جڑ عبداللہ نے میری اس سرزنش پر خوب بغلیں بجائیں۔

میں اس گرما میں پھر اس کے ساتھ کھیلنے نہیں گیا — چغل خور۔ شکایتی رقعہ کہیں کا!

میں نے کیٹس کو کوٹ کیا — میرا دل دکھتا ہے اور ایک سلا دینے والی سکتے کی کیفیت مجھ پر طاری ہوتی ہے..... میاں ڈف!"

احسان نے کہا "یار ہمیں دیوار پھاندنی پڑے گی۔ اگر پھر کیڑے سے گئے تو رپورٹ ہو جائے گی۔"

ثناء الحق نے اپنی کہانی جاری رکھی (اپنی گذری ہوئی یادوں کے حزن میں ڈوبی ہوئی۔ جس کا ایک ایک لمحہ وہ دوبارہ جی رہا تھا۔ وہ ایک طاقت ور شراب کے نشے میں سرشار انسان تھا۔ "اور ہر سال ہم اپنے وطن میں تقریباً ساون بھادوں کے مہینوں میں آتے تھے جب ہمیں چھٹیاں ہوتی تھیں۔ میں اکثر عبداللہ کو دیکھتا۔ کبھی گاؤں کے بچوں کے ساتھ گولیاں اور ریشدن اور گلی ڈنڈا کھیلتے۔ کبھی چھپڑ میں اپنی بھینس کو نہلاتے۔ کبھی دریا کے اس پار واڑے میں اپنے جانور (؟) کو چراتے۔ درانتی لئے گھاس چھیلنے کے لئے بر دٹیوں کی طرف جاتے یعنی وہ مختلف کام کرتے جو سب غریب دیہاتی لڑکے کرتے ہیں اور جو میری رائے میں خشک الفاظ رٹنے یا سود مرکب کے سوال حل کرنے سے کہیں زیادہ صحت مند اور مفید کام ہیں۔ درختوں کی کونپلوں کی طرح وہ سورج اور بارش کی چھینٹوں میں بڑا ہوتا رہا۔ جب بھی ہم ملتے ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے اور ادھر ادھر کی باتیں کرتے جواب مجھے یاد نہیں۔ ہم دونوں اس کی چغل خوری کو بھول گئے تھے اور وہ اب ہمارے درمیان ایک ہنسی کی بات تھی۔ اس نے قرآن حفظ کرنا شروع کیا اور گاؤں کے اسکول میں بھی جانے لگا۔ ایک دفعہ اس نے اپنے منشی کے بولنے کی ہو بہو نقالی کر کے ہمیں بڑا ہنسایا۔ اس کا نام غلام رسول تھا مگر وہ مشہور منشی چچڑ ملہ کے نام سے تھا۔ اگرچہ اس کی کوئی خاص وجہ نہ تھی۔ عبداللہ نے بڑی ہنستی ہوئی آنکھوں سے مجھے بتایا۔ "ثناء ول۔ یہ چچڑ لڑکوں کو بڑی سزا دیتا تھا۔ جب کسی لڑکے کو سبق نہ آتا تو اس کے پاس آ کر بیٹھ، بغل یا ٹانگوں پر زور زور سے چٹکیاں لیتا۔ لڑکے اپنے درد سے چلاتے اور چچڑ بڑا خوش ہوتا۔ سب اس سے ڈرتے تھے۔ ایک دن اس نے میرے ساتھ بھی ایسا کیا۔ میں نے ثناء ول بدلے میں چچڑ کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کی انگلی پر زور سے چک مارا۔ پھر تو چچڑ صاحب کو نانی یاد آ گئی۔ زور سے "ہاؤ" کیا۔ وہاں چچڑ نے مجھے دھمکی دی کہ بے وقوف بدتمیز نالائق، میں تیرے نانا رضی اکبر سے تجھے پٹواتا ہوں۔" وہاں سے بھاگا اور ڈاک خانے میں میاں صاحب کے سامنے میری شکایت کی کہ آپ کے نواسے نے گستاخی کی ہے اور میری انگلی کاٹ لی ہے۔ میاں صاحب کی عادت تم جانتے ہو۔ انہوں نے کہا "چچڑ! تیرے کرتوت ہی ایسے ہیں اس

کی سزا مجھے ملی۔ ورنہ عبداللہ بڑا نیک ہے۔" میری بے بے چچڑ کی ہال ہال سن کر بدھائی لئے آگئی اور پھر تو آگے آگے مسٹر چچڑ اور پیچھے میری بے بے مدھائی اٹھائے اور چچڑ کی الیتو نیسی کرتی ہوتی، وہ چچڑ کو راجے کے کھوہ تک چھوڑ آئی۔ وہ دن اور آج کا دن۔ چچڑ نے پھر کسی لڑکے کی چٹکیاں نہیں لی۔ مجھے آتا دیکھتا ہے تو کترا کر نکل جاتا ہے۔ چچڑ کی ایک اور عادت یہ تھی کہ اچھے کھاتے پیتے لڑکوں کو تلوں تالی بجا کر بلاتا "ادے مظفرا — (تالی) جا اپنی بے بے سے تازہ مکھن لے آ" یا "اوئے نانی۔ شیطان دی نانی (تالی) آج منشی جی کو مسّی روٹی کھلا" جس طریقے سے عبداللہ یہ باتیں سناتا تھا اور جس مسخرے انداز میں۔ ہنسی سے بل پڑ پڑ جاتے تھے۔ ایک دفعہ میں نے گاؤں کے بچوں کو ٹھیکری پر کھیلتے ہوئے دیکھا۔ انہوں نے عبداللہ کی سرکردگی میں نانی کو گھیر رکھا تھا اور تالیاں بجا بجا کر ایک ساتھ کورس میں گا رہے تھے۔

نانی کُتّے دی نانی جلالپور جانا پیا

"نانی بیچارا رونے لگا اور پھر حلقے میں کوئی سوراخ دیکھ کر نکل بھاگا۔ سب چھوٹے شیطانوں کا گلہ "نانی کُتّے دی نانی چلاتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ آگے آگے عبداللہ۔ میں نے جا کر نانی بیچارے کو ان شرارتی لڑکوں سے نجات دلائی۔ تب میری بارہ تیرہ سال عمر تھی اور میں خاصا بڑا اور تگڑا تھا۔

غالباً ۱۹۳۶ء کی بات ہے۔ میں نے اسلامیہ کالج لاہور میں فسٹ ایر میں داخلہ لیا۔ داخلے کے بعد ہی گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہو گئیں اور میں وطن چلا گیا۔ دادا جی تب علیل تھے اور میرے جانے کے کوئی ایک ماہ بعد وفات پا گئے۔ آخری دم تک ہوش میں رہے اور اپنے بستر سے ایک بادشاہ کی طرح ہدایتیں دیتے۔ میں گھوڑی پر اسی طرح کہیں دن ڈھلے وہاں پہنچا۔ دادا سے مل کر نیچے آیا تو پھوپھی جیناں نے باتوں باتوں میں بتایا کہ مہینہ پہلے شرچھو مر گئی ہے۔ شرچھو کی موت بھی بالکل اس کی دبنگ جفاکش اور وحشیانہ زندگی کے عین مطابق تھی۔ وہ آدھی رات کو اپنے گدھے پر پچی سے لکڑیاں کاٹ کر لا رہی تھی کیونکہ دن کو وہاں محکمہ جنگلات کے بیلداروں کی پہرہ داری رہتی تھی۔ اندھیری کالی سیاہ رات تھی اور یہ دو ہتڑوں جٹنی دلیر عورت اکیلے دم پہاڑی سے اتر رہی تھی کہ ایک مریادھے (جنگلی سور) نے اس پر حملہ کیا۔ شرچھو کے ہاتھ میں کلہاڑی تھی اور اس شیرلی بچی نے اس سے مریادھے کا جی دار مقابلہ کیا۔ جنگلات والوں نے بعد میں پتہ چلایا کہ انہوں نے اس رات (بستی میں) "یا علی مدد" کا نعرہ سنا تھا اور اس کے بعد ایک عورت کی عجیب ہولناک چیخیں اور بددعائیں۔ اس مقابلے کو کسی نے نہیں دیکھا اور کوئی نہیں جانتا کہ کیا ہوا اور شرچھو خونخوار جنگلی سور سے کیسے لڑی مگر دوسرے دن صبح گاؤں کے باہر شرچھو کا گدھا لکڑیوں کے گٹھے سے لدا ہوا دیکھا گیا۔ اپنی ہنکانے والی کے بغیر۔ اس سے ہر ایک کو تعجب ہوا اور جب شرچھو دیر تک نہ آئی تو بوڑھا رضی اکبر اس کے بیٹے اور دو پوتے گاؤں کی ایک جماعت کے ساتھ تلاش میں بستی میں گئے۔ ایک پہاڑی پر چند بیٹھے اور اچھلتے ہوئے گدھوں سے سراغ پا کر وہ ادھر گئے اور وہاں ایک جھاڑی کے پاس انہوں نے شرچھو کا زخمی مسخ شدہ اکڑا ہوا جسم پایا۔ آنکھیں ستائشانہ انداز میں کھلی ہوئی پھیلے ہوئے ہاتھ کی مٹھی کے ساتھ کلہاڑی جس پر خون جما ہوا تھا۔ پاس ہی دو قدم پر جنگلی سور سر میں کلہاڑی کے پھل کا قاتل زخم لئے مردہ پڑا تھا۔

میری پھوپھی جیناں نے کہا "جو کچھ کہو۔ تھی شرچھو کوئی جن کی بچی۔ جو عورت ایک مریادھے کو کلہاڑے سے مار سکتی ہے اس کے جگرے اور زور کو دھن ہے۔"

لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے ساتھ جوڑا سے جایا گیا اور جب اسے دفنایا گیا تو نہ صرف کھوہار بلکہ آس پاس کے گاؤں کے لوگ بھی آئے تھے۔ میری پھوپھی نے ڈرامائی انداز میں یہ واقعہ سنایا تو میں نے محسوس کیا کہ شرچھو جانے جانے گاؤں کی تاریخ میں ایک اور LEGEND چھوڑ گئی ہے جو پشتوں میں نہیں بھلائی جائے گی۔

دوسری صبح میں شرچھو کے گھر اس کے بیٹوں سے تعزیت کرنے اور فاتحہ پڑھنے گیا۔ رضی اکبر اپنے بیڑ بکس کے نیچے چٹائی پر بیٹھا تھا۔ سنجیدہ اور

شکستہ۔ وہ اپنی بیٹی کی موت کے صدمے سے دنوں میں بہت بوڑھا ہو گیا تھا اور پہلے سے بھی زیادہ رد کھا اور چڑچڑا۔ اس کی آنکھیں خالی اور کوری نظر آتی تھیں جیسے وہ پتھر کی ہوں۔

میں نے جا کر کہا "اسلام علیکم چاچا جی"۔

اس نے پہلے مجھے اس طرح دیکھا جیسے نہیں پہچانا۔ پھر اس نے کہا "وعلیکم السلام۔ آؤ جی۔ جی آیاں نوں۔ لفافے کا رڈ لینے آئے ہو"۔ وہ اچھی طرح میرے آنے کا مقصد جانتا تھا۔

"نہیں چاچا جی۔ اجازت دیں تو بیٹھ جاؤں۔ ماسی سرفراز کے انتقال کا سن کر بڑا افسوس ہوا۔ بڑی شیردل عورت تھی۔ مشیت ایزدی کے سامنے کوئی چارہ نہیں"۔

"مشیت ایزدی رضی اکبر دے خاندان واسطے ای رہ گئی ہے"۔ وہ بڑبڑایا اور پھر ایک زہرخند کے ساتھ اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔

میں نے کہا کہ ہر ایک کی زندگی لکھی ہوتی ہے اور سب کو باری باری جانا ہے۔

"لیکن کئی تو ایہاں دھرنا مار کر بیٹھے ہیں۔ ایہہ بڈھے نیاز احمد ہوریں حالی جیندے نے۔ مرے نہیں"۔

اپنے دادا کے بارے میں اس کا یہ حوالہ ایک جلتا ہوا انگارہ تھا مگر میں اسے چبا گیا۔ رضی اکبر کا غالباً بڑھاپے کے صدمے سے دماغ چل گیا تھا۔

میں نے کہا "چاچا جی۔ آپ کی اس بات کے بعد مجھے فاتحہ نہیں کہنی چاہیے۔ مگر سرفراز بیگم آپ کی بیٹی تھی۔ میں مرحومہ کی فاتحہ کہنے آیا ہوں۔

میں نے ہاتھ اٹھائے۔ اس نے سرسری اور بے دلی سے ہاتھ اٹھائے اور ہم نے فاتحہ پڑھی۔ فوراً بعد رضی اکبر نے کہا "نیاز احمد کے پاس میرے نواسوں کی کچھ زمین گروی رکھی ہوئی تھی جس پر وہ قبضہ کر بیٹھا ہے۔ اس کو کہو کہ میرے نواسوں کا حق نہ مارے اور اس سے پہلے کہ فرشتہ اجل اس کی روح کو دوالڈر کرے اس ظلم سے توبہ کرے"۔

بوڑھے کی باتوں نے میرا دل بڑا میلا کیا۔ میں نے تحمل سے کام لیا اور اٹھتے ہوئے اس سے پوچھا "عبداللہ کہاں ہے؟"

"عبداللہ ــــ حافظ عبداللہ۔ وہ واڑے پٹھے کاٹنے گیا ہوگا"۔

میں وہاں سے نہر کے پار واڑے میں گیا۔ سورج چمک رہا تھا اور اناج کے ادھ کٹے کھیت سنہری دھوپ میں نہا رہے تھے۔ ایک باڑ کے پاس میں نے عبداللہ کو ایک ٹیکری پر دیکھا وہ ایک درانتی سے کچر کچر گھاس کاٹ رہا تھا۔ ایک دیہاتی لڑکے کی طرح تازہ دم اور صحتمند۔ اس کے چہرے پر طمانیت اور سکون تھا اور ہونٹوں پر ماہیا کی گنگناہٹ۔

"آؤ بھائی ثناول۔ کدآئے ہو؟"

ہم نے ہاتھ ملائے۔ وہ مجھ سے چار پانچ سال چھوٹا تھا۔

"میں تمہارے نانا کے پاس فاتحہ پڑھنے گیا تھا۔ اس نے بتایا کہ تم واڑے میں گئے ہو"۔

"بے بے نے مرپا دھے کو مار ڈالا"۔

"ہاں مجھے پتہ لگ گیا تھا۔ تمہاری بے بے بڑی بہادر تھی"۔

"جگنیا والا دل تھا بے بے کا......" وہ پھر درانتی چلانے لگا "ثناول میں نے قرآن حفظ کر لیا ہے"۔

"حافظ عبداللہ بن گئے ہو گویا"۔

"اور میں اب بنجسن کے سکول میں جاتا ہوں گھو بار میں تو صرف پانچ جماعتیں ہیں۔ بنجسن میں ہائی سکول ہے۔ مجھے بھی اے۔ بی۔ سی آگئی ہے۔ وٹ از یور نیم۔ ہاؤ ڈو یو ڈو۔ دی ٹو بگل مائی شو" اور وہ فخر سے مسکرایا۔

پھر وہ بولا "تنا دل۔ یہ جو ہوائی جہاز اڑاتے ہیں کیسے بنتے ہیں؟"

"کیسے کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ میرا دل کرتا ہے میں ہوائی جہاز اڑایا کروں۔ ہوائی جہاز مجھے بڑا پسند ہے پر میاں جی کہتے ہیں وہ گر پڑتے ہیں"

"ہاں گر تو پڑتے ہیں"۔ میں نے اسے دو تین ہوائی جہازوں کے گرنے کے حادثات سنائے۔ جرمن زیپلن کا قصہ بھی جسے ہوا میں آگ لگ گئی تھی۔ ہم گھاس کی کتر کترا اور پرندوں کی چہچہاہٹوں میں بہت سی باتیں کرتے رہے۔ وہ سوال پوچھتا تھکتا نہ تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ بائیسکوپ کیا ہوتا ہے۔ اس نے زینب بی بی کے گھر بھونپو والے گراموفون کے ریکارڈ سنے تھے اور مجھ سے پوچھا کہ اس میں کوئی گانے والی کس طرح چھپی ہوتی ہے۔ اتنی باتیں ہم نے کیں۔

میں نے کہا "تم درانتی سے گھاس بڑی تیزی سے کاٹتے ہو"

"تم کاٹو۔ بڑا آسان ہے" اور اس نے درانتی میرے ہاتھ میں دے دی۔

میں نے گھاس کاٹنے کی کوشش کی مگر اسے اتنا آسان نہ پایا۔ وہ ہنسنے لگا اور پھر اس نے مجھے اس کا گر سمجھایا کہ درانتی کو اس طرح پکڑتے ہیں اور اس رخ چلاتے ہیں اور یہ کہ درانتی کا پھل پہلے ٹھیک کر لینا چاہیے اور پھر کسی پتھر پر تیز۔ میں نے پھر کوشش کی تو اپنا ہاتھ تھوڑا سا کاٹ لیا۔ خون بہنے لگا۔ اور عبداللہ نہر کے کنارے سے مٹھی پر ریت لے آیا جسے اس نے زخم پر بکھیر دیا۔ "پہلی دفعہ ہاتھ ہر کسی کا کٹتا ہے" اس نے میری حوصلہ افزائی کی "تم میرے ساتھ آیا کرو۔ میں تمہیں نشانہ سکھا دوں گا۔ میں اب گھر کے بہت سے کام خود کرتا ہوں۔ پہلے تو میری بے بے تھی۔ میں اٹیرن سوت بھی کات لیتا ہوں اور موچے بھی گانٹھ لیتا ہوں مگر ہوائی جہاز اڑانا مجھے نہیں آیا"

"ہوائی جہاز تمہارے پاس ہے کہاں؟"

"تمہارے پاس ہے؟"

"ہاں۔ اگلے سال میں آؤں گا اور ہم دونوں اسے اڑایا کریں گے۔ گاؤں کے اوپر اور بیٹی کے اوپر"

"ہاہا۔ ہاہا" وہ درانتی پھینک کر خوشی سے ناچنے لگا۔ اور پھر اس نے شکایت کی کہ میرے پاس تھا تو میں اس پر کیوں نہیں آیا۔ ریل گاڑی میں کیوں۔ میں نے کوئی مناسب عذر کیا۔

ہم واپس ایک بڑا سا گٹھا لے کر آئے اور پھر ہر کے پاس پھر ملنے کا وعدہ کر کے لوٹ گئے۔

ایک بار میں پھر اسے ملا۔ میں ساوی گھوڑی پر اپنے ایک رشتہ دار کو ملنے بنجسن جا رہا تھا۔ راستے میں سڑک پر عبداللہ اور اس کے پانچ چھ ساتھی بستے بغل میں دابے پیدل سکول کو رواں تھے۔ میں نے اس کو گھوڑی پر اپنے پیچھے بٹھا لیا۔ ساوی گھوڑی (میں نے کہا ہے امیرانہ خو بو کی وضعدار گھوڑی تھی اور بعض وقت وہ اتنی پر کینہ ہو جاتی تھی جتنی کوئی گھوڑی ہو سکتی ہے۔ مجھے اپنی پیٹھ پر سواری کرانے سے وہ خوش نہیں ہوتی تھی اور گویا اضطراراً اور مجبوراً ایسا کرتی تھی۔ اب جب میں نے عبداللہ کو زین کے پیچھے نمدے کے تہہ پر بٹھایا تو ساوی نے اسے ناپسند کیا۔ وہ بپھری۔ اس کے نتھنے غصے سے پھڑکنے لگے۔ وہ اگلی ٹانگیں اٹھا کر ہمیں گرانے کی نیت سے کودی۔ مگر میں نے اسے لگام سے قابو رکھا اور رکابوں میں پاؤں مضبوطی سے جمائے جیسا

کر تو رے مراثی نے مجھے سکھایا تھا۔

"دیکھو۔ دیکھو" عبداللہ نے کہا "ساوی خوشتاں کر رہی ہے"

میں ابھی اچھا سوار نہیں تھا اور ساوی کی متلون مزاجی سے ڈرتا تھا۔ میں دل میں ڈر گیا لیکن ظاہراً بڑی بہادری سے کہا۔ "اس حرامن کو کبھی کبھی جنون چڑھتا ہے۔ میں ابھی اس کو سیدھا کرتا ہوں۔"

جب ساوی ہمیں گرا نہ سکی تو وہ بپھری ہوئی اپنی خودسری سے پوری میں ہو گئی۔ میں اس کی ایک آنکھ میں غصے اور کینے کی دمک دیکھ سکتا تھا اور اگرچہ میں نے عبداللہ پر رعب ڈالنے کے لئے بڑے مشاق شاہسوار کا طور اختیار کیا جو گھوڑوں کی رمزوں اور چالوں سے واقف ہو مگر دل میں ڈر رہا تھا۔ میرا پسینہ چھوٹ گیا۔ عبداللہ نے کہا "بھائی شاہ ول۔ تمہیں گھوڑے کی سواری نہیں آتی۔ اسے کھڑا کرو۔ کھڑا کرو..... دُر۔ دُر۔ ساوی یہ کیا کرتی ہے۔ دُر۔ دُر۔"

ہم ایک رستے پر جا رہے تھے جس کے ایک طرف کیکر کے کانٹوں کی باڑ تھی۔ ساوی نے کہا کیا کہ اپنے بدن کو باڑ کے ساتھ ساتھ رگڑ کر چلنے لگی تاکہ ہمیں کانٹے چبھیں۔ وہاں سے وہ پل کے پاس نہر کی پٹڑی پر آئی۔ اسی طرح کودتی ہوئی شرارت پر آمادہ۔ اور میں اپنی سستی بھول گیا تھا۔ کیونکہ میرا میرا خیال تھا کہ اس کا ارادہ ہمیں نہر میں پھینکنے کا ہے مگر اس کا ارادہ یہ نہ تھا۔ صرف وہ برے نومشق سواروں کو بھانپ لیتی تھی

وہ پٹڑی پر بھاگی۔ ہم اس کی پیٹھ پر جمے رہے۔ عبداللہ سے کہا "اس کی باگیں مجھے پکڑاؤ۔ شاہ ول" مگر اتنے میں زین کا تنگ کسی طرح ڈھیلا ہونے سے زین الٹ گئی اور اس کے ساتھ ہی میں زمین پر آرہا۔ گھوڑی کی رفتار ابھی ہلکی تھی۔ عبداللہ بھی کود کر نیچے اتر آیا۔ ساوی فوراً وہیں کی وہیں کھڑی ہو گئی۔ اس کی ٹانگوں کی نسیں کانپ رہی تھیں۔

عبداللہ خوب ہنسا۔ پھر اس نے گھوڑی کو تھاپیاں دیں اور پھر اس نے نمدے کے تہہ کو بچھا کر اس پر زین کے تنگ کو مناسب طریق پر کسا۔ نہ کم اور نہ زیادہ۔

اس نے کہا تمہیں سواری نہیں آتی۔ اب شاہ ول۔ میں آگے بیٹھتا ہوں اور تم پیچھے۔ اب ساوی خشتاں نہیں کرے گی۔

اس نے مجھے چڑھایا اور پھر خود رکاب میں پاؤں رکھ کر بڑی پھرتی اور صفائی سے اوپر زین پر کود گیا۔ باگیں ہاتھ میں سنبھالیں۔ پہلے تو ساوی نے اپنی پہلی اداکاری کرنے کی کوشش کی۔ کبھی گھومتی کبھی اچھلتی مگر عبداللہ نے تھپکیوں، بولیوں اور باگ کے اشاروں سے اسے رام کر لیا۔ وہ بھانپ گئی کہ اب اس کی پشت پر ایک سوار ہے اور اس کی کچھ نہ چلے گی۔ وہ اب عبداللہ کی مرضی پر کبھی دُلکی چلتی، کبھی پویہ اور کبھی آہستہ آہستہ۔ راستہ بھر عبداللہ مجھے گھوڑے کے گر سکھاتا رہا جس طرح اس نے ایک دفعہ مجھے درانتی سے گھاس کاٹنا سکھایا تھا۔ وہ پیچھے تہہ پر آ گیا اور میں زین پر۔ اب کے میں کافی سدھا ہوا سوار تھا اور ساوی نے راستہ بھر کوئی حجت نہ کی۔ پنجن آنے پر میں نے عبداللہ کو سڑک کے دوشاخے پر اتارا اور خود آگے موج پور کی سمت چل پڑا۔ وہ کچھ دیر وہاں کھڑا مجھے دیکھتا رہا۔ مسکراتا ہوا اور اپنا ہاتھ ہلاتا ہوا۔ بایاں ہاتھ۔ عبداللہ ابھی کھبچو تھا۔

اس کے بعد میں ایک دو دفعہ گھر گیا اور پھر حالات کے تحت تین چار سال تک نہ جا سکا۔ میرے دادا کی وفات کے بعد گھر بار وہ پہلا سا گھر بار نہ رہا۔ وقت کے ساتھ کتنے ہی انقلابات آ جاتے ہیں۔ چیزوں میں اور انسانوں میں۔ ہم خود بدل جاتے ہیں اور ایک طرح سوچو تو نہیں بھی بدلتے۔ میں اپنے بچپن اور لڑکپن سے اپنے آپ میں بڑی تبدیلی پاتا ہوں۔ لیکن شاید اسی زمانے کے تاثرات، عادات، خوشبوؤں اور نظاروں نے ہی مجھے وہ آدمی بنایا ہے جو میں اب ہوں۔ ممکن ہے اپنی اصل میں میں وہی معصوم، کھویا ہوا، شرارتی بچہ ہوں۔ مگر یہ میں جانتا ہوں کہ چیزوں میں وہ پہلی سی تازگی اور

بھڑک اب مجھے دکھائی نہیں دیتی۔ زمین پر پھیلی ہوئی ایک سنہری دھند اب اٹھ گئی ہے .... دادا کے تین ماہ بعد میری دادی بھی سیڑھیوں سے گر کر اللہ کو پیاری ہو گئی۔ اگلے سال میری دونوں بیوہ خالائیں بھی یکے بعد دیگرے رخصت ہو گئیں۔ پہلے بڑی خالہ نذیراں تپ محرقہ میں مر گئی۔ میری چھوٹی خالہ کو اپنی بہن سے بڑی محبت تھی۔ اگرچہ بڑی اسے اکثر جھڑکتی اور ٹوکتی رہتی تھی۔ وہ گھلنے لگی اور آخر ایک مہینے کے بعد اپنی بڑی بہن سے جا ملی۔ میری چھوٹی پھوپھی جیلا اپنے خاوند کتبوں والے ماما غلام رسول کے ساتھ گاؤں چھوڑ کر خانیوال کے پاس چلی گئی۔ جہاں انہیں آبکاری کی شرائط پر کچھ مربعے زمین مل گئی تھی ....

۱۹۳۸ء میں میں گاؤں چند روز کے لئے گیا۔ وہاں پتی کی زمینوں پر ہمارے چند شریکوں نے قبضہ کر لیا تھا اور میرے والد نے مجھے لکھا کہ وہاں جا کر اس تنٹے کو چکاؤں۔ میں رات کو اپنے چوبارے پر جا رہا۔ میرے دادا کے پرانے مراثی فرزے کی گھر والی نے مجھے روٹی کھلائی۔ دوسرے دن شام کو میں پٹواری سے مل کر گھوڑی پر واپس آ رہا تھا کہ راستے میں خاندان کے قبرستان کے پاس میں فاتحہ پڑھنے کے لئے رکا۔ جب میں بچپن میں اپنے دادا کے ہمراہ یہاں آیا کرتا تو پکی پختہ اینٹوں کی کاتی سے سبز قد آدم چاردیواری تقریباً محفوظ تھی اور ایک چھوٹا سا چکر کاٹنے والا آہنی دروازہ تھا تاکہ گائیں بھینسیں اندر نہ جا سکیں۔ میں اس دروازے پر جھوٹے لیا کرتا تھا۔ اندر لمبی گھاس میں ہمارے مرے ہوئے بڑوں کی پختہ قبریں تھیں ۔۔۔ ہر قبر کے اوپر ایک کتبہ تھا جس پر مرنے والے یا مرنے والی کی تاریخ پیدائش درج تھی اور اس کے نیچے ایک تعریفی شعر جس سے مرحوم کی تاریخ وفات نکلتی تھی۔ میرا دادا ایک عالم اور شاعر تھا اور یہ کتبوں پر اشعار اسی کے تھے۔ اب میں نے دیکھا کہ چاردیواری بالکل ٹوٹ پھوٹ چکی ہے اور لوگ اس کی اینٹیں اکھاڑ کر لے گئے ہیں۔ چکر والا آہنی پھاٹک بھی غائب تھا۔ قبریں سب شکستہ حالت میں تھیں اور اونچی گھاس اور جھاڑیوں میں چھپی ہوئیں۔ میں شام کے دھندلکے میں کتبوں کی عبارت پڑھنے کی کوشش کرنے لگا جو اب مٹ چکی تھیں۔ تب میں نے ایک دیہاتی لڑکے کو منہ پر ڈھاٹا باندھے اور ہاتھ میں کوئی چیز لئے سامنے سے پر ڈنڈیوں کی طرف جاتے دیکھا۔ اس کی چال اور وضع میں مجھے کوئی چیز آشنا لگی اور پھر میں پکارا "عبداللہ! حافظ عبداللہ!" وہ ٹھٹکا۔ اور پھر اس نے پیچھے مڑ کر نظر ڈالی کیونکہ یہ وہی تھا۔ اب سترہ اٹھارہ برس کا لمبا، تنومند لڑکا۔ جوانی کی سرحد پر۔ ڈاڑھی کا سبزہ نمودار۔

"شاہ الحق۔ بھائی شاہ الحق۔" اس کی آواز میں بلوغت اور مردانگی کا بھاری پن تھا۔ "السلام علیکم۔ کب آئے ہو؟ خیر خیریت ہے؟" اس کی آنکھوں اور ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں آئی اور مجھے عجیب سا لگا۔ شاید میں نے سوچا ــــ اس کے ابا کے خون میں رچی ہوئی جلدی رکھائی اور درشتی اب جب کہ وہ جوان ہو گیا ہے اپنا اثر دکھانے لگی ہے۔ اس کے انداز میں کچھ رازداری، کچھ بھید کا شائبہ میں نے محسوس کیا۔ اس کی آنکھیں میری آنکھوں سے ملنے سے کتراتی رہیں۔ خدا جانے کیا بات ہے؟

"کہاں جا رہے ہو عبداللہ؟"

"بردشیاں۔ پیٹھے کاٹنے۔"

"اس وقت؟ اور یہ منہ پر ڈھاٹا کیوں باندھا ہے؟"

"منہ سوج گیا ہے اس لئے رومال باندھ لیا ہے۔"

"آج کل کیا کر رہے ہو؟ چاچا رحمٰن اکبر کا کیا حال ہے؟"

"چاچا ٹھیک ہے۔ میں نے مڈل پاس کر کے سکول چھوڑ دیا ہے۔ اچھا۔ تم اب کچھ دن رہو گے؟ میں کل ملنے آؤں گا۔ اچھا خدا حافظ۔"

وہ جلدی میں تھا۔ میں اسے اس گہرے ہوتے جھٹپٹے میں لمبے لمبے ڈگ بھرتے دیکھتا رہا ــــ یہ تعجب کرتے ہوئے کہ وہ کس طرح بدل گیا ہے اور کیسے اتنا بے رُخا اور روکھا ہو گیا ہے۔ پھر قبرستان میں کچھ وقت گذار کر اور فاتحہ پڑھنے کے بعد میں آگے گاؤں کی طرف چل دیا۔

میں گاؤں کی آوازوں میں جب دیئے سے روشن کمرے میں کھانا کھانے بیٹھا تو نور امراثی نیچے اکڑوں بیٹھ کر اور حقہ پیتا ہوا مجھے گاؤں کی خبریں دینے لگا۔ وہ ایک چھوٹا موٹا کبڑا سا آدمی تھا۔ ایک بکرے جیسی چھدری داڑھی کے ساتھ جو اب سفید ہو چلی تھی۔ اس میں اپنی نسل کی ساری لطیفہ گوئی اور نقل کرنے کی صلاحیت تھی اور اس کے چٹکلوں اور باتوں نے مجھے خوب لطف دیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ مولوی غوث محمد نے دوسرا نکاح پڑھوا لیا ہے۔ جینی داڑھی اور آنا خراب۔ لالو ماچھی کی بیوی پنجن کے علیا کمہار کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ بابا فضلے کے دو لڑکے فوج میں چلے گئے ہیں۔ میں نے اس سے قبرستان میں حافظ عبداللہ سے ملاقات کا اور اس کے عجیب بے پروائی کے رویئے کا ذکر کیا۔ اس کی باتوں سے مجھے معلوم ہوا کہ عبداللہ اب گاؤں کی گلیوں میں بے لگام گھوڑے کی طرح مستایا پھرتا ہے، ہر وقت ریشمی لاچہ میں چھیل چھبیلا بنا ہوا، بات بات پر ہنستا ہے اور گاؤں کی کنواریوں کو دیکھ کر اس کے منہ پر ہیر وارث شاہ یا ہیبے کے بول آجاتے ہیں۔ وہ رانجھا اور مہینوال بننے کی کوشش کر رہا ہے۔

"نورے" میں نے کہا "جوانی دیوانی ہوتی ہے۔ ہم سب اس منزل میں سے گذرتے ہیں۔"

"سچ ہے میاں ثناول۔ کئیوں پر اس آندھی کو چڑھتے دیکھا ہے۔ یہ جوانیوں کا بھوت بڑا برا ہے۔ حافظ مجنوں کو دیکھو۔ نہ صورت نہ شکل۔ اس عمر میں بھی عورتوں کی مجلس میں جا بیٹھتا ہے اور جب لڑکیاں اس سے ٹھٹھا مخول کر کے اٹھا دیتی ہیں تو کہتا ہے۔ دل کریندا مجلس کریئے باہیں نہ دیندیاں کڑیاں۔ اگلے دن مجھے سکول کے پاس ملا اور کہنے لگا۔ ساٹھ ورہے کا ہو گیا یہ حافظ مجنوں مگر اب بھی جوانی کو دیکھ کر دل مچل جاتا ہے۔ گناہ کمانے کی بات ہے۔ جوانی شے ہی خدا نے عجیب بنائی ہے اور ہر ایک جوانی کا الگ الگ سواد۔ تو میاں ثناول، حافظ عبداللہ پر تو مست جوانی گھر کر آئی ہے۔"

پھر اس نے مجھے حافظ مجنوں کی نقل کر کے خوب خوب ہنسایا اور میں سو گیا۔ صبح کاذب کے وقت مسجد میں اذان سے میری آنکھ کھلی۔ تم جانتے ہو میں نماز کم ہی پڑھتا ہوں مگر گاؤں میں خدا جانے کیوں مسجد میں جا کر جماعت میں نماز پڑھنے کو دل چاہتا ہے۔ مجھے سادہ دہقانی لوگوں کے ساتھ نماز پڑھ کر عجیب لطف حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ میں نے مسجد میں جا کر مولوی غلام غوث کی امامت میں نماز پڑھی۔ اس کا لہجہ اسی طرح دہقانی اور اکھڑ سا تھا مگر وہ میرے کانوں پر گراں نہ گذرا۔ وہ مجھے اس ماحول میں کچھ اچھا ہی لگا۔ دعا پڑھنے اور حاضرین سے علیک سلیک کرنے کے بعد میں اٹھا تو میں نے حافظ عبداللہ کو وہاں دیکھا۔ ہم اکٹھے جوتیاں پہن کر باہر نکلے۔ گلی میں مویشی اپنے گلے کی گھنٹیاں ٹنٹناتے گھاس چرنے بروٹیوں میں جا رہے تھے۔ گاؤں جاگ اٹھا تھا۔

"عبداللہ" میں نے کہا "مجھے پتہ لگا ہے کہ اس گاؤں میں رانجھے کی روایت اب تمہارے دم قدم سے قائم ہے۔"

"تمہیں کس نے بتایا بھائی ثناول؟" اس کا چہرہ کانوں تک سُرخ ہو گیا۔ میں نے سمجھا کہ اس نے اس کا بُرا مانا ہے۔ پھر وہ کھلکھلا کر ہنسا اور اس نے میرے ہاتھ پر ہاتھ مارا ــــ بالکل ایک جوان کی طرح۔

"بھائی ثناول۔ مجھے معاف کرو۔ میں کل شام تم سے اوپرا ملا۔ میں ایک ضروری کام سے جلدی میں تھا۔ تم نے پتہ نہیں اس سے کیا سمجھا ہو گا۔ اب میں فارغ ہوں اور میں تم سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔"

ہم اوپر چوبارے میں آئے اور بیٹھ گئے۔

"بھلا بوجھو بھائی شنادل۔ میں کل شام کو کہاں جا رہا تھا؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ تم نے ہی مجھے بتایا تھا کہ تم مویشیوں کے لئے چارہ کاٹنے جا رہے ہو۔ میں دل میں حیران تھا کہ اس کام کے لئے یہ کون سا وقت ہے۔"

"میں تمہیں بتا دوں تو تمہیں یقین نہیں آئے گا۔ لیکن تم میرے پرانے بیلی اور بڑے بھائی ہو۔ تم سے کیسے چھپاؤں۔ میں ایک آدمی کو ٹوکے سے قتل کرنے جا رہا تھا۔"

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں "کیوں! تم نے اسے قتل کر دیا پھر؟"

"نہیں" عبداللہ نے کہا "اس کی قسمت اچھی تھی۔ وہ مجھے مل جاتا تو میں اس کو کبھی نہ چھوڑتا۔ اس کی تکہ بوٹی کر دیتا۔ وہاں جا کر مجھے پتہ چلا کہ وہ فوج میں بھرتی ہو گیا ہے۔"

"تمہاری قسمت اچھی تھی۔" میں نے تلخی سے کہا "تم خون کر دیتے تو پولیس تمہیں پکڑ کرلے جاتی اور تم پھانسی چڑھ جاتے۔ تم اتنے اچھے لڑکے تھے۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ تم بڑے ہو کر قاتل بن سکتے ہو۔"

"بھائی شنادل۔ تم تو غصے ہو گئے۔ وہ حرامزادہ بڑا بھیڑا آدمی تھا۔ اس نے میری شاداں کے ساتھ فحش مذاق کیا تھا اور اس پر دست درازی کرنے کی بھی کوشش کی تھی۔ میں بڑا بے غیرت ہوتا جو اس کو پی جاتا۔ میں مرد ہوں۔"

پھر اس نے مجھے ساری کہانی سنائی۔ گاؤں کے ایک سفید پوش برکت کی لڑکی جس سے وہ دیوانہ وار محبت کرتا تھا اپنے چھوٹے دس سالہ بھائی کے ہمراہ اپنے ماموں کے ہاں رسول پور گئی تھی۔ جب وہ گھوڑی پر واپس آ رہے تھے تو ایک شخص غلام محمد گاجی اور اس کے ایک ساتھی لفنگے نے انہیں راستہ میں ایک کیکروں کی ڈھک کے پاس روک لیا اور شاداں کو چھیڑنے لگے۔ شاداں ایک دلیر اور پرحوصلہ لڑکی تھی اس نے ان کو خوب خوب سنائیں، مگر آخر وہ اکیلی عورت تھی اور اس کے مدِمقابل دو تگڑے نوجوان! اور وہ دل میں بڑی ڈری۔ جگہ بڑی بیابان تھی۔ گامے نے بڑھ کر لڑکی کو بازو سے نیچے کھینچنے کی کوشش کی۔ شاداں کا چھوٹا بھائی رونے لگا۔ خدا نے اس کی آبرو کی حفاظت کی کیونکہ اس وقت سڑک پر سوڑی شریف کے پیر صاحب اور ان کی جماعت کے کچھ لوگ اچانک گھوڑیوں پر آتے نظر آئے۔ گامے کی ان کو دیکھ کر سٹی گم ہو گئی اور شاداں کو دھمکی دے کر کہ وہ اس کے ہاتھ سے نہیں بچے گی، گاما اور اس کے ساتھی کیکروں میں گم ہو گئے۔ شاداں نے اپنی گھوڑی کو تیز کیا اور اسے دوڑاتی ہوئی پیر صاحب کی جماعت کے پاس سے گذری۔ وہ ایک لڑکی کو اس طرح تیز گھوڑی دوڑاتے دیکھ کر بڑے حیران ہوئے اور پیر صاحب نے پوچھا بھی "دِھیئے خیر ہے؟" مگر شاداں نے جانور کی رفتار کم نہ کی اور اسی طرح اپنے گاؤں میں ہانپتی کانپتی پہنچی۔

شاداں نے تین چار روز ہوئے اسے واڑے میں اس کا ذکر روتے ہوئے کیا اور میں نے قسم کھائی کہ میں گامے کو نہیں چھوڑوں گا اور وہ زندہ نہیں رہے گا۔ ایک دن رسول پور جا کر اس کے متعلق مجھے پتہ لگا کہ اس کا باپ اب جہلم میں سکونت پذیر ہے جہاں وہ کسی دکین کا منشی ہے۔ گاما پیچھے کبھی کو تو زمین کی دیکھ بھال کرتا ہے مگر اس کا اور اس کی لفنگوں کی ٹولی کا کام سوائے کھیلی کھلی کرنے اور گاؤں کی لڑکیوں سے چھیڑ خانی کرنے کے اور کچھ نہیں۔ میں نے اس کا گھر دیکھا اور اس جگہ کا پتہ لگایا جہاں وہ سوتا تھا۔ کل شام کو میں اسے ختم کرنے

کے ارادے سے گھر سے نکلا۔ اسی لئے میں تمہارے پاس زیادہ دیر نہ ٹھہر سکا کیونکہ رسول پور آٹھ کوس ہے اور مجھے کافی دور جانا تھا۔ مگر افسوس اس کی حیاتی کچھ دن اور لکھی ہوئی ہے۔ ایک دن پہلے وہ اپنے باپ کی سرزنش سے بگڑ کر جہلم جا کر بھرتی ہوگیا۔"

"تمہارا مطلب ہے تم کل شام رسولپور گئے بھی اور لوٹے بھی؟ سولہ کوس؟"

"یہ کوئی بات نہیں۔ میں کوئی تین بجے مسجد میں آیا۔ گھر بھی نہیں گیا۔ میاں صاحب فکر کر رہے ہوں گے۔ دیکھو شادل تم کسی سے اس کا ذکر نہ کرنا۔" پھر بولا "شادل تم نے میری شاداں کو دیکھا ہے؟"

"نہیں۔"

"میں تمہیں دکھاؤں گا۔ سارے گاؤں میں اس جیسی سوہنی اور جاندار کڑی اور کوئی نہیں۔ اور تم مان جاؤگے کہ عبداللہ یونہی اس کے لئے ہوکے نہیں بھرتا۔ نم درگا اس کا بوٹا قد ہے اور اس کی آنکھیں نشے کے کٹورے ہیں۔ پھول گلاب کا ہے شاداں۔"

میں ہنسا۔ "عبداللہ۔ تم تو شاعر ہوگئے ہو۔"

"شادل چیز ہی ایسی ہے —— چپ شادل وہ دیکھو۔ وہ آ رہی ہے۔ چال دیکھو۔"

میں نے ملکڑی کی نیچی بالکنی میں سے دیکھا۔ گلی کے موڑ پر سے ننگے پاؤں، نیلے تہبند اور سبز چھینٹ کی لمبی قمیص میں ایک لڑکی سر پر گھڑا رکھے آ رہی تھی —— دوسری دیہاتی لڑکیوں کی طرح کنوئیں پر سے پانی بھرنے جاتی ہوئی۔ وہ واقعی خوبصورت تھی، بانکی اور چھیل چھبیلی۔ رنگ میں صباحت تھی اور اس کے چہرے کے خد و خال تیکھے تھے۔ اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں اور وہ اتنی شرمیلی اور معصوم لگی تھی جیسے اس نے کبھی کسی نوجوان دیہاتی لڑکے کی خواہش سے جلتی ہوئی نظروں کو اپنے جسم میں کھبتے نہ محسوس کیا ہو۔ جیسے کبھی اس کے ارمان نہ جاگے ہوں۔ سب دیہاتی نوخیز لڑکیاں ایسی ہی لگتی ہیں اور ان کے سینوں میں جذبات کا کتنا متلاطم طوفان اور کتنے رنگین سپنے ہوتے ہیں یہ خدا ہی جانتا ہے۔

پھر ایک عجیب بات ہوئی اس کی نگاہ اوپر اٹھی اور اس نے ہمیں بالکنی پر کھڑے اور اسے دیکھتے ہوئے پایا۔ اس کے چہرے میں آگ سی دوڑ گئی اور اس کی چال میں آپ ہی آپ لڑکھڑاہٹ آگئی ...... اور اس کے سر پر کپڑے کے چھلے پر رکھے ہوئے گھڑے کا توازن قائم نہ رہ سکا۔ پیشتر اس کے کہ وہ اپنے لانبے نازک ہاتھوں سے گھڑے کو سنبھالتی وہ الٹا اور ایک تڑاخ سے گلی کے فرش پر گر کر ٹوٹ پھوٹ گیا۔

عبداللہ نے اوپر سے کہا "کرمائیے۔ گھڑا توڑ دیا وی۔ تینوں بے بے مارے گی۔"

گھڑے کے ٹوٹنے سے وہ بڑی پریشان ہوئی اور کچھ دیر وہاں گم سم کھڑی رہی اور پھر چہرے پر ایک مسکراہٹ لئے وہ الٹے پاؤں بھاگی۔ سامنے سے بابا شاہو اپنی لاٹھی لئے آتا تھا۔ شاداں اس سے ٹکرائی اور شاہو کی لاٹھی گر پڑی۔ شاہو نے گری ہوئی لاٹھی کو اٹھایا اور بھاگتی ہوئی لڑکی کو دیکھتے ہوئے اس نے گلی کو سنایا۔ "اے برکتے دی کرمائیے۔ تو مجھے جھلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔"

"اس کا گھڑا تم نے تڑوایا ہے" میں نے عبداللہ سے کہا۔

وہ زور سے ہنسا اور پھر وہ سنجیدہ ہوگیا "تم میرے بھائی ہو۔ میری مدد کرو۔ قول دو کہ تم میری مدد کرو گے۔"

اس نے مجھے بتایا کہ شاداں کی بے بے تو اسے پسند کرتی ہے لیکن برکت شاداں کا رشتہ اپنی بہن کے لڑکے سے کرنا چاہتا ہے۔ دونوں میاں بیوی میں اس بات پر ناچاقی رہتی ہے۔ "تم برکت سے بات کرو۔" عبداللہ نے کہا "تمہاری بات کا بڑا اثر ہوگا۔ آخر مجھ میں کوئی نقص تو ہے نہیں میں خدا کے فضل سے جوان اور تندرست ہوں اور میں اپنے چاچے کے ساتھ مل کے آٹے کی مشین کا کام شروع کر رہا ہوں۔ خدا اس میں برکت

دے گا۔ تم برکتے کو کہنا کہ شاداں کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ سچ مچ شادل میں اس کو بڑا خوش رکھوں گا ـــــ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔

وہ ایک محبت میں مخمور نوجوان کی طرح باتیں کرتا رہا۔ میں مسکرایا اور اس سے وعدہ کیا کہ میں برکت سے ضرور بات کروں گا۔ وہ چلا گیا۔ تو میں تھوڑی دیر کے بعد برکت کے ہاں گیا۔ وہ میرے دادا کے پرانے دوستوں میں سے تھا۔ وہ اٹھ کر مجھ سے لپٹ گیا۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد میں نے طریقے سے لڑکیوں کے لئے اچھے رشتے ملنے کی مشکلات کا ذکر کیا۔ تم میری لوگوں کو اکسانے کی صلاحیت تو جانتے ہو۔ اپنی ساری صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر میں نے کوئی دو گھنٹے کی تقریر کے بعد اسے اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ شاداں کا رشتہ عبداللہ سے کر دے گا۔

"پتر ثناءالحق" اس نے کہا "تم مجھے نہ کہتے تو میں کبھی نہ مانتا۔ تم بڑے سیانے ہو اور تمہاری بات کو میں موڑ نہیں سکتا۔ لیکن مجھے شک ہے کہ بڈھا لڑکی رحمی اکبر میرے پاس عبداللہ کا رشتہ مانگنے آئے گا۔"

"وہ آئے گا" میں نے کہا "اور اگر وہ نہ بھی آئے تو کوئی بات نہیں۔ عبداللہ بجو اور مٹر بھو کا لڑکا ہے۔ بجو خود لاہور سے آکر تمہارے پاؤں پڑے گا۔"

"میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ برکت کو میں نے بڑی تدبیر سے شیشے میں اتارا ہے۔" عبداللہ شام کو آیا تو میں نے اسے یہ خوشخبری دی۔ وہ بےحد خوش ہوا "میں جانتا ہوں میرے بخت اچھے ہیں شادل۔ تم نے مجھ پر اتنا احسان کیا ہے کہ میں اس کا بدلہ نہیں چکا سکتا...... تمہارے پاؤں دباؤں!"

"مگر عبداللہ" میں نے کہا "کیا رحمی اکبر برکت کے پاس شاداں کا رشتہ مانگنے آئے گا؟"

"یہ میرا کام ہے" وہ بولا "میاں جی دو مردوں کے لئے کتنے ہی درشت ہوں، میرے ساتھ ان کا بڑا لاڈ ہے ـــ وہ جائیں گے۔"

میں گاؤں میں تین چار دن اور رہا۔ میرے جانے سے پہلے معاملات طے ہو گئے تھے اور اس کی شادی کی بات چیت پکی ہو چکی تھی۔

عبداللہ مجھے اسٹیشن پر چھوڑنے کے لئے آیا ـــــ سارا راستہ وہ ہنسی مذاق کی باتیں کرتا رہا اور ماہیا گاتا رہا۔ اس نے مجھ سے شادی میں آنے کا وعدہ لیا اور کہا کہ وہ مجھے کارڈ لکھے گا۔ وہ اس وقت کتنا خوش اور بے فکر تھا، ایک ایسے شخص کی طرح جس کی عزیز ترین خواہش پوری ہو گئی ہو۔

پولیس اسٹیشن کے گھنٹے نے بارہ بجائے۔ چاند اب برف کی طرح سفید اپنا آدھا سفر طے کر چکا تھا اور تارے نیلے سیاہ غبار میں چاروں طرف بھٹکے ہوئے مدھم ٹمٹما رہے تھے۔ کبھی کبھی پتے ہوا کے ایک ہلکے جھونکے سے کھڑکھڑاتے۔

"ہمیں اب دیوار پھاند کر ہی جانا پڑے گا۔ بارہ ہو گئے ہیں۔" میں نے کہا۔

"فکر مت کرو" ثناءالحق نے کہا "رات جوان ہے اور رات ہماری ہے...... اور کتنا کچھ میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں۔ کتنی یادیں میرے دماغ میں ہجوم بن کر ابھر رہی ہیں ـــــ مگر کسی اور وقت۔ کسی اور وقت۔ تم تھک گئے ہو گے اور تمہیں نیند آ رہی ہو گی۔ میں اب زیادہ دیر نہیں لوں گا...... ہاں حافظ عبداللہ کی شادی۔ میرا خیال ہے، مارچ ۱۹۴۰ء میں مجھے لاہور اپنے کالج کے پتے پر اس کا کارڈ ملا کہ اس کی شادی فلاں تاریخ کو طے پائی ہے اور میں ضرور آؤں۔ میں ان دنوں امتحان کی تیاری میں مصروف تھا لیکن میں نے ایک دن کے لئے گاؤں جانے اور شادی میں شریک ہونے کا فیصلہ کیا۔ چھوٹے اسٹیشن پر ہمارا مراثی نورا گھوڑی لے کر پہنچا ہوا تھا۔ یہ ساوی ہتھنی تھی جو میرے دادا کی وفات کے دو دن بعد ہی مر گئی تھی۔ یہ اس کی جوان بچھیری تھی، اپنی ماں کی طرح سفید نہیں بلکہ خاکستری رنگت کی، کنوتیاں کھڑی کئے اور جوانوں

کی طرح چمکدار، پھرتیلی اور چاق چوبند۔ اس پر وہی پرانی اپنی ماں کی انگریزی زین کسی تھی —— گاؤں کی واحد انگریزی زین —— سب جاندار ہستیاں گزر جاتی ہیں مگر ان کی استعمال کی چیزیں ان کے پیچھے رہ جاتی ہیں اور ہماری گاؤں کی حویلی میں ابھی تک ایک صندوقچی پڑی ہے جس میں میرے دادا کی عینک، ربڑ کی ٹوپی والی کالی دوات اور کچھ پرانے خطوط اور مسودات رکھے ہیں —— ماضی سے ملانے والی ایک زنجیر کی مانند..... نورے نے مجھے بتایا کہ بجو اللہ داد، اپنی دوسری بیوی کے ساتھ اپنے بیٹے کی شادی پر آیا ہوا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس خبر نے مجھے کیوں حیران کیا۔

شام کو میں اپنی حویلی میں پہنچا۔ دوسرے دن عبداللہ کا نکاح تھا —— عبداللہ اپنی شادی کے انتظامات میں لگا تھا۔ مگر میرے آنے کا سن کر وہ وقت نکال کر میرا شکریہ ادا کرنے کے لئے آیا۔ وہ ایک بانکا گبھرو لگتا تھا۔ بادشاہ کی طرح خوش۔ وہ چاہتا تھا میں اس کا شبالہ بنوں۔ میں نے کہا کہ ایک تو میں وہ کپڑے نہیں لایا جو اس موقعے کے لئے ضروری ہیں۔ دوسرے شبالہ ایک چھوٹے لڑکے کو ہونا چاہیے جو اس کے پیچھے گھوڑی پر بیٹھ سکے۔ وہ ہنسا اور کہنے لگا "شادل، تمہیں وہ دن یاد ہے جب ساوی نے اڑی کی تھی اور تم میرے پیچھے میری کمر میں ہاتھ ڈال کر بیٹھے تھے اور کپڑوں کا کیا ہے۔ میں تمہیں اپنا لاچہ دے دوں گا۔ تم بڑے اچھے شبالے بنو گے......"

میری عادت ہے کہ مجھے تماشا بننے سے ہول آتا ہے اور آخر میں نے اسے اکسایا کہ وہ اپنے چھوٹے سوتیلے بھائی رحمت کو شبالہ بنائے۔

رات کو میں اس کے گھر گیا اور اس کے اعزا و اقربا سے ملا۔ بوڑھے سرائی رمضی اکبر کے چہرے پر میں نے پہلی بار مسکراہٹ سے ملتی جلتی کوئی چیز دیکھی۔ اس کے "جی آیا نوں، ثنا ما الحق" میں حقیقی محبت کی گرمی تھی۔ وہ اس حد تک پر تواضع تھا کہ اندر سے دلہن کا جوڑا بھی دکھانے کے لئے لے آیا۔ گوٹے کناری کا سرخ باناتی جوڑا جو اس نے خود جہلم میں ایک درزی سے سلوایا تھا اور جس پر ڈیڑھ سو روپے لاگت آئی تھی میں نے جوڑے کے کپڑے اور اس پر کام کو بہت سراہا اور اس سے رمضی اکبر بہت گنگنانے لگا۔ رات بھر گاؤں کی لڑکیاں گھڑوں پہ ماہیے اور شادی کے گیت گاتی رہیں اور دیہاتی مہمان نئے تہبندوں اور صافوں میں ملبوس حقے پیتے اور ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ دوسری صبح حافظ عبداللہ سر پر لنگی باندھے، اجلا ریشمی لاچہ اور اچکن پہنے "چھیل چھبیلا بنا براتیوں کے ہمراہ دلہن کے گھر ڈھکا"۔ وہ ہماری ساوی کی بچھیری پر انگریزی زین پر سوار تھا۔ اس کا چہرہ سہرے سے ڈھنپا ہوا۔ اور چھوٹا رحمتا اپنے نئے کپڑوں اور سلمے ستارے والی گول ٹوپی میں مغرور اور خوش اس کے پیچھے اس کی کمر میں اپنے بازو حمائل کئے —— دلہن کے گھر تک زیادہ فاصلہ نہ تھا اس لئے ہم سب پیدل چلے۔ مولوی غلام غوث نے نکاح پڑھایا چھوہارے بانٹے گئے۔ اس کے بعد شاداں کا داج جو اس کے باپ برکت نے اسے دیا تھا، باہر لایا گیا۔ رنگین بیل پایوں کے پلنگ اور پلنگڑیاں، چمکتے ہوئے پیتل اور ایلومونیم کے بھانڈے، ایک بڑا صندوق، ایک لال چھپا چرخہ، دو لالٹینیں، ایک دودھ بلونے کی "منّی" مدھانی کے ساتھ، رنگدار لکڑی کے چمچے اور ڈوئیاں، چار پانچ اچھے مکمل بستر اور ایک سنگر مشین —— داج میں ایک بھینس بھی تھی۔ جب براتی داج کو دیکھ چکے تو معتلی شاداں کے داج کو پلنگوں پر رکھے سارے گاؤں میں پھرانے لے گئے تاکہ سب لوگ دیکھ سکیں کہ شاداں کے باپ نے اپنی بیٹی کو کیا کچھ دیا ہے۔

دوپہر کی روٹی میں نے دلہن کے گھر کھائی۔ مٹی کے برتنوں میں بکرے کے گوشت کا سالن اور گھی میں تر تر آٹے کی میٹھی کڑھائی۔ ہر کوئی ہنسی مذاق کی ترنگ میں تھا۔ خود سرائی رمضی اکبر نے ایک دو مذاق کئے۔ اس نے ایک موٹے پانڈی کا ذکر کیا جو کہا کرتا تھا کہ کڑھائی سلونے سے پہلے کھانی چاہیے تاکہ آدمی اچھی چیز سے شکم سیر ہو جائے تو پھر سلونے کو ہاتھ لگائے۔ اس نے حافظ مجنوں کا بتایا جس نے ایک دفعہ کڑھائی کی پوری دو تین پراتیں کھالی تھیں اور جب وہ نکو نک ہوگیا تو دو آدمیوں کو اسے جھولے کی طرح اٹھا کر اس کے گھر پہنچانا پڑا۔ حافظ مجنوں نے جو موجود تھا اور کڑھائی کو دونوں ہاتھوں سے تیز تیز کھا رہا تھا، اس قصے کی صداقت سے انکار کیا لیکن سب اسی پر ہنسے۔ جب اسے زیادہ چھیڑا تو وہ اپنے اذیت دینے والوں کو دور کرنے کے لئے اپنی لاٹھی ہوا میں گھماتا ہوا وہاں سے بھاگا —— اوہ، یہ دیہاتی شادیاں، یہ تہوارے

شہروں کی شادیوں کی طرح پھیکی اور بے روح نہیں ہوتیں ...... چار بجے ہم رخصتی گیتوں کے درمیان شاداں کی ڈولی عبداللہ کے مکان پر لائے۔
...... میں نے عبداللہ کو بات بات پر ہنستے ہوئے دیکھا۔ اس کے سنگی ساتھی اس سے مردانہ، براہِ راست ننگے مخول کرتے تھے اور وہ جواب میں ہنس دیتا تھا۔ مجھے شام کو گاڑی پکڑنی تھی اور جب میں وہاں سے چلا تو حافظ عبداللہ ایک رنگین پایوں کی پلنگڑی پر کھڑا تھا اور اپنی خالاؤں اور پھوپھیوں اور دوسری عورتوں سے ہنستا ہوا سلام کرائی وصول کر رہا تھا ـــــ وہ اب شادی شدہ تھا ـــــ گھر بار والا۔ ایک پورا مرد۔

جب اگلے سال میں گاؤں گیا تو عبداللہ کا ایک بچہ ہو چکا تھا۔ وہ اپنے پہلے گھر سے جہاں اس کا بڑا بھائی اور اس کے بیوی بچے رہتے تھے اٹھ آیا تھا اور چھپڑ کے پار اپنی کلتکی (آٹے کی مشین) کے احاطے میں ایک کچے گارے سے لپے کوٹھے میں رہتا تھا۔ ایک دوپہر کو ایک گاؤں سے لوٹتے ہوئے جہاں میری بڑی پھوپھی ایک ٹھیکیدار سے بیاہی تھی اس کلتکی میں اس سے ملنے کے لیے رکا۔ کلتکی کی "کوہ کوہ" اور ٹوپی دار لمبی چمنی سے نکلتے ہوئے دھوئیں سے میں نے اندازہ لگایا کہ آٹا پس رہا ہے اور حافظ عبداللہ کا کام چل پڑا ہے۔ اس سے مجھے اطمینان ہوا۔ بڑی چوکھٹ کے کھلے دروازے کے باہر تین چار گدھے اناج کی بوریوں سے لدے کھڑے تھے۔

میں گھوڑی پر سر نیچا کیے اندر داخل ہوا تو میں نے عبداللہ کو مشین کے کوٹھے کے باہر ایک بڑی تکڑی میں کچھ بورے تولتے ہوئے پایا۔ اس نے مجھے دیکھا اور ایک ہنستے ہوئے خوش آمدید بھرے چہرے کے ساتھ کام چھوڑ کر بھاگتا ہوا آیا۔ میں گھوڑی سے اترا جسے ایک کوزہ پشت کمیں نے سنبھال لیا اور ہم ایک دوسرے کے بازوؤں میں دوڑے۔ اس نے مجھے محبت سے زور آزمائی کے سے انداز میں خوب بھینچا اور ہم ہنسنے لگے۔ وہ اب مونچھ رکھے تھا۔ اس کے بال کنگھی چوٹی سے جمے ہوئے تھے اور تیل سے چمکدار۔ اس کی کلائی پر ایک گھڑی بندھی تھی۔

"شاول۔ تمہارے آنے کا پتہ ملا تھا اور اس کے بعد میں دو دفعہ تمہارے مکان پر ہو آیا ہوں" اس نے کہا "تمہیں میرے پاس ٹھہرنا چاہیے تھا۔ خدا کے فضل سے میری اتنی حیثیت ہے کہ تمہارے جیسے مہمان کو بستر اور روٹی دے سکوں"۔

وہ مجھے اپنے کوٹھے کے اندر لے گیا۔ صحن میں ایک بھینس اور کٹی کھرلی کے پاس بندھی تھیں اور اس کی بیوی اپنے بچے کو گود میں ہلکورے دیتی ایک پیڑھے پر مٹی کے چولہے کے پاس بیٹھی ہانڈی پکا رہی تھی۔

"شاداں! شاداں!! شاول آیا ہے۔ اٹھ سلام کر۔ یہ تیرے باپ سے میری سفارش نہ کرتا تو تو میرے گھر کبھی نہ آتی ـــــ شاول! ہمارا ایک جانگ ہے"۔

شاداں اپنے بچے کو چھاتی سے لگائے اٹھی اور جھکی آنکھوں سے کہنے لگی "جی آیاں نوں۔ بھائی جی"۔ اور اس نے اپنے بچے کو آگے بڑھایا۔

میں نے گل گوتھنے ننگے بچے کو اپنے بازوؤں میں اٹھا لیا۔ وہ ایک صحتمند موٹا بچہ تھا۔ بٹنوں سی آنکھوں والا۔ بالکل اپنے باپ پر۔ وہ رونے لگا اور میں نے اسے اس کی ماں کو دے دیا۔

"نام کیا ہے؟" میں نے پوچھا

"سکندر حیات" اس کی ماں نے عزور اور خوشی سے کہا۔

"مولوی غوث محمد نے کہا تھا کہ اس کا نام سکندر حیات رکھو۔" عبداللہ نے کہا "بڑا ہو کر بخت والا ہوگا اور وزیر بنے گا"۔

میں نے شاداں کو غور سے دیکھا۔ وہ سال میں ہی پوری عورت بن گئی تھی۔ جسم بھرا بھرا اور گدرایا ہوا۔ خچر کی طرح مضبوط اور پختہ۔ بیاہی عورت

کا چہرہ۔ وہ اب بھی ایک ملکہ کی طرح حسین اور پُر وقار تھی۔ وہ ایک بہتی ہوئی نزاکت سے چلتی تھی۔

ہم پلے پوتنے صاف ستھرے چمکیلے برتنوں سے سجے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے تو ایک طاق میں رکھے ہوئے ٹائم پیس کا الارم بجنے لگا۔

عبداللہ نے مسرت سے کہا "شاباشا با۔ گھڑیے گھڑیے بول۔ شادل آیا ای"۔

میں رنگین پایوں کی پلنگڑی پر بیٹھ گیا۔ کمرے میں شاداں کے داج کا سارا سامان ایک عجائب گھر کی طرز پر سجا ہوا تھا۔ ایک بڑے بھونپو والا گراموفون بھی تھا۔ وہاں بیٹھے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ اس کمرے سے زیادہ آرام دہ اور پر تعیش کون شاہی محل ہو سکتا ہے۔ شاداں میٹھی لسی ایک شیشے کے جگ میں لے آئی اور ہم نے دو دو گلاس پیئے۔ عبداللہ نے اپنی بیوی کو چھیڑا "شادل۔ میں تم سے تمہاری بہن کی ایک شکایت کرنا چاہتا ہوں۔ جب سے سکندر حیات خاں ہمارے گھر میں تشریف لائے ہیں تمہاری بہن نے میری پروا ہی کم کر دی ہے۔ نہ یہ اب میری ٹانگیں دباتی ہے نہ میرا سر سہلاتی ہے"۔

شاداں شرمائی ہوئی فوراً باہر چلی گئی۔

عبداللہ نے کہا "شاداں نے مجھے بڑا سُکھ دیا ہے۔ اس کے آنے سے میری جون ہی بدل گئی ہے۔ سچ ہے نیک بخت عورتیں اپنی قسمت ساتھ لاتی ہیں۔ اس کے آنے کے چھ مہینے کے اندر اندر مجھے کسی کی محتاجی نہیں رہی۔ میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہوں۔ اپنا گھر بار اور اپنا کاروبار"۔

پھر اس نے اچانک کہا "شادل۔ تمہیں جنانی کی خواہش نہیں ہوتی؟ تم اپنا گھر کیوں نہیں بساتے"۔

میں نے جواب دیا کہ ابھی وقت نہیں۔ میں پڑھ رہا ہوں اور جب میں پڑھائی سے فارغ ہو جاؤں گا تو شادی کی سوچوں گا۔

"جنانی کے بغیر ایک مرد کی کچھ زندگی نہیں۔ آدمی گناہ سے بچتا ہے۔ تم کیسے عورت کے بغیر رہتے ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا"۔

میں وہاں عبداللہ کے گھر کوئی دو گھنٹہ بیٹھا۔ اس نے مجھے اپنی کلفی کے کاروبار کے متعلق بتایا اور یہ کہ وہ کچھ پیسے آنے پر آرے اور ٹوکے کی مشین بھی لگانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ہم نے بھونپو والے گراموفون پر کچھ ریکارڈ بھی سنے۔ اس کی بیوی ایک لکڑی کی طشتری میں کھانا لے کر آئی۔ ساگ اور تازہ مکھن اور تنور کی روٹی۔ کھانے نے بڑا لطف دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں سکندر حیات کے ہاتھ پر دو روپے رکھ کر اس خوش بابرکت گھر سے رخصت ہوا۔ اپنی زندگی کے بنجر پن اور تنہائی کا سوچتا ہوا میں کچھ اُداس اُداس حویلی کو لوٹا۔

میں اپنے تعلیمی کورس پڑھنے سے ہمیشہ گھبراتا ہوں۔ اور اس کی وجہ سے میں متواتر دو سال بی۔اے میں فیل ہوتا رہا۔ والد صاحب قبلہ سخت ناراض تھے۔ کیونکہ مجھ سے انہوں نے کافی توقعات وابستہ کر رکھی تھیں۔ اس مدت میں میں گاؤں نہ جا سکا۔ حافظ عبداللہ اور اس کا ایک ساتھی وشنو کھتری جو گاؤں میں مکینک بنا ہوا تھا ایک بار لاہور مشینری کے کچھ پرزے خریدنے کے لئے آئے تھے۔ عبداللہ دیواز ہوسٹل میں مجھے ملنے کے لئے آیا۔ اس کا جسم ابھی تک کسرتی تھا مگر خوشحالی اور بے فکری کی وجہ سے کچھ فربہی کی طرف مائل۔ اوائل شباب کی تازہ روئی کی جگہ اب ایک مردانہ پختگی نے لے لی تھی اور اس نے بھی نوکیلی مونچھیں اگالی تھیں۔ جن کی نوکوں کو وہ مسلسل بل دیتا رہا۔ وہ بے ساختگی سے ہنستا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اب اس کا ایک اور لڑکا بھی پیدا ہو چکا ہے۔

اور اس بار تم نے اس کا نام خضر حیات رکھا ہوگا؟ — سکندر حیات کے بعد خضر حیات" میں نے کہا۔

وہ ہنسا۔ "نہیں نہیں۔ اس بار میں نے سب تجویزوں کو رد کر دیا۔ میں نے اس کا نام اس کے چاچا پوشالحق رکھا ہے"۔ اس نے فخر سے میری طرف دیکھا اور میرے دل کا کوئی اندرونی حصہ مسرت سے دمکا۔

"چاچا رضی اکبر نے اس کی مخالفت نہیں کی؟" میں نے پوچھا "اسے ہم طوائفوں سے بڑی کد ہے۔"

"سچ کہوں۔ میاں جی نے مخالفت کی مگر میں نے کہا کہ اس کا اصل چاچا شناء الحق ہے اور میں اس کا نام یہی رکھوں گا۔"

"اور بہن شاداں کیسی ہے؟"

"ٹھیک اور خوش ہے۔ ہاں میاں جی سے اس کی نہیں بنتی اور مجھ پر بھی غصے ہوتی رہتی ہے کہ میں میاں جی کی پاسداری کرتا ہوں۔ شادی کے وقت مجھے پتہ نہیں تھا کہ وہ اتنی تیز مزاج نکلے گی۔ ایک دو بار تو وہ اس بات پر میکے چلے جانے کی دھمکی بھی دے چکی ہے لیکن میں اس کو راضی کر لیتا ہوں۔ جانی کو بھی انجن کی طرح ٹھنڈا کرنا پڑتا ہے"...... وہ کچھ سوچ میں چلا گیا۔

"اسے خوش رکھو۔"

"ہاں" وہ چونکا "خوش! تم نے اسے مجھے دلایا ہے۔ میں اب بھی اس سے پہلے کی طرح محبت کرتا ہوں۔"

دشنو کھتری ایک لمبے کوٹ میں ایک چھوٹا سا آدمی تھا۔ چھدرے کانوں میں مندریاں پہنے بولا۔ "لالہ سکھی رام کا قول تھا کہ جب عورت ہٹ پر آتی ہے تو صرف ایک چیز اسے درست کر سکتی ہے۔ سونٹے کی مار...... اور وہ......"

میں نے دیکھا کہ دشنو کھتری کے کوٹ کی جیب میں سے ایک بند بوتل کا منہ تھوڑا سا نکلا ہوا ہے۔ وہ مجھے شراب کی بوتل لگی اور میں تعجب کرنے لگا کہ کہیں حافظ عبداللہ کو بھی چسکی لگانے کی لت تو نہیں پڑ گئی۔ وہ کوئی آدھ گھنٹے کے بعد چلے گئے۔

۱۹۴۳ء کے جون جولائی کے مہینے میں مجھے اپنے والد کی ہدایت کی تکمیل میں پھر گاؤں جانا پڑا۔ میں اس مشن پر جانے سے قطعی خوش نہیں تھا اس وجہ سے کہ فریق ثانی وہی چڑچڑا اور تلخ کلام بوڑھا حافظ عبداللہ کا نانا رضی اکبر تھا۔ ایسے خانگی تنازعے بڑے تدبر اور حوصلے ہی سے نپٹائے جا سکتے ہیں۔ وہ بھی اس صورت میں جب دوسرا فریق مصالحت کی راہ اختیار کرے اور کچھ جھکے۔ رضی اکبر ایسا شخص نہ تھا۔ وہ ساری زندگی نہ خدا کے سامنے جھکا تھا نہ شیطان کے سامنے۔ اور میرا خیال ہے کہ بارگاہ ایزدی میں اس کے سجدے نیاز مندی اور عبودیت سے عاری ہوتے تھے۔ اس کا معبود وہ خود تھا —— اس کا غرور اور اس کی انا۔ دریا کے پار ہماری کچھ متنازعہ زمین پر جو ایک آدھ ایکڑ تھی اس کے بڑے نواسے اسماعیل نے ناجائز قبضہ کر رکھا تھا۔ والد صاحب نے اسے اور رضی اکبر کو کئی بار لکھا کہ وہ قبضہ چھوڑ دیں مگر یہ ایسی بات تھی جو رضی اکبر کے سینے میں ہمارے خاندان کے خلاف بھرے ہوئے زہر کو اور زیادہ گھولتی۔ میں نے سوچا کہ میں اس معاملے میں بوڑھے کی بجائے حافظ عبداللہ سے بات کروں گا کہ وہ اپنے نانا کو سمجھائے۔

جب گاڑی جوڑے کے اسٹیشن پر پہنچی تو مطلع ابر آلود تھا۔ کالی سیاہ گھٹا بیّی کی پہاڑیوں پر سے اُمڈتی ہوئی آسمان پر چڑھتی آ رہی تھی اور پربت کی ٹھنڈی ہوا ایک ہراول دستے کی طرح درختوں کو تھپیڑے مارنے لگی تھی۔ نورے نے جو گھوڑی لے کر آیا ہوا تھا مجھے کہا کہ تو رکی برسات آنے والی ہے اور بہتر ہوگا کہ چودھری علم دین کے ڈیرے میں بارش کے رکنے تک آرام کر لیں۔ مجھے بیّی کے شاداب گہرے نیلے پہاڑ کیکروں اور بھیکڑوں کے درمیان لہراتی سیاہ ہوتی ہوئی سڑک، چمکتے کڑکتے بادلوں کے نیچے کرلاتے ہوئے پرندوں کی نوائیں، سب اتنے بھلے اور سحر انگیز لگے کہ میں نے اس موسم میں گاؤں جانے کا ارادہ کر لیا۔ "بارش آتی ہے تو آئے۔" میں نے کہا۔ ہم چل پڑے۔ آگے آگے بدکتی گھوڑی پر میں اور پیچھے پیچھے سامان سے لدے گدھے پر نورا مراثی۔

ہم کمال پور سے گذرے اور بارش پھر بھی نہ آئی۔ اگرچہ ٹھنڈی ٹھنڈی فرفر کرتی ہوا نمی سے لدی ہوئی تھی۔ تھوڑی دور آگے ایک چھوٹی پل کے اوپر ہم نے ایک خمیدہ کندھوں والے لاٹھی ٹیک ٹیک کر چلتے ہوئے بوڑھے آدمی کو جا لیا۔ میں پاس سے گذرا تو میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ یہ

کھوہار کا پوسٹ ماسٹر رضی اکبر تھا۔ بڑھاپے اور ضعیفی اور کبڑے پن کے باوجود اسی طرح مغرور، اور ساری دنیا کے خلاف کینہ پالے۔

"اسلام علیکم چاچا جی" میں نے گھوڑی روکتے ہوئے کہا۔ "کہاں سے آرہے ہیں؟"

"وعلیکم السلام" وہ رکھائی سے غرّایا اور اسی طرح لاٹھی ٹیکتا ہوا چھوٹی مضبوط ٹانگوں سے کچی سڑک پر چلتا رہا۔

"چاچا۔ میں نثار الحق ہوں۔ عطاء الحق کا بیٹا۔ آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟" میں نے کہا۔

"اچھا! اچھا۔ میری بینائی کمزور ہوگئی ہے۔ مگر میں ملاؤں کو ایک میل سے سونگھ لیتا ہوں۔ ان کی بُو اتنی تیز ہے۔ نثار الحق خاں۔ تمہارے باپ کا کیا حال ہے؟"

"وہ خیریت سے ہیں۔"

"خیریت سے؟" اس نے اپنی لاٹھی ہوا میں لہرائی "اسے میری طرف سے کہہ دو کہ ظلم کبھی نہیں پنپتا۔ جب تک رضی اکبر زندہ ہے اسے واڑے والی زمین کا ایک چپّہ نہیں مل سکتا۔"

"چاچا!" میں نے کہا "زمین کی کس نے بات کی ہے؟ آپ گھوڑی پر چڑھ بیٹھیں۔ کھوہار کافی فاصلہ ہے اور بارش آرہی ہے۔ میں پیدل آجاؤں گا۔"

وہ اس اخلاق پر حیران ہوا۔ وہ اپنے زہر کو اگلنے کی خاطر تلخ کلامی کے لئے زمین ہموار کر رہا تھا اور یہاں اس کے شریک اور دشمن عطاء الحق کا بیٹا اسے سواری کے لئے اپنی گھوڑی کی پیشکش کر رہا تھا۔

"جاؤ۔ جاؤ۔" وہ بولا "میری ٹانگیں گھوڑی سے زیادہ مضبوط اور تیز ہیں۔"

میں نے ایک بار اور اصرار کیا اور پھر اس کی کھلی کدورت کو دیکھ کر میں نے گھوڑی کو ایڑ لگائی۔ ایک فرلانگ آگے سڑک کے موڑ پر میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ اسی طرح خمیدہ، لاٹھی ٹیکتا، تیز تیز چلتا ہوا آرہا تھا۔ سر پر صافہ۔ جھریوں والے تلخ چہرے پر لال بھبوکا داڑھی۔ بجھی ہوئی خشمناک آنکھیں، ایک تنہا کھولتا ہوا بوڑھا آدمی۔ اس وقت وہ مجھے ایک المیہ کردار لگا۔

پہلے چھینٹے کلمیانہ کے گاؤں سے کچھ آگے ہم پر پڑے۔ کھوہار یہاں سے بس ایک کوس تھا۔ ہم نہ رُکے اور بڑھتے گئے۔ پرے پبّی کی پہاڑیوں پر بڑی موسلا دھار بارش برستی معلوم ہوتی تھی۔ اگرچہ یہاں ابھی بوندا باندی ہی تھی۔ آسمان بپھری ہوئی سیاہ گھٹاؤں کا ایک آتشیں کڑاہ بنا تھا۔ ہم کھوہار میں داخل ہوئے تو بارش موسلا دھار برسنے لگی اور حویلی تک پہنچتے ہم بالکل بھیگ گئے۔ یہ ایک سیلابی بارش تھی اور اس خطے میں بھی جو بارشوں کے لئے مشہور ہے۔ میں نے آسمان کو اس طرح برستے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اب میں نے سوچا۔ ہفتوں تک گاؤں کی گلیوں میں گھٹنوں گھٹنوں کیچڑ رہے گا اور ہر کوئی ہاتھ میں لاٹھی لئے اور اپنے تہبند کو اوپر اٹھائے اپنے کام پر نکلے گا اور زہریلے ملیریا کے مچھر چھتوں میں پیدا ہو کر انسان اور جانور کی زندگی اجیرن کر دیں گے۔

میں نے چوبارے میں کپڑے تبدیل کئے۔ نورے نے مٹی کی انگیٹھی میں پھونک مار مار کر آگ جلائی اور آگ کے سامنے بھیگے ہوئے بستر کو خشک کرنے کی تدبیر کرنے لگا۔ گاؤں پر خاموشی سی طاری تھی اور سوائے موٹی چادروں میں گرتی ہوئی بارش اور بجلی کی کڑک کے اور کوئی آواز نہ تھی۔

میں اس بالکنی پر کھڑا ہو کر اس ہولناک بارش کا نظارہ کرنے لگا۔ اچانک پبّی کی طرف بجلی کسی نامعلوم زبان کے حروف کی شکل میں کوندی اور سارا آسمان روشن ہو گیا اور پھر ایک دہلا دینے والی گڑگڑاہٹ سے ایک چندھیا دینے والی روشنی کی تلوار سی نیچے لپکی۔ دس توپوں کی کڑک کے ساتھ۔

نورے نے خوف سے کہا۔ "میاں جی۔ گاؤں کے نزدیک کہیں بجلی گری ہے۔ اللہ رحم کرے۔"

میرا خیال ہے کوئی آدھ گھنٹے کے بعد طوفانی بارش کے شور میں میں نے دو عورتوں کی آواز سنی۔ "نی شرِ ہو دے عبداللہ بے چارے نے بجلی بچی اے۔" دوسری عورت نے کہا "ہائے ہائے نی بے چارا۔ میں مر گئی۔ ہائے جوان ہی آہی۔"

میرا دل ڈوب گیا اور میں دعا کرنے لگا کہ میرے کانوں نے غلط سنا ہو۔ بارش ذرا تھمی تو فوراً اور میں باہر بھاگے۔ گلی میں بہتے پانی اور گارے میں شپشپاتے اور دیواروں کو پکڑتے۔ کلتکی میں پہنچتے پہنچتے ہمیں کچھ وقت لگا۔ کلتکی کے کوٹھے کے پھونس کی چھت گری ہوئی تھی اور مشین کا انجن ترا مڑا اور سیاہ اپنی آہنی پنجر نمایاں کئے پڑا تھا۔ چھ سات دیہاتی عورتیں اور مرد جمع تھے۔ انجن اور مشین کے درمیانی پٹے کے نیچے کوئلے کی طرح سیاہ ، سکڑا اور جھلسا ہوا حافظ عبداللہ کا جسم پڑا تھا۔ بالکل ناقابلِ شناخت۔

بعد میں روتی ہوئی شاداں نے مجھے بتایا کہ جب چھت کے گرنے کا دھماکہ ہوا تو عبداللہ اُس کے منع کرنے کے باوجود یہ دیکھنے کے لئے بھاگا کہ اس کی مشین کو کچھ نقصان تو نہیں پہنچا۔ پھر بجلی بڑے زور سے کڑکی اور مشین پر گری اور عبداللہ جو اپنی آئی سے پاس کھڑا تھا جل بھن گیا۔

اوہ ادہ بین جو دیہاتی بوڑھیوں نے اپنے بازو لہرا لہرا کر اس کی میت پر کئے! عبداللہ کا جسم رضی اکبر کے گھر کے صحن میں چادر میں ڈھنپا ایک چارپائی پر پڑا تھا۔ اردگرد اس کی خالائیں، پھوپھیاں اور دوسری عورتیں سیاہ کپڑوں میں اکڑوں بیٹھی تھیں۔ ایک اٹھتی اور مرے ہوئے شخص کی طرف بانہہ بڑھا کر اور اسے مخاطب کر کے دلگداز بین کرتی۔ دیہات میں جب کوئی مرتا ہے، تو اس کا مناسب ماتم کیا جاتا ہے اور گاؤں کے سب لوگ اس میں حصہ لیتے ہیں۔

اور جب ہم شام کو اس کی میت کو اٹھائے دفنانے لے گئے تو ہر ایک کی آنکھوں میں آنسو تھے اور لبوں پر رنج و غم کے الفاظ، سوائے ایک شخص کے۔ یہ اس کا نانا رضی اکبر تھا۔ بوڑھے ضدی آدمی کی آنکھ سے ایک آنسو نہ بہا۔ میں اس کے ساتھ چل رہا تھا۔ اس کی آنکھ کوری اور خالی تھی۔ وہ کھرے تلخ لہجے میں موسم اور فصلوں کی باتیں کرتا رہا۔ ایک بار اس نے مجھ سے میری پڑھائی کے متعلق بھی پوچھا۔ ہاں جب میں نے مشیتِ ایزدی کا ذکر کیا تو وہ بھڑک اٹھا اور حقارت اور غرور سے غرایا "مشیت کا کرم ہمیشہ رضی اکبر کے گھر پر ہی ہوتا ہے!"...... میں نے جان لیا کہ اس کے لئے اب اس دنیا میں زیادہ دیر زندگی نہیں۔

شناء الحق خاموش ہو گیا۔ چاند کچھ پھیکا پڑنے لگا تھا اور پہلے مرغوں کی اذانیں سنائی دینے لگیں۔

اور یہ ایک آدمی کی زندگی کی کہانی ہے۔ میں نے حافظ عبداللہ کو اس دنیا میں آنے پر دیکھا اور مولوی کو اس کے کانوں میں کلمہ پڑھتے سنا۔ پھر وہ میری آنکھوں کے سامنے بچپن اور بلوغت کی منزلوں سے گذرا جس میں سے سب انسان گذرتے ہیں۔ وہ اس طرح بڑھا جیسے ایک پھول زمین میں سے اگتا ہے وہ جوان ہوا اور جوانوں کی طرح ایک لڑکی کی چاہت میں دیوانہ ہو گیا۔ میں نے اسے اس کی شادی کے وقت چارپائی پر کھڑے مسکراتے اور سلام گردائی قبول کرتے دیکھا۔ میں نے اسے ایک ذمہ دار مرد بنتے، گھر بساتے اور باپ بنتے دیکھا اور پھر میں اس وقت بھی موجود تھا جب اسے سوندھی مٹی کے نیچے آرام کرنے کے لئے لٹایا گیا۔ سب آدمی ان سب منزلوں میں سے گذرتے ہیں اور آخر میں زمین ان کو اپنی کوکھ میں بلا لیتی ہے اور وہ سایوں کی طرح زندوں کی آنکھوں اور ذہنوں سے غائب ہو جاتے ہیں۔ ان کے سب خواب، ارمان، پچھتاوے اور مستقبل کے ارادے ایک مشتِ خاک بن کر ہواؤں میں اڑ جاتے ہیں مگر ایک طرح وہ باقی رہتے ہیں ——— دوسرے انسانوں کے سینوں میں۔ اس میں بڑی سچائی ہے کہ سب آدمی ایک دوسرے کے دست و بازو ہیں۔ جب ایک مرتا ہے تو ہم سب اس کے ساتھ مرتے ہیں......

پھر ہم رنج سے اٹھے اور اپنے اپنے خوابوں اور خیالوں میں کھوئے ہوئے ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے خاموش سڑک پر ہوسٹل کی سمت چل پڑے۔

ڈاکٹر محمد الحسن فاروقی

لال شہزادہ

نواب منصور علی خاں عرف چھوٹے مرزا صاحب کے خاندانی قبرستان میں ایک قبر سب سے الگ تھی اور سب سے زیادہ نمایاں اس وجہ سے تھی کہ وہ سرخ پتھر کی بنی ہوئی تھی۔ جو بھی اس قبرستان میں پہنچ جاتا وہ بیساختہ یہ سوال ضرور کرتا "یہ قبر کس کی ہے؟" اس سوال کے جواب میں جو کوئی بھی نواب صاحب کے خاندان کا فرد موجود ہوتا وہ ایک عجیب قصہ سناتا۔ میں ایسے موقع سے وہاں پہنچا تھا کہ نواب صاحب جن کا سن نوے برس سے اوپر تھا خود ساتھ تھے اور میرے سوال کے جواب میں انہوں نے کہنا شروع کیا:

"یہ میری بہن تھی مجھ سے چھوٹی تھی۔ ہم دو بھائی تھے۔ بڑے مرزا صاحب جن کی وہ سفید قبر دیکھ رہے ہو اور چھوٹے مرزا یعنی میں اور میری اولاد والد مرحوم کی بیر کی تھی۔ کس قدر خوبصورت تھی۔ ایسا صاف رنگ کہ پان کھاتی تھی تو گلے میں پیک دکھائی دیتی تھی۔ بال اتنے بڑے کہ ٹخنوں تک آتے تھے۔ کانسے میں رکھ کر دھوئے جاتے اور ایسے سیاہ اور ایسے چمکدار کہ ناگن معلوم ہوتے تھے۔ یہ بڑی بڑی آنکھیں اور دکھائی ایسی کہ دیکھتے ہی آدمی نشے میں آجائے۔ فریبِ نرگسِ مستانہ جو آتش نے کہا نہیں ہے ؎

مگر اس کو فریبِ نرگسِ مستانہ آتا ہے — الٹتی ہیں صفیں گردش میں جب پیمانہ آتا ہے

تو وہ عالم تھا۔ ستواں ناک، کتابی چہرہ، چوڑا ماتھا، بھرے بھرے سرخ گال۔ اللہ نے اپنے ہاتھ سے خاص طور سے بنایا تھا۔ شہر بھر کی بیگمات اسے دیکھنے کے لئے آتیں اور اکثر دیکھ کر غش کھا جاتیں۔"

"کسی غیر مرد نے تو کبھی دیکھا نہ ہوگا؟" میں نے سوال کیا۔

"کیا مجال جو پرندہ پر مار جاتا۔ بس ان ہی لوگوں کا سامنا تھا جن سے شرع نے پردہ جائز رکھا۔ والد تھے، بھائی جان اور میں۔ چچا ماموں کے لڑکوں سے بھی پردہ تھا۔"

"پڑھی لکھی بھی نہ ہوں گی؟"

"لکھنی تو تم جانتے ہو کہ ہمارے یہاں لڑکیوں کو لکھنا نہیں سکھایا جاتا۔ ہاں پڑھی ضرور تھی اور اس پڑھنے ہی سے اس کا قصہ شروع ہوتا ہے۔ یہی کوئی آٹھ نو برس کی ہوگی۔ استانی پڑھا رہی تھی۔ استانی کہا کرتی تھی کہ قیامت کا ذہن پایا ہے صاحبزادی نے۔ آپ سے آپ نکال لیتی ہیں اور ایک دفعہ پڑھنے میں حفظ اور پڑھنے کا لہجہ وہ قیامت کہ جن سننے لگیں اور یہی تو قیامت ہوئی کہ ایک جن عاشق ہو گیا۔"

"جن؟ یہ کیسے آپ کو معلوم ہوا؟"

"ایک دن استانی پڑھانے پڑھاتے اٹھ کر بھاگی اور امی جان کے پاس آکر بولی۔ "میں نہیں پڑھا سکتی صاحبزادی کو۔ ان پر کسی جن کا

سایہ ہے اور یہ کہہ کر وہ برقعہ اوڑھ بگ ٹٹ بھاگی اور پھر ہمارے گھر کا رُخ نہیں کیا۔ امی جان نے دیکھا۔ ماشاءاللہ بیگم کو۔ اس کا نام ماشاءاللہ بیگم رکھا گیا تھا، سمجھے؟ تو سُرخ ہو رہی تھی۔ آنکھیں تک سرخ بیر بہوٹی۔ بس اپنے کمرے میں جا کر پلنگ پر پڑ گئی اور کمرے کے دروازے اندر سے بند ہو گئے سب کھٹکھٹایا کئے بالکل نہ کھلے۔ میں گھر میں آیا۔ امی جان مرحومہ نے مجھ سے کہا۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ کوئی جواب نہیں۔ باہر سے بھائی جان کو، ابا جان مرحوم کو بلا لایا۔ وہ سب کھٹکھٹایا کئے کوئی جواب نہیں۔ اس کمرے کی دو کھڑکیاں، باغ کی طرف تھیں ہوا آنے کے لئے اور عورتوں کے باغ دیکھنے کے لئے۔ میں نے ادھر جا کر دیکھا۔ دونوں کھڑکیاں بھی پٹ بند تھیں۔ کھڑکیاں زیادہ اونچی نہ تھیں اور ان کے پاس درخت، تھے ان پر چڑھ چڑھ کر میں نے زور زور سے کھڑکیوں پہ ہاتھ مارے مگر معلوم ہوتا تھا پتھر ہو گئی تھیں وہ کھڑکیاں۔ ہاں ابا جان مرحوم کے کہنے پر آواز آئی۔ "پریشان نہ کیجئے۔ لال شہزادے آئے ہیں جب چلے جائیں گے تو دروازے کھل جائیں گے۔"

"یہ آواز کیسی تھی آپ نے سنی تھی؟"

"وہی ماشاءاللہ بیگم۔ میری بہن کی آواز تھی جب بھی جواب آیا اسی کی آواز میں۔ وہ لال شہزادہ کبھی خود نہیں بولا۔ ابا جان پلٹے تو عجب طرح گم گم سے نظر آئے۔ امی جان بیرسن کر رونے لگیں۔ امام باڑے کے سامنے جا کر گر پڑیں اور دعائیں کرنے لگیں۔ ہم دونوں بھائیوں نے کہا یہ سب کچھ نہیں۔ لال شہزادہ ویزادہ کچھ نہیں۔ اس لڑکی کا دماغ کچھ پھر گیا ہے۔ امی جان نے کہا کچھ جھاڑ پھونک ہو مگر ابا جان نے کہا کہ غیر مرد کا سامنا ہو گا ایسا ہرگز نہ ہو گا۔ کوئی گھنٹہ بھر کے بعد کمرے کے تینوں دروازے اور دونوں کھڑکیاں آپ سے آپ کھل گئیں۔ ہم سب کمرے میں گئے۔ دیکھا ماشاءاللہ پلنگ پر تھکی ہوئی پڑی ہے بڑے بڑے بال کنڈلی مارے ایک طرف رکھے ہیں۔ ہم کو دیکھ کر اس نے آنکھیں کھولیں۔ شرمائی۔ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سر سے دوپٹہ اوڑھا اور منہ چھپا لیا۔ ماں پاس بیٹھ گئیں۔ لونڈیاں پاس کھڑی ہو گئیں۔ ہم مرد لوگ، چلے آئے۔ یہ پہلا واقعہ تھا۔"

"تو کیا ایسے واقعے روز ہوتے؟"

"نہیں ہر جمعرات کو۔ کمرہ آپ سے آپ کیوڑے گلاب سے دھل جاتا۔ لوبان اور اگر کی وہ خوشبو کہ میں کیا کہوں۔ ایسی خوشبو کبھی سونگھی نہیں، مگر کسی کی ہمت نہیں کہ کمرے کے اندر جائے۔ بیگم کے پلنگ پر چادر تکیہ غلاف چھت گیری مسہری پردے سب چمکنے لگتے۔ ماشاءاللہ بیگم بیٹھے بیٹھے الکدم سرخ ہو جاتی۔ لال بیر بہوٹی اور اٹھ کر بھاگتی۔ کمرے میں چلی جاتی۔ ایک ایک کر کے سب، دروازے کھٹ پھٹ بھڑ سے بند ہو جاتے ہم سب دیکھتے رہتے۔ کچھ نہیں کر سکتے تھے تعجب کے عالم میں آ جاتے۔ پہلے پہلے تو مجھے رات رات بھر نیند نہ آتی مگر پھر عادت پڑ گئی کیونکہ جمعرات کا تو یہ ورد ہو گیا تھا۔"

"آپ نے باہر لوگوں سے یہ ذکر نہیں کیا؟"

"نہیں ابا جان نے کہا کہ لوگ کہیں گے کوئی مرد آتا ہو گا۔ جن کا فریب بنایا ہے اور پھر لال شہزادے کی یہ تاکید تھی کہ راز گھر سے باہر نہ جائے نہیں تو سارے خاندان کو باندھ دیں گے۔

"یہ تاکید آپ کو کیسے معلوم ہوئی؟"

ابا جان مرحوم کی آواز پر جواب ضرور آتا: ایک دن انہوں نے دروازے کے پاس جا کر کہا۔ "آخر آپ جن ہی تو ہماری شرع محمدی کے پابند ہیں نا فرض جن تو جناب امیر کا غلام ہو گیا تھا۔ آپ بھی اسی کے خاندان سے ہیں، آپ کا مطلب کیا ہے؟ مجھے باپ کی حیثیت سے دریافت

کرنے کا حق پہونچتا ہے۔" تو وہی لڑکی کی آواز میں جواب آیا ــــ "ہمارا مطلب کسی کو تکلیف دینا نہیں ہے۔ ہم اس پر عاشق ہو گئے ہیں۔ اس کو قرآن پڑھتے سنا اور اس کی آواز دل میں اتر گئی اور پھر دیکھا تو ایک جان چھوڑ ہزار جان سے عاشق ہو گئے۔ ہمارا اس کا نکاح ہو گیا ہے۔ ہم ہر جمعرات آیا کریں گے آپ نے اگر کسی سے سانس لی تو پھر خاندان بھر کی خیر نہیں ہے آپ جو بھی مانگیں ہم آپ کو دیں گے اور اگر راز کھلا تو سب کو راندھ دیں گے" ــــ ڈر کے مارے اتی جان تک نے کسی سے کچھ نہ کہا اور ہم لوگ دم سادھ گئے۔ لونڈیاں باندیاں اگر کہیں کہنے بیٹھتیں تو آپ سے آپ منہ بند ہو جاتا۔ ہر جمعرات کو یہ ہوتا رہا اور سب کمال سکوت میں رہے۔"

"اچھا۔ آپ کے والد صاحب مرحوم نے ان لال شہزادے سے کبھی کچھ مانگا بھی؟"

"ابا جان کی ایک بڑی تمنا تھی کہ انہیں ویسے ہیرے الماس کی انگوٹھی پہننے کو ملے۔ ویسی ہی جیسی انہوں نے جانِ عالم حضرت واجد علی شاہ کے ہاتھ میں دیکھی تھی۔ اور کوئی تمنا نہ تھی۔ خدا کا دیا سب کچھ گھر میں تھا تو ایک رات انہوں نے دروازے کے پاس جا کر کہا "اگر آپ جو چاہیں لا سکتے ہیں تو مجھے ایک ہیرے کی انگوٹھی لا دیجئے ویسی ہی جیسی جانِ عالم پہنتے ہیں۔" جواب آیا۔ "اس سے بہتر مگر ایک شرط ہے۔ کل رات آدھی رات کے بعد آپ گومتی میں جا کر گھٹنے گھٹنے پانی میں کھڑے ہوں اور آنکھیں بند کر لیں اور جب آواز آئے تو ہاتھ پھیلا دیں اور انگوٹھی لے لیں۔" والد مرحوم یہ شرط پوری کرنے کو تیار نہ ہوئے۔ میں نے کہا۔ "میں کروں گا ایسا۔" دوسری جمعرات کو انہوں نے لال شہزادے سے اجازت مانگی تو جواب ملا۔ "اگر آپ نہیں تو بڑے مرزا یا چھوٹے مرزا ہی آ جائیں مگر تیسرا کوئی نہیں۔" تو صاحب دوسری ہی رات کو میں گھوڑے پر سوار ہو کر گومتی پہونچا۔ چاند ماہ کامل ہو رہا تھا۔ لہریں بڑی ناز سے کھیل رہی تھیں۔ ادھر حسین آباد کے پاس گومتی کا موڑ ہے نہیں؟ گومتی کا نام ہی گومتی ہے کیونکہ وہ گھومتی بل کھاتی جاتی ہے۔ اس موڑ پر ہم لوگ پیراکی کیا کرتے تھے اور چلتے وقت مجھے وہی یاد آیا۔ میں وہاں پہنچا۔ گھوڑے کو چھوڑ دیا۔ سدھا ہوا جانور، کیا مجال جو جگہ سے ہلتا۔ ساکت کھڑا ہو گیا۔ میں جوتا اتار پائنچے چڑھا گھٹنے گھٹنے پانی میں پہنچ کر کھڑا ہو گیا۔ آنکھیں بند کئے ہوئے کافی دیر کھڑا رہا۔ دل مضبوط کئے رہا۔ اک دم سے آواز آئی۔ "لیجئے چھوٹے بھائی انگوٹھی۔" بالکل ماشاء اللہ بیگم کی آواز تھی۔ میں نے ہاتھ بڑھایا اور انگوٹھی ہاتھ میں آ گئی۔"

"آ گئی؟" تعجب سے میرے منہ سے نکلا۔

"جی صاحب سچ مچ کی چاندی کی انگوٹھی اور اس میں وہ ہیرا لگا ہوا کہ کسی نے کبھی خواب میں نہ دیکھا ہو۔"

"اس کو دوسروں کو دکھانے کی اجازت تو نہ ہو گی؟"

"کیوں نہیں بالکل اجازت تھی۔ صاحب ابا جان نے جوہریوں کو دکھائی پچیس ہزار اور تیس ہزار کی آنکی گئی۔ کہا گیا کہ جانِ عالم کی بھی انگوٹھی اس تک نہیں پہونچتی۔ وہ والد پہنتے رہے اس کے بعد بھائی جان پہنتے رہے۔ لوگ اسے دیکھنے آتے۔ میری اس انگلی میں رہی۔ غدر کے بہت بعد جب ہم سب لٹ لٹا گئے اور کچھ پاس نہ رہا تو میں نے تیس ہزار کی ایک مہاراجہ کے ہاتھ بیچی۔ ان کے یہاں اب تک ہے۔"

"یہ سب سے زیادہ تعجب کی بات ہے۔"

"ارے آپ اسی پر تعجب کرتے ہیں۔ اب دنیا میں گناہ بہت بڑھ گئے ہیں اس لئے جناتوں نے بھی اپنا تعلق توڑ دیا ہے ورنہ ہماری جوانی میں یہ بات بڑی عام تھی اور لال شہزادے تو گھر کے داماد تھے جو فرمائش کی جاتی پوری ہوتی۔"

"وہی گومتی میں گھٹنے گھٹنے پانی میں کھڑے ہو کر؟"

"نہیں۔ بعد میں یہ سلسلہ بھی نہیں رہی۔ صبح ہوتی، دروازے کھلتے، ماشاءاللہ بیگم اوھر شاہ نشین میں امی جان کے پاس آتی۔ ہم کمرے میں جاتے اور جو چیز مانگی ہوتی وہ وہاں رکھی ملتی۔ اور سنئے۔ بھائی جان نے ایک دفعہ جاڑے میں اصلی سفیدہ آم مانگے۔ یہ ناممکن بات تھی مگر صبح کو وہ بھی رکھے ملے اور وہ مزے کے سفیدے کہ کیا کہوں۔ ایسا مزہ تو کبھی ملا ہی نہیں۔ امی جان کی تاکید تھی کہ زیادہ سے مانگنا بڑی بُری بات ہے ——— اس لئے ہم لوگ زیادہ مانگتے نہیں تھے۔ یہ چیزیں بھی امتحاناً مانگی تھیں۔ اور صاحب گھر میں جب کسی چیز کی ضرورت ہوتی جیسے مسندیں، تکیے، ظروف، پردے وغیرہ وہ آجاتے۔ ایک دفعہ ابا جان نے کہا کہ یہ سب پردے پرانے ہو گئے نئے کمخواب کے ہونے۔ دوسرے دن نئے کمخواب کے پردے ہر جگہ کے لئے کمرے میں رکھے ملے۔ امی جان کا چاندی کا پاندان پرانا ہو گیا تھا۔ گنگا جمنی خاصدان پچک گیا تھا وہ سب نئے آگئے اور پہلے والوں سے دُگنے بھی دُگنے۔ اور صاحب کٹھیوں میں اناج غلہ جو بھرا جاتا تھا وہ ختم ہی نہیں ہوتا تھا۔ گائے بھینسوں کا دودھ بڑھ گیا تھا۔ بکریوں کے تین تین بچے ہونے لگے تھے۔ گھوڑے بھی بڑے چاق و چوبند ہو گئے تھے۔ لال شہزادے کے سائے کا عجب اثر تھا میاں۔ آپ لوگوں سے بیان کرتا ہوں تو یقین نہیں کرتے۔ کیسے یقین آئے۔ اسی شیطانی دجالی دور نے دماغ چوپٹ کر دیئے ہیں۔" امی جان کہتی تھیں کہ صندوقچہ آپ سے آپ روپوں سے بھر جاتا ہے۔ لونڈیوں کے سرہانے تکیے کے نیچے اشرفیاں نکلیں۔ کیا کیا بتاؤں۔ پورے سات برس تک یہی ہوتا رہا۔ ماشاءاللہ بیگم کوئی سولہ برس کی تھی ——— " اور یہ کہہ کر ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ ہاتھ سے آنسو پونچھنے لگے۔

پھر وہ قبر کے پاس آکر اس پر ہاتھ ٹیک کر فاتحہ پڑھنے لگے۔ اب وہ زار و قطار رو رہے تھے۔ رومال سے آنکھیں پونچھ کر بولے "اچھا ہوا مر گئی۔ جانِ عالم ہی کے زمانے میں بھگدڑ میں نہ معلوم کیا حال ہوتا اور آج کل کل جُگ میں کیا معلوم کیسے جیتی۔ آنکھوں کے سامنے اس کا نقشہ آجاتا ہے، جی تڑپنے لگتا ہے۔ مگر جو مرضی اللہ کی۔"

میں تھوڑی دیر خاموش رہا۔ وہ قبر سے الگ ہو کر پھر اسی جگہ آکر بیٹھ گئے جہاں پہلے بیٹھے تھے۔ میں نے سوال کرنے کی جسارت کی۔ "آخر ان کا انتقال کیسے ہوا؟"

انہوں نے افسردہ آواز میں کہا۔ "اب کیا بتاؤں میاں۔ انگریزوں کا زمانہ اس ... میں اچھا ہے کہ کوئی کسی سے زبردستی نہیں کر سکتا۔ مگر اُدھر غدر سے پہلے پولیس کا یہ انتظام نہ تھا۔ جس کا ذرا زور ہوا بس جو چاہا کر لیا۔ ماشاءاللہ بیگم کے حسن کا چرچا ہر بڑے گھر میں تھا۔ مشاطائیں مہریاں دوڑتی پھرتی تھیں۔ جب سے وہ بارہ برس کی ہوئی روز ابا جان کے پاس پیغام آتے تھے۔ وہ کہتے ابھی بچہ ہے ابھی اس کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ ابھی دائیاں منع کرتی ہیں۔ یہاں تک کہہ دیا کہ وہ عورت ہی نہیں ہے میاں اس کی شادی نہ ہو سکے گی مگر لوگ کہاں ماننے والے تھے۔ چار برس تک دن رات پیغام پر پیغام رقعے پر رقعے آتے رہے ہم سب رد کرتے رہے مگر منہ سے یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ اس کی شادی لال شہزادے سے ہو گئی ہے ورنہ راندے جاتے۔ آخر کو شہزادے دارا قدر نے جو ایک کٹنی سے اس کا حال ہی سن کر عاشق ہو گئے تھے اس قدر ضد کی کہ کیا کہا جائے۔ آخر میں دھمکی دی کہ گھر پر حملہ بول دیں گے اور اٹھا کر لڑکی کو لے جائیں گے۔ آج کل انگریزی حکومت میں ایک رئیس شریف کیا چھوٹے سے چھوٹے آدمی کے ... اگر ناممکن نہیں تو بس ایک صورت تھی کہ جانِ عالم تک رسائی ہو۔ مگر یہ معاملہ ایسا تھا کہ ان پر بھی اعتبار کرنا عبث تھا۔"

"لال شہزادے سے کوئی مدد نہ مانگی؟ آخر ان کا ہی معاملہ تھا۔"

"سنئے تو۔ ان سے ابا جان نے کہا۔ کوئی جواب نہ آیا۔ بار بار کہا کوئی جواب نہیں اور پھر ابا جان نے بھی تو غضب کیا۔ ارے انکار کرتے۔

دارا قدر کے سپاہیوں کو آنے تو دیتے۔ مجھے تو یقین تھا کہ وہ سب دھوئیں کی طرح اڑ جاتے مگر ابا جان ڈر گئے اور کہہ بیٹھے "اس کی شادی لال شہزادے سے ہو چکی" بس کیا تھا۔ ماشاء اللہ بیگم کو سخت بخار چڑھا۔ ایسا سخت کہ جسم پر چنے ڈال دو تو بھن جائیں۔ کسی حکیم کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ کیا ہوا۔ امی جان قلق سے بے بس ہو کر زمین پر گریں اور جاں بحق تسلیم ہو گئیں۔ ماشاء اللہ بیگم سوتی کی سوتی رہ گئی۔ اس کو یہاں لا کر دفن کیا۔ ابا جان نے سرخ پتھر کی قبر بنوائی مگر کچھ ہی دنوں میں وہ بھی مر گئے۔ جان عالم کو انگریزوں نے قید کر کے کلکتے بھیج دیا۔ جلد ہی دارا قدر نادار ہو گئے۔ ہمارا بھی سب لٹ گیا۔ ہم دو بھائی رہ گئے۔ بھائی جان بھی گذر گئے۔ میں اکیلا رہ گیا ہوں۔ ہاں بچے، پوتے، نواسے، سب ہی ہیں۔ ماشاء اللہ گھر بھرا ہے۔ وثیقہ ملتا ہے۔ آرام ہے مگر جینے کو جی نہیں چاہتا۔ عمر ہے کہ شیطان کی آنت ہو گئی ہے۔ سانپ ہو گیا ہوں۔ غدر آنکھوں کے سامنے سے گذر گیا۔ اب کوئی ستر برس ہو گئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کل کی بات ہے۔ ماشاء اللہ بیگم اس قبر سے نکلی ہوئی سامنے دکھائی دیتی ہے ویسی ہی لال جیسی لال شہزادے کے اس پر آنے کے وقت ہو جایا کرتی تھی۔"

نواب صاحب پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے تھے۔ اس لئے میں نے آگے کوئی سوال کرنا مناسب نہ سمجھا۔ ہم دونوں قبرستان سے چلے آئے اب میرے لئے یہ قصہ نواب صاحب کے خیال کے ساتھ وابستہ ہو گیا تھا اور جب ایک دن پھر اطمینان سے میں اگلے دن گھر پر ان سے ملا تو میں نے پوچھا۔ "لال شہزادے والا قصہ روحانی اور مادی تعلقات کا کچھ ایسا قصہ ہے کہ میری سمجھ میں نہیں آتا؟"

وہ بگڑ کر بولے۔ "قصہ، قصہ کیسا! یہ سب ان آنکھوں کا دیکھا واقعہ ہے۔ آج کل کے آپ لوگ گھڑی ہوئی کہانی سمجھتے ہیں۔ میرے لئے علم الیقین سے عین الیقین۔ اور رہا یہ کہ لال شہزادے غائب ہو جاتے اور چیزیں سب ملتی ہی رہیں۔ ماشاء اللہ بیگم کی روح کو لے گئے جسم کو چھوڑ گئے تو میاں جنات ہوں گے۔ ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ یہ آپ لوگوں کے سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔ مشاہدہ محض مشاہدہ ہے۔ میں نے آنکھوں دیکھی، آپ بیتی آپ پر تی بیان کی۔"

منیر احمد شیخ

قیمتی آدمی

یہ شخص جو اس وقت میرے سامنے بیٹھا ہے سر سے پاؤں تک نفرت کی پوٹلی ہے جب بات کرنے کو منہ کھولتا ہے تو ایسی بو چاروں طرف پھیل جاتی ہے جو گندگی کی ڈھیری کو چھیڑنے سے پیدا ہوتی ہے۔ گندگی کی ڈھیری چپ پڑی رہے تو پڑی رہے لیکن جب اس پر بارش کا قطرہ گرتا ہے یا کوئی چلتے ہوئے اسے چھڑی سے ہلاتا ہے تو پھر ڈھیری کی خاموشی ٹوٹ جاتی ہے اور پاک اور مصفّا فضا میں ناقابلِ برداشت بدبو کے بگولے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ یہی حال اس شخص کا ہے جو میرے سامنے بیٹھا ہے۔ یہ میرے سامنے کیوں بیٹھا ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ میں اس کے سامنے بٹھا دیا گیا ہوں۔ مجھے اس کے سامنے روزانہ بیٹھنا ہی پڑتا ہے کہ اگر نہ بیٹھوں تو اپنے پیٹ کا دوزخ کیونکر ٹھنڈا کروں۔ پیٹ کا دوزخ آدمی کو بڑا ذلیل کرتا ہے۔ میں جتنا اوپر اٹھنے کی کوشش کرتا ہوں اور اپنے آپ کو یہ سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں کہ تو محض رزق کا کیڑا نہیں بلکہ وہ طائر لاہوتی ہے کہ جب اسے رزق سے پرواز میں کوتاہی کا احساس ہونے لگے تو وہ رزق پر موت کو ترجیح دیتا ہے لیکن یہ شخص جب بھی دیکھتا ہے کہ میں اڑنے کے لئے پر تولنے لگا ہوں تو فوراً مجھے یقین دلا دیتا ہے کہ تو رزق کا کیڑا ہے اس لئے اڑنے کی کوشش مت کر۔ میں رزق پر موت کو ابھی تک ترجیح نہیں دے سکا کہ یہ میری کمزوری ہے اور شاید میں چاہتا بھی نہیں۔ اپنے پیٹ کی آگ ٹھنڈی کرنے کے لئے اس شخص کو مجھے ایسے ہی برداشت کرنا پڑتا ہے جیسے انسان اپنے جسم کی گندگی کو برداشت کرنے لگ جاتا ہے اور آہستہ آہستہ بھول جاتا ہے کہ گندگی اس کے جسم کا لازمی حصہ ہے

لیکن یہ گندگی جو میری زندگی میں شامل ہو چکی ہے اب جسم کے علاوہ روح پر بھی چھانے لگی ہے اس سے مجھے کبھی کبھی احساس ہوتا ہے کہ آدمی کو اتنا مجبور کیوں کر دیا گیا ہے کہ وہ ایک لقمے کے لئے ایسے لوگوں کو برداشت کرے جو آدمیت کی نفی کرتے رہتے ہیں اور جن کا وجود بنایا ہی اس لئے گیا ہے کہ وہ آدمی کو جانور کی سطح پر ہی رکھیں، اس کا اعتماد، یقین اور ایمان متزلزل کرتے رہیں اور یہ باور کراتے رہیں کہ آدمی کتنا مجبور اور کتنا محدود ہے۔ میرا قصہ یہ ہے کہ میں چھوٹے آدمیوں کی صحبت میں رہ رہ کر خود بھی بڑا چھوٹا ہو جاتا ہوں اور میرے نازک احساسات پر زندگی کی گھناؤنی حقیقتوں کی دبیز چادر گرنے لگتی ہے اور میں اپنے آپ کو اللہ کی بڑی گھٹیا مخلوق سمجھنے لگتا ہوں جسے اتنا بھی اختیار نہیں کہ تازہ اور شفاف ہوا میں سانس لے سکے۔ دن کی دھوپ میں جب چاہے نہا سکے اور خوشبوؤں کو چن سکے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اپنے پیدا کرنے والے سے کیا شکایت کروں۔ اگر اس نے ہمیں یہ کہہ رکھا ہے کہ تو اپنے لقمے کو اپنے پسینے میں ڈبو کر کھائے گا تو اے لوگو! گواہ رہنا کہ میرا لقمہ میرے پسینے سے ہمیشہ تر ہوتا ہے ـــــ لیکن یہ شخص میری زندگی میں کیوں آ گیا؟

یہ چھوٹے قد اور گھٹے ہوئے جسم کا آدمی اس ملک میں اپنے آپ کو اول درجے کا شہری قرار دیتا ہے اور مجھے تیسرے درجے

کا۔ مجھے اس پر اعتراض ہے لیکن اس میں یہ شخص سچا ہے کہ جس سسٹم نے اسے پیدا کیا ہے اس میں آدمی کی اپنی کوئی حیثیت نہیں رہی ہے۔ حیثیت، کرسی، عہدے پیسے کی رہ گئی ہے اور آدمی ان میں اپنی شکل چھپاتا پھرتا ہے۔

کفیل الرحمٰن ایم۔ اے جب پیدا ہوا تو اس کی شکل پر بھی وہی معصومیت تھی جو پیدا ہوتے وقت ہر شخص کے چہرے پر ہوتی ہے۔ اس کی بھولی بھالی ہنسی پر اس کے ماں باپ اور رشتہ دار سبھی جان نثار کرتے تھے۔ اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کی انگلیاں کتنی معصوم تھیں اور اس کے ننھے ننھے پاؤں جب ہوا میں لہراتے تھے تو یوں لگتا تھا کہ دنیا میں اگر کوئی بدی ہے تو وہ ان پاؤں کے سامنے نہیں ٹھہر سکے گی۔ ہاتھوں، پاؤں، انگلیوں اور ہونٹوں کی یہ معصومیت بدی اور نفرت کو ختم کرتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ لیکن کفیل الرحمٰن جب بڑا ہوا اور مجھے اس کے سامنے لاکے بٹھا دیا گیا تو انہیں ہونٹوں، ہاتھوں، پاؤں اور انگلیوں نے یوں حرکت کرنا شروع کی کہ دنیا کی تمام بدیاں اور نفرتیں میرے سامنے میز پر آن کے ڈھیر ہو گئی ہیں۔ اس کے ہونٹ جب ہنسنے کے لئے کھلتے ہیں تو ان میں سے تضحیک اور نفرت پھوٹ پھوٹ کے نکلتی ہے اس کے ہاتھ قصاب کے ہاتھ ہیں اور اس کی انگلیاں زہر بھری سوئیاں ہیں اور اس کے پاؤں گناہ کے ہتھوڑے ہیں جو زمین پر برستے ہیں تو وہ لرز اٹھتی ہے۔

کفیل الرحمٰن جب پیدا ہوا تو یتیم تھا اس نے ابھی چند سانس ہی لئے تھے کہ اس کے باپ کے سانس ختم ہو گئے۔ چچا نے اس کی کفالت کی ذمہ داری اپنے سر لے لی اور اس کا نام کفیل الرحمٰن رکھا کہ اب یہ کسی کا محتاج نہ ہو۔ کفیل الرحمٰن کا چچا غریب آدمی تھا۔ اپنی اولاد کو پالنے کے ساتھ ساتھ اب بھتیجے کا بوجھ بھی پڑ گیا لیکن آدمی باہمت تھا۔ خود روکھی سوکھی کھا کے گذارا کر لیتا لیکن کفیل کو چوپڑی لاکے دیتا۔ اس نے کفیل کو کبھی احساس نہ ہونے دیا کہ اس کا باپ مر گیا ہے اور اس کا کوئی پرسانِ حال نہیں رہا۔ کفیل نے بی۔ اے پاس کیا تو چچا بھی چلتا بنا تب اُسے روٹی کی فکر ہوئی اور ساتھ ہی یتیمی کا احساس بھی اُبھرا۔ کفیل کا باپ درحقیقت اس کے بی۔ اے کے بعد ہی مرا تھا۔ اپنے اصل باپ کے بارے میں وہ کوئی احساس نہ رکھتا تھا۔

اس نے سوچا کہ اسے کوئی نہ کوئی کام کرنا چاہیے۔ کراچی کارپوریشن میں کلرک کی ایک اسامی کے لئے درخواست دی اور لکھا کہ میں بی۔ اے پاس ہوں اور یتیم ہوں۔ بہت سے بہن بھائیوں کی ذمہ داری میرے کندھوں پر آن پڑی ہے ـــ ایڈمنسٹریٹر کارپوریشن نے درخواست کنندہ کو مستحق جانا اور کفیل کو بھرتی کر لیا۔ وہ نوکری کرنے لگا لیکن یہ غم اسے کھائے جا رہا تھا کہ وہ ایم اے پاس نہیں کر سکا۔ ایم۔ اے پاس کرنا ضروری ہے کہ آدمی پڑھا لکھا شمار ہوتا ہے اور نوکری بھی بڑی ملتی ہے۔ اگرچہ یہ دونوں باتیں اپنی جگہ خاصی دلچسپ تھیں لیکن وہ اپنے ارادے کو پورا کرنے پر تلا ہوا تھا۔ اس نے تہیہ کیا کہ وہ نوکری کے ساتھ ساتھ کسی پرائیویٹ کالج میں نائٹ کلاسز میں داخلہ لے کر ضرور امتحان دے گا اور ایم اے کر کے ہی رہے گا۔ بظاہر یہ فیصلہ اسے بہت مشکل معلوم ہوا مگر جب اس نے داخلہ لے کر تیاری شروع کی تو یہ مشکل اسے بہت آسان لگنے لگی۔ دو سال میں اس نے ایم اے کر لیا اور اپنے نام کے ساتھ یہ ڈگری اس طرح چپکا لی کہ اس کے جاننے والے اُسے کفیل الرحمٰن کے بجائے کفیل الرحمٰن ایم اے کہنے لگے۔ ایم اے کے الفاظ وہ اس طرح ادا کرتے تھے جیسے وہ ایم اے پہلے ہے اور کفیل الرحمٰن بعد میں۔ ایم اے اس کے جسم پر اس سوٹ کی طرح چڑھا ہوا تھا جو پہننے والے کی شخصیت کو دبا دیتا ہے اور آدمی بعد میں نظر آتا ہے اور سوٹ پہلے اور ساری شخصیت سوٹ کی کریزوں میں سمٹ جاتی ہے۔ دُور سے دیکھیں تو یوں لگتا

ہے کہ آدمی نہیں سوٹ چلا آ رہا ہے۔ کفیل الرحمٰن کے ساتھ بھی ایسا ہی حادثہ ہوا تھا۔ ایم۔ اے کرنے کے ساتھ پہلی خرابی یہ ہوئی کہ اب وہ اپنے آپ کو پڑھا لکھا آدمی سمجھنے لگا۔ کسی شخص کا اس سے ذکر ہوتا تو وہ پہلی بات یہ پوچھتا کہ اس نے کتنی جماعتیں پاس کر رکھی ہیں۔ جب اسے پتہ چلتا کہ وہ تو بی۔ اے پاس بھی نہیں تو وہ اس شخص کی بات کو اہمیت دینے کے لئے ہرگز مائل نہ ہوتا۔ جب اسے بتلایا گیا کہ بعض بڑے بڑے عالم اور ادیب کسی کالج یا یونیورسٹی کے تحصیل یافتہ نہ تھے تو یہ ماننے ہی سے انکار کر دیتا کہ وہ لوگ بڑے عالم یا ادیب بھی ہو سکتے ہیں۔ ایم۔ اے کرتے ہی اسے کلرکی سے وحشت ہونے لگی۔ اس نے ایڈمنسٹریٹر کو لکھا کہ اب میں ایم۔ اے ہو گیا ہوں، مجھے ترقی دی جائے یا پھر تنخواہ بڑھائی جائے۔ ایڈمنسٹریٹر نے جواب دیا کہ فی الحال یہ دونوں صورتیں نہیں ہو سکتیں اس کے لئے انتظار کرنا پڑے گا۔ لیکن وہ بہت بے صبرا ہو رہا تھا۔ ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد اس کے خیالات میں یک لخت تبدیلی ہو گئی تھی۔ وہ سمجھنے لگا تھا کہ وہ ملک کا سب سے زیادہ پڑھا لکھا آدمی ہے اور یہ ڈگری حاصل کر کے اس نے اپنے خاندان پر ہی نہیں سارے ملک پر احسان کیا ہے۔ اس کامیابی کا تذکرہ اخباروں میں ہونا چاہیے۔ شہر میں جلوس نکلنا چاہیے۔ سرکار کو نوکریاں پلیٹ میں سجا کر اسکی خدمت میں پیش کرنی چاہئیں۔ اخبار اور ریڈیو پر تو خیر یہ خبر نہ آئی لیکن نوکری کے معاملے میں وہ خوش قسمت تھا۔ ایک نیم سرکاری محکمے میں ایک اچھی سی نوکری مل گئی۔ دوسرے لفظوں میں اسے افسری سمجھ لیجئے کہ اس میں ایک کمرہ، چپڑاسی، اسٹینو، گھنٹی، ماتحت لوگ، سبھی الا بلا جمع تھی۔ افسر بننے کا اسے بہت شوق تھا اور جب وہ پہلے روز کرسی پر بیٹھا تو اسے یوں لگا کہ وہ بہت بڑا فاتح ہے اور لوگ اس کے حضور نذرانہ پیش کرنے حاضر ہوں گے۔ ماتحتوں کو نئے صاحب کی آمد کی خبر ہوئی تو ان میں کھسر پھسر ہونے لگی۔ چند ایک نے کہا کہ ہمیں خود جا کر سلام کرنا چاہیے۔ دوسروں کو اس سے اختلاف تھا۔ ان کا خیال تھا کہ افسری ماتحتی الگ چیز ہے، جو شخص باہر سے آیا ہے اسے خود مل کر اپنا تعارف کروانا چاہیے۔ اسی لے دے میں چار پانچ ماتحت چق اٹھا کر اس کے کمرے میں گھس گئے اور اسے خوش آمدید کہا۔ اس نے ماتحتوں کو بڑے اخلاق سے کرسیوں پر بیٹھنے کو کہا اور پھر ان سے اپنا تعارف کرایا اور بتلایا کہ افسر تو آج کل بہت سے لوگ بن جاتے ہیں لیکن وہ عام آدمی نہیں ہے اسے بڑی محنت سے یہ نقطہ ان کے ذہن نشین کروانا پڑا کہ وہ ایک خاندانی آدمی ہے، اور یہ نوکری جو اسے ملی ہے دراصل اس کے ذاتی رتبے سے بہت کم ہے۔ اس کا ذاتی رتبہ کیا تھا؟ اس کا اندازہ لگانا بیچارے دفتر کے کلرکوں کے لئے بہت مشکل تھا۔ ان کے لئے تو اتنا ہی کافی تھا کہ جو شخص اس کرسی پر آن کے بیٹھ گیا ہے وہ ضرور کوئی بڑھیا شے ہی ہوگا ورنہ وہ اس کرسی پر کیسے بیٹھتا۔ اپنی نالائقی اور کبھی کبھی اپنی ناکامی کا احساس انہیں اسی کرسی کو دیکھ کر ہوتا اور اس کا تذکرہ وہ بے جھجک کرتے ہوئے پائے جاتے کہ اگر وہ اس قابل ہوتے تو آج کلرک کیوں ہوتے۔ واقعہ یہ تھا کہ اس کرسی کی شان ان کلرکوں کے خون پسینے ہی کے طفیل قائم تھی اور جیسا کہ ہر جگہ ہوتا ہے اصل کام کرنے والے لوگ ہمیشہ نیچے کی سطح پر ہوتے ہیں، یہاں بھی ساری گاڑی ان ماتحت لوگوں ہی کے دم سے چلتی تھی۔ اوپر والا محض دستخط کر دیتا تھا اور اپنے تئیں یہ سمجھتا تھا کہ ادارے کا کام اسی کے طفیل چل رہا ہے۔ یہ غلط فہمی افسری اور ماتحتی کے رشتے میں توازن رکھنے کے لئے بڑی ضروری ہوتی ہے

اس نے اپنے سب ماتحتوں کو ایک روز میٹنگ کے لئے بلایا اور دفتری امور پر اُن سے گفت و شنید شروع کی۔ میٹنگ کے

آغاز میں اس نے ماتحتوں کی اُن کے سامنے تعریف کی کہ وہ بہت لائق اور ماہر آدمی ہیں اور یہ کہ ان کا تجربہ بہت ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ جہاں تک میرا تعلق ہے میں تو یہاں آپ کی راہنمائی میں کام کروں گا۔ آپ مجھے راستہ بتلائیں گے تو چلوں گا۔ ماتحت اپنی اپنی جگہ اس تعریف پر بہت پھولے اور ہر ایک کو پہلی بار پتہ چلا کہ وہ بھی اپنی جگہ اہم آدمی ہے اور دفتری عمارت میں بنیادی پتھر کا درجہ رکھتا ہے۔ ماتحتوں کے سامنے تعریف کرنے کا گُر اُس نے خاص طور پہ اختیار کیا تھا کہ اس طرح وہ اپنی تعریف سن کر اور زیادہ کام کرنے کی تگ و دو کریں گے۔ حالانکہ ہوتا یہ تھا کہ بیچ میں سے ایک آدھ ماتحت کہنے لگ جاتا کہ یار یہ تعریف تو بس ایسے ہی لگتی ہے۔ گدھوں کی طرح ہم سے کام لیتا رہتا ہے اور خود کرتا کراتا کچھ نہیں۔ کبھی کبھی وہ اپنے بارے میں کہے گئے سارے تعریفی کلمات پر شک کرنے لگ جاتے اور انہیں یقین سا ہونے لگتا کہ یہ شخص فراڈ ہے۔

خیر دفتری امور پہ ان سے گفت و شنید شروع ہوئی تو درمیان میں اس نے اپنی کوٹھی میں خانسامے کو فون کیا کہ اس وقت میں بہت ضروری میٹنگ کر رہا ہوں تم مچھلی کا انتظام کرو کل ہمارے افسر کی دعوت ہے۔ اس نے اپنا منہ ٹیلیفون سے ہٹایا اور ریسیور ہاتھ میں تھامے ہوئے ماتحتوں سے کہا۔ "معاف کیجئے میں گھر میں خانسامے سے بات کر رہا تھا۔" اور پھر ان سے دفتری امور پہ بات کرنے لگا۔ ٹیلیفون کے دوسرے سرے پر خانسامہ ریسیور کان سے لگائے کھڑا تھا۔ اس نے ماتحتوں کو دو ایک ہدایات دینے کے بعد پھر خانسامے کی طرف رجوع کیا اور کہا۔ "ہاں! مچھلی کافی ہونی چاہیے۔ ہمارا افسر مچھلی کا بہت شوقین ہے۔ اسے کل کے ہاٹ کیس میں بند کر دینا۔ ہمیں پکنک پہ جانا ہے۔" ریسیور سے منہ ہٹاتے ہوئے اس نے پھر ماتحتوں سے کہا کہ خانسامے کو ذرا ضروری ہدایات دینا تھیں۔ ہدایات دینے کا اسے لپکا تھا۔ ماتحتوں سے بھی وہ گفتگو اس طرح کرتا جیسے وہ گدھے ہیں اور انہیں ہدایات دینا نہایت ضروری ہے۔ ماتحتوں کی عزت اس کے دل میں ذرا سی نہ تھی۔ وہ بظاہر اُن کے منہ پر ہر ایک کی تعریف کرتا لیکن ساتھ ہی ایک آدھ فقرہ ٹانگ کھینچنے کو کہہ دیتا۔ تاکہ ماتحتوں کو اپنے مقام کا احساس رہے۔ ماتحتوں کو اپنے مقام سے ہلتا ہوا دیکھ کر وہ بہت خوفزدہ ہو جاتا تھا۔ اور اسے یوں لگتا تھا کہ اگلے لمحے وہ اس سے بے تکلف ہو جائیں گے اور اس کی کرسی الٹ جائے گی۔ ماتحت جب ہدایات کی فہرست سنتے سنتے بے چین ہونے لگتے تو وہ اندر سے بہت خوش ہوتا کہ وہ انہیں اذیت دے رہا ہے۔ مگر وہ کُسک نہیں سکتے۔ ماتحتوں کو بور کرنے اور انہیں بے چین کرنے میں اسے بڑی لذت ملتی تھی اور وہ ان بے چاروں پر بڑے اُلٹے سیدھے رعب ڈالتا۔ یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ وہ ان سب سے زیادہ کام کرتا ہے۔ اسے زکام بھی ہو جاتا تو وہ ماتحتوں کو بلا کر کہتا۔ "کام کی زیادتی کی وجہ سے طبیعت ٹھیک نہیں رہی۔" کبھی کہتا کہ وہ ساری رات جاگتا رہا ہے اور دفتر کا کام کرتا رہا ہے۔ کبھی کہتا کہ ڈاکٹروں نے اسے متنبہ کیا ہے کہ اگر وہ اسی طرح کام کرتا رہا تو کسی روز اس کا نروس سسٹم خراب ہو جائے گا۔ وہ بیچارے اس کی سن لیتے اور یہ سوچتے ہوئے اپنی سیٹوں پر آ جاتے کہ اس شخص سے کام کرنے کے لئے پتہ نہیں کتنی محنت کرنا پڑے گی۔

کفیل الرحمٰن اپنے ماضی سے خوفزدہ تھا۔ اپنے عزیز رشتہ داروں سے خوفزدہ تھا۔ اپنے ماتحتوں سے خوفزدہ تھا۔ اپنے افسروں سے خوفزدہ تھا۔ اس نے چچا کے خاندان کو چھوڑ دیا کہ ان کے ساتھ رابطے کا مطلب تھا کہ وہ بھی انہیں میں سے ہے اور پھر ان کے اخراجات تھے جو کفیل الرحمان کو پہاڑ دکھائی دیتے تھے۔ یہ تمام خوف اس کے اندر جڑوں میں

اتر چکے تھے اور اس نے اپنی ذات کے گرد ایک خول چڑھا لیا تھا۔ وہ اپنے افسروں کے آگے ڈینگیں مارتا۔ ماتحتوں کے سامنے بڑیں ہانکتا۔ دائیں بائیں الٹے سیدھے جھوٹ ہی جھوٹ۔ اتنا جھوٹ کہ اس کے چہرے پر منافقت کی لکیریں اس کے خدوخال کو مسخ کرنے لگیں۔ سر کے بال پیچھے سے اڑنے لگے مگر یہ خول روز بروز موٹا ہوتا جا رہا تھا اور کفیل اس کے اندر روز بروز کمزور اور دبلا۔

دفتر سے اسے ڈیڑھ ہزار روپے مہینے کے ملتے تھے۔ دفتر سے واپسی پر وہ چپڑاسی کو اپنی کار میں بٹھا کر لے جاتا اور اس سے گھر کے کام کرواتا۔ ہر ممکن سہولت جو اسے ملازمت کی وجہ سے ملتی تھی وہ اس کو استعمال میں لاتا۔ وہ جس کوٹھی میں رہ رہا تھا اس کا کرایہ دفتر کی طرف سے ادا ہوتا تھا۔ ذاتی کار میں دفتر جاتا اور سواری کا خرچہ دفتر سے وصول کرتا۔ دفتر جاتے ہوئے راستے کے چوک میں کھڑا ہوا سپاہی ہاتھ کے اشارے سے اسے گزرنے کے لئے کہتا کہ حادثہ نہ ہو جائے۔ یہ سپاہی حکومت سے اسی بات کی تنخواہ لیتا تھا کہ کفیل جب سڑک سے گزرے تو حادثے سے دوچار نہ ہو۔ دفتر کے دروازے پر چوکیدار ہوتے جو دن رات دفتر کی حفاظت کرتے جس میں وہ کام کرتا تھا۔ دفتر میں سردیوں کے موسم میں آگ کی انگیٹھیاں ہوتیں جن میں روزانہ چار سیر کوئلہ ڈالا جاتا تاکہ کفیل الرحمان کا کمرہ گرم رہے۔ گرمیوں میں ٹھنڈے پانی کی مشین کام کرتی اور خس کی ٹٹیوں پر سات گھنٹے پانی ٹپکایا جاتا۔ پانی ٹپکانے کے لئے دو آدمی ملازم رکھے گئے تھے۔ کفیل بیمار ہوجا"؟ تو اس کے علاج کا خرچ بھی دفتر ادا کرتا۔ سال میں ایک مہینے کی چھٹی ملتی اور اس کے ساتھ پورا سفر خرچ بھی۔ اس کی تنخواہ کا بل بنانے کے لئے ایک خزانچی اور پانچ چھ کلرکوں کا ایک الگ شعبہ تھا۔ یہ سب لوگ کفیل کے لئے کام کرتے۔ شام کو جب خانساماں سونے لگتا تو وہ اس خیال سے مطمئن ہوتا کہ آج صاحب کو وقت پر گرم گرم کھانا مل گیا ہے۔ ٹریفک کا سپاہی وردی اتار کر لیٹتا تو خدا کا شکر ادا کرتا کہ آج سڑک پر کوئی حادثہ نہیں ہوا۔ دفتر کے چوکیدار مطمئن تھے کہ چوری کی کوئی واردات نہیں ہوئی۔ دفتر کا جمعدار شام کو مزے سے سیٹی بجا بجا کر گاتا کہ سارا دن اس نے دفتر کو صاف رکھا۔ خس کی ٹٹیوں پہ پانی ٹپکانے والے اپنا فرض ادا کرنے کے بعد تنوری روٹیاں اور دال کھا کر اطمینان سے سو جاتے۔ انگیٹھیوں میں کوئلہ ڈالنے والے اپنی باقاعدگی پر نازاں تھے۔ سٹینو رات دن کفیل الرحمان کے ذاتی خطوط ٹائپ کر کر کے شام کو تھکا ہارا اپنے بال بچوں میں مست ہو جاتا۔ خزانچی اور کلرک اس کا بل بنا کر مہینے بھر کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاتے۔ یہ سب لوگ کفیل الرحمان کے لئے کام کرتے تھے۔ صبح سے شام تک اور پھر شام سے صبح تک۔

اور کفیل الرحمان کیا کرتا تھا؟

یہ وہ سوال تھا جو چپڑاسی، کلرک، چوکیدار، سپاہی، سٹینو اور خانساماں کسی سے نہ کر سکتے تھے۔ خانساماں کو اتنا پتہ تھا کہ کل صاحب کے افسر کے لئے مچھلی بنا کر ہاٹ کیس میں بند کرنی ہے اور ماتحتوں کو اتنی خبر تھی کہ صاحب ساری رات جاگ جاگ کر دفتر کی فکر کرتا ہے اور میٹنگ کے دوران سرکاری ٹیلیفون پر خانساماں کو ہدایت دیتا ہے کہ اسے بڑے صاحب کے لئے مچھلی بنانا ہے۔

کہتے ہیں کہ سال کے بعد جب کفیل الرحمان کا تبادلہ ہوا تو سالانہ رپورٹ میں درج تھا کہ کفیل الرحمان ان قیمتی افسروں میں سے ہے کہ اگر ان کا وجود نہ ہو تو سارا کاروبار ہی رک جائے۔

غلام محمد

اُس کے دُکھ

اس نے راہ چلتے بک اسٹال پر اپنی پسندیدہ کتاب دیکھی۔ وہ برسوں سے اس کتاب کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے اس کتاب پر تبصرے پڑھے تھے اور اس کی شہرت سنی تھی مگر اتفاق سے جیب میں ایک پھوٹی کوڑی نہ تھی۔ وہ سخت بیقرار ہوا۔

وہ اپنی ڈھائی سو روپے کی ملازمت کے باوجود فقیر تھا۔ روپے ہر ماہ اس کے ہاتھ میں آتے مگر چشم زدن میں جانے چپکے سے کدھر نکل جاتے اور اس کی تمام ضرورتیں تشنہ رہ جاتیں۔ اس نے بک اسٹال پر ہی وہ کتاب پڑھنا چاہی۔ کتاب کو طاق پر سے اتارا۔ کیا دیکھتا ہے کہ اس کے صفحات پر پن لگا دی گئی ہے تاکہ پڑھنے کے لئے لوگ اسے خریدنے پر مجبور ہو جائیں۔ اس نے مایوس ہو کر کتاب طاق پر رکھ دی۔ دکاندار منہ کھا کر ہنسنے لگا۔

شہر میں کوئی ایسی لائبریری نہ تھی۔ جہاں سے اسے یہ کتاب مفت پڑھنے کو مل جاتی۔ کتاب دیکھنے کے بعد ہی اس کے اندر قیامت کا ہیجان برپا ہو گیا تھا۔ وہ اسے پڑھنے کے لئے بے تاب تھا۔ اسے پا لینے کا جذبہ، اس کے نزدیک عشق کا سا جذبہ تھا اور وہ اس پر غالب تھا۔ وہ سوچنے کی مسلسل کوشش کرتا رہا۔ کہ وہ کتاب کیسے حاصل کی جا سکتی ہے اور سوچنے کی ہر تازہ کوشش کرتے اسے محسوس ہوتا جیسے وہ ایک انتہائی پرانی موٹر کو اسٹارٹ کرنے کی جدوجہد کر رہا ہو۔ اس کے ذہن میں خیالات اسی واہیات موٹر کی طرح زور سے چنگھاڑ کر یک لخت خاموش ہو جاتے۔

یہ عمل ایسا تھا کہ اس کی پسلیاں دکھنے لگیں اور ہاتھ مفلوج سا ہو گیا۔ اس نے کروٹ بدلی۔ آنکھیں اوپر اٹھا کر دیوار کی گھڑی پر جا مرکوز ہو گئیں۔ پنڈولم ہلکے ہلکے جنبش کر رہا تھا۔ اس کا دل بھی اسی طرح دھڑک رہا تھا۔ اس نے پنڈولم کو غور سے دیکھنا شروع کیا اور دم بھر کے لئے محسوس کیا کہ ویسا ہی ایک پنڈولم اس کے سینے میں بھی ہلکے ہلکے جنبش کر رہا ہے۔ وقت بظاہر گزر رہا ہے، مگر لگتا ہے جیسے دکھوں کی گھڑیاں ٹھہر گئی ہیں۔ وہ حیران و پریشان تھا کہ وہ کب تک ایک لنگڑے کی مانند ان ٹھہری ہوئی گھڑیوں سے بھاگنے کی کوشش کرتا رہے گا۔ گھڑی میں اس وقت شام کے چھ بجے تھے۔ وہ ۲۴ گھنٹوں سے بھوکا تھا۔ اس کی آنتیں سکڑ رہی تھیں اور لگتا تھا جیسے کسی نے آپریشن کر کے اس کے پیٹ میں ایک راکشش کا بچہ چھپا دیا ہے اور وہ نالائق سخت اودھم مچائے ہوئے تھا۔

اس نے تین گلاس پانی غڑاپ غڑاپ حلق سے نیچے اتار کر پھر اپنے ذہن کی واہیات موٹر کو اسٹارٹ کرنے کی سعی کی۔ سب سے بڑا مسئلہ یہ درپیش ہوا کہ اب کے قرض کون دے گا۔ وہ اپنے تمام احباب سے قرض لے چکا تھا اور عزیز و اقارب کے حالات اس سے بہتر نہ تھے ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس نے آنکھیں موند لیں۔ یکے بعد دیگرے کئی چہرے تیزی کے ساتھ گزر گئے، وہ ایک فقیر کی طرح کشکول لئے مایوس کھڑا رہا۔ اس کے بعد کچھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ سامنے تاریکیوں کا جال نظر آیا۔ پھر جیسے اس کے ذہن کی موٹر واویلا مچا کر فوراً ٹھنڈی ہو گئی۔

اس کے پیٹ اور ذہن میں شدید جنگ ہو رہی تھی اور خیالات کی دھجیاں اڑ رہی تھیں۔ اس نے سوچا یہ غلیظ پیٹ کیسا مضبوط اور توانا ہے۔ اس کے آگے ذہن کی لطیف لہروں کی جیسے کوئی حیثیت نہ تھی، لگتا تھا، جیسے توپ کے منہ پر آدمی کھڑے ہیں، مگر آج رات اسے لکھنا ہی پڑے گا۔ یہ اس کا اہم ترین فریضہ تھا۔ وہ اسے قطعی نظر انداز نہیں کر سکتا۔

مگر اس کے پاس کوئی شئے ایسی نہ تھی جسے فروخت کر کے وہ اپنے پیٹ کی آگ بجھا لیتا چنانچہ توپ کے منہ پر ایک ایک کر کے ہزاروں آدمی آئے اور بھک سے اڑتے گئے۔

وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ یہ اداس، تنہا اور غیر دلچسپ کمرہ اس کی ذات کا سمبل تھا۔ ایک طرف میز پر چند کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ دوسری طرف ڈھیلی ڈھالی چارپائی تھی جس میں چنے کی دال اتنے بڑے بڑے کھٹمل بھرے پڑے تھے جو چارپائی سے نکل کر دیواروں پر رینگنے لگتے۔ دیوار پر ایک کھونٹی تھی۔ الگنی پر کچھ کپڑے تھے۔ اس نے سوچا، اپنا قلم بیچ کر میں کام چلا سکتا ہوں۔

اس کا قلم ایسا ویسا نہ تھا۔ اگلے وقتوں کا شیفر تھا اور بہت تیز اور اچھا لکھتا تھا۔ اس کے بڑے بھائی نے اسے یہ قلم بطور تحفہ عنایت کیا تھا۔ وہ اس قلم سے جدا ہونے کے تصور سے لرز گیا۔ مگر کوئی چارہ نہ تھا۔ اس نے الگنی سے پتلون اور قمیض اتار کر پہنی اور قلم اپنی جیب میں رکھ کر تیزی کے ساتھ باہر چلا گیا۔ دوسرا مسئلہ یہ درپیش ہوا کہ وہ اسے کہاں جا کر بیچے؟ سڑک کے کنارے اچکے، بدمعاش اور جیب کترے یہ کام کرتے تھے۔ اور ظاہر ہے وہ ایک باعزت شہری تھا اور ادب لکھتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ پیٹ نے اسے اچکوں، بدمعاشوں اور جیب کتروں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ مگر وہ ان کے درمیان کسی قیمت پر بھی اپنا وجود برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے قلم کی دکانوں کے پھیرے لگانے شروع کر دیئے۔

کوئی ایک گھنٹے میں اس نے محسوس کر لیا کہ اس کا عزیز ترین سرمایہ جو اس کی تین انگلیوں کا ایک لازمی حصہ بن چکا تھا، محض پانچ روپوں میں بک سکتا ہے اور اس عمل میں اس کی بھوک شدید تر ہو گئی۔ چنانچہ اس نے اپنا قلم بیچ دیا۔ (اس نے بڑے کرب سے سوچا کہ دیوار کی کھونٹی اس کی اپنی ملکیت ہوتی تو قلم نہ بیچ کر وہ اسے پانچ روپوں میں بیچ دیتا۔)

ایک ایک روپیہ کے پانچ نوٹ اپنی مٹھی میں بند کر کے وہ ایک ریسٹوران کی طرف چل پڑا۔ اس کی ناک گوشت اور چپاتی کی ذائقہ دار خوشبو سے مہک اٹھی۔ اس نے اپنی رفتار تیز کر دی اور فیصلہ کیا کہ وہ اپنے پیٹ کے اندر چھپے ہوئے راکشش کے بچے کو کھلا کھلا کر مار ڈالے گا۔ اسی کمبخت نے اسے قلم بیچنے پر مجبور کیا۔ قلم، اس کا بیش بہا سرمایہ۔ وہ ایک دم قلاش ہو گیا تھا۔ اسے اپنے قلم کا بڑا افسوس تھا۔

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا ریسٹوران کی طرف چلا جا رہا تھا اور خیالات اس کے ذہن میں پرانی موٹر کی مانند شور مچا رہے تھے دفعتاً پیچھے سے کسی نے اس کے شانے پر ہات رکھ دیا۔ وہ سخت خوفزدہ ہوا۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ چوری کرتے پکڑا گیا ہے۔ سارے جسم میں لرزہ آ گیا۔ اسے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی جرات نہ ہوئی۔ وہ فوراً بھاگ کھڑا ہونا چاہتا تھا۔ مگر اس کے شانے پر گرفت مضبوط ہو گئی۔ دوست!

"کون؟" اس کا دل، بہت زور سے دھڑکا، اس نے پلٹ کر دیکھا۔ "عبدالتین، آہ، کیسے ہو؟"

"کیوں گھبرا گئے سعید؟"

"نہیں عبدالتین ایسی کوئی بات نہیں۔ مگر تم اتنے پریشان کیوں ہو؟"

عبدالتین نے اپنے مخصوص ڈرامائی لہجے میں جواب دیا۔ "ڈھائی سو روپے کمانے والوں کا پورا معاشرہ پریشان ہے۔ اب ایسے بھی دن آئے ہیں کہ چاول سونے کے داموں بکنے لگا۔ پانی پر ٹیکس بیٹھا۔ مکانوں کے کرائے بڑھ گئے مجھے ایک پیالی گرم چائے پلاؤ۔"

سعید کی مٹھی جس کے اندر پانچ روپے تھے بھنچ گئی اور ایک گھونسے کی شکل اختیار کر گئی: "نہیں یار یہ ڈھائی سو کا آدمی معذور ہے۔"

"کیوں معذور ہے؟"

"پیسے نہیں ہیں۔"

"چلو میں پلاتا ہوں۔"

"مجھے بھوک لگی ہے، میں چائے نہیں پی سکتا۔"

"ایڈیٹ!"

گنجا عبدالمتین جس کا چہرہ پلاسٹک کی مانند چمک رہا تھا، غرایا اور یہ کہہ کر چلا گیا کہ بیٹے اب چائے ہی پی کر اپنی بھوک کی آگ بجھاؤ یہ گوشت چپاتی اور چاول تمہارے لئے نہیں۔ سعید کے خشک ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ بکھری۔ اس کی آنکھوں تلے بے شمار گنجے، جن کے چہرے پلاسٹک کی مانند چمک رہے تھے ابھرنے لگے۔ اس نے اپنے دوستوں کے بارے میں سوچا۔ سب کے سب مصیبتوں میں مبتلا ہیں، پھر اس کے تصورات میں چپکے سے نصراللہ در آیا۔ کہنے لگا۔ "میرا بچہ سخت بیمار ہے۔" سعید نے اپنا گھونسہ شدید تر کر لیا۔ "میرے پاس صرف پانچ روپے تھے۔ ایک ڈاکٹر سے مشورہ لیا اور وہ پانچ روپے اس کی نذر ہو گئے۔"

"مجھے بہت افسوس ہے نصراللہ۔"

"خدا کے لئے اس وقت میری مدد کرو۔ یہ نسخہ دیکھو!"

سعید نے نسخہ دیکھا، لکھا ہوا تھا۔ ٹیرامائسین۔

"نصراللہ بولا۔" ڈاکٹر نے کہا ہے۔ فوراً ٹیرامائسین دیا جائے اور بخار دیکھنے کے لئے مجھے ایک تھرمامیٹر بھی لینی ہے، مگر جیب میں ایک کوڑی نہیں۔"

سعید نے کوئی جواب نہ دیا۔

نصراللہ بولتا رہا "مجھے یہ چیزیں خریدنے کے پیسے ادھار دیدو۔"

سعید اپنی نظریں نیچی کئے، ریستوران کے متعلق سوچنے لگا۔ اس کی ناک میں گوشت اور چپاتی کی اشتہا انگیز خوشبو چلی آ رہی تھی اور بھوک بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کے پاس بھلا پیسے کہاں ہیں۔ وہ کہاں سے ادھار دے سکتا ہے۔ وہ آپ چوبیس گھنٹوں سے فاقہ کر رہا ہے اور اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کی خاطر وہ اپنا قلم بیچ کر دولا ہو چکا ہے۔ اس کے ذہن میں پھر واہیات سی موٹر غل مچانے لگی: "نصراللہ! مجھے معاف کر دو۔ میں ایسے کڑے وقت میں تمہارے کام نہیں آ سکتا، میں زندگی بھر تمہیں اپنا منہ نہیں دکھا سکتا۔ میں خود پریشان ہوں۔" یہ الفاظ ادا کرنے کے لئے اس نے نصراللہ کی طرف دیکھا۔ نصراللہ کی آنکھوں سے ایک آنسو ٹپکا۔ بولا۔ "بھائی اس جگ میں شادی بیاہ کر کے بھی ہمیں چند لمحات خوش ہو لینے کا حق نہیں پہنچتا۔" وہ اپنی آنکھیں خشک کرتا ہوا چل دیا۔

سعید بھی نصراللہ کی طرح پڑھا لکھا فقیر تھا۔ وہ اس کے دکھوں سے واقف تھا۔ اس کے دل پر گہری چوٹ لگی اور اس کی مٹھی جو ایک گھونسے کی شکل اختیار کر گئی تھی ڈھیلی ہو گئی۔ اس نے پکارا۔ "نصراللہ! نصراللہ!"

نصراللہ نے مڑ کر دیکھا۔ سعید نے اسے ہاتھ کے اشارے سے بلایا، اور آدھا راستہ چل کر اس سے ملا۔ بولا "نسخہ مجھے دے دو۔ میں

تمہارے بچے کے لئے دوا اور تھرمامیٹر خرید دوں گا۔" نصراللہ کا چہرہ جو مایوس ہوچکا تھا' امید کی کرنوں سے چمکنے لگا۔

پھر وہ لڑا مائیسین اور تھرمامیٹر اپنے ہات میں لے کر بولا۔ "میرے عزیز بھائی' مجھے جلدی سے جانے دو۔ میں پھر تم سے مل کر تمہارا شکریہ ادا کروں گا۔" وہ لپک کر چلا گیا۔

نصراللہ کا تصور گڈ مڈ ہو کر آنکھوں سے اوجھل ہوگیا۔ سعید نے اپنی مٹھی کھول کر اطمینان کر لیا کہ روپئے اسی کے پاس ہیں اور وہ نصراللہ کے بچے پر خرچ نہیں ہوئے۔ وہ اتنی دیر فٹ پاتھ پر ساکت کھڑا تھا اور لوگ اسے بڑی حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ وہ تیزی کے ساتھ ریستوران کی طرف لپکا۔ راستے میں کئی لوگوں سے ٹکرایا۔ انہوں نے اسے گھور گھور کر دیکھا۔ وہ ان نظروں سے بے نیاز لپکا چلا جا رہا تھا۔

وہ بک اسٹال کے قریب سے گزرا تو اس کے قدم وہیں منجمد ہو کر رہ گئے۔ پھر وہ رینگنے کے انداز میں بک اسٹال میں داخل ہوگیا اور اپنی پسندیدہ کتاب کو اس طرح للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا جیسے وہ کتاب نہ ہوئی' گوشت اور چپاتی ہوگئی۔ اس کی آنتوں میں ایک خفیف سی جنبش ہوئی' اور منہ میں رطوبت پیدا ہوگئی' اور محسوس ہوا جیسے آنتوں میں آگ بھڑک اٹھی ہے۔ اس نے کتاب اپنے ہات میں لیکر دکاندار سے پریشان کن لہجے میں پوچھا۔ "کیا قیمت ہے؟"

دکاندار نے بے نیازی سے اس کی طرف دیکھا۔ "چار روپئے بچھتر پیسے۔"

"اتنی زیادہ قیمت"؟

کتاب کے صفحات پر پن لگا دی گئی تھی۔ اس نے کتاب کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اسے پا لینے کا جذبہ اس کے نزدیک عشق کے برابر تھا۔ اس کے پاس صرف پانچ روپئے تھے۔ اور ظاہر ہے۔ کتاب سے اس کے پیٹ کی آگ نہیں بجھ سکتی تھی۔ اس کی بھوک ناقابل برداشت ہو چکی تھی۔ اس نے انتہائی مکارانہ طور پر سوچا۔ کیوں نہ کتاب چرا لوں؟۔ مگر وہ اس بھیانک تصور سے ڈر گیا' اور کتاب اس کے ہات میں کانپنے لگی۔

پچیس پیسوں میں اس کا پیٹ نہیں بھر سکتا تھا اور بھوک ایسی شدید تھی کہ اس کے ذہن سے کتاب کا تصور غائب ہوگیا اور ناک میں گوشت اور چپاتی کی اشتہا انگیز خوشبو اڑی اور اس کی آنکھوں تلے ایک دھواں سا اٹھتا لگتا تھا' جیسے پھر واہیات سی موٹر اس کے ذہن میں شور مچانے لگی ہے۔

وہ کتاب کو وہیں چھوڑ کر ریستوران کی طرف چل پڑا۔

اختر جمال

بڑا گھر

اللہ میاں کے گھر سے وہ خوبصورت اور پاک روح سیدھی اس کال کوٹھڑی میں چلی گئی - !

ایک پھٹے ہوئے میلے کمبل پر اس کے ننھے سے وجود کو لٹا دیا گیا اور اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا ——— پہلی مرتبہ اپنی ننھی ننھی سہمی آنکھوں سے خدا کے جہان کو دیکھا - ! اسے ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آیا - ایسی گھٹن اور ایسا اندھیرا تو اسے ماں کی کوکھ میں بھی محسوس نہ ہوا تھا۔ اس لئے کہ تب تو وہ اپنی ماں کی آنکھوں سے دیکھا کرتا تھا - گندی ہوا کا ایک تیز جھونکا ——— نتھنے سے دماغ میں بدبو کا بھبکا چھوڑ کر چلا گیا -

جنت کی مثالی خوبصورتی، پاکیزگی اور صفائی کے بعد اس نئے ماحول میں اس کا دم گھٹنے لگا - پھر ایک میلی سی بدبودار کپڑوں والی عورت نے اسے اپنے سینے سے لگایا اور اپنے لہو کا امرت قطرہ قطرہ اس کے ہونٹوں میں ٹپکایا - اور پھر اسے سب چیزیں اچھی لگنے لگیں - قربت اور اپنائیت کا اتنا گہرا احساس اسے پہلے کبھی نہ ہوا تھا - اسے میٹھی نیند آ گئی اور اس کے ہونٹوں پر وہ میٹھی مسکراہٹ پھیلنے لگی جو صرف دودھ پیتے ننھے بچوں کے ہونٹوں پر ہی آیا کرتی ہے - معصوم اور بے خبر مسکراہٹ جس میں سچی خوشی جگمگاتی ہے - !

صبح سات بجے کال کوٹھری کا دروازہ کھولا گیا - یہ سلاخ دار کوٹھری چوڑی کم اور لمبی زیادہ تھی - رات کو عورتیں ساری ضروریات اندر کوٹھری ہی میں پوری کیا کرتی تھیں - اس وجہ سے کوٹھری انتہائی متعفن تھی - تالا کھولتے ہی عورتیں ایک ایک کر کے برآمدے میں نکل آئیں اور ان کے پیچھے سینکڑوں مکھیاں کوٹھری میں بھنبھناتی داخل ہوئیں -

ادھیڑ عمر کی موٹی ٹارٹن نے جب ایک قیدی عورت کی گود میں اسے دیکھا تو حیران ہو کر بولی " ارے یہ شریر اتنے بڑے تالے میں سے بھی اندر آ گیا " ——— پھر اس نے بچے کو گود میں لے کر کہا " پکا چار سو بیس ہے ——— چار سو بیس - ! "

اور پھر دوسرے ہی لمحے اس کے اندر سوئی ہوئی ممتا ترس کھا کر بولی " بدنصیب ! " سچ تو کہہ رہی تھی وارڈن - اس کی آمد پر ڈھولکیاں بجیں نہ گیت گائے گئے اور نہ ہی مٹھائی تقسیم ہوئی - اس کے لئے کسی نے چھوٹے چھوٹے کرتے اور خوبصورت رضائیاں تیار نہیں کیں - نہ ہی کسی دادی یا نانی نے ارمانوں سے گود میں لے کر اسے گھٹی پلائی - وہ دنیا میں اس لئے آیا ہے کہ قدرت اسے پیدا کرنے پر تلی ہوئی تھی جیسے وہ اگر نہ آئے گا تو اللہ میاں کے رنگا رنگ کارخانے میں کسی چیز کی کمی رہ جائے گی - جہاں گورے کالے پیلے ہر قسم کے انسانوں کی پہلے ہی اتنی بہتات ہے کہ زمین انہیں کھلانے پلانے اور ان کا بوجھ اٹھانے سے عاجز آ گئی ہے اور تنگ آ کر انسان جانوروں کی افزائش نسل اور اپنی نسل کشی پر مجبور ہے، لیکن اللہ میاں نے اسے سوچ سمجھ کر ہی پیدا کیا ہوگا - زندگی کی کبھی نہ ختم ہونے والی کہانی کو اس نئے اور خوبصورت کردار کی ضرورت ہوگی اور اس لئے اللہ میاں نے کہہ دیا کہ " ہو جا " اور وہ ہو گیا - !

قیدی عورتوں نے سہارا دے کر برآمدے میں اس کی ماں کو اور قریب ہی سرخ کمبل پر اسے لٹا دیا - دھوپ میں اس کی آنکھیں مند گئیں

اس قدر چکا چوند بڑی عجیب سی لگی ۔!

سلاخوں دار کوٹھری اندر سے دھوئی گئی اور پھر قیدی عورتیں اپنے اپنے کاموں میں لگ گئیں۔ کسی کے ذمہ صفائی ستھرائی تھی۔ کسی کو باورچی خانے کے برتن اور کسی کو باغ کا کام ملا۔

نو بجے جیل کا ڈاکٹر آیا۔ سب عورتوں کو قطار میں کھڑا کر دیا گیا۔ ڈاکٹر ان سب کو چھوڑ کر ننھے اور اس کی ماں کے پاس آیا "کتنا خوبصورت اور تندرست بچہ ہے" ڈاکٹر نے حیران ہو کر سوچا۔ کیا کال کوٹھری اتنے پیارے بچوں کو جنم دے سکتی ہے؟ اور پھر اسے دکھ ہوا کہ اب یہ بھی خارش اور آنکھیں دکھنے کی بیماریوں میں مبتلا ہو جائے گا۔ ڈاکٹر نے بچے اور اس کی ماں کو دوائیں لکھ کر دیں اور پھر دوسری عورتوں کا معائنہ کرنے لگا۔ باری باری نمبر پکارے گئے اور اپنے اپنے نمبر پر وہ عورتیں دوائیں لینے آئیں۔ زیادہ تر عورتیں ماحول کی غلاظت کی وجہ سے بیمار تھیں۔ خارش اور آنکھیں دکھنے کی بیماریاں عام تھیں چند عورتوں کو نزلہ زکام اور کھانسی کی شکایت تھی۔

ڈاکٹر کے جانے کے بعد قیدی عورتوں کی سربراہ رضیہ اس کی ماں کے پاس آئی اور بولی "تو سات آٹھ روز آرام کر۔ تیرے حصہ کا کام میں کروں گی۔ ڈاکٹر صاحب نے چند روز کی تجھے کام سے معافی دلا دی ہے۔"

رضیہ ایک مضبوط جسم کی سانولی سی عورت تھی۔ اس کی عمر بھی زیادہ نہ تھی وہ ان سب سے زیادہ محنتی اور پھرتیلی عورت تھی۔ وارڈن اسے بجلی کہا کرتی تھی۔ رضیہ سب عورتوں کو ان کے دن بھر کا کام بانٹنے لگی۔ سورج ڈوبنے تک اس چار دیواری کے اندر کے کام ختم ہونے ہی میں نہیں آتے اور سورج ڈوبتے ہی ان سب کو سلاخوں دار کوٹھری میں بند کر کے بڑا سا موٹا تالا لگا دیا جاتا تھا حالانکہ اگر انہیں یوں بند نہ کیا جاتا تب بھی وہ اتنی بڑی بڑی دیواروں کو پھلانگ کر نہیں جا سکتی تھیں۔ مرد قیدیوں کی تو اور بات ہے ان میں سے کئی تو زنجیریں بھی کاٹ کر ان اونچی دیواروں سے یوں نکلے جیسے ہوا ——— کسی کو خبر بھی نہ ہوئی مگر جب بھی ایسی کوئی واردات ہوتی تھی قیدیوں پر زیادہ سختی شروع ہو جاتی تھی سرخ کمبل کے کھٹمل اور جوئیں دھوپ میں چمکنے لگیں۔ وہ میٹھی نیند سو رہا تھا اس کی ماں بھی قریب ہی لیٹی تھی۔ قیدی عورتیں کام میں مصروف تھیں۔ صفائی۔ جھاڑو اور باغ کے کام سے فارغ ہو کر وہ سب دھوپ میں چرخہ کاتنے بیٹھ گئیں ۔ چند عورتیں کھڈی کے کام میں مصروف ہو گئیں۔ صبح ناشتے پر ان سب کو ایک ایک موٹی روٹی اور پتلی پانی سی چائے مل چکی تھی اور اس لئے اب وہ بڑے اطمینان سے اپنے اپنے کام میں لگی ہوئی تھیں۔

قیدیوں کی سربراہ رضیہ بڑی مخلص عورت تھی وہ کئی دفعہ کام چھوڑ کر بچے کے پاس آئی اسے سینے سے لگا کر پیار کیا اور چوما "رابعہ بہن خدا تیرے بچے کا نصیب اچھا کرے" مگر اس کی ماں کو رضیہ کی دعا بھی طنز کی طرح بری سی لگی۔ بھلا اگر نصیب اچھا ہوتا تو یہ یہاں پیدا ہی کیوں ہوتا اس کی ماں نے سوچا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "نہ رابعہ بہن رو نا مت ——— بری بات ہے ——— خدا کی ناشکری مت کر"۔ رضیہ کا حلق بھی آنسوؤں سے نمکین ہوا جا رہا تھا مگر وہ اس کی ماں کو تسلی دیتی رہی "شاید خدا نے ابھی تیری قسمت میں سکھ کے کچھ دن لکھے ہیں تب ہی بیٹا دیا ہے۔"

"اب تک تو اپنی ہی فکر تھی اب اس کی بھی فکر ہو گئی!"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے تمہیں معافی مل جائے ——— !" رضیہ کو اچھی طرح معلوم تھا کہ رابعہ عمر قید کی سزا کاٹ رہی ہے اور اسے معافی نہیں مل سکتی۔ اس جیل خانے کے اندر آئے ہوئے ابھی چند ہی مہینے تو ہوئے ہیں۔ بھلا معافی کیسی ——— ! اور اس بچے کو بھی قسمت

نے خوب ہی پریشان کیا ہے ۔ ! رضیہ اداس ہو گئی ۔ وہ کھرپی لے کر کیاریوں کی گوڈی کرنے لگی مگر جانے کیوں آج پہلی مرتبہ اس کا جی کام میں نہیں لگ رہا تھا ــــــ اس کا جی چاہتا تھا کہ خوب روئے ــــــ !

رضیہ نے جب رابعہ کے ننھے کو سینے سے لگایا تو اسے اپنے بچے یاد آنے لگے ۔ ویسے تو وہ کئی سال ہوئے جب وہ اپنے بچوں کو یاد نہیں کرتی مگر آج تو سینے میں عجیب طرح کی ہوک سی اٹھی ۔ کون جانے وہ سب کیسے ہوں گے ! کیا کرتے ہوں گے ۔ باپ کو محنت مزدوری سے کب فرصت ہے کہ ان سے لاڈ پیار کرے گا اور بڑھی دادی وہ کتنی بدمزاج ہے ۔ دو وقت کی روٹی بھی شاید سکھ سے نہ دیتی ہو ۔ اس کا بڑا لڑکا اب آٹھ سال کا ہو جائے گا اور لڑکی پانچ سال کی ہو گی ۔ ایک لڑکی گود ہی اللہ کو پیاری ہو گئی وہ سب سے زیادہ خوش قسمت تھی ورنہ آج وہ بھی دردر کی ٹھوکریں کھا رہی ہوتی ۔ دونوں بچے سارا دن گلیوں میں آوارہ پھرتے ہوں گے ۔ گالی گلوچ مار پٹائی ۔ وہ جس راستہ پر پڑ گئے ہوں گے وہ بڑا خوفناک ہے ، اس کا انجام بس یہی کال کوٹھری ہے ۔ رضیہ لرز جاتی ۔ ! اسے اپنا بچپن یاد آتا تھا ۔ گاؤں کی زندگی اور پھر اچانک شہر آکر اسے اور اس کی ماں کو کتنی مصیبتیں اٹھانی پڑی تھیں ۔ کون سی بے غیرتی باقی رہ گئی تھی اور جب فضل نے اس سے شادی کرنے کو کہا تھا تو وہ یوں کھل اٹھی تھی کہ اب ساری مصیبتیں ختم ہو گئی ہیں ۔ شادی کے بعد اسے سچا سکھ مل گیا ۔ محنت مزدوری ، بچوں کی بیماریاں ہر تکلیف اس نے صبر سے برداشت کی لیکن جب فضل محنت مزدوری کرنے کے بعد ہانپنے لگا اور پھر خون تھوکنے لگا تو رضیہ کی آنکھوں میں دنیا اندھیر ہو گئی ۔ ڈاکٹر نے کہا علاج تو ہو جائے گا مگر پیسوں کی ضرورت ہو گی اس بیماری کا علاج بھی مہنگا ہے ۔"

رضیہ نے یہ سن کر فیصلہ کن لہجے میں کہا " آپ علاج تو کیجئے پیسوں کا انتظام ہو جائے گا " اور وہ جس نے ساری زندگی پابندی سے نمازیں پڑھی تھیں اور جو سالن میں سے نمک بھی نہ چکھتی تھی اس روز بیگم صاحبہ کے گھر سے سونے کے کنگن چرا لائی ۔

سارا گھر اس کے بھروسے پر چھوڑ کر وہ اڑوس پڑوس میں بیٹھی دن دن بھر باتیں کیا کرتی تھیں ۔ چابیوں کا بھی انہیں خیال نہیں آتا تھا ۔ رضیہ ان کے گھر دو برس سے کام کر رہی تھی اور انہیں رضیہ سے زیادہ کسی اور پر بھروسہ نہ تھا ۔

لیکن اس روز رضیہ فیصلہ کر چکی تھی کہ وہ فضل کے علاج کے لئے دنیا ایک کر دے گی ــــــ ! اور جب اس نے چابیوں کا گچھا حسب معمول تخت پر پڑا دیکھا تو بس اٹھا لیا ــــــ مگر اتنا آسان کام بھی رضیہ کو بہت مشکل معلوم ہو رہا تھا ــــــ ان چابیوں سے اس نے بارہا بیگم صاحبہ کی اجازت سے بکس کھول کر کپڑے جمائے تھے ۔ الماری کھول کر روزانہ وہ خود ہی گھی اور چینی پتی نکالتی تھی لیکن یہی چابیاں آج اسے بچھو کی طرح ڈنک سا مار رہی تھیں مگر وہ تو ہر ڈنک سہنے کا ارادہ کر چکی تھی اس نے مضبوطی سے گچھا پکڑ لیا ۔

جب وہ کمرے میں داخل ہوئی تو بری طرح لرز رہی تھی اس کے ہاتھ پیر کانپ رہے تھے ۔ دماغ چکرا رہا تھا ۔ کبھی وہ اندر قدم رکھتی اور کبھی باہر پلٹ کر دیکھتی ، یکایک اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ فضلو کو مرنے نہیں دے گی اور پھر اس میں بلا کی دلیری آ گئی ۔ اس نے بجلی کی سی پھرتی سے الماری کھولی ۔ اور کنگن ڈبے میں سے نکال کر اپنی پوٹلی میں چھپا لئے ۔

دوپہر کو جب وہ گھر گئی تو ہمیشہ کی طرح بیگم نے اندر بیٹھے بیٹھے اس سے کہا " چلی جاؤ ــــــ " اور وہ خاموشی سے پوٹلی اٹھائے باہر آ گئی ! اسی دن مرلنے میں کنگن بیچتی ہوئی وہ پکڑی گئی ۔ اقبال جرم کے سوا کوئی چارہ نہ تھا ۔ فضلو نے اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں دیکھیں تو اپنا سر پیٹ لیا " کمبخت یہ تو نے کیا کیا ــــــ ! " بیگم کو بھی صدمہ ہوا ــــــ " رضیہ بھی چوری کر سکتی ہے ! اگر رضیہ بھی چور ہے تو پھر شاید کوئی نوکر ایماندار نہیں مل سکتا ــــــ "

کنگن تو بعد میں انہیں واپس مل گئے مگر انہیں اتنے عرصے کے اعتماد اور بھروسے کے لٹ جانے کا دکھ تھا !

رضیہ کو امید تھی کہ چند سال بعد وہ رہا ہو جائے گی لیکن کیا فضلو اس وقت تک زندہ رہے گا اور اس کے بچے ! ان کا کیا ہوگا !

دوپہر کو رضیہ بھی دوسری عورتوں کے ساتھ کھڈی کے کام میں لگ گئی۔ وہ سب سے زیادہ تیزی کے ساتھ کام کر رہی تھی مگر اس کا دل ابھی تک فضلو کے بچے کی طرح روئے جا رہا تھا۔ جانے کیوں آج وہ بری طرح بچوں کے لئے تڑپ رہی تھی۔ اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر سوچا کہ ممتا کی آگ لئے کہیں جھلس ہی نہ جائے۔ ! اور جانے کیوں اس لمحہ رضیہ کو بڑا عجیب سا خیال آیا۔ اس نے سوچا کہ جب اس کے دل میں دو بچے پیدا کر کے اتنا درد ہوتا ہے تو وہ جس نے سارے جہان کو پیدا کیا ہے اس کے کیسا درد اٹھتا ہوگا ——! وہی ان کا مالک ہے —— وہی میرے بچوں کا مالک ہے —! اور پھر وہ مسکرانے لگی اور ہمیشہ کی طرح ہنسنے لگی۔

وہ سب عورتیں جن کے ہاتھوں میں سرت تھا، اپنی پیلی پیلی آنکھوں میں سارے جہاں کی اداسیاں سمیٹے بیٹھی تھیں۔ سب کے خیالات پریشان تھے۔ ان سب کے گھر تھے —— عزیز رشتہ دار تھے —— دکھ بھرے ماضی تھے —— شرم اور دکھ کی کہانیاں وہ ایک دوسرے کو بارہا سنا چکی تھیں مگر ہزاروں باروں کی بھڑاس نکال کر بھی کسی کے دل کا بوجھ ہلکا نہ ہوتا تھا۔ ایسا لگتا تھا وہ جسم میں دل نہیں پتھر کی سلیں رکھے کام کیا کرتی تھیں۔ وہ سب بری عورتیں تھیں، چور اچکی۔ بدمعاش۔ آوارہ۔ قاتل اور خونی عورتیں ——!!

عورت جس کا وجود خوبصورتی ، نرمی ، نزاکت اور پاکیزگی ہے، وہ عورت ان کے جسم میں پیدا ہوتے ہی مر گئی تھی۔ وہ سب تو بس چور، بدمعاش اور قاتل تھیں اور اسی لئے اپنے اپنے جرائم کی سزا بھگت رہی تھیں۔ ان سب میں بچی رفاقت تھی۔ جلن۔ حسد اور اونچ نیچ اس چہار دیواری سے باہر ہیں۔ وہ سب ایک دوسرے کو جانتی ہیں۔ اچھی طرح سمجھتی ہیں۔ اور ایک دوسرے سے ہمدردی کرتی ہیں۔ لوگ اپنے جن جرائم اور کمزوریوں کو ایک دوسرے سے چھپاتے ہیں وہ ایک دوسرے کو بتاتی تھیں اور اس طرح وہ ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئی تھیں۔ نفرت کا تو سوال ہی نہ تھا۔ اس لئے کہ نفرت تو اونچ نیچ پیدا کرتی ہے۔ وہ سب ایک جیسی تھیں۔ ساری بری عورتیں —— اور اس لئے وہ ایک دوسرے سے محبت کرتی تھیں !!

رابعہ کے ننھے سے بچے کو ان سب نے اپنی آنکھوں کا تارا بنا لیا وہ جب ہنستا اور کلکاریاں بھرتا تو وہ سب مسکرانے لگتیں جب اسے کوئی تکلیف ہوتی تو سب کے دل دھڑکنے لگتے۔ وہ کبھی ایک گود میں ہوتا اور کبھی دوسری گود میں۔ وہ ایک بڑے گھرانے کے بچے کی طرح سب کی آنکھوں کا نور بن گیا۔

جب سے فضا پیدا ہوا تھا رابعہ خوش رہنے لگی تھی۔ وہ بہت کم بولا کرتی تھی مگر اب کبھی وہ زور سے کھلکھلا کر ہنس پڑتی۔ اور کہا کرتی تھی کہ خدا کی مرضی تو دیکھو جو بچہ کال کوٹھری میں پیدا ہوا وہ تو زندہ ہے اور جو راحت اور آرام میں پیدا ہوئے اور پلے بڑھے وہ سب اس کو پیارے ہو گئے اس کے دو بچے تو چھوٹی ہی عمر میں مر گئے تھے اور ایک پیدائش کے وقت ہی ختم ہو گیا تھا۔ بچوں کی موت نے اس کے دل دماغ پر بہت برا اثر ڈالا تھا۔ اب اس کال کوٹھری میں وہ خوش رہنے لگی تھی ——! اسے زندہ سلامت بچہ تو مل گیا —— جانے کیوں اس کی اولاد کو باہر سے ملا ہوا راس نہ آتی تھی۔ اسے لئے وہ خوش تھی کہ اپنے بچے کے ساتھ اب وہ ایک محفوظ جگہ پر ہے جہاں شاید موت بھی آتے ہوئے گھبراتی ہے —— اور اسی لئے تو وہ زندہ رہ گیا —— ایسی عجیب عجیب بے وقوفی کی باتیں سوچ کر وہ خوش تھی۔ اس کا بیٹا واقعی سخت جان نکلا —— اس کی آنکھیں بھی خوب خوب دکھیں —— کھلی بھی جھڑ گئی —— اور چھوٹی چھنیاں بھی مگر ساری بیماریاں ڈاکٹر کی دواؤں سے جاتی رہیں اور وہ خوب تندرست تھا۔ سارے دن وہ مٹی میں کھیلا کرتا تھا۔ قریب ہی سب عورتیں کام کیا کرتیں اور وہ مٹی کے ٹیلے بنایا کرتا جب وہ گھٹنوں چلنے لگا تو سب کو نیا تماشا مل گیا اور پھر وہ تتلا تتلا کر بولنے اور چلنے لگا وہ ایک بڑے کنبے اور برادری کا فرد تھا اسے اپنی اہمیت کا شدید احساس تھا۔ ماسی رضیہ —— ماسی جمراں۔ ماسی قرن

ہر طرف ماسیاں ہی ماسیاں تھیں' بوڑھی شبراتن کو وہ دادی کہا کرتا تھا۔ وہ اپنی ہر ضد ان سب سے پوری کروا لیتا تھا۔ عورتوں کے وارڈ کی نگران دو عورتیں تھیں جن کی باری باری ڈیوٹی بدلا کرتی تھی۔ وہ دونوں عورتیں ننھے پر مہربان تھیں۔ ایک کا نام زینب تھا اور دوسری کا رحیمن۔ زینب خاموش سی عورت تھی مگر جب اسے غصہ آتا تو وہ زمین   آسمان ایک کر دیا کرتی تھی۔ قیدی عورتیں اس سے ڈرتی تھیں۔ رحیمن بھی ادھیڑ عمر کی تھی مگر زینب سے وہ عمر میں بڑی تھی۔ وہ بڑی سیدھی سادی سی خدا پرست عورت تھی اور بعض قیدی عورتوں سے اسے دلی ہمدردی تھی۔ وہ سب سے چھپا کر ان کے کام کر دیتی تھی۔ ننھے کو دیکھ کر ہمیشہ مسکراتی اور کبھی کبھی اس کے لئے برفی لایا کرتی تھی۔ برفی کا سوکھا ہوا ٹکڑا جب وہ ننھے کے ہاتھ میں تھماتی تو وہ اس قدر خوش ہوتا کہ اس کی ماں بھی ہنس پڑتی تھی۔ ننھے کو سب پیار سے گل کہا کرتے تھے اس کی ماں نے کہا تھا کہ اس کے باپ کو بھی گھر میں سب گل کے نام سے پکارتے تھے ــــ اور اتنے بڑے گھر میں ایک ہی تو گل تھا۔!!

زینب اکثر مذاق میں اسے چار سو بیس کہا کرتی تھی۔ اس لئے کہ وہ سب نمبروں سے پکاری جاتی تھیں اور وارڈن اونچا قہقہہ لگا کر کہتی اب چار سو بیس کی باری ہے ــــ یہ سن کر وہ مسکراتا اور خاموشی سے اس کا حکم مانتا وہ اکثر معصومیت سے اپنا نام چار سو بیس بتایا کرتا تھا ــ!

جب وہ ذرا بڑا ہوا تو جیل کے برآمدوں، کمروں اور باغ میں آزادی سے گھوما کرتا تھا۔ اسے دن بھر آوارہ گردی کی کھلی چھٹی تھی۔ کوئی بھی منع نہ کرتا تھا۔ دونوں وارڈن عورتیں ترس کھا کر کہتیں "اس بیچارے کا کیا قصور ہے۔ ماں کے جرم کی سزا بھگت رہا ہے۔ اس نے کتنی ہی بار یہ جملہ سنا تھا۔ وہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ ماں نے کیا جرم کیا ہے۔ مگر ماں کے ہونٹوں پر سدا چپ ہی لگی رہتی تھی۔ اس کی ماں بہت کم بولا کرتی تھی اسے دوسروں کی باتیں سننے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ گل کو بھی سب کی باتوں میں مزا آتا تھا۔ مگر اس کا جی چاہا کرتا تھا کہ ماں بھی خوب باتیں کیا کرے حالانکہ ان سب کی بہت سی باتیں تو اس کی سمجھ میں بھی نہ آتی تھیں۔ وہ اس کے ننھے سے دماغ میں ایک الجھن بن کر رہ جاتی تھیں اور جب وہ تنہا ہوتا تو ان الجھنوں کو سلجھانے کی کوشش کرتا۔

پھر رفتہ رفتہ یہ بات اس کی سمجھ میں آنے لگی کہ وہ جگہ جہاں وہ پلا اور بڑھا ہے' اس کا گھر نہیں ہے ـ؛ اور یہ سب اس کی اپنی ماسیاں نہیں ہیں، لیکن جانے کیوں اسے وہ سب اتنی اچھی لگتی تھیں۔ جیسے اس کی سگی ماسیاں ہوں۔ وہ نگران عورت جو سارے دن چیخا چلایا کرتی تھی اور گالی گلوچ جس کی عادت تھی' اسے تو اس عورت سے بھی محبت تھی اور وہ مونچھوں والا وارڈن جس کے خوف سے عورتیں تھر تھر کانپتی تھیں اسے ذرا بھی اس وارڈن سے ڈر نہ لگتا تھا۔ اس کو تو کبھی کبھی اس کی مونچھوں کی بے تکی حرکت پر کھڑے کھڑے زور کی ہنسی آ جاتی تھی۔ جب وہ بات کرتا تو اس کے ہونٹوں سے زیادہ اس کی مونچھیں حرکت کیا کرتی تھیں۔ وہ اکثر ماسی رضیہ سے پوچھا کرتا تھا کہ وارڈن جب اندر آتے ہیں تو بس ماسی رضیہ کو کیوں گھورے جاتا ہے ــــ ماسی رضیہ مسکرا کر چپ ہو جاتی اور ایک دن وہ بولی "اس لئے مجھے دیکھا کرتا ہے کہ میں اتنی گوری ہوں نا ــــ اس کی ماں بہنوں میں کوئی بھی ایسی شکل کی نہ ہو گی" ماسی رضیہ اسے بھی بہت پسند تھی۔ وہ اسے سب ماسیوں سے زیادہ اچھی لگتی تھی۔ اور وہ دونوں ایک دوسرے کے دوست تھے۔ بہت سی باتیں وہ ایک دوسرے سے کہہ لیتے تھے اور آپس میں بہت سی باتیں راز رکھتے تھے ــــ ماسی رضیہ کا یہ راز اسے معلوم تھا کہ وہ رحیمن سے کہہ کر اپنے میاں کو کارڈ لکھواتی ہے ــــ رحیمن بڑی نیک عورت ہے اس کا دل بالکل موم کا سا ہے۔ چاہے وہ کتنی ہی گالیاں بکے مگر وہ بری نہیں ہے۔ رضیہ جب رو کر کہتی ہے "ماسی! آج گھر جا کر میرا کارڈ ڈلوا دینا" اور پھر اسے بتاتی ہے کہ کارڈ میں کیا کیا لکھنا ہے تو رحیمن اسے یقین دلاتی ہے کہ رات ہی بیٹے سے کہہ کر کارڈ لکھوا دوں گی۔ گل ساری باتیں سنتا ہے مگر اس نے کبھی کسی کو یہ بات نہیں بتائی! رضیہ ماسی بھی اس کی بہت سی باتیں جانتی ہے۔ جب وہ جیل کے امرود اور مالٹے توڑ کر کھاتا ہے۔

تو رضیہ ماسی اسے بتا دیتی ہے کہ وارڈن آرہا ہے۔ ایک دو دفعہ اسے وارڈن نے امرود کھاتے بھی دیکھا مگر یونہی مونچھیں ہلا کر چل دیا۔ جیل کے قیدی جیل میں لگے ہوئے پھل نہیں توڑ سکتے۔ سارے پھل ٹوکروں میں بھر کر باہر بھیج دیئے جاتے تھے۔ ماسی رضیہ کہا کرتی تھی کہ بازار میں بکنے کے لئے جاتے ہیں۔

جب وہ ذرا بڑا ہوا تو عورتوں کی حد میں سے نکل کر مرد قیدیوں کے پاس بھی جانے لگا۔ وہ دریوں اور قالینوں کے بننے میں بہت دلچسپی لیتا تھا اور اکثر ان کے ساتھ سوت کے گولے بنانے کا یا اور کوئی چھوٹا سا کام کرنے لگتا۔ یہاں اسے اور بھی مزیدار باتیں سننے کو ملتی تھیں۔ مرد قیدیوں میں جب وہ پہلی بار کھیلنے گیا تو اسے سب سے اچھی بات یہ لگی کہ سارے مردوں کی وارڈن جیسی لمبی لمبی مونچھیں نہیں ہوتیں اور نہ ہی سارے مرد جیلر صاحب کی طرح موٹے ہوتے ہیں۔ وہ سب سفید کپڑے اور سفید ٹوپی پہنے دن بھر انتھک محنت کرتے تھے ایک دوسرے کی ہمدردی اور رفاقت ان کا سب سے بڑا سرمایہ تھی۔ ان میں رحمان بابا بھی تھا جس کی بڑی سی سفید داڑھی تھی جو پانچوں وقت قیدیوں کو نماز پڑھاتا تھا۔ فرصت کے وقت تسبیح پڑھتا رہتا تھا وہ اگو کو بھی باتیں سناتا تھا نبیوں فرشتوں اور ولیوں کے قصے ــــــ ! رحمان بابا کی ساری عمر جیل کی چار دیواری میں گزری۔ سنا تھا وہ خون کر کے آیا ہے۔ جب کبھی اس کے ماضی کا ذکر چھیڑا جاتا، وہ بڑے سکون سے کہتا "خون کرنا ضروری تھا۔ یہ میری غیرت کا حکم تھا!" اور یہ سن کر وہ سب چپ ہو جاتے تھے۔ وہ سب اس کی عزت کرتے تھے۔ شاید غیرت کا تقاضا پورا کرنے کی وجہ سے ہی اسے عمر قید ہوئی تھی۔ ورنہ سیدھی پھانسی ہو جاتی۔ وہ حالات کے سامنے سر نہ جھکا سکنے کا شروع ہی سے اقرار کرتا تھا وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہتا اکبر جان بہت خوبصورت تھی ــــ! میں اس کے لئے روزی کمانے شہر گیا تھا ــــ میں نے بڑی بڑی سختیاں اٹھائیں۔ محنت مزدوری میں رات دن ایک کر دیا ــــ اور پھر اکبر جان کے لئے بہت سے پیسے لے کر لوٹا ــــ اسے گہنے پسند تھے ــــ میں نے سوچا تھا اس کے لئے گہنے بنواؤں گا ــــ مگر جب میں گھر آیا تو میرے تن بدن میں آگ لگ گئی، میں نے ان دونوں کو ایسی حالت میں دیکھا کہ اپنا کلہاڑا اٹھا لیا ــــ وہ بھاگ گیا ــــ اور اکبر جان کو میں نے مار ڈالا ــــ ہاں مار ڈالا ــــ !! گل نے کئی دفعہ رحمان بابا کی کہانی سنی تھی۔ اسے رحمان بابا اور اس کی اکبر جان جو مر چکی تھی دونوں اچھے لگتے تھے۔

ایک افسر تھے جو غبن کے الزام میں آئے تھے۔ وہ اپنا سارا رعب داب اور ٹھاٹ باٹ بھول کر قیدیوں کے سے کپڑے پہنے سارے دن قالین بنا کرتے تھے۔ بننے بہت زور سے تھے، کہا کرتے تھے شاہجہان نے اپنی ملکہ کے لئے سنگِ مرمر کا تاج محل بنایا تھا اور میں نے اپنی بیگم کو سونے کا تاج محل بنا کر دیا ہے۔

انہی قیدیوں میں رمضان بھی تھا جسے سب پاگل سمجھتے تھے وہ ہر وقت چپ رہا کرتا تھا اور جب بارش شروع ہوتی تو ناچنا شروع کر دیتا اور جب تیز دھوپ نکلتی تو سو جاتا وہ کبھی کبھی آسمان کو دیکھ کر یوں اشارے کر کر کے باتیں کرتا جیسے وہاں اس کے بہت سے دوست اور رازدار جمع ہیں۔ کون جانے اگر یہ بچ بھی ہو تو ــــ ! اللہ میاں کے بھید اللہ ہی جانتا ہے۔ گل کو یہ لگتا تھا کہ رمضان پاگل نہیں ہے۔ اور جو چیزیں اسے نظر آتی ہیں۔ وہ دوسروں کو نظر نہیں آتیں۔ اور اسی لئے اس کی باتیں بھی کسی کی سمجھ میں نہیں آتی ہیں۔ ایک دفعہ گل سے اس نے یہ کہا تھا "یہیں رہو گے" اور گل خوش ہو کر بولا "ہاں یہیں رہوں گا ــــ ماں کے پاس تم سب کے پاس!" اور سب قیدی خوب ہنسے تھے۔

زمان خاں ان سب سے عمر میں چھوٹا تھا اس کی عمر تیس سال کے لگ بھگ ہو گی۔ وہ بہت طاقتور آدمی تھا۔ اس نے گل کو کسرت کرنا سکھایا تھا۔ زمان خاں بڑے مزے کی باتیں سناتا تھا وہ اسے بتاتا تھا کہ باہر کی دنیا میں اتنے کھیل تماشے ہیں کہ دیکھ دیکھ کر بھی انسان کا جی نہیں بھرتا

وہ کہا کرتا تھا کہ اگر تم جمیلہ اور گیتا بالی کو دیکھو تو تمہیں پتہ چلے کہ خوبصورتی کیا ہوتی ہے۔ تم نے کوئی خوبصورت عورت نہیں دیکھی۔ ہاں تم سمجھتے ہو کہ ماسی رضیہ دنیا کی سب سے خوبصورت عورت ہے ——— وہ تو تمہیں اس لئے اچھی لگتی ہے کہ تمہاری ماں ہے مگر جانے دے ابھی تو چھوٹا ہے میری بات نہیں سمجھ سکتا۔"

گل کو یہ لگتا تھا کہ خان زماں بس اس لئے بڑے فخر آتا ہے کہ اسے پولیس کو تنگ کرنے میں بڑا مزہ آتا ہے " اتنے ڈاکے ڈالے ہیں مگر اب کے نکلا تو بس آخری ڈاکہ اتنا شاندار ہو گا کہ ساری عمر عیش سے گزرے گی " جب گل آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھتا تو وہ کہتا " مگر بیٹا تو کوئی ڈھنگ کا کام کرنا، شریف آدمیوں جیسا کام ——— !"

" شریف آدمی کون ہوتے ہیں ؟"

" وہ جو جیل نہیں آتے ——— " وہ قہقہہ لگا کر سمجھاتا " یہ جو جیل سے باہر کی دنیا ہے یہاں سب شریف ہی شریف ہیں "

" کیا شریف بننا بہت مشکل ہے ؟"

" نہیں بیٹا بہت آسان ہے شریف بننا۔ اگر بھوکے ہو تو جان دے دو مگر چوری نہ کرنا۔ اگر تمہیں تو ساری عمر فٹ پاتھ پر گزار دو مگر خبردار کسی کے گھر میں نقب نہ لگانا ——— اگر ساری عمر کنوارے رہنا پڑے تو رہو مگر خبردار کسی رنڈی کے کوٹھے کی طرف نہ دیکھنا"

" عجیب بات کرتے ہو خان ——— یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ انسان بھوکا رہے اگر کسی دن روٹی دیر سے آتی ہے تو میرا تو برا حال ہو جاتا ہے اور تم کہتے ہو ساری زندگی بھوکے رہو ——— !"

" بیٹا بھوک کی بھی بہت سی قسمیں ہوتی ہیں تم نے ابھی ایک ہی بھوک دیکھی ہے۔"

" تمہیں روٹی کی طرح اور کس کس چیز کی بھوک لگتی ہے "

" مجھے ——— مجھے تو ہر چیز کی بھوک لگتی ہے چوری کی بھی ——— جتنی سزا ملتی ہے بھوک بڑھتی جاتی ہے "

" گل سہم گیا۔ بھوک کتنی بری چیز ہوتی ہے "

زماں خاں بولا " اگر باہر جا کر تمہیں شریف بننا مشکل لگے تو پھر مگرمچھ بن جانا۔ اس لئے کہ چھوٹی مچھلیوں کو سب پکڑ لیتے ہیں۔ مگرمچھ کو پکڑنے کی کسی میں ہمت نہیں جو اس کے قریب آتا ہے وہ اسے نگل جاتا ہے "۔ یہ بات گل کی سمجھ میں نہ آتی جب وہ ماں کو خان زماں کی باتیں سناتا تو ماں بہت خفا ہوتی " تو خان زمان کے پاس کیوں بیٹھتا ہے۔ وہ اچھا آدمی نہیں ہے ——— وہ تجھے بگاڑ دے گا۔ اس کی باتیں نہ سنا کر "

گل کی ماں کبھی کبھی کہا کرتی تھی " میرا جی چاہتا ہے کہ درخواست دے کر تجھے نانی کے پاس بھیج دوں۔ تو یہاں میرے ساتھ کب تک خوار ہو گا۔ اب جوان ہو جائے گا۔ تجھے دنیا دیکھنا چاہئے۔ تیری نانی بے چاری گاؤں میں اکیلی رہتی ہے۔ وہ بڑی خوشی سے تجھے اپنے پاس رکھے گی، تو اس کا بڑھاپے میں سہارا بن جائے گا، بیچاری بڑی دکھیا ہے "

" نہیں ماں میں تجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا "

" پاگل تو نے دیکھا ہی کیا ہے ——— ان بڑی بڑی دیواروں کے اندر رہنا بھی کوئی جینا ہے۔ گاؤں میں ہرے بھرے میدان ہیں۔ کھیت اور چراگاہیں ہیں۔ تو لڑکوں کے ساتھ کبڈی کھیلا کرے گا۔ جی بھر کے گنے اور چھلیاں کھایا کرے گا۔ گرم گرم سوندھے سوندھے بھٹوں کی خوشبو گاؤں کی ہوا میں بس جاتی ہے۔ تو بانسری بجانا بھی سیکھ جائے گا۔ صبح سویرے اپنے مال مویشی لے کر چرانے جایا کرنا۔ نانی کے پاس گائے اور بھینس ہیں۔ ہماری

گائے بھوری اور سفید ہے۔ اس کے دو بچھڑے بھی ہیں، بچے گھر کا خالص دودھ اور مکھن ملے گا تو اتنا موٹا اور سرخ ہو جائے گا بالکل اناڑ کی طرح ——— !

"نہیں ماں میں تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا، مجھے یہیں اچھا لگتا ہے۔ یہاں سب لوگ اتنے اچھے ہیں"

"ہائے تو نے اچھے لوگ کہاں دیکھے ہیں"، وہ اسے سینے سے لگا کر رونے لگتی "ہائے مجھ جہنم جلی کے ساتھ تو دوزخ میں بھی جائے گا۔

مگر ماں مجھے یہاں آخر کیا تکلیف ہے۔ تو ہے ——— ماسی رضیہ ہے، رحمان بابا ——— کیا یہ سب اچھے نہیں ہیں، بس ایک تھانیدار ہی تو برا ہے ——— اور تو مجھے سب لوگ پسند ہیں ——— ؟"

"ہائے ان ڈاکوؤں اور لیٹروں کو تو اچھا کہتا ہے۔ پاگل اچھے تو وہ ہوتے ہیں جو سارا دن ہل چلاتے ہیں۔ فصل بوتے اور کاٹتے ہیں محنت اور تھکن سے چور ہو کر شام ہی سے دیا گل کر کے سو رہتے ہیں، یا پھر سردیوں کی لمبی راتوں میں الاؤ کے پاس بیٹھ کر گیت گاتے ہیں اور کہانیاں کہتے ہیں۔ ہیر رانجھے اور سوہنی مہینوال کی کہانیاں۔ وہ سارے دکھ ان کہانیوں کے سہارے خوشی خوشی جھیل جاتے ہیں، وہ کسی کے گھر چوری نہیں کرتے ڈاکہ نہیں ڈالتے ——— !وہ فاقے کرتے ہیں اور خوش رہتے ہیں ——— !

"ماں ہم دونوں بھی تو یہاں اتنے خوش ہیں ——— "

"تجھے کیا پتہ کہ خوشی کیا ہوتی ہے ——— با ذرا بڑے اور سمجھ آجائے تو پھر تجھے نانی کے گھر بھیج دوں گی۔ چودہ سال کا ہونے والا ہے۔ آدھی قید تو نے بے گناہ ہی کاٹ لی "

گل کو ماں پر بڑا تعجب ہوتا تھا۔ عجیب بات ہے ماں آخر اتنا کیوں گھبراتی ہے۔ دونوں وقت اچھا بھلا کھانے کو ملتا ہے۔ ماسی رحیمن جو بنا دیتی ہے کیا نانی کے گھر کا کھانا اس سے بھی اچھا ہوگا۔

ایک دفعہ گل نے خواب میں دیکھا کہ وہ نانی کے گھر گیا ہے اور وہاں بالکل تنہا کھڑا رو رہا ہے اور زور زور سے ماں کو پکار رہا ہے۔ اتنے میں اس کی آنکھ کھل گئی۔ ماں پریشان ہو کر بولی "کیا بات ہے گل تو سوتے سوتے کیوں رو رہا تھا؟ ——— کیا خواب میں ڈر گیا ——— ؟"

"ماں میں نے خواب میں نانی کا گھر دیکھا تھا۔ ماں مجھے نانی کے گھر مت بھیج ——— " ماں نے اسے کلیجے کے بالکل قریب کر لیا "پاگل اگر تو چلا گیا تو میں مرجاؤں گی۔ تیری وجہ سے قید خانہ گھر لگتا ہے ——— تو چلا گیا تو میں کیا کروں گی ——— میں تجھے نہیں بھیجوں گی ——— "

وہ خوش ہو گیا۔ وہ سب لوگوں کو چھوڑ کر جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا جب ماسی رضیہ جیل سے جانے لگی تھی تو اس نے ماں سے کہا تھا کہ گل کو ساتھ کر دے مگر ماں نہیں مانی تھی ——— ! اور ماسی رضیہ چلی گئی تھی۔ گل کو ماسی رضیہ کے جانے کا بہت دکھ ہوا تھا ——— وہ اسے بہت یاد آتی تھی مگر وہ ماسی رضیہ کی خاطر ماں کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا ——— !

جیلر صاحب نے کئی دفعہ ہمدردی سے کہا کہ اب گل سمجھدار ہو گیا ہے اسے باہر بھیج دو۔ کوئی عزیز رشتہ دار آ کر لے جائے ——— یہ بیچارہ خواہ مخواہ سزا بھگت رہا ہے!

"نہیں جیلر صاحب ——— یہ چلا گیا تو میں مرجاؤں گی ——— " اس کی ماں رونے لگتی ——— اس کی زرد آنکھوں میں اتنی التجا اور مجبوری ہوتی تھی کہ جیلر صاحب چپ ہو جاتے تھے ——— !

گل نے کئی دفعہ قیدیوں کی زبانی یہ سنا تھا کہ اس کی ماں خون کر کے آئی ہے مگر اس نے ماں سے جب کبھی یہ بات کی وہ ہمیشہ اسے ٹال گئی۔ ماسی رضیہ سے بھی اس نے کئی دفعہ پوچھا تھا مگر ان دنوں وہ اتنا چھوٹا تھا کہ ماسی رضیہ اس سے بہت سی باتیں کرنے کے باوجود یہ بات نہیں کرنا چاہتی تھی ——— مگر ماسی رضیہ جیل سے

رہ جاتی تو اب وہ اسے ضرور بتا دیتی۔ اب وہ کتنا بڑا ہو گیا ہے —— ماں شاید کبھی نہ بتائے گی۔

لیکن ایک دن جانے کیوں اس کی ماں نے اسے سب کچھ بتانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے ماں سے اتنا ہی پوچھا تھا "ماں میرا باپ کیسا تھا —؟" اس کے تصور میں کبھی وارڈن کی بڑی بڑی مونچھیں آتی تھیں۔ کبھی جیلر صاحب کا موٹا اور بے ہنگم جسم اور کبھی رحمان بابا کی لمبی داڑھی —— مگر سب چیزیں اس طرح گڈمڈ ہو جاتیں کہ وہ فیصلہ نہ کر سکتا تھا کہ اس کا باپ کیسا تھا۔

ماں بولتی تیرا باپ بہت اچھا تھا —— چوڑا چکلا —— اور لمبا —— اتنا شاندار آدمی گاؤں میں تو دوسرا نظر ہی نہیں آتا تھا۔ جیل میں تو نے ویسا آدمی کہاں دیکھا ہے —— وہ تو بس ایک ہی تھا —— !

"ماں سب کہتے ہیں تو نے اسے مار ڈالا ہے —— کیوں مار ڈالا" —— ؟

وہ چپ ہو گئی اور پھر یکایک اس نے فیصلہ کر لیا کہ اسے اب سب کچھ بتا دینا چاہیئے جو بات سب کو معلوم ہے وہ اپنے بیٹے سے آخر کیوں چھپائے —— "سچ کہتے ہیں سب —— میں نے اسے مار ڈالا ——" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی —— ! اور جب اس کی سسکیاں تھمیں تو وہ گل کے سر پر ہاتھ پھیر کر بولی "میں نے اسے اس لئے مار ڈالا کہ مجھے اس سے بڑی محبت تھی۔ میں نے کبھی اس کے سوا کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔ اسے پا کر میں اتنی سکھی تھی مجھے اپنا چھوٹا سا گھر سچ مچ جنت لگتا تھا۔ اس نے جلد ہی میری جنت کو دوزخ بنا دیا۔ وہ مزدوری کرنے شہر گیا تو وہاں سے سال بھر بعد لوٹا اور ایک عورت ساتھ لایا —— میں غصے سے پاگل ہو گئی۔ میں اس کی بدلی ہوئی تیوریاں دیکھ رہی تھی۔ جب وہ چھٹی لے کر دو چار دن کو آتا تو خوشامد بھری باتیں کرتا۔ میں بڑی حیران ہوتی کہ وہ خوشامد سے کیوں بولتا ہے —— آخر میں نے گاؤں کے سکول سے چار جماعتیں پڑھی تھیں۔ میں ایسی بھولی نہ تھی کہ اس کے رنگ ڈھنگ نہ سمجھتی مگر سوچتی تھی کہ چلو مرد کی ذات ہے مگر جب وہ عورت گھر میں لے آیا تو میں نہ سہہ سکی بیٹا۔ میں نے اس کے ساتھ پورے بیس برس گزارے تھے۔ اس کے بچے جنے تھے —— ان کی موت کے دکھ اٹھائے تھے۔ اس نے میرے زخموں پر اور نمک چھڑکا —— میں کہاں تک کلیجے پر چھریاں چلواتی —— میں نے ایک دن چپکے سے دونوں کو زہر دے دیا —— میرا نہ ہوا تو اس کا بھی نہ ہوا۔ اسے جینا تھا تو میرا ہو کر جی سکتا تھا —— بیٹا اب بھی وہ مرا نہیں ہے —— وہ تیرے روپ میں پھر آ گیا ہے۔ ویسی ہی آنکھیں —— ویسا ہی ماتھا اور ہونٹ ——" ! اس نے عجیب طرح کی ممتا کے ساتھ اسے بھینچ کر گلے سے لگایا اور چوما —— "تو اس ظالم کی تصویر ہے ——" !

اس دن تو وہ ماں کے پیار سے گھبرا گیا۔ عجیب ہے ماں اگر وہ باپ کو اتنا پسند کرتی تھی تو پھر مار کیوں ڈالا —— ! اور پھر اسے رحمان بابا کا خیال آتا تھا۔ رحمان بابا بھی اکبر جان سے محبت کرتا تھا اسی لئے اس نے اکبر جان کو مار ڈالا —— یہ لوگ کیسے ہیں —— ماں مجھ سے کتنی محبت کرتی ہے —— ! مگر نہیں وہ مجھے نہیں مار سکتی —— •

گل کی ماں دمے کی مریضہ تھی۔ سردیاں آئیں تو اس کی بیماری بہت بڑھ گئی۔ ایک رات تو اس کال کوٹھری میں اس نے کسی کو سونے نہ دیا۔ صبح تک اس کی کھانسی کی گونج سنائی دیتی رہی۔ جب گہری سیاہ چادر کا نقاب پھاڑ کر سورج کی کرن نے جھانکا تو اسی لمحہ اس کی ماں نے بھی کال کوٹھری کی تاریکی میں سے نکل کر روشنی کی طرف اپنا سفر شروع کر دیا۔ ازلی اور ابدی روشنی جو ہر انسان کی منزل مقصود ہے ! اس نے خون کیا تھا مگر وہ شیطان کی چیلی نہ تھی —— وہ چودہ سال سے ہر ہر لمحے سوتے اور جاگتے اسے یاد کرتی رہی۔ اس کا دم بھرتی رہی۔ وہ جو رحیم اور کریم ہے —— اور اب وہ روشنی کی تلاش میں ایک انجانی سمت پہ چل نکلی —— !

کال کوٹھری میں عورتوں کا رونا دھونا اور آہ و بکا کا شور سن کر گل گھبرا کر اٹھا —— "ماں —— ماں کیسی ہے ؟"

بوڑھی شبراتن نے اسے گلے سے لگا لیا —— "صبر کر —— وہ تیرے باپ کے پاس چلی گئی"

"باپ کے پاس! مگر باپ کو تو اس نے مار ڈالا تھا"

"اب وہ بھی مرگئی ہے —— اب وہ دونوں پھر اکٹھے ہو گئے ہیں"

"ماں — مرگئی! — ماں مرگئی —— !" وہ چیخ کر بولا اور پھر دادی کی گود میں گر کر رونے لگا —— دوسری قیدی عورتیں بھی زور زور سے رونے لگیں —— ! اور روتے روتے صبح ہو گئی! پھر جب بڑا تالا کھولا گیا تو سلاخوں کے اندر سے لاش باہر لائی گئی —— نمبر ۲۱۱ مرگئی! وارڈن نے جیلر صاحب کو بتایا اور ماسی جیراں نے رو رو کر کہا "وہ چلی گئی —— ان سلاخوں اور تالوں میں سے بھی چلی گئی"

"اچھی تھی" وارڈن نے نیک دلی سے کہا —— اور پھر ہمدردی سے گل کے سر پر ہاتھ رکھا "اب تم باہر چلے جانا —— !"

ماسی جیراں نے بتایا کہ انھوں نے رات بھر اس کی ماں کو دوائیں پلائیں —— کمر اور ہاتھ پاؤں دبائے —— مگر اس کا سانس ہی نہ رکتا تھا ڈاکٹر صاحب نے بھی گل کو ہمدردی سے دیکھا اور کہا "تم نے اپنی ماں کے ساتھ چودہ سال بیکار ہی سزا بھگتی۔ اب تم آزاد ہو جاؤ گے"

گل ڈاکٹر صاحب کے جانے کے بعد پریشان کھڑا سوچتا رہا کہ وہ کہاں جائے گا —— ! جانے کیوں اسے اس وقت ماسی رضیہ بہت یاد آئی۔ کاش جب وہ چھوٹا سا ہی اس کے ساتھ چلا جاتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ اب وہ ماسی رضیہ کو کیسے ڈھونڈ سکتا ہے۔ اتنے سال گزر گئے ماسی رضیہ نے تو کبھی خبر ہی نہ لی —— !

جب کفن دفن ہو چکا تو قیدی عورتوں نے جیلر صاحب سے سپارے منگوا کر پڑھے اور اس کی ماں کو دو قرآن شریف کا ثواب بخشا۔ بوڑھی شبراتن کو اس کی ماں کی جدائی کا بہت رنج تھا۔ وہ اس کی پرانی ساتھی تھی —— اس کال کوٹھری میں ایک دوسرے کی رفاقت ہی سب کچھ ہے۔ اکٹھے دکھ اٹھانے کے احساس نے ان کے درمیان محبت بڑھا دی تھی —— یہ انوکھی رشتہ داری تھی —— دکھ اٹھانے کا رشتہ —— ! تمام قیدی عورتیں اس کی ماں کو یاد کر کے رونے جاتی تھیں اور ان کے ساتھ وہ بھی رونے لگتا تھا"

جیراں بولی "ہمارا بس چلتا تو تجھے اپنے ساتھ رکھتے، کبھی نہ جانے دیتے مگر اب تجھے جانا ہو گا —— اور بیٹا اسی میں تیری بھلائی بھی ہے —— آج قید بھگتی۔ تو نے دیکھا ہی کیا ہے اس کال کوٹھری کے سوائے —— اب تو اپنی نانی کے گھر چلا جانا"

"نانی کے گھر"! گل کا دل گھبرانے لگا۔

شام کو جیلر صاحب نے اسے بلایا "گل تم اپنی ماں کی وجہ سے یہاں رہ رہے تھے۔ تمہارا کوئی جرم نہ تھا۔ بس اس کا بیٹا ہونا ہی تمہارا جرم تھا۔ اور اب جب وہ مرگئی تو تم آزاد ہو۔ تمہاری ماں تمہیں زبردستی اپنے ساتھ لئے ہوئے تھی ورنہ ہم تمہیں پہلے ہی چھوڑ دیتے۔"

آزادی کتنی بڑی گالی ہے اور پنچھی پنجروں سے کیوں محبت کرتے ہیں جیلر صاحب کو یہ احساس نہ تھا۔

"جیلر صاحب مجھے یہاں سے نہ نکالئے"

"افسوس ہے لڑکے۔ اب قانوناً تم یہاں نہیں رہ سکتے۔ یہ تو تمہیں تو اپنی آزادی پر خوش ہونا چاہئے" جیلر صاحب کی بھاری بھرکم شخصیت اس کے حقیر اور ناچیز وجود پر سچ مچ ترس کھانے لگی۔

جیلر صاحب نے سپاہی سے ماں کا سامان منگوایا۔ اس کی کل کائنات ایک چھوٹی سی پوٹلی تھی۔ سپاہی نے پوٹلی کھولی۔ ایک جوڑا کپڑا جو وہ پہن کر آئی تھی۔ چاندی کے چند زیور اور پانچ روپے نقد —— اور کچھ بوسیدہ کاغذات —— ان کاغذات میں سے ایک پر اس کی نانی کے گھر کا پتہ تھا۔ جیلر صاحب نے اسے کارڈ تھما کر کہا یہ سنبھال کر رکھنا "تمہاری نانی کا پتہ ہے"

گل گھبرا گیا۔ تو اب نانی کے گھر اسے جانا ہی ہو گا۔ اس نے اداسی سے جیل کے در و دیوار کو دیکھا۔ پھر ماں کی پوٹلی مضبوطی سے پکڑی۔ جیلر صاحب کو

سلام کیا اور باہر نکل آیا۔ وہ دوبارہ جیل کے اندر نہ جا سکا۔ اسے باہر اپنے کمرے سے ہی جیلر صاحب نے رخصت کر دیا۔ اس کا کتنا ہی جی چاہا کہ جیل کے اندر ایک دفعہ اور جا کر سب سے مل آتا —— دادی —— رحمان بابا —— ماسی مہراں —— مگر اب تو وہ سب کال کوٹھری میں بند ہو گئے ہوں گے —— اور بڑا سا تالہ ڈل چکا ہو گا۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔ اس نے گردن گھما کر جیل کی اونچی اونچی دیواروں کو دیکھا —— بڑے سے آہنی پھاٹک کو دیکھا جس میں لگا ہوا چھوٹا پھاٹک ابھی تک کھلا تھا —— کیسے آرام سے وہ اس وقت ان سب کے ساتھ کال کوٹھری میں بند ہو جاتا تھا اور روٹی کھاتا تھا —— ماں کے پاس پڑ کر سو جاتا تھا مگر اب وہ اندر نہیں جا سکتا —— اس لئے کہ اب وہاں ماں نہیں ہے ——!

وہ باہر جانے والی سڑک پہ ہو لیا۔

جیل ایک پہاڑی پر تھی اور نیچے نشیب میں دور تک سڑک بل کھاتی جا رہی تھی۔ وہ نانی کے گھر جا رہا تھا —— یہ باہر کی دنیا اس کی نانی کا گھر ہے —— اور جیل کے اندر کی دنیا اس کی ماں کا گھر تھی —— اس کا اپنا گھر ——!

سڑک طے کرنے کے بعد وہ ایک پیلے موڑ پر آ گیا۔ اور اس موڑ پر آ کر وہ گھبرا سا گیا —— اتنی وسعت —— دور دور تک ہر طرف زمین و آسمان نظر آ رہے تھے۔ جیل کی دیواروں کے اندر تو یہ لگتا تھا کہ زمین و آسمان بھی ان دیواروں کے ساتھ ہی کہیں ختم ہو جاتے ہیں مگر یہاں جس طرف دیکھو زمین ہی زمین —— ہر طرف آسمان —— آسمان جو کہیں ختم نہیں ہوتا —— وہ حیران ہو کر رک رک کر دیکھتا رہا —— بعض دفعہ تو اتنی بڑی دنیا کو دیکھ کر اس کا جی اتنے زور سے گھبراتا کہ وہ آنکھیں بند کر کے راستہ میں بیٹھ جاتا —— پھر اٹھ کر چلنے لگتا۔

جب وہ بڑی سڑک پر آیا تو اس نے بڑی بڑی کوٹھیاں دیکھیں۔ دکانیں مکان اور بازار دیکھا —— سڑکوں کا جال —— اور موٹروں اور لاریوں کی دوڑ —— ہر طرف لوگ ہی لوگ —— اف کتنے سارے لوگ ہیں اس دنیا میں! اس نے ایک چھوٹے سے بازار کے موڑ پر حیران ہو کر سوچا —— گورے کالے دبلے موٹے —— کیسے عجیب عجیب لوگ ہیں۔ وہ راستہ چلتے ہوئے انہیں غور سے دیکھنے لگا۔ نت نئی وضع کے کپڑے۔ ہر ایک کی علیحدہ طرز —— کہیں شلوار قمیص کہیں کوٹ پتلون۔ جیل میں تو سب ایک جیسے کپڑے پہنتے تھے۔ عورتیں مرد سب سفید پاجامہ اور سفید قمیص پہنتے تھے۔ بس مرد ٹوپی لگاتے تھے اور عورتیں دوپٹہ اوڑھتی تھیں مگر یہاں —— کئی دفعہ وہ موٹر کے نیچے آتے آتے بچا ——!

جب موڑ پر اس نے سپاہی کو دیکھا تو اسے بڑی خوشی ہوئی جیسے پردیس میں اچانک کوئی عزیز مل جائے۔ یہ لباس اس کا جانا پہچانا تھا۔ سپاہی قیدیوں کو چھوڑنے اکثر آیا کرتے تھے اور وہ تیزی سے دوڑتا ہوا سپاہی کے پاس گیا "یہ گاؤں کہاں ہے؟" اس نے نانی کا پتہ سپاہی کو دکھا کر پوچھا۔

سپاہی نے اسے غور سے دیکھا اور پھر بولا "جیل سے آ رہے ہو ——؟"

"کتنے برس "وہاں" رہے؟"

"پیدا ہی وہاں ہوا تھا"

"جب ہی کپڑے بھی جیل کے پہنے ہو!"

"میری ماں مر گئی —— "گل کی آنکھوں میں پھر آنسو آ گئے۔ اندھیرا ہو چلا تھا اور چلتے چلتے اب اسے زور کی بھوک لگ رہی تھی۔

"یہ گاؤں بہت دور ہے صبح جانا"

"کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں رات گزار لوں —— ایسا کوئی گھر ——؟"

بس بیٹا۔ لاوارث لوگوں کا تو ایک ہی گھر ہے۔ وہ بڑا گھر جسے تم چھوڑ کر آ رہے ہو —— اور کوئی گھر نہیں ہے —— سامنے ٹال کے پاس ہوٹل

ہے وہاں چلے جاؤ کچھ کھا پی لینا ــــــ "

"گل کو سردی لگ رہی تھی۔ سردی نے بھوک کے احساس کو اور بڑھا دیا تھا۔ وہ نانی کے گھر کا پتہ جیب میں رکھ کر ہوٹل کی طرف مڑ گیا ــــــ ؛
ٹین کی چھوٹی چھوٹی چند کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ وہ بھی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ بیرے نے قریب آکر آنکھ ماری " کچھ چاہئے یا کسی کا انتظار ہے ؟ " اس نے اکثر لوگ اس قسم کے لڑکوں کو چائے پلاتے اور مٹھائی کھلاتے دیکھے تھے۔

"گل نے پریشان ہو کر کہا " بھائی میں بہت بھوکا ہوں "!

"نکالو پیسے نکالو "

گل نے پوٹلی میں سے پانچ روپے نکالے اور پھر اس میں سے ایک روپیہ نکال کر بیرے کو دیا اور چار جیب میں رکھ لئے۔

"کیا کھاؤ گے ؟"

اس سوال پر گل حیران سا ہو گیا۔ یہ بھی پوچھنے کی بات ہے وہ روٹی اور دال کے سوا کیا کھا سکتا ہے۔ اسے ماسی رحیمن کی برفی یاد آگئی " برفی اور روٹی لادو "

" بیٹا برفی سے پیٹ نہیں بھرے گا۔ روٹی اور کباب لادوں ؟ "

جب بیرا واپس آیا تو وہ ایک روٹی دو سیخ کباب اور تھوڑی سی برفی لے آیا۔ گل نے پیٹ بھر کر روٹی کھائی۔ کباب اسے بہت مزیدار معلوم ہوئے اس کا جی چاہا کہ اور کباب منگوائے۔ پھر اسے ماسی عمراں کی بات یاد آئی۔ تھوڑے تھوڑے پیسے نکال کر خرچ کرنا۔ جب پیسے ختم ہو جائیں تو ایک آدھ چیز بیچ دینا مگر ماں کے گلے کی مالا سنبھال کر رکھنا۔ یہ نہ بیچنا جب بیاہ ہو تو اپنی دلہن کو دے دینا ــــــ " اسے ماسی عمراں کی ساری باتیں یاد آئیں جب لوگ اس کی ماں کا جنازہ لے جا رہے تھے تب ہی ماسی عمراں نے اسے ساری باتیں سمجھانی شروع کر دی تھیں۔ چلتے وقت اسے ان سب سے جدا ہونے کا بڑا افسوس تھا۔ کاش ماسی رضیہ کا پتہ ہوتا ــــــ تو پھر وہ نانی کے بجائے اس کے گھر چلا جاتا۔ کتنی اچھی تھی ماسی رضیہ ــــــ ! جانے نانی کیسی ہو گی ــــ ! شاید اچھی ہو ــــــ اس کی ماں کی طرح ــــــ اس نے سوچا سویرے وہ گاؤں روانہ ہو جائے گا۔

بیرا جب برتن اٹھانے لگا تو بولا " چائے پیو گے ــــــ "!

" یہاں رات کو بھی چائے ملتی ہے ــ ! "

" کیا تم کسی گاؤں سے آ رہا ہے ؟ ــــــ ابے یہ شہر ہے گاؤں نہیں ہے "!

" گل چپ ہو گیا اس نے بیرے کو اپنے بارے میں زیادہ بتانا مناسب نہ سمجھا۔ اس لئے کہ اگر اس نے اب کوئی بات بتائی تو اسے یقین تھا کہ وہ پھر خوب روئے گا ــــــ اس کا جی اب بہت پریشان تھا اور اس لئے وہ چپ رہا۔

" یہاں کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں میں سو رہوں ؟ "

" ؟ شام کے سات بجے سونا چاہتا ہے ! ارے شہر آیا ہے گھوم پھر کر تماشا دیکھ ــــــ پیسے ہیں تو سینما چلا جا ــــــ ! "

" میں بہت تھک گیا ہوں اور مجھے نیند آ رہی ہے کوئی جگہ بتا دو تو میں وہاں سو جاؤں ــــــ صبح اٹھ کر میں تمہارے بہت سے کام کر دوں گا۔ جھاڑو دے دوں گا۔ برتن صاف کر دوں گا "

ہمارے ساتھ چلتا ہے ؟ " قریب ہی بیٹھے ہوئے بڑی بڑی مونچھوں والے ایک آدمی نے قہقہہ لگا کر کہا۔ جانے کیوں گل کو وہ آدمی بہت برا لگا۔ اگر سونے

کی جگہ پوچھی تو ہنسنے کی کیا بات تھی۔ گل اس کی بات کا جواب دیئے بغیر پوٹلی اٹھائے باہر نکل گیا

راہ چلتے چلتے اس نے دیکھا سڑک کے ساتھ لگے ہوئے فرش جیسے لمبے چبوترے پر بہت سے لوگ سو رہے ہیں وہ بھی خاموشی سے لیٹ گیا وہاں لیٹے ہوئے لوگوں نے اس کی کوئی پرواہ کی کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ اور یہاں کیوں لیٹ گیا ہے —! اسے ایسے لگا جیسے بڑے گھر کی طرح یہ بھی ان سب کا ٹھکانہ ہے —! رات نے ان سب کو مہربان ماں کی طرح اپنی آغوش میں چھپا لیا —!

صبح جب وہ سو کر اٹھا تو اس کی پوٹلی سرہانے سے غائب تھی اس میں اس کی ماں کے چاندی کے زیور اور کپڑے تھے۔ چار روپے نقد اور نانی کے گھر کا پتہ تھا ——!!

ماں مر گئی — اسی رضیہ کھو گئی اور نانی کا گھر — اب وہ نانی کے گھر کیسے جائے گا۔ اس نے پریشان ہو کر وسیع و عریض آسمان کو دیکھا پھر چاروں طرف کھڑے ہوئے مکانوں۔ دکانوں اور لوگوں کو دیکھنے لگا — کتنے لوگ ہیں — کتنے گھر ہیں۔ ہر طرف جگہ ہی جگہ ہے — مگر اس کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے —!

ایک چھوٹا سا لڑکا فٹ پاتھ پر پالش کا ننھا سا بکس لے کر بیٹھ گیا اور زور زور سے صدا لگانے لگا "ایک آنہ پالش — ایک آنہ —" کئی چلتے ہوئے قدم رکے اور کبھی کالے اور کبھی لال برش زور زور سے چلتے ہوئے دکھائی دیئے — جب جوتے ایسے چمک گئے کہ ان میں سے آئینہ کی طرح چہرہ نظر آ جائے — تو قدم آگے بڑھ گئے۔

گل حیرت سے یہ تماشا دیکھتا رہا۔ پھر وہ اس لڑکے کے پاس گیا۔ وہ دونوں بہت جلد دوست بن گئے۔ گل کی پتا سن کر کریم کو بہت ترس آیا۔ کریم کی عمر تو آٹھ سال تھی مگر ذہنی عمر کے لحاظ سے وہ چودہ سال گل سے بڑا تھا۔ وہ اسے سمجھانے لگا "مجھے دیکھو میرے تو ماں باپ بھی ہیں۔ پھر بھی محنت کرتا ہوں اور خوش رہتا ہوں —"

"تمہارے ماں باپ ہیں! کہاں ہے تمہارا گھر؟"

"میرا باپ چرسی اور جواری ہے —— میری ماں کسی آدمی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ میں اپنے گھر میں اکیلا ہوں۔ کبھی کبھی باپ آ جاتا ہے ورنہ جانے وہ کہاں رہتا ہے۔ میں کبھی گھر میں رہتا ہوں اور کبھی دوستوں کے ساتھ فٹ پاتھ پر ہی سو جاتا ہوں ——!"

گل کو کریم سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ وہ پہلے کی طرح اب خود کو تنہا محسوس نہیں کر رہا تھا۔ اس نے سوچا دنیا میں اس جیسے ہزاروں ہیں وہ بھی جن کے ماں باپ نہیں ہیں اور وہ بھی جن کے ماں باپ ہیں —! تو پھر کوئی غم نہیں کوئی فکر نہیں — لیکن کاش وہ نانی کے گھر جا سکتا —!

"تجھے اپنی نانی کے گاؤں کا نام تو یاد ہو گا"

"شاہ پور نام لیا کرتی تھی ماں —— مگر سارا پتہ کاغذ میں تھا —؟"

"ارے شاہ پور تو یہاں سے صرف آٹھ یا نو میل ہے۔ تو شاہ پور جا کر نانی کا گھر ڈھونڈ لے۔"

"اتنے لوگوں میں —— اتنے گھروں میں —!"

"پاگل وہ تو گاؤں ہے۔ چھوٹی سی جگہ —— وہاں کے لوگ شہر والوں کی طرح نہیں ہوتے۔ وہ ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ تو ایسا کرنا۔ سیدھا چوپال میں چلا جانا — اپنے باپ کا نام بتانا — ماں کا نانی کا ذکر کرنا — بس تو سیدھا نانی کے گھر پہنچ جائے گا۔"

"کہیں نانی کو ڈھونڈنے میں تو بھی نہ بچھڑ جائے ——!"

"نہیں میں کہیں نہیں جاؤں گا ـــــ میرا اڈہ یہی ہے ـ ہم سب لڑکے پہلے ساتھ بیٹھ کر لڑتے تھے ـ اب سب نے اپنی اپنی جگہ بنالی ہے اور کوئی دوسرے کی جگہ نہیں بیٹھتا ـ یہ جو بجلی کا کھمبا ہے اس سے لے کر اس کھمبے تک فٹ پاتھ پر میں اکیلا ہوتا ہوں ـــ ! جہاں چاہوں بیٹھ جاتا ہوں جب بیمار ہوتا ہوں تو اقبال میری جگہ بیٹھ جاتا ہے ـ اس جگہ ذرا آمدنی اچھی ہوتی ہے ـ یہ موڑ ہے نا ـــــ اسکول اور کالجوں کے لڑکے اور دفتروں کے بابو سب اس راستے سے گزرتے ہیں ـ پہلی تاریخ سے لے کر سات تاریخ تک تو بابو لوگ بھی کبھی کبھی جوتوں پر پالش کرا لیتے ہیں ـ آخر مہینے میں اگر انہیں پالش کے لئے آواز دوں تو ایسا برا مانتے ہیں جیسے گالی دے دی مگر یہ کالج کے لڑکے بڑے اچھے ہوتے ہیں ـ پالش بھی کراتے ہیں اور دل کے بڑے بھی ہوتے ہیں ـ کبھی آنے کی جگہ پوری چونی پھینک کر چل دیتے ہیں ـ میری بات مان اگر نانی کے گھر گزر نہ ہو تو یہی دھندا شروع کر دینا ـ میں تجھے اچھی جگہ بٹھا دوں گا ـ"

گل کو وہ آٹھ سالہ لڑکا اپنا محسن اور سرپرست معلوم ہونے لگا ـ وہ شکر گزاری سے بولا "تم بہت اچھے ہو ـ تم نہ ملتے تو میں کیا کرتا ـــ !"

"تم شاہ پور کا کرایہ مجھ سے لے لو ـ آٹھ یا نو آنے میں کام چل جائے گا مگر میرے پاس کل دس آنے ہیں اگر تم ہمت کر کے شاہ پور پیدل چلے جاؤ تو ہم دونوں دس آنے میں روٹی اور کباب کھا سکتے ہیں ـــــ"

گل کو بھی زور کی بھوک لگی ہوئی تھی اس لئے اسے آخری تجویز زیادہ پسند آئی ـ جب وہ دونوں شال کے ساتھ والے چھوٹے سے ہوٹل سے روٹی کھا کر لوٹے تو انہیں اقبال مل گیا ـــــ اس کے ڈبے میں روٹی کھا کر بھی آٹھ آنے فالتو تھے ـ کریم کے کہنے پر اس نے گل کو آٹھ آنے ادھار دے دیئے اور خالی ڈبہ لیکر لوٹ گیا

کریم نے گل کو شاہ پور جانے والی بس میں سوار کرا دیا ـ بس میں بیٹھ کر گل نے آٹھ آنے کا ٹکٹ خریدا ـ پھر بس میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھ کر سوچنے لگا کہ کیا پتہ ان میں سے کوئی نانی کو جانتا ہو ـــــ ! جب بس چلی تو گل کو بہت مزا آیا ہوا کے تیز جھونکوں سے اس کے بدن میں ایک لطیف سی جھرجھری دوڑ گئی ـ کھیت ـــــ میدان ـــــ درخت اور ننھے ننھے پہاڑی ٹیلے اسے نظر آ رہے تھے ـ وہ بس کی تیز دوڑ سے پورا لطف اٹھا رہا تھا ـ کبھی کھڑکی میں سے باہر دیکھتا اور کبھی ڈرائیور اور مسافروں کا جائزہ لیتا ـ اسے ساری چیزیں یک بیک اچھی لگنے لگیں اتنے سارے لوگ ـــــ ہر طرف پھیلی ہوئی رنگ برنگی دنیا ـــــ پھر اسے کریم کا خیال آیا اور وہ اس کے بارے میں سوچ کر زیادہ خوش اور زندگی سے مطمئن نظر آنے لگا ـ

شاہ پور گاؤں پہنچ کر گل خاصی دیر تک ادھر ادھر پھرتا رہا ـ ماں سچ کہتی تھی مکئی کے کھیت تھے ـــــ ہری بھری چراگاہیں ہیں ـــــ ہر طرف ڈھور ڈنگر ہیں ـ نانی کے پاس بھی گائیں اور بھینس ہے ـ ماں کہتی ہے گائے بھوری اور سفید ہے ـــــ وہ راستے میں دو مرتبہ بھوری اور سفید گایوں کے قریب گیا اور سوچنے لگا شاید یہ ماں کی گائے ہو ـــــ مگر اجنبی چرواہے نے اس پر کوئی توجہ نہ دی ـ

وہ پتہ پوچھ کر چوپال پر گیا ـــــ وہاں جب اس نے اپنی ماں اور باپ کا ذکر کیا تو پہلے تو کسی کی سمجھ میں نہ آیا مگر ایک ادھیڑ عمر کا آدمی جس کی داڑھی میں سفید بال تھے ـ فضل خاں کے نام پر اچانک اٹھ کر بیٹھ گیا ـ اس نے پیار سے گل کے سر پر ہاتھ رکھا ـ اس کے لئے لسی اور بھنے ہوئے دانے منگوائے پھر وہ شخص دیر تک فضل خاں کو یاد کرتا رہا ـ فضل خاں اس کا دوست تھا ـــــ ! گل کو اپنی نانی کے بارے میں بھی اسی آدمی سے معلوم ہوا کہ وہ مر چکی ہے ـــــ ! اس کی نانی گاؤں میں نانی برکتے کہلاتی تھی ـ بڑی نیک دل اور غنی عورت تھی ـ اس کی بیٹی خدا جانے کس پر گئی جو اتنا بڑا کلنک کا داغ خاندان کے ماتھے پر لگا گیا گل کو اپنی ماں کے بارے میں ان کی باتیں پسند نہ آئیں ـ

اسے نانی برکتے کے گھر پر اس کے باپ کا دوست یہ کہہ کر لایا تھا کہ یہاں نانی کا کوئی دور کا رشتہ دار رہتا ہے ـ مگر اسے امید نہ تھی کہ وہ گل کو ساتھ رکھنے پر آمادہ ہو گا ـ نانی برکتے کا دور کا رشتہ دار گل سے بہت بے مروتی سے پیش آیا ـ اس نے سب کے سامنے کہا فضل خاں کا لڑکا جیل میں مر چکا ہے ـ اس کے پاس کیا ثبوت ہے کہ یہ فضل خاں کا لڑکا ہے ـ لوگوں نے کہا کہ فضل خاں کی صورت اگر یاد ہے تو یہ بات نہیں کہنی چاہیئے ـ یہ لڑکا فضل خاں کی تصویر ہے

گر نانی کا رشتہ دار جانتا تھا کہ لڑکا مکان کا اصل وارث ہے اس لئے وہ اس کی شکل دیکھنے کا روادار نہ تھا۔

گل مایوس ہو کر لوٹ آیا اس نے حسرت سے نانی کے گھر کے دروازے کو دیکھا ——— آم کے درخت کو دیکھا۔ ماں یہاں کھیلا کرتی تھی ——— دادی ماں کہتی تھی اس درخت کے آم بہت میٹھے ہوتے ہیں ——— مگر سب کچھ جھوٹ ہے ——— اس گاؤں میں کوئی چیز میٹھی نہیں ہو سکتی ———! اسے نانی کا گھر اور سارا گاؤں برا لگنے لگا اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ جلد ہی کریم کے پاس چلا جائے گا۔

جب وہ واپس آنے کے لئے مڑا تو اس کے باپ کے دوست نے کہا "رات ہو چلی ہے۔ اس وقت گاڑی نہیں ملے گی۔ صبح چلے جانا رات گھر پہ گذارنے تو اچھا ہے ———!"

اس آدمی نے رات کو اسے مکی کی روٹی اور سرسوں کا بھنا ہوا ساگ دیا ——— اسے یہ کھانا بہت مزے کا معلوم ہوا۔ ماں کتنا یاد کرتی تھی مکی کی روٹی اور سرسوں کے ساگ کو ——— بیچاری ماں ——— اس نے کھانا کھاتے ہوئے ماں کو یاد کیا۔ رات کو وہ ایک کھاٹ پڑ کر سو گیا

صبح سویرے جب وہ اٹھا تو اس نے مہرن کو دیکھا۔ مہرن اسے بہت اچھی لگی۔ اس کا جی چاہا کہ مہرن کے ساتھ کھیلے مگر مہرن کے باپ نے یہی مہربانی کی تھی کہ اسے رات بھر کے لئے رکھ لیا تھا۔ اس زمانے میں کون کسی کی ذمہ داری لے سکتا ہے۔ اپنے بچوں کا تو پورا ہوتا نہیں۔ اس کے باپ کے دوست نے ایک روپیہ دے کر اسے رخصت کیا۔ گل نے جاتے ہوئے سوچا کاش وہ یہاں رہ سکتا ——— ! مگر پھر وہ ایک روپے کا نوٹ مٹھی میں مضبوطی سے پکڑ کر باہر چلا گیا۔ اب اسے کسی کا گھر ڈھونڈنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس نے سوچا کریم ضرور اسے اپنے ساتھ رکھے گا۔ اس کی ساری امیدوں کا مرکز کریم تھا جو زور زور سے ہنستا اور گاتا رہتا ہے۔ اس نے بھی واپسی میں کریم کی طرح گلا پھاڑ کر گانا چاہا "یہ زندگی کا میلا ——— !" اور آواز کی گونج سے وہ کچھ حیران اور پریشان سا آگے بڑھ گیا ———!

"مجھے معلوم تھا کہ تم آجاؤ گے!" کریم نے تیزی سے برش چلاتے ہوئے کہا "بھائی یہ دنیا ہے یہاں نہ کوئی کسی کا باپ ہے نہ بیٹا۔ یہ جو روپیہ ہے نا ——— یہی باپ بھی ہے اور بیٹا بھی ——— اچھا ہوا تم آگئے ———!"

وہ تھک کر بیٹھ گیا۔ بچے ہوئے آٹھ آنے اس نے کریم کے بکس میں ڈال دیئے۔ پھر جانے کیا سوچ کر تھکی ہوئی آواز میں بولا "یہاں، کہیں دری بننے اور سوت کاتنے کا کام نہیں ہوتا؟ ——— میں یہ کام جانتا ہوں"

"ارے یار اگر تجھے بوٹ پالش مشکل لگتا ہے تو چل میں تجھے کسی کے گھر نوکر کروا دوں گا ——— میرا ایک دوست حمید یہاں سودا سلف لانے کا کام کرتا ہے۔ پندرہ روپے مہینہ کھانا ملتا ہے۔ بڑے آرام میں ہے، سودا لا دیا۔ بچی کو گود میں کھلا تا پھر لے ——— آٹا گوندھنا اور مسالہ پیسنا بھی شاید اسی کے ذمے ہے مگر پھر بھی خوش ہے۔ مجھے تو بوٹ پالش کا کام ہی پسند ہے۔ آزادی ہے ——— جہاں چاہو آؤ جاؤ ——— جو جی چاہے کرو۔ حمید بغیر کام کے گھر سے باہر نہیں نکل سکتا اور جب گھر جاتا ہے پہلی بات بیگم یہ کہتی ہیں "اتنی دیر کہاں رہا" بیچارہ کبھی کبھی تنگ آجاتا ہے۔ مگر اسے بوٹ پالش نہیں پسند ——— چھوڑتا ہے نا ——— گھر میں ہر طرح کا کھانا ملتا ہے ———؟"

شام کو حمید سے ملاقات ہوئی تو اس نے بتایا کہ پڑوس میں ایک جگہ خالی ہے۔ وہ دوسرے دن سویرے گل کو نوکر رکھانے گیا۔

"پہلے کہاں رہتے تھے؟"

"جیل میں"

"ہائے اللہ ——— حمید تمہاری مار ——— مجھے بھی یہ چھوکرا اچھا ہی ملا۔ وہاں میں بغیر نوکر کے ہی بھلی۔"

"میں نے چوری نہیں کی۔ میں تو پیدا ہی جیل میں ہوا تھا۔ ماں کے ساتھ تھا"

"لو ـــــ سن لو ـــــ ماں بھی نمبری تھی۔ یہ تو پکا چار سو بیس ہوگا۔"

"آپ کو میرا نمبر کیسے معلوم ہوا؟" گل نے حیران ہو کر پوچھا۔ اسے گھر سے کان پکڑ کر ایک صاحب نے باہر نکالا اور بولے خبردار ـــ جو آئندہ یہاں آئے۔" حمید بھی شرمندہ سا تھا۔ اس نے گل کو سمجھانا چاہا "عجیب بات ہے جب تم نے چوری نہیں کی تو یہ تمہیں برا کیوں سمجھتے ہیں۔"

کریم کو دیکھ کر گل جانے کیوں رونے لگا اور کریم ہنس کر بولا "یہ اتنا بڑا لڑکا بات بات پر لڑکیوں کی طرح روتا ہے۔ یار میں نے آج تک ایسا لڑکا نہیں دیکھا" گل نے آنسو پونچھ کر مسکراتے ہوئے کہا "میں بھی بوٹ پالش کروں گا۔"

کریم نے اس کی پیٹھ پر زور کا ایک مکا مارا ـــــ اور جانے کیوں گل کو وہ مکا ماں کے پیار کی طرح اچھا لگا۔ پھر کریم نے اسے مٹھائی کی دو گولیاں دیں۔ "بیچارا یتیم۔ دو تیرے حصے کی ہیں"، گل آنکھوں میں آنسو اور ہونٹوں پر مسکراہٹ لئے گولیاں چوسنے لگا۔

گل نے کہنے کو تو کہہ دیا تھا کہ پالش کروں گا مگر اسے سڑک پر رہنا ذرا پسند نہ تھا۔ اسے کال کوٹھری یاد آتی۔ کتنا سکون تھا وہاں۔ اور یہاں صبح سے لے کر شام تک بس سڑک پر گزرتی ہے ـــــ رات گئے تک تانگوں اور موٹروں کی آوازیں اسے بہت بری لگتی تھیں۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ شام سے پڑ کر سو جائے۔ کسی ایسی جگہ جہاں سر پہ چھت اور چاروں طرف دیواریں ہوں ـــــ! اسے اندھیرا اچھا لگتا تھا اور سڑک کی روشنیاں اسے رات کو بری لگتی تھیں مگر پھر بھی وہ اس طرح کی زندگی گزارنے پر مجبور تھا ـــــ!

جیل میں چودہ سال کیسے دھیرے دھیرے رینگ کر گزرے تھے۔ مگر نانی کے گھر آتے ہی وقت پر لگا کر اڑنے لگا۔ جانے کیوں وہ باہر دنیا کو نانی کا گھر ہی سمجھتا تھا۔ "میری ماں کا گھر بہت اچھا تھا ـــ اور نانی کا گھر مجھے بالکل پسند نہیں ـــــ" وہ رات کو فٹ پاتھ پر لیٹے ہوئے اکثر اپنے ساتھیوں سے یہ بات کہا کرتا تھا۔

گل نے کریم کے ساتھ بیٹھ کر بوٹ پالش بھی کی۔ روکھی سوکھی کھا کر میٹنی شو بھی دیکھے ـــــ سینما دیکھ کر اسے اکثر خاں زماں یاد آیا تھا۔ نیلو۔ صبیحہ ـــ نرگس اور گیتا بالی کے نام اس نے خاں زماں ہی سے سنے تھے۔ اسے تعجب ہوتا تھا کہ خان زماں کو باہر کے کھیل تماشوں کے مقابلے میں جیل کے اندر کا آرام کیوں پسند نہیں ہے ـــ! باہر کی دنیا میں تو پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اندر پیسے کا کوئی دکھ نہ تھا ـــــ! سچ تو یہ ہے کوئی بھی دکھ نہ تھا۔

جس ہوٹل پر وہ اور کریم اکثر چائے پیا کرتے تھے وہاں اسے مونچھوں والا موٹا آدمی اکثر مل جاتا تھا مگر گل اس سے بات نہ کرتا تھا۔ کریم نے کئی دفعہ ہوشیار کیا تھا کہ "اس کے پھندے میں نہ آنا۔ بڑا خراب آدمی ہے۔ مونچھوں والے آدمی کو سب لوگ استاد کہتے تھے۔ وہ گل پر بہت مہربان تھا۔ اکثر اس کے منع کرنے پر بھی وہ چائے کے پیسے خود دے دیتا تھا۔ اور کہا کرتا تھا اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو اس سے لے لے لیکن گل نے اس سے کبھی کچھ نہ مانگا تھا۔

اقبال جو کریم کا پرانا ساتھی تھا، بوٹ پالش کا کام چھوڑ کر استاد کے ساتھ رہنے لگا تھا۔ استاد جب اسے گرم گرم جلیبیاں اور پوریاں کھلاتا تو دور سے بیٹھے بیٹھے اس کے منہ میں بھی پانی بھر آتا۔ اور کریم ایسے موقع پر اس کی طرف سے منہ موڑ کر بیٹھتا تھا۔ اقبال صاف ستھرے کپڑے پہنے، بالوں میں خوشبودار تیل ڈالے استاد کے ساتھ گھوما کرتا تھا۔ ایک دن اقبال نے گل سے کہا "استاد تجھے اتنا پسند کرتا ہے اور تو اس کے ساتھ اتنی بری طرح بولتا ہے کریم نے خواہ مخواہ تجھے استاد کے بارے میں بہکا رکھا ہے۔ استاد اچھا آدمی ہے۔ اس جیسا محبت کرنے والا آدمی سارے جہان میں نہیں ہے۔ مجھے اتنا آرام ہے۔ گھر میں رہتا ہوں۔ تھوڑا بہت کام کرتا ہوں ـــ زیادہ تر گھومتا ہی رہتا ہوں۔ استاد پڑھاتا ہے۔ ہنر سکھاتا ہے۔ بوٹ پالش میں نو دس آنے سے زیادہ کبھی دن میں نہیں ملے مگر اب تو کسی کسی دن بیس روپیہ روز تک مل جاتا ہے۔"

گل کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں "اچھا ــــ"

"دیکھ کریم سے بات نہ کرنا"

"گل نے واپسی پر کریم سے کوئی بات نہ کی۔ وہ جانتا تھا کہ کریم کو استاد سے دلی نفرت ہے۔ پھر بات کرنے کا فائدہ بھی کیا۔ وہ ایک دن خاموشی سے استاد کے ساتھ چلا گیا۔

کئی دن تک وہ بجلی کا کھمبا جہاں گل بیٹھا کرتا تھا سونا پڑا رہا۔ کریم نے ایک ایک سے اس کا پوچھا مگر اس کا کوئی پتہ نہ چلا۔ خدا جانے کون لے اڑا۔ بگولے کی طرح سیدھا اور بھولا تھا" کریم نے بڑے افسوس سے حمید سے کہا۔ حمید کو ڈر تھا کہ لاری موٹر کے نیچے آ گیا ہو مگر کریم نے کہا "ایسا پاگل بھی نہیں ہے"۔

پھر ایک دن گل اسے استاد کے ساتھ نظر آیا۔ ایک ہفتے کی اچھی کھلائی پلائی نے اس کا رنگ روپ نکھار دیا تھا۔ وہ ایک نئی قمیص اور نیکر پہنے تھا اور بالوں میں تیل دور سے چمک رہا تھا۔ کریم کو دیکھ کر اس نے منہ پھیر لیا اور نظریں چرانے کی کوشش کی مگر کریم اس کے پاس چلا گیا۔

"گل یہ تونے بہت برا کیا ــــ"

گل چپ رہا۔

اور بیٹا جیب کاٹنے سے تو بھوکا مرنا اچھا ہے"

گل نے پھر بھی خاموشی نہیں توڑی تو کریم غصے سے بولا "دیکھنا تجھے کہاں کہاں کی سیر کراتا ہے۔" استاد نے اٹھ کر کریم کو تھپڑ مارنا چاہا مگر کریم بھاگ گیا اور گل میز پر استاد کے پاس بیٹھ کر گرم جلیبیاں کھانے لگا۔

استاد کے اور بہت سے شاگرد تھے مگر گل اس کا منظورِ نظر بن گیا۔ دوسرے لڑکے اس سے جلنے لگے وہ جس سے بھی زیادہ لاڈ کرتا تھا دوسرے سب لڑکے اس سے جلنے لگتے۔

مگر گل کی اقبال سے اور زیادہ دوستی ہو گئی تھی۔ گل ایک فرمانبردار لڑکے کی طرح استاد کا ہر حکم مانتا تھا اسے بہت سی باتیں بری لگتی تھیں۔ سب سے زیادہ قابلِ نفرت خود استاد اور اس کی محبت تھی مگر اس کی وجہ سے گل کو ایک چھت اور دیواروں والا گھر مل گیا تھا۔ دونوں وقت پیٹ بھر کر کھانا مل جاتا تھا اور جب استاد زیادہ خوش ہوتا تو ساتھ لے جا کر ہوٹل پر کھلاتا پلاتا تھا۔

جب استاد نے اسے جیب کاٹنے کا فن سکھانا چاہا تو وہ بہت گھبرایا۔ "استاد مجھے ڈر لگتا ہے۔ مجھ سے اور کوئی کام لے لو میں باورچی خانے کا سارا کام کروں گا۔ برتن میں اکیلا ہی صاف کر لیا کروں گا ــــ"

استاد کو ان باتوں پر بہت غصہ آیا مگر وہ خاموش رہا اور سوچنے لگا کہ گل ان لڑکوں میں سے ہے جو ہنر سیکھنے کو پیدا ہی نہیں ہوئے جب۔ گل استاد کی گالیاں سنتا تو وہ ارادہ کرتا کہ قسمت آزمائی کرے گا مگر عورتوں کے ساتھ پل کر بقول استاد کے وہ عورت ہی بن گیا تھا۔ اس کا دل چڑیا کی طرح دھڑکتا تھا وہ گھبرا جاتا تھا ــــ ہاتھ پاؤں لرزتے اور جس کی جیب کاٹنے کا ارادہ کرتا اس کے سامنے بھیگی بلی بنا سہما کھڑا رہتا۔ استاد ان باتوں پر گل سے خفا رہنے لگا تھا۔ حالانکہ گل نے سارے گھر کا کام اپنے ذمہ لے رکھا تھا وہ ایک ہنرمند سگھڑ گرہستن کی طرح صبح سے شام تک مصروف رہتا تھا۔ سب لڑکوں کے برتن مانجھتا آٹا گوندھتا ــــ تنور سے روٹی لاتا، صفائی کرتا اور فرصت کے وقت کیاریوں میں گوڈی کرتا ــــ گل کے آنے سے پہلے صحن میں جھاڑ جھنکاڑ کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ مگر اب ہر طرف پھول مسکرا رہے تھے۔ استاد نے اس کی محنت مشقت دیکھ کر مارنا اور جلانا کم کر دیا تھا۔ یوں بھی اس کا سا گورا چٹا اور خوبصورت بچہ اس ٹولے میں دوسرا نہ تھا۔

کریم سے گل کی کبھی کبھی آتے جاتے ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ گل نے کریم کو دیکھ کر چھپنا چھوڑ دیا تھا وہ اس کی محبت کی اور زیادہ قدر کرنے لگا تھا اور ہر طرح اسے درست ہو ملنا چاہتا تھا۔ ایک دن گل نے کریم کو بتایا کہ محلے کا ایک غریب طالب علم جو کالج میں پڑھتا ہے اسے پڑھایا کرتا ہے اور اچھی باتیں سناتا ہے۔ اس نے بھی بوٹ پالش کر کر کے اتنی ترقی کی ہے۔ اب وہ امتحان دینے والا ہے پھر بڑا افسر بن جائے گا۔

"تو بھی پڑھ کے بڑا آدمی بن جائے گا؟"

"میں اگر بڑا آدمی بنا تو پہلا کام یہ کروں گا، سب سے پہلے تیرے استاد کو پکڑوں گا۔ سب اچھے اچھے لڑکوں کو اس نے چور اچکا بنا دیا ہے۔ مجھ پر تو اس کا بس نہیں چلا۔ میرا باپ ننھے میں ہی کہتا رہتا ہے کریم تیرا دادا بڑا شریف تھا۔ بیٹا سب کچھ کرنا چوری اور برا کام مت کرنا۔" خدا جانے کون تھا کریم کا دادا — کریم نے اپنے باپ سے سنا ہے کہ ہندوستان میں دادا کی بڑی حویلی تھی مگر کریم کا باپ تو جھگی میں رہتا ہے۔ اسے دادا کی حویلی سے کیا مطلب، کریم کو اپنے باپ پر ترس بھی آتا ہے وہ ہمیشہ اس کی بات مانتا ہے وہ جانتا ہے کہ باپ سارے دن محنت مزدوری کرتا ہے — بیمار ہے — ان کے بھاگنے کا غم الگ۔ اس لئے بیچارہ نشہ کرتا ہے جب وہ نشے میں دھت پڑا ہوتا ہے تو کریم اس کے جوتے اتار کر آرام سے لٹا دیتا ہے اور دیر تک اس کے پیر دبایا کرتا ہے۔ صبح سویرے باپ بیٹا اپنی اپنی منزل پر روانہ ہو جاتے ہیں۔

گل نے کریم سے کئی دفعہ کہا کہ اسے کریم کا ساتھ چھوڑنے کا دکھ ہے مگر اب تو استاد کے پھندے سے نکلنا مشکل ہے وہ اس پر کڑی نظر رکھتا ہے۔ کریم نے ایک دن کہا کہ تیرے جانے کا مجھے بڑا غم تھا۔ ایک دن قیصر بھائی مل گئے جب سے زندگی بدل گئی ہے۔ ہمایوں کہ انھوں نے جوتے پالش کرائے کہ کالج میں جلسہ ہے اور کہا پیسے نہیں ہیں پھر دے دوں گا کئی دن بعد انھوں نے پیسے دیئے تو میں نے لوٹا دیئے۔ آنے دو آنے کی کیا بات ہے۔ تب سے میں خود انہیں بلا کر ان کے جوتے پالش کرنے لگا۔ ایک دن قیصر بھائی نے بتایا کہ انھوں نے بھی بچپن میں جوتے پالش کئے ہیں اور بڑی مصیبت سے پڑھا ہے۔ تب میرے دل میں پڑھنے کا شوق پیدا ہوا اور میں نے ان سے کہا تو وہ بہت خوش ہوئے اور اب روزانہ میں ان سے پڑھتا ہوں۔ دوسری کتاب شروع کر دی ہے۔ کاش تو استاد کے پاس نہ جاتا تو ہم اکٹھے پڑھتے۔ اقبال بھی چلا گیا — تو بھی چلا گیا — حمید بہت کم ملتا ہے۔ اب تو میں سینما شو بھی بہت کم جاتا ہوں۔"

ایک دن گل راستہ چلتے چلتے چکرا گیا — کریم کا بکس اور پالش کی دونوں ڈبیاں اور برش سب چیزیں سڑک پر پڑی ہوئی تھیں اور کریم کا کہیں پتہ نہ تھا۔ بہت سی موٹریں — سائیکلیں اور رکشائیں قریب رکی ہوئی تھیں خون کے نشان زمین پر چمک رہے تھے۔

گل کا دل دھڑکنے لگا۔ "کریم — کریم" وہ دیوانہ وار اسے آوازیں دیتا ہوا ہر طرف دوڑا — کریم اس سے کئی برس چھوٹا ہونے کے باوجود اس کی نظروں میں بہت بڑا اور لائق احترام تھا۔ وہ کریم سے محبت ہی نہیں عقیدت بھی رکھتا تھا۔ ایسی عقیدت جو سادہ لوح انسانوں کو دیوتاؤں اور فرشتوں سے ہوتی ہے۔ لوگ کہہ رہے تھے کوئی حادثہ ہو گیا۔ وہ ایک ایک سے کریم کا پوچھتا رہا جب اس نے کریم کو ایک طرف سے آتا دیکھا تو اس کی جان میں جان آئی "کریم — کیا ہوا —؟" کریم جواب میں اس سے لپٹ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ وہ کریم جو کہا کرتا تھا کہ رونا لڑکیوں کی عادت ہے!

گل بھی رونے لگا — اور تب کریم نے اسے بتایا "قیصر بھائی موٹر کے نیچے کچلے گئے —" گل نے قیصر بھائی کو نہیں دیکھا تھا مگر وہ اور زیادہ رونے لگا۔ اس کا دل بالکل عورتوں کا سا تھا اسے اپنی ماں کی موت یاد آ گئی۔ جانے کب تک وہ دونوں سسک سسک کر روتے رہے۔ قیصر بھائی کے مرنے پر اتنی بڑی سڑک پر صرف دو لڑکے رو رہے تھے۔ شاید ساری دنیا میں ان دو کے علاوہ ان کے لئے اور کوئی رونے والا نہ ہو — یا ان کے رونے والوں کو خبر ہی نہ ہو۔ وہ کسی گاؤں کے تھے۔ اپنی ماں کو خرچ بھیجتے تھے۔ بڑی محنت کرتے تھے خود بھی پڑھتے تھے۔ لڑکوں کو بھی پڑھاتے تھے۔ مجھے تو بنا پیسوں کے پڑھاتے تھے، چھوٹا بھائی سمجھتے تھے کہا کرتے تھے جب میں نوکر ہو جاؤں گا تو تمہیں اسکول میں داخل کرا دوں گا۔ کریم ان کی باتیں یاد کر کے پھر رونے لگا۔ گل اب

میں کیا کروں ـــــ اب مجھے قیصر بھائی کہاں سے ملیں گے ـ اب مجھے کون پڑھائے گا ـــ"

گل کا ذرا بھی جی نہ چاہ رہا تھا کہ کریم کو چھوڑ کر جائے ـ مگر اسے ڈر تھا کہ استاد پوچھے گا اتنی دیر کہاں رہے ـــ اگر کسی لڑکے کو دیر ہو تو استاد ڈرتا تھا کہ پولیس کے ہتھے چڑھ کے اس کے راز نہ بتا دے ـ حالانکہ اس کے شاگرد پولیس کے ہاتھوں محفوظ ہی تھے مگر پھر بھی کبھی کبھی کوئی ٹیڑھا آدمی مل ہی جاتا ـ اس لئے استاد بہت احتیاط کرتا تھا ـ گل نے گھبرا کر سوچا کہ استاد آج خوب مارے گا ـ وہ بولا "کریم جی نہیں چاہتا تجھے چھوڑ کر جاؤں مگر استاد کی مار سے ڈر لگتا ہے ـــ پھر خالی ہاتھ لوٹ رہا ہوں وہ پوچھے گا تو کیا جواب دوں گا ـ"

"یار کبھی کبھی تو پریشان ہو کر سوچتا ہوں کہ میں بھی کہیں نوکری کر لوں ـــ مگر یہ بوٹ پالش کا کام نہیں چھوٹتا ہے ـــ اب میں کیا کروں اب اس میں جی نہیں لگے گا ـــ چل میں بھی تیرے استاد کے پاس چلوں "

"نہیں ـــ نہیں ـــ تیری ایک دن نہ نبھے گی ـ تجھے تو وہ مار ڈالے گا ـ کریم تو جیسا ہے ہم سب سے اچھا ہے ـــ تو اسی طرح گزار ـــ"

"کیا اتنی بڑی دنیا میں اب مجھے کوئی دوسرا پڑھانے والا نہیں ملے گا ؟"

"نہیں ملے گا ـــ گل اب اتنی بڑی دنیا میں مجھے دوسرے قیصر نہیں مل سکتے ـــ"

"قیصر بھائی کی ماں اب کیا کرے گی ـــ ؟ گل کو قیصر بھائی کی ماں کا بار بار خیال آ رہا تھا ـ کریم کو ان کی ماں کا خیال نہ آیا تھا ـ اس نے تو اپنی ماں کے بارے میں بھی کبھی نہیں سوچا تھا وہ زندگی میں ماں کی اہمیت ہی نہ سمجھ سکتا تھا ـ اپنی ماں کے لئے اس کے دل میں ایک انجانی سی نفرت تھی ـ اس کا باپ نشے میں اکثر کہا کرتا تھا اگر وہ زندہ ہوتی تو اسی طرح کبھی تو کرتی " جانے کس طرح کی عورت سے شادی کی تھی اس کے باپ نے ـــ جو اسے بیوی کی چاہت دے سکی نہ کریم کو ماں کی ممتا ـ

کریم نے سوچا قیصر بھائی کی ماں ضرور اچھی عورت ہو گی ـ گل ماں کی اہمیت جانتا تھا ـــ ماں کے وجود تک زندگی اسے کال کوٹھری میں بھی جنت معلوم ہوتی تھی اور اس کے بعد اتنی بڑی دنیا اس کے لئے دوزخ بن گئی ـــ اس لئے اسے قیصر بھائی کی ماں پہ شدید ترس آ رہا تھا ـ اس نے کریم سے کہا " کاش ہمیں ان کا گھر معلوم ہوتا ـ ہم ان کے پاس جا سکتے "

"ان کی ماں کو اخبار سے خبر مل جائے گی ـ پولیس والے کہتے تھے ہو تصویر چھپے گی ـ کریم کی آنکھوں میں پھر آنسو چمکنے لگے " میں سمجھتا تھا وہ بہت بڑے آدمی بنیں گے ـــ وہ سچ مچ بہت اچھے تھے ـ تو نے کبھی نہیں دیکھا ـــ اگر تو ایک بار ان سے بات کر لیتا تو ساری عمر استاد کی شکل نہ دیکھتا " مر تو ابھی استاد کے پاس جانے کی بات کر رہا تھا "

"یونہی ـــ ذرا دماغ چکرا سا گیا تھا ـ مجھے جانا ہوتا تو بہت پہلے چلا گیا ہوتا ـــ اب تو میں کبھی نہیں جاؤں گا ـــ"

"اچھا چلتا ہوں استاد خفا ہو گا ـــ"

"ارے تو اتنا بڑا جوان لڑکا ہو کر بھی استاد سے اتنا ڈرتا ہے " جب میں تیرے برابر ہو جاؤں گا تو دیکھنا کیا کروں گا ـ "

"کیا کرے گا ـــ ؟"

کریم ہنس پڑا مگر اس کی آنکھوں میں اب تک آنسو چمک رہے تھے ـ

گل جب اڈے پر آیا تو استاد بہت خفا ہوا " خالی ہاتھ آیا ہے ـ پھر آخر تو کیا رہا ـــ " اس کی خوب پٹائی ہوئی ـ جب وہ رات کو سونے لیٹا تو اس کی ہڈی ہڈی دکھ رہی تھی ـ مگر اسے کوئی افسوس نہ تھا کہ وہ کیوں دیر سے آیا ہے ـ کریم اس کا اتنا پیارا دوست ہے اس کی خاطر مار بھی کھا لی تو کیا ہوا بلکہ آج وہ وہیں سو جاتا ـــ کریم کے ساتھ اس کے گھر چلا جاتا ـــ اس کا باپ کتنا ہی برا سہی مگر بے رحم نہیں ہے ـ گل جب بھی اس کے گھر رہا کریم کا

باپ اچھی طرح ہوتا ——— نشے میں تو اس کے لئے وہ اور کریم دونوں ایک جیسے ہوتے تھے۔ کسی سے بھی مطلب نہ رکھتا تھا بیچارہ ——— ! ایک یہ استاد ہے ظالم اور جھوٹا ——— "پیسہ نہیں ——— پیسہ نہیں" ہر وقت رٹ لگائے رہتا ہے حالانکہ اس کے پاس بہت پیسہ ہے۔ اس لمحے گل کا جی چاہا کاش اس کا باپ بھی زندہ ہوتا چاہے کریم کے باپ جتنا برا ہوتا ——— اس کی پروا نہ کرتا۔ شرابی جواری سب کچھ ہوتا ——— مگر ہوتا تو ——— پھر اسے ماں یاد آگئی۔ وہ کہا کرتی تھی تو اس ظالم کی تصویر ہے۔

ایسا ہی ہوگا میرا باپ جیسا میں ہوں۔ اس نے محبت سے اپنے چہرے کو ہاتھ لگانے کے اس ٹکڑے سے آئینے میں دیکھا جو اس کی جیب میں پڑا رہتا تھا۔ اس طرح محبت سے اس کی ماں کے مرنے کے بعد پھر کسی نے اس صورت کو نہ دیکھا تھا۔ آج اسے اپنے وجود کے لیے ایک نامعلوم سی محبت محسوس ہوئی جیسے وہ اس کا اپنا وجود نہیں اس کے باپ کا دوسرا وجود ہے۔ آئینے میں نہ جانے کتنی دیر تک وہ اپنے باپ کو ڈھونڈتا رہا اور پھر اس کی آنکھ لگ گئی۔

ایک دن گل کی خوشی کی انتہا نہ رہی جب اس نے ایک جھونپڑی سی دکان پر خان زمان کو دیکھا۔ وہ دوڑ کر خان زمان سے لپٹ گیا۔ خان زمان بھی اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا وہ خوب ہٹا کٹا اور طاقت ور نظر آ رہا تھا۔ ان چند برسوں میں اس کے اندر زیادہ تبدیلی نظر نہ آتی تھی۔ وہ گل سے ——— بولا "تو تو بڑا ہو گیا۔ ایک دم جوان ——— جو تو رکے سے کام بھی کرتا ہے یا اب تک ویسی ہی عورتوں کی سی باتیں کرتا ہے۔" جیسی بچپن میں کیا کرتا تھا۔ گل نے خان زمان کو استاد کے بارے میں بتایا۔ وہ ساری باتیں سن کر بولا "اسے چھوڑ کر آج ہی میرے ساتھ چل ——— میں ایسے ہزاروں استادوں کو جانتا ہوں، وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔" گل استاد سے بہت بیزار تھا۔ وہ خان زمان کو اپنا نجات دہندہ سمجھا اور اس نے سوچا جیل میں تو سب خان زمان کو برا کہتے تھے مگر جو بھی ہو خان زمان استاد سے ضرور اچھا ہی ہوگا۔

"اب اتنے سال بعد باہر آیا ہوں۔ سالوں کو تگنی کا ناچ نہ نچا دوں تو میرا نام بدل دینا۔"

گل لرز گیا "تو کیا تم پھر ڈاکہ ———"

"ہش ——— تیرا خیال ہے سرکار مجھے وظیفہ دے گی جو گھر پر بیٹھ کر کھاؤں گا۔ اور مجھے کوئی دوسرا کام پسند نہیں ہے۔ خطروں سے محبت ہے جب تک زندگی میں خطرہ نہ ہو، چونکا دینے والی بات نہ ہو ——— مزا ہی نہیں آتا۔"

گل کو اس کی بات بڑی عجیب لگی۔ اس نے سوچا استاد اسے بزدل اور نکما سمجھتا ہے مگر وہ خان زمان پر ثابت کر دے گا کہ وہ ڈرپوک نہیں ہے۔

"سوچ لو ——— ابھی وقت ہے۔"

"میں سوچ چکا ہوں" گل نے بچپن کی رفاقت میں زیادہ کشش محسوس کی۔

پھر اسے دوسرے پرانے رفیق یاد آئے اور اس نے پوچھا "ماسی مہران کیسی ہے، دادی کا کیا بنا، رحمان بابا کیسے ہیں۔؟"

"سب اچھے ہیں۔ دادی مر گئی۔ رحمان بابا بیمار رہتا ہے۔ ماسی مہراں کی سزا پوری ہونے والی ہے۔"

"ماسی رحیمن، اور وہ دوسری وارڈن ——— اور وہ مونچھوں والا وارڈن اور جیلر صاحب ——— سب لوگ کیسے ہیں۔" گل کو وہ سب بچھڑے ہوئے عزیزوں کی طرح یاد آئے۔

"سب اچھے ہیں۔ جیلر صاحب اور زیادہ موٹے ہو گئے ہیں" بیتے دنوں کی یاد سے گل نے خان زمان کے لئے اور زیادہ محبت محسوس کی اور وہ بولا "جلدی چلو ——— استاد نہ آ جائے"

"استاد کے فرشتے بھی اب تیرے پاس نہیں آ سکتے۔"

چند روز خان زمان اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ رہ کر گل کو یہ اندازہ ہوا کہ خان زمان استاد ہی کا دوسرا جسم ہے بلکہ وہ استاد کا بھی استاد ہے ۔ گل کو خان زمان سے ایسا ڈر نہیں لگتا تھا جو ہر وقت استاد کے گھر میں دماغ پر مسلط رہتا تھا۔ پھر بھی وہ خان زمان کو خوش رکھنا چاہتا تھا اور اپنی بہادری ثابت کرنے کا موقع ڈھونڈ رہا تھا۔ اسے یہ فکر رہتی تھی کہ کہیں استاد کی طرح وہ بھی اسے بزدل اور نکما کہنا شروع کر دے۔ خان زمان کے ساتھیوں میں سے گل کو دو آدمی پسند آئے تھے شیرو اور سلیمان ۔ سلیمان عمر میں اس سے تھوڑا ہی بڑا ہو گا وہ بہت ہنسنے ہنسانے والا آدمی تھا اور وہ دونوں گل سے برابری کا برتاؤ کرتے تھے ۔ استاد کے ہاں کے توہین آمیز اور ذہنک کے برتاؤ کے بعد یہ برتاؤ گل کے لئے بہت ہی اچھا تھا۔ خان زمان نے وہی برابری قائم کر رکھی تھی جو جیل کی دیواروں کے اندر تھی ۔

ایک دن خان زمان نے کہا کہ ”تجھے پتہ چلاؤں کہ تیرے استاد نے کتنا ہنر سکھایا ہے “

” کیا جیب ۔۔۔۔۔؟ “

” خان زمان نے قہقہہ لگایا ” ارے جیبوں میں کیا ہوتا ہے۔ آج کل کوئی بیوقوف ہے جو جیب میں پیسے لے کر نکلے ۔ اور پھر بھیا جن کی جیبوں میں پیسے ہوتے ہیں۔ وہ تو زمین سے موٹروں میں نکل جاتے ہیں سیدھے دکان کے سامنے جا کر موٹر روکتے ہیں۔ خریداری کی اور چلتے بنے ۔۔۔۔ استاد پاگل ہے ۔ غریبوں کی جیبیں کاٹتا ہے ۔ لاکھوں چھوٹی ضرورتوں کے لئے لوگوں کو پریشان کر کے ان کی بددعائیں لیتا ہے ۔ میں تو ان کا پیسہ لیتا ہوں جن کے پاس فالتو پیسہ ہوتا ہے ۔“

گل مسکرا دیا ۔۔۔۔ اس نے سوچا کہ خان زمان واقعی عقل مند آدمی ہے ۔

چند روز بعد گل نے دیکھا کہ وہ سب رازداری سے باتیں کیا کرتے تھے ۔ خان زمان نے کہا تجھے ابھی تجربہ نہیں ہے اس لئے ابھی خاموشی سے دیکھتا ہے تو اچھا ہے ۔ مگر گل نے بہادری کی دھاک بٹھانے کا موقع دیکھا تو اصرار کیا کہ اسے ضرور شامل کیا جائے۔ خان زمان احتیاطاً اسے ساتھ نہ لینا چاہتا تھا مگر عین موقع پر اس کا ایک ساتھی بیمار ہو گیا ۔ اس لئے اس نے گل کو بھی شریک کر لیا ۔

رات کو چند لوگ باری باری اڈے سے نکلے ۔ ان میں گل شیرو سلیمان خان زمان اور کالا خان شامل تھے ۔

گل کو کالا خان ذرا بھی پسند نہ تھا وہ منہ ٹیڑھا کر کے بولتا تھا اور اس کے ہونٹوں سے ہر وقت تھوک اڑتا تھا ۔ گل کو اس سے بڑی گھن آتی تھی ۔ خان زمان اور کالا خان کے پاس رائفلیں تھیں ۔ باقی سب نہتے تھے ۔

خان زمان نے گل کو بتایا تھا کہ یہ کوئی ڈاکہ نہیں ہے ایک چھوٹی سی مشق ہے ۔ مدت سے کام چھوڑا ہوا ہے ۔ اس لئے مشق ضروری ہے ۔ ورنہ اتنی چھوٹی اسامی پر ہاتھ ڈالنا اچھا نہیں لگتا ہے ۔ ایک بہت بڑے خان کا گھر بھی اسے چھوٹی اسامی معلوم ہو رہی تھی کیوں کہ اس کے ارادے بہت بڑے تھے ۔ ایک چھوٹے ملازم نے بتایا تھا کہ پورا زیور اور جہیز تیار ہے اور اس لئے خان زمان نے مشق کے لئے اس کو بھی کو پسند کیا ۔ خان زمان نے گل سے یہ بھی کہا تھا کہ اسے دیکھنے کے لئے ساتھ لے جا رہا ہے ۔ اصل کام تو وہ اور کالا خان کریں گے ۔ اسے معمولی کام دیا جائے گا ۔ خان زمان سمجھتا تھا کہ استاد کے ساتھ کئی سال گزار کر گل کو بھی کچھ نہ کچھ تو ہنر آتا ہی ہو گا اور وہ بالکل اناڑی بھی نہ ہو گا ۔ لیکن پھر بھی گل کی طرف سے اسے کھٹکا سا تھا ۔ اس نے گل کو سمجھا رکھا تھا کہ جلدی نہ کرے سب کو دیکھے اور پھر کام کرے ۔ سیڑھیوں کا فاصلہ ان سب نے بلیوں کی طرح طے کر لیا گل کو اس میں بھی بہت دیر لگی ۔ وہ سب مقررہ سمتوں کی طرف ہو لئے ۔ گل سے کہا گیا کہ وہ ساتھ والے کمرے میں جا کر بستر پر جو بھی سو رہا ہو اسے یہ رومال سنگھا دے اور پھر خاموش کھڑے ہو کر آہٹ کا انتظار کرے اور کھٹکا ہوتے ہی بھاگ جائے ۔

گل نے کمرے میں داخل ہو کر دیکھا ایک بہت خوبصورت مسہری بچھی ہوئی تھی ۔ قریب ہی میز پر لیمپ میں سے ہلکی ہلکی روشنی آ رہی تھی ۔ اتنی اچھی مسہری گل نے پہلے نہیں دیکھی تھی کمرے کی ہر چیز نئی اور خوبصورت تھی ۔ وہ مسہری کی طرف بڑھا ۔ اتنی خوبصورت سرخ رضائی بھی اس نے پہلے نہیں دیکھی تھی ۔ وہ مسحور سا ہو گیا ۔۔۔۔ اور زیادہ قریب گیا تو بھونچکا سا رہ گیا ۔ اسے ہدایت کی گئی تھی کہ فوراً رومال سنگھا دے ۔۔۔۔ اس نے جیب سے رومال تو نکال لیا مگر رومال

اس کے ہاتھ سے ایک طرف گر پڑا اور اسے خبر بھی نہ ہوئی۔ وہ مبہوت کھڑا رہا۔

تکیے کے غلاف کے سفید اور چمکدار غلاف پر کالے کالے بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے ہلکے گلابی رخساروں پر سیاہ پلکیں کتنی بھلی لگ رہی تھیں۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی جیسے وہ سپنے میں دولہا کو دیکھ رہی ہو۔ گل حیران پریشان سوچنے لگا —— یہ کون ہے —— نیلو تو نہیں —— ؟ نہیں نیلو کو تو وہ بہت سی فلموں میں دیکھ چکا ہے —— گل نے بازار میں ہزاروں عورتیں پھرتی دیکھی تھیں مگر اسے کوئی عورت اچھی نہ لگی تھی۔ وہ عورتوں کو اکثر توڑے غرور سے اس لئے بھی دیکھا کرتا تھا کہ شاید ان میں ماسی رضیہ کی من گھومتی مل جائے ! پھر گل کو وہ کہانیاں یاد آئیں جو ماسی رضیہ شہزادیوں کی سنایا کرتی تھی گل بکاؤلی —— اور بدر منیر —— ! اور نیلم شہزادی —— ! کتنی کہانیاں سنی تھیں اس نے سوچا بالکل شہزادیوں کی سی صورت ہے۔ ضرور یہ کوئی شہزادی ہے —— ! اس کا جی چاہا کہ وہ بس چپ چاپ کھڑا اسے دیکھتا رہے۔ —— بس دیکھتا رہے !!

اچانک ساتھ والے کمرے سے چیخ کی آواز آئی اور پھر گولی چلنے کی آواز —— اور پھر بستر پر سوئی ہوئی لڑکی چیخ مار کر اٹھ بیٹھی —— ! اس کے چیخ مارتے ہی گل گھبرا گیا —— اس کے قدم ہلنا بھول گئے۔ وہ حیران پریشان سراسیمہ کھڑا رہا —— !

اس کے سب ساتھی بھاگ چکے تھے —— وہ گرفتار کر لیا گیا۔ چوکیدار کی لاش ڈیوڑھی میں پڑی ہوئی تھی اور ایک لمبے چوڑے آدمی نے گل کو دونوں بازوؤں سے پکڑ رکھا تھا —— وہ نہ بھی پکڑتا تو گل وہاں سے نہ بھاگتا۔

"چچا جی —— جب میں جاگی تو یہ میری صورت دیکھے جا رہا تھا —— "

اس کی پیٹھ پر گھونسے تابڑ توڑ پڑے —— "کس نے خون کیا ہے ؟ "

"خون !" —— وہ گھبرا گیا —— ! وہ اتنا چکرایا ہوا تھا کہ اس کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آ رہی تھی۔

"بدمعاش تیرے ساتھ کون کون تھا ! —— جلدی نام بتا —— کس نے خون کیا ہے۔ موٹے آدمی نے مکے مار کر پھر پوچھا —— وہ بے بس ہو کر گڑگڑایا
"شہزادی میں سچ کہتا ہوں میں نے خون نہیں کیا —— "

"شہزادی" —— ! لڑکی یہ لفظ کہہ کر زیر لب مسکرائی "سنا چچا جان مجھے شہزادی کہہ رہا ہے "

لڑکی کے چچا نے فون کیا —— تھوڑی دیر میں ہر طرف پولیس کی سیٹیاں سنائی دینے لگیں۔ اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دی گئیں۔ لڑکی نے اسے ترس کھا کر دیکھا اور پھر بولی "کم بخت کی شکل صورت تو بھلے آدمیوں کی سی ہے "

"سارا زیور لے گئے۔ بھاری بورڈوں کا ایک بکس لے گئے ورنہ تو چھینک گئے" چچا پریشان ہو کر بولے۔

"آپ گھبرائیے نہیں انشاء اللہ سب کچھ مل جائے گا۔ زمین آسمان ایک کر دوں گا —— " انسپکٹر نے کہا —— پھر —— اس نے گل کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈلوا دیں اور بولا "مار مار کر ادھ موا کر دیں گے سب کچھ قبول دے گا —— نہیں بتائے گا تو پھانسی پر چڑھے گا۔"

چچا جان کو زیورں کے خیال میں چوکیدار بھی یاد نہ رہا تھا۔ ابھی اچانک اس کا خیال آیا " بیچارہ —— بڑا وفادار آدمی تھا۔ نمک کا حق ادا کر دیا "

گل کو تھانے میں سارے دن مار پڑی۔ خان زمان نے سمجھا رکھا تھا خبردار پکڑے جاؤ تو کچھ نہ بتانا —— کسی کا نام نہ لینا۔ وہ استاد کی مار کھا کھا کر ڈھیٹ ہو گیا تھا مگر اس مار کے سامنے استاد کی مار کی حقیقت نہ تھی۔ خان زمان نے اسے آج تک نہ مارا تھا —— کتنا اچھا برتاؤ تھا اس کا —— وہ بھی خان زمان کو نقصان نہ پہنچنے دے گا —— کتنے عرصہ جیل بھگت کے باہر نکلا ہے۔ اسے تو ابھی اپنی زندگی کا تاریخی ڈاکہ بھی ڈالنا ہے۔ ڈنڈے جوتے —— لاتیں —— سب کچھ کھا کر بھی وہ یہی کہتا رہا "مجھے نہیں معلوم کس نے خون کیا ہے —— ؟ "اسے نہیں معلوم تھا گولی کس نے چلائی ہے ——

خان زماں یا کالے خان ——— مگر وہ ان دونوں میں سے کسی کا نام نہیں لے سکتا تھا ——— اس نے سوچ لیا تھا جان دے دے گا مگر خان زماں سے بے وفائی نہیں کرے گا
اس کی جوانی پر ترس کھا کر ایک سپاہی نے کہا۔ قاتلوں کا نام بتا دے۔ سلطانی گواہ بن کر صاف بچ جائے گا ورنہ بجرمِ قتل کے الزام میں پھانسی ہوگی۔

"پھانسی ——— " گل کے حلق میں پھانس سی لگی۔ زندگی سے اسے محبت تھی۔ اپنے اس وجود کی خاطر اس جسم و جان کے لئے کون کون سی سختیاں برداشت نہیں کی ہیں۔ ——— اور وہ اب مرنا نہیں چاہتا۔ وہ زندہ رہنا چاہتا ہے۔ مگر اس طرح کی زندگی بھی تو اسے پسند نہیں ہے ——— اس کا جی چاہتا ہے ایک گھر ہو ——— گھرا

"دوسرا سپاہی بولا" پھانسی نہ ہوئی تو عمر قید ضرور ہوگی وہ پھانسی سے بھی بری ہے"

"عمر قید ——— !" گل کے چہرے پر مسکراہٹ کھل گئی۔ اس کا جسم چوٹوں کے شدید درد سے تڑپ رہا تھا مگر ہونٹ دیر تک مسکراتے رہے۔

اس کی ماں کو بھی عمر قید ہوئی تھی ——— ! اسے اپنی ماں یاد آئی ——— ! پھر وہ کوٹھری یاد آئی جس میں ماں کے ساتھ رہتا تھا۔ ماں کی لوریاں اور کہانیاں یاد آئیں ——— اگر ماں نہ مرتی تو وہ کبھی نانی کے گھر نہ آنے دیتی ——— لیکن شاید جوان ہونے پر اسے آنا ہی پڑتا ——— ! مگر اب اگر اسے عمر قید ہو گئی تو وہ پھر ہمیشہ وہیں رہے گا اسے کوئی نہ نکال سکے گا۔ گل کو مایوسی میں امید کی کرن نظر آنے لگی۔

مقدمہ چلا ——— گل نے قاتل کا نام نہیں بتایا "میں کسی کو نہیں جانتا" اس نے ایک ہی جواب دیا۔ اس پر قتل کا الزام عائد کیا گیا مگر عینی شہادت برعکس تھی۔ پچھلا اور اگلا دونوں پولیس کے سامنے بیان دے چکے تھے کہ گولی چلنے کی آواز آئی تو وہ لڑکی کے کمرے میں خاموش کھڑا تھا۔

مقدمے کے نتیجے میں اسے عمر قید کی سزا ہو گئی ! عمر قید کے لئے تو وہ اقبالِ جرم کو بھی خوشی سے تیار تھا مگر عدالت نے رحم کیا اور اسے ایک زندگی دے دی اور ایک گھر دے دیا ——— !!"

جب وہ انیس برس کا جوان عمر قید کی سزا کاٹنے جیل کے آہنی پھاٹک میں داخل ہوا تو قیدیوں اور سپاہیوں نے اسے ترس کھا کر دیکھا ——— !"یہی تو باہر رہنے کے دن تھے ——— " کتنوں نے کہا۔

جیلر صاحب نے اسے پہچان لیا "گل تم آگئے ——— "

"جی ہاں جیلر صاحب اب میں کبھی نہیں جاؤں گا" وہ خوش ہو کر بولا۔

"مجرم کی اولاد بھی مجرم ہوتی ہے۔ تم بھی خونی بنے ——— تمہاری ماں بھی قاتل تھی ——— "

جیل کے آہنی پھاٹک میں داخل ہونے کے بعد زمین اور آسمان پھر مل گئے۔ دنیا چھوٹی سی اور محفوظ معلوم ہونے لگی۔ ایسی دنیا جس میں سب ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ اس نے دور سے رحمان بابا کو نماز پڑھتے دیکھا۔ بہت سے نئے نئے چہرے نظر آئے مگر نئے ہو کر بھی سب اپنے لگے ——— در و دیوار سے اپنائیت کی بو آ رہی تھی۔ اس نے سوچا بغیر جیب کاٹے اور چوری کئے اسے دو وقت سکون سے روٹی ملے گی ——— ! صبح جائے ——— وہ پتلی پانی سی دال اس کا مزہ یاد کر کے اسے خوشی سی محسوس ہوئی ——— اور وہ پھیکی سی موٹی روٹی جو وہ بچپن سے کھاتا آیا ہے اب پھر کھائے گا۔ اور پھر وہ سارا دن کام کرے گا ——— وہ کام سے نہیں گھبراتا آخر استاد کے گھر کا سارا کام کرتا تھا۔ یہاں سب قیدیوں کے ساتھ برتن مانجھے گا، جھاڑو دے گا ——— باغ میں خوبصورت پھول لگائے گا گلاب کے پھول ——— اور پھر اسے جانے کیوں شہزادی یاد آگئی ——— جو بالکل گلاب کے پھول کی طرح تھی۔ اس نے سوچا کاش اس کی ماں کی پوٹلی چوری نہ ہوئی ہوتی تو وہ چاندی کا گلوبند شہزادی کو دے دیتا ——— !

صبح سویرے جب قیدی کھڈی کا کام کریں گے اور قالین بنیں گے تو وہ وارڈن سے پوچھ کر عورتوں کے احاطے میں جائے گا اور ماسی جیراں سے ملے گا اسے اور دوسری وارڈن عورتوں کو جنہیں وہ ماسیاں کہا کرتا تھا، شہزادی کے بارے میں بتائے گا ——— ! اتنی بڑی دنیا میں اسے ماسی رضیہ نہیں مل سکی۔ نانی کا

مگر نہیں ملا مگر اس نے شہزادی کو دیکھ لیا ——! اور اب ساری زندگی وہ شہزادی کو نہیں بھول سکے گا۔ اگر وہ جیل سے باہر رہ گیا ہوتا تو کبھی شہزادی کو نہ دیکھ سکتا۔ اچھا ہی ہوا کہ اس نے شہزادی کو دیکھ لیا ہے ——!

اب جب وہ کام کرتے ہوئے شہزادی کے بارے میں سوچا کرے گا تو تمام کام اچھی طرح کر سکے گا۔ کام میں خوب جی لگا کرے گا۔ ہر کام اس کی یاد سے عجب صورت ہو جائے گا —— وہ دری اور قالین پر خوبصورت بیل بوٹے اور تیزی سے بنا سکے گا۔ وہ محنت سے نہیں گھبراتا، اس کا تو جی چاہتا ہے کہ وہ اتنی محنت کرے، اتنا کام کرے کہ اس کے خون پسینے سے ہر جگہ گلاب ہی گلاب نظر آئیں۔ جیل اور ساری دنیا گلاب کے پھولوں سے بھر جائے —— بس ہر طرف گلاب ہی گلاب ——!

اس نے جیل کی اونچی اونچی دیواروں کو دیکھا جو آسمان کو چھو رہی تھیں اس نے خوش ہو کر سوچا یہ میرا گھر ہے —— سب کا گھر —— جب ہی تو اسے بڑا گھر کہتے ہیں۔

اس لمحے جانے کیوں اسے کریم یاد آیا۔ کاش وہ بھی اس کے ساتھ آ سکتا۔ اس کی رفاقت میں زندگی بڑی اچھی گزرتی۔ اس نے کریم کو عرصے سے نہیں دیکھا تھا —— کاش وہ کریم کو شہزادی کے بارے میں بتا سکتا۔! اس نے سوچا کریم اخبار میں اس کی چھوٹی سی تصویر دیکھے گا۔! ہوٹل میں ہال کے سب لوگ جب اخبار پڑھیں گے تو کریم ضرور دوڑ کر ان سے اخبار چھین لے گا۔ اور کون جانے لڑکیوں کی طرح رونے کا مذاق اڑانے والے کریم کی آنکھوں میں اخبار دیکھ کر آنسو بھی آ جائیں گے وہ چپ چاپ اخبار رکھ کر سوچے گا گل برا لڑکا تھا —— نہیں نہیں وہ لوگ یہ نہیں سمجھ سکتے —— وہ تو اسے جانتا تھا —— اتنی بڑی دنیا میں بس ایک چھوٹا سا لڑکا ہی تو اسے جانتا تھا ——!

رات کو سیاہی پھیلنے سے پہلے ہی جب قیدیوں کو سلاخوں والی کوٹھری کے اندر کر کے وارڈن نے بڑے سے تالے میں چابی گھمائی تو گل کو اس لمحہ بڑا اطمینان محسوس ہوا۔ عجیب طرح کی حفاظت کا احساس ——!

کوٹھری میں داخل ہوتے ہی ماں کے پیار کی مہک آئی۔ اس نے گہرا سانس لیا ——! اور ایک ننھے سے معصوم بچے کی طرح بے فکری سے لال کمبل بچھا کر سمٹ کر لیٹ گیا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں —— اندھیرا کتنا پیارا ہے —— اور اجالا کتنا برا ہے اس نے سوچا ——! اندھیرا اس کا اپنا ہے اور اجالا پرایا ہے —— اس نے جب آنکھیں بند کیں تو اس کے ہونٹوں پر بچ بچ دودھ پیتے بچے کی سی مسکراہٹ پھیلنے لگی۔ سرخ کمبل کی مانوس بو محسوس کر کے اس نے خوشی اور آسودگی سے لمبے لمبے سانس لیے —— اور اس گھٹا ٹوپ اندھیرے اور مانوس فضا میں وہ خوشی اور گہری آسودگی کا احساس لے کر اس طرح سو گیا جیسے ایک بار پھر ماں کی کوکھ میں آ گیا ہے۔

نگہت مرزا

نامُراد

رکشا کی گھڑگھڑاہٹ عین گھر کے سامنے رکی تو اماں بی دیگچی میں چمچہ ہلانا بھول گئیں۔ دودی دالان یا برآمدے میں بچھے تخت پر آڑی ترچھی لیٹی، ٹانگوں میں تکیہ دبائے کوئی ناول پڑھ رہی تھی۔ رکشا کا انجن پھر سٹارٹ ہوا اور گھڑگھڑاہٹ ایکدم سے شروع ہو کر مدھم ہونے لگی۔ پھر سناٹے میں گھنٹی چیخ اٹھی۔ فاروق احمد ڈریسنگ گاؤن سے الجھتا بھاگتے قدموں اپنے کمرے سے نکل کر ڈرائنگ روم کی طرف گیا۔ اماں بی نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور سہم کر، چپکے چپکے آیت پڑھ کر، بھاگتے فاروق احمد پر پھونک ماری ——— مولا، تو ہی میرے بچے کا نگہبان ہے۔ پھر یونہی جی کی تسلی کی خاطر انہوں نے چلا کر دودی سے پوچھا "ری دودی باہر کون آیا ہے؟"

دودی نے کتاب پر سے نظریں ہٹائے بغیر لاپروائی سے کہا "میں کیا جانوں اماں۔ ہوگی وہی چڑیل"

یوں سب شک ختم ہوئے تو اماں بی نے تیزی سے چمچہ چلانا شروع کر دیا۔ یہ چڑیل کہاں سے لگ گئی میرے بچے کے پیچھے۔ مولا تو ہی بچائیو اسے۔ میں تو چولہے میں ڈالوں ایسی لڑکی کو۔ ارے کیا اس کے ماں باپ کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہے! اندھیر ہے اندھیر ——— پھر ان کی نظر ناگاہ دودی پر جا پڑی "اے ہے لاکھ بار کہا ہے اس قطامہ کو، ٹانگوں میں تکیہ دبا کر نہ لیٹا کرو۔ موئی بدذات سنتی ہی نہیں"

دودی اماں بی کی جلتی نظروں سے لاپروا انہماک سے ناول پڑھتی رہی۔ کسی انتہائی رومانی منظر سے اس کے چہرے پر لالی جھلکنے لگی، گال تپ اٹھتے، نتھنے ہوئے ہوئے کانپنے لگتے اور ٹانگوں میں دبے تکیے پر اس کی گرفت اور بھی تیز ہو جاتی۔

"موئی نامراد!" اماں بی نے اب کی بلند آواز سے کہا۔ ان کا جی بے تحاشا لڑنے جھگڑنے اور اونچی اونچی آوازیں رٹنے کو چاہ رہا تھا۔

پندرہ بیس منٹ گزرے تو فاروق احمد ڈرائنگ روم کا پردہ ہٹا کر باہر نکلا اور ڈریسنگ گاؤن اتارتے ہوئے اماں بی کے پاس آ کھڑا ہوا "اماں ــ چائے ملے گی؟"

اماں بی کا دبا ہوا غصہ بھڑک اٹھا۔ چلا کر بولیں "میں کیا بھٹیارن ہوں؟ ادھر سے آؤ تو چائے۔ ادھر سے آؤ تو چائے۔ مجھے کیا تیرا باوا جہیز کے لایا تھا کہ خادمہ بنا چھوڑا ہے دونوں بہن بھائی نے مل کر ———؟"

فاروق احمد کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی اور ڈریسنگ گاؤن کندھے پر ڈال کر وہ اپنے کمرے کی طرف جانے لگا۔

"میں پوچھتی ہوں آیا کون ہے؟" اماں بی اتنی جلد میدان چھوڑنے والی نہ تھیں۔

فاروق احمد کے چہرے پر دبی دبی مسکراہٹ پھیل گئی۔ گردن موڑ کر آہستہ سے بولا "نسرینا" ـ یہی کہتے کہتے وہ رک گیا۔ وہ جتنے پیار

سے اسے یہی کہتا، اماں بی اتنا ہی اس سے چڑتیں۔

دودی اس سارے ہنگامے میں ویسے ہی بے نیازی سے بیٹھی ناول پڑھتی رہی۔ بلکہ کو بھی سر اٹھا کر اس نے کسی کی طرف نہ دیکھا۔ فاروق احمد کپڑے بدل کر نکلا تو دودی کے پاس چلا آیا —— "دودی اندر چلو سبرینا بلا رہی ہے۔"

دودی نے کتاب پر سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔ "اونہوں۔"

فاروق احمد ٹائی درست کرتے کرتے رک گیا۔ "میں کہتا ہوں اندر چلو دودی۔"

دودی نے کتاب چہرے پر رکھ لی اور تمسخر سے بولی —— "ورنہ ——؟"

فاروق احمد نے جھٹکا دے کر ٹائی کی گرہ درست کی اور تخت پر بیٹھ کر دودی کے ماتھے پر پیار کرتے ہوئے بولا "ورنہ کیا۔ دودی میری بہن ہے اور مجھے پتہ ہے وہ سبرینا سے ضرور ملے گی۔"

چند لمحے وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر وہ چپ چاپ اٹھ کھڑی ہوئی اور فاروق احمد کے کندھے سے لپٹ کر بلی کی طرح اپنا چہرہ رگڑنے لگی۔ دودی کو یہ کر جب فاروق ڈرائنگ روم کی طرف چلا تو کنکھیوں سے باورچی خانے کی طرف دیکھا۔ اماں بی چائے کا پانی ابال رہی تھیں۔ "دراصل اماں اک ذری سٹھیا گئی ہیں۔" اس نے خوش دلی سے سوچا۔

پھر ڈرائنگ روم اچانک ہی قہقہوں سے بھر گیا۔ دودی کے قہقہے، فاروق کے قہقہے اور سبرینا کے قہقہے —— اور ان قہقہوں کے پیچھے دھوئیں سے بھرے باورچی خانے میں بے چاری اماں بی۔ انہیں اپنے آپ پر ترس آتا۔ اب تیری یہ قدر رہ گئی ہے۔ تجھ میں اور ایک خادمہ میں کیا فرق ہے! تو ان کی خدمت کرتی ہے، ان کے لئے کھانا پکاتی ہے، ان کے کپڑے دھوتی ہے، ان کے آئے گئے کی خاطر مدارات کرتی ہے اور بس —— اس کے معاوضے پر تیرا لڑکا تجھے ہر مہینے کی پہلی کو تنخواہ لا دیتا ہے اور بس —— آج تیرا گھر والا زندہ ہوتا تو تیری یہ حیثیت تو نہ ہوتی۔ پھر پلو منہ پر ڈال کر وہ چپکوں چپکوں رونے لگیں۔

ہمیشہ یونہی ہوتا۔ جب بھی سبرینا آتی اور وہ تینوں ڈرائنگ روم میں گھس کر اونچے اونچے قہقہے لگاتے تو اماں بی کو ایک دم اپنے شوہر کی یاد ستانے لگتی اور وہ پلو میں منہ چھپا کر سسکیوں میں رویا کرتیں۔ ہاں ہاں اب تو وہ سٹھیا گئی ہیں۔ انہیں کیا سمجھ زمانے کی۔ انہوں نے جب بھی فاروق احمد کو سنجیدگی سے سمجھانا چاہا وہ ہمیشہ یہی کہا کرتا۔ "ارے اماں تمہیں کیا پتہ زمانہ کتنا بدل چکا ہے۔"

تب وہ بھنا اٹھتیں۔ میں تو پاگل ہوں بے وقوف ہوں، مجھے کیا سمجھ زمانے کی۔ میں تو سٹھیا گئی ہوں، اور پھر وہ ایسے بڑے بڑے کوسنے دیا کرتیں کہ پاس پڑوس کی عورتیں دانتوں میں انگلیاں داب لیتیں، اور بعض تو کہا کرتی تھیں کہ اماں بی کی اس ہر آن لڑنے جھگڑنے اور ہر ایک میں کیڑے ڈالنے کی عادت نے ان کے میاں کے کلیجے میں ناسور ڈال دیئے تھے اور وہ بے چارہ گھل گھل کر مرا۔ بہر حال اب تو اماں بی بڑی عقیدت اور بڑی اداسی سے انہیں یاد کیا کرتیں اور ٹھوڑی تلے ہاتھ دھر کر سوچتیں —— فاروق کے ابا، اگر تم مجھ نصیبوں جلی کو چھوڑ کر نہ جاتے تو آج میری یہ حیثیت تو نہ ہوتی، کتوں سے بھی بدتر ——

یونہی روتے دھوتے انہوں نے صدیق کو بلا کر چائے اندر بھجوائی اور سر جھکا کر پھر سوچنے لگیں۔ یہ محفل رات گئے ٹوٹتی اور یوں کہ دودی پھر تخت پر جا بیٹھتی اور تکیہ ٹانگوں میں دبا کر ناول منہ کے سامنے رکھ کر پڑھنے لگ جاتی۔ وہی انہماک، وہی دلچسپی، وہی اردگرد سے بے نیازی۔ یوں محسوس ہوتا جیسے وہ یہاں سے کبھی پل کو بھی نہ اٹھی تھی۔ جیسے وہ کل سے، پرسوں سے، ہمیشہ سے اسی تخت

پراسی انداز میں لیتی ہے ــــ فاروق احمد سبرینا کو چھوڑنے چلا جاتا اور عموماً رات گئے لوٹا کرتا اور اگلے آنے والے دو تین روز تک فاروق احمد اماں بی سے نظریں چرائے خاموشی سے گھر میں داخل ہوا کرتا۔ مبادا اماں بی اسے سامنے بٹھا کر پھر وعظ و پند کے دفتر نہ کھول دیں۔

مگر کبھی کبھار وہ فاروق احمد کو پکڑ ہی لیتیں ــــ "میں کہتی ہوں فاروق، یہ آخر ہے کن کی لڑکی؟"

فاروق احمد بے چینی سے کندھے ہلاتے ہوئے کہتا ــــ "پتہ نہیں اماں"

اس پر اماں بی کی بلاغت عود کر آتی "اس کے تو لچھن ہی شریف لڑکیوں کے سے نہیں ہیں۔ میں کہتی ہوں فاروق، میری بات مان، آخر کو پچھتائے گا۔ ارے ایسی لڑکیاں بھی کبھی شریف گھروں میں آئی ہیں۔ ہے ہے کیسے اندھے ماں باپ ہیں کہ بیٹی کو یوں بے مہار چھوڑ رکھا ہے۔ توبہ! مردار، شیطان کے کان بہرے۔ میری جو کبھی ایسی لڑکی ہوتی تو میں اس کی ٹانگیں نہ چیر کے رکھ دیتی۔ کلمُونی کو ہنڈیا اُسے ــــ"

ایسے میں فاروق احمد ہمیشہ اٹھ کھڑا ہوتا اور بے چینی سے سر سہلاتا۔ اپنے کمرے کی طرف لڑکھڑاتا ہوا سا چلا جاتا۔

کبھی کبھار جب فاروق احمد ذرا خوشگوار موڈ میں ہوتا تو ہنس کر گویا اماں بی کو چڑاتا ــــ "مگر اماں، سبرینا میں ایسی کیا برائی ہے۔ صرف یہی نا کہ وہ اخبار کے دفتر میں کام کرتی ہے۔ مگر اس سے اس کے کردار پر تو کوئی بُرا اثر نہیں پڑتا"

اماں بی ایک دم چلا اُٹھتیں "لے اب چلا ہے مجھے جھٹلانے۔ ارے وہ غیر مردوں کے ساتھ آتی رات گئے گھومتی ہے۔ میں پوچھتی ہوں یہی شریفوں کے لچھن ہوتے ہیں؟" ناگاہ ان کی نگاہ دودی پر جا لگتی اور وہ شرمندہ سی ہو کر سوچتی "موئی نامراد۔ ہزار بار کہا ہے ایسے نہ لیٹا کر، جوان بھائی گھر میں ہے۔ اس کی غیرت خدا جانے کہاں ڈوب مری ــــ"

اس شام سبرینا جلد ہی چلی گئی۔ اصل میں وہ کچھ پریشان سی تھی۔ فاروق احمد نے کئی مرتبہ پوچھنا چاہا مگر ہر بار وہ ٹال گئی۔ اور دودی نے اسے یوں پریشان اور متفکر دیکھ کر سوچا، شاید سبرینا نے میرا وہ فقرہ جو میں نے چپکے اماں سے کہا تھا، سُن لیا ہو۔ سو وہ حتی الامکان اس سے اچھی اچھی باتیں کرتی رہی مگر سبرینا کی پریشانی کم نہ ہوئی اور جلد ہی اٹھ کر چل دی۔ اور خلافِ معمول اس نے فاروق احمد سے کہا کہ وہ اسے چھوڑنے کی ناحق تکلیف نہ کرے۔ اس پر فاروق احمد نے چونک کر اور گھبرا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

سبرینا اس شام واقعی بہت پریشان تھی اور بات صرف اتنی سی تھی کہ اس سہ پہر جب وہ دفتر سے نکلنے کو تھی تو کنول نے شرارت سے مسکرا کر کہا تھا "بھئی سبی، اب جلدی سے کوئی ہنگامہ پیدا کر دنا!" اس نے چونک کر پوچھا تھا "کیسا ہنگامہ؟" اس پر کنول کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔ "میرا مطلب ہے فاروق احمد سے شادی خانہ آبادی ــــ" تو وہ ایک دم بپھر پڑی تھی اور دوسرے کمرے میں جا کر ٹھنڈے پانی کے ایک گلاس سے اس نے اپنے حواس درست کئے تھے اور سوچا تھا، کنول یوں سوچتی ہے تو کیا اور لوگ بھی اسی خطوط پر نہیں سوچتے ہوں گے!

اور تب اس لمحے اسے احساس ہوا کہ وہ کیسی شدید احمق تھی کہ دنیا بھر میں سوائے اپنے ذہن کے اور کسی ذہن کے وجود کو تسلیم ہی نہ کرتی تھی، اور اب کنول نے اسے بتا دیا تھا کہ اس کے پاس بھی ایک ذہن ہے اور وہ بھی سوچنے پر قادر ہے۔ مگر فاروق احمد سے شادی؟ یہی سوال تھا جو اسے بار بار پریشان کئے جاتا ــــ لو ابھی تو اس نے خود مختارانہ زندگی میں قدم ہی رکھا تھا۔ ابھی سے کیسے اسے ترک کر دیتی؟ ــــ مدت کا خواب اب تو کہیں جا کر پورا ہوا ہے۔ نہیں نہیں، ابھی نہیں۔ ابھی تو شادی کا خیال بھی سراسر احمقانہ ہے ــــ اس نے فیصلہ کن

انداز میں سوچا تھا مگر پریشانی بدستور باقی تھی - اگر عام اذہان ان خطوط پر سوچتے ہیں تو پھر فاروق احمد! ـــ کیا وہ بھی اسی زاویے پر سوچتا ہوگا ؟ کیا اس کے ذہن میں بھی یہی خیال ہوگا ؟ مگر فاروق احمد تو میرے لئے ایک دوست ہے - ایک مخلص ہمدرد اور شفیق دوست اور بس۔
ـــ فاروق احمد سے شادی! نہیں نہیں، یہ انتہائی احمقانہ سی بات لگتی ہے اور اس شام فاروق احمد کے گھر بھی پریشانی اسے گھیرے رہی اور فاروق احمد سے باتیں کرتے ہوئے سبرینا نے سوچا، میں اس شخص کو اس لئے پسند کرتی ہوں کہ اس کا ذہن اس قدر شاداب ہے۔ اس کی گفتگو سے مجھے مضامین لکھنے میں مدد ملتی ہے - دنیا کے چپے چپے سے اس کی واقفیت بے پناہ ہے اور اس کا مطالعہ ـــ اور اپنی سوچوں میں گم ہونا وہ اس شام قہقہوں کے باوجود بے معنی سی گفتگو کرتی رہی۔

اس کے بعد کئی دن تک سبرینا فاروق احمد سے ملنے کی جرأت نہ پیدا کر سکی - فاروق احمد کا ٹیلیفون آتا تو وہ گھبرا سی جاتی اور اپنی بے پناہ مصروفیت کا عذر تراش کر ملنے سے انکار کر دیتی - وہ یہ فیصلہ تو کر چکی تھی کہ فاروق احمد سے کسی صورت بھی شادی نہیں کی جا سکتی - اب شادی کوئی گڑیا گڈے کا کھیل تو تھا نہیں کہ بغیر سوچے سمجھے ہاں کر دی جاتی۔

ایک بار فاروق احمد نے اسے بے حد غصے سے ٹیلیفون کیا "دیکھو سبی، اگر تم آج نہ آئیں تو پھر کبھی مت آنا۔"

اس نے سہم کر پوچھا "وہ کیوں فاروق؟؟"

فاروق غصے سے بولا "وہ یوں کہ آج کے بعد تم سے ملنے کے لئے وہاں کوئی نہ ہوگا ـــ"

سبرینا معصومیت سے بولی "کیوں؟ کیا گھر تبدیل کر رہے ہو؟"

فاروق پوری قوت سے دھاڑا "گھر نہیں، دنیا تبدیل کر رہا ہوں ـــ سمجھیں اب؟؟"

سبرینا خوف زدہ ہونے کی بجائے ہنس پڑی "فاروق ـــ للہ یہ تو بتاؤ تم اپنی سولہویں سالگرہ کب منا رہے ہو؟"

فاروق نے جھنجلا کر ٹیلیفون بند کر دیا۔

دوسری شام سبرینا فاروق احمد کے گھر تھی۔

اماں بی پر دہی غصے، مایوسی اور رقت کا دورہ پڑا - دودی حسبِ معمول پہلے تھوڑی سی ضد اور پھر بھائی کے پیار پر سبرینا سے مل مگر جلد ہی لوٹ آئی - وہ شاید ناول کا سب سے مزیدار حصہ پڑھ رہی تھی۔

اور سبرینا نے سوچا، اب وہ فاروق احمد کو اصل معاملے سے آگاہ کر دے گی اور اپنے فیصلے سے بھی ـــ اور ابھی وہ چپکے چپکے جملے ترتیب دے رہی تھی کہ فاروق خوشی سے بولا "ایک تو خوشخبری سنو سبی، امی رضامند ہو گئی ہیں!"

وہ چونک پڑی "کس بات پر؟"

فاروق چند لمحے اس کے بھولے چہرے کو دیکھتا رہا ـــ "سبرینا بیگم کو بہو بنانے پر۔"

سبرینا کا جی دھک سے رہ گیا، قطعی غیر متوقع حملہ تھا - وہ تو ابھی جملوں کی ترتیب پر ہی غور کر رہی تھی - پھر اس نے بمشکل جمع کی ہوئی قوت کو بروئے کار لاتے ہوئے پوچھا "میں مطلب نہیں سمجھی فاروق؟"

اس کے چہرے پر پھیلی زردی اور زبردستی کی حیرت پر فاروق کا ماتھا ٹھنکا مگر اس نے خوش دلی سے جواب دیا "مطلب سمجھنے کی تمہیں کچھ ایسی ضرورت بھی نہیں - جب امی تمہارے گھر جائیں گی تمہیں مانگنے ـــ"

سبرینا اور کوئی راہ نہ پا کر چلا اُٹھی "فاروق !!!"

دونوں چند لمحے حیران سی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر سبرینا نے پہل کی۔ قدرے کانپتی ہوئی آواز میں وہ رُک رُک کر بولی "فاروق —— افسوس ہے تم نے مجھے غلط سمجھا —— ! کیا ہم اچھے دوست نہ تھے ؟"

فاروق بھنّا اٹھا اور کرسی کے ہتھے پر مُکّہ مار کر چلّایا "سبرینا !"

پھر سبرینا کے خوف سے سفید ہوتے ہوئے چہرے کو دیکھ کر طنز سے مسکرایا، اور آہستہ سے کہنے لگا "میں مشرق کا باشندہ ہوں سبرینا بیگم، جہاں عورت اور مرد کے درمیان کوئی رشتہ نہیں سوائے ایک رشتے کے، اور وہ رشتہ شادی کا ہے۔" پھر چند لمحے خاموش رہ کر اس نے نظریں سبرینا کے چہرے پر گاڑ دیں اور تیز لہجے میں کہا "میں نہیں جانتا تھا کہ تم مشرق میں رہتے ہوئے بھی مغربی ذہن کی مالک ہو۔"

وہ چپ چاپ اس کی زہر میں بجھی باتیں سنتی رہی اور گود میں رکھے ہاتھوں سے کھیلتی رہی۔ فاروق رُکا تو اس نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور گھبرائی ہوئی سی آواز میں بولی "مگر فاروق کیا تمہارے نزدیک دوستی کی کوئی اہمیت نہیں ؟ کیا تم نے مجھے کبھی دوست نہیں سمجھا ؟"

فاروق احمد چپ چاپ بیٹھا میز بجاتا رہا ——

"فاروق ! کیا تم مجھے دوست نہیں بنا سکتے ؟" سبرینا آہستگی سے درخواست کے لہجے میں بولی "میں نے تو ہمیشہ تمہیں عام آدمیوں سے اونچی سطح پر پایا —— کیا تم میرے اس خیال کو جھٹلا دو گے ؟ بولو فاروق —— کیا تم واقعی اس بات پر یقین رکھتے ہو کہ مشرق میں —— اور فاروق کو بے چینی سے پہلو بدلتے دیکھ کر وہ خاموش ہو گئی ——

"تم غلطی پر تھیں سبرینا بیگم۔ میں ایک عام اور معمولی سا مرد ہوں —— اور مجھے افسوس بھی ہے کہ تم سا آورشی ذہن میرے پاس نہیں —— بہر حال ——" وہ چند لمحے چپ چاپ بیٹھا ویسے ہی میز بجاتا رہا۔ پھر آہستگی سے اُسے مخاطب کیا "آؤ تمہیں چھوڑ آؤں ؟"

سبرینا نے اس کے لہجے کی بے حسی کو محسوس کیا مگر کچھ نہ بولی اور بیگ اُٹھا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ راستے بھر دونوں خاموش رہے جیسے اچانک ہی برسوں کے فاصلے ان میں حائل ہو گئے ہوں۔

بیگم اختر کی کوٹھی پر جہاں سبرینا بیگم "پے انگ گیسٹ" کی حیثیت سے رہتی تھی، فاروق احمد کا "خدا حافظ" اس نے صرف ہونٹ ہلانے اور معمول کی مانند اپنا ہاتھ نہ بڑھایا۔

سبرینا نے دیکھا اور اچانک مڑ کر بولی "فاروق، کیا اب بھی میں تم سے مل سکتی ہوں نا ؟"

اس کے لہجے کی لجاجت پر فاروق کا جی پسیجا مگر فوراً ہی اس نے خود پر قابو پا لیا اور سپاٹ آواز میں بولا "نہیں !"

سبرینا لڑکھڑا گئی —— "کیوں ؟؟؟"

فاروق چند لمحے اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا "یہ بے مقصد ملاقاتیں تمہارے مستقبل پر اثر انداز ہو سکتی ہیں بے وقوف لڑکی !" پھر وہ جلدی سے مڑا اور سنسان تاریک سڑک پر تنہا چلنے لگا ——

سبرینا کا جی چاہا اُسے واپس بلائے، اس کے مضامین، اس کی کہانیاں، اس کی تو شخصیت ادھوری رہ جائے گی۔ مگر رات کی تاریکی نے اس کا وجود چھپا لیا تھا۔ چند لمحے وہ سیڑھیوں پر کھڑی رہی۔ پھر دروازہ کھول کر اپنے کمرے میں آ گئی اور سونے سے

پہلے اس نے تمام واقعہ ـــــ فاروق احمد کی پہلی ملاقات سے لے کر آج شام تک ـــــ دہرایا، اور سوچا کہ اس کا فیصلہ درست ہے۔ وہ ابھی کسی صورت میں بھی شادی نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے اتنے بڑے بڑے خواب چکنا چور ہو کر رہ جائیں گے۔ ابھی کچھ عرصہ وہ آزاد اور تنہا زندگی گزارنا چاہتی ہے ـــــ پھر وہ سو گئی۔

مہینوں تک سبرینا نہ لوٹی تو فاروق احمد کو عجیب سا لگا کہ دودی نے پلٹ کر ایک بار بھی اس کے بارے میں نہ پوچھا۔ البتہ اماں بی متفکر سی رہنے لگیں۔ ان کی بلا سے وہ کتیا نہ آئے مگر یہ جو فاروق کو چپ سی لگ گئی تھی، اس سے انہیں ہول آتا۔ بلا سے وہ موئی مردار ایک آدھ دن ہی کو آجائے، فاروق کے چہرے پر ہنسی تو پھوٹے۔ اب وہ کیسا نازک مزاج ہو گیا تھا۔ بات بے بات جھگڑ نے بیٹھ جاتا اور دودی کو جس سے وہ باپ جیسی محبت کرتا تھا، کیسے چھوٹی چھوٹی باتوں پر ڈانٹنے لگا تھا۔ اماں بی کا بے تحاشا جی چاہتا کہ فاروق کو پاس بٹھا کر محبت سے پوچھیں ـــــ بیٹے تو اتنا پریشان کیوں ہے؟ ـــــ مگر اس کے چہرے پر مسلط سختی وہ ہمیشہ خوفزدہ ہو جایا کرتیں ـــــ

ایک سہ پہر فاروق دیر تک پڑا سوتا رہا اور شام کے قریب بوجھل قدم اٹھاتا باورچی خانے میں آیا۔ "اماں چائے پلاؤ گی؟" سرد سے لہجے میں اس نے کہا۔

اماں بی کا جی بھر آیا۔ ستا ہوا چہرہ دیکھ کر ممتا کی شدید لہر اٹھی جو انہیں گھٹنے گھٹنے بھگو گئی۔ جی چاہا بڑھ کر اس کا سر اپنی گود میں لے لیں اور اس کے چہرے پر پھیلے سارے دکھ اپنے سینے میں سمیٹ لیں۔ "بیٹھو بیٹے۔ پانی گرم ہے ابھی دم کئے دیتی ہوں" وہ اندر آ کر دیوار کے ساتھ پڑی چوکی پر بیٹھ گیا۔ پانی کھولنے لگا تو اماں آہستہ سے بولیں "سبرینا نہیں آئی کتنے دنوں سے فاروق؟؟؟"

اس نے چونک کر اماں بی کی طرف دیکھا ـــــ کیا یہ وہی عورت ہے جو اس کے آنے پر اتنے نفیضے کھڑے کیا کرتی تھی! اُسے گالیاں اور کوسنے دیتی تھی! اور اب؟ جی چاہا ہنس کر پوچھے ـــــ پیاری ماں! اب یہ دودھ کیوں اُترا ہے؟ مگر پھر وہ اسی سرد لہجے میں بولا "پتہ نہیں اماں!"

اماں بی کے ہاتھ سے صافی گر پڑی۔ انہوں نے بلا ارادہ گھوم کر فاروق کی طرف دیکھا اور تعجب سے پوچھا "تو نے ٹیلیفون کر کے پتہ بھی نہ کیا؟"

فاروق جھنجلا کر بولا "مصروف ہو گی اماں۔" پھر اچانک ہی نہ جانے کیا ہوا کہ اس نے ایک ٹھوکر کے ساتھ چوکی نیچے گرا ئی اور باورچی خانے سے نکلتے ہوئے بولا "اب تو تمہیں خوش ہونا چاہئے اماں۔ سبرینا اب یہاں کبھی نہیں آئے گی!"

اماں بی پر جیسے اختلاج کا دورہ پڑا۔ فوراً ًمحبت بھرے بیٹے کا ہمدردانہ لہجہ بھلا کر چلائیں "دیکھا، میں نہ کہتی تھی فاروق؟ شریف لڑکیوں کے کہیں یہ لچھن ہوتے ہیں ـــــ کل تم تھے اور آج تمہاری جگہ کوئی اور۔"

تب دودی نے ناول پر سے نظر ہٹا کر یوں قہقہہ لگایا جیسے کوئی لطیفہ ہو گیا ہے!

اور فاروق اپنے کمرے میں جاتے جاتے رُک گیا۔ پلٹ کر اماں بی کے پاس آیا۔ غصے کی شدت سے اس کا چہرہ تمتما رہا تھا ـــــ

دروازے میں رُک کر اس نے نفرت سے اماں بی کو دیکھا اور پھر مڑ کر تخت پہ آڑی ترچھی لیٹی دُودی کو جو ٹانگوں میں تکیہ دبائے اور سامنے ناول رکھے باورچی خانے کی طرف دیکھ رہی تھی "اماں ——— کسی پہ کیچڑ اچھالنے سے پہلے اپنے گھر میں بھی جھانک لینا چاہئے ——— دودی کو تم کیا سمجھتی ہو بھلا؟ ——— اس سے ذرا پوچھو تو شکیل اور مسعود کون ہیں؟ اس سے پوچھو تو اسے فلموں پہ کون لے جاتا ہے؟ اس سے پوچھو تو اتنے ڈھیر تحفے جو اس کے پاس جمع ہیں وہ اسے کون دیتا ہے؟ ——— اس سے پوچھو تو ——— غصے سے اس کی آواز پھٹ گئی۔

دالان میں تخت پر لیٹی دودی ہڑبڑا کر اُٹھی۔ ناول فرش پہ دور تک پھسلتا گیا۔ اس نے ایک سہمی ہوئی نظر فاروق پر ڈالی اور پھر چیخ کر اندر بھاگ گئی۔

اماں بی سکتے کی سی حالت میں فاروق کو دیکھتی رہیں تو وہ ایک دم پوری قوت سے چیخ اٹھا ——— "اپنی اولاد ہے نا۔ اب تمہیں کیونکر یقین آئے گا۔ کہہ دو میں جھوٹ بک رہا ہوں ———" وہ غصے سے مڑا اور اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔

اماں بی نے خالی تخت کی طرف دیکھا جہاں دودی کا دوپٹہ لٹک رہا تھا۔ پھر انہوں نے دوہتڑوں سے اپنی چھاتی پیٹ لی۔

آغا سہیل

پتنگا

جب ریل گاڑی سے اتر کر پتنگا نے چاروں طرف دیکھا تو یوں محسوس ہوا کہ اس نے آنکھیں بند کر کے دھند کے سمندر میں غوطہ لگایا ہو ———— کہر آلود آسمان حد نگاہ تک دھند چھائی ہوئی بڑا ناکہ اور مریل سی گھوڑی اس میں جتی ہوئی جو پھونک پھونک کر قدم رکھتی تھی تو اکہ رینگتا تھا۔ اس پر بھی میر موتیع دعائیں دم کر کر کے پھونکتے جاتے اچانک کیسی جس کو پھول کی چھڑی تک نہ چھوائی ہو، اور گھوڑی کو میری عزیزہ بیٹی، عزیناز جان، قرۃ العین اور عزیزہ سلمیٰ وغیرہ کہہ کر مخاطب کرتے ہوں۔ اس کی رفتار معلوم ———— اکے کے ایک پر کے اوپر دیوان جی بیٹھے۔ دوسرے پر کے اوپر ہزاری اور اندر پردے میں پتنگا ———— جس کے پیروں کے جھانجھ اور کڑے ہر ہر ہچکولے پر گھوڑی کے گلے میں پڑے ہوئے گھنگھروؤں سے زیادہ شور کرتے تھے تو ہزاری کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی۔ اس نے گھوڑی کی رفتار سے اکتا کر کہا ———— "اجی میر صاحب ———— اب تو خدا کے لئے اس بار جو آٹھوں کا میلہ لگے تو اسے بیچ کر بسم اللہ کر کے دوسری ذرا شوخ سی گھوڑی خرید لیجئے"۔

میر موتیع نے کان کھڑے کیے" "کیا کہا میاں ہزاری؟ ———— کچھ میری عزیزہ سلمیٰ کی نسبت تم نے رائے دی"۔

دیوان جی نے خطرے کی بو پا کر بات برابر کرنے کی کوشش کی "نہیں قبلہ آپ چلتے رہیئے بھلا گھوڑی کی نسبت ایسی گستاخی کون کر سکتا ہے"۔

میر موتیع آگے سے اتر پڑے گھوڑی کے پاس جا کر کھڑے ہو کر اس کی تھوتھنی کو سہلاتے ہوئے بولے "دیوان جی یہ اکہ بڑی حویلی نہیں جائے گا ———— دوسری سواری لے لیجئے ———— آپ اتنی بڑی حویلی اور ایسی عالیشان سرکار کے دیوان ہیں مگر بات کرنے کا ہنوز سلیقہ نہیں آیا ————"

دیوان جی نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی تو ہر طرف سناٹا تھا۔ درختوں پر کہرے کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ ہر دس قدم کے آگے شاہراہ تک دھند میں ڈوبی ہوئی تھی، سردی کا یہ عالم تھا کہ ذرا کان کھلے اور یخ بستہ ہوا کا جھونکا سن سے جسم کے پار ہوا بدن میں لہو جما جاتا ہے، ناک برف کی قلفی کی طرح جمی ہوئی رکھی ہے۔ دیوان جی اس تصور ہی سے کانپ گئے کہ یہاں دو چار گھنٹے تنہائی میں گزارے جائیں۔ جوان جہان عورت ساتھ میں ایک نوخیز سا چھوکرا، دو بوڑھے، اگر ڈاکو آجائیں تو بھلا ہم ان کا کیا بگاڑ سکیں گے۔ جھٹ بولے "قبلہ میر صاحب، بھلا کیا قصور ہوا؟"

دیوان جی نے اتنا جو کہا تو میر صاحب چیخے "اب قصور بھی میں ہی بتاؤں، ارے مرے کا آپ نے گھوڑی کہا اسے کہ نہیں؟ بھلا

اتنی بات کی مجھے تاب کہاں۔ دیکھئے ذرا اس کی غزالیں آنکھوں کی طرف، واللہ آنسو چھلک رہے ہیں ـــ آج تک اس کی آنکھوں میں میں نے آنسو نہیں دیکھے ـــ دل ٹکڑے ہو گیا سینے میں دیوان جی ـــ سارا شہر جانتا ہے کہ کہکشاں سلمہا میری آنکھ کا تارا ہے اور اس کی نسبت آپ گھوڑی کا لفظ استعمال کریں!" پھر گھوڑی کی طرف مخاطب ہوئے اور اس کی پیشانی کو چوم کر بولے "ہائے بیٹی کہکشاں، کیا کریں، زمانہ بڑا ناقدر شناس ہے، میں تو تمہیں پوروں پوروں میں رکھوں، کسی کی گرم نگاہ تک نہ پڑنے دوں مگر کیا کروں بیٹی پیٹ کی آگ نہیں مانتی۔"

ہزاری اور دیوان جی عجب مخمصے میں پھنسے، عجب خبط الحواس اکے والے سے سابقہ پڑا تھا۔ ڈالی گنج کا سنسان اسٹیشن، نہ کوئی جان نہ پہچان، دور دور تک آدم نہ آدم زاد اور مزہ یہ کہ بارہ بجے دن تک کوئی گاڑی کے آنے جانے کا امکان بھی نہیں، چاروناچار دیوان جی نے کہا "قبلہ بے شک مجھ سے بڑی چوک ہوئی۔ میں بے حد شرمسار اور نادم ہوں ـــ لے بسم اللہ کہہ کر بڑھایئے اور قصور بخشئے۔"

"جی!!" میر موقع نے مڑ کر کہا "جب تک قرۃ العین گوشۂ چشم سے اشارہ نہ کرے گی میں نہیں چل سکتا ـــ اس کے مزاج کو بھلا آپ کیا جانیں اور اس کے دماغ کو بھلا کیا کوئی پہنچے۔"

ہزاری جل کے رہ گیا۔ زیر لب بولا "گھاس کھا گیا ہے بڈھا" ـــ دیوان جی نے کہا "افیم کی پینک ہے۔ ایک آدھ چھینٹا تیز ہو گیا ہو گا۔" اندر پردے میں پتنگا کی چوڑیاں جھنجھنائیں اور اتفاقیہ اسی وقت گھوڑی نے کنوتیاں بدلیں، کان کھڑے کیے اور سر کو ایک ہلکا سا جھٹکا دیا۔ بس میر موقع کے لئے یہ اشارہ مہمیز کا کام کر گیا۔ جھٹ اکے پر آ بیٹھے۔ بولے "چلیے اب موقع ٹھیک ہے، عزیزہ خود چلنے پر آمادہ ہے، اب اس کی مرضی کے خلاف کروں گا تو اس کا دل میلا ہو گا۔"

دیوان جی اور ہزاری نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا اور غالباً پس پردہ پتنگا نے بھی۔ گھوڑی قدرے تیز تیز قدم اٹھانے لگی میر موقع بولے "ماشاءاللہ، ماشاءاللہ چشم بد دور آج عزیزہ سلمہا شوخی کی طرف مائل ہے۔ یا پھر میاں ہزاری کا طعنہ تازیانے کا کام کر گیا۔ بھئی کہکشاں ہم تو قائل ہیں تمہاری غیرت اور خودداری کے ـــ کیوں نہ ہو، ہو آخر بھلا کیسی عالی نسب، ماشاءاللہ۔ دیوان جی کی طرف مڑ کر فخریہ انداز میں میر موقع نے دیکھا اور داد طلب کی۔

دیوان جی نے کہا "واہ واہ ـــ سبحان اللہ کیا پری کی سی چال ہے"

ہزاری نے فقرہ جڑا "کبک دری بھی شرما رہی ہے۔"

میر موقع پھول گئے، خوشی میں سارا غم بھول گئے، بولے "حضرت یہ بڑی عالی نسب ہے عزیزہ"

ہزاری بولا "بجا ارشاد ہے قبلہ، آپ سا پدر نامدار جس کی تربیت کرے، کیوں نہ بھلا وہ اس بات پر فخر کرے۔"

میر موقع نے کہا "ہاں یہ تو صحیح کہ میں نے اتنی سی جان کو پالا پوسا، ہر طرح کے ناز و نعم میں رکھا۔ اچھے سے اچھا کھلایا پلایا پال پوس کر جوان بھی کیا۔ مگر صاحب اس عزیزہ کا سلسلۂ نسب حضرت رخشؒ تک پہنچتا ہے۔"

دیوان جی نے ذہن پر زور دے کر تمام اولیائے کرام کے اسمائے گرامی یاد کیے اور جب حضرت رخشؒ کا نام کہیں نہ ملا تو سخت مایوس ہوئے مگر ڈر کے مارے منہ سے کچھ نہ بولے کہ مبادا میر موقع کے مزاج کے خلاف گزرے۔

میر موتع دیوان جی کو خاموش پا کر بولے "قبلہ دیوان جی حضرت رخش ؒ کے مزار مقدس کا پتہ اسی عزیزہ سلمہا نے معلوم کیا ہے۔ وہ جو اکھاڑہ بھیم کے پاس سے ریل کی پٹڑی گزرتی ہے اور ایک شکستہ سا مزار پڑا ہوا ہے، وہ حضرت رخش کا ہے ــــ کہکشاں سلمہا ایک روز منہ اُٹھائے اس طرف چلی گئی۔ میں نے بھی لگام ڈھیلی چھوڑ دی، مزار کے پاس پہنچ کر رک گئی اور اشارے کر کر کے مجھے پاس بلایا۔ مجھ کمبخت کی سمجھ میں خاک کچھ نہ آیا۔ بہت پوچھا، کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے ہر ہر بزرگ کا نام لیا کہ یہ کس کا مزار ہے ــــ فلاں کا ہے ــــ فلاں کا ہے تو صاحب سلمہا چپ ــــ کوئی جواب نہیں، یہاں تک کہ میں نے یہ بھی پوچھ لیا کہ کیا یہ میر تقی میر کا مزار ہے کیونکہ ایک شاعر کو میں نے اس مزار کے بارے میں یہی کہتے سنا تھا بلکہ اکثر اسے فاتحہ پڑھتے بھی دیکھا تھا۔ عزیزہ سلمہا نے اس بات پر خشمگیں نظروں سے مجھے دیکھا تو صاحب میں سہم گیا اور اسی وقت میں نے دل میں طے کر لیا کہ میر تقی میر کا تو یہ مزار ہرگز نہیں ہو سکتا ــــ میں نے چپکے سے کان میں کہا، کیوں بیٹی تمہارے جد اعلیٰ حضرت رخش ؒ کا مزار اقدس ہے؟ تو گردن اثبات میں ہلا دی۔ چنانچہ قبلہ ہر جمعرات کو جو آپ مزار پہ ہار پھول کے انبار دیکھتے ہیں، شمع جلتی ہوئی اور لوبان سلگتا ہوا پاتے ہیں تو وہ اسی بندۂ ناچیز کا حقیر ہدیہ ہے ــــ آپ ہی بتائیے کہ اگر رستم جیسے پہلوان کا خدا بخشے حضرت رخش ؒ ساتھ نہ دیتے تو بھلا آپ کہہ سکتے تھے رستم کو رستم زماں"۔

اس تقریر کے بعد دیوان جی کے ذہن میں یہ بات جمی کہ آنجاہ یہ رستم کے گھوڑے رخش کا اس اہتمام و احترام سے بیان ہو رہا تھا۔ بارے منزل مقصود آئی۔ ہزاری اور دیوان جی کی جان میں جان آئی ــــ پتنگا نے چادر بچھ برتھ میں سے پاؤں نکال کے پہیوں پہ قدم جمائے، گورے گورے پیروں میں چاندی کے جھانجھ اور کڑے پڑے ہوئے تھے۔ سلما ستارے کی سرخ کامدار جوتی بہار دکھا رہی تھی۔ ہزاری ہزار جان سے ان پیروں پر عاشق ہو گیا۔ دیوان جی نے بڑھ کر سہارا دیا۔ چھم چھم کرتی ہوئی پتنگا ڈیوڑھی میں آئی۔ ہزاری بقچی اٹھا کر لایا۔ چادر پیچھے کی نقاب ہٹا کر بقچی پر جو پتنگا نے نظر ڈالی تو چاند سا مکھڑا بجلی بن کر ہزاری کے دل پر گرا۔ دھیرے سے بولا: "پتنگا ــــ میں ڈیوڑھی پر رہتا ہوں، روٹی کا کام کرتا ہوں، بات بات پر باہر کے کاموں پر دوڑایا جاتا ہوں ــــ تمہارا کام بھی جی جان سے کروں گا ــــ کبھی تمہارے حکم سے باہر نہیں رہوں گا۔ آج سے سمجھو تمہارا کوڑیا غلام ہوں، دن میں ایک بار ضرور آیا کرنا۔"

دیوان جی پیچھے سے آگے بولے ــــ "جاؤ پتنگا، اندر جاؤ۔ کہہ دو دیوان جی بیگم صاحبہ کی خدمت میں کورنش بجا لاتا ہے۔"

پتنگا ڈیوڑھی پھلانگ کر اندر گئی۔ صحن میں سناٹا تھا۔ غلام گردش میں کچھ ہلکی ہلکی آوازوں سے اسے اندازہ ہوا کہ کچھ نوکر جاگ اٹھے ہیں۔ محلسرا کے تمام دروازے بند۔ پردے پڑے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف کی غلام گردش میں بھی جاگ ہو رہی ہے لیکن دروازے ہر طرف کے بند۔ لق و دق صحن کے بیچوں بیچ بغل میں بقچی دبائے حیران پریشان دیر تک وہ کھڑی سوچتی رہی کہ کیا کرے کیا نہ کرے۔ اونچی اونچی دیواروں کے آگے سوائے دھند اور کہرے کے کوئی شے اب تک نظر نہیں آتی تھی۔ بڑے بڑے محراب دار دروں میں دروازے بند تھے اور شیشوں کی رنگ برنگی محرابیں دھند میں لپٹی ہوئی تھیں۔ اوپر کارنس اور چھجے اور چھجوں کے اوپر جالی اور کوٹھے کے دونوں پہلوؤں میں دو خوبصورت مہتابیاں تک دھند کی وجہ سے دھندلا گئی تھیں۔ پتنگا نے اس خوبصورت حویلی کو اپنے بچپن میں اپنی نانی کے ساتھ آ کر جب پہلی بار دیکھا تھا تو اس وقت بھی اس کو یہی مہتابیاں بہت بھلی معلوم ہوئی تھیں اور وہ ہمیشہ اس حویلی کے دوبارہ دیکھنے کی آرزو رکھتی تھی اور آج جب اس کی یہ دلی تمنا بر آئی تھی تو وہ اس قدر خوش نہیں تھی۔ ہیضے کی وبا میں اُس کے ماں باپ بہن بھائی اور دوسرے اعزہ نہ مرتے اور نہ اُسے علاقے کے

رئیس کے گھر اس طرح آ کر اُن کے رحم و کرم پر پڑنا پڑتا تھا۔ آج اس حویلی میں اُس کے آنے کی حیثیت اور تھی اسی وجہ سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے نگہ اوپر اٹھا کر دل ہی دل میں کہا "پالنے والے تیرا شکر ہے"۔ معاً پھر اس کی نگاہیں خوبصورت مہتابیوں سے ہم آغوش ہو گئیں ان مہتابیوں کے ساتھ یہ حویلی کیسی خوب صورت معلوم ہوتی تھی ــــ جیسے کوئی حسینہ بستر ناز پر لیٹی ہو اور یہ مہتابیاں اس کے سینے کی طرح پر شکوہ انداز میں اوپر اٹھی ہوئی ہوں۔ ایسی بات سوچ کر اُسے شرم بھی آ گئی۔ مگر بات اتنی خوب صورت اور بھرپور تھی کہ اس کا جی خوش ہو گیا۔ اُسے سچ مچ حویلی بستر ناز پر کسی خوابیدہ حسینہ کی طرح پڑی ہوئی نظر آئی۔

ایک غلام گردش کا دروازہ کھلا۔ نورانی چہرے والی بوڑھی آتو جی دعائے نور کا وظیفہ پڑھتی ہوئی باہر نکلیں۔ ایک سیاہ سائے کو دیکھ کر ٹھٹکیں۔ "اوئی! کون ہے بوا" کہتی ہوئی آگے بڑھیں۔ دو تین پیش خدمتوں نے ہڑبڑا کر دروازے کھولے اور بیک زبان بولیں "آگئی" چاروں کے بغل مار مار کر ساری جوان بوڑھی ادھیڑ ملازمائیں لونڈیاں پیش خدمتیں آ کر بولیں "پتنگا آگئی"

"اے آتو جی پتنگا آئی ہے۔ بیگم صاحبہ کو اطلاع دیجئے۔" اور چاروں طرف سے اسے سب نے گھیر لیا۔

آتو نے پاس آ کر سر سے پیر تک پتنگا کا جائزہ لیا۔ پتنگا بولی "بندگی"

آتو نے ناک بھوں چڑھائی۔ بولیں "توئے دیہاتوں میں بھلا تمیز کہاں، ادب کہاں؟ سُنو بی پتنگا یہ ہے سرکار دربار کا معاملہ ــ تمہاری گنوار و نٹھار بندگی یہاں نہیں چلے گی ــــ سمجھیں؟ بڑی حیثیت کے لوگ کم حیثیت نوکروں کو بندگی کرتے ہیں۔ یہاں تو کورنش اور تسلیم کی خو ڈالنا پڑے گی۔"

ابھی یہ پند جاری تھا اور پند نامہ کھلا ہی ہوا تھا کہ حویلی کے ایک حصے سے ستار بجنے کی آواز دھیرے دھیرے آنے لگی اور کوئی مردانی مگر پر سوز مترنم آواز میں گانے لگا۔

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے — بے نیازی تری عادت ہی سہی

دوسری طرف کوئی خاتون بڑی پرسوز آواز میں مناجات پڑھ رہی تھیں۔

سامان شتاب کر دے میرے دل کے چین کا — پروردگار واسطہ خونِ حسین کا

ایک طرف سے تسبیح و تہلیل کی صدائیں بلند تھیں۔ آسمان پر پرندے اڑتے ہوئے گزر گئے۔ گھر میں پلے ہوئے طوطے، لال، مینائیں بولنے لگے، چہکنے لگے۔ کبوتر غٹرغوں غٹرغوں بولتے اور مرغ ککڑوں کوں کہہ کر چلائے۔ طوطے نے اپنا وظیفہ پڑھا۔

"میٹھو ــ میٹھو، نبی جی بھیجو مدد حسین کی۔ میٹھو بیٹے کھانا کھایا، نہیں بی بی کہاں کھایا بھوکا ہوں ــــ نبی جی بھیجو مدد حسین کی۔"

آسمان پر قدرے روشنی پھیلی تو پتنگا کو لے کر آتو بڑی بیگم صاحبہ کی نماز کی چوکی کے پاس لائیں۔ بڑے دالان سے ہو کر، دوسرے دالان سے گزر کر شہ نشین پر چوبی تختوں کا چوکا لگا تھا، نماز کی چوکی اسی پر بچھی ہوئی تھی اور بڑی بیگم صاحبہ مصلے پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ پتنگا نے جھک کر کورنش عرض کی۔ اشارے سے جواب ملا۔ صحنچی میں آ کر اس نے دیکھا تو چھوٹی بیگم بھی مصلے پر بیٹھی مناجات جھوم جھوم کر پڑھ رہی تھیں جو دو چار لونڈیاں باندیاں اس کو اپنی ہمجولی بنانے کے خیال سے اس کے ساتھ سائے کی طرح لگی ہوئی تھیں، ان میں سے ایک نے چھوٹی بیگم کے قریب کھڑے ہو کر دھیرے سے کہا "پتنگا"

چھوٹی بیگم نے اُس کے سراپا کو تنقیدی نظر سے دیکھا اور پھر مناجات میں لگ گئیں۔

آتو نے کہا "جا پتنگا" کنیز جو چھوٹے نواب کی چھو چھو ہے اس کے حجرے میں تیرا پلنگ بچھا ہوا ہے۔ وہاں جا کر بیگم صاحبہ کے حکم کا انتظار کر۔

کنیز دُہرے بدن کی سیاہ فام مگر ہنس مکھ لڑکی تھی۔ پتنگا سر جھکائے، بقچی بغل میں دبائے جب حجرے میں داخل ہوئی تو جیسے کنیز کھل گئی۔ بقچی لے کر طاقچے پر رکھی، پلنگ درست کر کے اُسے بٹھایا اور اس کی آنکھوں میں جھانک کر مسکرا دی۔ ہولے سے در میں لٹکے ہوئے پنجرے کی طرف دیکھ کر اشارہ کر کے بولی "دیکھ پتنگا یہ جو مینا ہے نا — اِسے جب میں نے شہتوت کے درخت پر سے پکڑا اور اس پنجرے میں ڈالا تو یہ بہت پھڑپھڑائی — اب دیکھو کتنے آرام سے بیٹھی ہے"۔

پتنگا نے گہری نظروں سے کنیز کی طرف دیکھا۔ کنیز نے بے اختیار پتنگا کے گلے میں باہیں حمائل کر دیں۔ پیار بھرے لہجے میں بولی "بہن برا نہ ماننا — ہم سب اسی مینا کی طرح پنجرے میں بند ہیں"

پتنگا بولی: "حویلی بڑی خوب صورت ہے"۔

کنیز چند لمحے تو خاموش رہی، پھر بولی۔ "ہاں ہے تو — باغ بھی بڑا اچھا ہے، آم، شریفے، امرود، بڑھل، کٹھل، شہتوت، بیر سب کچھ لگے ہیں۔ کمرک کا بھی پیڑ ہے اور پھولوں کی کیاریاں بھی ہیں۔ موتیا، بیلہ، چنبیلی، جوہی، موگرا، ہارسنگھار سب اپنی اپنی فصل پر پھولتے ہیں۔ آج کل نرگس کے پھول کھل رہے ہیں۔ گل اشرفی بھی ہے — تمہیں کونسے پھول پسند ہیں پتنگا بہن؟ چھوٹے نواب تو بس نرگس کے پھولوں کے عاشق ہیں — شاعر ہیں نا"۔

"شاعر؟ — چھوٹے نواب شاعر ہیں؟ — ہائے اللہ"!

"کیوں"

"کچھ نہیں — یوں ہی — پتہ نہیں، مجھے معلوم نہیں۔ شاعر کیسے ہوتے ہیں اور شعر کیسے کہتے ہیں — اور اور یہ شعر — ہوتے کیا ہیں"؟

'ارے تم کو یہ بھی نہیں معلوم" — کنیز بولی "یہاں تو مشاعرے ہوتے ہیں۔ خیر دیکھ لینا سب کچھ۔ اور وہ اُدھر جو باغ سے ملا ہوا چھوٹا سا مکان ہے جس پر پھولوں کی بیل چڑھی ہوئی ہے، چھوٹے نواب اسی میں رہتے ہیں۔ بڑے نواب اِدھر پہلو والے کمرے میں۔ بس ہر وقت ڈنڈ بیٹھکیں لگایا کرتے ہیں، جانتی ہو کتنا دودھ پیتے ہیں روزانہ بڑے نواب"؟

"نا"

"پانچ سیر، پورا پانچ — اور ڈکار تک نہیں لیتے۔ یہ اُونچی چھاتی ہے اُن کی۔ سُرخ رنگ، بڑی بڑی خوفناک آنکھیں۔ بولتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ شیر گرج رہا ہے — صادق پہلوان کے کندھے پر بس یوں ہی ہاتھ رکھا تھا تو وہ زمین پر گر پڑا۔ جانتی ہو یہ کیتکی، چنپا، زعفران مُرداریں کیا کہتی ہیں —؟"

"کیا؟"

کنیز نے گہری نظروں سے پتنگا کو دیکھا، پھر خود بخود کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اچھا ابھی نہیں، پھر بتاؤں گی"۔

پتنگا کو خلجان تو ہوا لیکن اصرار نہیں کر سکی۔ کنیز کی زبان کترنی کی طرح چل رہی تھی۔ "اور منجھلے نواب کو تو سوائے گانے بجانے کے

کچھ ہوش ہی نہیں، دن رات ستار ہے اور وہ ہیں ——— سنجھلے نواب ——" اس نے معنی خیز انداز سے پھر تپنگا کو دیکھا —" جانتی ہو سنجھلے نواب کو"؟

پتنگا نے نفی میں زوروں سے گردن ہلائی۔ کنیز نے کان کی لویں پکڑ کر کہا" توبہ ہے ——— اللہ ہر بہو بیٹی کی عزت کو بچائے بُوا۔ لنگر کے بہت بُرے ہیں ——— بیگم صاحبہ نے تو اُن کا محلسرا میں آنا جانا تک بند کر دیا ہے۔ بوڑھی اور بیاہی بیش خدمتوں کے سوا کوئی وہاں نہیں جاتا۔ جب بڑی بیگم صاحبہ کو سلام کرنے سنجھلے نواب آتے ہیں تو ہم سب پردے میں بٹھا دئے جاتے ہیں۔ اب کوئی برس دن سے تو میں بھی اُن کے سامنے نہیں گئی"۔

کنیز نے سرگوشی میں کہا:" اور اس موئی زعفران کے دیدے کا پانی ایسا ڈھلا ہے کہ روز رات کو چوری چھپے سنجھلے نواب کے دیوان خانے میں چلی جاتی ہے۔ صبح تڑکے واپس آتی ہے۔ ایک دن آتو جی کی نظر پڑ گئی۔ بیٹھ پر دو ہتڑ مار کر بولیں۔ ارے موئی ڈھینڈھا پھول جائیگا تو محلسرا سے نکال باہر کی جائے گی ——— جانتی ہو ڈھینڈھا کسے کہتے ہیں؟"

پتنگا نے پھر بڑے زوروں سے نفی میں گردن ہلا دی تو کنیز کو ہنسی آگئی بولی" خیر سب جان لوگی، ابھی تم مُنہ بند کلی ہو —— مگر دیکھو بُوا نہ تو کبھی سنجھلے نواب کی طرف جانا ——— اور ——— اور"

کنیز رُکی تو تپنگا نے پوچھا۔" اور کدھر"؟

کنیز نے کہا" اور تہہ خانے میں بھی نہ جانا ——— جانتی ہو یہ جو اتنی بڑی شہ نشین اور در در بڑے بڑے دالان ہیں ان کے نیچے کیا ہے؟"

" تہہ خانہ" پتنگا نے کہا" مجھے معلوم ہے میں بچپن میں ایک بار نانی کے ساتھ یہاں آچکی ہوں۔ تہہ خانے میں جن رہتے ہیں نا ———"

" ہائے بُوا جن نہیں ——— ایک بامن آیا تھا۔ بتاتا تھا کہ تہہ خانے میں اشرفیوں سے بھری ہوئی سینکڑوں دیگیں چھت سے لٹک رہی ہیں ——— مگر ہر دیگ پر سیاہ سانپ پھن کاڑھے بیٹھا ہے۔ بامن نے کہا بیگم صاحبہ یہ مایا آپ کو نہیں مل سکتی۔ آپ کی اولاد کو ملے گی یا اولاد کی اولاد کو ———"

" ہائے میرے اللہ اگر سانپ نکل آئیں تو؟" پتنگا نے کہا۔

سنجھلے نواب کے دیوان خانے سے الاپ کی آواز آ رہی تھی اور ستار کی لے پر اس الاپ سے عجب کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ ہلکی سی دھوپ بھی نکل آئی تھی لیکن دُھند بہت دھیرے دھیرے چھٹ رہی تھی۔ شہ نشین کی طرف سے بیگم صاحبہ کی پاٹ دار آواز سنائی دی" ہرمزی خانم (یہ آتو جی کا نام تھا) ۔ ا!"

" حاضر ہوئی سرکار!" ہرمزی خانم پیر میں جوتی گھسیٹتی ہوئی اندر دالان میں چلیں۔

ڈیوڑھی پر پہرہ داری نے آواز دی ——— " محلدار ——— اے محلدار ——— دیوان جی بیگم صاحبہ کو کورنش عرض کرتے ہیں"۔

بیگم صاحبہ نے پاندان سے گلوری بناتے ہوئے ہرمزی خانم سے کہا" پتنگا چھوٹی بیگم کی خدمت پر مامور کی جاتی ہے۔ یتیم بھی ہے یسیر بھی۔ ذرا تم سب اُس کا خیال رکھنا ——— دیوان جی کو ہماری بندگی کہو"۔

"بہت بہتر۔" اَوَچی نے مودب ہو کر ایک فراشی سلام کیا۔ "بندی بھی تسلیم بجالاتی ہے۔"

بیگم صاحبہ نے کہا۔ "ذرا ہم پتنگا سے ملنا چاہتے ہیں ـــــ چھوٹی بیگم نے وظیفہ تمام کر لیا ہو تو انہیں بھی بلانا۔"

جس طرح کسی عمارت میں مینار بنا کر ادھورے چھوڑ دیئے جاتے ہیں، مہتابیوں کی شکل تو ایسی ہی تھی لیکن، حویلی کو دور سے دیکھئے تو یوں لگتا جیسے کسی پرندے نے بازو سمیٹ کر پرواز بند کر دی ہو ـــــ ان مہتابیوں پر جو نیچے سے زینے جاتے ہیں وہ بھی میناروں کے زینوں کی طرح گردشی شکل میں بنے ہیں، لیکن ان پر پڑھنے کا موقع پتنگا کو کئی روز تک نہ مل سکا۔ چھوٹی بیگم نے اسے ذرا بھی مہلت نہ دی۔ کبھی اس سے لحاف سلوائے، رضائیاں ٹھیک کروائیں، سلفچی آفتابے منجھوائے، چھت گیریاں درست کروائیں، تکیوں اور تکیوں کے غلاف بدلوائے اور جب ان سب کاموں سے فرصت ہوئی تو بدن دبوایا ـــــ اور جب رات رات گئے تک کام کرنے سے وہ چور چور ہو گئی تو پڑ کر سو گئی۔ اسے کسی بات کا ہوش ہی نہ رہا ـــــ

ایک روز صبح صبح آواز آئی: "رکابدار حاضر ہوا ہے سرکار۔"

کئی بار جب رکابدار نے آواز دی، اور کوئی ڈیوڑھی پر نہ گیا تو چھوٹی بیگم نے پتنگا کو دوڑا دیا ـــــ

"جوزیات حاضر ہیں، حبشی بھی ہے، جوزی بھی، پستے کی برفی بھی ہے، اور بڑی سرکار کے لئے ایک ہدیہ بھی لایا ہوں ـــــ" رکابدار نے کہا اور ایک رکابی جو بڑے اہتمام سے سجا کر لایا تھا بڑھا دی۔ پتنگا نے ابھی رکابی تھامی بھی نہیں تھی کہ ایک ہاتھ اس کے اوپر سے آیا اور رکابی جھپٹ لی۔ اس نے اوپر دیکھا تو ایک جسیم تجیم آدمی لنگوٹ باندھے اس کے پیچھے کھڑا حلوا سوہن کھا رہا تھا۔ ڈر کے مارے جو چیخ اس کے حلق تک آ گئی تھی اس کو اس نے دبا دیا۔ سُرخ و سپید رنگت، چوڑی چکلی چھاتی، پتلی کمر، بازو رانیں اور پنڈلیاں پُرگوشت، آنکھوں میں جوانی اور قوت کا خمار ـــــ بڑے نواب پہ سچ مردانہ حسن کا بہترین مرقع تھا، دیکھتے دیکھتے رکابی خالی کر کے اس نے پتنگا کے ہاتھ پر رکھی اور یہ جا وہ جا ـــــ بیچاری پتنگا چچونڈی بن کر رہ گئی۔ کیا کرے کیا نہ کرے۔ چاروناچار چھوٹی بیگم سے اس نے واقعہ بیان کیا تو انہوں نے اسے خاموش رہنے کو کہا اور رکابدار کو روپے بھجوا دیئے ـــــ اسی وقت سے بڑے نواب کا ڈیل ڈول اس کے ذہن پر چھا گیا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ مردانہ حسن بھی کوئی شے ہوتا ہے اور وہ اس طرح نگاہوں میں کھُب کر رہ جاتا ہے ـــــ کنیز اس کی دم ساز اور ہمراز تھی، لیکن یہ راز تو اس نے کنیز تک کو نہ بتایا۔ بس دل و دماغ میں بڑے نواب کی من موہنی تصویر کو بسا کر چپ چاپ اس کی پرستش کرنے لگی۔ بڑے نواب کی ایک ہی جھلک نے اس کو ان کا والہ و شیدا بنا دیا۔ اس کو حویلی اور بھی حسین نظر آنے لگی۔

جاڑوں میں اگر مہاوٹیں لگ جائیں تو سردی خوب چمکتی ہے۔ دو دن تک سورج مطلق نظر نہ آیا۔ دالانوں کے دروازے بند پڑے پڑے ہوتے، انگیٹھیاں روشن اور لوگ دبکے دبکائے لحافوں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ نوکر چاکر، پیش خدمتیں، لونڈیاں باندیاں سب حاضر باش حکم کے منتظر بار بار، ڈیوڑھی پر ہزاری آ کر آوازیں دیتا "پتنگا ـــــ" اور پتنگا ادبدا کر ٹال ٹال جاتی۔ کبھی کنیز کو بھیج دیتی، کبھی زعفران کو۔

چھوٹی بیگم کے بدن میں دو دن سے سخت درد تھا اور وہ صحنچی میں اپنے چھپرکھٹ پر پڑی ہوئی تھیں۔ پتنگا ان کے کمر کو لھے دبا رہی تھی۔ ایک پیش خدمت سرہانے کھڑی ہوئے ہوئے آگ کی انگیٹھی دھونک رہی تھی۔ دوسری دھیرے دھیرے مثنوی "زہرِ عشق" سنا رہی تھی۔

چھوٹی بیگم نے پان کی ایک گلوری کھا کر دھیرے سے کہا: "اری پتنگا ـــــ دیکھ یہ موا ہزاری بے طرح تیرے پیچھے پڑا ہوا ہے، بار بار تجھے جو ڈیوڑھی پر بلاتا ہے تو کہیں کوئی جادو ٹونا نہ کر دے ـــــ تُو تو ابھی چھوٹی کونپل ہے، وہ مُردار بڑا گھاگھ ہے۔"

"چھوٹی بیگم صاحبہ ـــــ میں اس موئے کو اپنی پتنگا کی ایڑی چوٹی پر سے سات بار وار دوں ـــــ اس کے منہ کو لو کالے ہے آئینہ میں اپنی صورت تو دیکھے ـــــ" آگ دھونکنے والی ملازمہ بولی۔

زہرِ عشق پڑھتے پڑھتے پیش خدمت رُکی اور رُک کر بیگم صاحبہ کی طرف دیکھنے لگی۔ بیگم صاحبہ نے ایک لمحے کو پتنگا کی بڑی بڑی نشیلی آنکھوں میں جھانک کر کہا: "ماشاء اللہ چشم بددور، تیری یہ بڑی بڑی آنکھیں تو بالکل آم کی پھانکیں ہیں۔"

پتنگا شرما گئی۔ ہولے سے بولی: "اے ہے چھوٹی بیگم صاحبہ، کیوں بناتی ہیں مجھ نگوڑی کو ـــــ میں تو آپ کو دیکھتی ہوں اور سوچتی ہوں کہ یہ مردوئے بھی کیسے بدنگاہ ہوتے ہیں ـــــ آخر سرکار کیا رکھا ہوتا ہے ان مردار بازاری عورتوں میں۔ میری سمجھ میں تو خاک کچھ نہیں آتا۔ آپ کا حسن ہزاروں میں ایک ہے بی بی۔"

چھوٹی بیگم کی آنکھوں میں ـــــ آنسو آ گئے اور اسی لمحے پتنگا کو یوں محسوس ہوا کہ درد جسم میں نہیں ہے دل میں ہے۔ چھوٹی بیگم کے شوہر نے ایک بازاری عورت ڈال لی تھی اور دو تین برس سے چھوٹی بیگم میکے میں آ کے پڑ رہی تھیں مگر شوہر نے پلٹ کر کروٹ تک نہ لی تھی، آنسو خشک کر کے بولیں "بوا یہ اپنی اپنی قسمت، جسے پی چاہیں وہی سہاگن۔" اور پھر مثنوی پڑھنے والی ملازمہ کو اشارہ کیا، وہ جھوم جھوم کر پڑھنے لگی:

رنگ خوبی عطا کیا گل کو　　　　نالہ و درد بخشا بلبل کو

باہر آسمان پر بادل گھرے ہوئے تھے اور پانی برابر برس رہا تھا۔ ذرا سی بھی دروازے کی دراز کھلتی تھی تو ہوا کا تیز جھونکا آتا تھا اور کلیجے کے پار ہو جاتا تھا۔ بڑی بیگم صاحبہ، شہ نشین پر آنتوے طلسم ہوش ربا سن رہی تھیں۔ ایسے میں کئی بار پتنگا کا جی چاہا کہ ذرا بڑے نواب کو جا کر ایک نظر دیکھ آئے۔ لیکن جی مسوسے ہوئے بس وہ چھوٹی بیگم کے کمر کولہے دبا رہی تھی، مثنوی بدستور جاری تھی:

اس سے جس نے ذرا تپاک کیا　　　　سب سے پہلے اُسے ہلاک کیا

بس میں ڈالے زُکبریا اس کے　　　　رحم دل میں نہیں ذرا اس کے

آتشِ ہجر سے جلاتا ہے　　　　آگ پانی میں یہ لگاتا ہے

پتنگا کا جی اوب اوب گیا، بادلوں کی ایسی چھت بندھ گئی تھی کہ باہر آسمان کے نیچے نکلنا محال اور اندر دالانوں میں گھس کر بیٹھنا دوبھر تھا۔ بھلا چھوٹی بیگم کی الم ناک زندگی سے اسے کب تک دلچسپی رہتی ـــــ بارے کنیز آئی، اشارے سے اُس کو آنکھ مار کر چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد پتنگا بہانے سے اُٹھی۔ اپنے حجرے میں آئی تو دیکھا کنیز کے ہاتھوں میں نئی نئی چوڑیاں چمک رہی ہیں ـــــ

کنیز اسے دیکھتے ہی مارے ہنسی کے دُہری ہو گئی بولی "جانتی ہے پتنگا کون لایا؟"

"میں کیا جانوں؟"

"اری سن تو ـــــ وہ مُوا ہزاری تیرے لئے لایا تھا، میں نے کہا یہ تو میں پہنوں گی، اس کو اور لا دینا۔ بولا کنیز۔ دیکھو یہ مذاق اچھا نہیں۔ جس کی چیز ہے اس کو ملنا چاہئے۔ پتنگا اجازت دے تو لو ـــــ تو بھئی اب تمہاری کیا رائے ہے؟"

"جھُلسا موئے کو۔"

اس وقت منجھلے نواب کے مکان سے ستار پر گانے کی آواز آئی :

مہاراجا —— ہو وو وو —— کو وو ڑیا !!!! کھولو وو وو و

رس کی بی بی ی بوندا پڑے ے ے ے

ارے مہاراجا ہو وو وو —— رس کی بوندا ! پڑے ے ——

تپنگا کو یوں لگا جیسے بارش کی ایک ایک بوند رس میں ڈوبی ہوئی سچ مچ اس کے دل کے کواڑ پر ٹپ ٹپ کر کے گر رہی ہے اور دل کا کواڑ ہولے ہولے دھیرے دھیرے یوں کھل رہا ہے جیسے نئی نویلی دلہن کا گھونگھٹ سرکتا ہے۔ وقت اور سُر کا اگر سنجوگ ہو جائے تو کائنات بھی ایک نقطے پر سمٹ آتی ہے۔ منجھلے نواب کی آواز میں سچ مچ جادو تھا۔ تپنگا آنکھیں بند کر کے پلنگ پر لیٹ گئی اور جب تک گیت کی آواز بارش کے ہلکے ہلکے سنگیت پر اس کے کانوں سے ٹکراتی رہی وہ چپ چاپ پڑی رہی —— گیت ختم ہوا تو آنکھیں کھول کر دیکھا کنیز جا چکی تھی۔

درخت کی تپلی تپلی ڈالوں پر دھیرے دھیرے تپنگا چڑھی اور جب گھنی گھنی شاخوں میں خوب اچھی طرح چھپ گئی تو اس نے منجھلے نواب کے صحن کی طرف نگاہ اٹھائی جہاں مسند پر منجھلے نواب گاؤ تکیے سے لگے بیٹھے تھے۔ خوب بڑی بڑی مونچھوں سے ایکے چہرے سے عجب جلال ہویدا تھا۔ انگرکھے اور چوڑی دار گھٹنے میں ان کا مضبوط جسم بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ دوست احباب جمع تھے اور رنڈی کا طائفہ حاضر تھا۔ سارنگی اور طبلے کی سنگت پر ایک نوخیز رنڈی بھاؤ بتا بتا کر گا رہی تھی :

ارے مورا سیاں، سوتن گھر نہ جا

" " " " " " سوتن گھر نہ جا، بیرن گھر نہ جا

ارے مورا سیاں ——

تُو تو کے موری بالی عمریا

" " " " " ابھی تو ہوں لڑکیاں سوتن گھر نہ جا

اوپر تپنگا چڑھی ہوئی تھی اور نیچے کنیز کھڑی ہوئی تھی، آتو کے ڈر کے مارے جلدی سے وہ نیچے اتری تو اس کی جان میں جان آئی۔ جلدی سے باغ کے باہر جانا چاہتی تھی کہ اس نے دیکھا چھوٹے نواب پھولوں کا گلدستہ بنا رہے ہیں اور کچھ گنگنا رہے ہیں۔ ننگے پاؤں دونوں محل سرا میں آ گئیں۔ تو دونوں نے ایک دوسرے کے سینوں پر ہاتھ رکھ کر دیکھا تو دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ اسی وقت آتو کی آواز آئی "تپنگا ——؟"

"آئی آتو جی" تپنگا کے بولنے سے پہلے ہی طوطا بولا تو تپنگا کو ہنسی آ گئی۔ دو چار صلواتیں سنانا چاہتی تھی کہ اس نے دیکھا چھوٹی بیگم نہانے کی چوکی پر بیٹھی ہیں۔ سر کے بال کھلے ہیں۔ نیچے لگن میں کھلی بھیگی ہوئی ہے اور بال دھوئے جا رہے ہیں —— سر دُھلا کر چھوٹی بیگم نے آتو سے کہا: "آج سے حمام میں تپنگا بیٹھ دھویا کرے گی۔ آتو جی تمہارے ہاتھوں میں اب دم نہیں رہا۔"

آتو نے تپنگا کو گھورا اور زبان سے کہا "بہت اچھا صاحب زادی۔"

یہ بھی تپنگا کی زندگی میں پہلا تجربہ تھا کہ اکیلے حمام میں پچیس چھبیس برس کی ایک کڑیل جوان عورت اس کے سامنے مادر زاد ننگی کھڑی تھی جس کے سیاہ گھنے بال ٹخنوں تک لوٹ رہے تھے اور جس کا بدن کندن کی طرح دمک رہا تھا۔ جلد کے نیچے جیسے ہلکی ہلکی آنچ سی اس کو اٹھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ پیٹھ

ملتے ملتے کئی بار اس کے جی میں آئی کہ ان گداز مرمریں کمر کولھوں میں گدگدی کر دے لیکن چھوٹی بیگم کے مزاج سے بھی وہ واقف تھی۔ چپ چاپ بیٹھی ملتی رہی ــــــ نہا دھو کر جب چھوٹی بیگم باہر نکلیں تو عورت کے جسم کا جادو پتنگا پر منکشف ہو چکا تھا اور آج صحیح معنوں میں اس کے دل میں چھوٹی بیگم سے ہمدردی اور ان کے بدذوق شوہر سے شدید نفرت پیدا ہو گئی۔ چھوٹی بیگم بال سکھانے کے لئے اوپر کوٹھے پر چڑھ گئیں تو پتنگا بھی اوپر چلی گئی ــــــ چاروں طرف چھوٹے چھوٹے کچے پکے مکانات بنے تھے جہاں غریب غربا آباد تھے۔ اوپر کھلا ہوا وسیع آسمان تھا۔ دور مشرق کی جانب کھیت اور باغ نظر آتے تھے۔ سڑکوں پر اکا دکا بگھیاں، اِکے، تانگے نظر آ رہے تھے۔ وہ کسی چھلاوے کی طرح دیکھتے دیکھتے مہتابی پر چڑھ گئی جہاں سے شمال کی جانب گومتی ندی واقعی گھومتی گھامتی چکر کاٹتی بہہ رہی تھی۔ جنوب کی طرف شہر کی سب سے بڑی جامع مسجد نظر آتی تھی اور مغرب کی طرف سبزہ ہی سبزہ ــــــ یہ تو دور کے مناظر تھے۔ محل سرا سے متصل مکانات کا نظارہ بھی بخوبی ہو سکتا تھا۔ اچانک دھائیں دھائیں ــــــ دو فائر ہوئے اور برابر کی مہتابی سے شعلے سے نکلے، پتنگا دھک سے رہ گئی۔ درختوں سے شور مچاتے ہوئے کوے اڑ گئے اور فضا میں بو سی پھیل گئی۔

”پتنگا“! چھوٹی بیگم زینے میں آ کر چیخیں۔

”جی!“ سہمی ہوئی آواز میں وہ بولی ــــــ

”نیچے آ۔“

اور جب وہ نیچے پہنچی تو اس نے دیکھا بڑے نواب انگریزی برجس پہنے، گلے میں کارتوسوں کی پیٹی ڈالے، ہاتھ میں بندوق لئے کھڑے ہیں، شکار پر جانے کی تیاری ہے۔ بڑی بیگم صاحبہ کھڑی دعائیں دم کر رہی ہیں۔ آتو قرآن کھولے نواب کو گردوبیں کرنے کو تیار کھڑی ہے۔ باہر تمام ملازمین حاضر ہیں۔ ہاتھی پر ہودا کسا ہوا ہے۔ ڈیوڑھی کے سامنے ہزاری دہی کی مٹکی نیک شگون کے طور پر لئے کھڑا ہے۔ نواب کا تازہ تازہ شکار ایک کبوتر تھا۔ حکم دیا گیا کہ اس کا خون نواب کے تلوؤں پر لگوا دیا جائے۔ دیکھتے دیکھتے ساری پیش خدمتیں دوڑیں۔ کسی نے نواب کا جوتا اتارا، کسی نے جراب اتاری اور کسی نے ایڑی پر خون ملا، اور پتنگا کوشش کے باوجود اپنی جگہ سے جنبش تک نہ کر سکی۔ بس ٹکٹکی باندھے ہوئے نواب کو تکتی ہی رہی۔ بڑی بیگم نے چاندی کے دو روپے نواب کی مٹھیوں میں دبائے اور کہا: ”بیٹا یہ مستحقین کو اپنے ہاتھوں سے بانٹ دو۔“

نواب نے گردن کے اشارے سے پتنگا کو بلایا لیکن اس کے قدم زمین پر جم کر رہ گئے تھے۔ چھوٹی بیگم نے کہا ”جا پتنگا لے لے۔“

اور پتنگا کے ذہن میں معاً بجلی سی لہرائی۔ بھولی بسری ایک بات یاد آئی۔ بولی ”ہم سادات آلِ رسولؐ ہیں، ہم پر صدقہ حرام ہے۔“

نواب کا چہرہ اتر گیا۔ بڑی بیگم اور چھوٹی بیگم سناٹے میں آ گئیں۔ آتو کو تو دم سنانے لگا۔ تمام نوکروں میں سرگوشیاں اور کانا پھوسیاں ہونے لگیں۔ نواب کا قفلِ دہن کھلا: ”معاف کرنا سیدانی بی ــــــ تم ہمیں دعا دے کر رخصت کرو۔“ نواب نے یہ دیکھے بغیر کہ کون مستحق روپے لے رہا ہے، مٹھیاں کھول دیں اور مبارک سلامت کی فضا میں سب نے دامن پھیلا پھیلا کر دعائیں دیں۔

پتنگا نے کپکپاتے ہوئے ہونٹوں سے کہا ”خدا حامی و ناصر!“

بکھتا ہاتھی جھومتا ہوا حویلی کے سامنے سے گزرا۔ ہر ایک شخص مکان کے چھجے کے اوپر ہاتھ اٹھا اٹھا کر خدا حافظ ــــــ خدا حافظ، اللہ بیلی اللہ نگہبان کہہ رہا تھا اور نواب اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہودے میں بیٹھے ہوئے چلے جا رہے تھے۔

ایک پتنگا کیا ــــــ سارا گھر اداس تھا کہ سرِ شام ایک اور گل کھلا ــــــ سنبھلے نواب ہاتھ میں بندوق لئے دندناتے ہوئے گھر میں آ گھسے۔ سیدھے بڑی بیگم کی طرف چلے گئے۔ نوکر چاکر دہل گئے۔ جس نے چیخنے چلانے کی نیت کی نواب نے بندوق کی نالی اسی کی طرف کر دی۔ بڑی بیگم بھی

بڑے ہی دل گردے کی عورت تھیں۔ ذرا بھی اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ بڑی دلجمعی اور اطمینان سے بیٹھی رہیں۔ نوکروں سے کہا آنے دو۔ سنجھلے نواب اپنی بڑی بڑی بھیانک مونچھوں میں مسکرائے تو پتنگا کو وہ ایک خوف ناک ڈاکو نظر آئے جس کے دل میں سفاکی اور بے رحمی کوٹ کوٹ کر بھری رہتی ہے اور اس نے کئی بار سوچا کہ وہ کچھ کرے۔ آخر پر رعشہ چھوٹا ہوا تھا۔ چھوٹی بیگم کی گھگھی بندھی ہوئی تھی اور پتنگا در سے لگی کھڑی ہوئی سب کچھ دیکھ تو رہی تھی لیکن اس پر بھی خوف طاری تھا۔ کنیز نے صحنچی سے جو نکل کر یہ منظر دیکھا تو تڑ سے زمین پر گر گئی۔ اور بے ہوش ہو گئی۔ سنجھلے نواب نے بڑھ کر بندوق کی نالی بڑی بیگم کے سینے پر رکھ دی "او کھوسٹ"! انہوں نے اپنی ماں کو مخاطب کیا "ساری دولت اپنے اُلفتوں کے کلیجے میں اتار رہی ہے —— مجھے دو تین سو روپے پر ٹرخا دیتی ہے۔ یہ نہیں جانتی کہ لڑکا جوان جہان ہے۔ کچھ اس کی اور بھی ضرورتیں ہیں —— نکال اپنا صندوقچہ —— کدھر چھپایا ہے ہیروں کا ہنے —— لا نکال میرے حوالے کر ——"

بڑی بیگم صاحبہ نے کہا "او نامراد، مردود، شیطان ازلی، یزید کے ساتھی —— کیا میں تیری ان گیدڑ بھبکیوں میں آ جاؤں گی، —— خدا تیرا منہ کالا کرے۔ دنیا اور آخرت دونوں میں تو ذلیل و خوار ہووے ——"

"او بڑھیا —— کیوں تیری شامت گھیر رہی ہے" اور یہ کہہ کر سنجھلے نواب نے بیگم صاحبہ کا منہ دوپٹے سے باندھ دیا۔ پلنگ کی ادوائن کھول کر ہاتھ پاؤں باندھ دیئے اور مقابے سے کنجی نکال کر صندوق کھول کر صندوقچہ برآمد کر لیا۔ نہایت فاتحانہ انداز سے صندوقچہ لے کر وہ چلے تو پتنگا چیل کی طرح جھپٹی لیکن ایک ہی لمحے میں اس کی دونوں کلائیاں سنجھلے نواب کی گرفت میں تھیں، اور وہ ہس بھی نہیں سکتی تھی۔ سنجھلے نواب نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "تم تو خود ہیرا ہو —— کہاں چھپی تھیں؟ ہیرے اور جواہرات بھی ملے اور تم بھی ہاتھ لگیں" پھر وہ ماں سے مخاطب ہو کر بولے "دیکھ بڑھیا یہ میرا سالانہ خراج ہے —— اور یہ میری خدمت کے لئے لونڈی ——"

اچانک سامنے سے منجھلے نواب ہاتھ میں ستار لئے ہوئے اور چھوٹے نواب دیوان لئے ہوئے دوڑے دوڑے آئے اور سنجھلے نواب نے قہقہہ لگایا —— پتنگا کا ہاتھ چھوڑ دیا، صندوقچہ بغل میں دبا کر دو ہوائی فائر کئے اور یہ جا وہ جا ——

محلسرا میں کہرام پڑ گیا۔ بڑی بیگم صاحبہ کو سب نے کھولا تو وہ ہچکیوں ہچکیوں رو رہی تھیں اور منجھلے نواب کا منہ چھوٹے نواب اور چھوٹے نواب کا منہ منجھلے نواب تک رہے تھے۔ پتنگا اپنی کلائیوں کو سہلا رہی تھی۔ کنیز پکے فرش پہ جو گری تھی تو اس کا سر کھل گیا تھا اور خون کی ایک لکیر سی فرش پر بنتی چلی گئی تھی۔ باہر سے ہزاری اور دیوان جی زوروں سے چیخ چیخ کر پوچھ رہے تھے۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی کہ پتنگا دوڑ کر ڈیوڑھی پہ چلی گئی اور ہول جول میں یہ بھی بھول گئی کہ وہ بغیر دوپٹے کے ہزاری کے سامنے پہنچ گئی تھی۔ اس نے سارا واقعہ دیوان جی کو سنا دیا تو وہ دونوں سناٹے میں آ گئے —— دیوان جی پہ یکبارگی رقت کا دورہ پڑا اور وہ چیخ چیخ کر رونے لگے اور روتے ہوئے اندرونی ڈیوڑھی پر چلے گئے "بڑی بیگم صاحبہ" دیوان جی نے ہچکیوں ہچکیوں روتے ہوئے کہا "آج معلوم ہوا ہے کہ ہم بے والی و وارث ہو گئے —— ارے اس ڈیوڑھی کو خدا سلامت رکھے —— کیسے دن آ گئے ہیں، شریف اشرف کیا کیا چلن اختیار کر رہے ہیں"۔

ہزاری نے چپکے سے کہا: "دیکھو پتنگا۔ اب تیری عزت خطرے میں ہے۔ بلی کے منہ کو خون لگ چکا ہے، اب سنجھلے نواب سے آبرو بچانا مشکل ہے۔ تو میرا کہا مان —— میرے ساتھ چلی چل۔ تیرے تلوے دھو دھو کے پیوں گا، اللہ کی قسم تجھے بیگموں کی طرح رکھوں گا۔

چنگا اپنی کلائیوں کو سہلا سہلا کر رونے لگی اور ہزاری اپنے انگوچھے سے اس کے آنسو خشک کرنے لگا جس کا چنگا نے مطلق بُرا نہ منایا ——— لیکن جب ہزاری نے بھاگ چلنے پر اصرار کیا تو اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔ ڈیوڑھی سے لوٹتے وقت ہزاری نے پھر کہا۔ "دیکھ چنگا بہت پچھتائے گی ——— اور اپنے ساتھ میری بھی مٹی پلید کرے گی۔"

جب چنگا وہاں سے واپس آئی تو کنیز کے سر پر پٹی بندھی تھی اور وہ چارپائی پر پڑی کراہ رہی تھی۔ آتو چھوٹی بیگم کے تلوے سہلا رہی تھی اور زعفران کے سوا ہر ایک پریشان اور سراسیما نظر آتا تھا۔ چھوٹے نواب اور منجھلے نواب اب تک خاموش کھڑے تھے جیسے وہ اس حویلی کے دو عالیشان ستون ہوں اور بس۔

بڑے نواب چار پانچ روز کے بعد شکار کھیل کر واپس آئے تو سارا واقعہ اُن سے چھپا لیا گیا۔ سخت تاکید کر دی گئی کہ اس حادثے کی ہوا بھی نہ دی جائے ورنہ ابھی گھر سے پچھتاتی ہوئی کئی لاشیں نکل جائیں گی۔ بس بڑے نواب کا گھر میں سرد مہری سے جو خیر مقدم کیا گیا تو خود ان کا ماتھا ٹھنکا۔ ماں کی علالت بھی اُن کو کچھ فرضی معلوم ہوئی۔ انہوں نے منجھلے اور چھوٹے نواب سے مل کر کچھ معلوم کرنا چاہا لیکن بے سود۔ آتو سے پوچھا تو وہاں پانچ سیر کا اُن کے منہ پر قفل لٹک رہا تھا۔ بہن سے معلوم کیا لیکن اُن کے جواب سے بھی تشفی نہ ہوئی۔ رات کا کھانا کھا کر جب نواب اپنے ٹھکانے پر جانے لگے تو چنگا کے پاس اس کے حجرے میں آ گئے۔ "سیدانی بی!" بڑے نواب نے دھیرے سے کہا ——— "ہم تمہاری دعا سے واپس تو آ گئے ——— لیکن ہمارے آنے سے کسی کو خوشی نہیں ہوئی۔ ہر ایک ناراض ناراض سا نظر آ رہا ہے۔ خدا معلوم کیا بات ہے، جیسے کوئی بہت بڑا راز مجھ سے چھپایا جا رہا ہے ——— تم ایک ذرا کی ذرا اوپر نہیں آ سکتیں؟ ——— میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔"

جواب کا انتظار کئے بغیر ہی نواب مڑے تو ایک سایہ سا دیوار کے پاس رینگا ——— نواب نے کہا "کون؟" لیکن جواب ندارد ——— چنگا نے بھی حجرے کے باہر آ کر دیکھا تو زعفران کے حجرے میں وہ سایہ دبک کر چلا گیا، اور جب نواب نے زعفران کے کمرے میں جا کر لیمپ کی روشنی میں ادھر ادھر دیکھا تو ایک کونے میں زعفران دبکی ہوئی یوں بیٹھی تھی جیسے بھیگی بلی۔

چنگا نے نواب کے پاس جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا، اس کو زعفران کی سازش سے ڈر لگا۔ نواب بے خبر تھے لیکن انہیں کیا معلوم کہ زعفران کیا کر رہی تھی۔ صرف آتو کو اور چند نوکروں کو خبر تھی۔ آتو نے بڑی بیگم کے کان بھر نا شروع کئے تو اچانک ایک دن ہزاری سے چپکے ہی چپکے دائی کو بلوایا گیا ——— دائی نے زعفران کو علیحدہ حجرے میں لے جا کر ٹٹولا تو دھک سے رہ گئی۔ ماں بننے کے آثار ظاہر تھے۔ جب دائی نے اپنا فتویٰ دے دیا تو چپکے ہی چپکے بہت سا روپیہ دے کر دائی کا منہ بند کر دیا گیا۔ بڑی بیگم نے تنہائی میں زعفران کو بلوا کر راز اگلوانا چاہا تو وہ خوب پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ ساری محلسرا میں ادھم تھا لیکن بڑے نواب کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی گئی۔ آتو کے ذریعے ہزاری کو زعفران سے منسوب کرنے کے جتن ہونے لگے لیکن وہ ایک ہی گھاگ تھا، سمجھ گیا۔ آتو سے کہا کہ "بیگم صاحبہ ایسی ہی مہربان ہیں تو چنگا سے شادی کرا دیں، میں راضی ہوں۔" آتو نے کہا کہ "چنگا سیدانی ہے تو شیخ زادہ۔" اور جب زعفران کے ساتھ شادی کر لینے میں اسے ملنی چوڑی رقم کی رشوت بھی پیش کی گئی تو ہزاری بپھر کر بولا "آتو جی، تم کو تو خدا کو منہ دکھانا ہے ——— ایمان ایمان سے کہہ دو کہ اگر تمہارا بیٹا ہوتا تو تم زعفران کو اپنی بہو بنا لیتیں؟" آتو کے منہ سے نکلا "اے نوج، ہم بی بی کا دانہ کھاتے ہیں میاں ——— نوابوں کا آنش نہ ہم کھائیں نہ اپنی اولاد کو کھلائیں ——— میاں بات یہ ہے ذات نہیں ———" یہ کہہ کر مڑیں تو دیکھا بڑے نواب کھڑے تھے۔ نواب نے آتو کو گھور کر دیکھا، پھر اُلٹے پیروں اپنی ماں کے پاس گئے۔ "اماں جان مجھے سب معلوم ہو گیا۔"

اور اماں جان (بڑی بیگم) کے آنسو بہنے لگے بولیں "بیٹا ——— کیا کروں، خاندان کی لاج تو رکھنا ہی ہے، اس نالائق نے تو خاندان کی عزت کو بٹہ لگایا ہی ہے۔"

"خاندان کی لاج؟" بڑے نواب بڑبڑائے۔ شام کی ہوا خوری کے لئے انگریزی برجس پہن کر گھوڑے پر سیر کرنے جا رہے تھے۔ ہاتھ میں تازیانہ تھا۔ وہ سے

اپنی پنڈلی پر پٹخنے لگے۔ پھر زوروں سے آواز دی: "سیدانی بی — سیدانی بی"

اور تپنگا لرزتی ہوئی آپہنچی "جی بڑے نواب"

بڑے نواب نے شہ نشین کے ایک در میں لٹکے ہوئے قرآن مجید کو جزدان سے نکال کر تپنگا کے ہاتھوں پر رکھ دیا" تم کو اسی کلام ربانی کی قسم — میرے پیچھے یہاں جو کچھ ہوا ہے، سب ابھی ابھی مجھے بتاؤ"

بے چاری تپنگا کانپ کر رہ گئی۔ اس نے اپنے چاروں طرف دیکھا، ہر ملازمہ اور پیش خدمت آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے منع کر رہی تھی۔ چھوٹی بیگم نے بھی آنکھ کے اشارے سے منع کیا۔ اس نے بڑی بیگم کی طرف دیکھا۔ نگاہیں چار ہوئیں تو بیگم صاحبہ نے نظریں جھکا لیں۔

بڑے نواب چیخ کر بولے: "سیدانی بی — تمہارے جد حضرت امام حسین علیہ السلام نے یزیدیوں کے نرغے میں گھر کر بھی سچی بات کہی تھی، حق بات کہی تھی — تمہارے خاندان کا یہی شیوہ ہے کہ پھانسی کے تختے پر بھی بے باکی سے سچ اور حق بات کہہ گزرتے ہیں — تم صاف صاف کہو"

تپنگا کی گردن فخر سے بلند ہو گئی۔ بڑی بیگم چھاتی کوٹ کوٹ کر رونے بلکنے اور تڑپنے لگیں۔

بڑے نواب نے کہا: "اماں جان میرے سینے میں آگ لگی ہوئی ہے۔ میں اس آگ میں جلا جا رہا ہوں — لیکن مجھے کوئی سچی بات نہیں بتاتا"

تپنگا بولی: "بڑے نواب میرے سینے میں بھی سچائی کا نور اتر آیا ہے — لیجئے میں سب کچھ بتائے دیتی ہوں"

اور اس نے سارا واقعہ من وعن سنا دیا تو نواب تڑپ کر صحن میں اور صحن سے باغ کی طرف اور باغ کی دیوار پھاند کر سنجھلے نواب کے مکان کے صحن میں آگئے۔ سنجھلے نواب کا گریبان پکڑ کر کھینچتے ہوئے محل سرا میں لے آئے اور اس قدر تھپڑ، جوتے اور گھونسے مارے کہ سنجھلے نواب کا نشہ ہرن ہو گیا اور سارا چہرہ لہولہان ہو گیا۔ تمام عورتیں چھڑانے کی کوشش کر رہی تھیں لیکن کسی کا بس نہیں چلتا تھا۔ بالآخر بڑے نواب نے محلسرا کے ایک ستون میں سنجھلے کو باندھ دیا اور اوپر سے بھری ہوئی بندوق لے آئے۔ چاہتے تھے کہ کام تمام کر دیں کہ ممتا کی ماری ماں دوڑ کر سنجھلے نواب سے چمٹ گئی — اس وقت وہ بڑی بیگم صاحبہ نہیں تھیں صرف ایک ماں تھیں۔

"ہٹ جایئے اماں جان! اس مردود کو جہنم واصل ہونے دیجئے — اس نے خاندان ہی کی عزت کو بٹہ نہیں لگایا، انسانیت کو قتل کیا ہے — یہ قاتل ہے اور قاتل کی سزا موت ہے"

"ادھر چھوٹی بیگم بھی بڑے نواب کی بندوق پکڑے ہوئے زار و قطار رو رہی تھیں اور سنجھلے نواب پھٹی پھٹی نظروں سے ہر طرف دیکھ رہا تھا۔

اللہ اللہ کر کے بڑے نواب کو ٹھنڈا کیا گیا۔ ماں نے بڑے بیٹے کے قدموں پر سر تک رکھ دیا۔ لیکن طے یہ پایا کہ سنجھلے نواب کو اسی طرح بندھا رہنے دیا جائے۔ چھوٹی بیگم نے چہرے کا لہو صاف کیا۔ بڑے نواب نے بندوق سامنے رکھ دی اور ماں کی چھاتی پر سر رکھ کر خوب روئے۔ تمام گھر میں عورتیں رونے لگیں — تپنگا ازراہِ ہمدردی پانی کا کٹورا بھر کر سنجھلے نواب کو پلانے گئی — سنجھلے نواب کے چہرے پر ہلکی سی خوشی اور اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ کٹورا لیتے وقت لبوں پر ہلکی سی جنبش پیدا ہوئی اور کانپتے ہوئے ہونٹوں سے سرگوشی میں کچھ کہا جسے سنتے ہی معاً تپنگا کٹورا پھینک کر جوتی اتار کر دھڑا دھڑ مارنے لگی:

"کتے، ذلیل — کیا سمجھا ہے تو نے؛ — کیا مجھے زعفران سمجھا ہے تو نے؟"

تمام نوکر چاکر دوڑ پڑے اور بڑے نواب بھی بپھری ہوئی شیرنی کے تیور دیکھ کر تعجب میں پڑ گئے اور ابھی سراسیمگی کم نہ ہوئی تھی کہ دھڑ ادھڑ دو فائر ہوئے۔ لوگوں نے دیکھا تو بڑے نواب کی بندوق تپنگا کے ہاتھ میں تھی اور سنجھلے نواب کی چھاتی سے خون کا فوارہ ابل رہا تھا، اور تپنگا چلا رہی تھی — "میں سیدانی ہوں — میرے سینے میں سچائی کا نور اتر آیا ہے"

حمیدہ رضوی

چوتھے کھونٹ

آخر جب آدم کو شجرِ ممنوعہ کے قریب بھی نہ جانے کا حکم تھا تو پھر وہ کونسی قوت تھی کیسا سحر تھا جو انہیں کشاں کشاں اس تک لے گیا اور پھر انکشاف کا یہ پھل کھا کر جب حقیقت عریاں ہو کر ان کے سامنے آئی تو انہیں معلوم ہوا کہ جو کچھ ہوا لذت آمیز مگر اذیت رساں ہے، چنانچہ یہی کہانی اس دنیا میں بار بار دہرائی گئی۔ ساری زندگی کی تفسیر بس یہ کہانی ہے۔ جبھی تو شہزادے نے سمجھا کہ وہ نگری نگری گھوم کر اور تین کھونٹ کے سارے اسرار معلوم کرنے میں کافی ریاضت کر چکا ہے اور اب لاکھ بڑی سے بڑی قوت اسے چوتھے کھونٹ جانے سے منع کرے کہ ان راہوں میں آگ کے ابلتے دریا ہیں اور خون کی اونچی اونچی موجیں ہیں اور انگاروں کے بیابان ہیں اور اگر ریاضت کے بل پر وہ دشوار گذار مراحل طے کر کے چوتھے کھونٹ پہنچ بھی جائے اور اس طلسم ہوشربا میں داخل ہو بھی جائے تو پھر شہزادی کے سوال اسے پتھر کا بنا دیتے ہیں کیونکہ اس کے پاس کوئی جواب نہیں ہوگا ـــــ مگر وہ بہر حال جائے گا ـــــ انکشافِ حقیقت کے تجربوں میں خطرہ تو ہوتا ہی ہے۔ اُسے آدم کی طرح شجرِ ممنوعہ چکھ کر ایک نئے جہان کا سراغ تو لگانا ہی ہے ـــــ مگر پھر یہ پچھتاوے کے آنسوؤں کی لہریں کیوں اٹھتی ہیں۔ پھر یہ کیوں ہوتا ہے ـــ شوپن ہاور کی طرح سوچا جاتا ہے کہ بہت آگے آ گئے۔ اب لوٹنا ہی چاہیے۔ اس زندگی کو روکنا ہی ہوگا ـــــ چنانچہ اس نے بھی یہی سوچا کہ وہ تین کھونٹ گھوم گھوم کر کافی عرفان حاصل کر چکا ہے اور چوتھے کھونٹ کے راستے نے تو کتنے کے رہے سہے مراحل بھی طے کرا دیئے ہیں اور اب وہ پختہ ہے اور اپنے آپ میں مکمل ـــ اور جب وہ اس طلسم ہوشربا کے اس محل کے دروازے پر پہنچا تو اس نے ڈٹ کر کہا ـــــ مجھے حقیقت بتا ہی دو۔ مجھے بتاؤ وہ کون سے سوال ہیں جو پتھر کا بنا دیتے ہیں ـــــ اور وہ مسکرائی اور اس کے گالوں میں بھنور سے پڑ گئے۔

"تم لوٹ جاؤ۔ یہ محض تمہارا خیال ہے کہ آگہی میں سکون ہے۔ تم نہ بدھ ہو نہ سقراط نہ ابراہیمؑ نہ عیسیٰؑ نہ حسینؓ۔ تم بہت کمزور ہو۔ منصور سے بھی گئے گذرے۔ تم پاگل ہو جاؤ گے ـــــ ناواقفیت بھی بہت بڑی نعمت ہے ـــــ کیا اتنا کافی نہیں کہ حقیقت ازلی وقت ہے اور وقت خدا ہے۔ تم بدل جاؤ وقت نہیں بدلے گا ـــــ تم پتھر کے ہو جاؤ، وقت پلٹ کر نہیں دیکھے گا۔ اسے تمہارا کوئی انتظار نہیں ـــــ" اس نے کالی گھنی پلکیں جھپکائیں۔ "لوٹ جاؤ ـــــ مجھے تم سے ہمدردی ہے ـــــ" "ارے یہ دھان پان سی ذرا سی فلسفی کی خالہ اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہے؟ ـــــ" اور جب اس نے آنکھوں میں آنسو بھر کے اس کو طلسم خانے میں جھانکنے کی اجازت دے ہی دی اور جب وقت کا سب سے اہم سوال اس کے سامنے آیا تو وہ پتھر کا ہو گیا ـــــ کیونکہ اس کی توقع کے برعکس یہ سوال بہت مشکل تھا اور اسے کوئی جواب نہیں سوجھا تھا ـــــ سب پتھر کے ہو گئے ـــــ نتھیا گلی کشمیر، لداخ اور مری کے پہاڑی سلسلے، پچھوا ہوا کے جھونکے، جہلم اور نیلم کے پانیوں کا سنگم، آتش دان میں سلگتے انگارے ـــ آگہی بھی اذیت عدم آگہی بھی اذیت ـــــ تب ہی تو انسان کائنات کی سب سے دکھی مخلوق ہے ـــ اور ـــ اب وہ جنت سے نکلے ہوئے آدم کی طرح مصیبتوں اور کلفت کے دشتِ ویراں میں حسرتوں کا جنازہ کاندھوں پر اٹھائے حقیقت کا بارِ گراں سنبھالے وقت کی رہگذر پر رینگ رہا ہے۔ جذبۂ تجسس یا پچھتاوے کا سایہ اس کے تعاقب میں ہے اور آگے افق تا افق پھیلی ہوئی تاریکی جس کے بارے

میں اسے کوئی علم نہیں ـــــ مگر یہ بوجھ تو اٹھانا ہی تھا اور آدم کو اٹھانا تھا کہ قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند ـــــ شجرِ ممنوعہ کھانا تو نئی منزلوں کا سراغ لگانے کا بہانہ تھا ـــــ چنانچہ وہ جا چکی اور وہ اسے اپنے بازوؤں میں چھپا چکا مسلا صرف اس کے پیرہن کی خوشبو فضا میں پھیلی ہوئی ہے اور وہ اسے سمیٹ بھی نہیں سکتا۔ وہ پتھر کا ہو چکا ہے ـــــ ارے ڈاکٹر عسکری تم جو یہاں مظفر آباد کے ہسپتال کے اس چھوٹے سے بنگلے میں بیٹھے ازل و ابد کے رشتوں کو تلاش کر رہے ہو قطعی جاہل ہو ـــــ آنچہ معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد ـــــ اس نے اٹھ کر ٹہلتے ہوئے سوچا ـــــ

کبھی وہ کتنا بے فکر انسان تھا۔ بس لاشوں کو چیر چیر کر تجربے کرتے ہوئے بھی ہنسنا، کرکٹ میچ کھیلنا، ڈراموں میں مزاحیہ ایکٹنگ کرنا، کلفٹن پر اتوار منانا ـــــ سوچ بچار، ادب آرٹ سب اسے بیکار معلوم ہوتے تھے ـــــ پھر نہ جانے کیسے بیٹھے بٹھائے ایسا پٹڑہ ہو گیا کہ میں نے سوچنا شروع کر دیا۔ تب ہی تو آج میں دیکھ رہا ہوں کہ میرے گرد لامحدود کائنات پھیلی ہوئی ہے، ایک ہجوم ہے مگر میں تنہا ہوں ـــــ تنہا اذیت کا بوجھ سہار رہا ہوں تنہا اپنے وجود کو برقرار رکھنے کی جدّ و جہد کر رہا ہوں مگر پھر بھی مجبور ہوں اور ماحول کی آہنی سلاخوں میں محبوس ـــــ صرف ذات کی اذیت ہی نہیں میرے گرد، میرے باہر بھی کئی جہنم ہیں اور میں ان سے بھاگ نہیں سکتا۔ میں شوپن ہاور والا حل بھی پسند نہیں کرتا کہ مجھے اس نے ظرف کا طعنہ دیا ہے یہ سب کچھ بھگتنا ہی ہوگا ـــــ طارق نے ٹھیک کہا تھا کہ تم موربڈ ہو گئے ـــــ مگر اس بات کا اس کہانی سے کوئی تعلق نہیں کہ جب تین گھونٹ گھوم کر شہزادہ چوتھے گھونٹ پہ سمجھ کر پہنچا کہ یہ اس کی منزل ہے تو وہ پتھر کا کیسے ہو گیا۔ انکشافِ حقیقت اور پتھر کا بن جانے کے درمیان وہ کونسا لمحہ تھا جب وہ غافل ہو گیا، کیا اس کی ریاضت پرخلوص نہ تھی یا وہ ابھی ناپختہ تھا اور یا محض لوگوں کی نظروں میں وہ پتھر کا ہو گیا اور حقیقت میں اگلی منزلوں کو چل پڑا جس کا کسی کو علم نہیں۔

ـــــ پھر ٹیلیفون کی گھنٹی صبح ہی صبح چلائی اور مظفر آباد کے ایوانِ صدر سے بتایا گیا کہ کوئی خاتون پاکستانی علاقہ سے آئی ہیں اور کسی کتاب کے سلسلہ میں مقبوضہ کشمیر سے آئے ہوئے زخمی مہاجرین اور آزاد فوجیوں سے ملاقات کرنا چاہتی ہیں ـــــ اور جب وہ تیار ہو کر اپنے کمرہ میں پہنچا ہی تھا تو سرکاری جیپ میں کسی کے آنے کی آہٹ ہوئی اور جیپ اسی کے ساتھ ایک لڑکی موتیا سے رنگ کا دوپٹہ کانوں کے گرد لپیٹے سفید کوٹ پہنے کمرہ میں داخل ہوئی اور وہ فوراً احتراماً کھڑا ہو گیا ـــــ مگر دوسرے ہی لمحے اس کا دل دھڑک اٹھا اور چہرے پر سرخی دوڑ گئی ـــــ "ارے شگفتہ تم! ـــــ کیسے آئیں، کب آئیں، کس کے ساتھ آئیں اور میرے گھر کیوں نہیں ٹھہریں؟" ـــــ اس نے ایک ساتھ اتنے سوال کر ڈالے ـــــ شوخ و شنگ، شریر اور ہر دم مسکراتی ہوئی شگفتہ اس کے سامنے تھی۔

"ارے میرے تو خیال و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہاں آپ ڈٹے ہوں گے ـــــ طارق بھیا کسی کام سے یہاں صدر سے ملنے آئے تھے تو میں بھی چلی آئی کہ ان زخمی مظلوموں سے خود مل کر معلومات اکٹھے کروں۔ ایک کتاب کے سلسلے میں ضرورت ہے ـــــ" اس نے دستانے ٹھیک کرتے ہوئے مسکرا کر کہا اور اس کے گالوں کے بھنور میں وہ ڈوب سا گیا ـــــ

"تو یہ آپ تھیں اور یہاں ہم تھر تھر کانپ رہے ہیں کہ خدا جانے کتنے بڑے حجم کی خاتون تشریف لا رہی ہیں" ـــــ اس نے شگفتہ کو پیار سے دیکھتے ہوئے کہا ـــــ اس نے اسی وقت طارق کو ٹیلی فون پر بچارہ بتائی کہ میں شگفتہ کو قطعی واپس نہیں بھیجوں گا اور جناب کو بھی فارغ ہونے کے بعد یہیں آنا پڑے گا خواہ رات ہی کیوں نہ ہو جائے ـــــ اور پھر شگفتہ کو لے کر اس نے سارے ہسپتال کا راؤنڈ لیا اور ایک ایک زخمی مہاجر اور فوجی سے انٹرویو لیا اور جب واپس ہوا تو کھانے کا وقت ہو گیا تھا اس لئے وہ سیدھا اپنے بنگلے پر واپس آ گیا ـــــ اس کے چہرے پر شفق سی پھیلی ہوئی تھی اور گویا ـــ دل چمک گیا تھا۔ اسی لئے اس کے ساتھ شگفتہ کو دیکھ کر اس کا نوکر بھی بہت خوش ہوا تھا ـــــ "ڈاکٹر صاحب! یہ بیگم صاحبہ کون ہیں؟" اس نے کوئی جواب نہ دیا اور ساتھ والے کمرے میں کپڑے تبدیل کرنے چلا گیا ـــــ شگفتہ میری کون ہے؟ ـــــ جانے کون ہے مگر اسے آج یہاں دیکھ کر کچھ ایسا احساس ہوا ہے جیسے کوئی گم گشتہ دولت مل گئی ہو ـــــ یا جیسے بیٹھے ناولوں کو پڑھتے پڑھتے جیمز جوائس اور ورجینیا وولف کو پڑھا جائے یا پھر

بچوں کی بدہیئت ڈرائنگ دیکھتے دیکھتے لیونارڈو کی تصویر نظر آ جائے ــــ شگفتہ وہیں ڈرائنگ روم میں بیٹھی اب کشمیری بوڑھے سے باتیں کر رہی تھی جو ستمبر کی جنگ میں بارہ مولہ سے مہاجر ہو کر آیا تھا ــــ اور وہ دوسرے کمرے میں سوچے جا رہا تھا ــــ شگفتہ سے تو پتہ نہیں کیا رشتہ ہے۔ سنتے ہیں دو تین پشتوں قبل دونوں کے جدِ امجد سگے بھائی تھے۔ بچھڑ جانے کیسے دونوں بھائیوں کا نقطۂ نظر بدل گیا اور منافرت کی خلیج ایسی بڑھی کہ پھر ایک دوسرے سے ملنا اور خاندان کی کسی تقریب میں شرکت کرنا یا ایک دوسرے کو مٹی دینا اور لینا بھی گناہ سمجھا جانے لگا ــــ آزادیٔ پاکستان کے باعث البتہ ایسا ہوا کہ جو دور تھے قریب آ گئے اور اسی کا نتیجہ تھا کہ خاندان کی کسی شادی میں اسے شگفتہ کے بڑے بھائی طارق، بہن شائستہ اور دوسرے چچا زاد پھوپھی زاد بھائیوں سے ملنے کا اتفاق ہوا اور ان کی بلند ذوقی، شائستگی، پاکیزہ خیالات اور کردار میں ایسی گہرائی سی نظر آئی، ان کے ماحول میں ایسی طمانیت کا احساس ہوا کہ وہ پھر انہیں کا ہو کر رہ گیا۔ اسے اس سارے گھرانے، ان کے آئیڈیلز، ان کی مذہب پرستی اور قوم پرستی، ساتھ ہی بے تعصبی اور انسان دوستی اتنی پسند آئی کہ وہ امی کی ناپسندیدگی اور خالہ کی مخالفت کے باوجود جب بھی لاہور آتا آدھا وقت ان کے گھر ضرور صرف کرتا۔ ان میں سب سے پیاری عادت طارق کی تھی۔ شائستہ میں مذاحیہ حس بہت زیادہ تھی اور نظموں کی پیروڈی کر کے خوب ہنساتی تھی۔ نفیس لطیفے دلچسپ سناتا تھا۔ کبھی کبھی بڑی عالمانہ بحثیں بھی چھڑ جاتیں۔ وہ سرمایہ داری کے خلاف باتیں کرتے۔ بورژوائیت کے خلاف لطیفے گھڑتے اور مذاق اڑاتے ــــ اَلَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَہٗ یَحْسَبُ اَنَّ مَالَہٗٓ اَخْلَدَہٗ ۝ کی تشریحیں ہوتیں اور اس میں متوسط زندگی گذارنے کے بعد تمام پیسے کو جمع کرنا وہ حرام قرار دیتے۔ قومی خدمت کے لئے پیسے لگائیے۔ قارون کی طرح قبر میں کیوں لے جائیے ــــ

اور یہ شگفتہ تو اس وقت سات آٹھ سال کی بے ڈھنگی سی لڑکی تھی۔ عجب اوٹ پٹانگ حرکتیں کرتی۔ سرتیا پنڈت سائرہ فاروقی اور یاسمین خوشباش کے ساتھ باقاعدہ پچھواڑے کے سنسان میدان میں کرکٹ میچ کھیلے جاتے۔ کبھی گھنٹوں چاروں کی دوڑ لگ رہی ہے۔ کبھی درختوں پر چڑھ کر چھلانگ لگانے کی مشق ہو رہی ہے اور اس سے فارغ ہوئے تو منڈیر کے اوپر بیٹھ کر رسالے پڑھے جا رہے ہیں۔ ان میں سب سے دلچسپ اور شریر سرتیا تھی ــــ چاروں سفید فراکیں چوڑی دار پجامے اور دو چوٹیوں میں سرخ ربن ڈالے آنکھوں میں دبالے دار کاجل لگائے پھرتیں۔ ان بڑوں کے بہت سے مشاغل میں سے ایک مشغلہ ان بچیوں کے سر پر چپت لگانا بھی تھا مگر وہ سب چڑتی نہیں تھیں، ہنس کر بھاگ جاتی تھیں۔ اس سے شگفتہ قطعی غیر اہم ہستی تھی۔ اس نے کبھی دھیان بھی نہیں دیا تھا کہ اس کی شکل صورت میں کوئی خاص بات ہے۔ بس عام سی لگتی ــــ ان دنوں اس کی کاہلی کا البتہ بڑا چرچا تھا یعنی کھانے پینے کے لئے بھی ان کی امی بلا کر کھلائیں تو کھاتی ورنہ بھوکی رہتی۔ کمرے میں اندھیرے لیٹی کوئی رسالہ پڑھ رہی ہے۔ اٹھ کر بجلی نہیں جلائے گی خواہ کتنا ہی اندھیرا ہو جائے، کوئی دوسرا ہی جلاتا ــــ بس اپنی سہیلیوں کے سوا کسی چیز کی پروا نہیں ــــ اس کے بعد وہ کئی سال تک کرکٹ ٹیم کے ساتھ لاہور جاتا اور ان لوگوں سے ملتا رہا مگر شگفتہ میں خود کو متوجہ کروانے والی کوئی بات ہی نہیں تھی بلکہ اس کی اپنی سگی خالہ کی بہن جو اس سے عمر میں سال چھوٹی ہی تھی تیزی سے ہونہار ہو رہی تھی اور اس کو دیکھ کر کچھ ایسی ہی بے چینی کا احساس ہوتا جیسے بڑی لڑکیوں کو دیکھ کر ہوتا ہے۔

پھر وقت اڑنے لگا۔ اس نے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کر لیا تھا اور فوج میں ملازم ہو چکا تھا اور شاید یہی وجہ تھی کہ وہ چار سال تک لاہور نہ جا سکا۔ طارق کے کبھی کبھار کے خط سے گھر میں ہونے والی تبدیلیوں کا پتہ چلتا رہا کہ نفیس منگلا میں ایس۔ ڈی۔ او ہو گیا ہے۔ منظور احمد نے وکالت شروع کر دی ہے۔ شائستہ کی ملتان شادی ہو گئی ہے اور طارق خود یونیورسٹی میں ملازم ہو گیا ہے اور ساتھ ہی پی۔ ایچ۔ ڈی کی تیاری کر رہا ہے ــــ پروین اس دوران میں لاہور سے اپنی امی کے ساتھ البتہ آتی رہتی تھی۔ چینی کی گڑیا تو وہ پہلے ہی لگتی تھی اب جسامت نے تو جیسے قیامت سی برپا کر رکھی تھی۔ رنگ سفید، آنکھیں چھوٹی اور بھوری، بال سرخی سے جو کٹے ہوئے تھے اور سیٹ کئے ہوتے، سلیقے سے سنوارے ہوئے ــــ قد اونچا، کولہے بھرے، چست قمیض اور شلوار میں اس کا جسم

دیکھ کر اپنے بھرے ہوئے شراب کے گلاس کا گمان ہوتا جو چھلکنے کے قریب ہو ـــــ وہ باتیں بہت کم کرتی تھی اور کرتی بھی تو لندن اور پیرس کے تازہ فیشنوں اور ہالی وڈ کی ایکٹرسوں سے آگے کبھی نہ بڑھتی ـــــ اور خود ڈاکٹر عسکری سے تو وہ بات ایک دو جملوں سے زیادہ کبھی نہ کرتی۔ اس سے کہیں زیادہ اس کا جسم بولتا رہتا۔ اس کی آنکھیں بولتی رہتیں اور عسکری یہ زبان سمجھ کر بھی جیسے انجان بن جاتا ـــــ بہر حال اس کے ناز انداز بڑے قائل تھے اور اسی لئے جب ماں نے اس سے منگنی کے لئے پوچھا تو اس نے خوشی سے رضا مندی ظاہر کر دی ـــــ حقیقتاً اس میں کامیاب بیوی ہونے والی اکثر باتیں تھیں ـــــ اور یوں شادی ہو جاتی اور چین سے بسر ہوتی۔ اپنے خاندان کے دوسرے بزرگوں کی طرح وہ بھی عیش پارٹیوں، دولت، پوزیشن کے پھیر میں زندگی گذار دیتا اور بلڈ پریشر یا ہارٹ اٹیک میں مر جاتا ـــــ مگر یہ سارا کھیلا تو اس فلسفہ نے کیا۔ نہ کراچی میں اس کا دوست جرمن فلسفہ پر اس کے خیالات پر اعتراض کرتا اور نہ یوں زندگی کا مفہوم بدل جاتا ـــــ چنانچہ اس نے سوچا کہ لاہور جا کر اپنے بوہیمین ٹائپ انٹلکچوئیل دوستوں سے اس سلسلہ میں تبادلہ خیال کرے گا ـــــ وہ فوج کی خاص ٹریننگ کے لئے جرمنی جانے والا تھا اس لئے اور بھی ایک ماہ کی چھٹی لے کر لاہور آگیا تھا۔ مگر پروین کی عنایات اتنی وافر تھیں کہ چار دن تک اسے باہر نکلنے کی مہلت ہی نہ ملی۔ وہ ہر لمحہ ہردم ساتھ رہتی، باہر بھی اور گھر میں بھی ـــــ تب ہی تو وہ جھنجھلا گیا۔

پروین خدا کے لئے مجھے فرصت تو دو۔ تمہیں معلوم ہے میں جرمنی جانے والا ہوں اور یہاں مجھے بہت سے ضروری کام ہیں"

"مجھے معلوم ہے تب ہی تو میں ہردم تمہارے ساتھ رہتی ہوں مگر تم ہو کہ ـــــ تمہیں مجھ سے قطعی محبت نہیں۔ تمہیں کسی کی محبت کی قدر بھی ہے؟ ـــــ شاید تم اتنے حسین نہ ہوتے تو ایسا نہ کرتے۔ تم میں محبت کرنے کی اہلیت ہی نہیں۔ تم جانے کیسے مرد ہو کہ ـــــ"

اس پر پہلی بار پروین کے عورت پن کی جہالت کا انکشاف ہوا مگر اس نے پروین کو منا لیا اور پھر چپکے سے باہر نکل آیا ـــــ شدید گرمی کے بعد بارش شروع ہوئی تھی۔ موسم خوشگوار تھا۔ پروائی کے جھونکے درختوں میں سرگشت کر رہے تھے ـــــ طارق کے گھر کے دروازے پر پہنچ کر اسے خیال آیا کہ اب بھلا وہ پہلی سی دلچسپ محفلیں کہاں ہوں گی۔ صرف طارق ہوگا مگر ـــــ خیر وہی کافی ہے ـــــ اس وقت اس کے ذہن کے کسی گوشے میں بھی شگفتہ کے وجود کا احساس نہ تھا۔ وہ خاموشی سے گھر میں داخل ہوا۔ گھر بڑا سونا معلوم ہو رہا تھا۔ خاموشی سی طاری تھی جو اس گھر کی روایت کے خلاف تھی۔ اس نے آنگن میں کھڑے ہو کر چاروں طرف دیکھا۔ کوئی بھی نہ تھا پھر اس کی نگاہ سیڑھیوں کی ریلنگ کی طرف چلی گئی۔ کوئی نازک سی خوبصورت جسم کی لڑکی کھڑی اڑتے ہوئے بادلوں کو دیکھے جا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر کوئی میک اپ نہ تھا۔ آنکھیں کاجل سے عاری تھیں مگر خوبصورت لگ رہی تھیں اور گز گز بھر سے بھی لمبے سیاہ بال شانوں پہ لہرا رہے تھے ـــــ خیر کوئی حسین تو نہیں مگر ـــــ کچھ شاعر کے تخیل کی طرح ہے اور اس پر عاشق بھی ہوا جا سکتا ہے ـــــ مگر توبہ توبہ میں یہ کیا واہیات بات سوچ رہا ہوں۔ جانے کون لڑکی ہے۔ شاید شائستہ کی سہیلی ہو۔ اس کے سائیڈ پوز کی وجہ سے اسے اور اچنبھا ہوا ـــــ پھر وہ گھومی اور گنگناتی ہوئی سیڑھیاں پھلانگتی اس کے سامنے آگئی ـــــ

"اوہو، عسکری بھائی قبلہ و کعبہ ـــــ تسلیمات ـــــ آپی کل ہی سسرال گئی ہیں اور بھیا صبح پشاور گئے ہیں اپنے مقالے کے سلسلے میں۔" وہ مسکرائی اور عسکری کو پہلی بار احساس ہوا کہ اس کے گالوں پر گڑھے پڑتے ہیں ـــــ "اور امی کسی سے ملنے گئی ہیں!"

وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ ارے یہ تو شگفتہ کی بچی ہے! ـــــ پھر وہ بھی ہنس پڑا ـــــ

"سناؤ بھائی تمہاری کالج کا اور تمہاری سہیلیوں کا اور شرارتوں کا کیا حال ہے؟"

"جی سب پر خدا کا فضل ہے اور سب بدستور ہیں۔" وہ پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی ـــــ اس کے اتنے لمبے بال دیکھ کر اس کا دل چاہا کہ ہاتھوں میں لے کر دیکھے کیسا لگتا ہے ـــــ مگر وہ اپنے خیال پر خود ہی شرمندہ ہو گیا۔ بچو جی! یہ پروین کی ٹائپ قطعی نہیں ہے۔ وہ سوچتے ہوئے آنگن میں

بچھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا ــــ پھر اس نے شگفتہ کو بتایا کسی صاحب نے فلسفے کے اس نظریے پر اعتراض کیا ہے ــــ" اور میں سوچ رہا تھا کہ طارق سے بات کروں اس کا مطالعہ اچھا ہے، ما بدولت کوئی فلسفی تو ہیں نہیں ــــ"

وہ ہنس پڑی۔ پھر اس نے دو چار کتابوں کے نام لئے کہ یہ میرے پاس ہیں اور اس موضوع کو سمجھنے میں معاون ہوں گی ــــ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے اس نے بتایا "فلسفہ مجھے بھی پسند ہے مگر صرف وقت گذاری کے لئے۔ لغویات البتہ میرا خاص موضوع ہے اور اس پر میں محنت کر رہی ہوں ــــ سچ بڑا دلچسپ مضمون ہے۔ آپ نے تو ڈاکٹری میں تھوڑا سا ضرور پڑھا ہوگا ــــ"

اور جب وہ گھنٹوں بعد واپس ہوا تو اسے محسوس ہوا شگفتہ سے باتیں کرنا بھی عجیب تسکین بخش ہے اور یہ بے ڈھنگی سی شریر لڑکی کیسی معقول، سمجھدار، پُر اعتماد اور اپنے خاندانی روایت کے مطابق ذہین ہے، مگر قطعی نان رومانٹک ــــ اسے تھوڑی مایوسی بھی ہوئی اور خوشی بھی ــــ اس کی شخصیت کتنی دلکش اور متاثر کن ہے ــــ مگر پروین بذاتِ خود حسین ہے اور ــــ شخصیت تو پروین میں ہے ہی نہیں۔ اور پہلی بار اس نے شگفتہ اور پروین کے درمیان مقابلہ کر ڈالا۔ اسے اپنے اس خیال پر حیرت بھی ہوئی ــــ مگر نہیں پروین حسین ہے اور مجھے اس سے محبت ہے ــــ

مگر پھر جانے کیا ہوا کہ وہ نہ چاہنے کے باوجود غیر ارادی طور پر خود کو شگفتہ کے گھر پاتا اور قدم قدم پر شگفتہ اور پروین کا مقابلہ کئے جاتا۔ وہ خود پر زور دے کر پروین کی خوبیاں یاد کرتا ــــ پروین بہت کم باتیں کرتی ہے مگر اس کی باتوں میں کتنی لگاوٹ، کتنی سپردگی، کتنی وارفتگی ہوتی ہے۔ اس کی ہر حرکت میں کتنا والہانہ پن ہے۔ وہ میری پسند ناپسند کا قدم قدم پر خیال رکھتی ہے۔ کوئی لباس، کوئی زیور انتخاب کرنے سے پہلے وہ اس کی رائے ضرور لیتی ہے کبھی باورچی خانے میں نہیں گئی مگر ماں اور نوکر سے کہہ کر جب تک وہ رہتا ہے کھانے پینے کا خاص خیال رکھتی ہے۔ ذرا سی طبیعت ملول ہوئی اور گردن میں بانہیں ڈال کر وجہ پوچھنے لگی۔ اس کی ایک ایک ادا میں اپیل تھی اور قریب بیٹھ کر پتہ چلتا تھا واقعی کسی عورت کا قرب حاصل ہے۔ کبھی اپنی بات اور پسند اوپر رکھنے کا ارادہ بھی نہیں۔ ہر بات میں بچھی جاتی ہے۔ ایسی لڑکی بھلا کہاں ملے گی ــــ مگر یہ شگفتہ بے ڈھنگی بغیر شرمائے بغیر کوئی ادا دکھائے بس فطری انداز میں باتیں کرتی ہے ــــ اُجاڑ صورت لئے پھرتی ہے۔ بناؤ سنگار کا کوئی سلیقہ نہیں۔ بس لمبی سی ایک چوٹی کمر تک جھول رہی ہے۔ چہرہ کریم پوڈر سے بے نیاز ہے۔ کبھی کاجل لگا کبھی وہ بھی نہیں ــــ کپڑوں کے رنگ اتنے ہلکے کہ دور سے نظر بھی نہ آئیں۔ سرخ اور گلابی رنگ تو کبھی پہنا ہی نہیں ــــ نفاست پسندی ایسی کہ کپڑے پر کوئی دھبہ نہیں ہوگا اور نوکر بھی ہو تو صاف ہو اور اس کا گلاس تھامنے سے پہلے وضو کرے ــــ کاہل ایسی کہ کوفی اور آئس کریم بہت اچھی بناتی تھی۔ بڑی صفائی نفاست اور عجیب طرح کی خوبی سے پیش کرتی مگر فرمائش کے باوجود نہیں بناتی ــــ البتہ اگر طارق نے بہت پیار سے خوشامد کی تو بنا دی۔ ایک ماہ میں صرف دو بار ایسا خوشگوار موقعہ آیا تھا ــــ دل چاہتا تو گھنٹوں اپنی دلکش آواز اور ندی کی روانی کے سے اتار چڑھاؤ کے لہجے میں باتیں کرتی رہتی اور اگر موڈ نہ ہو تو کوشش کے باوجود بات نہیں کرتی۔ وجہ پوچھو تو ہنس کر چپ۔ عجیب موڈی تھی۔ حساس اور خود دار ایسی کہ معمولی سی ناشائستگی کا مذاق بھی گوارا نہیں۔ ہر بات انتہائی تہذیب کے دائرہ میں۔ صفائی کے خبط کا یہ عالم کہ گھر میں اگر کوئی سگریٹ پینے والا مہمان آگیا تو فوراً ٹریا کے گھر جا پہنچی ــــ اور شاید اسی کے لئے بلکہ ــــ یقینی طور پر اس کی وجہ سے میں نے سگریٹ پینا ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا حالانکہ پہلے میری سگریٹ پینے کی رفتار کا اوسط ایک گھنٹہ میں بارہ تھا ــــ اس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے سوچا ــــ سنگدلی کا یہ عالم کہ چہیتے دادا مر گئے اور ایک آنسو نہ گرا۔ بس صرف اتنا کیا کہ دس پندرہ دن کمرہ میں بند رہی۔ رونی صورت کبھی نہیں بنائی، ہر دم ہنسے جا رہی ہے ــــ رومانی ادیبوں کی تحریروں کا ایسے مذاق اڑاتی جیسے بڑے اور معقول لوگ "جادو کی بنسری" قسم کی تحریروں پر ہنستے ہیں ــــ کبھی جذباتی نہیں ہوگی۔ کبھی پروین کی طرح "چاندنی راتوں کے جادو" قسم کے جملے نہیں بولتی ــــ اکھڑ ــــ اور اتنی ساری برائیاں ڈھونڈ کر بھی اس کے دل کی بے چینی کم نہ ہوتی ــــ شاید یہ نفسیات میں

اس کی دلچسپی کا اثر ہے۔ کہ اس کی باتوں کے ذہن پر چھا جانے والے سحر سے نجات پانا مشکل نظر آتا ہے۔ عورتوں کی باتیں آدھے گھنٹے بھی ناقابلِ برداشت ہوتی ہیں اور وہ گھنٹوں باتیں کئے جائے کبھی تھکاوٹ اور بیزاری کا احساس تک نہیں ہوتا ـــــ مگر بداخلاق بھی تو ہے۔ گھنٹوں بیٹھے رہو۔ کسی خوشی کا اظہار نہیں ـــــ جان بوجھ کر ملنے نہ آؤ، کوئی شکایت نہیں ـــــ جلدی اٹھ کر چلے جاؤ کبھی نہیں کہے گی کہ کچھ دیر اور بیٹھئے۔ عجیب بے حس لڑکی ہے ـــــ وہ سوچ کر سلگ کر ناک اس میں ایسی کوئی خوبی نہیں اور میں اب اس کے گھر نہیں جاؤں گا۔ مگر جانے کیسے وہ خود کو شگفتہ کے گھر پاتا ـــــ ان کا سارا گھر بہت خوش اخلاق تھا۔ اس لئے وہ اس کے روزانہ بے وجہ پہنچ جانے پر اعتراض نہ کرتے۔ ویسے اس کی امی یعنی عسکری کی ممانی صاحبہ کی آنکھوں میں اس کے لئے کوئی ایسی پسندیدگی بھی نہ ہوتی۔ اس کے باوجود انہوں نے روایتی ماؤں کی طرح کبھی شگفتہ کو مجھ سے بات کرنے سے منع نہیں کیا نہ ہی مشکوک نظروں سے دیکھا، حالانکہ طارق کی غیر موجودگی میں ایں خود کو مجرم سا محسوس کرتا۔ ممانی نے اپنے بچوں کو تربیت ہی ایسی دی کہ بچے خود کو اور اپنے خاندانی اور اقدار و روایات کو پہچانتے تھے ـــــ سیکس کا نشہ لڑکیوں کی طرح وہ کوئی حرکت نہ کرتی اور اسی وجہ سے خود عسکری کو بھی کسی قسم کی جرأت نہ ہوتی ـــــ حالانکہ ایسے ہزاروں موقعے آئے۔ ہونہہ جن لڑکیوں نے اپنے شوہر کے سوا کسی مرد کو دیکھا ہی نہ ہو اور جنہیں کبھی کسی اور مرد سے بات تک کرنے کا موقعہ نہ ملا ہو وہ اگر پاکبازی کی دھونس جماتی ہیں تو کیا کمال ہے یا وقت نے انہیں مہلت ہی نہیں دی۔ بات تو جب ہے کہ قدم قدم پر موقعے ملیں اور انسان بلند کرداری کا مظاہرہ کرے اور کسی گھٹیا پن کا ثبوت نہ دے ـــــ اصل میں ساری بات نفسیاتی تربیت اور مذہبی احترام کی وجہ سے تھی ـــــ بہرحال شگفتہ سے مل کر جانے کیوں اس کو بڑھتی ہوئی پیاس کا احساس ہوتا۔ مگر پھر بھی وہ اسے شدت سے یاد آتی ـــــ دنیا جہان کی خرابیوں کے باوجود وہ اس کے ذہن پر چھائی رہتی۔

اور ایک دن جب اس کے واپس کراچی جانے میں صرف تین دن باقی تھے تو اس نے شگفتہ سے پوچھا تھا۔" شگفتہ مجھے اسٹیشن الوداع کہنے نہیں آؤگی ؟"

"کیوں ؟ ـــــ کیا آپ محاذ پر جا رہے ہیں ؟ ـــــ پھر تو چلوں ہار وارنے کو" اس نے آنو چھیلتے ہوئے کہا۔

وہ کھسیا گیا ـــــ " نہیں بھائی، ویسے ہی ذرا ـــــ "

" ہونہہ" اس نے پلکیں جھپکا کر مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر کہا ـــــ " پھر تو کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی اور الوداع کہنے جانا تو ویسے بھی کوئی منطقی حرکت نہیں " اسے پہلی بار احساس ہوا کہ اس کی آنکھیں خاصی خوبصورت ہیں اور اس کے جواب نے جیسے اس کا دل توڑ دیا ہے۔ کتنی بے درد ہے یہ دھان پان سی لڑکی ـــــ اور اس ذہنی کیفیت میں وہ پھر اس سے ملنے تین دن نہیں گیا۔ چوتھے دن اسے واپس جانا تھا۔ اور جب وہ دن بھی آگیا تو وہ بولایا بولایا سا پھرا ـــــ چیزیں رکھ رکھ کر بھول گیا۔ ہر کام ہی جیسے الٹا ہو رہا ہو ـــــ تب اس نے کھانا کھاتے ہوئے چونک کر کہا۔ " پروین میں شگفتہ کے گھر کچھ ضروری کاغذات تین چار دن پہلے چھوڑ آیا تھا ـــــ اور اس کی ایک کتاب بھی میرے پاس ہے ـــــ " اس نے پروین سے نظریں چراتے ہوئے کہا ـــــ جو اسے مشکوک نظروں سے گھور رہی تھی ـــــ

" یہیں سے فون کر دیجئے۔ کوئی دے جائے گا۔"

اس کا دل بیٹھ گیا ـــــ " اچھا" ـــــ پھر وہ اٹھ کر فون کے کمرے میں آیا۔ دوسری طرف رسیو کرنے والی شگفتہ ہی تھی اور ابھی وہ اس سے صرف کہہ ہی پایا تھا کہ کتاب لے جاؤ کر پروین پیرہ دینے آگئی ـــــ وہ خاموشی سے سنتا رہا ـــــ " آج ہی صبح بھیا پنڈی چلے گئے ہیں۔ چھوٹے دونوں ابھی اسکول سے نہیں آئے اور میں جولائی کی اس تیز دھوپ میں کالج سے واپس آکر دوبارہ باہر نکلنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ اس لئے مجبوری ہے۔ جانے دیجئے کتاب پر صبر کر لیا۔ کوئی نہیں آسکتا۔ مجبوری ہے " ـــــ عسکری نے رسیور رکھ کر بجھے لہجے میں کہا۔ " پھر کاغذات کا کیا ہوگا ؟"

تجانا ہی پڑے گا ــــــ میں سب سمجھتی ہوں ان لوگوں کی حرکتیں، یہ آپ کو جلانے کی ترکیب ہے۔ کیسے یہ لوگ چھچھورے ہیں ــــــ" پروین نے زہر اگلا۔

"شٹ اپ پروین ــــــ اس کا غصے کے مارے بُرا حال ہو گیا۔ ان لوگوں کے بارے میں کچھ سخت سست سننا اس کی برداشت سے باہر تھا۔ اور پھر شگفتہ نے قطعی نہیں کہا تھا کہ آکر کتاب دے جایئے۔ اسے تو پروا تک نہیں ــــــ اسے دکھ سا ہوا ــــــ مگر وہ خود کو شگفتہ سے ملنے کے لئے جانے سے روک نہ سکا ــــــ دروازے پر پہنچ کر سیدھے اندر چلے جانے کے بجائے اس نے اظہار ناراضی کے طور پہ خوب زور سے کال بیل دبائی اور اندر جا کر کھڑا رہا۔ ــــ شگفتہ ہی دیکھنے آئی تھی ــــــ اس کو دیکھ کر یوں ہنسی گویا کوئی بات ہی نہیں۔ جیسے اس نے ابھی ایسی دل شکن بات ہی سنی ہو۔

ــــــ "او ہو قبلہ و کعبہ جناب عسکری بھیا تشریف لائے ہیں۔ فرمایئے؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور اس کے قریب سے نکل کر سیدھا ڈرائینگ روم میں چلا گیا۔ گویا واقعی کوئی ضروری کام رہ گیا ہو ــــــ وہ وہیں حیرت سے کھڑی رہی ــــــ واپس آکر وہ اس کے سامنے کھڑا ہو گیا ــــــ وہ مسکرائی۔ "ارے بھئی صاحب، کتاب تو دیجئے۔ پاکستان میں یہ کتاب ملتی بھی نہیں۔"

"اب تو خود ہی لینے آیئے تو کتاب ملے گی ورنہ جرمنی چلی جائے گی" ــــــ اس نے شگفتہ کے چہرے کو عجیب سی تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

ــــــ پھر خود ہی ہنس پڑا ــــ "قسم خدا کی اتنا غصہ آرہا تھا تمہارے اوپر ــــ خواہ مخواہ ہنسا دیا ــــــ"

"میں نے تو نہیں مشورہ دیا" ــــــ وہی خشک انداز تھا۔

وہ ایک قدم اور اس کے قریب آگیا ــــــ "شگفتہ شام اودھ کی بہار دیکھی ہے؟"

"یہ تو کوئی رومانی نثر نگاری کا ٹکڑا ہے۔ شاید ایسی خوبصورت نثر کے نمونے آپ کو نیاز فتحپوری، یلدرم اور حجاب امتیاز علی کے ہاں بھی ملیں گے بلکہ اس سے بھی بھاری ترکیبیں کہ کھوپڑی پگھل جائے۔" وہ ہنسی۔

"گولی مارو رومانیوں کو۔ میں نے تو شام اودھ ابھی یہیں دیکھی تھی" ــــــ اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا جو کچی نیند سے اٹھنے کی وجہ سے سرخ اور خمار آلود نظر آرہی تھیں ــــــ پیشانی پر ننھے ننھے بال بے ترتیبی سے پھیلے تھے اور انگوری رنگ کا جمپر اس شدید گرمی میں آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچا رہا تھا۔

اس کی بات سن کر لمحہ بھر کو اس کی پلکیں جھک گئیں اور گالوں پر سرخی دوڑ گئی ــــــ مگر پھر وہ سنبھل گئی۔ "بھئی جی، وہم ہے آپ کا۔ دیکھئے تو سہی یہ جولائی کی تپتی دوپہر ہے اور وہ دیکھئے ساری بیلیں اور پھول کیسے کملا گئے ہیں۔ آج کل کالج میں بھی بڑی بوریت ہوتی ہے۔ نفسیات پڑھتے پڑھتے ہم سو جاتے ہیں ــــــ"

وہ ابھی جانے کتنی طویل بکواس، اسے شرمندہ کرنے کے لئے کئے جاتی اس لئے اس نے دھیرے سے اس کے سر پہ چپت لگائی اور خدا حافظ کہہ کر باہر چلا گیا ــــــ

وہ اس کی گہری شخصیت سے کوئی راز نہ پا سکا۔ اسے کئی دن تک خود پر حیرت ہوتی رہی کہ بھلا اس بے ڈھنگی سی لڑکی کو میں ایسی اہمیت کیوں دینے لگا ہوں ــــــ مگر اہمیت تھی کہ بڑھتی ہی گئی اور اس کی یاد اس کے اعصاب پر نہ چاہنے کے باوجود سوار ہو گئی اور جب پانچ سال کی مدت کے بعد قریب تھا کہ وہ اسے بھول جائے کہ وہ پھر اچانک یوں مل گئی جیسے قحط زدہ دھرتی میں بارش کا پہلا قطرہ ــــــ وہ کپڑے تبدیل کرکے واپس نشست کے کمرے میں آیا تو شگفتہ اخبار دیکھنے میں مصروف تھی ــــــ شہزادے کو چوتھے کھونٹ کا راز پانے جانا ہی ہوگا ــــــ شاید وہی اس کی منزل ہو، شاید اس

کے دل کا راز آشکار ہو کر مجھے سکون بخشنے کر سارا بوجھ میرے ہی اوپر نہیں ۔۔۔۔ پھر وہ دونوں اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ اس کے بات کرنے کا انداز اب اور زیادہ باوقار، سنجیدہ اور سلجھا ہوا تھا۔ وہ بین الاقوامی اور قومی معاملات پر سنجیدگی اور متانت سے باتیں کرتی رہی مگر گھریلو موضوعات پر بات کرنے سے وہ کتراتی رہی ۔۔۔۔ کبھی خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگتی۔ باتوں کے جواب بہت مختصر تھے ۔۔۔۔ مسلسل ہنسنے جانے کے بجائے ہلکا تبسم تھا مگر تھا ضرور، اور گالوں کے گڑھے پہلے سے بھی حسین لگ رہے تھے ۔۔۔۔ اور جب وہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں آرام کرنے چلی گئی تو اس کا دل چاہا کہ وہ اس لڑکی کو بازوؤں میں چھپا کر کہے۔ "مارو گوئی، تم اپنے آئیڈیلز کو اور اپنے یورشدا پس منظر کو ۔۔۔۔ چلو ۔۔۔۔" مگر نہیں، یہ تو ہو نہیں سکتا۔ کم از کم یہی ہو جائے کہ اسے پتہ چل جائے شگفتہ کے دل میں کچھ ہے بھی میرے لئے ۔۔۔۔ تب اس نے ہیملٹ کی طرح سوچا کہ جان ہتھیلی پر رکھ کر یہ راز تو اس سے معلوم کرنا ہی ہوگا خواہ باتوں باتوں میں یا پھر کسی اور طرح ۔۔۔۔

شام ڈھل گئی تھی اور ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی تھی۔ وہ دونوں برآمدے میں کھڑے طارق کے انتظار میں وادیٔ نیلم کی طرف جانے والی اونچی نیچی سڑک کو دیکھتے رہے اور پھر اندر آ کر آتش دان کے شعلوں کے سامنے بیٹھ گئے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے جانے کب عسکری نے روسی ادب کا ذکر چھیڑ دیا اور پھر اسے بتایا کہ مجھے دوستوفسکی کا یہ جملہ بڑا اہم اور معنی خیز معلوم ہوتا ہے ۔۔۔۔ پیار نہ کر سکنے کی اذیت ہی سب سے بڑا جہنم ہے۔ وہ خاموشی سے شعلوں کو دیکھتی رہی پھر عسکری نے نظریں اٹھا کر کہا ۔۔۔۔ "اس سے زیادہ یہ جملہ معنی خیز ہے، ہر دوسرا وجود میرے لئے جہنم ہے ۔۔۔۔ اگر غور کیا جائے تو ایک ہی بات ہے۔ دوسرے ہی جہنم بن کر پیار نہ کر سکنے کی اذیت میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ اسی لئے تو شیطان اور انسان کی دشمنی وجود میں آئی۔ وہ برداشت ہی نہیں کر پایا کہ ۔۔۔۔ اس سے زیادہ کسی اور کو اہمیت دی جائے۔ کتنی ماسٹر پیس سطریں مارلو نے ڈاکٹر فاسٹس میں لکھی ہیں:

THINKEST THOU THAT I, WHO SAW THE FACE OF GOD
AND TASTED THE ETERNAL JOYS OF HEAVEN,
AM NOT TORMENTED WITH TEN THOUSANDS HELL
IN BEING DEPRIVED OF EVERLASTING BLISS.

وہ خاموشی سے اس کی بات سنتی رہی ۔۔۔۔ کچھ دیر سوچتی رہی ۔۔۔۔ "اپنے اپنے ظرف کی بات ہے عسکری بھائی۔ شیطان کا ظرف ہی اچھا نہیں تھا ورنہ خود اپنی آگ میں نہ جلتا ۔۔۔۔ اور یہ جو خود کو مصلوب بنا کر، مظلوم بنا کر اشتہار دینے اور جھنڈا بنا کر بانس پر لٹکانے کا ورثہ ہے نا، یہ بھی انسان کو شیطان ہی سے ملا ہے ۔۔۔۔ میں خدا کے برابر ہوں۔ میں اس کا مقابل ہوں ۔۔۔۔ میں یہ ہوں اور میں وہ ہوں اور پھر انجام کار سانپ ہوں، یہ شعر سنا ہے نا ۔۔۔۔

عشق کی چوٹ تو پڑتی ہے دلوں پر یکساں
ظرف کے فرق سے آواز بدل جاتی ہے

تو ساری بات یہ ہے کہ یہ سارا ہیجان پن اسی اپنے آپ کو سب سے زیادہ اہمیت دینے کا نتیجہ ہے ۔۔۔۔ سمجھے؟" اس کی مسکراہٹ میں بڑی نرمی تھی۔

"تم نے جو کہا وہ بھی ٹھیک اور میں نے جو کہا وہ بھی ٹھیک ۔۔۔۔ مگر جانے مجھے اب کیوں محسوس ہونے لگا ہے کہ انسان اس کائنات کی لاتعداد اشیا کے ہجوم میں بھی کتنا تنہا، بے بس اور مجبور ہے۔ اپنی اذیتوں کا بوجھ اور اپنی مسرتوں کا جنازہ اپنے کاندھوں پر رکھے بس ایک الوژن کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ اس کے ارادے کو کوئی دخل نہیں اور بس ایک انجانی قوت زندگی کے دھارے کو بہائے لئے جا رہی ہے ۔۔۔۔ اسے روکنا چاہیے۔"

"ارے آپ کیسے موربڈ ہو گئے ہیں؟ ۔۔۔۔ حضرت علیؓ کی روایت نہیں سنی؟ ۔۔۔۔ میں نے ارادوں کی شکست سے خدا تعالیٰ کو پہچانا ۔۔۔۔" پھر وہ دونوں ایسے خاموش ہو گئے جیسے سارے موضوع ایک دم ختم ہو چکے ہیں۔ آخر کوئی کب تک دوسروں کی زبان میں بات کرے۔ اور دل کے کواڑ بند رکھے۔

اور طارق نے رات کو جب کھانے کے بعد بہت سی دوسری باتوں کے ساتھ یہ بھی کہا کہ "یار ہم سب تو والدین میں تبدیل ہو چکے ہیں بلکہ ہم سے دس سال چھوٹی اس شگفتہ کی بھی اگلے سال شادی کر رہے ہیں اور تم جس کی سب سے پہلے منگنی ہوئی تھی، ابھی تک کنوارے بیٹھے ہو۔ آخر کب تک کر رہے ہو شادی ؟ ——— انتظار ہے بھارت پھر ایک بار حملہ کر دے تاکہ ——— تاکہ تم کوئی بہت بڑا کارنامہ دکھاؤ۔ ہیں ؟" طارق نے ہنس کر پوچھا۔

"جی ہاں موت بھی تو ایک کارنامہ ہے۔ مستقل مرگ سے وطن کے دفاع میں آناً فاناً ختم ہو جانا زیادہ خوشگوار ہے ———"

"بھئی اچھے بچوں کی طرح جینے کے ڈھنگ سیکھو ——" طارق نے اسے فہمائش کی ——— "ہوں بچوّ جی، میری طرح تم بھی ہیملٹ کے سے کرب سے دوچار ہوتے اور کوئی حل نہ پاتے اور پھر بھی موربد نہ ہوتے تو میں جانتا ———" وہ سوچ کر چپ ہو گیا ——— فلسفہ تو محض غم کو چھپانے کا ذریعہ ہے۔ ہر فلسفی یہی کرتا ہے ——— شخصیت سے فرار ——— اس کا وجود کونسا معروضی ہے ———

اور جب آزاد کشمیر کی برف میں ڈوبی رات رنگینی آ گئی اور وہ دونوں علیحدہ علیحدہ کمروں میں سونے چلے گئے تو گھنٹہ بھر بعد عسکری کو پتہ چلا کہ نیند اس سے کوسوں دور ہے۔ وہ اٹھ کر باہر برآمدے میں آ گیا۔ خیالات کے ہجوم نے اس کے دماغ میں آگ لگا دی تھی ——— باہر کہر میں ڈوبی چاندنی کو دیکھ کر اسے خیال آیا کہ غم کی مرئی شکل ہوتی تو کچھ اسی طرح کی ہوتی ——— وہ سوچنے لگا اگر شگفتہ یہی بتا دے کہ اسے بھی مجھ سے محبت ہے تو میرا غم ختم ہو جائے نہیں تو یہی پتہ لگ جائے کہ کیا اسے میری کیفیات کا علم ہے ؟ ورنہ دل کے کھنڈر غم کی تند آندھی سے ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ اس کا دل شدت سے چاہا کہ شگفتہ کے گلے میں بانہیں ڈال کر اسے شدت سے پیار کرے اور پھر اسی حالت میں مر جائے یا خودکشی کر ڈالے ——— مگر مر جانے کے باوجود اس حقیقت میں کوئی فرق نہیں پڑے گا کہ میں شگفتہ کے اس خیال کی توثیق کر دوں گا کہ بورژوا لوگوں میں کیریکٹر نہیں ہوتا، انسانیت اور ہمدردی بھی نہیں ہوتی اور مذہب کو بھی انہوں نے عیوب کی پردہ پوشی کا ذریعہ بنا لیا ہے ——— اور یہ کہ اونچی ذات یا پوزیشن میں پیدا ہو جانا کوئی خوبی نہیں۔ اصل خوبی اس کا اونچا کردار ہے جس کے لئے قرآن مقدس نے اتقا کا لفظ استعمال کیا ہے ——— پھر وہ مجھ سے نفرت کرے گی ——— نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ مجھے اس کی محبت چاہیے ——— وہ کئی بار اس کے کمرے کی دہلیز تک جا کر واپس آ گیا ——— پھر اس سمے اس نے اپنے تین پشتوں قبل کے بزرگوں سے شدید نفرت محسوس کی۔ ——— آخر جب شگفتہ کے پردادا اور میرے پردادا ایک باپ کی اولاد تھے تو پھر میرے جدِ اعلیٰ کو یہ ہوا کیا تھا کہ درس و تدریس علم و حکمت کے مقدس پیشے کو چھوڑ کر انگریز کی کمپنی میں ملازم ہو گئے جبکہ ان کے والد شاہانِ مغلیہ تک کی خوشامد کرنا اور ان کے قریب رہنا بھی اپنے وقار کی ہتک سمجھتے تھے ——— وہ لوگ معاشرے کی تطہیر اور ملک کی آزادی کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں سب کچھ قربان کر رہے ہیں اور آپ ۱۸۵۷ء کے بعد ان مقدس لوگوں کی جاسوسی کر کے انہیں پھانسی اور کالے پانی کی سزا دلوا کر جاگیر حاصل کر رہے ہیں اور انگریزوں کی خوشامد میں لگے ہیں۔ اتنی سنگین سزاؤں کے باوجود ان کی اولاد انگریز کی نوکری نہیں کرتی۔ تجارت، صحافت، وکالت اور معلمی سے وقت گزار کر آزادی کی تحریک میں پیش پیش ہیں اور آپ ڈپٹی کلکٹروں کی بورژوا نسل اس تحریک کو کچلنے میں مصروف ہیں، پاکستان بننے کے مخالف ہیں مگر پاکستان بن جاتا ہے تو آپ لوگ سب سے پہلے سرمایہ منتقل کروا کر یہاں پہنچتے ہیں۔ یہاں بھی دکھ اور قربانیاں شگفتہ کا خاندان جھیلتا ہے ——— لعنت ہے ——— مگر ——— اس صد سالہ جور و ستم اور خاندانی گراوٹوں کا بوجھ صرف اس کی ذات کو بھگتنا ہے ——— اس کا دل ڈوب گیا ——— عجیب طرح کے جذبات نے جیسے چنگاریاں اس کے جسم میں بھر دیں مگر سلگتے ہوئے جذبات کے اخراج کا کوئی اور ذریعہ نہ پا کر خود کو اذیت دینے کے لئے وہ شبینہ گاؤن پہنے برف میں بیٹھا رہا۔ پھر نہ جانے کب اٹھ کر بستر میں چلا گیا۔ اسے ہوش اس وقت آیا جب طارق نے اسے جھنجوڑ کر جگایا ——— بخار کی وجہ سے اس کی حالت تباہ تھی مگر وہ جلدی سے ناشتہ کر کے طارق کے ساتھ ہی ہسپتال چلا گیا۔ کسی زخمی فوجی کی ٹانگ کا اپریشن کرنا تھا جس میں بم کا ٹکڑا رہ گیا تھا ——— شکر ہے امتحان کی طویل شب گزر گئی ——— اس سمے اس نے عورت ذات کے لئے بے پناہ نفرت محسوس کی ———

بے حس بے درد ــــــ

اسپتال سے واپسی پر اس نے دیکھا کہ وہ سفید پھولوں والی کالی ساڑی باندھے خاموش فضاؤں میں تک رہی تھی۔ ساڑی میں اس کا جسم اور متناسب ہوگیا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ کھڑی ہوگئی ــــ "اب کیا حال ہے آپ کا؟"

"صرف ایک سو پانچ بخار ہے" اس نے بیزار سی مسکراہٹ سے کہا اور کپڑے بدل کر بستر میں گر گیا ــــــ

"یہ تو بہت برا ہوا۔ آپ کو بخار تیز ہوتا جا رہا ہے" اس نے فکرمندی سے کہا۔

"کوئی فکر کی بات نہیں شگفتہ بس ذرا ٹھنڈ کا اثر ہے ــــ تم ان فکروں میں کیوں پڑو تم بس مسکراؤ ــــ"

"عسکری بھائی پلیز ــــ" اس کی آواز میں سخت احتجاج دکھ اور تلخی تھی۔

عسکری نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کے چہرے سے جیسے سارا خون نچڑ چکا تھا۔ ہونٹ سفید اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں ــــ پھر اس کی آنکھیں بے تحاشا چھلک پڑیں اور آنسو تیزی سے ڈھلک کر تھوڑی پر جمع ہونے لگے ــــ اسے اپنے کمینہ پن پر غصہ آگیا ــــ "شگفتہ مجھے معاف کر دو۔ میری ذہنی حالت کچھ غیر متوازن سی ہو رہی ہے ــــ کاش تمہیں پتہ ہوتا کہ ــــ"

"پتہ! ــــ اور آپ مجھے مسکراہٹ کا طعنہ دے رہے ہیں! ــــ دنیا میں ہر غیر حقیقی شے کی طرح یہ مسکراہٹ بھی ہے مگر یہ اب میری عادت ہو چکی اور ــــ آپ کے بارے میں مجھے کیا معلوم نہیں؟ ــــ اس دن سے معلوم ہے جب سے آپ جرمن فلسفے پر کتاب لینے آئے تھے ــــ میں نے طے کر لیا تھا کہ یہ پیغمبر پن ہے اور مجھے اس کی خوش گلی کر کے اس آگ سے بچنا ہے۔ میں دور بھاگتی رہی ــــ آپ کے جرمنی سے آئے خطوط کے جواب بھی یہ کہہ کر نہیں دیئے کہ مجھے فرصت نہیں ــــ مگر جانے کب ــــ اور ــــ اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ آپ چار گھنٹے سردی اور برف میں بیٹھے رہے۔ یہ ایک حقیقت ہے مگر دنیا میں اس سے بھی بڑی زندہ اور اہم حقیقتیں ہیں ــــ میں آپ کی ذہنی بے چینی کو سمجھتی ہوں ــــ مگر پھر ــــ" اس نے سوالیہ انداز میں کچھ ایسی قابلِ رحم نگاہوں سے دیکھا کہ ــــ

اور اس "مگر ــــ" کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا ــــ تب اس نے جانا کہ وقت کی شہزادیوں کا یہی سب سے بڑا سوال رہا ہوگا جس کا شہزادوں کے پاس کوئی جواب نہیں تھا اور وہ پتھر کے ہو گئے ــــ پھر جیسے صدیاں بیت گئیں۔ زندگی اپنے محور پر کئی دفعہ گھوم گئی ــــ مگر وہ پتھر کا ہو چکا تھا ــــ وہ جو سمجھتا تھا کہ چوتھے کھونٹ پہنچ جانا ہی راہی کی منزل ہے اسے معلوم ہوا کہ اصل منزل تو شہزادی کا سوال سن کر پتھر کا ہو جانے میں بھی نہیں بلکہ ــــ یہ تو اصل میں آغاز ہے ایک ایسے سفر کا جس میں ہر منزل ایک نیا مرحلہ ہے اور ہر مرحلہ ایک نیا سفر ــــ تو پھر آدم کی طرح شجرِ ممنوعہ کھا کر بھٹکنے میں بھی لذت ہے ــــ سب کچھ پتھر کا ہو چکا ہے مگر اصل سفر تو چوتھے کھونٹ کا اب شروع ہوا ہے ــــ" اپنے اپنے ظرف کی بات ہے عسکری بھائی اور دنیا میں یہ حقیقت تو ہمیشہ غیر اہم ہے۔ اس سے اہم تر حقیقتوں کے لئے ہم جیتے ہیں ــــ"

"ارے صاحب بتی جلا دوں اتنے تیز بخار میں اندھیرے گھپ میں ٹہل رہے ہیں" بابا جی نے روشنی کر دی ــــ "دو دو گھنٹے رات گذر چکی اور پتہ بھی نہیں صاحب کو، جانے انہیں کیا ہو گیا ہے" ــــ وہ باورچی خانے میں چلا گیا ــــ چوتھے کھونٹ کے اندھیرے میں بھی ایک ایسی روشنی ہے جو کسی کسی کو نظر آتی ہے بابا ــــ جیسے اس اذیت میں لذت۔ پھر وہ تھکن سے آنکھیں بند کر کے صوفے میں گر گیا ــــ باہر پھیلی ہوا میں ٹھنڈک تھی اور اونچی نیچی پہاڑیاں بھی کہر میں سفید ہو رہی تھیں اور نیلم اور جہلم کا پانی بھی۔

ذکی انور

بھوک

میگھو سارے آسمان پر بادل کا کوئی چھوٹا سا بھی ٹکڑا تلاش کرتے کرتے تھک گیا۔ اُس کی گردن اکڑ گئی اور آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا اور جب اُسے ایسا لگا کہ وہ چکرا کر گر جائے گا تو وہ توے کی طرح تپتی ہوئی زمین پر بیٹھ گیا۔

ہلکے نیلے رنگ کا صاف شفاف آسمان ایسا نظر آرہا تھا جیسے حدِ نظر تک پھیلا ہوا پرسکون سمندر، لیکن اس سمندر سے پانی کے ایک قطرے کے لئے بھی پیاسے ترس رہے تھے۔ دھرتی نے جیسے اپنے لاکھوں کروڑوں ہاتھ سمیٹ لئے تھے اور پیاسے کاسہ ہاتھ میں لئے، آسمان کی طرف نظر جمائے خاموش کھڑے تھے۔

میگھو نے سرفراز صاحب کی باڑی میں اور اپنی چھوٹی سی باڑی میں دن رات بیوی بال بچوں کے ساتھ محنت کر کے اور بڑی بڑی امیدیں لے کر کنوئیں سے پانی ڈھو ڈھو کے سبزی، ساگ، مرچ، دھنیا اور پودینہ لگائے تھے اور ان کی کچھ اس عقیدت مندی کے ساتھ خدمت کرتا رہا تھا جیسے وہ سب کے سب مقدس تلسی کے پودے ہوں، اور اس میں شک نہیں کہ دھنیا اور پودینہ کے پودوں نے اُس کی بڑی لاج رکھ لی تھی اور جس دن اُس کی لڑکی کو لڑکے والے دیکھنے آئے تھے اُس نے دو ٹکے کی دھنیا کی پتیاں اور ڈیڑھ روپے کا پودینہ بیچا تھا۔ اتفاق سے اُس دن سرفراز صاحب اپنی بیگم کے ساتھ کہیں باہر گئے ہوئے تھے ورنہ وہ تیار ہونے سے پہلے اپنے پیارے پودوں کا سودا ہرگز نہ کرتا سرفراز صاحب اور اُن کی بیگم ہمیشہ ہی اُس کا کام چلاتے رہتے تھے۔ اُس دن کے سے نازک موقع پر وہ یقیناً اُس کی مدد کرتے۔

زمینداری ختم ہونے سے پہلے میگھو کا دادا سرفراز صاحب کے ہاں کا کمیا تھا۔ میگھو کا باپ نرائن مہتوں اور خود میگھو سرفراز صاحب کے خاندان کے پروردہ تھے لیکن میگھو کی شادی کے دوسرے ہی سال زمینداری ختم ہو گئی اور اب سرفراز صاحب کے پاس تھوڑی ہی سی خود کاشت زمین رہ گئی تھی جس سے سرفراز صاحب کے ہی بہت بڑے کنبے کا گزارہ مشکل تھا۔ چنانچہ اُس خاندان کے سب سے پہلے فرد سرفراز صاحب کے بڑے بھائی ڈاکٹر اعجاز صاحب نے تجارت کی طرف قدم بڑھایا تھا اور انھوں نے دوا کی دوکان کھول لی تھی لیکن اس کے لئے اُن کی رگوں میں دوڑتا ہوا زمینداری کا خون انھیں اکثر لعنت ملامت کرتا جس کے وہ آہستہ آہستہ عادی ہو گئے تھے۔ خاندان کا دوسرا فرد سرفراز صاحب کا چھوٹا بھائی افتخار جس نے ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد امریکن سفارت خانے میں مترجم کی نوکری کر لی تھی۔ وہ خود اپنی ملازمت سے مطمئن تھا یا نہیں یہ الگ بات ہے لیکن گھر کے موجودہ اعلیٰ ڈاکٹر اعجاز صاحب کو بہرحال اُس کا ملازمت کرنا پسند نہیں تھا۔ اور وہ اس فکر میں تھے کہ کسی طرح افتخار کو ملازمت سے الگ کر کے تجارت میں ہی لگا دیا جائے۔ انھیں ملازمت سے سخت نفرت تھی چنانچہ وہ افتخار سے زیادہ باوقار سرفراز صاحب کو سمجھتے تھے جو بلا سے کچھ کام دھام نہیں کرتے تھے لیکن کسی کے نوکر تو نہیں تھے۔

سرفراز صاحب بی۔ اے فائنل میں تھے کہ برصغیر کی آزادی کے چرچے شروع ہو گئے اور اُن کی تعلیم ادھوری رہ گئی۔ اُس وقت سترہ سال کے تھے اور تب سے ہی انھوں نے سیاست میں دلچسپی لینا شروع کر دی تھی۔ زمینداری کے خاتمے سے پہلے تک تو گھر میں وہ صرف کھانے اور ناشتے کے وقت نظر آتے تھے۔ اُن کا باقی وقت جلسے جلوسوں میں کٹتا تھا۔ لیکن زمینداری کے خاتمے کے بعد دو اور نئی باتیں ہو گئیں، ایک تو یہ کہ اُن کے والد میاں احتشام الدین، جو سارے شہر میں

صرف میاں صاحب کماتے تھے۔ اپنی کار کے حادثے میں اللہ کو پیارے ہوگئے۔ اور دوسری بات یہ کہ ڈاکٹر امتیاز صاحب نے دوکان کھول لی۔ افتخار ابھی پڑھ رہا تھا دو اور بھائی بہت چھوٹے چھوٹے تھے۔ چنانچہ سرفراز صاحب نے محسوس کیا کہ انھیں بھی گھر کی کچھ ذمہ داری لینی چاہیے چنانچہ کھیتی اور گھر چلانے کی ذمہ داری انھوں نے سنبھالی۔ ڈاکٹر امتیاز ان کے انتظام سے مطمئن تھے۔

میگھو سرفراز صاحب کا تقریباً ہم عمر تھا۔ چنانچہ ان دونوں میں پہلے بھی رعیت اور مالک کا رشتہ کم تھا دوست کا رشتہ زیادہ اور اب تو رعیت اور مالک کا امتیاز ہی ختم ہو چکا تھا۔ اب میگھو سرفراز صاحب کا دوست تھا لیکن ان کی دوستی میں پرانی اونچ نیچ کا تکلف اب تک برقرار تھا۔ میگھو سرفراز صاحب کی عزت ٹھیک اسی طرح کرتا جیسے اُس کے باپ دادا سرفراز صاحب کے بزرگوں کی کرتے آئے تھے۔

اب وہ زمانہ تو نہیں رہ گیا تھا کہ سرفراز صاحب میگھو کے پانچ افراد پر مشتمل سارے کنبے کی پرورش کرتے لیکن پھر بھی سرفراز صاحب کی ذات سے میگھو کو بڑا سہارا تھا اور صرف سرفراز صاحب ہی کیا نہیں بلکہ گھر کے دوسرے لوگ بھی میگھو اور اُس کے گھر کے افراد کے ساتھ نہایت ہی ہمدردی کا برتاؤ کرتے ہیں۔ لیکن مالی امداد یا تو سرفراز صاحب کرتے تھے یا پھر اُن کی بیگم۔

سرفراز صاحب کی شادی کو صرف تین سال ہوئے تھے۔ اُنھوں نے تو سوچا تھا کہ وہ شادی کریں گے ہی نہیں چنانچہ اپنی عمر کے تقریباً ۳۵ سال تو انھوں نے کسی نہ کسی طرح نکال دیئے اور اب وہ کسی حد تک مطمئن ہو چلے تھے کہ اب تو وہ چالیس کے قریب پہنچ رہے ہیں اب اُن سے کون شادی کرے گا۔ لیکن تھے وہ بڑے اچھے اسمارٹ حسین اور اٹھائیس انتیس سے زیادہ کے بالکل نہیں لگتے تھے۔ چنانچہ سترہ سال کی بی۔ اے پاس سلمہ کا پیغام آیا اور سرفراز صاحب کی بھابھی تو اُس لڑکی پر عاشق ہوگئیں۔ دھر پکڑ کر سرفراز صاحب کو شہید کر ہی دیا گیا۔ اور پھر اُن کی بھابھی کی پیش گوئی حرف بہ حرف درست نکلی —— کہاں کے جلسے، کیسا جلوس، کیسی میٹنگ، کیسی پارٹی —— بس سلمہ رانی تھیں اور سرفراز صاحب تھے —— اور کئی مہینوں تک اُن کا یہی حال رہا۔

سرفراز صاحب کے شادی کر لینے سے میگھو کو بھی ڈاکٹر امتیاز صاحب اور اُن کی بیگم سے کچھ کم خوشی نہیں ہوئی تھی اور اُس نے چاندی کا ایک دس تولے کا بازو بند دلہن کی بیگم کو تحفے میں دیا تھا۔ لیکن میگھو کی بیوی کے دل میں ایک خطرہ سا بدورش پانے لگا تھا۔ وہ خود عورت تھی اور عورت کے بارے میں اچھی طرح سمجھتی تھی۔ جس طرح خود اُس نے میگھو کو روکا تھا کہ وہ دس تولے چاندی کا بازو تحفے میں نہ دے۔ ایسا ہی ہے تو کوئی پلاسٹک کے دو چار کھلونے دے ڈالے۔ ٹھیک اسی طرح اُس کے دل میں سرفراز صاحب کی بیگم کی طرف سے یہ خدشہ تھا کہ وہ سرفراز صاحب کا ہاتھ ضرور کھینچ لے گی۔

لیکن میگھو کی بیوی کا خطرہ جلد ہی ختم ہو گیا۔ اُس نے محسوس کیا کہ چھوٹی سرکار بڑے سرکار سے کچھ کم فیاض نہیں بلکہ اُن سے دو چار قدم آگے ہی تھیں۔

کئی مہینوں کی وحشت کی زندگی گزارنے کے بعد سرفراز صاحب پھر اپنی سیاسی سرگرمیوں میں جٹ گئے تھے۔ پہلے ایسا ہوتا تھا کہ گھر پر اگر وہ نہیں ملتے تھے تو میگھو سیدھے پارٹی کے دفتر میں پہنچ جاتا اور وہیں اُن سے مل لیتا۔ لیکن اب اُسے پارٹی کے دفتر تک جانے کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔ سرفراز صاحب اگر گھر پر نہیں ہوتے تو اُس کی ضرورت بیگم سرفراز پوری کر دیا کرتیں۔

لیکن سلمہ کی یہ فیاضی بیگم امتیاز کو کھلنے لگی۔ اُن کی دلی تمنا تھی کہ اُن کا خاندان ایک نمونے کا خاندان ہو۔ جہاں نہ تو بھائیوں میں کسی بھی قسم کا اختلاف ہو اور نہ بھائیوں کی بیویوں میں۔ چنانچہ اُنھوں نے سلمہ سے دو ٹوک باتیں کرنا ہی مناسب سمجھا لیکن سلمہ سے باتیں کرنے سے پیشتر انھوں نے اپنے خاوند سے مشورہ کر لینا زیادہ ضروری سمجھا اور یہ بہت ہی اچھا ہوا ورنہ ہو سکتا تھا کہ کم سے کم سلمہ کے دل میں بیگم امتیاز کی طرف سے میل پیدا ہو جاتا۔

ڈاکٹر امتیاز صاحب نے اپنی بیگم کو یہ بتا کر مطمئن کر دیا اور کسی قدر حیرت میں ڈال دیا کہ سلمہ کے والد نے اُس کے نام سے کوئٹے کی ایک کان کا ایک حصہ خرید ا ہوا تھا جس سے ہر تین مہینے پر سلمہ کے نام سات آٹھ سو روپے آتے تھے۔ منی آرڈر ڈاکٹر امتیاز کے ہی پتے پر آتا تھا اور روپے وصول کر کے وہ سرفراز صاحب کے

حوالے کرایا کرتے تھے۔

مزید اطمینان کے لئے بیگم امتیاز نے سلمہ سے شکایت کی کہ اس نے کبھی کرنٹے کی کان کا تذکرہ نہیں کیا۔ لیکن سلمہ کے جواب نے انھیں لاجواب کر دیا کہ جب ان کے خاوند کو سب کچھ پتا تھا تو سلمہ اگر انھیں الگ سے بتاتی تو اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا تھا کہ وہ اپنی دولت کی دھونس جمانا چاہتی تھی۔۔

بات ختم ہو گئی۔ اور پھر سلمہ کی فیاضی بیگم امتیاز کو کبھی نہیں کھلی بلکہ وہ اپنے دل کی گہرائی میں اس کے لئے عقیدت کا جذبہ محسوس کرنے لگیں کہ اس ننھی بھولی چھوکری کو جس کے ابھی بال بچے نہیں اور کھیلنے کھانے کے دن ہیں، محتاجوں اور ضرورت مندوں کا کس قدر خیال رہتا ہے۔

اور تب سلمہ کی سرفراز صاحب سے بھی بڑھی ہوئی فیاضی اور منگھو سے ہمدردی نے منگھو کی بیوی کے اندر کی اُس عورت کو ایک بار پھر اُبھارا، جس پر شیطان کا سایہ ہوتا ہے۔۔۔ دوز بروز آسمان کو چھوتی ہوئی مہنگائی نے منگھو کو ایک ذرا سا ڈھیلا کر دیا تھا تو کیا ہوا، محنت مزدوری کرنے والا منگھو بہت ہی تندرست تھا۔ اس کی چمڑی بھی دوسرے محنتی لوگوں کی طرح سیاہ نہیں تھی۔ بال پہلوانی تھے گھونگریلے۔ سرفراز صاحب کے اتارن کرتے پاجامے میں تو چھیلا لگتا تھا۔ اور ویسے ہی اگر سگریٹ کا دھواں اڑاتا ہوا پنگھٹ کے پاس سے گزرتا تو اس کی بیٹی کی عمر کی کنواریاں بھی اُسے ایک نظر دیکھے بغیر نہ رہتیں۔ وہ بانسری بہت اچھی بجاتا تھا اور بدلیا کی دھنوں کا تو بادشاہ تھا۔ ایک بار سرفراز صاحب نے اُسے ریڈیو پر بھی پروگرام دلوا دیا تھا۔ مگر وہاں اُسے ایک بات بہت بری لگی تھی کہ جب آدمی بجاتے بجاتے مست ہو جائے تو کہا جاتا ہے کہ بس۔۔۔ اب بند کرو ٹائم ختم ہو گیا۔

سلمہ نے اُسے کئی بار خاص طور پر بلوا کر اس سے بانسری سنی تھی اور خود گنگنا کر اس نے اُسے کئی فلمی گانوں کی دھنیں سکھائی تھیں، اور پچھلے جاڑے میں سلمہ نے اپنے بھائی سے لے کر ایک کافی اچھا گرم کوٹ اُسے دے دیا تھا۔

اور منگھو کے اندر کی اُس عورت نے جس پر شیطان کا سایہ تھا ان تمام حقیقتوں کا سلسلہ دس تولے کے چاندی کے ہار میں پرو ڈالا تھا اور وہ سوچتی تھی کہ اس کے ساتھ اور چھوٹے سرکار کے ساتھ دغا ہو رہی ہے۔

اور پھر یہ سوچ اس کے دماغ سے اڑی، اور اڑ کر پہلے بیگم امتیاز کی پیشانی پر بیٹھی جس سے ان کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اور پھر وہ سوچ ان کی ناک پر بیٹھ گئی اور یہ سب کچھ ان دنوں کی بات ہے جب گرانی اپنی حد سے تجاوز کر کے قحط کی سرحد میں داخل ہو چکی تھی۔

بہار کے بہت سے علاقوں کا حال سرفراز صاحب اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آئے تھے۔ انھوں نے دیکھا تھا کہ زمانے بھر کے شہدے اور گنڈے، کالج کے طالب علم بچارے چار میل کی دوری سے اپنے سر پر پانی کا گھڑا اٹھائے آتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ کم سے کم پیاسا تو کوئی نہ مرے۔ انھوں نے دیکھا تھا کہ بیج اٹھویے جوان کنواری لڑکیاں شہر کی طرف سے آتی تھیں اور ان کے کھونچے میں سیر دو سیر غلہ اور آنکھوں میں منوں شرم ہوتی تھی اور وہ اپنی بوجھل آنکھیں کسی سے ملانے کی ہمت نہیں کر پاتی تھیں۔ انھوں نے یہ بھی دیکھا تھا کہ رات جب بھیگ جاتی، کسان اپنی پیاری گائیں اور ان کے بھولے بھالے بچے تھان سے کھول کر لے جاتے اور صبح جب وہ شہر سے واپس آتے تو ان کی بغل میں غلّے کی گٹھری ہوتی اور سر پر پاپ کی گٹھری۔

اور واپس آ کر بری طرح ریلیف کے کاموں میں جٹ گئے تھے۔ کبھی اس گاؤں کا دورہ، کبھی اس گاؤں کا دورہ، کبھی دلی، کبھی پٹنہ، کبھی چیریٹی شو، کبھی ریلیف ٹکٹ بیچنے کی مہم۔ وہ گھر بہت کم ہی آتے تھے اور آتے بھی تھے تو بس گھڑی دو گھڑی کے لئے۔ مصیبت تو یہ تھی کہ انھوں نے ڈاکٹر امتیاز صاحب کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا تھا۔

مصیبت آتی ہے تو ایک ہی نہیں آتی، کئی مصیبتیں لائین لگائے آتی چلی جاتی ہیں۔ کتنے ہی دیہات میں طرح طرح کی وبا پھوٹ پڑی تھی۔ اور ڈاکٹر امتیاز صاحب اپنی دوکان ملازم کے سپرد کر کے گاؤں گاؤں مارے مارے پھر رہے تھے۔ گھر میں اگر کوئی مرد تھا تو وہ تھا انتظار جو اتفاق کی گرمیوں کی تعطیل گزارنے آگیا تھا۔

ویسے اُس نے تعطیلیں نینی تال میں گزارنے کا فیصلہ کیا ہوا تھا۔ اور گھر آنے کے بعد بھی وہ اب تک نینی تال چلا گیا ہوتا لیکن بڑے بھائیوں اور سلمہ نے اُسے روک لیا تھا۔ چھوٹا ہونے کی وجہ سے وہ بڑے بھائیوں کا تو بہت پیارا تھا۔ اگر وہ ضد کرتا تو وہ دونوں ہی اسے نینی تال جانے کی اجازت دے دیتے لیکن سلمہ کی فرمائش وہ ٹالنا نہیں چاہتا تھا۔

چنانچہ میگھو کی بیوی کی سوچ جواب بیگم امتیاز کی ناک پر بیٹھی ہوئی تھی یہ دیکھ کر کچھ اور تیز ہو گئی کہ امتیاز جیسے ضدی لڑکے نے کتنی آسانی سے سلمہ کی بات مان لی تھی۔ اور بیگم امتیاز پردے پردے جاسوسی کرنے میں جٹ گئیں۔

بُت کی طرح چپ چاپ زمین پر بیٹھا میگھو سوچ رہا تھا —— کل کیا ہوگا؟ وہ جیسے سو گیا تھا۔ اور اُس کی نیند اُس وقت ٹوٹی جب اُس کی بیوی نے آکر پوچھا "آج کی بنی؟ —— اک بھی چنگی آٹا نئی بھی —— چھوڑا کے دکھا دلگی ہی سے گو نے کسی گھر بھی نئی گیلے، نئی تو پاؤ آدھ آٹا ل جیہا ہا —— یہاں بیٹھل ٹر کی گرد بچھایا ہے؟"

میگھو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے اُٹھا اور مری ہوئی چال سے گھر میں داخل ہو گیا۔ اُس کا چھوٹا بچہ دالان میں چارپائی پر پڑا کراہ رہا تھا میگھو نے اُس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا اور جیسے کانپ اُٹھا۔ اُسے بہت تیز بخار تھا۔

چھوٹی بچی جو تقریباً پانچ سال کی تھی۔ اُس کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی لیکن کچھ بولی نہیں لیکن میگھو بخوبی سمجھ گیا کہ وہ کیا کہنے آئی ہے۔ یہ بات میگھو سے تھوڑی ہی چھپی ہوئی تھی کہ رات منشی جی کی بیوی نے دونوں بچوں کے لئے تھوڑا سا آٹا دیا تھا اور وہی کھا کر تینوں بچے سو گئے تھے۔ میگھو اور اُس کی بیوی نے صرف ایک ایک لوٹا پانی پی لیا تھا اور اب اس وقت دوپہر ہونے کو آئی تھی اور بچوں نے کچھ نہیں کھایا تھا۔

کل سے آج صبح سویرے تک میگھو کئی بار سرفراز صاحب سے ملنے گیا تھا لیکن اُن سے نہ گھر پر ملاقات ہوئی تھی اور نہ پارٹی کے دفتر میں اور نہ ہی ریلیف کے دفتر میں۔ وہ سلمہ کے سامنے بھی دستِ سوال دراز کر سکتا تھا لیکن اُس کی بیوی نے اپنی سوگندھ دے کر اُسے منع کر دیا تھا کہ وہ چھوٹی سرکار سے کبھی کچھ نہ مانگے۔ اُس نے اُسے سمجھایا تھا کہ ہم کوئی بھکاری تھوڑے ہی ہیں جو سب کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھریں۔ چھوٹے سرکار کی بات اور تھی کیونکہ چھوٹے سرکار سے تو میگھو کا دوستانہ تھا۔

میگھو کی بچی نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن صرف اُس کے لب ہل کر رہ گئے۔ البتہ اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی میگھو نے اُسے اُٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ اور اُسے گود میں لئے پیچھے سے آنسو پونچھتا ہوا باہر نکل گیا۔

میگھو نے فیصلہ کن انداز میں سوچا "ہاں ہم بھکاری ہیں جب بھگوان نے اس حال کو پہنچایا ہے تو پھر شرم کاہے کی۔" وہ سوچ رہا تھا وہ تھوڑا ہی اکو خاکم کی طرح جوئے میں اپنا سب کچھ ہار کر یا دولت گوپ کی طرح تاڑی پی پی کر بھکاری بنا ہے۔ وہ تو محنت کرنے والا مزدور ہے، آج بھی محنت سے جی نہیں چراتا لیکن کوئی اس کی محنت خریدے بھی تو۔ کوئی اُسے کام دے بھی تو کوئی اُس سے کام لے بھی تو۔ اور اُس نے فیصلہ کر لیا کہ اگر اب کے چھوٹے سرکار سے ملاقات نہیں ہوئی تو وہ چھوٹی سرکار کے آگے ہاتھ پھیلانے میں ہرگز نہیں ہچکچائے گا۔ کچھ بھی ہو وہ اپنی پھول سی بچی کو بھوک سے اور اپنے اکلوتے بیٹے کو بخار سے مرنے نہیں دے گا۔ چاہے کوئی بھکاری ہی کیوں نہ سمجھے۔

بارہ دنوں سے باہر گئے ہوئے سرفراز صاحب اب تک نہیں لوٹے تھے۔ یہ بات میگھو کو ڈیوڑھی کے باہر ہی ڈیوڑھی کی ایک ملازمہ سے معلوم ہو گئی۔ اور اُسی دفعہ اُسے اپنی بیوی کی دی ہوئی سوگندھ یاد آ گئی اور یک بیک اُس کے پاؤں رک گئے۔ اُس کی بچی نے جو اُس کی انگلی تھامے چل رہی تھی اُسے ڈیوڑھی

کی طرف کھینچا لیکن وہ اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں۔

"چل ہونا باپ پر ہو" بچی نے کہا۔

لیکن میگھو نے جواب نہیں دیا اور وہ اپنی جگہ پر جوں کا توں کھڑا رہا۔

میگھو سے ڈیوڑھی کا کون آدمی تھا جو مانوس نہیں تھا۔ ملازمہ نے اُسے ٹھٹھک کر کھڑا دیکھا تو حیرت سے پوچھا "کیوں، اندر نہیں چلوگے میگھو؟"

"چل رہا ہوں" وہ جیسے کسی غیبی طاقت کے تحت بول رہا تھا۔ "چلو نا"

وہ ملازمہ کے ساتھ ساتھ اندر چلا گیا۔ سلمہ ڈرائنگ روم میں صوفے پر لیٹی چھت کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی تھی۔ اور کچھ اس حد تک کھوئی ہوئی تھی کہ اُسے خبر تک نہیں ہوئی کہ میگھو اس کے سامنے کھڑا تھا اور اُس کی بچی ٹھٹھک کر فرش پر بیٹھ گئی تھی۔

میگھو کو ڈرائنگ روم میں جاتے دیکھ کر بیگم امتیاز بھی وہیں آ کر بیٹھ گئیں لیکن سلمہ کو اُن کے آنے کی بھی خبر نہیں ہو سکی۔ بیگم امتیاز کچھ لمحوں تک خاموش بیٹھی رہیں آخر اُنھوں نے کہا

"کیا بات ہے سلمہ؟"

سلمہ جیسے نیند سے چونک اٹھی اور جو اس نے چھت سے نظر ہٹائی تو کم سے کم بیگم امتیاز نے صاف طور پر دیکھا کہ اُس کی پلکوں میں آنسو کے قطرے بہنے کو بے تاب تھے۔

سلمہ نے بناوٹی جماہی لے کر اپنی آنکھیں پونچھ لیں اور بیگم امتیاز نے کہا "بے چارا میگھو کب سے کھڑا ہے"

"ہاں ـــــ" سلمہ نے قطعی طور پر بے دلی سے کہا۔ "کیا بات ہے؟"

"چھوٹی سرکار ..... لیکن میگھو اس سے زیادہ کچھ اور نہیں کہہ سکا اور سلمہ نے اُس سے پھر پوچھا بھی نہیں کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا تھا لیکن بیگم امتیاز نے پوچھا "کیا بات ہے میگھو؟"

"سرکار ....." اور اب کے اس سے زیادہ اور کچھ کہنے کے بدلے اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"ارے بولو بھی تو ـ" بیگم امتیاز نے پوچھا "سب خیریت ہے نا؟"

"سرکار ... " میگھو جیسے بڑی ہمت کر کے بولا "بچہ بخار سے جل رہا ہے اور اس چھوکری نے رات آدھی روٹی کھائی تھی ..... صبح سے اب تک بھوکی ہے"

بیگم امتیاز نے ملازمہ کو بلایا اور بچی کو اُس کے ساتھ بھیج دیا کہ وہ اُسے کھانا کھلا دے۔ پھر وہ سلمہ سے بولیں "سلمہ ـ تم تو ہمیشہ اس کی مدد کرتی آئی ہو۔ بے چارے کا گھر بھر بھوکا ہے اور بچہ بیمار ہے اگر تم ....."

"بھابھی ـ" سلمہ بیگم امتیاز کی پوری بات سنے بغیر چیخی ـ "بھوک ـ بھوک ـ بھوک ..... بیماری ـ بیماری ـ بیماری بس تو یہ دو لفظ سن سن کر پاگل ہو گئی ہوں۔ تھک گئی ہوں قسم خدا کی، میرے کان پک گئے ہیں اور ایک دن میں بھوک اور بیماری کی رٹ سنتے سنتے مر جاؤں گی ..... کون بھوکا نہیں ہے بھابھی کون بھوکا نہیں ہے، میں بھوکی ہوں، آپ بھوکی ہیں، ساری دنیا بھوکی ہے۔ یہ نسل ہی بھوکوں کی نسل ہے ..... بھوکی نسل ..... یہ نسل ہی بیماروں کی نسل ہے ..... کس کس کا پیٹ بھریں گی آپ بھابھی، کس کس کا علاج کریں گی ..... مٹ جانے دیجئے ساری دنیا کو فنا ہونے دیجئے ساری نسل کو۔ پھر نہ بھوک رہے گی نہ بیماری ..... شانت ہو جائے گی ساری دنیا ..... شانت ہو جائے گی ....."

وہ اُٹھی اور آنسو پونچھتی ہوئی ڈرائنگ روم سے باہر چلی گئی۔

میگھو نے بیگم امتیاز کی طرف دیکھا اور بیگم امتیاز نے میگھو کی طرف جیسے وہ دونوں ہی ایک دوسرے سے یہ پوچھ رہے تھے کہ یہ سب کچھ کیا ہو گیا۔ لیکن کوئی بھی

کسی کو کچھ نہیں بتا سکا۔

اور چند لمحوں کے بعد میگھو نے روتے روتے کہا۔ "بڑی سرکار — اب میرا بچہ نہیں بچے گا۔ اب میرا لال بخار میں جل جل کر مر جائے گا اب میرا......"

وہ بلک بلک کر گچھے سے آنسو پونچھنے لگا اور بیگم امتیاز اسے دلاسا دینے لگیں کہ بچوں کو ایسے ہی زور شور سے بخار آتا ہے۔ صبح تک اُتر جائے گا لیکن میگھو کی تسلی نہیں ہو سکی، اور اس نے جیسے کراہتے ہوئے کہا۔ "بڑی سرکار...... میرے پاس تو چتا کی لکڑی اور کفن کے لئے بھی پیسے نہیں ہیں۔ وہ تو مر ہی جائے گا، پھر کل کیا ہوگا؟...... کل کیا ہوگا......" وہ پھر رونے لگا۔

چار بچوں کی ماں بیگم امتیاز کی ممتا لرز اٹھی، وہ خاموشی سے اٹھیں، اندر گئیں، اور پھر واپس آ کر انھوں نے پانچ روپے کا ایک نوٹ اور دوا کی چند ٹکیاں اسے دیتے ہوئے کہا۔ "بڑی قیمتی دوا ہے یہ، آدھی آدھی ٹکیہ تین تین گھنٹے پر دیتے جاؤ، بخار کو اترنا ہی ہوگا۔"

ایک بار پھر میگھو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اس نے جھک کر بیگم امتیاز کے پاؤں چھو لئے اور جب اس کی بچی اندر سے کھانا کھا کر واپس آ گئی تو میگھو بولا۔ "میں چھوٹی سرکار سے مل کر جانا چاہتا ہوں۔"

"جاؤ —" بیگم امتیاز بولیں۔ "تم سے کیا پردہ ہے جاؤنا وہ اپنے کمرے ہی میں ہیں۔"

"اگر وہ اور خفا ہو گئیں تو؟" میگھو نے پوچھا۔

"میں جانتی ہوں وہ خفا نہیں ہوں گی۔" بیگم امتیاز کہنے لگیں۔ "آدمی کا من ہی ہے نا میگھو کوئی خاص بات ہوگی جو وہ اُلجھ پڑیں، ویسے وہ تمہیں بہت پیار کرتی ہیں۔ تم وہاں نہیں آتے ہو تو تیسرے دن آ ہی پہنچ کر بلواتی ہیں اور تم سے بانسری سنتی ہیں — ہے نا؟"

"لیکن آدمی کا بھاگیہ ہمیشہ ایک سا کب رہتا ہے مالکن!" میگھو بولا — "اب ہم لوگوں کے برے دن آ گئے۔ ماں اگر اپنے بچوں کو دھتکار دے تو پھر وہ بچہ......"

اس سے آگے میگھو نے کیا کہا، بیگم امتیاز نہیں سن سکیں کیونکہ ان کا سر بُری طرح چکرانے لگا تھا اور انھیں ایسا لگ رہا تھا کہ ان کے ذہن پر سے تاریکی کا کوئی دبیز پردہ ہٹتا چلا جا رہا تھا۔

میگھو ڈرائنگ روم سے باہر نکلا اور سلمہ کے کمرے کی طرف چلا لیکن کمرے کے دروازے پر پہنچ کر وہ ٹھٹھک گیا۔ بیگم امتیاز بھی آ پہنچی تھیں۔ انھوں نے اُسے اشارے سے اندر جانے کو کہا لیکن میگھو بولا۔ "نہیں سرکار — میں ہندو ہوں، دیوی کی پوجا کرتا ہوں اور جانتا ہوں کہ دیوی اگر اپنے بھگت کو دھتکار دے تو پھر اُسے مندر کے اندر قدم نہیں رکھنا چاہیئے۔"

اس نے جھک کر کمرے کے دروازے کی چوکھٹ چومی اور پھر چوکھٹ چھو کر ہاتھ اپنے سر پر پھیر لیا، اور ایک بار پھر ہاتھ جوڑ کر بیگم امتیاز کو سلام کر کے چلا گیا۔ بیگم امتیاز کافی دیر تک وہیں کھڑی کچھ سوچتی رہیں۔

رات کے ایک بجے کی ٹرین سے سرفراز صاحب گھر واپس آ گئے۔

سلمہ اس وقت تک جاگ رہی تھی لیکن سرفراز صاحب کی آواز سن کر بھی وہ باہر نہیں نکلی اور جب خود سرفراز صاحب اندر کمرے میں آئے تو اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ "شاید آپ کو کسی بہت ضروری کام سے آنا پڑا؟"

"ہاں سلمہ —" سرفراز صاحب کہنے لگے "میرپور اور اس کے آس پاس کے تین گاؤں میں اگر کل صبح تک اناج نہیں پہنچا تو چار پانچ سو جانیں تلف ہو جائیں گی...... وہاں بیماریاں بھی پھیل گئی ہیں اور بھائی جان کی دوکان سستے کھو دانے جاتی ہے۔"

"اور میں یہ سوچ رہی تھی کہ اب آپ ساری دنیا سے بھوک اور بیماری کا خاتمہ کر کے ہی واپس لوٹیں گے۔"

لیکن سرفراز صاحب کو آج دوپہر کی بات کا کوئی علم نہیں تھا چنانچہ وہ سلمہ کی بات کا طنز نہیں سمجھ سکے اور ہنس کر رہ گئے۔ پھر بولے "میں چار بجے بھولو کی گاڑی سے لوٹ جاؤں گا۔ بلکہ میں نے تو ایس ڈی او سے جیپ بھی منگوائی ہے۔ اگر کام جلد ہو گیا تو جیپ سے ہی چلا جاؤں گا۔"

"یہاں کا تو کوئی کام ہے نہیں" سلمہ نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "آپ کو چاہیئے تھا کہ اُدھر ہی دوکان سے دوا لیتے، بازار سے غلہ خریدتے اور واپس چلے جاتے۔ یہاں تو فضول ہی آئے۔ انسان کے لئے سب سے بڑا فرض تو ہے بھوکوں کو کھانا کھلانا اور بیماروں کو دوا دینا۔"

"بے شک ـــ" سرفراز صاحب پھر بھی کچھ نہیں سمجھ سکے اور بڑی معصومیت سے بولے "اسی لئے تو میں یہاں آیا ہوں سلمہ ..... تم نے سیلاب کے لئے کیسا دل کھول کر چندہ دیا تھا۔ بھوکوں کی اور بیماروں کی مدد کرو، سیکڑوں لوگ مر رہے ہیں سلمہ، ہزاروں لوگ مر رہے ہیں ..... لیکن ہمیں ..... لیکن ہمیں ..... ہمیں اس بھوک کا مقابلہ کرنا ہے ..... اس بیماری کا مقابلہ کرنا ہے ..... اس آفت کا مقا ....."

سلمہ کچھ اس انداز میں تالیاں بجانے لگی کہ سرفراز صاحب بوکھلا کر خاموش ہو گئے۔

"آفت ـــ بھوک ـــ بیماری ـــ" سلمہ زور سے ہنس پڑی۔ پھر بہت ہی رک رک کر کہنے لگی ـــ "سرتاج! آفت کہاں نہیں ہے؟ بھوک کسے نہیں ہے؟ بیماری کے جراثیم سے کس کا خون محفوظ ہے۔ کیا آپ بھوکے نہیں ہیں؟ کیا آپ بیمار نہیں ہیں؟ ـــ میرے سرتاج فرق ہے تو صرف بیماریوں اور بھوکوں کی قسموں کا یا پھر فرق یہ ہے کہ کوئی بیماری اور بھوک سہہ لیتا ہے اور کوئی کراہ کراہ کر سارے ملک، ساری دنیا کو بور کر دیتا ہے۔"

"کیا کہہ رہی ہو تم؟" سرفراز صاحب بڑی حیرت سے سلمہ کی طرف دیکھنے لگے۔

سلمہ بڑے اطمینان سے مسکراتی ہوئی بولی "میں یہ کہہ رہی ہوں ڈارلنگ! کہ میری طرف سے حضور کو ایک پیسے کی بھی امید نہیں رکھنی چاہیئے۔"

"سلمہ! ـــ" سرفراز صاحب جیسے چیخ اُٹھے "یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ کیا تم سچ کہہ رہی ہو؟"

"جی ہاں بالکل سچ ـــ" سلمہ فیصلہ کن انداز میں بولی ـــ "یہ میرا قطعی فیصلہ ہے۔ میں نے کسی کی بیماری، بھوک اور موت کا ٹھیکہ نہیں لے رکھا ہے۔"

"لیکن ـــ" سرفراز صاحب کی دکھاہٹ بہت بڑھ چکی تھی وہ ہکلاتے ہوئے بولے ـــ "لیکن تم نے تو سیلاب کے لئے ....."

"وقت وقت کی بات ہے" سلمہ بولی "اس سے زیادہ میں اور کیا کہہ سکتی ہوں۔"

"لیکن تم تو بہت رحم دل واقع ہوئی ہو" سرفراز صاحب بولے "میگھو کا گھر تقریباً تم ہی چلا رہی ہو۔"

"ہاں ـــ" سلمہ مسکرائی "اُس کا بچہ بیمار ہے اور گھر کے سارے لوگ بھوکے ہیں لیکن میں نے آج اُسے ڈانٹ کر نکال دیا۔"

"کیوں، سلمہ کیوں؟" سرفراز صاحب چونک اُٹھے ـــ "یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے سلمہ؟ ..... میں تو بڑی امید لے کر آیا ہوں ....."

"تو اب ناامید ہو کر واپس چلے جائیے۔" اُس نے بڑے روکھے پن سے کہا اور پلنگ سے اُٹھ کر کمرے سے باہر جانے لگی۔

لیکن سرفراز صاحب نے اُس کا ہاتھ تھام لیا اور یک لخت وہ اُن کے سینے سے چمٹ گئی اور سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔

ایس ڈی او کی بھیجی ہوئی جیپ واپس بھیج دی گئی اور چار بجے بھولو کی گاڑی بھی نکل گئی۔ اور سرفراز صاحب جب آٹھ بجے صبح کی گاڑی سے میرپور جانے کی تیاری کر رہے تھے تو سلمہ بڑے پیارے انداز سے لجاتی ہوئی سی اُن کے پاس آئی اور دستخط کیا ہوا ایک بلینک چیک اُن کی طرف بڑھاتی ہوئی بولی "چھ ہزار دو سو کے اندر کوئی بھی رقم اس چیک میں بھری جا سکتی ہے۔"

تصدق سہیل

بڑا گھر

دوپہر کے قریب جب وہ گھر پہنچا تو وہ کافی تھک چکا تھا لیکن پھر بھی وہ آتے ہی بھاگ کر کھڑکی کے پاس جا پہنچا یہ کھڑکی اسے بہت عزیز تھی۔ یہاں بیٹھ کر وہ اکثر کھیتوں میں گھاس چرتی بھیڑوں کو دیکھا کرتا تھا مگر اس وقت بھیڑیں نہیں تھیں۔ ہاں رہٹ کے چلنے کی آواز ضرور آ رہی تھی اور دور تک پھیلے ہوئے آموں کے پتوں میں ہوائیں سرسرا رہی تھیں۔ آموں کے درختوں کے بیچوں بیچ شہر کو جانے والی سڑک اب خالی اور ویران پڑی تھی۔ یہ دو کوس لمبی سڑک وہ ابھی ابھی طے کر کے آیا تھا اور تانگے کے پہیوں کے چرچرانے کی آواز ابھی تک اس کے کانوں میں گونج رہی تھی اور وہ گھوڑے کی لید کی بو جو اگلی سیٹ پر بیٹھنے کی وجہ سے اسے سونگھنا پڑی تھی۔

ہے تھو۔ اس نے کھڑکی سے باہر تھوک دیا۔ اس کا دل واقعی پھر سے متلانے لگا تھا کہ یکدم کسی نے پیچھے سے آ کر اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیئے اور وہ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے ان کا جائزہ لینے لگا۔

"خالی" اس نے چیخ کر کہا۔

"خالی کا بچہ ــــ خالہ جان نہیں کہا جاتا" اور یہ کہتے ہوئے اس کی سولہ سترہ برس کی بچھیری جیسی خالہ نے اس کے منہ پر آہستہ سے طمانچہ لگا دیا۔

"بس تم آتے ہی ادھر آ کر بیٹھ جایا کرو۔ میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔ رفعت کے ہاں جانا تھا مجھے۔ جیواں کم بخت ویسے نہیں آ رہی آج کل ورنہ اس کے ساتھ چلی گئی ہوتی۔ سوچا للّو آ جائے تو مزا ہی آ جائے اور ہو گئی دعا منظور۔ چلو گے للّو؟" اس نے اس کے چھوٹے چھوٹے گال مسلتے ہوئے پوچھا۔

"ابھی تو میں تھکا ہوا ہوں۔ کل چلیں گے" للّو بولا۔

"نہیں نہیں۔ وہ چلاتی۔ ابھی .... میں چار دن سے انتظار کر رہی ہوں اور ہاں پھر وہاں سے کیمرہ بھی تو لائیں گے ان کے ہاں سے۔ کل تمام دن فوٹو کھینچیں گے ــــ کیوں؟ ......"

اور وہ تیار ہو گیا۔

"ٹھہرو میں ذرا کپڑے بدل لوں۔ نہیں نہیں جاؤ نہیں۔ تم ذرا آنکھیں بند کر لو۔ کھولنا نہیں ــــ جب میں کہوں جب ...." اور وہ کپڑے اتارنے لگی۔

وہ تھوڑی دیر تک آنکھیں بند کئے کھڑا رہا۔ پھر اچانک اسے چھینک آ گئی اور اس کی آنکھیں کھل گئیں تو وہ خالی کو اس حالت میں دیکھ کر یکدم گھبرا گیا۔

"اے بے شرم" خالی نے جلدی سے قمیض سامنے کر لی تو لمحہ بھر کے لئے صرف اس کی بھری بھری بادامی رنگ کی ٹانگیں ہی اس کے سامنے رہ گئیں۔ "تمہیں تو کہا تھا آنکھیں نہیں کھولنا" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

چھینکنے سے کھل گئیں اپنے آپ"۔ اس نے دوبارہ آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا لیکن اب اس کا دل بری طرح سے دھڑک رہا تھا۔ نہ جانے وہ کیوں اسے دوبارہ اسی حالت میں دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے سوچا وہ پھر آنکھیں کھول دے لیکن ڈر کی وجہ سے آنکھیں میچے کھڑا رہا۔

یہ مکان بستی کے دوسرے مکانوں سے کافی دور ہٹ کر کھیتوں کے کنارے واقع تھا۔ اس لئے تاریکی پھیلتے ہی وہاں عجیب سکوت چھا جاتا۔ چاروں طرف الّو بولنے لگتے اور صحن میں لگے ہوئے آم اور بیری کے درخت سائیں سائیں کرنے لگتے تو عجیب ہیبت ناک سا منظر بن جاتا۔ بے شمار چھوٹے بڑے کمرے تھے جن میں سے بہت سے اکثر بند رہتے۔ چار کمرے جو عموماً کھلے رہا کرتے تھے ان میں سے ایک ڈرائنگ روم کے طور پر استعمال ہوتا۔ دوسرے میں لڈو (جس کا نام نہ جانے کیا تھا) کے نانا، نانی جان اور ایک میں خالہ رہتی تھی۔ باقی کمرے چودھری صاحب کے لڑکوں اور ان کی بیویوں کے تھے جو سال میں کبھی کبھار وہ ولیں سے بچے جلنے آیا کرتیں۔ ان کے آنے سے چند روز کے لئے مکان میں خاصی چہل پہل رہتی۔ چودھری صاحب جو چہرے مہرے سے کسی راجپوت مہاراجے کی تصویر معلوم پڑتے تھے تمام راجپوتی خصلتوں کے مالک تھے اور بقول ان کے اصل راجپوت تھے یہ تو ان کی بیگم تھیں جنہوں نے ان کی نسل کا ناس مار دیا تھا۔ وہ رات رات بھر مصلّے پر بیٹھے بہو رانی کے ہاں بیٹا ہونے کی دعائیں مانگا کرتے لیکن اگر کبھی اس کے باوجود لڑکی پیدا ہو جاتی تو بہو کی جیسے شامت آجاتی۔ وہ رات دن اسے صلواتیں سناتے پھر ایسے وقت میں ان کی بیگم صاحبہ جو اندھی ہونے کی وجہ سے اکثر چارپائی پر بیٹھی رہا کرتیں تھیں، ان کے ساتھ شامل ہو جاتیں تو بہوؤں کو بھاگتے راہ نہ ملتی لیکن اتنا کچھ ہونے کے باوجود بچے دیں بجنے جاتے اور ان کی بہوئیں ہزار ہزار میل کا فاصلہ طے کر کے بھی دہیں آتیں۔ ان کے پانچ لڑکے تھے اور سب کے سب شادی شدہ اس لئے سال میں بمشکل دو ایک مہینے ہی ایسے ہوتے تھے جب وہ بالکل اکیلے ہوں ورنہ کوئی نہ کوئی آیا ہی رہتا۔

لیکن ان دنوں بھی جب وہ تینوں اکیلے ہوتے، چودھری صاحب اسی طرح آٹا ماپ کر نوکرانی کو دیتے۔ بہو کے آنے پر جو کچھ زیادہ ہو جاتا تھا گھٹ جاتا اور ایک لکڑی بھی کم کر دی جاتی۔ چینی کے وہ زیادہ قدر دان تھے اور یہ نوکرانی کے ہاتھ نہیں دی جاتی تھی کیونکہ ان کے خیال میں وہ چلتے چلتے آدھی سے زیادہ چینی راہ ہی میں پھانک جاتی تھی۔ اس لئے جب چائے وغیرہ کی ٹرے لگا دی جاتی تو وہ خود اپنے راشن گودام کا تالا کھول کر چینی لاتے اور چائے کے ختم ہوتے ہی سب سے پہلے چینی دان اٹھا کر چل دیتے۔ اس بات پر یا ایسی ہی دوسری باتوں پر میاں بیوی کی اکثر تکرار ہو جاتی جس سے ان کے دن کا کافی حصہ گذر جاتا۔ باقی کا دن وہ مصلّوں پر بیٹھ کر گذار دیتے۔

بڑی بیگم صاحبہ (چودھری صاحب کی بیوی) بہت ضدی تھیں اور اکثر وہی بات کرتیں جس سے انہیں منع کیا جاتا۔ اس کی وجہ سے وہ اپنی آنکھیں تک کھو بیٹھی تھیں اور اپنی صحت سے بھی ہاتھ دھو چکی تھیں۔ اس کے باوجود وہ کسی کی سننے کو تیار نہ تھیں۔ ڈاکٹر کے اسٹیتھوسکوپ لگانے ہی پر دیکھے ایسا جما کر طمانچہ مارتیں کہ کیا کوئی آنکھوں والا دیکھ کر بھی مارے گا۔ یہ تو خیر دوسری بات تھی کہ ڈاکٹر گھر کا تھا اور اب تقریباً عادی ہو چکا تھا اور وہ طمانچہ کھانے والے دن اپنی خفت مٹانے کے لئے پانچ روپے زیادہ کا بل دے دیا کرتا تھا ورنہ اگر کوئی اور ہوتا تو کبھی بھولے سے بھی ادھر کا رُخ نہ کرتا۔ وہ چونکہ ناک میں بولنے کا عادی تھا اس لئے بڑی بیگم اسے ڈاکٹر گنگنا کہا کرتیں۔ وہ لڈو پر بہت جان چھڑکتی تھیں اور اکثر اس کی خاطر چودھری صاحب سے لڑائی تک ہو جاتی تھی اور یہ سب بات اکثر چینی ہی کی بدولت شروع ہوتی۔ شام کو لڈو دودھ پیتے میں آہستہ سے بڑی بیگم سے جنہیں وہ نانی امّاں کہا کرتا تھا چینی کے لئے کہہ دیتا اور وہ بھڑک اٹھتیں۔ "ہائے ہائے .... او بڈھے کیوں ترسا رہا ہے بچے کو۔ کنجوس کہیں کے اسے پھیکا دودھ پلا رہا ہے؟ ہائے لوگو غضب خدا کا!"

"تو کیا ہو گیا۔" چودھری صاحب منہ چڑا کر بولتے۔ "تو نے تو بچے" کا بھی دماغ خراب کر دیا ہے۔ بچوں کو بھلا کیا معلوم میٹھا پھیکا کیا بلا ہوتی ہے۔"

"ہاں ہاں یہ تو تجھے ہی معلوم ہے۔ مزے مارنے تو تو ہی جانے ہے۔ مرن جوگے کافر۔ توبہ ہے بھئی۔" لڑائی جھگڑے سے شروع ہو کر مختلف باتوں سے گزرتی ہوئی نہ جانے کہاں سے کہاں تک پہنچ جاتی۔ یہاں تک کہ لڈو تھک ہار کر پھیکا ہی دودھ پی کر خالی کے کمرے میں سونے چلا جاتا۔

وہ سردیوں کی ٹھنڈی ٹھنڈی راتوں کو اپنے بہت بڑے پلنگ پر نیم دراز کمبلوں اور گدیلوں میں دبکی بیٹھی کچھ نہ کچھ پڑھ رہی ہوتی۔ اُسے بھوتوں پریتوں کی کہانیوں کا بہت شوق تھا۔ ایسی کہانیاں پڑھتے ہوئے وہ اکثر اس قدر ڈر جایا کرتی تھی کہ خوف کے مارے اسے کمرے کا دروازہ تک بند کرنے کی ہمت نہ پڑتی۔ ایسے میں وہ لڈو کو دروازہ بند کرنے بھیجا کرتی اور وہ جب لوٹتا تو اسے اپنے سینے سے چمٹا لیا کرتی جس سے لڈو کے گدگدی سی ہونے لگتی۔

ان دنوں نانی اماں کی کھانسی زوروں پر تھی۔ وہ رات بھر کھانستی رہتیں اس کے باوجود ان کو چٹخنی مٹھی چیز ملتی بچوں کی طرح نگل جاتیں۔

اس نے نانی اماں سے کہا۔ "نانی اماں آپ کو پرہیز کرنا چاہیے۔"

وہ ہنس پڑیں۔ "ارے آخری وقت ہے بیٹا۔ اب پرہیز کاہے کا۔" اور اسے یہ سن کر رونا سا آ گیا۔ وہ اس کے چہرے کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھنے لگیں۔ "واہ واہ میرا بیٹا تو بہت خوبصورت ہے۔ شہزادہ ہے شہزادہ —— " اور پھر وہ اپنی چھڑی پکڑ کر کھڑی ہو گئیں۔ "لڈو چلو بیری کے سائے میں بیٹھیں گے۔"

وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر صحن میں لگے ہوئے بیری کے درخت کے نیچے لے آیا۔ "ہاں یہاں ٹھیک ہے۔ اُدھر تو کم بخت ہوا ہی نہیں چلتی اور پھر بیر بھی کھائیں گے۔" نانی اماں نے بیٹھتے ہی اس کا ہاتھ آہستہ سے دباتے ہوئے کہا۔

"کیا؟" وہ زور سے چیخا۔ اسے معلوم تھا کہ ان کو بیر نہیں کھانا چاہئیں اور نانا جان بھی اسے کئی مرتبہ منع کر چکے تھے۔ وہ سوچنے لگا۔ کاش کوئی آ جائے مگر وہاں کون تھا جو آتا۔ نانا جان نماز پڑھنے گئے ہوئے تھے اور خالی! .... اس کے کمرے کا دروازہ پھر بند تھا کمبخت۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔ یہ زمرّد کا بچہ خالی کو پھر پیٹ رہا ہے شاید —— اور اسے کل کا وہ سین یاد آ گیا جب وہ کسی کام سے خالی کے کمرے میں گیا تھا تو اس نے دیکھا تھا کہ زمرد خالی کے سینے پر چڑھا بیٹھا تھا جسے دیکھتے ہی وہ چیخا تھا۔ "او زمرّد کے بچے" اور وہ دونوں تڑپ کر علیحدہ ہو گئے تھے۔

"کیوں پیٹ رہا ہے خالی کو؟" —— اس نے غصّے سے زمرد سے پوچھا تھا جسے سن کر وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنسنے لگے تھے اور خالی نے کہا تھا۔ "نہیں لڈو۔ میں نے بھی اس کی خوب مرمت کی ہے۔" اور پھر اسے ڈانٹ کر بولی تھی۔ "چلو جا کر باورچی خانے میں بیٹھو۔"

اور زمرد چپ چاپ مسکراتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔ اسے یہاں آئے ابھی بمشکل دو ہی مہینے ہوئے تھے۔ جیوا کے جانے کے بعد چودھری صاحب نہ جانے اسے کہاں سے پکڑ لائے تھے۔ وہ خالی سے عمر میں تین چار سال بڑا تھا۔ دن کا اکثر حصّہ باورچی خانے میں رہتا مگر چودھری صاحب کے گھر سے باہر قدم رکھتے ہی خالی کے کمرے میں گھس جاتا۔

رات کے وقت وہ کھانا تیار کر کے گھر چلا جاتا تھا تو اس کی جگہ جیک لے لیتا تھا۔ جیک دن بھر ٹھنڈی زمین کھود کر ایک طرف امرود کے درخت کے نیچے لیٹا ہانپتا رہتا لیکن رات کو جب اس کی زنجیر کھول دی جاتی تو یکدم گھر کی ہیبت ناک فضا میں اور بھی اضافہ ہو جاتا۔ بند کمروں پر بھوت ناچنے لگتے اور ایسے میں جیک کی آواز بستی میں دُور دُور تک گونجا کرتی۔ رات کو ادھر سے گزرنے والے بھی بھیں گز پرے سے ہو کر گزرتے کہ کہیں ایسا نہ ہو

دروازہ کھلا رہ گیا ہو یا وہ دیوار پھاند آئے۔ وہ اپنی پانچ سالہ زندگی میں چودھری صاحب کو تین مرتبہ کچہری کا منہ دکھا چکا تھا۔

نانی اماں کی کھانسی پھر شروع ہو گئی تھی اور وہ خالی کے کمرے کو بھول کر ان کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ چارپائی کے اوپر بیری کی ہری بھری شاخیں بیروں سے لدے پھندے ہونے کی وجہ سے کسی دلہن کی طرح لال پیلی ہو رہی تھیں۔ اچانک ٹپ سے ایک بیر نانی اماں کے پاس آ گرا۔ انہوں نے کھانستے کھانستے اِدھر اُدھر ہاتھ مارنے شروع کر دیئے لیکن اس نے جلدی سے بیر اٹھا کر اپنے منہ میں رکھ لیا۔

"لڈو ادھر بیر گرا تھا۔ اٹھا نا تو بیٹے۔" نانی اماں نے کہا۔

"نہیں تو نانی اماں۔" اس نے بیر نگلتے ہوئے کہا۔

"بد ماش کھا گیا! — سچ تو کھا گیا نا؟" — نانی اماں نے للچائی ہوئی آواز میں کہا۔

اس رات بھی وہ وہیں تھا۔ آسمان پر سیاہ بادل گھر آئے تھے اور آم کے درختوں کے نیچے خشک پتے کھڑکھڑاتے پھر رہے تھے۔ چاروں طرف عجیب سناٹا طاری تھا۔ اس نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا تو میلوں تک اسے اندھیرا ہی اندھیرا نظر آیا۔ اس اندھیرے میں جوار کے قدِ آدم پودوں میں جو کھڑکی سے باہر تاحدِ نظر پھیلے ہوئے تھے مختلف قسم کے جانور ریں ریں کر رہے تھے۔ یہ سب دیکھ کر اسے ڈر سا محسوس ہونے لگا۔

"یہ کیا بول رہا ہے خالی؟" — اس نے خالی کو جو نہ جانے کیوں آج خلافِ معمول چپ سادھے لیٹی سونے کی کوشش کر رہی تھی، پوچھا، تو وہ بے دلی سے بولی۔ "کچھ نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔ سو جاؤ۔ بہت رات ہو گئی ہے۔"

اور وہ چپ چاپ اس کی گود میں سو گیا۔ لیکن آدھی رات کے وقت جب اچانک اس کی آنکھ کھلی تو وہ اپنے کو تنہا پا کر چیخنے لگا۔ اور اس کی آواز سن کر ناناجان آ پہنچے۔ اس نے دیکھا کہ وہ اس وقت کسی جنگلی شیر کی طرح خونخوار نظر آ رہے تھے۔

"کیا بات ہے بیٹے؟" انہوں نے پوچھا۔

"مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" اس نے کہا۔

وہ خالی کو ڈھونڈنے لگے۔ "طاہرہ کہاں ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم —" اس نے کہا۔

تب وہ غصے سے گرج اٹھے اور اُن کے ساتھ ہی عمر منزل کی دیواریں چیخ اٹھیں — "طاہرہ! — طاہرہ! —"

لیکن وہاں کون تھا جو جواب دیتا۔ باہر والا دروازہ کھلا دیکھتے ہی ان کی ڈاڑھی کے بال تتر بتر ہو گئے اور لمحہ بھر پہلے شیر لگنے والا آدمی اب بھیگی بلی سا بنا اس کے سامنے کھڑا تھا۔

وہ ایک دفعہ پھر زور سے گرجے۔ "جیک! جیک!!"

ان کی پکار بے سود گئی تو انہوں نے بڑھ کر سب بتیاں روشن کر دیں۔ جیک ایک طرف خلافِ معمول بندھا پڑا اپنے مالک سے ملنے کے لئے زنجیر سے کشتی لڑ رہا تھا۔ انہوں نے بڑھ کر جلدی سے اسے کھولا تو وہ دوسری ہی جست میں گھر سے باہر تھا۔ اتنے میں نانی اماں جانے کیسے چھڑی کے بغیر کمرے سے باہر نکل آئیں۔ وہ ایسے کھڑی تھیں جیسے انہیں سب کچھ دکھائی دے رہا ہو۔ "کیا ہے؟ کیا بات ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"طاہرہ نہیں ہے۔" ناناجان ان کے پاس پہنچ کر آہستہ سے بولے۔

"تم ہیں ؟" اور وہ دھڑام سے گر گئیں۔ دور کہیں کھیتوں سے جیک کے بھونکنے کی آواز آرہی تھی۔

صبح جب زمرونہ آیا تو تمام بات ان کی سمجھ میں آگئی۔ ناناجان دہلیز سے باہر قدم رکھتے ہوئے گھبرا رہے تھے۔ وہ شام تک گھر میں ہی پاگلوں کی طرح پھرتے رہے۔ ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور داڑھی کے بال جو ہمیشہ سلیقے سے جمے رہا کرتے تھے، بری طرح بکھر رہے تھے۔ جیک کھلا پھر رہا تھا مگر انہیں جیسے آج اس بات کی پرواہ ہی نہ تھی کہ وہ کسی کو کاٹ کھائے گا۔

نانی اماں تو بس چارپائی کی ہو کر رہ گئی تھیں۔ انہوں نے صبح سے ایک لفظ نہ کہا تھا اور کھانسی بھی زور پکڑ گئی تھی۔ ڈاکٹر بلایا گیا۔ پھر بلایا گیا —— اور پانچویں دن جب ڈاکٹر نے ان کی نبض پر ہاتھ رکھا تو انہیں جیسے بالکل آرام آچکا تھا وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ "بیگم صاحبہ" —— وہ حسب معمول ناک میں بولتے ہوئے چیخا اور اس کی آنکھوں سے دو آنسو گر کر بستر کی سفید چادر میں جذب ہو گئے۔

اب ناناجان اور جیک اکیلے رہ گئے تھے۔ جیک نے جیسے یکدم لوگوں کو کاٹنا چھوڑ دیا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ یکدم ناناجان کی طرح بڈھا ہو گیا ہو۔ اب وہ دونوں بیری کے درخت کے نیچے چپ چاپ بیٹھ رہتے۔ ناناجان بادلوں کو دیکھتے اور وہ باہر دروازے کو دیکھ دیکھ کر اداس اوں اوں کیا کرتا

وہ ایک اداس اور دھندلائی ہوئی سی شام تھی۔ شہر کو جانے والی ٹوٹی پھوٹی سڑک پر تانگوں کے ادھر ادھر بھاگنے کی وجہ سے بے طرح گرد اڑ رہی تھی۔ اور یہ سب اڑتی ہوئی گرد اب جمع ہو کر جیسے عمر منزل کی ہر چیز پر چھا گئی تھی۔ صحن بستی والوں اور باہر سے آئے ہوئے عزیز و اقارب اور ملنے والوں سے کھچا کھچ بھر گیا تھا۔ لوگ تین تین چار چار کی ٹولیوں میں ادھر ادھر کھڑے آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ چودھری صاحب کے بیٹے بیٹیاں سب کے سب ان کے بستر کے گرد جمع ہو گئے تھے۔

پھر سورۂ یٰسین پڑھنے کی آواز کمرے سے آنے لگی تو باہر یکدم سناٹا چھا گیا۔

"اب چند گھڑیوں کے مہمان ہیں۔" کسی نے آہستہ سے کسی سے کہا تو لڈو لوگوں کے ہجوم کو چیرتا ہوا چودھری صاحب کے بستر کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ وہ آنکھیں بند کئے لیٹے ہوئے تھے اور سب کی نظریں ان کی چلتی ہوئی سانس پر لگی تھیں کہ یکدم انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ لڈو کی طرف دیکھ کر جو ان کی آنکھوں کی بالکل سیدھ میں کھڑا تھا انہوں نے مسکرانے کی کوشش کی مگر مسکراہٹ آدھے ہونٹوں پہ پہنچ کر نقاہت کی وجہ سے ٹوٹ گئی۔ پھر انہوں نے اپنی تمام تر طاقت لگا کر ہلنے کی کوشش کی مگر جب ہل نہ سکے تو اپنے قریب کھڑے بڑے لڑکے کو نظروں سے اپنے قریب آنے کو کہا۔ وہ جلدی سے کان ان کے منہ کے قریب لے گیا۔

"تکیے کے نیچے .... ہے ......" انہوں نے بڑی مشکل سے کہا۔

بڑے لڑکے نے جلدی سے ان کے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹی سی پوٹلی نکالی تو بولے۔ "لڈو ..... کو ..... دو!"

اس نے پوٹلی جلدی سے لڈو کو دے دی۔ سب لوگ پوٹلی اور لڈو کو حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے۔

"چینی ہے ....." وہ بولے ..... "لے لو ..... کھاؤ ......" پھر لڈو کی طرف محبت سے دیکھتے ہوئے ایک ہلکی سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر ابھری اور پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے وہیں جم کر رہ گئی۔

("دائرۂ خیال" لندن میں پڑھا گیا)

بنگلہ : ببھوتی بھوشن بندوپادھیائے
اُردو : احمد سعدی

چھوٹا سا گھر

آج سے کئی سال پہلے کی بات ہے۔

میں ایک جلسے میں شرکت کرنے کے لئے کھڑگپور گیا ہوا تھا۔ بیساکھ کا مہینہ تھا اور اس ماہ میں ایک دن بھی بارش نہیں ہوئی تھی۔ اس پر کھڑگپور کی گرمی ویسے ہی مشہور تھی۔ آس پاس کوئی درخت بھی نہیں تھا، چاروں طرف ریلوے کالونی کے چھوٹے چھوٹے کوارٹرز تھے اور اُن کے سامنے ایک بڑا سا بدرو تھا جو گندے پانی سے لبالب بھرا ہوا تھا۔ چار نمبر کوارٹر ایسا تھا کہ اس میں آدمی کسی نہ کسی طرح گذر بسر کر سکتا تھا۔ تین نمبر کی حالت اس سے بھی خراب تھی اور اس میں رہنے والے بہت تکلیف کے ساتھ گذارہ کر رہے تھے۔ لیکن دو نمبر اور ایک نمبر کوارٹرز کی حالت اتنی بدتر تھی کہ ان کوارٹرز میں رہنے والے جانور سے بھی بُری حالت میں تھے اور انہیں دیکھ کر بڑا ترس آتا تھا کیونکہ وہ لوگ ان کوارٹرز میں رہنے کی بجائے اصطبل میں زیادہ آرام سے رہ سکتے تھے۔

میں ایک صاحب کے یہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ غالباً کوئی اچھی سی ملازمت کرتے تھے اور اسی وجہ سے انہیں چار نمبر کوارٹر ملا ہوا تھا۔ چھوٹے چھوٹے کمرے تھے جن کی چھتیں بہت نیچی تھیں اور ان صاحب کی بیوی نے مخمل پر ریشم کے دھاگے سے "شوہر مجازی خدا ہے" کاڑھ کر اور فریم کرانے کے بعد دیوار پر آویزاں کر دیا تھا اور شیشے کی الماری میں چینی کے برتن اور مٹی کے کھلونے سجا رکھے تھے۔ ایک طرف دیوار پر مہاتما گاندھی کی تصویر اور سن لائٹ صابن کا اشتہار اور راس لیلا اور چیتن آنند کی تصویریں تھیں اور کسی جگہ کے مزدوروں نے صاحب خانہ کو کسی زمانہ میں الوداعی پارٹی دی تھی، اس واقعہ کی یادگار تصویر بھی فریم میں جڑی ہوئی ٹنگی تھی۔ کمرے میں ہوا کا گذر بس برائے نام تھا۔ اس پر بیساکھ کی گرمی پوری شدت سے پڑ رہی تھی جس سے کنکریٹ کی چھت تپ کر توے کی طرح گرم ہو جاتی تھی۔ کمرے ویسے ہی چھوٹے تھے، اس پر اسباب کی وجہ سے ہات پاؤں ہلانے کی بھی جگہ باقی نہیں رہی تھی اور حبس کا یہ عالم تھا کہ سانس لینا بھی دشوار ہو جاتا تھا۔

میں نے صاحبِ خانہ سے پوچھا — "آپ اس کمرے میں کس طرح رہتے ہیں؟"

"پھر کیا کروں بتایئے، ملازمت کی مجبوری ہے۔" انہوں نے جواب دیا۔

"آپ کتنے دنوں سے اس کوارٹر میں ہیں؟"

"میں نے ۱۹۲۷ء میں جوائن کیا تھا۔" انہوں نے کہا — "اب آپ خود حساب کر لیں، اکیس سال ہو رہے ہیں۔"

"اسی کوارٹر میں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"تب تو کوئی بات ہی نہیں تھی۔" وہ بولے — "جب میری تنخواہ کم تھی تو مجھے تین نمبر کوارٹر الاٹ ہوا تھا اور اس میں نو سال تک رہا، آپ نے

دو نمبر کوارٹر تو ابھی دیکھا ہی نہیں، اسے دیکھ کر تو آپ اور بھی حیران ہوں گے، میں ایک سال تک دو نمبر میں بھی رہ چکا ہوں۔"

اور میں نے دل میں سوچا، اس شخص نے محض دو سو روپوں کے لئے کتنی ہی چاندنی راتوں کے حسین مناظر، کتنی ہی بھری دوپہروں کا حسن، کتنی ہی نیم شب کے اسرار، کتنی ہی برساتوں کی رم جھم، کتنی ہی بہاروں کے بدلتے ہوئے رنگ، کتنی ہی گلپوش وادیوں کے مہکتے دامن، کانوں میں رس گھولتی ہوئی کوئل کی پکار اور زندگی کے کتنے ہی کیف آور لمحوں کو کھو دیا ہے اور صرف اسی نے نہیں، اس کی بیوی نے بھی سہانے خواب گنوائے ہیں اور اس کے بچوں نے عہدِ طفلی کے معصوم پُر اسرار اور بے فکری کے زمانے کھوئے ہیں اور اس کے باوجود انہیں کچھ پتہ نہیں تھا کہ انہوں نے اپنی زندگی کے کتنے حسین اور قیمتی لمحے کھو دیئے ہیں۔

میں نے پوچھا —— "چھٹی لے کر اب تک کتنی بار اپنے گھر گئے ہیں؟"

"کتنی بار؟" انہوں نے حیرت سے میری طرف دیکھا —— "ان بائیس برسوں میں صرف دو بار گھر گیا ہوں۔"

"بہت تکلیف اٹھا رہے ہیں آپ لوگ۔" میرے منہ سے غیر ارادی طور پر نکل گیا۔

"نہیں تو۔" انہوں نے جلدی سے کہا —— "جو لوگ نئے نئے آتے ہیں، انہیں بڑی تکلیف اٹھانی پڑتی ہے۔ پہلے کوارٹر ملنے میں سات آٹھ سال لگتا تھا لیکن اب تیرہ چودہ سال لگ جاتے ہیں۔"

"پھر وہ لوگ رہتے کہاں ہیں؟"

"اس سے ریلوے کو کوئی مطلب نہیں، درخت کے نیچے رہو یا سڑک پر اور نوکری کرنا ہو تو کرو نہ کرنا ہو نہ کرو اور اس کھڑگپور میں کرایہ کا مکان بھی نہیں ملتا کیونکہ ریلوے کوارٹرز کے علاوہ نجی مکانات بہت کم ہیں۔"

"واقعی؟"

"بالکل۔"

"پھر وہ لوگ رہتے کہاں ہیں؟"

"کسی کے آوٹ ہاؤس میں یا پھر کسی غیر شادی شدہ کے کوارٹر میں۔ غیر شادی شدہ لوگوں کے کوارٹر میں بڑی بھیڑ رہتی ہے اسی وجہ سے نئے اور غیر شادی شدہ ملازم کی حالت بڑی ابتر ہوتی ہے۔ بھیڑ بکریوں سے بھی بدتر۔ کسی دن ان کا کوارٹر دکھانے آپ کو بھی لے جاؤں گا——"

دوسرے صاحب نے کہا —— "اور آپ کو ایک بار ایک نمبر اور دو نمبر کوارٹر بھی دکھانے لے جاؤں گا۔ دیکھئے گا وہ کیا چیز ہے۔ وہ انسانوں کے رہنے کے لئے تیار نہیں کئے گئے۔ پتہ نہیں کس انجینئر نے ان کوارٹروں کو بنایا تھا۔ اس کے گھر بیوی بچے تھے یا نہیں خدا جانے——"

تیسرے صاحب نے کہا —— "آپ کے دیکھنے کی ایک تیسری جگہ بھی ہے۔ میں آپ کو وہاں لے جاؤں گا۔ یہ جگہ اس شہر کے جنوب میں واقع ہے اور اس علاقہ میں ریلوے افسروں کے کوارٹر ہیں۔ دیکھ کر آپ کو حیرت ہوگی بالکل جنت کا نمونہ ہے——"

صاحبِ خانہ نے کہا —— تم ٹھیک کہتے ہو مترا۔ انہیں ایک بار وہاں بھی ضرور لے جاؤ——!"

دوسرے صاحب نے کہا —— "وہاں تو انہیں لے جانا ہی ہوگا۔ ورنہ کنٹراسٹ کیسے تیار ہوگا اور یہ کس طرح سمجھیں گے کہ ہم لوگ کس جہنم میں پڑے ہوئے ہیں اور وہ لوگ کس جنت کا مزہ لے رہے ہیں۔ آپ کی تو شاید وہاں دعوت بھی ہوگی مسٹر باسو کے یہاں۔ پھر تو جانا ہی ہوگا۔ شاید ابھی تھوڑی دیر میں آپ کا بلاوا بھی آجائے گا——"

اور میں نے دیکھا، شہر کا جنوبی علاقہ واقعی جنت کا نمونہ ہی تھا۔ کھلی ہوئی بڑی پُر فضا جگہ تھی۔ فرحت بخش ہوائیں چلتی رہتیں اور چاروں طرف ہری ہری دوب سے بھرے ہوئے لان، پھولوں کے پودے اور منتش درختوں کی قطاریں اور بڑے بڑے دریچوں میں جڑے ہوئے شیشے، ایسا ماحول پیدا کر دیتے کہ آدمی ان میں کھو جاتا —— اندر بہترین قسم کے فرنیچر، لائٹ، قالین اور قیمتی پردے۔ دراصل یہ کوارٹر ہمارے یا آپ کے لئے تیار نہیں کئے گئے تھے —— یہ تو ان انگریزوں کے لئے بنائے گئے تھے جن کی چمڑی سفید تھی —— یہ کوارٹر صرف سفید چمڑی والوں کو الاٹ کئے جاتے تھے —— خواہ وہ ریلوے کے بڑے ملازم ہوں یا چھوٹے —— انہیں تین نمبر یا چار نمبر کوارٹر بھی الاٹ نہیں ہوتے تھے۔ ایک نمبر یا دو نمبر کوارٹر کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا —— اور میں سوچنے لگا —— یہ لوگ کس بے رحمی سے ہمارا خون چوس رہے تھے! ہم لوگ کیا انسان نہیں ہیں —— یا

پھر شام ہو گئی ——

پہلی بیساکھ کی تقریب منانے کے سلسلے میں ایک جلسہ اور اس کے ساتھ "رنگا رنگ" پروگرام تھا۔

پہلے صدر کا انتخاب عمل میں آیا، اس کے بعد استقبالیہ گیت گایا گیا، اس کے بعد دیر تک "روبند رو سنگیت" ہوتا رہا اور بار بار مائیکروفون خراب ہوتا رہا۔ اس کے بعد لوگوں کی تقریر شروع ہوئی۔ "رنگا رنگ" پروگرام اخیر میں رکھا گیا تھا ——

سب سے آخر میں جب میں تقریر کرنے کے لئے کھڑا ہوا تو اس وقت رات کے دس بج رہے تھے۔ جلسے میں بیشمار لوگ شریک ہوئے تھے، کئی ہزار ہوں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس جلسے کے منتظمین بیحد ذہین تھے۔ اگر رنگا رنگ پروگرام پہلے رکھ دیا جاتا تو صدر کی تقریر سننے کے لئے اس وقت تک پنڈال میں ایک آدمی بھی موجود نہ ہوتا۔ اسی لئے انہوں نے سب سے آخر میں "رنگا رنگ" جیسا دلچسپ پروگرام رکھ کر، اس پروگرام کو دیکھنے کے لالچ میں لوگوں کو آخر وقت تک بیٹھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ چھپے ہوئے "پروگرام چارٹ" کے مطابق صدر کی تقریر کے بعد مٹھائی تقسیم ہونا تھی اور اس کے بعد رنگا رنگ پروگرام تھا لیکن ابھی میری تقریر جاری ہی تھی کہ مٹھائی کی تقسیم شروع ہو گئی اور مٹھائی کی تقسیم شروع ہوتے ہی ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔

دو ایک آدمیوں نے ہڑبونگ مچتے دیکھ کر چیخ کر کہا —— "بہت زیادہ ہنگامہ ہو رہا ہے! مٹھائی کی تقسیم بند کر دو ——"

مگر اب کسی کے روکنے سے کہیں مٹھائی کی تقسیم رک سکتی تھی! وہ لوگ یا تو مٹھائی لینے آئے تھے یا "رنگا رنگ" پروگرام دیکھنے، میری بکواس سننے تھوڑا ہی آئے تھے۔

دو ایک بار لوگوں نے تالیاں بجائیں لیکن پنڈال کے عقب میں مٹھائی لینے کے لئے بچوں نے وہ اودھم مچا رکھی تھی کہ تالیوں کا شور بھی اس میں ڈوب کر رہ گیا اور میں اپنی تقریر ختم کر کے بیٹھ گیا۔

اس کے بعد ایک صاحب نے کھڑے ہو کر صدر کا شکریہ ادا کیا اور جلسہ ختم ہو گیا۔

مٹھائی کی تقسیم ابھی جاری تھی کہ ایک صاحب میرے پاس آئے اور بولے ——

"چلئے، آپ بھی ناشتہ کر لیجئے۔ ہیں ہیں —— اس طرف سے —— جی ——"

ان لوگوں نے اچھا ہی انتظام کیا تھا۔ تنقید کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ میں نے بھی تعریف کر دی —— "آپ لوگوں کا انتظام بہت اچھا ہے۔"

میں پنڈال سے باہر آ رہا تھا کہ اتنے میں بھیڑ کے اندر سے ایک لڑکا نکلا اور اس نے میرا پاؤں چھو کر مجھے سلام کیا۔ اس کا چہرہ دیکھتے ہی میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ میرے گاؤں کے ہیرو مچھیرے کا لڑکا کنہائی تھا۔ کنہائی میٹرک پاس کرنے کے بعد مشرقی پاکستان ریلوے میں

کہیں ملازم تھا۔

"تم یہیں ملازمت کر رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، پاکستان سے چلا آیا ہوں، پہلے ایسٹرڈم میں تھا — آپ کو ماں بلا رہی ہے، ادھر کھڑی ہے —"

"تمہاری ماں! یہاں —؟"

مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ کنہائی کی ماں ہمارے محلے میں ہمیشہ سے ہی چوڑا کوٹتی تھی، دھان ابالتی تھی اور مچھلی فروخت کر کے اپنے گھر کا خرچ چلاتی تھی۔ وہ اکھڑ دیہاتن تھی۔ میں ہمیشہ اسے جیٹھ کے مہینے میں صبح کو اٹھ کر آم چننے کے لئے جاتے ہوئے دیکھتا تھا۔ وہ گاؤں کے پیچھے جنگلوں سے بھرے ہوئے آم اور کٹھل کے باغ میں آم چننے جاتی اور اساڑھ مہینے کے وسط تک وہ اسی طرح جنگلوں جھاڑیوں اور جنگلی بیلوں میں الجھتی ہوئی آم چنتی ہوئی دیکھی جاتی اور بادڑ کے کھائے ہوئے آم اکٹھا کرنے کے لئے بھاگی پھرتی۔ گاؤں میں دیسی آم کا موسم جیٹھ مہینے کے آخر میں ختم ہو جاتا ہے، پھر بھی اسے اساڑھ مہینے تک اسی طرح آم چنتے ہوئے دیکھ کر مجھے ہنسی آ جاتی۔

اس کے گھر کا راستہ میری دہلیز کے اوپر سے تھا۔ جیسا کہ عموماً گاؤں وغیرہ میں ہوتا ہے۔ اس لئے وہ ہر روز میری دہلیز پر چڑھ کر آتی اور جاتی تھی۔ وہ جب واپس آتی تو میں اس سے پوچھتا۔ "کنہائی کی ماں! آم ملا؟"

جواب میں وہ مجھے ٹوکری نیچی کر کے دکھا دیتی — "اور آم کہاں ہے دادا ٹھاکر، یہ دیکھئے —"

تقریباً تین چوتھائی بادڑ کے کھائے ہوئے دو چار آم اس کی ٹوکری میں پڑے ہوتے۔

اگر خوش قسمتی سے کسی دن اسے ایک بھی اچھا آم مل جاتا تو مجھ سے کہتی — "یہ آم میں آپ کے لئے لائی ہوں — یہ لیجئے —"

"نہیں نہیں، میں نہیں لوں گا، تم لیتی جاؤ —" میں جواب دیتا۔

مگر وہ میری بات ان سنی کر دیتی اور مجھے زبردستی آم دے کر چلی جاتی۔

گاؤں کے سبھی لوگ کہتے، کنہائی کی ماں بڑی نیک ہے۔ وہ کبھی کسی سے جھگڑا نہیں کرتی تھی اور مچھلی فروخت کرتے وقت اس کی اسی سادگی سے فائدہ اٹھا کر برہمن پاڑا کی چالاک عورتیں اس سے ادھار مچھلی لے لیتیں اور اس کے پیسے وصول کرنے کے لئے اسے چھ چھ ماہ تک چکر کھلاتیں — کبھی کبھی اس کے پیسے بھی مار دیتیں، مگر پھر بھی وہ کسی کی شکایت نہ کرتی اور جس نے ادھار مچھلی لے کر چھ ماہ بعد ایک روز پہلے پیسہ ادا کیا ہو اُسے وہ پھر اُدھار مچھلی دے دیتی —

ہمارے محلے میں رام چیٹرجی کا لڑکا جیلی بچپن ہی میں یتیم ہو گیا تھا اور اس نے رہی غربت اور تنگدستی کی حالت میں کسی طرح میٹرک بھی پاس کر لیا تھا اور ریلوے میں ملازم بھی ہو گیا تھا اور جیلی کی ماں گھر میں اکیلی رہتی تھی۔ گھر کے سامنے کے تالاب میں کسی دن صبح سویرے کنہائی کی ماں برتن مانجھنے جاتی اور دیکھتی کہ برہمن پاڑا کے گھاٹ پر (ایک چھوٹے سے تالاب پر تین گھاٹ تھے) جیلی کی ماں بھگوئی ہوئی دال دھونے بیٹھی ہے۔ اسے دیکھ کر جیلی کی ماں مسکرا کر کہتی — "تم نے سنا، کل رات جیلی آیا ہے —"

"او ماں، یہ کیا؟" وہ جھوٹے برتن چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوئی۔

"کہاں ہے؟ میرا سونا کہاں ہے؟ میرا ہیرا، میرا بیٹا کہاں ہے —؟"

اس نے جیلی کو بچپن میں گود کھلایا تھا۔ اس لئے جب کبھی جیلی گھر آتا، وہ اس پر اپنا سارا پیار، اپنی ساری ممتا وار دیتی۔ اس کی آنکھوں میں ماں

کی شفقت چھلک اٹھتی ـــ وہ جیلی کے لئے ایک بڑی سی لوکی مچھلی لے آتی۔ اپنی گائے کا دودھ دوہ کر اسے دے آتی اور باریک چاول کا چوڑا کوٹ کر رکھتی اور جب جیلی اپنی ملازمت پر واپس جانے لگتا وہ گٹھڑی میں باندھ کر اس کے ساتھ کر دیتی ـــ

اور میں اس کی ممتا کا یہ تماشا بہت دنوں تک دیکھتا رہا تھا۔

وہی کنہائی کی ماں اب یہاں آگئی تھی ـــ

وہ جو کبھی جیسور ضلع کے ایک چھوٹے سے گاؤں سے کبھی راناگھاٹ بھی نہیں گئی تھی، وہی آج سات سمندر تیرہ ندی پار کر کے کھڑگپور آگئی تھی بانس کے جھاڑوں سے گھری ہوئی اپنی مچھیروں کی بستی اور اپنا پھوس کا مکان چھوڑ کر آج وہ بیٹے کے پاس چلی آئی تھی۔

کنہائی کی ماں مجھے دیکھ کر آگے بڑھ آئی اور مسکراتے ہوئے بولی ـــ "ہمارے دادا ٹھاکر کتنی دور آکر لکچر دیتے ہیں! آج کنہائی نے بتایا تھا کہ جلسہ میں دادا ٹھاکر کا لکچر ہوگا۔ میں نے کہا، مجھے بھی لے چل، بہت دن ہوگیا ہے دیکھے ہوئے۔ کتنا اچھا لکچر دیتے ہیں آپ ـــ"

اتنا کہہ کر اس نے میرا پاؤں چھو کر پرنام کیا۔ عمر میں وہ مجھ سے بڑی تھی، میری دیدی کے برابر۔ لیکن میں برہمن تھا۔ اگر مچھیرے کی بیوی کی عمر اس سے بھی زیادہ ہوتی تو بھی وہ مجھے اسی طرح پرنام کرتی۔ یہی گاؤں کا اصول ہے۔

میں نے کہا ـــ "اچھی تو ہو کنہائی کی ماں ـــ؟"

"آپ کی دعا سے اچھی ہی ہوں۔ بہو دیدی کہاں ہے؟ بچے سب اچھے ہیں نا؟"

"ہاں سبھی خیریت سے ہیں ـــ ان دنوں کلکتہ میں ہیں ـــ"

"آپ اپنے گاؤں نہیں جاتے؟"

"اس درمیان ایک بار گیا تھا، دو مہینے پہلے ـــ"

وہ اسی طرح بے چین اور پیارے لہجے میں بولی ـــ "گاؤں کے لوگ کیسے ہیں ـــ بتایئے؟"

اتنے میں جلسے کے ایک کارکن آکر میری یاد دہانی کراتے ہوئے بولے ـــ "مہربانی کر کے آپ ضرور تشریف لائیں، نئے سال کی خوشی میں ہم لوگوں نے مسٹر باسو کے یہاں ایک ڈنر پارٹی کا انتظام کیا ہے ـــ"

لیکن نہ جانے کیوں میرا دل چاہا کہ میں انکار کر دوں۔ میں ان لوگوں کے لئے ہزاروں ڈنر پارٹیاں چھوڑ سکتا ہوں۔ سارے کھڑگپور شہر میں، اتنے سارے مہذب، تعلیم یافتہ، ذی مرتبہ اور شرفاء کے درمیان مجھے وہ گاؤں کی جاہل اور گنوار مچھیرن اس لمحہ سب سے زیادہ اپنی محسوس ہوئی۔

کنہائی کی ماں نے کہا ـــ "یہ نہیں ہوگا ـــ یہ کیا دادا ٹھاکر؟ آپ ہمارے گھر نہیں جائیں گے؟ میں آپ کو چھوڑ دوں گی؟ میرے گھر میں آپ کے قدموں کی دھول نہیں جائے گی؟"

"چلو، واہ، جاؤں گا کیوں نہیں ـــ"

ادھر ان لوگوں نے کہا ـــ "یہ کیا سر؟ اس وقت آپ جائیں گے تو یہ لوگ آپ کو کھلائے بغیر آنے دیں گے ـــ؟ آپ نہ جائیں ـــ"

میں نے جواب دیا ـــ "کوئی بات نہیں، مجھے زیادہ دیر نہیں ہوگی۔ ابھی آرہا ہوں، گاؤں کے لوگ ہیں ضد کر رہے ہیں ـــ"

میں نے ان دونوں کے ساتھ ان کے کوارٹر تک جا کر دیکھا۔ وہ دو نمبر کوارٹر تھا۔ کم تنخواہ پانے والے ملازم کو دو نمبر کوارٹر ہی الاٹ ہوتا تھا۔ کنہائی کی ماں نے مجھے لے جا کر اپنے کوارٹر میں بٹھایا۔ دو چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔ ایک باورچی خانہ، ایک برآمدہ ـــ یہ دو نمبر کوارٹر تھا۔

بیساکھ کی تیز دھوپ میں کمرے کے اندر گرمی کا کیا عالم تھا وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ جیل کی کال کوٹھڑی بھی اس کمرے سے یقیناً بہتر ہوتی ہوگی۔ کمرے میں ہلنے ڈولنے کی بھی جگہ نہیں تھی۔ اس کے علاوہ اس کے اندر نہ ہوا کا گذر تھا نہ روشنی کا۔ دم گھٹنے لگتا تھا۔ ان دو کمروں میں سے ایک کمرہ سجا ہوا تھا جو کی پر ایک سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔ چھوٹی سی ایک میز پر ایک سستا سا ٹائم پیس رکھا ہوا تھا۔

میں بچپن ہی سے دیکھتا آیا تھا کہ ہیرو مچھیرا بانس کے ٹاپے سے مچھلیاں پکڑتا اور ٹوکری میں رکھ کر ہاٹ میں جاکر فروخت کرتا۔ کنہائی کی ماں ٹین کے کنستر میں دن دن بھر آم کے پیڑ کے نیچے آنگن میں بیٹھی دھان ابالتی رہتی ——— بہت غریب تھے یہ لوگ۔

کنہائی کی بیوی نے آکر مجھے سلام کیا۔ بولی ——— "تشریف رکھئے، میں آپ کے لئے چائے تیار کرتی ہوں"

حیرت ہے یہاں آکر ان لوگوں نے چائے پینا بھی شروع کر دیا ہے ———

کنہائی کی ماں نے شفقت بھرے لہجے میں کہا ——— "کنہائی نے ایک گھڑی خریدی ہے۔ آپ نے دیکھا دادا ٹھاکر"؟

میری نگاہ اس سستے ٹائم پیس پر جاکر رک گئی۔ میں نے ٹائم پیس کو اٹھا کر اسے چند لمحوں تک الٹ پلٹ کر دیکھا اور تعریف کی ——— "واہ یہ تو بہت اچھا ٹائم پیس ہے!"

"کنہائی نے سب کچھ کر لیا ہے دادا ٹھاکر ———"

"واقعی، یہ کمرہ بھی بالکل سجا ہوا ہے، دیوار پر کیا ٹنگا ہوا ہے؟"

"بہو نے بنایا ہے۔ سیپی سے بنایا ہوا پھول ہے ———"

"واہ۔ بہو نے بہت خوبصورت بنایا ہے ———"

"بنانے کی بہتیں؟ بہت اچھے گھر کی لڑکی ہے، گانا بھی جانتی ہے، بہت اچھا گاتی ہے ——— ہاں ———"

"گانا ——— ؟"

"ہاں، ہیکس بجاکر ———"

"ہارمونیم؟" میری حیرت بڑھتی جارہی تھی۔

"گانا سنئے گا دادا ٹھاکر؟ اے بہو، چائے بنا کر دادا ٹھاکر کو گانا بھی سنا دو۔ آج میرے لئے کتنی خوشی کا دن ہے۔ دادا ٹھاکر کے قدموں کی دھول میرے گھر میں آئی ہے"

مجھے یہ سب دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کنہائی کی ماں، کنہائی اس طرح ترقی کرے گا، یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔"

کنہائی کی ماں نے آنچل سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا ——— "دعا دیجئے دادا ٹھاکر کہ میرا کنہائی زندہ رہے۔ دونوں شام دو مٹھی آرام سے کھائے ——— آپ تو جانتے ہیں، اس کے باپ کے مرنے کے بعد میں نے کتنی مصیبت اٹھا کر اسے پالا ہے۔ کنہائی اس وقت ایک برس کا تھا۔ اس کے لئے میں نے کتنے دکھ سہے ہیں۔ لوگوں کا دھان ابال کر، چوڑا کوٹ کر، برتن مانجھ کر میں نے اس کی پرورش کی ہے۔ وہی کنہائی آج مجھے بھی اپنے پاس لے آیا ہے، شادی کی ہے، گھڑی خریدا ہے، کرسی خریدی ہے، چائے پیتا ہے ...."

میں نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا ——— "تم ٹھیک کہتی ہو، اس کی کیا بات ہے ———"

اتنے میں میرے لئے بازار سے ناشتہ لے کر کنہائی آگیا اور کنہائی کی بیوی نے ایک پلیٹ میں گوٹری، رس گلا اور نمکی لاکر میرے سامنے رکھ دیا۔

بولی —— "کھا کر دیکھئے، پکوڑی میں نے خود تیار کی ہے ——"

پھر کنہائی کی ماں چائے لے کر آئی، بولی —— "یہ پیالی کنہائی نے خریدی ہے، اچھی ہے دادا ٹھاکر؟"

"بہت اچھی ہے، بہت خوبصورت ——"

کنہائی شرمندہ سا ہو گیا۔ اس نے کہا —— "ماں، تم ذرا اس طرف جاؤ، کاکا بابو کے لئے پان لے آؤ۔"

مگر اس بے چارے کو کیا معلوم تھا کہ اس کی ماں نے اس کی غیر حاضری میں مجھے کیا کچھ بتا دیا تھا اور کیا کچھ ابھی بتانے والی تھی۔ لیکن اس میں کنہائی کی ماں کی کیا خطا تھی۔

پھر وہ گانا سنانے کے لئے اپنی بہو کو پکڑ کر لے آئی اور جب وہ ہارمونیم لے کر بیٹھی تو میں نے پوچھا۔ "یہ ہارمونیم بھی کیا کنہائی نے خریدا ہے؟"

"نہیں دادا ٹھاکر۔" کنہائی کی ماں نے جواب دیا —— "بہو گانا سنانے کے لئے پڑوس سے مانگ کر لائی ہے۔"

اس کے بعد کنہائی کی بیوی نے گانا سنایا اور مجھے تسلیم کرنا پڑا کہ وہ اچھا گاتی ہے۔

اور جب میں آنے لگا تو کنہائی کی ماں نے پوچھا —— "میری بہو کیسا گاتی ہے؟"

"بہت اچھا، بہت اچھا گاتی ہے ——"

کنہائی نے کہا —— "ماں، تم اس طرف جاؤ۔ کاکا بابو کو دیر ہو رہی ہے، میں انہیں پہنچا کر آتا ہوں۔"

اور میں ان لوگوں سے رخصت ہو کر چلا آیا۔ کنہائی کی ماں مجھے گلی کے موڑ تک چھوڑنے آئی۔

وہ بہت خوش تھی۔ میں اس کے یہاں آیا تھا اور چائے پی تھی۔ یہ بات اس کے لئے کیا کچھ کم تھی۔ اگر وہ گاؤں میں ہوتی تو کیا یہ ممکن تھا ——

اسے اس بات کی بھی خوشی تھی کہ آج کنہائی نے اتنی ترقی کی تھی، اتنا بڑا ہو گیا تھا۔

وہ بار بار مجھ سے کہہ رہی تھی —— "اگر آپ گاؤں جائیں دادا ٹھاکر، تو سب لوگوں کو میرے بارے میں بتایئے گا، میں تو بہت دنوں سے گاؤں نہیں گئی۔ ایک برس ہو رہا ہے، اساڑھ مہینے میں یہاں آئی تھی۔ گاؤں بہت یاد آتا ہے، میرے آنگن میں جو امرود کا پیڑ ہے اس میں امرود پھلے ہوں گے، اب کے کون کھائے گا، کون جانے؟"

اس کے بعد مسٹر باسو کے یہاں ڈنر پارٹی میں جا کر دیکھا، بڑی رونق تھی۔ چاپ، کٹلٹ، پائس، کھیر، آم، سندیش —— انواع و اقسام کی چیزوں کی افراط تھی۔ تمام چیزیں خوش ذائقہ اور لذیذ تھیں۔ افسر کالونی کا یہ سب سے بڑا بنگلہ تھا۔ ٹینس لان میں ہری ہری دوب تھی، پھولوں کے پودے تھے۔ گیٹ پر عشق پیچاں کے پھولوں کے گچھے جھول رہے تھے۔ مسٹر باسو کی لڑکی نیلیما نے اسراج بجا کر سنایا، رویندر سنگیت گا کر سنایا، چھوٹی لڑکی رونو نے ایک انگریزی نظم پڑھ کر سنائی۔ اس کے بعد دونوں بہنوں نے مل کر "رام دھن" گایا جسے سبھوں نے پسند کیا۔ وہ دونوں بہنیں شانتی نکیتن میں تعلیم حاصل کر رہی تھیں اور دیکھنے میں بھی بے حد خوبصورت تھیں۔

لیکن کھانے کی میز پر بیٹھنے کے بعد بار بار میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں کنہائی کی ماں کے یہاں جا کر دیکھ آؤں کہ اس سستے سے ٹائم پیس میں کیا بجا ہے ——!

مسز ویل ویل

عُمر

دو کمروں کا چھوٹا سا فلیٹ۔ دن میں ایک کمرہ ڈرائنگ روم بن جاتا ہے اور رات میں پرانے شوہر اور نئی بیوی کا بیڈ روم۔ کمرے میں صوفہ سٹ ہے۔ چھوٹی سی سنٹر ٹیبل ہے اور کونے میں رکھے ہوئے سائڈ ٹیبل پر پلاسٹک کے پھولوں سے بھرا ہوا پاسنا گلاس کا خوبصورت گلدان۔ دیوار سے لگا ہوا دیوان ہی رات کو پلنگ کا کام دیتا ہے۔

دوسرے کمرے میں دنیا بھر کا سامان ہے۔ نیا بھی پرانا بھی۔ اور اسی طرح بیٹیاں بھی ہیں۔ نئی بھی، پرانی بھی۔ ربینا، نینا نئے خریدے ہوئے شیشے کے گلاسوں کی طرح چمکتی ہیں اور پرانی بیوی کی پرانی بیٹی انیتا کو دیکھ کر دھوئیں سے دھندلے ہو جانے والے باورچی خانے کا خیال آتا ہے۔ ہاں عمر کے تقاضے سے کبھی کبھی یہ چیز ضرور آنکھوں میں کھٹکتی ہے کہ اس دھندلے پن میں نہ دب سکنے والی لو بھی کبھی چمک اٹھتی ہے اور اس وقت وہ لو اتنی تیز جلتی ہیں، جل کر سب کچھ خاک سیاہ کر دینے کے لئے گویا کمر کس کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ نئی ماں کی جانبداری جب برداشت کی حدوں کو توڑ دیتی ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ اتنے پھنسے ہوئے بلاؤز کی مانند اس گھر کے تمام بندھنوں کو بھی توڑ کر رکھ دے اور کہیں بھاگ جائے۔

عمر بڑھ گئی ہے مگر بلاؤز اب بھی وہی ہے جو جسم کے ہر حصے کو کس کر نہایت کریہہ تصویر آنکھوں کے سامنے پیش کر دیتا ہے اس نے اکثر للچائی نظروں سے ربینا اور نینا کے صاف شفاف اور زرق برق کپڑوں کو دیکھا ہے۔ موقع ملنے پر انہیں چھو کر بھی دیکھا ہے۔ صرف پہنا نہیں ہے۔ پہننے میں اسے اس لئے ڈر نہیں لگتا کہ پکڑی جائے گی تو اس کی پٹائی ہو گی بلکہ یہ خیال دامنگیر ہوتا ہے کہ انہیں پہن کر پھر اپنے پرانے اور معمولی کپڑے پہننے کی خواہش قابو سے باہر ہو جائے گی۔ اپنے پھٹے پرانے کپڑوں کو دیکھنے کو جی ہی نہیں چاہتا۔ مگر اس کی خواہش پر جب کوئی توجہ دینے والا ہی نہیں تو اسے مارے رکھنے ہی میں فائدہ ہے۔ اسے ماں کی موت تو یاد نہیں لیکن ہاں پتا کب مرے یہ اسے بخوبی یاد ہے۔ نئی ماں جس روز گھر آئی تھی اس روز وہ ہر سال اپنے زندہ مردہ باپ کی یاد میں دل ہی دل میں کچھ گنگنا لیتی ہے۔

گھر کا کام بھی ہے اور باہر کا کام بھی۔ گھر میں کوئی ملازم نہیں ہے۔ ملازم کا کام اسے کرنا پڑتا ہے۔ مگر تنخواہ کے نام پر اسے پھوٹی کوڑی بھی نہیں ملتی۔ اپنے کو اس گھر کی بیٹی کے بجائے ملازمہ ہی سمجھنے لگی۔ اسی لئے بارہا اس کا جی چاہا کہ وہ بھی کہے کہ یا تو سارا کام کرنے کی تنخواہ دو ورنہ اپنا کام سنبھالو۔

لیکن بس یہ کہا نہیں جاتا اور وہ منہ بند کئے کام کرتی جاتی ہے۔ دن پر دن، سال پر سال گذرتے گئے۔ بچی سے بڑی اور بڑی سے اب اتنی بڑی ہو گئی ہے کہ اب اپنے اندر ہونے والی بعض تبدیلیوں سے ادھر وہ بہت کھنچی کھنچی سی رہنے لگی ہے۔ ہر چیز میں تاک جھانک کرنے کی

ہر کسی سے بات کرنے کی ایک عجیب سی خواہش اس کے دل میں زور پکڑتی جاتی ہے۔ ادھر کچھ دنوں سے ہمسایہ مہرا صاحب کے ڈرائیور سے بلا سبب ہنس ہنس کر بات کرنے لگی ہے۔ گھر میں کسی کے نہ رہنے پر اسے دو ایک بار بلا کر چائے بھی پلائی ہے اور اس کے دیئے ہوئے کچھ تحائف کو اس نے کچن کے ایک خالی ڈبے میں رکھ بھی لیا ہے۔

گذشتہ کئی روز سے اس پر ایک عجیب سا جنون سوار ہو گیا ہے اور اسی سبب سے دن بھر کے کام سے تھک کر چور ہو جانے پر بھی راتوں کو اسے نیند نہیں آتی۔ ریتا اور نیتا کبھی کی سو چکی ہیں اور وہ زمین پر بچھی دری پر آنکھیں بند کئے پڑی ہوتی ہے۔ جب بھی آنکھیں کھول کر دیکھتی ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ کمرے کی تاریکی آنکھوں میں سمانے لگی ہے۔ گھپ اندھیرے میں کمرے میں رکھی ہوئی ہر چیز کی ایک دھندلی سی شکل اس کی نگاہ میں آتی ہے اور وہ اسے واضح شکل میں دیکھنے کا تصور کرتی ہے۔ کونے میں رکھی ہوئی الماری صرف ریتا اور نیتا کے ایک سے ایک عمدہ فراکوں سے بھری ہوتی ہے۔ ماں جب بھی الماری کھولتی ہیں تو اس کی آنکھیں ہر چیز کو اپنے میں سمو لینے کی کوشش کرتی ہیں اور اس کے ہاتھوں کا ایک ایک ریشہ گویا ان کپڑوں پر پھسل پھسل کر ٹوٹنے لگتا ہے۔

ریتا نیتا دن بھر میں چار بار کپڑے بدلتی ہیں اور وہ دو دن میں ایک بار کیونکہ خرچ کا بھی تو خیال ہے۔ روز روز دھونے سے صابن بھی خرچ ہوتا ہے اور کپڑے بھی پھٹتے ہیں۔ اخراجات کی بھی تو کوئی حد نہیں ہے۔ کہیں تو تخفیف کرنی پڑتی ہے۔ چنانچہ یہ تخفیف انیتا کے سلسلے میں کی جاتی ہے۔

کھڑکی کے پاس رکھی ڈریسنگ ٹیبل پر لگے آئینے میں اس تاریکی میں بھی وہ اپنا ایک دھندلا سا عکس دیکھ رہی تھی۔ ڈریسنگ ٹیبل کے پاس رکھے ہوئے چھوٹے سے اسٹول پر بیٹھ کر نئی ماں کو میک اپ کرتے دیکھنا اور درمیان میں بار بار کام چھوڑ کر ان کے احکام کی تعمیل میں دوڑنا اس کا معمول بن گیا تھا۔

"انیتا، ذرا دیکھ تو پیچھے سفید بال تو نہیں ہے؟"

سچ بتانے پر سفید بال توڑنے پڑیں گے اور گیس پر رکھی ہوئی سبزی جل جائے گی تو مار کھانی پڑے گی۔ اس لئے وہ جھوٹ بول دیتی—

"ایک بھی نہیں ہے ممی۔"

"گڈ۔ ذرا پرے ہٹ کر کھڑی ہو کمبخت میں کتنی باس آتی ہے۔"

اور انیتا دل ہی دل میں ہنس پڑتی ہے۔ نئی ماں سے اگر وہ کہہ دیتی کہ سر میں سیاہ بال کم اور سفید بال زیادہ ہیں تو بدبو بھول کر وہ اس سے بال نکلوانے بیٹھ جاتیں۔ لیکن چونکہ اب اس کے جھوٹ نے انہیں مطمئن کر دیا ہے، اس کے کپڑوں سے آنے والی بدبو ان کے لئے ناقابلِ برداشت ہو رہی ہے۔

اندھیرے میں اس نے پلکیں جھپکائیں۔ نئی ماں کتنی جانفشانی سے سیاہ پنسل لے کر اپنے ابروؤں کو کمان کی شکل دیتی ہیں اور کتنی صفائی سے گہرے رنگ کی لپ اسٹک کی تہ کو جب وہ یکساں چڑھاتی ہیں تو اسے نہ جانے کیوں بلی کے منہ میں دبے ہوئے زخمی چوہے کے جسم سے ٹپکتا ہوا خون یاد آنے لگتا ہے۔

"میرے بلاؤز پر آئرن کیا یا نہیں انیتا؟"

"ابھی کرتی ہوں ممی۔"

استری کیا ہوا بلاؤز لے کر آنے سے پہلے ماں اپنا بلاؤز کھول کر آئینے کے سامنے تن کر بیٹھ جاتی ہیں اور آئینہ میں ان کا عکس اس کے دل میں

پھریری سی اٹھا دیتا ہے۔

اس کا ہاتھ نادانستہ طور پہ اس گہری تاریکی میں اپنے پورے جسم پر پھر گیا تو ایک عجیب سی سنسنی اس کے جسم میں دوڑ گئی۔ اس نے ریتا، نیتا کی طرف دیکھا، وہ اب بھی اسی طرح ایک دوسرے سے لپٹی ہوئی سو رہی تھیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی پھر آہستہ آہستہ قدموں سے آئینے کے پاس آئی۔

آئینے میں اب اس کا عکس زیادہ صاف نظر آ رہا تھا۔ اس نے اپنے جسم کو خم دیا ٹھیک اسی طرح جیسے ساری پہن کر ماں اپنے آپ کو آئینے میں دیکھتی تھیں اور اپنے جسم کی گھٹن سے مطمئن ہو کر پلو کو تھوڑا اور بیچ میں کھسکا دیتی تھیں تاکہ ان کا گداز پن لوگوں کی نظروں میں آ سکے۔

انیتا کے پھنسے ہوئے بلاؤز میں ایک گھٹن سی تھی۔ اسے محسوس ہوا کہ اگر وہ گہری سانس لے گی تو اس کے بلاؤز کے ہک ٹوٹ جائیں گے۔ اس نے بلاؤز کے ہک کھول دیئے اور گہری سانس لی۔ تنگ بلاؤز کی گھٹن سے آزاد ہو کر اس کے دل کو بڑی راحت کا احساس ہوا۔ پھر فوراً خوفزدہ نظروں سے ریتا اور نیتا کی طرف دیکھا۔ وہ گہری نیند میں ڈوبی تھیں۔ اس کا جی چاہا کہ خود کو پوری آزادی سے آئینے میں دیکھے مگر عین اسی وقت نئی ماں اور پاپا کے کمرے میں کچھ جھنجھناہٹ سی ہوئی اور بلاؤز کھولنے کے لئے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ وہیں رک گئے۔ وہ پھر دبے پاؤں دری پہ آ کر لیٹ گئی اور تیز نظروں سے بند دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔

نئی ماں ہمیشہ اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے سوتی تھیں اور انیتا کے دل میں انہیں دیکھنے کا شوق تیز تر ہوتا جا رہا تھا۔ جب بھی کبھی وہ دونوں کو پلنگ پر بیٹھے ہوئے دیکھتی تو اس کے تصور میں عجیب عجیب سین ابھرنے لگتے اور جسم میں چیونٹیاں رینگنے لگتیں اور ایسے موقعوں پہ وہ انہیں کے آس پاس رہ کر یہ دیکھنے کی کوشش کرتی کہ اب وہ کیا کریں گے۔

رات کے اندھیرے میں بند دروازے کو ہاتھوں کے دھکے سے دھکیل کر اس نے بارہا یہ جاننے کی کوشش کی تھی کہ دروازہ کہیں کھلا ہوا نہ ہو یا غلطی سے وہ کبھی اندر سے بند کرنا بھول گئی ہوں اور وہ دیکھ لے۔

اس نے چور نظروں سے گہری نیند میں ریتا، نیتا کی طرف دیکھا اس کی طرح وہ کبھی رات میں الّو کی طرح کمرے میں چکر نہیں لگاتیں، کبھی دوسرے کمرے میں سوئے ہوئے ماں باپ کو دیکھنے کی خواہش ان کے دل میں نہیں پیدا ہوتی۔ کیا اس کا سبب اس کی نیم خام یا نیم پختہ عمر ہے؟ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ بے سبب اور بے معنی اشتعال اسی میں کیوں پیدا ہوتا ہے۔

وہ پھر اٹھ بیٹھی۔ سانس روک کر اس نے کچھ سننے کی کوشش کی۔ پھر آہستہ سے اٹھ کر دروازے کے پاس آئی۔ کواڑ اندر سے بند نہ ہوئے تو؟ اس کے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی اور پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ اس نے کواڑ کو دھکا دیا اور حیران رہ گئی۔

بغیر کوئی آواز کئے کواڑ آہستہ سے کھل گئے۔ انیتا کی چھاتی میں کچھ پھٹ سا پڑا اور جسم کانپ اٹھا۔ اس ذرا سی درز سے اس نے اندر دیکھا۔ اندھیرے میں پہلے تو کچھ نہ دیکھ سکی پھر سب کچھ صاف نظر آ گیا۔ اس کی آنکھیں باہر نکل آئیں اور منہ کے اندر زبان بالکل خشک ہو گئی۔ اسے محسوس ہوا گویا اس کے پیروں سے جان نکل گئی ہے اور پیٹ کی نسیں عجیب طرح سے مڑ گئی ہیں۔

"ای ڈیڈی! مجھے ایک گلاس پانی دو۔"

وہ چونک کر ہٹ گئی اور اس طرح پلنگ کے پاس آئی گویا ابھی اٹھی ہو۔

"کیا پیاس لگی ہے نینو؟"

"ہاں ڈیڈی۔"

"ٹھہر پانی لاتی ہوں۔"

نیتا کو پانی دے کر اس نے خود بھی لوٹا بھر کر پانی پی ڈالا۔ پھر بھی اسے محسوس ہوا کہ پیٹ کے اندر مڑتی کھنچتی آنتیں جلتی جا رہی ہیں۔ وہ دری پر اگر لیٹ گئی اور اپنے اندر مڑتی کھنچتی، اٹھتی بند ہوتی سرسراہٹ میں جکڑی بھی نہ جانے کب سو گئی۔

دوسرے دن وہ بھی، پاپا سے بچتی رہی۔ انہیں دیکھتے ہی اس کا چہرہ لال ہو اٹھتا۔

دوپہر کو سب کے چلے جانے پر اس نے ماں کا پوڈر اچھی طرح منہ پر لگایا اور ساری کے نیچے اپنے بلاؤز کو کچھ ڈھیلا کر لیا۔ ہاں یہ ٹھیک معلوم ہوتا ہے سانس بھی ٹھیک سے آتی ہے اور اپنے کو آئینہ میں دیکھ کر ایک سرسراہٹ بھی محسوس ہوتی ہے۔

"انیتا!"

دروازے میں ہیرا صاحب کا ڈرائیور کھڑا تھا۔ اسے دیکھتے ہی انیتا کو رات کا منظر یاد آگیا۔ اس کی نسیں کھنچنے لگیں اور چہرہ آگ کی طرح گرم ہو اٹھا۔

"اندر آؤ نا۔"

ڈرائیور ادھر ادھر دیکھ کر اندر آگیا۔

"پکچر چلوگی؟"

اس کے جسم میں کچھ سرسراہٹ سی ہوئی اور اس نے ساری کا پلہ کچھ کس لیا۔

ڈرائیور نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اپنی طرف کھینچا تو پہلے تو جی میں آیا وہ بھی وہی سب کچھ دہرائے لیکن پھر ڈر گئی اور ہاتھ کھینچ کر پیچھے ہٹ گئی۔

وہ ہنسا ــــ "ڈرتی ہے انیتا؟"

ہاں شاید ڈرتی ہی ہے۔ جسے کبھی کہیں سے کسی کا پیار نہیں ملا کبھی کسی کی شفقت نہیں ملی۔ اسے اس شخص سے نہیں رجانے کیوں اپنے دل ہی سے خوف محسوس ہونے لگا۔ ابھی تو اس نے بہاؤ کر باندھ رکھا ہے۔ کہیں چھوٹ دی تو؟

"یہاں آ نا انیتا۔ دیکھ میں تیرے لیئے کیا لایا ہوں۔"

انیتا نے دیکھے بغیر کہا۔ "مجھے نہیں چاہیئے۔ تو چلا جا یہاں سے۔ اور اب کبھی گھر کے اندر مت آنا۔"

اس نے اسے دھکیل کر کمرے سے باہر نکال دیا اور ایک جھٹکے سے دروازہ بند کر لیا۔

عشرت نقوی

خول

اور چند ہی دنوں بعد فرحت کو احساس ہو گیا کہ وہ لکھڈی کے بیکار دھاگوں کی طرح الجھتی جا رہی ہے۔ معاشیات پڑھانا اس کے بس میں نہیں رہا۔ وہ خود ECONOMETRICS کا سوال بنتی جا رہی ہے۔ MULTIPLIAR کا الجھا ہوا مسئلہ بن کر رہ گئی ہے۔ اسے بول اور کینڈال کی کتابیں کاٹنے کو دوڑنے لگیں۔ مالتھس اس کی نگاہوں میں چمگادڑ کی طرح لٹکنے لگا۔ وہ شماریات کی جمع تفریق میں الجھ کر رہ جاتی۔ آدم سمتھ، پینسر، کارلائل اور مارشل کے نظریات اسے بکواس، فضول نظر آنے لگے۔ وہ پڑھاتے پڑھاتے الجھ جاتی۔ خیالات کا تسلسل ٹوٹ جاتا اور اسے میز پر پڑی ہوئی فائل اٹھانا پڑ جاتی۔

آج اسے پڑھاتے ہوئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ اس کی آنکھوں میں دھوئیں کی باریک سی تہہ رقص کرنے لگی۔ دیوار میں جڑے ہوئے سیاہ پتھر بھی دھندلا گئے۔ چاک سے لکھے ہوئے سفید ہندسے آہستہ آہستہ مدھم ہوتے گئے اور وہ بھول گئی کہ میں کیا پڑھا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر آنسوؤں کی طرح پسینے کے قطرے جھلملانے لگے۔ ہاتھ میں تھاما ہوا انگلیوں کی مانند چاک کانپنے لگا۔ اس نے جلدی جلدی پلکیں جھپکائیں۔ ماتھے پر دو تین دفعہ ہاتھ مارا اور سیاہ رنگ کے بورڈ پر نظریں گاڑ دیں۔ چاک سے لکھے ہوئے چھوٹے چھوٹے ہندسے زمردی آنکھوں میں تبدیل ہونے لگے اور پھر تمام بورڈ پر سبز رنگ کی سینکڑوں چھوٹی چھوٹی آنکھیں اسے گھورنے لگیں۔ جن میں غصہ تھا۔ آگ کی تپش تھی۔ بے قراری تھی۔ انتقامی جذبہ تھا۔ اور پھر یہ آنکھیں پھیلتی گئیں اور ان گنت بلیاں اس پر غرانے لگیں اور پھر جیسے تمام کمرہ چیخنے لگا۔ پھک پھک کرتا پنکھا چیخنے لگا۔ حیرانی سے دیکھتی ہوئی لڑکیاں چیخنے لگیں۔ اس نے بے چارگی سے لڑکیوں کی طرف دیکھا۔ میز پر رکھی ہوئی کتابوں پر نظر ڈالی تو اسے میز پر نوزائیدہ بلی کے بچے دکھائی دیئے۔ اس کا دماغ بھائیں بھائیں کرنے لگا۔ سر چکرانے لگا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرے کی دبیز چادر تن گئی۔ ڈسٹر اور چاک کانپتی انگلیوں سے زمین پر گر پڑے۔ وہ دیوار کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے کان اب بھی چیخیں سن رہے تھے۔ یکایک وہ بے چین سی ہو کر بورڈ کو دیکھنے لگی۔ اسے محسوس ہوا جیسے کوئی دبی دبی سسکیاں لے رہا ہو اور پھر ایک لمبی چیخ اس کے منہ سے نکل گئی۔ بلیک بورڈ پر لکھے ہوئے سفید ہندسے خون کے دھبوں میں تبدیل ہونے لگے اور پھر خون کی بیشمار لکیریں ایک دوسرے میں تیزی سے مدغم ہونے لگیں۔ اور چاروں طرف خون ہی خون پھیلتا چلا گیا اور یہ خون گوشت کا ایک لوتھڑا بن گیا اور پھر یہ مدھم ہوتا ہوا صفر کا ہندسہ بن گیا۔

فرحت ہسٹریائی انداز میں کچھ بڑبڑائی۔ اس نے زمین سے ڈسٹر اٹھایا اور بلیک بورڈ پر لکھی ہوئی تمام تحریر کو مٹا ڈالا۔ پھر اس نے میز پر سے فائل اٹھائی اور لڑکھڑاتی ہوئی چال سے باہر نکل گئی اور کسی کو بتائے بغیر گھر آ گئی۔

اس نے کتابوں کو میز پر پھینکا اور بے سدھ ہو کر مسہری پر گر پڑی۔ اس کا ذہن بالکل کام نہ کر رہا تھا۔ وہ کافی دیر تک اسی طرح پڑی رہی۔

یہ بلّی تو وبالِ جان بن گئی ہے۔ جب دیکھو سائے کی مانند پیچھا کرتی رہتی ہے۔ پڑھنے بیٹھو تو کتاب کے لفظوں سے گھورنے لگتی ہے۔ پڑھانے لگو تو ڈائن کا سا تھوتھنا لئے کر بلیک بورڈ پر آمرتی ہے۔ ایک تو کم بخت نے سارے گھر میں گندگی پھیلائی۔ کالے کلوٹے کیڑے ہوتے بچے جن دیئے بے شرم نے سب کے سامنے اور پھر لگی چاٹنے جیسے بڑے ہو کر یہی مقابلۂ حسن میں حصّہ لیں گے۔ حکومت کریں گے۔ معاشیات پڑھائیں گے۔ لیکن۔ لیکن شاید میں نے ظلم کیا ہے اس پر۔ جبھی تو وہ میرے پیچھے لگی رہتی ہے۔ کھا جانے والی نظروں سے گھورتی ہے۔ ٹھیک ہی تو ہے۔ آخر اتنی بڑی سزا کی وجہ؟ یہ ظلم ہی تو ہے کہ دو دن بھی نہیں ہوئے تھے بچوں کو آنکھیں کھولے۔ ابھی انہوں نے اچھی طرح ماں کو بھی نہیں دیکھا تھا۔ جی بھر دودھ بھی نہیں پیا تھا پوری طرح۔ اور میں نے انہیں پڑوسیوں میں بانٹ دیا۔ کیسے کیسے روتی ہے بیچاری۔ بولائی بولائی پھرتی ہے پاگلوں کی طرح سارے گھر میں۔ اب تو میرے پاؤں بھی نہیں چاٹتی۔ میرے پاس بھی آکر نہیں بیٹھتی۔ شاید اسے مجھ سے نفرت ہو گئی ہے۔ نفرت نہیں تو کیا محبت ہو گی؟ کیسے چمٹے رہتے تھے وہ اس کے سینے سے اور بلی بھی کیسی بے جان ہو کر پڑی رہتی تھی۔ کتنا پیار کرتی تھی وہ بچوں سے ——— وہ بے چین ہو کر اٹھ بیٹھی۔ اس کی آنکھوں میں ماں کی تصویر گھومنے لگی۔

اس دن امّی کو بھی کتنی تکلیف تھی۔ بالکل اس بلی کی طرح تڑپی تھیں۔ ان کے ہونٹوں سے بھی خون بہنے لگا تھا جو دانتوں سے کٹ گئے تھے۔ پہلے نہیں سوچتیں اور جب مصیبت پڑتی ہے تو چیختی ہیں چلاتی ہیں۔ چارپائیوں سے کشتی لڑتی ہیں۔ خواہ مخواہ اپنا خون جلاتی ہیں۔ اس نے کراہت سے سوچا۔

اور یہ مرد۔ خدا کی بدترین قوم۔ جیسے عورتوں کے علاوہ ان کے پاس اور کوئی کھیل نہ ہو اور جب امّی جان چیخنے چلانے لگیں تو اس وقت خود مزے سے کاغذوں سے کھیلنے لگے۔ آفس میں بیٹھے فائلوں سے شغل فرمانے لگے اور گھر پر مجھ گیارہ سال کی بچی کو چھوڑ دیا۔ پر امّی نے بھی تو جلدی کی۔ ہمیشہ لوگوں کو چونکانے میں خوش ہیں۔ مجھے شادی کے سات ماہ بعد ہی لے آئیں اس بکواس دنیا میں اور پھر کسی مرے ہوئے آتش فشاں پہاڑ کی طرح خاموش ہو گئیں۔ جیسے ٹھنڈی پڑ گئی ہوں اور پھر اچانک فواد کو لے آئیں۔ چھی چھی چھی۔ اور پھر ے ماہ بعد ایک اور آخر ——— دیکھ لیا چونکانے کا مزہ؟ مجھے منع کر دیا تھا اندر نہ آنا۔ چیختی رہنا۔ مجھے رلاتی رہنا۔ خود سسکیاں لیتی رہنا مگر بیٹی کا داخلہ بند اور پھر بھی کیا سب کچھ بیٹی کے سامنے۔ اونہہ! خواہ مخواہ مصیبت۔ بچے ہوں جی بچے۔ ہمارا نام روشن ہو گا۔ ہم شادیاں کریں گے اُن کی۔ تاکہ وہ بھی ہماری طرح تڑپیں، کراہیں، چیخیں، خون میں نہائیں اور مر جائیں۔

اس کے ماتھے کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ ہاتھوں کی نیلی نیلی رگیں ابھر گئیں۔ اس کی آنکھوں میں غصّہ تیرنے لگا۔ یکایک وہ ایک دم چونک کر سفید دھلی چادر کو دیکھنے لگی اور ایک تلخ مسکراہٹ چادر پر پھیل گئی۔ پھر سے ماں نظر آئی اور ایک بے جان لوتھڑا اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا۔ سفید کفن میں ایک دوسرے کے پہلو میں لیٹی ہوئی دو میتیں دس کا ہندسہ بنی نظر آئیں۔

وہ انسانوں کے سائے سے بھی دُور رہتی۔ اسے اپنے باپ سے بھی نفرت سی ہو گئی تھی۔ وہ بہت کم اپنے باپ کے سامنے آتی۔ جب بھی وہ ان کو دیکھتی یا تو نظریں چرا لیتی یا منہ موڑ کر سامنے سے ہٹ جاتی۔ اس کے چہرے پر غصّے کے سائے پھیل جاتے جن میں نفرت کے بے شمار ذرّات ہوتے۔ اس کا چہرہ چند لمحوں کے لئے سُرخ مرچ کی مانند ہو جاتا۔ باپ سے باتیں کرتے وقت بھی اس کا لہجہ نہایت روکھا ہوتا۔ وہ دن کا اکثر وقت پڑھائی، صفائی اور پودوں کی کتر بیونت میں گذار دیتی۔ لوگ کہتے "اس پر بھوتوں کا سایہ ہے۔" یا "اس کی کوئی کل ٹیڑھی ہو گئی ہے۔" وہ ہمیشہ سے آدم بیزار رہی۔ بھتیجے کو اس نے کبھی بھی پیار نہ کیا تھا۔ کبھی کبھار ڈھیر سارا پیار اس کے چہرے سے جھلکتا مگر وہ اس کو ہاتھ نہ لگاتی جیسے وہ رضا ہو

بنتا ہو جسے وہ ہاتھ لگائے گی تو بھسم ہو جائے گی۔ جل کر کوئلہ ہو جائے گی۔ پھر وہ اسے دیکھ کر بھی جھنجلا جاتی۔

یہ بھی تو بڑا ہو کر ابا ایسی حرکتیں کرے گا۔ پھر کوئی دبی دبی سسکیاں لے گا۔ دانتوں سے زبان کاٹے گا۔ پھر زور زور سے چلائے گا۔ اور پھر۔۔۔ اور پھر۔۔۔ وہ زور سے اپنے سر کو جھٹکاتی اور کسی نہ کسی کام میں مصروف ہو جاتی۔

فرحت نے لان میں طرح طرح کے پھول لگائے ہوئے تھے۔ مگر اسے سرخ رنگ کے پھولوں سے نفرت تھی۔ گلاب، گل لالہ اور زعفران کا کوئی پودا اس کے لان میں نہیں تھا۔ کلیاں نکلتیں، غنچے پھوٹتے، پھول بنتے اور جب مرجھا جاتے پتی پتی ہو کر گر پڑتے یا شاخوں پر ہی سوکھ جاتے تو اسے بہت دکھ ہوتا۔ لان میں سے پھول توڑنا سخت منع تھا۔ جس دن کوئی پھول توڑ لیتا وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ کر کمرے میں بند ہو جاتی اور بھوک ہڑتال کرنے کا اعلان کر دیتی جیسے وہ گھر کی عام ممبر نہ ہو بلکہ مزدوروں کی انجمن کی صدر ہو اور اپنے مطالبات منوانے کے لیے بھوک ہڑتال کر رہی ہو۔

وہ کہتی "یہ پھول صرف میرے ہیں۔ میں نے ان کو لگایا ہے۔ میں نے ان کی پرورش کی ہے۔ کسی کو کیا حق ہے کہ ان کو توڑے، سونگھے، مسلے اور پتی پتی کر کے دوسروں کے پیروں میں روندنے کے لیے پھینک دے۔ یہ بھی تو جان رکھتے ہیں۔ سانس لیتے ہیں۔ خوشی اور غم محسوس کرتے ہیں۔ سرد جھونکوں اور تند ہواؤں سے انسانوں کی طرح متاثر ہوتے ہیں۔ گرمی سردی کا اثر قبول کرتے ہیں۔ اگر وہ کسی کو کچھ کہتے نہیں تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ انہیں شکار کی طرح جھنجھوڑا جائے اور ناجائز بچے کی طرح پھینک دیا جائے۔

فرحت نے بے شمار مصنوعی رنگ کے زرد پھول، کلیاں اور کھردری کھردری پتیاں جمع کر رکھی تھیں۔ وہ ان بے جان، بے بو کلیوں، پھولوں کو زور زور سے دونوں ہاتھوں میں مسلتی۔ ان کو کتنی ہی دیر تک دیکھے جاتی۔ ان کی ایک ایک پتی علیحدہ کر دیتی اور پھر بڑی محبت سے ان کو جوڑتی اور گلدان میں سجا دیتی۔ اسے گلدان جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔ وہ ہر تنخواہ پر دو تین جوڑے گلدان اور مصنوعی کلیاں ضرور لاتی۔ ایک پوری الماری اونٹ کی کھالوں، دھات، مٹی، چاندی کے گلدانوں سے بھری پڑی تھی۔ کارنس پر بڑے بڑے اونٹ کی کھال کے گلدان دھرے رہتے جن میں زرد رو پتیاں، کلیاں سجی ہوتیں۔ ان گلدانوں کے ساتھ ہی چاندی کے گلدانوں میں، چمکدار چمچے پھولوں کی طرح سجے رہتے۔ بہت سے چمچے اس نے الماری کے گلدانوں میں سجا رکھے تھے جو اکثر زنگ آلود تھے۔ اس کی عجیب سی دنیا تھی جو کمرے، لان، کتابوں، مصنوعی پھولوں، زرد رو پتیوں، بے جان چمچوں اور کھوکھلے گلدانوں کے گرد گھومتی تھی۔

شب کے کوئی گیارہ بجے تھے۔ جون کا مہینہ تھا۔ سورج جل جل کے شب کی راکھ میں کب کا جانے کہاں چھپ گیا تھا۔ اٹھارھویں کا چاند سیاہ بادلوں کی دلدل میں پھنسا گندے انڈے کی مانند نظر آ رہا تھا۔ اس کے نشان انڈے میں سے جھانکتے نامکمل بچے کی طرح نظر آ رہے تھے۔ فرحت ٹکٹکی باندھے اس ڈھلتے چاند کو دیکھ رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی۔

یہ چاند، سورج اور ستارے قدرت نے ہمارے لئے بنائے ہیں۔ ہمیں ان سے افضل بنایا ہے۔ لیکن صبح ہوتی ہے سورج ہمیشہ کی طرح سرخ و سفید، تر و تازہ دھلے ہوئے شلغم کی طرح نظر آتا ہے۔ ہر روز بالکل نیا لگتا ہے جیسے ابھی مشین سے نکلا ہو۔ چاند بھی جیسے جیسے تاریخ بدلتا ہے اس کے حسن میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ہر ماہ بعد نئی رعنائیاں لے کر جلوہ گر ہوتا ہے۔ آخر ہم سورج کی طرح تر و تازہ کیوں نہیں رہتے، پھول کی طرح مرجھا کیوں جاتے ہیں۔ ہماری کھال کیوں ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔ ہمارا رنگ کیوں اڑ جاتا ہے۔ بال کیوں سفید ہو جاتے ہیں۔ ہم کیسے افضل ہیں، کیسے اشرف ہیں۔ یہ تو ہمارے بغیر رہ سکتے ہیں ہم ان کے بغیر کیوں نہیں رہ سکتے۔ لیکن نہیں۔۔۔ ہم ان سے افضل ہیں، ہم اشرف ہیں۔ سورج ہمیں جلاتا ہے لیکن خود بھی تو جل رہا ہے ہمیشہ سے اور ہمیشہ ہی جلتا رہے گا۔ ہم چاند سے بھی تو افضل ہیں۔ ہم چاندنی سے لطف اندوز

ہوتے ہیں لیکن اس میں اتنی بھی تو حس نہیں کہ محسوس کرے کہ مجھ میں یہ لطافت ہے اور پھر حضرت آدم تو ہر شے سے افضل ہے۔ ہر شے سے افضل۔ اس نے کراہت سے سوچا۔ اس کی آنکھوں میں نفرت کی تہیں جمتی چلی گئیں۔ جسم بھوبل میں دبی ہوئی انیا کی طرح پھنکنے لگا۔ وہ لیٹے لیٹے اٹھ بیٹھی اور ساتھ والے پلنگ پر سوتے ہوئے باپ کو گھورنے لگی۔

یہ انسان، یہ اشرف المخلوقات، اونہہ، جو شیر سے زیادہ خونخوار، لومڑی سے زیادہ مکار ہے۔ سانپ سے زیادہ زہریلا اور بچھو سے زیادہ نیش زن ہے۔ مگرمچھ سے زیادہ نسل کش اور ریچھ سے زیادہ شہوت پرست ہے۔

وہ اپنا سر تھام کر لیٹ گئی۔ اس نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ آنکھیں سختی سے بند کر لیں۔ اسے محسوس ہوا جیسے ماں رو رہی ہو سسک رہی ہو تڑپ رہی ہو۔ اسے چاروں طرف چیخیں ہی چیخیں سنائی دینے لگیں۔ آہستہ آہستہ ہلتے ہوئے درختوں کے پتے چیخنے لگے۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ہلکی ہلکی چاندنی میں نظر آتے ہوئے پھول چیخنے لگے۔ اسے چاروں طرف خون ہی خون نظر آیا۔ اسے ایسے محسوس ہوا جیسے ستارے خون کے قطرے بن کر مجھ پر آ گرے ہیں گے۔ چاند سے خون برسنے لگے گا۔ جیسے یہ بھی ماں کی طرح خون میں لت پت ہو جائے گا۔ یہ گندہ انڈا ٹوٹ جائے گا۔ اس کا نامکمل بچہ مجھ پر آ گرے گا اور پھر —— وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور لان میں گھومنے لگی۔ اسے ایسے محسوس ہوا جیسے بلی بھی اس کے ساتھ ساتھ آ رہی ہو۔ اس کا پیچھا کر رہی ہو۔ وہ ایک دم ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی اور چاروں طرف دیکھنے لگی۔ اُسے ایسے لگا جیسے تمام پھولوں سے بلی کے بچے جھانک رہے ہوں۔ وہ ڈر گئی، جلدی سے مڑی، کانپتی ہوئی اپنے پلنگ پر آ گری۔ اس کی آنکھوں میں صبح والا واقعہ گردش کرنے لگا۔

"اوہو! کتنا غصہ تھا اس کی آنکھوں میں۔ کتنی نفرت تھی۔ وہ کیسے غرا رہی تھی مجھ پر۔ جیسے ابھی جھپٹ پڑے گی۔ میری آنکھوں کو نوچ لے گی۔ میں نے بھی تو اس پر کتنا ظلم کیا ہے۔ اس کے چاروں بچوں کو اس سے علیحدہ کر دیا۔ سب کو بانٹ دیا۔ وہ پانچویں بچے پر کتنا روتی تھی بالکل آنٹی کی طرح۔ کتنا پیار کیا تھا اس کو بلی نے۔ اس کے جسم کے نرم نرم بال بھی گیلے ہو گئے تھے۔ اس وقت کتنی بے چارگی تھی اس کی آنکھوں میں۔ کتنا درد تھا۔ اور وہ نجانے کون جذبہ تھا اس کی آنکھوں میں جس میں ٹھنڈک تھی، رنامہٹ تھی۔ شاید مامتا تھی۔ ہاں، وہ مامتا ہی ہو سکتی ہے۔ بالکل وہی چمک، وہی جذبہ انی کی آنکھوں میں پیدا ہوا تھا ببا کو دیکھ کر۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ اب رو دے گی۔ اب اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکیں گے اور وہ بچہ بھی لیٹا ہوا ایسے لگ رہا تھا جیسے ابھی ابھی دودھ پی کے سویا ہو۔ بلی کے پیار کو محسوس کر رہا ہو، اس کے لمس سے لطف اندوز ہو رہا ہو۔" اس کی آنکھوں میں سفید کفن میں لپٹی ہوئی میت گھوم گئی اور اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

"میں ظالم ہوں۔ میں نے بہت زیادتی کی ہے بلی پر۔ میں تمام بچوں کو واپس منگوالوں گی۔ اس بے چاری کا آخر قصور ہی کیا تھا۔ میں نے خواہ مخواہ اسے اتنی اذیت دی۔ بچے بھی تو روتے ہوں گے اسے یاد کر کے۔ ہاں! میں بچوں کو ضرور منگوالوں گی۔"

اور صبح ہی صبح اس نے تمام بچوں کو واپس منگوا لیا۔ لان سے پرے دیوار کے ساتھ بوڑھی بیری کے درخت کے نیچے زمین کو کھود کر پانی چھڑکا۔ آدھ سیر پکا دودھ پیالے میں ڈالا۔ بکرے کے چھیچھڑے بلی کے لئے منگوائے اور کھوئی کھوئی نگاہوں سے بچوں کو گھورنے لگی۔ چاروں بچے اس کے سینے سے لپٹ گئے اور اس طرح دودھ پینے لگے جیسے کوئی گوالا دودھ دوہتا ہے۔ وہ اگلے دونوں پنجوں سے باری باری سینے کو دباتے اور خُر خُر کرنے لگتے۔ بلی ان کے وجود سے غافل کچھ دیر تو آنکھیں بند کئے پڑی رہی اور پھر زمردی آنکھوں سے انہیں گھورنے لگی اور پھر اپنی چھوٹی سی زبان سے انہیں چاٹنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد بچے سینے سے علیحدہ ہو گئے۔ ایک اس کی گردن پر چڑھ بیٹھا۔ ایک نے اس کی دم پکڑنے کی کوشش کی جو پنڈولم کی طرح حرکت کر رہی تھی۔ دو بچے پاؤں پسار اس کے پہلو میں لیٹ گئے۔ وہ کتنی ہی دیر بچوں کے اس کھیل کو دیکھتی رہی۔ اس کے

جسم میں بار بار سنسنی سی اور جسم میں ایسی میٹھی میٹھی حرارت دوڑ جاتی جیسے سردیوں میں گرم پانی سے نہائی ہو۔ بعض دفعہ اسے ایسے محسوس ہوتا جیسے کوئی چٹکیاں لے رہا ہو۔ گدگدی کر رہا ہو۔ اس پر کپکپی سی بھی طاری ہو جاتی۔ اس کے پاؤں اور پنڈلیوں کے بھورے بال کھڑے ہو جاتے۔ وہ زیادہ دیر وہاں کھڑی نہ رہ سکی اور اپنے کمرے میں آگئی۔

اسے اپنا کمرہ عجیب سا لگا۔ وہ کارنس پر رکھے ہوئے گلدانوں کو گھورنے لگی۔

"میری زندگی بھی کتنی کھوکھلی ہے ان گلدانوں کی طرح۔ کتنی مصنوعی ہے ان پھولوں کی مانند۔ بالکل بے جان ان گچھوں کی طرح۔ پھولوں میں خوشبو نہیں۔ کلیوں میں زناہٹ نہیں اور میں بھی اجڑی اجڑی سی میری طرح" وہ انہیں دیکھ کر گھبرا گئی۔ اسے وحشت سی ہونے لگی۔ وہ کھڑکی کے پاس آئی اور لان میں کھلے ہوئے پھولوں کو دیکھنے لگی۔ روشندان سے ایک چڑیا اڑی اور بیری کے درخت پہ بنے ہوئے گھونسلے میں جا بیٹھی۔ فرحت کی توجہ بھی اس کی طرف مبذول ہو گئی۔ چڑیا کو دیکھتے ہی چھوٹے چھوٹے بچوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ چڑیا نے پر پھیلا دیئے۔ چونچ کو نیچے جھکایا اور چوں چوں اچیں اچیں کرتے ہوئے بچوں کے منہ پر منہ رکھ دیا۔ بچوں نے بے پر کے بازو ہلائے اور اپنے پوٹے بھرنے لگے۔

فرحت انہیں دیکھے جا رہی تھی۔ جیسے ہی چڑیا نے بچوں کے منہ پر منہ رکھا وہ اچھل پڑی اور ایک تلخ مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔ اس کی آنکھیں چراغ کی دم توڑتی لو کی طرح چمکیں اور پھر حسب معمول ہو گئیں۔ راکھ کے مانند پپوٹے بند ہونے لگے۔ گندمی رنگ گڑ کے پکے ہوئے چاولوں کی مانند ہو گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا اور عرق آلود پیشانی چوکھٹ پر رکھ دی۔ وہ کتنی ہی دیر اسی طرح کھڑی رہی۔ اس نے سر کو اٹھایا تو کھڑکی کی چوکھٹ گیلی ہو گئی تھی۔ وہ دیوار کے ساتھ لگی ہوئی بیری کو دیکھنے لگی۔ اور ایک خیال اس کے ذہن میں گردش کرنے لگا۔

"یہ بیری کا درخت کتنا خوبصورت ہے۔ کتنا خوش قسمت ہے۔ بڑھاپے میں بھی پتھر آتے ہیں اس پر۔ جوان ہوتا ہے جب بھی کتنی قدر ہوتی ہے اس کی۔ ضعیفی میں بھی بچوں کے ساتھ کھیلتا رہتا ہے بالکل ماں بن کر۔ عورت اور اس میں کتنی مناسبت ہے۔ جہاں لڑکی ہوتی ہے وہاں بھی تو پتھر آتے ہیں گول گول، چھدرے چھدرے، بدصورت، تراشے ہوئے، صاف شفاف قدرت کے اپنے ہاتھوں کے بنے ہوئے اور ـــــ اور کتنی زندگی ہوتی ہے اس درخت پر۔ کتنے ہنگامے ہوتے ہیں۔ پتے بھی بالکل بچوں کی طرح شور مچاتے ہیں۔ پھر یہ عورت کی کتنی عمدہ عکاسی کرتا ہے۔ یہ بھی تو چاہتا ہے کہ مجھ پر پتھر آئیں۔ میں انہیں کانٹوں بھری باہوں میں سنبھال لوں۔ میرے گول گول بیروں کی تعریف ہو۔ حالانکہ اپنی بدصورت جھریوں کو نہیں دیکھتا۔ اپنے بے تکے جسم پر نظر نہیں ڈالتا۔ میں بھی تو ایک بیری ہوں۔ بالکل تنہا بے رونق۔ لیکن اس کی مانند ضعیف بھی نہیں ہوں۔ میرا تو جسم بھی اس کی طرح بے ڈول نہیں ہے۔ پھر مجھ پر پتھر کیوں نہیں آتے۔ میرے بازو بھی تو کسی پتھر کے منتظر ہیں۔ آخر میری زندگی کانٹوں کا مجموعہ ہی تو نہیں ہے۔ میں بھی تو چاہتی ہوں کہ بچوں سے کھیلوں، کانٹوں سے الجھوں لیکن ـــــ میں نے کب چاہا تھا؟ اتنے ڈھیر سارے پتھر تو آئے تھے۔ میں نے ہی کسی کو پسند نہیں کیا لیکن جب نہیں چاہا تھا، اب تو چاہتی ہوں۔ اب کیوں نہیں آتے اس بوڑھی کھوسٹ پر کیوں آتے ہیں۔ میں اس کی طرح بدصورت بھی نہیں ہوں عمر بھی اس سے آدھی ہی ہوگی۔ چونتیس سال بھی کوئی عمر ہے۔ اتنی کی تو میں لگتی بھی نہیں، چند دن ہوئے افروز کہہ رہی تھی۔" توجی! مس فرحت ابھی کیوں شادی کریں۔ ابھی تو دو چار سال، اور پڑھائیں گی۔ ابھی عمر ہی کیا ہے ان کی۔ پچیس کی بھی مشکل سے لگتی ہیں!"

ہاں! واقعی لگتی تو پچیس کی ہی ہیں۔ بس بالوں سے پکڑی جاتی ہیں۔ کنپٹی کے بال تو سفید ہو گئے ہیں۔ ان کا کیا ہے وہ تو سیاہ بھی ہو سکتے ہیں۔ ملک صاحب تو اب بھی لٹو ہیں ان پر۔ شادی تک کے لئے تیار ہیں۔ فردوس نے کہا۔

"اونہہ! ملک صاحب نے شکل بھی دیکھی ہے آئینہ میں اپنی۔ منی چھ کی عینک اتار دیں تو مجھے بھی پہچاننے سے انکار کر دیں۔ اباجی کی طرح میری بجائے جمعدارنی کو اپنی بیٹی سمجھ بیٹھیں۔ پھر اپنے کالے توے ایسے رنگ کو نہیں دیکھتے۔ منہ پر موٹے موٹے کالی مرچوں ایسے مہاسوں پر نظر نہیں ڈالتے شادی کریں گے مجھ سے۔ ایک کو تو پہلے مار دیا اب مجھے بھی کھانا چاہتے ہیں۔ آئے بڑے۔" اس نے نفرت سے سوچا۔ بکتے کیا ہیں۔ "مس فرحت کو تو میں اب بھی آبادیات پر نیا مقالہ سمجھ سکتا ہوں۔" اونہہ! گویا میں آبادیات کا نیا مقالہ ہوئی۔ اور قمر نے کہا تھا۔ "مس فرحت کیا ہیں۔ مس مصیبت ہیں۔ وہ بھی کوئی لڑکی ہے۔ اس سے تو اچھا یہی ہے کہ میں ECONOMETRICS پڑھ لوں۔ HARD STONE سے سر ٹکرا کر مرنا ہے مجھے۔ ہزاروں پڑی ہیں۔ یہ پتھر ہمارے بس کا روگ نہیں۔" اور ظہیر نے منہ بنا کر کہا تھا۔ "وہ بھی کوئی لڑکی ہے۔ وہ تو ڈیپارٹمنٹ کا دوسرا کولر ہے کولر۔ میاں وہ تو MULTIPLIAR کے سوالوں کی طرح الجھی ہوئی ہے۔ چھلیا کی کتاب کی طرح بیکار ہے۔" اور پروفیسر محمود کہا کرتے تھے۔ "میں تو مس فرحت کو دیکھ کر معاشیات کے تمام نظریات بھول جاتا ہوں۔ صرف وہی ایک سوال بن کر میرے ذہن میں کھلبلی کرنے لگتی ہے۔"

معلوم نہیں محمود صاحب کہاں ہوں گے۔ اب تو ان کی شادی ہو گئی ہوگی۔ جانے کتنے بچے ہوں گے۔ ۱۲ سال۔ اف کتنی عمر گذر گئی اور میں نے کچھ بھی نہیں کیا — کچھ بھی تو نہیں — کتنی بکواس زندگی ہے میری۔ بالکل فضول۔ بے مصرف۔ پتھر کی طرح بیکار۔ پتھر، قمر، قمر......
بیچارہ قمر۔ مستقبل بیکار کر دیا بیچارے کا۔ کتنا چاہتا تھا وہ مجھے۔ HARD STONE !!..... واقعی ٹھیک ہی کہتا تھا وہ۔ بہت زیادتی کی ہے میں نے اس پر۔ نہیں مجھے ایسا سلوک نہیں کرنا چاہیے تھا اس سے۔ اور یہ ظہیر کتنا اچھا لڑکا تھا۔ مجھے کولر کہتا تھا۔ واقعی کولر ہی تو تھی میں۔ لیکن کہاں۔ کولر بھی کہاں تھی۔ اس سے پیاس تو بجھ جاتی ہے لیکن میں نے تو سب کو ہی پیاسا رکھا۔ اتنی سرد مہری بھی ٹھیک نہیں تھی۔ لیکن اس نے مجھے سمجھا بھی تو نہیں۔ چھلیا کو تو اس نے فوراً سمجھ لیا تھا۔ MULTIPLIAR کے سوالات بھی وہ فوراً ہی حل کر لیتا تھا لیکن مجھے کیوں نہ حل کر سکا۔ میں سوال تھی۔ لیکن اتنا مشکل سوال تو نہ تھی کہ اس سے حل نہ ہو سکتی۔

اس نے پیار سے کارنس پر رکھے ہوئے کھوکھلے گلدانوں اور مصنوعی پھولوں کو دیکھا اور دیکھتی ہی رہ گئی۔ اس کی آنکھیں اچانک فیوز ہوتے بلب کی طرح چمکیں۔ جسم میں عجیب سا تناؤ پیدا ہو گیا۔ سرد جسم لاوے کی طرح کھولنے لگا۔ وہ تیزی سے کارنس کی طرف بڑھی اور تمام گلدان زمین پر دے مارے۔ تمام پھول اور کلیاں ادھیڑ کر رکھ دیں۔ ان کی پتی پتی نوچ ڈالی اور الماری سے کچھوں کو نکال کر وحشیانہ انداز سے دیکھنے لگی۔

میں واقعی پاگل ہوں۔ بھلا! یہ کچھے اکٹھے کرنے کی کیا تک تھی۔ اس نے تمام کچھے کھڑکی سے باہر پھینک دیئے۔ چند لمحوں کے لئے بیری کے درخت کے نیچے سوتے ہوئے بلی کے بچوں کو دیکھا اور پھر بھائی کے کمرے میں کھیلتے ہوئے بھتیجے کو اٹھا کر اسے بے تحاشہ پیار کرنے لگی۔

ضمیر قادری

کھٹمل

انورہ کی نیند ٹوٹ گئی!

اس نے مس اعجاز ملک کی دہاڑ سنی۔ "داٹو۔ حرامی، نمک حرام کہیں کا!"

تب ہی جیل کا گجر گونج اٹھا۔ رات کے دو بجے تھے۔ انورہ بارہ کے بعد لیٹی تھی۔ دن بھر کی تھکن سے اس کی نس نس ٹوٹ رہی تھی۔ بڑی دیر کے بعد نیند آئی تھی۔ مشکل سے ایک ڈیڑھ گھنٹہ سو پائی ہوگی کہ مس اعجاز ملک کی دہاڑ سن کر اٹھ بیٹھی۔ اسے بڑے زور کی جھونجھل آ ئی۔ دل و دماغ میں نفرت کا گھٹوا دھواں سا ابھر گیا۔ اسے لگا جیسے اس کا دل رو رہا ہو۔ کھارے کھارے آنسو بہا رہا ہو۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے "پاک" کرتے وقت گیلی لکڑیوں کے کڑوے دھوئیں سے آنکھیں آنسو برسانے لگتی ہیں۔ وہ روہانسی ہوگئی ——— !

سوچا کر ٹال جائے، مگر تب ہی اس کی نظروں کے سامنے مس اعجاز ملک اپنی تمام قہر سامانیوں کے ساتھ آ کھڑی ہوئیں۔ پچھلی صبح چائے پیتے پیتے جیسے انہیں کرنٹ چھو گیا ہو۔ وہ جھٹکے کے ساتھ پرچ پیالی میز پر چھوڑ کر اٹھی تھیں اور داٹو کو بنگلہ، اردو اور انگریزی کی بیسیوں گالیاں سنا پڑی تھیں۔ ان کا بایاں ہاتھ کولہے پر تھا اور منہ سے گالیوں کی بوچھاڑ امنڈ رہی تھی۔ "حرامی، ایڈیٹ، کمینے، کتنی بار کہا کہ کرسیوں اور مسہری کے جوڑوں میں کر اس ملا ہٹ واٹر ڈال دیا کر، پر سنتا ہی نہیں کمینہ! کھٹمل کھٹمل، ہر جگہ کھٹمل۔ گندا کہیں کا۔ نوکری سے ڈس مس کر دوں گی، تب پتہ چلے گا۔"

نوکری سے الگ کرنے کی دھمکی یاد آتے ہی انورہ خوف سے کانپ اٹھی۔ اس نے جھنجھوڑ کر پاس ہی لیٹے اپنے شوہر دین الدین عرف داٹو کو جگایا اور مس اعجاز ملک کے کمرے کی طرف بھیج دیا۔

انورہ اور داٹو کی شادی دو برس پہلے ہوئی تھی۔ شہر وہ پہلی دفعہ چار مہینے ہوئے آئی تھی۔ اس کی شادی کے ڈیڑھ مہینے بعد ہی ان کے گاؤں "جھالاکاٹی" میں دریا کا پانی چڑھ آیا ——— ان کی "منتا پاٹ" کی فصل سیلاب میں بہہ گئی۔ گھر باڑی سب ہی کچھ تباہ ہو گیا۔ سونار دیش کے کسان بھوکوں مرنے لگے۔ تب ہی داٹو دوسرے سیلاب زدگان کی طرح کھیتی باڑی کو چھوڑ کر شہر کی طرف چل دیا۔ اس وقت لوگ ان شہروں کی طرف جو سیلاب سے کچھ حد تک محفوظ تھے، ایسے امنڈ رہے تھے جیسے گڑ کی بھیلی پر پردار چیونٹیاں!

انورہ تب نہ روئی تھی اور نہ اس نے لمبی لمبی ٹھنڈی سانسیں ہی بھری تھیں، ہاں کچھ کھوئی کھوئی سی ضرور رہی تھی وہ دس پانچ دن۔ پھر سب کچھ پہلے جیسا ہو گیا تھا۔ ایک سال پانچ مہینے کیسے کٹ گئے، انورہ کو پتہ ہی نہ چلا۔ اچانک چند دنوں بعد داٹو صاف ستھرے کپڑوں میں گھر پہنچا اور اس کے ساتھ وہ بھی شہر چلی آئی۔

داٹو کو ایک مقامی گرلس کالج میں چپراسی کی نوکری مل گئی تھی۔ کالج کے پیچھے رہائشی کوارٹرز تھے۔ انہی میں پرنسپل مس اعجاز ملک رہا کرتی تھیں۔

کوارٹرز کے سامنے تھوڑا سا لان چھوڑ کر کچن اور ایک کوٹھڑی تھی جس میں دالو اور انورہ رہتے تھے۔ دالو صبح سے مس اعجاز ملک کی خدمت میں لگ جاتا اور صبح نو بجے سے شام کے پانچ بجے تک کالج میں رہتا۔ بعد میں پھر رات دس گیارہ تک اسے مس اعجاز ملک کی خدمت کرنا پڑتی۔ اور ان سب کا معاوضہ اسے مہینے میں ساٹھ روپوں کی شکل میں ملتا اور مس اعجاز ملک کی گالیاں بخشش میں۔

انورہ کی نوکری نہ تھی مگر وہ دالو کی بیوی تھی اس لئے اسے مس ملک کا کھانا بنانا پڑتا، کپڑے دھونے پڑتے اور جھوٹے برتن صاف کرنا پڑتے۔ اس کا بھی سارا دن ان کی خدمت کرتے ہی گذرتا۔

اور آج تو حد ہی ہو گئی۔ سارا دن پانی گرم کرتے گذرا۔ دالو نے مسہری اور بھاری بھاری کرسیوں کو لان میں نکالا اور مٹی کے تیل ملے گرم پانی سے ان کی خوب دھلائی کی۔ اس کے بعد اس نے ڈھیر سے کپڑے دھوئے۔ مس اعجاز کے لئے چائے کھانا سب ہی کچھ تیار کیا۔ ان سب سے فارغ ہو کر اپنے اور دالو کے لئے بھات ابالا۔ دال ترکاری کے لئے پیسے ہی نہ تھے۔ نمک اور پیاز سے ہی بھات کھا کر سو رہی۔ اور وہ ابھی سو ہی رہی تھی کہ مس اعجاز ملک کی "دعاؤں" نے نیند حرام کر دی۔

مس اعجاز ملک کی عمر یہی کوئی پینتیس سینتیس کے درمیان ہو گی جسم بھرا بھرا مگر بے ڈول تھا۔ مونڈھے اور پیٹ دونوں ساتھ ساتھ باہر نکل کر بڑھ رہے تھے۔ رنگ گورا تھا پر اس میں ایک عجیب سا پیلا پن جھلکتا تھا، جیسے مرجھانے سے پہلے پھول مٹیالا پڑنے لگا ہو۔ ٹھوڑی کا گوشت بھی لٹکنے لگا تھا۔ اور سیاہ بالوں کے بیچ ایک دو سفید تار بھی کھنچ آئے تھے۔ بڑی بڑی کٹیلی آنکھوں میں کنواری چمک کی جگہ ایک بے نام سی اداسی کا دھندلا پن امنڈنے لگا تھا جسے آنکھوں کے نیچے کے ہلکے کالے دھبوں نے اور بھی گہرا کر دیا تھا۔

کالج کی استانیاں اکثر انورہ سے بات چیت کرنے اس کی کوٹھڑی میں آجاتیں مگر ان کی باتیں ہمیشہ مس اعجاز ملک کے گرد ہی گھومتی رہتیں۔ ان کے ذکر کے علاوہ وہ شاذ و نادر ہی دوسری گفتگو کرتیں، چند ہی دنوں میں انورہ مس اعجاز ملک کے بارے میں بہت کچھ جان گئی۔

مس اعجاز ملک کے باپ ہائیکورٹ کے مشہور جج تھے جن کا عرصہ ہوا کار کے حادثے میں انتقال ہو گیا تھا۔ ماں پہلے ہی مر چکی تھیں۔ ایک بھائی تھا وہ بچپن ہی میں کہیں چلا گیا تھا، پھر اس کی کوئی خبر نہ ملی۔ باپ کے انتقال کے بعد کئی رشتے داروں نے مس اعجاز کو اپنے ساتھ رکھنا چاہا مگر انہوں نے کسی کا سہارا لینا گوارہ نہ کیا۔ اب اس بھری دنیا میں وہ بالکل اکیلی تھیں۔ پھر انہوں نے شادی نہ کرنے کا عہد کر لیا تھا، انہیں مردوں سے نفرت ہو گئی تھی، وہ مردوں کے سائے سے بھی دور بھاگتیں۔ اگر کالج میں بھی کسی طالبہ کا کوئی سرپرست ملنے چلا آتا تو وہ اس سے بھی بہت ہی خشک برتاؤ کرتیں۔ کبھی کبھی تو ان کا برتاؤ کچھ اتنا خشک ہو جاتا کہ ملنے آنے والا ان کو بالکل گنوار ہی سمجھتا۔ کالج کی انتظامیہ کے پاس مس اعجاز ملک کے اس رویئے کی بہت سی شکایات بھی پہنچی تھیں۔ مگر آج سات برسوں سے مس اعجاز ملک کے برتاؤ میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ وہ کنواری استانیوں سے بھی تنی تنی سی رہتیں، کبھی کبھی ذرا سی بات پر وہ سب کے سامنے ہی انہیں بری طرح جھڑک دیتیں۔ ایسے موقعوں پر ان کے لہجے میں غضب کا زہریلا پن آجاتا۔

دو ایک استانیوں نے تو ان کے اس توہین آمیز رویئے سے تنگ آکر نوکری ہی چھوڑ دی تھی۔

لیکن شادی شدہ استانیوں سے ان کا رویہ کچھ بہتر ہی ہوتا۔ اس وقت کچھ ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ گھٹیا سے ہوٹل کا کھانا کھا رہی ہوں جس کے سالن میں چٹ پٹے مسالوں کی بھرمار ہو۔ نمک تیز ہو اور منہ میں جاتے ہی ایک تیکھی کڑواہٹ کا احساس ہو اور کھارے پن کی ایک لکیر حلق سے معدے تک کھنچ گئی ہو اور اندر ہی اندر آگ لگاتی چلی جا رہی ہو اور اسے مٹانے کے لئے ٹھنڈے پانی کی ضرورت ہو اور میز پر ٹھنڈے پانی کا گلاس بھی نہ ہو۔ بیرے کو پکارنے سے پہلے ہی لقمہ حلق میں پھنس گیا ہو اور آنکھوں میں پانی آگیا ہو۔

شادی شدہ عورتوں سے بات چیت کرتے وقت بعض اوقات ان کی آنکھوں میں کچھ ایسی اداسی امنڈ آتی جیسے وہ پکے ہوئے کھیت کا آدھ پکا پودا ہوں، جس کی اونچائی تو ضرور آس پاس کے پودوں سے بڑھ گئی ہو اور جس میں بال بھی آ گئی ہو مگر بال میں دانے نہ پڑے ہوں اور جس کی ترو تازگی ہر لمحے کم ہوتی جا رہی ہو اور وہ اسی فصل میں کاٹ دیا جانے والا ہو۔

کالج اسٹاف میں مرد چپراسی کا ہونا ناگزیر تھا کیونکہ اسے دن یا رات میں بہت سے ایسے کام کرنے ہوتے ہیں جنہیں کوئی عورت انجام نہیں دے سکتی، اسی وجہ سے گذشتہ سات برسوں سے چپراسی کے عہدے پر کوئی نہ کوئی مرد ہی رہا حالانکہ کوئی بھی چھ مہینے سے زیادہ نہ ٹکا بس اعجاز ملک نے ہر چپراسی کو کوئی نہ کوئی وجہ بنا کر نکال دیا۔ مگر دانو پچھلے دو سال سے چپراسی کے عہدے پر بدستور قائم تھا اور یہ دانو کی خوش قسمتی ہی تھی کہ بیسیوں بار نکالنے کی دھمکی دینے کے بعد بھی مس اعجاز اُسے نکال نہ سکی تھیں یا نکالنا نہ چاہا تھا۔

دانو پچیس برس کا ایک خوبصورت صحت مند نوجوان تھا۔ ناک نقشہ تیکھا اور جسم بھرا ہوا تھا۔ پر پتہ نہیں کیوں وہ مس اعجاز کے سامنے ہمیشہ مینڈھے کی طرح ممیانے لگتا۔ انورہ اس پر کئی بار جھنجھلائی بھی تھی، کبھی کبھی تو دانو کو مس اعجاز کے سامنے گھگھیاتے ہوئے دیکھ کر انورہ کو دانو سے بری طرح گھن آنے لگتی۔

ادھر بہت دنوں سے انورہ مس اعجاز ملک پر ایک نئی سنک سوار دیکھ رہی تھی۔ رات ہو یا دن، جب دیکھو انہیں کھٹملوں کی شکایت رہتی۔ کرسی پر ایک لمحہ بیٹھیں نہیں کہ ان کی کنپٹیوں اور پہلوؤں میں کھٹملوں نے چٹکی بھری۔ مسہری پر بھی یہی ہوتا اور اس کے لئے دن بھر میں دانو کو ہزاروں گالیاں اور پھٹکاریں سننا پڑتیں۔

دانو اور انورہ صفائی نہ کرتے ہوں ایسی بات نہ تھی۔ ہر ہفتے کرسیوں اور مسہری کو مٹی کے تیل ملے گرم پانی سے انورہ خود اپنے ہاتھوں سے صاف کرتی، گھنٹوں دھوپ دکھاتی یا ایک بار بھی کھٹملوں کے درشن نہ ہوتے۔ پھر بھی مس اعجاز کو کاٹنے کے لئے کھٹمل کہیں نہ کہیں سے آ ہی جاتے۔ انورہ بہت پریشان ہوتی۔ دن تو کسی نہ کسی طور کٹ ہی جاتا پر رات میں بھی جب یہی آفت رہتی تو اسے مس اعجاز ملک پر سخت طیش آتا۔

انورہ چاہتی کہ دانو اسے لے کر پھر "جھالا کاتی" چلا جائے۔ وہاں وہ پھر سے دھان اور پاٹ کی سنہری فصل اگائیں اور وہ کھیتوں میں آزاد چڑیوں کی طرح چہچہاتی پھرے — گھٹن کے اس ماحول سے نجات حاصل ہو جائے۔ بس وہ ہو اور دانو …… اور وہ دانو کی مضبوط باہوں میں سمٹ کر سو جائے۔ دن چڑھے سو کر اٹھے اور سنہری دھوپ میں "تالاب میں نہائے۔" کھانا پاک کرے" اور دانو کا کھانا لے کر کھیتوں کی طرف گاتی چلے

امی روپ نگر یے راج کنیا

رُوپیر جادو جانے چھی

ایران توران پار کوریا

تمار دیشے آشے چھی

{ میں روپ نگر کی شہزادی ہوں — روپ کا جادو لائی ہوں }

{ گھاٹ گھاٹ کا پانی پی کر — دیس تمہارے آئی ہوں }

اور اس کی سریلی آواز سن کر دانو کھیتوں سے اچھلتا اس کے قریب، اکدم قریب آجائے اور اسے اپنی مضبوط باہوں میں بھینچ لے اور

وہ مسرت کے جھولے میں ہنستے جھولتے خوشی سے بیہوش ہوجائے۔ اور پھر اس کی آنکھیں دانو کی گود میں کھلیں جو اپنی بے قرار پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی حسین آنکھوں کے کھلنے کا انتظار کر رہا ہو اور ایک لمحہ بھر پیاسی نظروں سے دانو کی آنکھوں میں جھانک کر شرما کر کروٹ لے لے اور...

..... اور ...... وہاں مس اعجاز نہ ہوں، ان کی دہاڑ نہ ہو، ڈانٹ پھٹکار نہ ہو اور دانو کو بار بار "جی میڈم غلطی ہوئی، آئندہ نہ ہوگی" نہ کہنا پڑے۔

گجر پھر گونجا۔ انورہ چونک اٹھی۔ ڈھائی بج گئے، دانو ابھی تک لوٹ کر نہیں آیا۔ اس نے مس اعجاز کے کمرے کی طرف دیکھا جہاں گھپ اندھیرا تھا۔ اس کی کوٹھڑی کی روشنی بھی بند تھی۔ انورہ نے چاہا کہ اٹھ کر بلب جلا دے۔ پر نجانے کیوں ہاتھ سوئچ تک نہ پہنچ سکا۔ وہ کھڑی نہ رہ سکی۔ واپس بستر پر گر گئی۔ اس کے دل کی دھڑکنیں بڑھ گئیں۔ اسے دانو کی فکر لگ گئی۔ وہ ابھی تک نہیں آیا۔ پھر اس نے سوچا کہ آتا ہی ہوگا کہیں کسی کام سے رک گیا ہوگا۔ مگر وہ تو کبھی اتنی رات گئے تک کہیں نہیں رکا کرتا۔ وہ دانو سے ایک دم روٹھ گئی۔ آج ضرور وہ اپنے دل کی کہے گی۔ وہ دانو کے سامنے گڑگڑائے گی، اس کے پیر پکڑے گی اور تب تک نہ چھوڑے گی جب تک وہ اسے لے کر گھر چلنے کا وعدہ نہ کرے گا۔

اس کی نگاہوں کے سامنے دیئے کی مدہم مدہم روشنی سے بھرا "گول پتے" کی چھت کا کمرہ گھوم گیا۔ اس کمرے میں وہ اور دانو، چھوٹا سا کمرہ، چھوٹی سی جنت، دھیرے دھیرے سنہری دھوپ پھیل گئی۔

جانوروں کے گلے کی گھنٹیاں بج اٹھیں۔ وہ دانو کا کھانا لے کر کھیتوں کی طرف چل پڑی۔

دانو بنسری بجا رہا ہے وہ ناچ رہی ہے دانو کی بنسری کے نغموں نے اس کے پیروں میں بجلیاں سی بھر دی ہیں وہ بے خود ہو کر ناچ رہی ہے۔ بنسری کے نغموں کا جادو اسے نچا رہا ہے۔ وہ بے خودی میں ناچتی رہے گی یہاں تک کہ ناچتے ناچتے مر جائے گی۔ بشرطیکہ دانو بنسری بجاتا رہے۔ ایک لمحے کو بھی نہ رکے ورنہ یہ رقص کا طلسم ٹوٹ جائے گا۔ اور اگر یہ طلسم ٹوٹ گیا تو وہ ضرور مر جائے گی۔

گجر پھر گونجا۔ تین بج گئے دانو نہیں آیا۔ لوٹ تو آنا چاہیے تھا اسے۔ مگر وہ ابھی تک نہیں لوٹا۔ اچانک انورہ کو محسوس ہوا جیسے مس اعجاز ملک کے کمرے کی مسہری اور کرسیوں سے ہزاروں کھٹمل قطار باندھ کر اس کی کوٹھڑی کی طرف دوڑے چلے آ رہے ہیں۔ وہ اس کی کوٹھڑی کے بند کواڑوں سے بھی اندر گھس آئے ہیں۔ اس کے بستر پر چڑھ گئے ہیں اور اس کے جسم کے ہر ہر حصے میں منہ گڑو دیا ہے اور خون چوسنے لگے ہیں۔ اور وہ لمحہ بالمحہ کمزور سے کمزور تر ہوتی چلی جا رہی ہے۔

تب ہی اسے محسوس ہوا کہ ایک موٹا سا کھٹمل رینگ کر اس کے سینے پر چڑھ آیا ہے اور اس کی کھال کو چھید کر اندر گھس رہا ہے وہ اس کے دل تک پہنچ گیا ہے اور اطمینان سے خون پی رہا ہے۔ خون پی پی کر وہ پھولتے پھولتے کیکڑا بن گیا ہے جو اپنے پیر سختی سے اس کے دل میں گاڑے ہوئے ہے۔ اور......... دانو......؟

امین رضا

اٹلس

میں بس سے اتر کر سڑک پار کرنے کی سوچ رہا تھا کہ سڑک کے دوسرے کنارے سے آٹے کی بوری کے بوجھ تلے دبی ہوئی دو سیاہ ٹانگیں لڑکھڑاتی ہوئی نظر آئیں۔ پھر میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ گہری لکیروں سے بھری ہوئی کشادہ پیشانی تھی اور اس کے نیچے جھریوں میں گھری ہوئی دو چمکدار آنکھیں جو زندگی کا واحد ثبوت تھیں۔ مجھے وہ چہرہ کچھ شناسا دکھائی دیا۔ میں اس کی طرف دیکھتا ہوا سڑک پار کر رہا تھا کہ دائیں طرف سے آتی ہوئی بس سے بچتے بچتے اس سے ٹکرا گیا۔ اس کی کمر پر لدی ہوئی بوری گر گئی تو اس نے سخت غصے کے عالم میں بڑبڑاتے ہوئے اپنا چہرہ بلند کیا۔ پھر یکدم خاموش ہو کر مجھے حیرت سے دیکھنے لگا..... اور ان چند لمحوں میں مجھے سکول کے زمانے کی یادوں سے ابھرتا ہوا بشیر احمد نظر آیا جسے ہم سب بشیرا کہتے تھے۔

اس نے اپنے نام کی اس تبدیلی پر کبھی ناراضی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ سب کا مشترکہ دوست تھا۔ اگر کسی کو اگلے دن کے لئے سکول کا کام کروانا ہوتا تو چھٹی کے بعد اسے روک لیتا اور وہ اس کام کو خوشی سرانجام دیتا۔ اگر کبھی جماعت میں بیت بازی کا مقابلہ ہوتا تو اسے شعر کے آخری حرف سے شروع ہونے والے کئی شعر یاد ہوتے۔ اس لئے وہ جس گروہ میں ہوتا اس کی کامیابی یقینی ہوتی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ہر امتحان میں اول آتا۔ یہی وجہ تھی کہ اسے کبھی سزا نہیں ملتی تھی۔

ایک دن جب ماسٹر صاحب نے سبق سنانے کے لئے بشیرے کا نام پکارا تو وہ یکدم گھبرا گیا۔ اس نے اپنے ڈیسک کے نیچے چھپائی ہوئی کسی چیز کو زمین پر گرا دیا..... بستہ کھول کر مطلوبہ کتاب نکالی اور سبق پڑھنا شروع کر دیا۔ ماسٹر صاحب نے زمین پر پڑی ہوئی چیز کو اٹھایا...... یہ ایک اٹلس تھی...... اس دن پہلی دفعہ بشیرے کو انگریزی کے پیریڈ میں اٹلس کا مطالعہ کرنے کے الزام میں معمولی سی سرزنش کی گئی۔ اس کے بعد تو اس کا یہ معمول بن گیا کہ پیریڈ کسی بھی مضمون کا ہو وہ اساتذہ کی نظروں سے بچ کر اٹلس دیکھتا رہتا اور جب کبھی انہیں اس کی اس چوری کا پتہ چلتا، اسے سزا ملتی۔

اسے جانوروں سے بھی بہت محبت تھی۔ ایک روز چھٹی کے بعد اس نے مجھے کہا۔ "رضی۔ آؤ بلبلیں پکڑنے چلیں۔"

"چلو" میں فوراً تیار ہو گیا۔

سکول سے کچھ فاصلے پر چھوٹے چھوٹے درخت نما پودوں کا ایک وسیع سلسلہ پھیلتا چلا گیا تھا۔ ان میں کہیں کہیں مختلف پرندوں کے گھونسلے تھے۔ ان میں سے بلبل کے گھونسلوں کو آسانی سے پہچانا جاسکتا تھا کیونکہ وہ ایک خاص خوبصورتی کے ساتھ بنائے جاتے ہیں۔ ہمارے پاس چھوٹے چھوٹے لکڑی کے دو شاخوں پر ربڑ باندھ کر بنائی ہوئی غلیلیں تھیں۔ ہم کچھ دیر تک ان سے ناکام نشانے باندھتے رہے پھر تھک کر ایک جگہ گھاس پر بیٹھ گئے۔ بشیرا آہستہ سے اٹھا اور ان جھاڑیوں میں جانوروں کے گھونسلے تلاش کرنے لگا۔ وہ اچانک خوشی سے چلایا۔ "رضی ادھر آؤ........ اس گھونسلے میں بلبل کے بچے ہیں۔"

"کتنے ہیں؟" میں نے اپنی جگہ سے اچھلتے ہوئے پوچھا۔

"دو" اس نے گھونسلے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے جواب دیا۔

ان میں سے ایک اڑنے کے قابل تھا۔ بشیرے کا ہاتھ لگتے ہی وہ اڑ گیا۔ اب وہاں صرف ایک پرندہ رہ گیا جسے اس نے پکڑ لیا۔ ہم دونوں جلدی جلدی گھر کی طرف چلنے لگے .... میں نے اس سے وعدہ کیا کہ میں شام کو اس کے گھر پرندہ دیکھنے آؤں گا .... گھر جا کر میں اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ میں نے ابھی کھانا کھایا ہی تھا کہ بشیر ہمارے گھر آیا۔ اس کے ہاتھ میں بلبل کا وہی بچہ تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ روتا ہوا آیا ہے۔ اس نے بتایا کہ بابا نے اسے پرندہ رکھنے کی اجازت نہیں دی اور کہا ہے کہ اسے وہیں چھوڑ آؤ۔ مجھے بھی اس کا بہت افسوس ہوا۔

اس نے مجھے راستے میں کہا۔ "رضی اب میں سکول نہیں جاؤں گا .... وہ مجھے مارتے رہتے ہیں .... یہ بھی نہیں دیکھتے کہ سب سے زیادہ نمبر میرے ہوتے ہیں

مگر تم ہر وقت اٹلس کیوں دیکھتے رہتے ہو؟ جماعت میں تو اسے الگ رکھ دیا کرو نا" میں نے کہا۔

اس سوال سے اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک آ گئی۔ وہ بولا۔ "رضی دراصل میں اٹلس میں خشکی کے راستے دیکھتا ہوں"۔

"وہ کس لئے؟"

"میں خشکی کے راستے انگلستان جانا چاہتا ہوں۔

میں ہنسنے لگا تو وہ بولا۔ "ہنستے کیوں ہو؟ کسی کو بتانا نہیں۔ یہ بات میں نے صرف تمہیں بتائی ہے"۔

اس کے بعد وہ کبھی سکول نہ آیا۔ سکول والوں نے دس دن کی بجائے ایک ماہ تک اس کا انتظار کیا کہ شاید وہ آجائے مگر وہ نہ آیا اور اس کا نام خارج کر دیا گیا۔ مجھے اس کے گھر جا کر پتہ چلا کہ وہ گھر سے بھی غائب ہے .... پھر اس کی ماں ایک سال تک اس کا انتظار کرنے کے بعد چل بسی۔ اس کا باپ اسی غم میں زیادہ بیمار رہنے لگا۔ آخر جب وہ لوٹا تو اس کے باپ کی بینائی اتنی کمزور ہو چکی تھی کہ وہ اپنے بیٹے کو نہ دیکھ سکا .... جس دن وہ میرے پاس آیا اس دن بھی اس کے ہاتھ میں اٹلس تھی۔ لیکن اب اس کے پاس آکسفورڈ کی چھپی ہوئی خوبصورت اٹلس تھی۔ اس نے آتے ہی کہا۔ "رضی! انگلینڈ جانا تو بہت آسان ہے"۔ یہ کہہ کر اس نے اٹلس کھولی اور مجھے سمجھانے لگا کہ وہ کس کس ملک سے ہو کر انگلینڈ جائے گا۔

پھر ملک میں بحالیات کا محکمہ قائم ہوا اور وہ مکان جس میں بشیر رہتا تھا ایک ایسے آدمی کو ملا جس کے پہلے ہی تین عالیشان مکان تھے۔ تب بشیر اپنی بہن کے ساتھ کہیں چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد چند دن تک لوگوں کو بشیر اور اس کی اٹلس یاد رہی۔ آہستہ آہستہ لوگ اسے بھول گئے۔ آج اس واقعے کو دس سال ہو گئے ہیں اور میں اس چھوٹے سے قصبے سمندری کی اس بڑی سڑک پر کھڑا کبھی بشیرے کو دیکھتا ہوں اور کبھی زمین پر پڑی ہوئی اس وزنی بوری کو۔

"رضی صاحب اب تو تم اونچے آدمی ہو"۔ مجھے اس کی آواز عجیب سی لگی اور جب میں اس سے بغلگیر ہوا تو اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔

وہ مجھے اپنے گھر لے گیا۔ اس کی بہن چائے بنانے لگی تو اس نے مجھے بتایا کہ وہ آٹے کی ایک چکی پر کام کرتا ہے۔

"تمہاری اٹلس کہاں ہے؟" میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

اس نے مجھے اٹلس دکھائی ...... وہی آکسفورڈ والی ...... مگر اب وہ بوسیدہ ہو چکی تھی اور اس کا وہ نقشہ جس میں انگلینڈ جانے کے لئے مختلف ملکوں کو پنسل سے ملایا ہوا تھا، پھٹ چکا تھا۔

بشیرے نے ہنستے ہوئے کہا۔ "رضی۔ نئی اٹلس سمندری میں ملتی ہی نہیں .... چھوٹا شہر ہے نا ....."

محمد مرتضیٰ سکھیرا

اُلّو

سرسوں کی پیلی اوڑھنی میں لپٹی ہوئی کیاری سے گھاس کھودتے ہوئے اچانک نورے کی نگاہ آم کے ٹنڈ منڈ درخت کی طرف اٹھ گئی تو جانے کیوں اس کا چہرہ سرسوں کے پھولوں کا سا ہو گیا اور اسے اپنی کمر میں درد کی ہلکی ہلکی لہر اٹھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ آم کے درخت پر گھونسلا دیکھ کر اس کی بوڑھی آنکھوں میں ایک سوالیہ نشان ابھر آیا تھا ——— یہ گھونسلا کس پرندے کا ہے ——— ؟ پہلے تو اس درخت پر کسی نے بسیرا نہیں کیا تھا۔ حد ہے، اس ٹنڈ منڈ اجڑے ہوئے درخت پر بھی کوئی "گھر" بن سکتا ہے ؟ اس نے سوچا۔

اور پھر اپنی سوچوں اور سوالوں کو ادھورا چھوڑ کر گھاس کا گٹھڑ بنایا اور اسے کندھے پر رکھ کر دوسرے ہاتھ میں حقہ تھاما اور سہج سہج گھر کو چل دیا۔ وہ ابھی اپنے کھیت کی حدود سے نکلا ہی تھا کہ حنیف اسے دیکھ کر بریسم کاٹتے کاٹتے رک کر کھڑا ہو گیا۔ اور نورا اسی ٹھہری چال سے حنیف کے پاس آ پہنچ گیا۔

"کیا حال ہے رانجھن ——— ؟" نورے کی آواز تھکی تھکی سی تھی۔

"میں تو اچھا ہوں بابا، مگر تم آج بجھے بجھے سے نظر آتے ہو۔ کیا بات ہے، خیر تو ہے نا ——— ؟" حنیف نے نورے کے ہاتھ سے حقہ لیتے ہوئے کہا ——— نورا چند لمحوں کے لئے خاموش رہا ——— اسے ایسے محسوس ہوا جیسے حنیف کی بات سے دنیا جہان کی اداسیاں اس کے ارد گرد اکٹھی ہو گئی ہوں اور اس کے سرخ و سفید چہرے پر ساری دنیا کی سرسوں کی زردی اکٹھی ہو گئی ہو۔

"میں نہ جانے کیوں ——— ابھی ابھی آم کے اس ٹنڈ منڈ درخت کو دیکھ کر اداس ہو گیا ہوں جو میری سرسوں کی کیاری میں کھڑا ہے۔ میرا دل جیسے کہیں ڈوب گیا ہے۔" نورا دھیرے دھیرے بول رہا تھا ——— "میں نے بہت دکھ جھیلے ہیں، مگر ایک دو پل سے زیادہ ان کا اثر کبھی قبول نہیں کیا لیکن آج نہ جانے کیوں اس درخت نے زندگی بھر کی اُداسیاں دل میں جمع کر دی ہیں۔"

"نہیں بابا ——— یہ آم کا درخت تمہاری اُداسی کا سبب نہیں ہے ——— کوئی اور ہی بات ہے۔ اصل بات تو کوئی اور ہے جو تم مجھ سے چھپا رہے ہو ——— " حنیف نے مسکراتے ہوئے کہا جیسے اصل بات وہ جانتا ہو۔

"نہیں حنیف! سچ یہی کچھ ہے اور تو کوئی ایسی بات نہیں۔" وہ بہت آہستہ آہستہ بول رہا تھا اور اس کے لہجے میں اداسیوں کی ماندگی تھی۔

"بابا ——— پنچایت والی بات کیوں نہیں کہتے۔" حنیف نے دل کی بات اگل دی۔ "اب مجھ سے بھی پردہ کرو گے بابا؟ تم آخر اقرار کیوں نہیں کر لیتے کہ آج اگر تمہاری بیٹھک میں ہونے والی پنچایت نے پھیکے کو سخت سزا نہ دی، تو تم اپنے غصے اور دکھ کی آگ کو ٹھنڈا نہیں کر سکو گے۔"

"نہیں، نہیں۔" نورا اس بات سے یوں چونکا جیسے اس کا ہاتھ اچانک انگارے پر پڑ گیا ہو۔ پھر اس نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ "کمائے جٹ

کی بیٹی کو اگر کسی نے چھیڑا یا کوئی اس سے مذاق کرے تو اس سے مجھے کیا واسطہ"

"لفظوں کے اس ہیر پھیر کو چھوڑو بابا! رانی اور رانی کے باپ سے ٹھیک ہے تمہیں کوئی دلچسپی نہ ہوگی لیکن رانی کی ماں تاجی ——!؟
حنیف نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی جیسے وہ اس ادھوری بات کا تاثر نورے کے چہرے سے پڑھنا چاہتا تھا ——— اسے نورے کا شرمندہ شرمندہ سا چہرہ بڑا بھلا لگا اور پھر وہ اچانک کھل کھلا کر ہنس دیا۔

نورے نے گھمبیر لہجے میں کہا۔ "میری اداسی کی اصل وجہ تو وہی آم کا درخت ہی ہے۔ باقی رہا پنچایت کا معاملہ تو تم جانتے ہو اس بیٹھک میں میری ان بوڑھی آنکھوں نے سینکڑوں پنچایتیں دیکھی ہیں۔ یہ بیٹھک میری تو ہے ہی نہیں، سارے گاؤں کی سانجھی ہے۔ میں نے اسے کبھی اپنی نہیں کہا۔ پنچایت کے فیصلے سب کی مرضی سے ہوتے ہیں، کسی ایک کے دل کی بات پوری ہو جانا تو ضروری نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے میری اداسی کی وجہ کوئی اور ہی ہو —— کوئی اور ہی وجہ ——— میں نے جب اچانک اس آم کے درخت کی طرف دیکھا تو جیسے میرا سارا چین لٹ گیا۔ میں نے حنیفے! زندگی میں ایک ہی بار چوری کی تھی۔ صرف ایک بار۔ جب ہاردن آباد صرف ایک چھوٹی سی بستی تھی، بدرو والا ——— ان دنوں کی بات ہے تب شریف صاحب نے اپنے گاؤں میں باغ لگوانا شروع کیا تھا۔ شریف صاحب نہر کے محکمے میں کوئی بہت بڑے افسر تھے اور اپنی یہ نہر ہاریہ انہی نے کھدوائی تھی۔ وہ بڑے سخت مزاج تھے اور اس علاقے میں بہت کم لوگوں سے ان کا یارانہ تھا۔ لیکن مجھ سے علیک سلیک تھی، میں ان کے پاس ایک دن باغ میں گیا۔ وہ کپڑے والی کرسی پر آدھے لیٹے حقہ پی رہے تھے۔ میں سلام کر کے پاس پڑی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ کہنے لگے "ابھی نورے، آج تمہیں آموں کے وہ پودے دکھاؤں جو سہارنپور سے ایک انگریز کے باغ سے منگوائے ہیں۔ ریاست بہاولپور کیا سارے پنجاب میں اس جیسے آموں کے پودے نہیں ملیں گے"۔ میں کہہ بیٹھا۔ "شریف صاحب! ایک پودا مجھے بھی دے دو ——" انہوں نے مجھے صاف ٹال دیا۔ میں وہاں سے خاموشی سے چلا آیا۔ مگر میں نے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ ایک پودا تو چرا کر بھی لے جاؤں گا اور میں پودا چرا لایا۔"

"شریف صاحب آدمی ذہین تھے۔ اگلے دن نوکر کے ہاتھ بلا بھیجا۔ میرے جانے پر انہوں نے اِدھر اُدھر کی طویل باتوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ —— میری کبڈی کی تعریف ——— امرتسر میں کبڈی کے مقابلوں کی باتیں، سکھ کھلاڑیوں کی تعریفیں ——— اور حنیف! ایک بار شریف صاحب مجھے امرتسر کبڈی کھلانے کو بھی لے گئے تھے۔ تمہارا باپ بھی اپنے زمانے کے بہت اچھے کھلاڑیوں میں سے تھا۔ مجھے تو اس کے بغیر کبھی کھیلنے کا لطف ہی نہیں آتا تھا۔ وہ بھی میرے ساتھ ہی تھا۔ ہاں! تو پھر شریف صاحب کہنے لگے کہ آم کا ایک پودا چوری ہو گیا ہے۔ چوکیدار کو میں نے جرمانہ کر دیا ہے لیکن میرا خیال ہے بلکہ یقین ہے کہ آم کا پودا تمہارے پاس ہے، تمہارے سوا اسے کوئی بھی لے جانے کا حوصلہ نہیں کر سکتا۔ وہ پودا مجھے شام تک لوٹا دو ——"

"میں نے کہا۔ "صاحب! آم کا پودا میں نہیں لے گیا۔ اور اگر لے بھی گیا ہوں تو واپس نہیں کروں گا۔"

شریف صاحب جانتے تھے کہ میں جس بات پر اڑ جاتا ہوں پھر ٹلتا نہیں ہوں خواہ مجھے اس کے لئے اپنی تیل پلائی ہوئی ڈانگ کا سہارا ہی کیوں نہ لینا پڑے۔ اور شریف صاحب کیا، سارا علاقہ جانتا تھا کہ میری ڈانگ کے آگے بڑے بڑے سورما بھی نہیں ٹھہرتے تھے۔ اب تو میں بوڑھا ہو گیا ہوں ——— میرے تیور دیکھ کر شریف صاحب نے بات ہنس کر ٹال دی اور پھر ایک مدت بعد جب اسی بوٹے کی بیل تیار ہو گئی تو میں شریف صاحب کے لئے ایک ٹوکری بھر آم لے گیا۔ آموں کی شکل دیکھ کر بولے۔ "نورے یہ اسی بوٹے کے آم ہیں جو تو میرے باغ سے لے گیا تھا۔"

میں نے ہنس کر کہا۔ "پہلے صاحب پہلے کھا کر تو دیکھو ـــــ"

ایک لمحے کے لئے بابا فودا خاموش ہوگیا جیسے کہانی کے سلسلے کی کڑی کہیں کھو بیٹھا ہو۔ اس نے دور تک ماضی کے ویرانے پر نگاہ ڈالتے ہوئے سوچا۔ پھر بولا۔ "حنیف! میں اپنے پیار کی بدنامی کا خود ہی ذمہ کیوں کر اٹھا لوں؟ نہیں کیسے بتاؤں کہ اسی آم کے پودے کی وجہ سے تو مجھے پتہ چلا تھا کہ پیار کی جو آگ مجھے جھلسا رہی ہے اس کی تپش تاجی کے دل تک بھی پہنچ چکی ہے۔ جب نہر میں ایک ماہ سے پانی نہیں آیا تھا پانی کی کمی سے ایک طرف تو فصلیں تباہ ہو رہی تھیں اور دوسری طرف انسانی پیاس آخری حد تک جا پہنچی تھی ـــــ تب اس گاؤں سے ڈیڑھ میل دور شریف صاحب کے گاؤں کے کنویں سے پانی کا گھڑا لا کر تاجی نے آم کے اس پودے کو پانی دیا تھا۔ جب تک تاجی نے اس پودے کو پانی نہیں دیا تھا میرے لئے یہ ایک عام سا پودا تھا، لیکن اس کے بعد یہ پودا جیسے میری محبوبہ، میری بیوی، بیٹا، سجن، ساتھی، میرا سب کچھ یہی تھا۔ مجھے شاید پتہ بھی نہ چلتا کہ کوئی اس پودے کو پانی بھی دے گیا ہے۔ اس روز جب میں فصلوں کی تباہی دیکھتا دیکھتا اس پودے کے پاس پہنچا تو میں نے دیکھا کہ اس کے گرد کے گڑھے میں پانی تھا ـــــ میں نے سوچا ـــــ میرا وہ کونسا ایسا پیارا سجن ہے جو پانی کے اس قحط کے زمانے میں، ایسے میں جب انسانی جانیں پانی کے ایک ایک قطرے کو ترس رہی ہیں میرے پودے کو پانی دے گیا ہے ـــــ؟ اور پھر میں نے وہاں پانی دینے والے کے پاؤں کا کھوج لگانا شروع کیا ـــــ پھر میں نے وہاں چھوٹے چھوٹے پاؤں کے نشان دیکھے ـــــ چھوٹے چھوٹے خوبصورت نشان۔ ـــــ اور میں ان نشانوں کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا گاؤں کی گلیوں تک آ پہنچا ـــــ میرا یقین ایمان میں بدل گیا جب وہ نشان تاجی کے گھر کی ڈیوڑھی کے اندر چلے گئے۔" فودا یہ کہہ کر خاصے وقفے تک خاموش رہا۔

"کن سوچوں میں کھو گئے بابا؟"

فودا چونک کر حال میں لوٹ آیا۔ "حنیف سوچ رہا تھا۔ اگر بڑے شریف صاحب زندہ ہوتے تو نہیں ان کی سفارش سے کہیں نوکری ضرور مل جاتی اور تیری جان اس زمینداری سے چھوٹ جاتی۔" فودے کے چہرے پر بڑی نکھری نکھری سی مسکراہٹ آ گئی۔ "اور پھر فخری بڑے ناز سے اپنی سہیلیوں کو بتاتی میرا ڈھولن تو سرکاری ملازم ہے۔ مگر بڑے شریف صاحب تو کیا چھوٹے مظہر شریف صاحب بھی اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ بات ختم کر کے اس نے گھاس کا گٹھر کندھے پر رکھا اور حقہ اٹھا کر گاؤں کی طرف بڑھ گیا۔

اس نے سوچا مجھے دیر ہو گئی ہے اور ابھی بیٹھک بھی صاف کرانی ہے۔ پنچایت کے بیٹھنے کا انتظام بھی کرنا ہے۔ لوگ کیا کہیں گے کہ بابا فودا بوڑھا ہو کر گاؤں کے ساتھ اپنی محبت کو بھی بوڑھا کر بیٹھا ہے اور یہ سب لوگ میری کتنی عزت کرتے ہیں اور یہ کیا کم عزت کی بات ہے کہ پنچایت ہمیشہ میری ہی بیٹھک میں ہوتی ہے؟ اس احساس کے ساتھ ہی اس کے قدم تیز ہو گئے۔

آج کی پنچایت میں پھیکے اور کمانے جٹ کی لڑکی رانی کے جھگڑے کا فیصلہ تھا۔ بات یہ تھی کہ پھیکے نے رانی کو اکیلا پا کر اسے چھیڑا تھا۔ فودے نے بڑی تیزی اور دکھ کے ساتھ سوچا۔ "پھیکے کو ایسی سزا ملنی چاہیے کہ آئندہ کسی گھبرو کو ایسی حرکت کی جرأت نہ ہو۔"

فودا جب اپنے گھر پہنچا تو جانو اسے دیکھ کر ڈیکارنے لگی۔ فودے نے گھاس جانو کے آگے ڈال دی۔ اسے ایسے محسوس ہوا جیسے وہ بھی آج بجھی بجھی سی ہے۔ اس نے اس کے دونوں سینگوں کے درمیان ہاتھ پھیرنا شروع کیا تو گائے نے بھی گھاس چرنا چھوڑ کر منہ اوپر اٹھایا۔

خوشیے ماچھی کو جانا دیکھ کر یوں جانو کے پاس سے ہٹ آیا اور کہنے لگا۔ "آج ڈیرہ گندہ گندہ سا لگ رہا ہے۔ اسے صاف کر کے پانی چھڑک دے۔ تجھے پتہ ہے نا آج یہاں پنچایت بیٹھے گی۔"

حنیف اپنے کام سے فارغ ہو کر ہمیشہ کی طرح فودے کی بیٹھک میں آیا تو دس بارہ چارپائیاں اسے ترتیب سے بچھی ہوئی ملیں۔ ایک طرف

پندرہ سولہ پیڑھیاں پڑی ہوئی تھیں۔ بیٹھک کے چبوترے کے کچے فرش پر تازہ تازہ چھڑکاؤ ہو چکا تھا اور بڑی سوندھی سوندھی خوشبو اڑ رہی تھی حقے کی نے منہ میں لئے نورا یادوں کا ہمالہ طے کرنے میں محو تھا۔

"کیا ہو رہا ہے بابا!" حنیف بولا۔

نورا ایک دم تڑپ کر یوں پلٹا جیسے آم کا پودا چراتے ہوئے شریف صاحب نے اسے پکڑ لیا ہو اور بید سے اس کی کمر پر سے کھال ادھیڑ دی ہو۔ اس نے ایک جھرجھری سی لی اور بولا۔ "سوچ رہا ہوں آم کے اس ٹنڈ منڈ درخت پر جو گھونسلا ہے وہ کس پرندے کا ہے؟ آم کے درخت کی لکڑی بڑی کمزور ہوتی ہے اور خشک لکڑی تو ویسے ہی ٹوٹنے کا بہانہ مانگتی ہے۔ اگر میرا بوجھ سہار لیتی تو میں اوپر چڑھ کر دیکھ ہی لیتا۔"

"بابا! ایک بات پوچھوں ——؟"

"کیا بات ہے، پوچھو۔"

"بابا تم نے زندگی بھر شادی کیوں نہیں کی؟ —— میرا خیال ہے تمہاری جوانی کا گھن تاجی ہے —— اور یہی گھن تمہیں اب تک چاٹے جا رہا ہے۔"

نورے کے چہرے پر محرومیوں کی دھول بکھر گئی اور حقے کا دھواں جیسے اس کے دل ہی سے نکلا تھا۔

"بابا! مجھے بتا دو، قسم لے لو، میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ تم نے شادی کیوں نہ کی؟ —— کیا شادی کے بعد کوئی عورت تمہیں پسند نہ آئی؟ —— تاجی سے بابا تم شادی کیوں نہیں کر سکے تھے؟"

نورا ایک دم چیخ اٹھا۔ "اتنے سوال نہ کرو —— ایسے سوال نہ کرو جن کا میں جواب نہ دے سکوں۔ تم میرے دوست کے بیٹے ہو —— بیٹے ایسے سوال نہیں کیا کرتے۔" نورا دل کے ویران کنویں سے بڑی مشکل سے الفاظ کھینچ رہا تھا۔

"بابا! تم مجھے اپنا دوست بنا لو۔" اس نے منت کے سے لہجے میں کہا۔ "مجھے سب کچھ بتا دو۔"

"میں تمہیں صرف ایک بات بتا سکتا ہوں کہ میں نے تاجی سے کبھی بات بھی نہیں کی تھی —— اور نہ اس نے مجھ سے —— بس اتنی سی کہانی ہے —— صرف اتنی سی" —— پھر حنیف کے مزید سوالوں سے جان بچانے کے لئے نورے نے کہا۔ "تم یہاں بیٹھو، میں ابھی پتہ کر کے آتا ہوں کہ لوگ پنچایت کے لئے کب آ رہے ہیں۔"

نورے کے گھر کے پاس ہی چودھری عمر دین کا گھر تھا جو گاؤں کے سیانوں میں سے ایک تھا۔ چودھری کی بیوی نے بتایا کہ چودھری کو تو کمائے جٹ کا لڑکا بہت دیر ہوئی بلا کر لے گیا تھا۔ نورا وہاں سے باری باری سب گھروں میں گیا۔ میاں رفیق، سید حبیب اللہ شاہ، چودھری نبی بخش مگر کوئی بھی گھر میں موجود نہ تھا۔ وہ گاؤں کے چوک کی طرف نکل گیا۔ اس نے بڑی حیرانی سے سوچا، آخر سب لوگ کہاں گئے۔ پہلے تو کبھی ایسا نہ ہوا تھا۔ ہر پنچایت میرے ہی ڈیرے پر ہوا کرتی تھی —— اور آج ——؟ جانے یہ لوگ کہاں چلے گئے ہیں؟ ——

پھر اس نے دیکھا، ڈگی کے کنارے کنویں سے ذرا ہٹ کر ٹاہلیوں کے سائے تلے معزز پنچایت زمین پر بیٹھی تھی! وہ خاموشی سے ان کی طرف چلتا گیا۔

چودھری عمر الدین فیصلہ کن انداز میں پھیکے کے باپ سے کہہ رہا تھا کہ تم اپنی بیٹی کا رشتہ کمائے جٹ کے لڑکے کو دے دو تاکہ تمہارے لڑکے کو ساری عمر یہ رشتہ یاد دلاتا رہے کہ اس نے ایک لڑکی کو چھیڑا تھا تو اسے اپنی بہن کا رشتہ دینا پڑا تھا۔ اور اس گاؤں کے سارے جوانوں کو کان بھی ہو جائیں

گے کہ گاؤں کی کسی لڑکی کو چھیڑنے کی کیا قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔

نورا خاموشی سے پنچایت میں آ کر بیٹھ گیا۔ اسے دیکھ کر جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو ـــــ سب کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں اور لوگ کن انکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ ابھی پھیکے کے باپ نے پنچایت کو جواب نہیں دیا تھا۔ مگر وہاں تو جیسے صدیوں کا سناٹا اکٹھا ہو گیا ہو۔

نورے کی آمد سب کو کھٹکی تھی مگر اس کا اظہار کوئی نہیں کر رہا تھا۔ آخر سید حبیب اللہ شاہ نے مدھم لہجے میں بولا۔ "میاں نورے ہمیں افسوس ہے کہ ہم آج کی پنچایت تمہارے ڈیرے پر نہیں کر سکے۔ اگر اجازت ہو تو ایک بات پوچھوں؟

"ہاں ہاں! کیا بات ہے؟" نورا جیسے بہت دور سے بول رہا تھا۔

"تمہاری کوئی بہن تھی؟"

"نہیں۔"

"تم نے شادی نہیں کی تو تمہاری بیٹی کہاں سے ہوتی۔ یہ پنچایت بہنوں اور بیٹیوں کے جھگڑے پر ہوئی ہے اور یہ بہنوں اور بیٹوں والوں کی پنچایت ہے اور میاں نورے! تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔"

نورے کو یوں محسوس ہوا جیسے کبڈی کھیلتے ہوئے کسی چھوکرے نے اسے پکڑ کر گرا لیا ہو۔ وہ سر نیہوڑائے پنچایت سے اٹھ گیا۔ اُسے اپنے قدموں کی چاپ بھی اجنبی سی لگی۔ گاؤں کی دیواریں اور گلیوں کا ذرہ ذرہ اسے طعنے دیتا ہوا محسوس ہوا۔

وہ طعنے سنتا ہوا اپنے کھیت کو جانے والی پگڈنڈی پر ہو لیا۔ آم کے اس ٹنڈ منڈ درخت کی طرف جب اس نے دیکھا تو وہاں بنے ہوئے گھونسلے میں ایک الو بیٹھا تھا۔

فیض احمد فیض

○

نہ کسی پہ زخم عیاں کوئی، نہ کسی کو فکر رفو کی ہے
نہ کرم ہے ہم پہ حبیب کا، نہ نگاہ ہم پہ عدو کی ہے

صفِ زاہداں ہے تو بے یقیں، صفِ میکشاں ہے تو بے طلب
نہ وہ صبح درد و وضو کی ہے نہ وہ شام جام و سبو کی ہے

نہ یہ غم نیا، نہ ستم نیا، کہ تری جفا کا گلہ کریں
یہ نظر تھی پہلے بھی مضطرب، یہ کسک تو دل میں کبھو کی ہے

کفِ باغباں پہ بہارِ گل کا ہے قرض پہلے سے بیشتر
کہ ہر ایک پھول کے پیرہن میں نمود میرے لہو کی ہے

نہیں خوفِ روزِ سیہ ہمیں کہ ہے فیضؔ ظرفِ نگاہ میں
ابھی گوشہ گیر وہ اک کرن جو لگن اُس آئنہ رُو کی ہے

باقر مہدی

○

ہر سانس اک سوال کی خونی سناں ہے کیوں ؟
سب اجنبی ہیں، پھر بھی کوئی مہرباں ہے کیوں ؟

سایوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کے کرنیں کہاں گئیں
یہ قتلِ آفتاب کا رنگیں سماں ہے کیوں ؟

اب حیرتیں بھی ریزہ ہوئیں آئینے کے ساتھ
عکسوں کی جستجو ہی مرا امتحاں ہے کیوں ؟

ٹوٹے خیال، کھوئی صدائیں، جلے حروف
اتنا ہجوم! پھر بھی یہ خالی مکاں ہے کیوں ؟

طوفاں کی موج موج میں مہتاب بہہ گیا
ساحل پہ چاندنی کا ابھی تک نشاں ہے کیوں ؟

معنی کے بھوت لفظوں کی دلدل میں پھنس گئے
آسیب پھر بھی تیرے مرے درمیاں ہے کیوں ؟

کچھ بھی نہیں ملے گا "یقیں" ڈھونڈتے رہو
گھیرے نئے خیال کو وہم و گماں ہے کیوں ؟

بے سود ہے تلاش، مقدر ہے جستجو،
خوفِ زیاں کے ساتھ غمِ رائگاں ہے کیوں ؟

ریاض مجید

○

آتے جاتے چہرے تکتا رہتا ہوں
دن بھر کھلی کتابیں پڑھتا رہتا ہوں

گھر کی تنہائی کا دھیان ڈراتا ہے
یوں ہی بازاروں میں گھومتا رہتا ہوں

کسے خبر ہے، کون سی دید ہو آخری دید
ہر اک چیز کو غور سے دیکھتا رہتا ہوں

نیند ہی تو عافیت کا اک گوشہ ہے
اکثر دوپہروں تک سوتا رہتا ہوں

پھیلتی لہریں جی کو اچھی لگتی ہیں
تالابوں میں پتھر پھینکتا رہتا ہوں

کس میں ہمت ہے جو سچی بات سنے؟
سچی سوچتا، جھوٹی کہتا رہتا ہوں

دیکھتا ہوں اک لمحے کو آئینہ مگر
کیا یہ میں تھا؟ پہروں سوچتا رہتا ہوں

ریاض مجید

○

اُسی فضا، اسی ماحول میں مکیں ہوں میں
وہاں سے آ کے بھی اب تک وہیں کہیں ہوں میں

میں جانتا ہوں جو کچھ ان دنوں تو سوچتا ہے
خیال کر کے ترے کس قدر قریں ہوں میں

رُلا رہا ہے مجھے کرب اپنے پیاروں کا
عدو کے ہاتھ میں ہاری ہوئی زمیں ہوں میں

برس رہی ہے اُداسی مری منڈیروں پر
پرانے قصر کی ویران شہ نشیں ہوں میں

گئے زمانے کو سمجھو مرے حوالے سے
کہ رفتگاں کی روایات کا امیں ہوں میں

وہ مجھ سے دور ہے لیکن خفا نہیں مجھ سے
اُداس تو ہوں، پریشان تو نہیں ہوں میں

مثالِ سنگ پڑا ہوں میں کس توقع پہ
کس انتظار کے دریا کا تہ نشیں ہوں میں

مجھے خود اپنا تو کوئی بھی غم نہیں پیارے
ترے ہی سکھ کے لیے آج تک حزیں ہوں میں

اس آتے وقت میں میرا بھی ایک حصہ ہے
تو ہو نہ ہو، ترے فردا سے پُر یقیں ہوں میں

ملے ہیں کتنے ہی دریا مرے سمندر میں
میں کیا بتاؤں کہ کس کس کا خوشہ چیں ہوں میں

نکل سکا نہ اُس اک لمحے کی گرفت سے میں
ریاض! عمر ہوئی — آج بھی وہیں ہوں میں

ریاض مجید

○

جیسے جیسے شہر کی رعنائیاں بڑھتی گئیں
دل میں خاک اُڑتی گئی، تنہائیاں بڑھتی گئیں

آنکھ پر کھلتی گئی دنیا کی بے حیثیتی
آگہی کے کرب کی پہنائیاں بڑھتی گئیں

اپنے دل کا جائزہ مشکل سے مشکل تر ہُوا
دن بدن اس بحر کی گہرائیاں بڑھتی گئیں

حال کے ہمراہ ماضی کو بھی دہرایا گیا
زندگی کے ساتھ بھی رسوائیاں بڑھتی گئیں

آنکھ سے مٹتے گئے اس چاند سے چہرے کے نقش
دل میں اُس کی یاد کی پرچھائیاں بڑھتی گئیں

وقت کے ہمراہ ڈھلتی ہوئی قسمت ریاضؔ
رفتہ رفتہ اپنی بے پروائیاں بڑھتی گئیں

○

کچھ اس طرح میں ترے حلقۂ اثر میں تھا
مرے لیے تو بس اک تُو ہی شہر بھر میں تھا

ترے خیال سے راہِ نجات مشکل تھی
میں تیرے ہجرِ طلب کے بھنور بھنور میں تھا

مجھے ہی دوریوں کا سنگسار ہونا تھا
کہ تیرے قرب کا سودا جو میرے سر میں تھا

میں آتے لمحوں کو کیسے قبول کر لیتا
ابھی گیا ہوا موسم مری نظر میں تھا

نہ ہو سکا کبھی دنیا سے میرا سمجھوتا
نہ جانے کیا مرے اندر کے شور و شر میں تھا

میں جس کو روتا ہوا گھر میں چھوڑ آیا تھا
وہ سایہ سایہ مرے ساتھ ہی سفر میں تھا

ترے ہی درد نے لفظوں کو معجزے بخشے
وگرنہ کون سا جادو مرے ہنر میں تھا

میں جس سکوں کے لیے شہر شہر پھرتا تھا
وہ منتظر مری آمد کا، میرے گھر میں تھا

خلیل رامپوری

○

نام اس اللہ کے بندے کا بھی رسوائی میں ہے
جو سمندر کی طرح سے اپنی گہرائی میں ہے

شاخ سے پتہ بھی اُڑتا ہے پرندے کی طرح
زندگی کی کوئی چنگاری تمنائی میں ہے

دھوپ کا دریا اُمڈ آتا ہے جب چڑھتا ہے دن
کوئی ایسی لہر کیا اس کی بھی انگڑائی میں ہے!

جب ہواؤں میں اُڑے گا، سب پتہ لگ جائے گا
جھیل نیلے آسماں کی کتنی گہرائی میں ہے

ہم کسی شیشے کو اپنے منہ سے پتھر کیوں کہیں
جس کا جو کردار ہے وہ اس کی گویائی میں ہے

تیرے من کا پھول بھی کھل جائے گا، اُمید رکھ
اس کے دامن کی ہوا کہتے ہیں پروائی میں ہے

ہلہاتی خاک کو دیکھا تو کیا دیکھا میاں!
اُس کو دیکھا چاہیے جو اس کی رعنائی میں ہے

گھیرے رہتا ہے مجھے لوگوں کی آوازوں کا شور
وہ اکیلا دیکھ کر کہتے ہیں "تنہائی میں ہے"

کوئی دروازے کی دستک کان میں پڑتی نہیں
بُت بنا بیٹھا ہوں گھر میں، دھیان شہنائی میں ہے

چھوڑ جاتی ہے ہوا بھی نقش اپنے خاک پر
سوچتا ہوں، تو کہاں پر جلوہ آرائی میں ہے

اُڑتے طیارے کی کھڑکی سے ذرا سا جھانک لے
اتنی ہنگاموں بھری دنیا بھی تنہائی میں ہے

دوستو کیا پوچھتے ہو حال اس کے گاؤں کا
آئینہ لپٹا ہُوا تالاب کی کائی میں ہے

اُٹھ رہی تھیں دور تک پانی کی دیواریں خلیل
ہم یہ سمجھے، نقص کوئی اپنی بینائی میں ہے

شمس الرحمٰن فاروقی

○

موجِ دریا کو ہنسیں، کیا غمِ خمیازہ کریں
رگِ افسردۂ صحرا میں لہو تازہ کریں

دل کے محبس میں کریں ذات کا ماتم کب تک
آؤ باہر تو چلیں، وقت کا اندازہ کریں

انگلیاں سرد ہیں، پھونکیں تو انھیں ہوش میں لائیں
اپنے سینوں پہ لکھیں، حرفِ وفا تازہ کریں

خوں ہے اک دولتِ دل، لوٹ ہی لیں اہلِ فلک
چہرۂ داغِ قمر پر تو نیا غازہ کریں

شیشہ تھا اک غمِ دل، ٹوٹ کے ساحل پہ گرا
منتشر ریت کے ہر ذرّہ کا شیرازہ کریں

شہرِ احساس سے بچنے کی تو کوئی نہیں راہ
سنگِ تخئیل پہ بند آنکھ کا دروازہ کریں

انور شعور

○

اب، کہ میں جیب کی طرح بے سروسامان نہیں
کاش خود تو ہو مرے پاس، ترا دھیان نہیں

گو یہ دن آج سے پہلے نہ پڑا تھا لیکن
آج کے بعد بھی اس کا کوئی امکان نہیں

تُو نے بھی مجھ کو مرے سوانگ سے جانا، افسوس
شاعری جو مرا فن ہے، مری پہچان نہیں

جو فقیہوں کا خدا ہے وہ نہیں ہے میرا
اور اگر ہو بھی تو اُس پر مرا ایمان نہیں

ہو گیا آکے بغل گیر، جب اُس نے دیکھا
اِس سے کترا کے گزرنا بہت آسان نہیں

صرف تاریکی و تنگی نہیں، میں بھی ہوں یہاں
یہ گھر اک قبر ہے ایسی کہ جو ویران نہیں

میں اگر خود نہ پریشان پھروں تو مجھ تک
کیسے پہنچے گی وہ خوشبو جو پریشان نہیں

حسن اختر جلیل

○

شب کی دہلیز سے کس ہاتھ نے پھینکا پتھر
ہو گیا صبح کا دھکا ہوا چہرا پتھر

کچھ انوکھی تو نہیں میری محبت کی شکست
آئینے جب بھی مقابل ہوئے، جیتا پتھر

اس طلسمات کی وادی میں پلٹ کر بھی نہ دیکھ
ورنہ ہو جائے گا خود تیرا سراپا پتھر

یاد کی لہر بہا لائی ہے کس دیس مجھے
ہے یہاں وقت کا بہتا ہوا دریا، پتھر

کس کے پیکر میں سماتا مرے احساس کا لوچ
میں نے انساں سے خجل ہو کے تراشا پتھر

تیری آنکھوں میں ابھی نیند کے ڈورے کیوں ہیں
یاں تو اک چوٹ سے ہو جاتے ہیں بینا پتھر

کُند کر دیتا ہے یوں ذہن کو حالات کا زہر
جیسے بن جائے چمکتا ہوا سونا پتھر

تیری سوچوں کی قسم، اے مرے خاموش خدا!
مجھ سے کرتے ہیں اطاعت کا تقاضا، پتھر

مجھ سے مایوس نہ پلٹے مری تقدیر کے غم
میری انگلی میں نہ تھا کوئی چمکتا پتھر

کتنی دلدار ہے ساحل کی چمکتی ہوئی ریت
اب نہیں پاؤں تلے کوئی نکیلا پتھر

میں سرِ دار کھڑا ہوں کئی صدیوں سے جلیلؔ
کون مارے گا مرے جسم پہ پہلا پتھر

حسن اختر جلیل

○

رہِ جنوں نے مناظر عجب دکھائے مجھے
کہ زرد پیڑوں کے لگتے ہیں سبز سائے مجھے

چلا ہوں شورِ دو عالم سے کنجِ دل کی طرف
کہ خامشی کی زباں پھر کوئی سکھائے مجھے

میں اس کی یاد کو سینے کی روشنی سمجھوں
جو اپنے دل میں جگہ دے کے بھول جائے مجھے

رگوں میں اپنا لہو زہر بن کے تیر گیا
یہ مرحلے بھی ترے شوق نے دکھائے مجھے

اُس ایک جسم میں تھے کتنے دل نشیں پیکر
وہ مل گیا تو کئی لوگ یاد آئے مجھے

○

یقیں تلاش کروں یا گماں تلاش کروں
میں اپنی روح کا زیور کہاں تلاش کروں

قدم قدم پہ بدلتا ہے میری ذات کا خول
کہیں رکوں بھی تو اپنا نشاں تلاش کروں

یہ روشنی کا تلاطم ڈبو نہ دے مجھ کو
چراغ ہاتھ میں لے کر دھواں تلاش کروں

کبھی یہ دھن تھی کہ اس کی گلی کا کھوج ملے
اور اب یہ فکر کہ اپنا مکاں تلاش کروں

کہیں سراب نہ ہوں یہ چڑھے ہوئے دریا
زمیں کی تہہ میں بھی آبِ رواں تلاش کروں

یہ کیا ستم ہے کہ مر دے گزر گہ وہ کہتا ہے
میں اپنے آپ میں دونوں جہاں تلاش کروں

اقبال ساجد

○

پیچھے سے آ کے دھیان کی زنجیر کھینچ لے
خوابوں کی چھت سے وہم کے شہتیر کھینچ لے

چپ کس لیے ہے، اینٹ کا پتھر سے دے جواب
حق چاہیے تو میان سے شمشیر کھینچ لے

مظلوم ہے، تو پیش ہو دربارِ وقت میں
انصاف چاہتا ہے تو زنجیر کھینچ لے

گھونٹیں نہ خواہشوں کا گلا کیوں دلوں میں لوگ
جب ہاتھ ہی دعاؤں سے تاثیر کھینچ لے

پھر دوسروں کی آنکھ میں تنکا تلاش کر
پہلے خود اپنی آنکھ سے شہتیر کھینچ لے

تجسیم کر کے شعلۂ آواز کی لپک
ان دیکھی، جیتی جاگتی تصویر کھینچ لے

ممکن ہے، دھول جھونک کے سورج کی آنکھ میں
ذرّے کا ہاتھ میان سے شمشیر کھینچ لے

کہتے ہیں وقت لوٹ کے آتا نہیں کبھی
اس یادگار لمحے کی تصویر کھینچ لے

ساجد گلِ مراد کو دامن میں خود گرا
اپنے ہی ہاتھ پر خطِ تقدیر کھینچ لے

صمد انصاری

○

ہم روحِ کائنات ہیں، نقشِ اساس ہیں
ہم وقت کا ضمیر، زمانے کی باس ہیں

تنہا ہیں ہم تمام، نہ قربت، نہ فاصلے
ہم آپ کے قریب، نہ ہم اپنے پاس ہیں

کب سے ٹنگے ہوئے ہیں خلاؤں کے آر پار
کب سے یہ آسماں کے ستارے اداس ہیں

خود رو ہیں ہم، ہمیں نہ خزاں سے ڈرائیے
صحرا کے مست پھول ہیں، جنگل کی گھاس ہیں

خود ہٹ گئے ہیں دُور بہاؤ کے زور سے
دریا کے وہ کنارے جو دریا شناس ہیں

جن کے بدن پہ اطلس و کمخواب ہے صمدؔ
سچ پوچھیے تو لوگ وہی بے لباس ہیں

○

آئینۂ دل، داغِ تمنا کے لیے تھا
سینے کا صدف، اک دُرِ یکتا کے لیے تھا

جو تیرنے والے تھے، وہ منجدھار میں ڈوبے
دریا کا کنارہ، کفِ دریا کے لیے تھا

کیوں ہاتھ میں تیرے مجھے پتھر نظر آیا
دلدار نہ اگر تھا، تو میں دنیا کے لیے تھا

گذرا نہ ترے بعد کوئی کوچۂ دل سے
یہ رستہ بس اک نقشِ کفِ پا کے لیے تھا

دیوار سے رُکتا نہیں دیوار کا سایہ
ضبطِ غمِ ماضی، غمِ فردا کے لیے تھا

بے پردہ چمکتا ہے جو اب محفلِ شب میں
وہ چاند صمدؔ کل یدِ بیضا کے لیے تھا

روحی کنجاہی

○

مضحکہ خیز ہوئی ہنسنے کی کوشش ایسی
کہ نہ ہوگی مرے زخموں کی نمائش ایسی

جیسے ہم بچھڑے ہیں، کوئی بھی نہ بچھڑا ہوگا
نہ ہوئی ہوگی جہاں میں کبھی سازش ایسی

حادثہ یہ ہے کہ میں نے تجھے پا کر کھویا
ورنہ مجھ کو بھی کہاں تھی تری خواہش ایسی

نہ گھروندوں کے نشاں اور نہ مکیں ملتے ہیں
مٹ گیا شہرِ دل و جاں، ہوئی بارش ہوئی

بُت بنا کر جو اٹھایا تو گرا، ٹوٹ گیا
اب پھر اک عمر جو پاؤں تو ہو کاوش ایسی

میں کراچی سے چلوں اور ترا ہو جاؤں
شہرِ لاہور، اگر پاؤں سفارش ایسی

○

چین گھر میں نہ کبھی تیرے نگر میں پاؤں
خود کو ہر لمحہ، میں اک لمبے سفر میں پاؤں

کوئی آواز نہ سایا نہ ہوا میں، ہلچل
معترض! سوچ میں کیا بیٹھ کے گھر میں پاؤں

تو کبھی پھول، کبھی چاندنی تھا میرے لیے
اب تجھے پیرہنِ برق و شرر میں پاؤں

میں کہیں، جسم کہیں اور مری روح کہیں
خود کو بکھرا ہوا ہر راہگزر میں پاؤں

مجھ سے ہر لمحہ کوئی جرم نیا ہوتا ہے
اک نہ اک حادثہ ہر تازہ خبر میں پاؤں

خود ہی رُوحی میں خلاف اپنے گواہی دوں آج
وقعتِ عدل جو منصف کی نظر میں پاؤں

ایوب دوھانی

○

شہر سنسان ہے، خوابوں سے جگائیں کس کو
اپنے قدموں کی بیاں چاپ سنائیں کس کو

ہم سفر کوئی نہیں ہے ترے سائے کے سوا
دشتِ تنہائی میں دیتا ہے صدائیں کس کو

سامنے آتے ہیں سب وہم کے پیکر بن کر
کس کو محسوس کریں، ہاتھ لگائیں کس کو

سب سمٹنے کو ہیں بیتاب کھُلی باہوں میں
ہم خفا کس کو کریں اور منائیں کس کو

دل تو زخموں سے معطر ہے مگر آنکھ نہیں
جشنِ مہکار سرِ راہ دکھائیں کس کو

اب تو ڈھونڈے سے بھی ملتا نہیں دیوانہ کوئی
لوگ بازار میں پتھر سے ڈرائیں کس کو

ذہن میں ایک بھی احساس کی تصویر نہیں
دوستو! نقش یہ دیوار بنائیں کس کو

کوئی پتھر نہیں ایسا کہ خلا کو ڈھانپے
اپنی تعمیر کی بنیاد بنائیں کس کو

کوئی تنکا بھی سہارا نہیں دیتا ایوب
اپنے جذبات کے طوفاں میں بہائیں کس کو

صدیق افغانی

○

آرہی تھی بند کلیوں کے چٹکنے کی صدا
میں سراپا گوش ہو کر رات بھر سنتا رہا

آگ کے سیلِ رواں میں بہ گیا ایوانِ سنگ
دھوپ کی شدّت سے پانی کا سمندر جل اُٹھا

کاش اُتر آئے مرے آنگن میں وہ ماہِ تمام
وحشت کی صورت مرا دامن بھی ہے پھیلا ہُوا

جب رگ و پے میں سرایت کر رہا تھا زہرِ حبس
روزنِ دیوار سے مجھ پر ہنسی ٹھنڈی ہوا

سبز کھیتوں سے کوئی صحرا میں لے جائے مجھے
میں ہرے سُورج کی تابانی سے اندھا ہو گیا

تیز آندھی کی ابھی آہٹ سُنی تھی کان نے
بجھ گیا اُن سرخ ہونٹوں پر تبسم کا دیا

بن گئی زنجیرِ خوشبو دار مٹی کی کشش
میں زمیں سے جب خلاؤں کی طرف جانے لگا

صدیق افغانی

○

کتنی ویرانی تھی میرے سامنے جب تو نہ تھا

دُور تک دل کے بیاباں میں رمِ آہو نہ تھا

یوں تو موضوعات کی بھرمار تھی ہر نوشت

غم سے بڑھ کر زیست کا کوئی حسیں پہلو نہ تھا

کر دیا بے چین تیرے جسم کی جھنکار نے

ورنہ بے موسم کوئی وارفتہ خوشبو نہ تھا

بے تُکے چہروں کی بارش سے اندھیرا چھا گیا

دھیان کے جنگل میں روشن ایک بھی جگنو نہ تھا

کیسے کیسے لوگ دلدل میں اتر کر دھنس گئے

وقت کی بے رحم آنکھوں میں کوئی آنسو نہ تھا

نقش تھی صورت تری ہر ذہن کی دیوار میں

رات بھر میری ہی گردن میں ترا بازو نہ تھا

قتل مجھ کو کر گیا صدیق لہجے کا گداز

وہ ستمگر تھا، جفا جو تھا، مگر بدخُو نہ تھا

رام ریاض

○

کسی نے دور سے دیکھا، کوئی قریب آیا
امیرِ شہر میں جب بھی کوئی غریب آیا

ہوا میں زہر گھلا پانیوں میں آگ لگی
تمہارے بعد زمانہ بڑا عجیب آیا

بریدہ دست، برہنہ بدن، شکستہ پا
ترے دیار میں کیا کیا نہ بدنصیب آیا

کسی کو اب نہ ستائے گی مرگِ نامعلوم
چراغِ دار جلا، موسمِ صلیب آیا

درونِ خانۂ دل آنکھ ہی اٹھائی تھی
مرا رقیب پکارا، مرا رقیب آیا

برس مہینوں میں، ہفتے دنوں میں ڈھلنے لگے
جو رامؔ دور تھا، وہ وقت اب قریب آیا

نذیر قیصر

○

کون ہوں! کیوں زندہ ہوں! سوچتا رہتا ہوں
خوابوں کی دُنیا میں جاگتا رہتا ہوں
رنگ اور خوشبو سے دھندلائے رستوں میں
ہوا کی اُنگلی تھام کے چلتا رہتا ہوں
آوازوں کی گٹھڑی سر پہ اُٹھائے ہُوئے
خاموشی کے زینے چڑھتا رہتا ہوں
جہاں سے میرے جسم کو اک دن اُگنا ہے
میں اس بانجھ زمیں کو ڈھونڈتا رہتا ہوں
آنکھوں کی عریانی سے چھپنے کے لیے
نئے نئے ملبوس پہنتا رہتا ہوں
صبح و شام ہوا کی اندھی لہروں میں
ذرّہ ذرّہ ہو کے بکھرتا رہتا ہوں
سوئی ہوئی راہوں میں تنہا چاند کے ساتھ
ساری ساری رات بھٹکتا رہتا ہوں
لوحِ جہاں پر بنتی بگڑتی تحریریں
دیکھتا رہتا ہوں اور سوچتا رہتا ہوں
جسم و جاں کی دھوپ سے جلتے صحرا میں
اپنا سایہ اوڑھ کے چلتا رہتا ہوں

خالد احمد

○

ربط کس سے تھا کسے، کس کا شناسا کون تھا
شہر بھر تنہا تھا، لیکن مجھ سا تنہا کون تھا

میں سمندر تھا، مگر ویران تھا، صحرا کی طرح
میرے گھر تک چل کے آتا، اتنا پیاسا کون تھا

ریزۂ سنگِ انا تھا راہ کا کوہِ گراں
بڑھ کے لگ جاتا مرے سینے سے ایسا کون تھا

سطح پر خاموشیوں کی گونج ہے نوحہ کناں
اپنی گہرائی کے دریا میں جو ڈوبا، کون تھا

ذات آخر ذات تھی، شہکار پھر شہکار تھے
کس کے فن کے واسطے کس کو سمجھا، کون تھا

پاؤں دھرتی پر تھے، لیکن ذہن تھے آکاش پر
سب کے سب میری طرح بکھرے تھے، یکجا کون تھا

کچھ بُرے تھے، کچھ بھلے تھے، خار کچھ، گلزار کچھ
ہر کوئی انسان تھا، آخر فرشتہ کون تھا

وہ بھڑک اُٹھا تو خالد سوچتا ہی رہ گیا
خوب رو پیکر کے اندر تند خو سا کون تھا

خالد احمد

○

اپنی تنہائی کے سائے سے لپٹ کر سو گئے
رکھ کے اپنے دل پہ تیرے غم کا پتھر سو گئے

ہم کو تیری سرد مہری کی ہوا یخ کر گئی
اوڑھ کر احساسِ محرومی کی چادر سو گئے

گھل گئیں احساس میں افکار کی گہرائیاں
مشتعل جذبات کے خود سر سمندر سو گئے

زیست کی نس نس میں ہے بیدار شاعر کا لہو
دل دھڑکنے پر رہے مامور پیکر سو گئے

نیم خوابیدہ زمیں سورج کی جانب پھر گئی
ایک کروٹ میں ستاروں کے مقدر سو گئے

سب پجاری مر گئے یا زنگ خوردہ ہیں گجر
کیوں ہمارے شہر کے آباد مندر سو گئے

سوچ کے جھونکے چلے یادوں کے جنگل کی طرف
جب ملے سوکھے ہوئے پتوں کے بستر سو گئے

حوصلے سُن ہو گئے اور خواہشیں اُکتا گئیں
پی کے زہرابِ قناعت سارے خود سر سو گئے

بند دروازہ تھا خالدؔ یا عبادت گاہ تھی
اس کے در پہ سارے بے کس سارے بے گھر سو گئے

خالد شیرازی

○

(نذرِ ندیم)

میری تخلیق ہوئی جس کی تگ و تاز کے ساتھ
وہی ذرّہ مجھے تکتا ہے بڑے ناز کے ساتھ

جرم کے بعد کھُلا دل پہ درِ خوفِ سزا
ذہن بیدار ہُوا صبح کے آغاز کے ساتھ

میں نے بھی توڑ دیا خاک کی خوشبو کا طلسم
کھو گیا میں بھی خلاؤں میں بڑے ساز کے ساتھ

پھر مری راہ میں حائل ہے وہی کوہِ سکوت
میں نے کاٹا تھا جسے تیشۂ آواز کے ساتھ

ڈھونڈتی پھرتی ہے کردار کو تمثیلِ گُنہ
رتجگے ختم ہوئے خالدِ شیراز کے ساتھ

خالد شیرازی

○

نہیں ضرور کہ تکمیلِ مدعا دیکھیں
مگر ہے جی میں کہ خونِ جگر بہا دیکھیں

نقوشِ پا، جو ہُوئے جا رہے ہیں گرد، انھیں
تھکاوٹوں سے شرابور لوگ کیا دیکھیں

یہ کیا سفر ہے کہ سیدھے سپاٹ رستے ہیں
کبھی تو ہم کوئی پُرپیچ راستا دیکھیں

فصیلِ شب سے اُدھر دے رہا ہو کوئی صدا
حصارِ خواب میں لیکن سب مجھے گھرا دیکھیں

فضا میں تیر رہے ہوں ہرے بھرے چہرے
خود اپنے چہرے کو لیکن بجھا ہُوا دیکھیں

سفر میں شل ہُوئے جاتے ہوں دھوپ کے پاؤں
اُفق کی آنکھ سے بہتی ہُوئی حِنا دیکھیں

طلوعِ مہر سے پہلے بس ایک پل کے لیے
کسی دیے کی طرح ہم بھی جھلملا دیکھیں

یہ دن بھی خالدِ شیراز دیکھنے تھے ہمیں
نظر اُٹھائیں تو پت جھڑ کا سلسلہ دیکھیں

جمیل ہمدم

○

وقت کی تہ میں اُتر جاؤں گا
میں بھی لمحہ ہوں، گزر جاؤں گا

اب جو نکلا ہوں ترے خواب لیے
تا بہ امکانِ نظر جاؤں گا

تو ہر اک شے میں ملے گا مجھ کو
تجھ کو پاؤں گا، جدھر جاؤں گا

تیری یادوں کے سفینے لے کر
اس سمندر سے گزر جاؤں گا

تو مرا ہمدم و ہمراز نہ بن
میں تو نشہ ہوں، اُتر جاؤں گا

وہ بھی دن تھے کہ گماں ہوتا تھا
تجھ سے بچھڑوں گا تو مر جاؤں گا

ظفر ابنِ متین

○

بلندیوں سے وہیں گی نہ پتیاں اب کے
زمیں کے پاؤں تلے ہو گا آسماں اب کے

گلوں کی چاہ میں بھٹکی روش روش پہ نسیم
یہ اور بات کہ مہکا نہ گلستاں اب کے

یہی نہیں کہ اُڑایا گیا جنوں کا مذاق
اٹھیں ہیں اہلِ خرد پہ بھی انگلیاں اب کے

بنی ہے بات تو کچھ بات بھی چلے شاید
بڑے ادب سے ملا ہے وہ بدگماں اب کے

وہاں وہاں سے اٹھی ہے مہک لہو کی ظفرؔ
چمن میں پھول کھلے تھے جہاں جہاں لب کے

عبداللہ جاوید

○

مشین ہو گئے سب یار کھو گئے سب یار
اکیلے ہم ہی رہے درمیانِ راہ گزار

دیارِ غیر ہو یا ہو دیارِ یارِ عزیز
وہی فضائیں وہی اجنبی در و دیوار

گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ ہی بدلتے ہوئے
نظر کے زاویے، دل کے مزاج، زلف کے تار

وفا کے نام پہ رکنے سے پہلے یاد رکھو
زمانہ نور کی مانند ہے سبک رفتار

جو ہو سکے تو اسے بھی سنبھال کر رکھو
کہ دل میں ہیں کسی اجڑے دیار کے آثار

مشتاق شبنم

○

خسروؤں کو کبھی خاطر میں نہ لاؤ
اے مرے کوہکنو! تیشہ اُٹھاؤ

موج و طوفاں سے گزرنا ہے تمہیں
دوستو ناؤ نہ کاغذ کی بناؤ

دیکھو کس سمت چلی ہے کشتی
دیکھو کس سمت ہے ندی کا بہاؤ

کوئی اس سمت بھی جا کر دیکھو
جس طرف آگ کا روشن ہے الاؤ

سب حقیقت ہے مری آنکھوں میں
اس حقیقت کو فسانہ نہ بناؤ

ہو چکی رات کی تنقیص بہت
گر ہو ممکن تو کوئی شمع جلاؤ

ذکاءالدین شایاں

○

درخت جھک گئے، پتوں نے آنکھیں کھولی ہیں
ہوائیں بہتی ہوئی موج سے جو بولی ہیں

دمکتی کرنیں، غم آلود گرد کی نظریں
جو ہم چلے ہیں، تو سب ساتھ ساتھ ہولی ہیں

تمام شہر و بیاباں کے راز لانا ہیں
ہوا نے رات کے پانی سے آنکھیں دھولی ہیں

فسردہ سینے کو بے رنگ و پُر سکوں پا کر
ہم اہلِ غم نے تری یادیں ہی چبھولی ہیں

سوائے چند دھندلکوں کے آئے گا اب کون
شفق نے ٹیلوں پہ یہ کیوں کتابیں کھولی ہیں

کبھی اکیلے میں، یوں بھی ہوا کہ ہم سے دُور
تمھاری پلکیں خود آپس میں مل کے رولی ہیں

تھکن سے چور، امیدوں کے چند خواب لیے
ہمارے بازو پہ خوشبو کی راتیں سولی ہیں

بشیر منذر

○

ہم بیابانوں میں گھومے، شہر کی سڑکوں پہ ٹہلے
دل کسی صورت تو سنبھلے، دل کسی صورت تو بہلے

زندگی کے راستے میں دو گھڑی کا ساتھ ہے یہ
اپنے من کی میں بھی کہہ لوں، اپنے من کی تو بھی کہہ لے

گویا زندہ رہنا بھی اک جرم تیرے شہر میں تھا
ہم ہر اک آہٹ پہ لرزے، ہم ہر اک دھڑکن پہ دہلے

اب تو تا حدِ نظر ویرانیاں پھیلی ہوئی ہیں
گھر کا یہ بے در خرابہ کتنا تھا آباد پہلے

وقت ایسا آگیا ہے، خامشی بہتر ہے منذر
بات جو کہتا ہے سُن لے، چوٹ جو لگتی ہے سہہ لے

افتخار نسیم

○

ہے جستجو اگر اُس کو، اِدھر بھی آئے گا
نکل پڑا ہے تو پھر میرے گھر بھی آئے گا

تمام عمر کٹے گی یونہی سرابوں میں
وہ سامنے بھی نہ ہوگا، نظر بھی آئے گا

جو گم ہُوا ہے نئے شہر کے مکینوں میں
وہ دیکھنے کو کبھی یہ کھنڈر بھی آئے گا

رچی ہے میرے بدن میں تمام دن کی تھکن
ابھی تو رات کا لمبا سفر بھی آئے گا

ذرا سی دیر میں ہر شے چمک اُٹھے گی نسیمؔ
سحر ہوئی ہے تو نورِ سحر بھی آئے گا

احمد ندیم قاسمی

○

انداز ہو بہو تری آوازِ پا کا تھا

دیکھا نکل کے گھر سے تو جھونکا ہوا کا تھا

اس حسنِ اتفاق پہ لُٹ کر بھی شاد ہوں

تیری رضا جو تھی، وہ تقاضا وفا کا تھا

دل راکھ ہو چکا تو چمک اور بڑھ گئی

یہ تیری یاد تھی کہ عمل کیمیا کا تھا

اس رشتۂ لطیف کے اسرار کیا کھلیں

تو سامنے تھا، اور تصوّر خدا کا تھا

چھپ چھپ کے روؤں، اور سرِ انجمن ہنسوں

مجھ کو یہ مشورہ مرے دردآشنا کا تھا

اُٹھا عجب تضاد سے انسان کا خمیر

عادی فنا کا تھا تو پجاری بقا کا تھا

ٹوٹا تو کتنے آئنہ خانوں پہ زد پڑی

اٹکا ہُوا گلے میں جو پتھر صدا کا تھا

حیران ہوں کہ دار سے کیسے بچا ندیم

وہ شخص تو غریب و غیور انتہا کا تھا


جب ہر روز شیو آرام دہ نہیں بنتا تو پھر سستا بلیڈ کیوں استعمال کرتے ہو؟
میں شیو پر زیادہ پیسے خرچ کرنا نہیں چاہتا تم ہی بتاؤ کیا کروں؟
سستے بلیڈ ہمیشہ مہنگے پڑتے ہیں۔ نہ شیو آرام دہ بنتا ہے اور نہ زیادہ دن چلتے ہیں۔ اسی لئے میں تو ٹریٹ بلیڈ ہی استعمال کرتا ہوں۔ کہنے کو تو ٹریٹ مہنگا ہے۔ لیکن زیادہ دن چلتا ہے اور شیو بھی دوگنا آرام دہ بناتا ہے۔
چند دن بعد
کہو ٹریٹ بلیڈ استعمال کیا؟
ہاں، واقعی ٹریٹ بلیڈ سے شیو بھی آرام دہ بنے اور بلیڈ بھی زیادہ دن چلے۔ اور اس حساب سے ہر شیو پر خرچ بھی کم رہا۔
ہر چہرے کیلئے موزوں ٹریٹ بلیڈ
سب یہ جانتے ہیں کہ صاف ستھرے شیو کے لئے پاکستان میں بننے والے بلیڈوں میں ٹریٹ بلیڈ سب سے اعلیٰ اور کوالٹی میں یکساں ہے اور اس سے شیو بھی زیادہ بنتے ہیں۔
ٹریٹ بلیڈ آرام دہ شیو، زیادہ شیو، کم خرچ شیو
Treet
A Treet FOR YOUR FACE
Treet
BLADE double edge
PRESTIGE T.B

شہرۂ آفاق
کریزک میٹرز

پاکستان میں اسمبل کیے جا رہے ہیں اور اب محدود تعداد میں دستیاب ہو سکتے ہیں ——!



صنعتی مقاصد کیلئے بجلی کے میٹر

3 فیز - 3 وائر اور 3 فیز - 4 وائر

400 وولٹس 50 سائیکلز

5 تا 400 امپز کیپیسٹی

مقامی فیکٹری سے حاصل کیے جا سکتے ہیں



گھریلو استعمال کیلئے بجلی کے میٹر

سنگل فیز —— 2 وائر

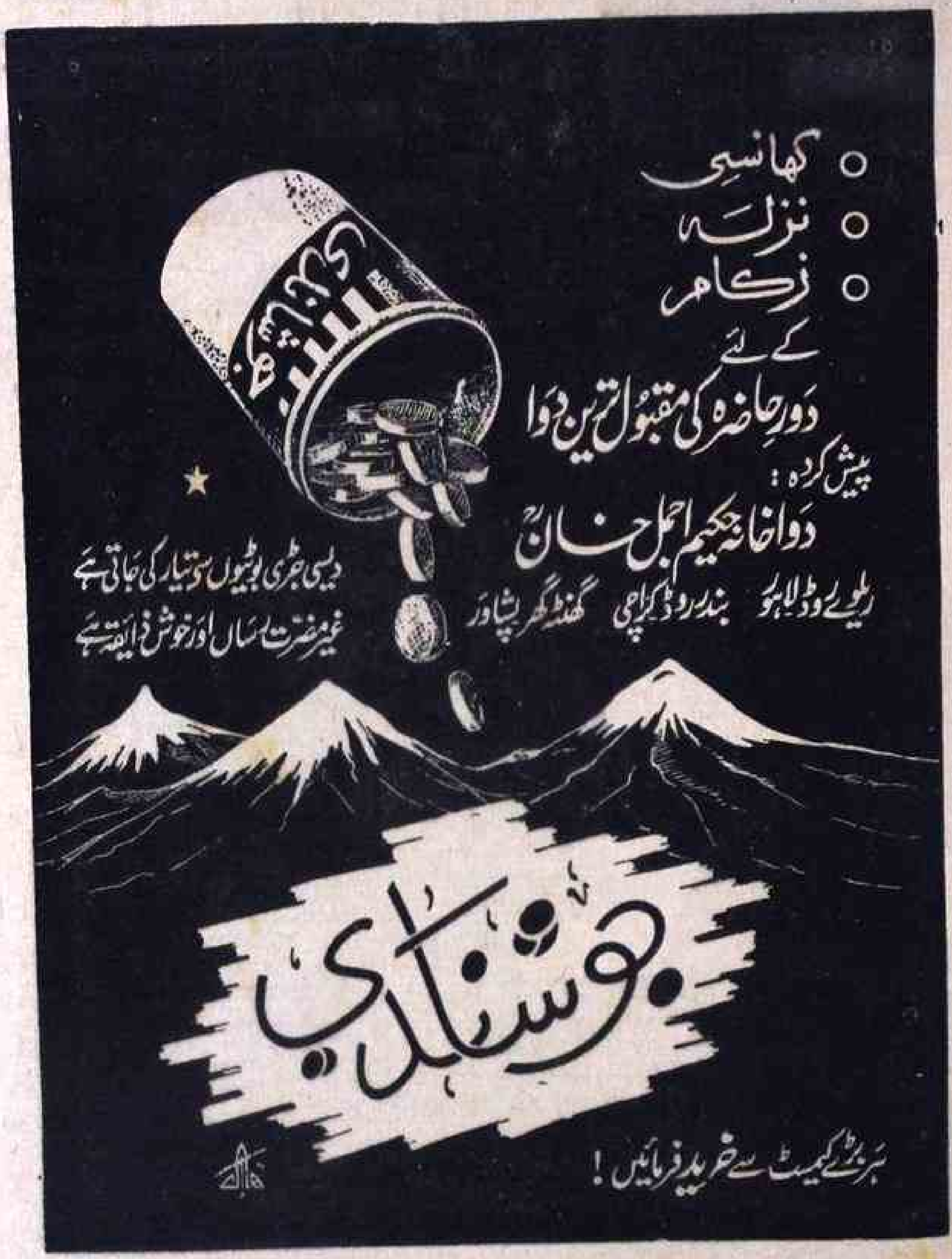
230/250 وولٹس - 50 سائیکلز

10 امپز تا 40 امپز

مقامی فیکٹری سے دستیاب ہو سکتے ہیں۔

عمدہ کام کی گارنٹی۔ مفت سروس اور نقص کی صورت میں تبدیلی کا وعدہ۔

سیّد بھائیز لمیٹڈ —— لاہور


کھانسی
نزلہ
زکام
کے لئے
دورِ حاضرہ کی مقبول ترین دوا
پیش کردہ:
دواخانہ حکیم اجمل خان
ریلوے روڈ لاہور بندر روڈ کراچی گھنٹہ گھر پشاور
دیسی جڑی بوٹیوں سے تیار کی جاتی ہے
غیر مضرت رساں اور خوش ذائقہ ہے
جوشاندی
ہر بڑے کیمسٹ سے خرید فرمائیں!


DEW
WITH LANOLIN CREAM
ڈیو ٹائیلٹ سوپ
یکدم
مسرت
*
خوشبو، تازگی، فرحت
اور ملائم جھاگ
ڈیو کی
انمول خوبیاں
AIM
FZS 41 E 67

عبدالرحمٰن چغتائی

دَورِ احیاء اور اسکا ایک عظیم فن کار

تاثرات کا یہ پلندہ ان دنوں کی یادوں پر مشتمل ہے جب میں اٹلی کی وادیوں، سبزہ زاروں، اس کے شہروں اور گلی کوچوں میں آرٹ کی ابتدا اور انتہا دیکھنے کی غرض سے اندھا دھند پھر رہا تھا اور ہر گھڑی یہ بھی سوچتا تھا کہ آخر ہمارا اپنا ملک بھی تو روایات اور ثقافتی قدروں کا گہوارہ ہے۔ ایک عظیم خطۂ ارضی جہاں تاریخ نے بڑے سے بڑا واقعہ دہرایا ہے۔ آخر یہ دنیا جس میں سے میں گزر رہا ہوں میری دنیا سے الگ تھلگ کیوں نظر آ رہی ہے۔

ان دنوں میرے ساتھ ایک جرمن لڑکی تھی اور میں چاہتا تھا کہ وہ مجھے یورپ کا۔ وہ گوشہ، جہاں آرٹسٹ اپنی تخلیق کے لئے ریاضت کرتے رہے ہیں، دکھانے میں میری مددگار ثابت ہو۔ اس کے عوض اس کی خواہش تھی کہ میں اسے ان جگہوں پر لے جاؤں جہاں تاج محل، لال قلعہ اور جامع مسجد اپنے مداحوں کی راہ دیکھ رہے ہیں۔

میں ان دنوں یہی کچھ چاہتا تھا کہ میں اپنے وطن لوٹوں تو کچھ ایسے تاثرات لیتا جاؤں جن سے ہمارے فن میں اضافہ ہو۔ میں نے ان دنوں بھی یہی دیکھا اور آج بھی یہی دیکھتا چلا آ رہا ہوں کہ ابھی وہ آرزوئیں اور ولولے ہمارے اندر پیدا نہیں ہوئے جن سے ہمارا ملک آرٹ کے معاملے میں ان ملکوں کا ہم پلہ کہلاتے۔

جب ہم پیرس میں تھے تو بعض مقبول ترین درسگاہوں کی طرف سے اعلیٰ ترین جسم والی حسیناؤں کے ماڈل سے استفادہ کرنے کے لئے ٹکٹ بازاروں میں فروخت ہوتے تھے۔ کچھ ایسے ہی جیسے گھوڑ دوڑ کے ٹکٹ فروخت ہو رہے ہوں۔ یہ واقعہ ۱۹۳۱ء کا ہے۔

آج بدلے ہوئے حالات کے مدنظر ایسا نظر آتا ہے کہ وہ درسگاہیں اب پیرس میں ختم ہو چکی ہوں گی کیونکہ عصرِ جدید کی ضرورتوں کے مدنظر اب اس ماڈل کی ضرورت کا احساس ختم ہو چکا ہے جس کا بوجھ غریب آرٹسٹ اٹھا بھی نہ سکتے تھے۔ ہمارے ہاں بھی کچھ دن ماڈل کا رواج تھا جو بھکاری بھکارن اور مزدور تک محدود تھا۔ پیکاسو، برک اور رووَلو نے ماڈل کی ضرورت کو ختم کر کے "پیٹرن" رائج کر دیا ہے۔ یہ پیٹرن جو پیرس میں تیار ہوا، اس کی سپلائی امریکہ، انگلستان، اٹلی تک پہنچ گئی۔ یہاں تک کہ اس کی سپلائی مشرق میں بھی کھلے بندوں ہونے لگی اور یہاں بڑے تپاک سے اس کا خیر مقدم ہونے لگا اور وہ بھی کچھ اس انداز سے جیسے یہ پیٹرن انہیں ورثہ میں ملا ہے۔ پھر کیا تھا، اکثر آرٹسٹ ان بنے بنائے پیٹرنوں کی تلاش میں مارے مارے پھرنے لگے — بزعمِ خویش اپنی "موروثی" جائداد حاصل کرنے کے لئے — وہ ہمیشہ اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ ان کے یہ پیٹرن دیکھنے والا خود بھی ان گہرائیوں اور ان کی الجھنوں کا حل تلاش کرے جو انہوں نے پیٹرن کو اڑانے میں حاصل کی ہیں۔

مجھے نقاد ہونے کا دعویٰ نہیں۔ پیٹرن دیکھ کر اکثر چپ اس لئے ہو جاتا ہوں کہ کم سے کم یہ تو سمجھ سکوں کہ یہ پیٹرن آخر کہاں سے اور کس کے

حصے میں آتا ہے۔ بہر حال اب یورپ میں نہ ماڈل کا شور ہے اور نہ یہ امید ہے کہ پھر اس دھرتی پر وہ لیناڑدو ڈونچی، مائیکل انجلو، نیپولیپی، جنٹل بلینی واپس لوٹ سکیں گے۔ جن کے معتبر ناموں سے آج بھی اٹلی کے گلی کوچے آباد ہیں اور پتہ چلتا ہے کہ ان آرٹسٹوں نے کس حد تک آرٹ کو اپنے ہم وطنوں کا جزوِ زندگی بنانے میں محنت کی تھی۔ یہ آرٹسٹ، یہ فن کار، یہ جمالیاتی حسن کی سی دولت تقسیم کرنے والے جو کچھ بھی چھوڑ گئے ہیں انہیں دیکھنے کے لئے ہر روز لاکھوں انسان ان کے ملکوں میں والہانہ انداز میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ وہ اس تازگی، اس اسلوب اور اس ارتقاء سے محروم نہیں رہنا چاہتے جس سے زندگی کی تہذیبی قدریں ہم معنی قرار پا گئی تھیں۔ جرمن لڑکی نے بڑے انہماک سے کہا "تمہاری تو یہی کوشش ہے کہ جو کچھ بھی تم یہاں سے لے جا سکو لے جاؤ، مگر مجھے بھی ساتھ لے جانا کہ میں بھی تمہارا تاج محل، لال قلعہ اور جامع مسجد دیکھ آؤں، جن کا تصور ——— میرے قلب کو گرمائے رکھتا ہے۔"

اور میرے قلب کو جن مشاہدات نے گرمایا، ان کے سلسلے میں مائیکل انجلو پیل کر رہی ہے۔

استاد کمال الدین بہزاد، مشرق کے ان عظیم فن کاروں میں واحد آرٹسٹ ہے، جس کی بین الاقوامی شہرت سے مسلمانوں کی مصوری کا وقار بلند ہے اور فخر محسوس ہوتا ہے کہ مغرب کا تنقیدی انداز استاد بہزاد کی مصوری کے متعلق سنجیدہ اور روح پرور ہے۔ یہ بات قابلِ ستائش بھی ہے کہ استاد بہزاد رنگ و نسل سے بالاتر مشرقی مصوری کا نمائندہ اور ایک عظیم دور کا پیش رو سمجھا جاتا ہے۔ بہزاد کا نام ایک ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ نام لینے اور سننے والوں میں اس کا احترام واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ البتہ ان لوگوں میں تقریباً ننانوے فی صد لوگ ایسے ہیں، جنہیں بہزاد کا نام تو یاد ہے لیکن انہیں اس کی کوئی ایک بھی تصویر دیکھنا نصیب نہیں ہوئی ہوگی۔

بہزاد کے اسلوب اور کردار کی عظمت سے اس عظیم دور کے عظیم فنکاروں نے اپنے تخلیقی شاہ کاروں سے ایرانی مصوری کو وہ لازوال حسن بخشا ہے جس کا مغرب کو کما حقہٗ اعتراف ہے۔ اس دور کے مصوروں میں سلطان محمد، استاد میرک، قاسم علی، حاجی محمد نقاش عبداللہ خراسانی، آقا رضا، آغا میر علی اور دوسرے مصور شامل ہیں۔ ان کا رشتہ دربار سے تھا۔ انہوں نے ایرانی مصوری میں ایک ایسی ہم آہنگی پیدا کر دی تھی کہ مسلمانوں کی مصوری کے رشتے عراق، ترکی، ایران اور ہندوستان تک پھیلتے چلے گئے۔ ساتھ ہی یہ مصور ایک دوسرے کے قریب ہونے کے باوجود اپنے اپنے انفرادی اسلوب کے استاد تھے۔

دورِ احیا کے آرٹسٹ لیونارڈو ڈونچی، مائیکل انجلو، گوونی بلینی، ٹیشین، بوٹاچیلی، جنٹل بلینی، فلیپو لیپی اور دوسرے کئی آرٹسٹ استاد بہزاد کے ہم عصر تھے۔ دورِ احیا کا عظیم دور ہی مائیکل انجلو اور استاد بہزاد کا دور تھا۔ اس حقیقت کے مدِ نظر بعض لوگوں نے استاد کمال الدین بہزاد اور رفائیل کا مقابلہ کیا ہے ان میں اکثر ایسے لوگ شامل ہیں جو نہ تو استاد بہزاد کے فن کو جانتے ہیں اور نہ رفائیل کے آرٹ کو سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے ان دونوں سکولوں کے فنی اسلوب کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ یہ یقیناً درست ہے کہ استاد بہزاد اور رفائیل بھی دورِ احیا کے دوسرے مصوروں کی طرح ایک دوسرے کے ہم عصر تھے، کوئی ایسا ذریعہ نہ تھا کہ یہ دونوں عظیم اُستاد ایک دوسرے کے قریب ہوتے اور انہیں ایک دوسرے سے مستفید ہونے کا موقع ملتا۔ اگر ان کے آرٹ میں کوئی رابطہ پیدا ہوتا تو مشرق و مغرب کا ملاپ مصوری کا کوئی نیا رنگ روپ اختیار کر جاتا۔

سلطان حسین مرزا، شیر نوائی، شاہ اسمٰعیل صفوی اور شاہ طہماسپ نے جس طرح اپنے ایرانی مصوروں کی قدردانی کی اور ہنر پروری کا ثبوت دیا اس کی متوازی مثال فلارنس کے مشہور خاندان مڈیچیا نے ہنر پروری کے سلسلے میں پیش کی اور اپنے فن کاروں کو موقع مہیا کیا کہ ان کے باکمال

فن کاروں کے پھلنے پھولنے میں کوئی کسر نہ رہ جائے۔ خصوصیت سے وہ ان آرٹسٹوں کی سرپرستی کرتے رہے جو اس وقت فلارنس میں مقیم تھے۔ ان آرٹسٹوں نے جو کچھ بھی اپنے ملک اور قوم کے لئے چھوڑا ہے اس میں انہوں نے والہانہ جذبات کے ساتھ اپنے مذہبی عقائد پیش کئے۔ یہ ان کا ایمان تھا اور ان کے نزدیک انسانی دوستی کا تقاضا بھی تھا کہ انجیل مقدس کی تصویریں تخلیق کی جائیں۔ وہ جو کچھ بھی تخلیق کرتے اس کا رشتہ کسی نہ کسی شکل میں ان کے عقائد اور عیسائیت سے ضرور جا ملتا تھا۔

فلیپو لیپی، جنٹل بلینی، گودینی بلینی اور بوٹا چیلی کی تصویروں میں مشرق کے اثرات بہت نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان کی تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی فنی کائنات مغرب کے علاوہ مشرق میں بھی پھیلی ہوئی تھی۔ خصوصیت سے بوٹا چیلی اس حد تک مشرق سے متاثر ہے کہ حیرت ہوتی ہے اس کی سوچ بچار تک میں مشرقیت اور مشرق کا فیضان ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ مشرق کا پروردہ ہے۔ اس کی مشرقیت بھرپور ہے۔ جنٹل بلینی کی مشرقیت اسے قسطنطنیہ لے گئی اور سلطان محمد خلیفۂ وقت نے اسے ملاقات کا شرف بخشا۔ سلطان کی نوازشات نے اسے اپنے کمال اور جوہروں کو اور زیادہ جلا دینے میں مدد دی۔ اس نے سلطان محمد دوم کی ایک لافانی شبیہہ بنائی۔ آج یہ شاہ کار لنڈن نیشنل آرٹ گیلری کی زینت ہے۔ اسے ان شاہ کاروں میں شامل کیا جاتا ہے جو اپنی فنی خوبیوں اور اسلوب کی وجہ سے انفرادی اور کمیاب سمجھے جاتے ہیں۔ یوں تو دیراں اور دوسرے کئی آرٹسٹوں نے مشرقی سرزمین کی تصویریں بنائی ہیں لیکن یہ واحد تصویر ہے جو ایک سلطان کے نام اور آرٹسٹ جنٹل بلینی سے منسوب ہے جس سے اس کے قسطنطنیہ جانے اور سلطان محمد دوم کی شبیہہ بنانے کی تصدیق ہوتی ہے۔ جنٹل بلینی نے وہاں کے قیام میں اور بھی تصویریں بنائی ہیں لیکن ایک تصویر جو اس نے ترکی طرزِ نگارش میں ایک ترکی آرٹسٹ کی بنائی ہے قابلِ مطالعہ ہے۔ یہ ایک البم میں لگی ہوئی ہے اور اس کا سائز بھی مشرقی تصویروں کا سا ہے۔ کبھی خیال کیا جاتا تھا کہ یہ شبیہہ استاد بہزاد کی بنائی ہوئی ہے۔ اور یہ اس کا ایک ناقابلِ فراموش شاہکار ہے۔ پھر یہ بھی چرچا رہا کہ استاد بہزاد نے یہ تصویر اصل تصویر سے نقل کی ہے۔ اس تصویر کی نقلیں تو ملتی ہیں لیکن یہ کبھی تصدیق نہیں ہو سکا کہ استاد بہزاد نے بھی اس تصویر کی نقل اتاری تھی۔ یہ تصویر ۱۴۷۹ء میں جنٹل بلینی نے قسطنطنیہ میں مکمل کی اور وہ آج بھی جوں کی توں ترکی میں موجود ہے۔ طرز اور تکنیک کے لحاظ سے اسے ایک قابلِ قدر شبیہہ کہا جا سکتا ہے۔

مائیکل انجلو، لیونارڈو ڈاونچی، ٹیشین اور رفائیل ایک دوسرے کے ہم عصر تھے۔ ان کے فن نے فلارنس، روم اور پورے اٹلی میں ایک نئے دور کا آغاز کیا جس کے ردِّ عمل سے مشرق کے اور خصوصیت سے مسلمانوں کے تہذیبی اثرات کم ہوتے گئے۔ ابن جابر بارہویں صدی عیسوی میں جزیرہ سسلی سے گزرتا ہے اور یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتا ہے کہ ولیم دوم بادشاہِ وقت خوب عربی بولتا اور لکھتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے دربار میں بھی عرب موجود تھے۔ وہ عید مناتے تھے اور روزے رکھتے تھے۔ عیسائی خواتین بھی عربی خوب بولتی تھیں اور مسلمان عورتوں کی طرح نقاب ڈال کر نکلتی تھیں۔ اسی کے پس منظر میں دیکھئے کہ بارہویں اور تیرہویں صدی عیسوی تک عیسائی مصوروں نے جس قدر حضرت بی بی مریمؑ کی اور ان کے ہمراہ حضرت زکریاؑ کی تصویریں بنائی ہیں ان میں عربی لباس کے علاوہ تصویروں کی نگارش صحراؤں کی یاد دلاتی ہے۔ اس صورت میں اسے ان غیر معمولی شخصیتوں کا کرشمہ کہنا چاہئے کہ دیکھتے ہی دیکھتے یہ اثرات کم ہو گئے اور مغربی مصوری کی طرزِ نگارش اور اسلوب کو نئے سانچوں میں ڈھال دیا گیا۔ انہوں نے مشرقی طرزِ معاشرت اور اس کے اثرات کو اس حد تک ختم کیا کہ پھر مشرقی اثرات نے اس انداز سے کبھی سر نہ اٹھایا جس انداز سے بوٹا چیلی، فلیپو لیپی، جنٹل بلینی اور دوسرے "مشرق زدہ" آرٹسٹوں نے انجیل مقدس اور حضرت یسوع مسیح کے اعلیٰ کردار کی پیش کش میں اپنی انفرادیت کو نمایاں کیا تھا۔ انجلو، رفائیل اور ٹیشین کا زاویۂ نگاہ

ہیئت اور مواد کے متعلق کتنا ہی مغربی اور انفرادی ہو، بوٹا چیلی، جنٹل بلینی، فلیپولیپی، جیٹو اور دوسرے "مشرق زدہ" آرٹسٹوں کا جمالیاتی نظریہ اور اسلوبِ فن براہِ راست حضرت یسوع مسیحؑ کی مشرقیت سے وابستہ تھا، اور وہ آرٹسٹ یہی چاہتے تھے - ان کی مشرقیت سے ہی وہ فضا اور وہ کسک پیدا کی جا سکتی تھی جس سے ان کے پیغمبر کو گزرنا پڑا - مائیکل انجلو اور دوسرے مغربی آرٹسٹوں نے بدلتے ہوئے حالات کے مدِ نظر مقدس انجیل کی ترجمانی کی تاکہ عیسائیت کا پرچار ہو، عبرانیت کی خدمت ہو اور یونانیت کی مشابہت پیدا ہو - یوں مغرب کی ثقافت نئے شعور سے آشنا ہوئی -

مغربی آرٹسٹوں نے اپنی روشن خیالی اور اپنے زاویۂ نگاہ کی تائید میں ماڈل کی تلاش شروع کی - اس سے ان آرٹسٹوں کو یہ فائدہ ہوا کہ عورتیں اور مرد اپنے خصوصی کرداروں کی دیکھ بھال میں لگ گئے - یہاں تک کہ بڑے بڑے گھرانوں کی عورتیں خود کو ماڈل کی حیثیت سے پیش کرنے لگیں اور یہ احساس بھی بڑی شدت سے دلوں میں گھر کر گیا کہ اس سے ان کے کرداروں پر خوشگوار اثر پڑے گا اور انہیں اسی مقدس فعل سے بقا حاصل ہو گی - مائیکل انجلو، رفائیل، لیونارڈو ڈونچی کے ماڈل اور ماڈل کے انتخاب کے قصے کہانیاں زبان زد ہوتی گئیں - ہوتے ہوتے ماڈل کو اس قدر شہرت حاصل ہوئی کہ ماڈل خود اپنی نمائش کرنے لگے - وہ آرٹسٹوں کے ہم رکاب ان کے جمالیاتی نظریوں کی تائید میں خود کو ان کے رحم وکرم پر چھوڑ دیتے اور خود بھی ان نظریوں کی گہرائی تک پہنچنے کی کوشش کرتے تاکہ آرٹ کے واسطے سے وہ بصیرت سے مالا مال ہوں اور حضرت یسوع کی خوشنودی حاصل کر سکیں - اسی شوق کی شدت میں عورتیں اپنے ستر کو کھو دیتیں اور اپنے خاندانی وقار کو فروخت کر دیتیں - مگر ایسا نظر آتا ہے کہ اس جنونِ تقلید نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے - انجلو کا غلام حضرت یسوع مسیح کا شاہ کار، حضرت موسیٰ کا مجسمہ، ڈیونچی کی مونا لیزا، میڈونا آف دی روک، ٹیشین کی وینس ماڈل ہی کا کرشمہ ہیں - یہ استادوں کا کمالِ فن ہے کہ انہوں نے جس اسلوب کی داغ بیل ڈالی اسے آیندہ صدیوں تک برتا گیا - ڈونچی کی شبیہہ نگاری، اور مضمون نگاری نقادوں کو کچھ ایسی راس آئی - ان کے لیے اس کی ذہنی بلندیوں کو چھونا مشکل تھا - مگر اس کے شاہ کار ان کے اندر ہیجان پیدا کر دیتے تھے - مونا لیزا کی اپنی شخصیت نے بھی ڈونچی کے تصورات کو تکمیل دینے میں اس کی مدد کی اور اس کے ساتھ پورا پورا تعاون کیا تھا جب وہ ماڈل کی حیثیت سے اپنے تخلیق کار کے سامنے بیٹھی تو اس نے آرٹسٹ کی دنیا ہی بدل ڈالی - یہ ایک حقیقت ہے کہ اس کی شبیہہ میں برابر نئے سے نئے رموز کا پتہ چلایا جاتا رہتا ہے - ہر نقاد یہ کہنے پر مجبور ہے کہ مونا لیزا مٹی کا مادھو یا موم کی مریم نہ تھی بلکہ جیتی جاگتی عورت تھی - وہ ذہین بھی تھی اور آرٹسٹ کے نظریے کو سمجھ کر اس کا ماڈل بنی تھی وہ ایک حقیقت تھی جس نے لینارڈو کے پندار کو ہلا دیا اور وہ بغیر کسی تامل کے اس کے قدموں پر گر گیا - انصاف سے دیکھا جائے تو وہ دونوں اپنے اپنے فرائض میں پورے اترے

آرٹسٹ مغربی ہو یا مشرقی، اس کی دنیا میں ہمیشہ ایسی شخصیتوں کا گزر رہا ہے جنہوں نے ثقافتی قدروں اور معاشرتی نظام میں ایک دوسرے کی مدد کی اور یہ تعاون ان کا جزوِ زندگی بن گیا - یہ ذرائع کبھی کم نگاہی سے ہاتھ نہیں آتے اور نہ یہ اتفاقات بغیر جذبے کے حاصل ہوتے ہیں -

لیونارڈو ڈونچی کے عظیم ہونے میں بہت سی تاریخی سندیں موجود ہیں اس کی شخصیت کے منفرد ہونے میں مونا لیزا کا انتخاب ہی ایک ناقابلِ فراموش شہادت ہے - اُس نے اس عورت کو میڈونا کے روپ میں دیکھا اور نہایت عجز سے اسے اپنے سامنے ماڈل بن کر بیٹھنے کی درخواست کی - وہ اس کے دل و دماغ پر کچھ اس طرح چھا گئی تھی کہ اس کے بعد اسی کی ہر تخلیق اور تصویر میں وہی اس کے تصورات میں بسی ہوئی نظر آتی ہے - وہ پہلا نقاد، وہ پہلا "نگار ساز" جس نے لیونارڈو کو مونا لیزا کے بھیس میں پہچانا اور رنگوں میں ملبوس مسکراہٹوں میں جانچا پرکھا،

بہت بڑی صداقت کا دریافت کنندہ ثابت ہوا۔ جب وہ تصویر کے سامنے رک گیا ہوگا تو وہ آرٹسٹ کے ہم رکاب ۔ اس کے دوش بدوش ۔ کہاں سے کہاں جا پہنچا ہوگا ۔

مونالیزا کی شبیہہ سے فن میں کئی خوشگوار پہلو روشن ہوئے اور انہوں نے ایسے زاویے اختیار کئے کہ ان سے باقاعدہ تحریکیں پیدا ہوئیں۔ مونالیزا کے پہلے نقاد نے اس شبیہہ کو چاہے باقاعدہ تنقیدی شعور سے نہ دیکھا ہو لیکن یہ طے ہے کہ لیونارڈو کی اس تخلیق نے فن کی پرکھ کے نئے معیار قائم کئے۔ میں ایک آرٹسٹ کی حیثیت سے یہ کہنے کا حق رکھتا ہوں کہ مونالیزا پر تنقیدی تبصروں کے ضمن میں جو حقائق اور افسانے جمع ہوئے ہیں وہ بہت کام کا سرمایہ ہیں۔ ہر تخلیق کا پس منظر مہذب اور تہذیب یافتہ قوموں کا کرشمہ ہے، جسے نظر انداز کرنا اور اس کی اہمیت پر غور نہ کرنا اپنی کند ذہنی اور جمالیاتی حسن سے محرومی کا اظہار کرنا ہے ۔

میں خیال کرتا ہوں کہ لیونارڈو سے کہیں زیادہ مونالیزا نے اپنے شعور کی تابانی اور غیر معمولی ذہانت کا ثبوت دیا ہوگا وہ زندگی کے بے شمار وسائل اور ہر آسائش کی مالک تھی مگر برسوں، آرٹسٹ کے چکر کو چکر نہ سمجھتے ہوئے پورے استقلال سے اپنے کردار کی پاسبانی کرتی رہی۔ فنی پختگی سے کہیں زیادہ اس کا استقلال اور کردار آرٹسٹ کے کام آیا۔ وہ اس دوران یقیناً ایسے مراحل سے بھی گزری ہوگی کہ اس نے اسکے واردات قلب کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے اندر جھانک کر بھی نہ دیکھا ہوگا۔ اور یوں اس کا ماڈل، بگلوں سے اور رنگوں کے ملاپ سے زیادہ بلند، مہذب جنسی میلان سے کہیں زیادہ، روحانی میلان سے حیرت انگیز طور پر دوچار ہوا ہوگا۔

جب ہم لیونارڈو کے اس شاہ کار کے سامنے جا کھڑے ہوتے ہیں تو زندگی مسکراتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ تخلیقی کارنامہ جلال و جمال کے بطن سے جنم لیتا ہے۔ اسی کے آغوش میں پلتا اور پروان چڑھتا محسوس ہوتا ہے۔ اسے جب بھی دیکھو، اس کی آپ بیتی اپنے نصب العین کے محور کے گرد اپنے دوام کا یقین دلاتی ہے ۔

ماڈل کی روایات پر نگاہ ڈالی جائے تو اکثر ایسا دکھائی دیتا ہے کہ یہ بھی غلامی کی روایات کا ایک عکس ہے جس سے ایک تخلیق کار متاثر ہے وہ اپنی قوتِ تخیلہ کو ایک ایسی مورت کے قدموں میں ڈال دیتا ہے جس سے اس کی غلامی کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں تاریخ نے کچھ ایسے سچے اور جھوٹے قصے گھڑے ہیں کہ وہ تاریخ کا ایک اہم حصہ بن چکے ہیں صرف نام درست رہ جاتے ہیں مگر فرضی واقعات کا ایک انبار اس کے گرد جمع ہو جاتا ہے۔ اس کے باوجود ان واقعات کی بھی ایک افادیت ہے۔

ہمارے قدیم گھر میں ہمارے ہمسائے کی ایک معصوم بچی ہمارے بچوں کے ساتھ کھیلنے کی غرض سے آیا کرتی تھی۔ تھی تو وہ بچی مگر اس کے اطوار میں سلیقہ تھا۔ اس کے خد و خال میں انفرادیت تھی اور وہ اپنے چلنے پھرنے، لوچ، لچک سے فوراً سب کی توجہ کا مرکز بن جاتی تھی۔ وہ جب بھی آتی اس کی انفرادیت خاص طور سے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیتی۔ میں اکثر اسے گود میں اٹھا لیتا، اس کے گال تھپکتا، بڑے پیار سے اس کو اپنے قریب لانے کی کوشش کرتا اور گود سے اتار کر بھی محوِ تماشا رہتا۔ وہ کچھ دن نہ آتی تو میں اسے بلا بھیجتا۔ اب وہ دس گیارہ سال کے لگ بھگ ہو چکی تھی پھر وہ کئی دن تک مجھے نظر نہ آئی تو میں نے اُسے بلا بھیجا۔ معلوم ہوا وہ اب نہ آئے گی کیونکہ اسے اپنی والدہ کا ہاتھ بٹانا ہوتا ہے۔ جب وہ بیاہی گئی تو میری بیوی نے اس کو سہاگن بنانے میں عملی حصہ لیا۔ ہماری ہزار دلچسپی کے باوجود وہ پروان نہ چڑھی اور گزر گئی۔ وہ سادہ اور حسین دلہن میری تصویروں اور رنگوں میں زندگی کی کروٹیں لیتی نظر آتی ہے۔ اس کا شعور، اس کی بے نیازی مجھے مونالیزا سے کہیں زیادہ خوبصورت محسوس ہوتی ہے۔ اس کی معصوم مسکراہٹیں پھیلتی پھیلتی مجھے کہکشاں کو چھوتی محسوس ہوتی ہیں۔ میرے فن میں اس کی حیثیت کائنات گیر ہے۔

انفرادیت کا مفہوم کچھ بھی لیا جائے لیکن یہی انفرادیت ہے جس سے فنی عمارت مضبوط اور استوار ہوتی ہے۔ ڈاونچی کی یہی انفرادیت ہے جس نے "فن نگاروں" کو اپنے طلسم کا اسیر بنایا۔ ہوتے ہوتے اس ضمن میں اتنا مواد جمع ہوتا گیا کہ آج وہ تحریریں اور تنقیدیں، افسانوں اور داستانوں کے سانچوں میں ڈھل کر کلاسیکی حیثیت اختیار کر گئی ہیں۔ کسی نے مونا لیزا کی مسکراہٹ کو اس کی عظمت و فوقیت کا ضامن قرار دیا ہے۔ کوئی اس کے اعلیٰ کردار کی دل نوازیوں کو سراہ رہا ہے۔ کوئی آرٹسٹ کی تلاش اور اس کی رمز شناسی سے ماڈل کی ذہانت کا اظہار کرنے لگتا ہے۔ کوئی اس کے بے پناہ حسن اور اس کے خدوخال کے جادو کا یقین دلاتا ہے۔ کوئی اس کے ہاتھوں کو دنیا کے سب سے خوبصورت ہاتھوں میں شمار کرتا ہے اور کوئی تصویر کے پس منظر پر تبصرہ کرنے لگتا ہے۔ بہت سے تبصرہ نگاروں نے اس کی آنکھوں کے سحر کو فن پارے کی تشکیل اور تکمیل کا حصہ ٹھہرایا ہے۔ بعض کی یہ بھی رائے ہے کہ لیونارڈو ڈاونچی کا یہ شاہکار اس کے اپنے عظیم ہونے کا ثبوت مہیا کرتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ شاہکار مونا لیزا کا اپنا کردار ہے۔ غرض اس شاہکار کی انفرادی عظمت کے ہزار پہلو ہیں۔

جب ہم ڈاونچی اور مونا لیزا کا معائنہ کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو الگ الگ ناپتے ہیں اور ان کو ان کی اپنی اپنی حیثیت سے دیکھتے ہیں تو تخلیق اور کردار کے رشتے واضح ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ہماری بیدار جمالیاتی بصیرت ہماری رہبری کرتی ہے۔ جھٹکے اور ٹھوکریں کھانے کی بجائے ہماری نگاہیں ایک ایسے مرکز پر جمی رہتی ہیں جہاں ہم کبھی ڈاونچی کو مونا لیزا پر اور کبھی مونا لیزا کو ڈاونچی پر فوقیت دینے لگتے ہیں۔ ہم سوچتے ہیں آخر مونا لیزا نے کس استقلال اور جرأت سے ایک آرٹسٹ کی آرزو پوری کی اور ماڈل بننا منظور کیا اور اس کے مقاصد کو سراہا اور اپنے آپ کو فن کا ایک کردار بنا دیا۔ یہ استقلال اور فراخ دلی اس امر کا ثبوت ہے کہ اس کے دل میں آرٹ اور آرٹسٹ کے لئے کتنی جگہ تھی۔ اس نے آرٹسٹ کے جذبات اور ولولوں کو اپنے جذبات اور ولولوں سے ہم آہنگ کر دیا۔ اور آرٹسٹ کے ہمراہ اس کے فیضانِ فن سے ہم نوا ہو کر برسوں اس بات کی منتظر رہی کہ آرٹسٹ اپنی امنگوں اور خواہشوں کے مدِ نظر ایک شاہکار کو جنم دے سکے۔ جس کا اس نے بڑی خود اعتمادی سے اسے یقین دلایا تھا۔ وہ دیکھتی رہی اور زیرِ لب مسکراتی رہی اور آرٹسٹ کے جذبات میں تلاطم پیدا کرتی رہی اور یوں لیونارڈو کے موقلم کی روانی کا سہارا بنی رہی اور پھر وہ قطعی نہیں جانتی تھی کہ آرٹسٹ کا موقلم اور اس کے رنگ کہاں اور کب جا کر دم لیں گے!

میں ماڈل کا قائل نہیں ہوں۔ میری مشرقیت، میری روایات اس پر کوئی روشنی نہیں ڈالتیں۔ میرے ماڈل تو چلتے پھرتے مرد اور چلتی پھرتی عورتیں ہیں۔ میں انہی سے ایک مشرقی ہونے کی حیثیت میں اپنے تاثرات اور "استخواں بندی" کو مختلف صورتوں میں ڈھالتا اور ظاہر کرتا ہوں۔ یہی میری تصویروں کا وصف ہے۔ اس پہلو سے ان میں گوناگونی اور خدوخال کے اتار چڑھاؤ قابلِ غور ہیں۔ آرٹسٹ کو اپنا مطالعہ بڑھانے کے لئے چلتی پھرتی دنیا کو اپنے قریب لانے اور قریب سے دیکھنے کی یہ ضرورت اس امر کا احساس دلاتی رہتی ہے (اور میرا یہی یقین ہے) کہ یہ مطالعہ ماڈل کی غلامی کی بجائے کہیں افضل اور بہتر ہے۔ ایسا نظر آتا ہے کہ مغل آرٹسٹ بھی بادشاہوں، ملکاؤں، شہزادوں اور شہزادیوں کو ماڈل کی حیثیت سے اپنے قریب دیکھتے تھے اور مختلف طریق سے اپنی طرزِ نگارش کا اظہار کرنے پر بڑی قدرت رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اکبرِ اعظم جہانگیر، شاہ جہان اور دوسرے درباری منصب دار ہمارے مطالعے پر پورے اترتے ہیں۔ اکثر تصویروں سے ان شخصیتوں اور ان کے کرداروں پر کماحقہٗ روشنی پڑتی ہے۔ ان میں اپنے اپنے کرداروں کی خصوصیات نمایاں ہیں۔ شاہ جہان کی شبیہہ کا مطالعہ کرنے سے اس کے شاہی جاہ و جلال کے علاوہ فنِ تعمیر سے اس کے لگاؤ کا بھی ثبوت ملتا ہے۔ ایسی ہی خصوصیات اکبرِ اعظم اور جہانگیر کی تصویروں سے واضح ہیں۔ اس کے برعکس اگرچہ ایرانی مصور اپنی نگارش اور جمالیاتی نظریوں میں یکتا اور اپنی انفرادیت میں نمایاں تھے۔ مگر جہاں تک شبیہہ نگاری

کا تعلق ہے، ان کے بنائے ہوئے چہرے جذبات سے خالی نظر آتے ہیں۔ سلطان حسین مرزا کا تاریخی کردار بڑی بڑی عظیم داستانوں اور یادگاروں سے وابستہ ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ کا ایک عظیم ترین باب اس کی شخصیت سے روشن ہے۔ لیکن اس کی شبیہہ جو اس وقت کے مصوروں نے بنائی ہے کسی بھی ایسی خوبی کی حامل نہیں جس سے اکبر، جہانگیر اور شاہ جہان کے سے پختہ کردار کا اظہار ہو سکے۔ معلوم ہوتا ہے ایرانی مصور اپنے جمالیاتی نظریوں میں بند تھے اور انہوں نے کبھی اپنے ماحول اور اپنے ماڈل کا مطالعہ اپنے قریب سے نہیں کیا تھا۔ ایسا ہوتا تو ہم بڑے وثوق سے کہہ سکتے کہ یہ وہی اسمٰعیل صفوی، شاہ طہماسپ اور شاہ عباس اور سلطان حسین مرزا ہیں جن کی عظمت کا پرتو ایرانی تہذیب اور ان کی نئی قدروں پر آج بھی واضح ہے۔

آرٹسٹ مشرقی ہو یا مغربی، وہ اگر کسی بادشاہ کے شکوہ، کسی عالم کی شخصیت یا کسی تاریخی واقعے سے متاثر ہو تو اس کے تاثر سے اس کی اپنی شخصیت اور اس کے جمالیاتی نظریوں اور صلاحیتوں کا پتہ چلتا ہے۔ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس نے اپنے تاثرات کو اپنی صلاحیتوں سے کیا شکل دی اور انہیں کس صورت میں قبول کیا اور کہاں تک کامیاب ہوا اور اس نے کہاں تک اپنی عصری ثقافت اور تہذیبی قدروں کو اپنے فن میں روشناس کرایا۔ اکثر مصوروں میں زندگی کی رنگا رنگی کو قبول کرنے کا بڑا ہی والہانہ جذبہ پایا جاتا ہے۔ ان میں زندگی کی توانائی اور تنوع تو موجود ہوتا ہے لیکن بنیادی طور پر عمارت کھوکھلی ہوتی ہے اور اس میں خلا ہی خلا نظر آتا ہے سوائے ایک مبہم سی ہم آہنگی کے۔ روشنیاں، بشارتیں، روحانی مسکراہٹیں جمال اور بصیرت ان کا حصہ نہیں ہے۔ وہ نظریۂ اظہار ہی تھا۔ وہ ہیئت، وہ نصب العین وہ حقیقی کمالِ فن ہی تھا، وہ سبق آموز شائستگی اور متانت ہی تھی جس کی بنا پر دورِ احیا کے مصوروں نے اپنے فن کو نکھارا۔ مطالعہ بتاتا ہے کہ حضرت یسوع مسیح کی زندگی آلام اور دکھ درد اور پکار کا ایک سلسلہ تھی۔ مائیکل انجلو نے جس خلوص سے، متانت سے، درد سے اور پکار سے اپنے فن کا آغاز کیا، اور پورے شکوہ اور جلال سے اس کا اظہار کیا، وہ اس عظیم انسان کا عظیم کارنامہ تھا۔ انجلو کے احساسات و جذبات میں ڈونچی سے بھی کہیں زیادہ لگن اور آگ تھی۔ وہ اپنے ہم عصروں میں اس بلندی پر نظر آتا ہے کہ اس کا درجہ وقت اور حالات کی رو سے ایک پیغامبر کا سا محسوس ہوتا ہے۔ اس کے بنائے ہوئے حضرت موسیٰؑ کے مجسمے کے سامنے دیکھنے والا سر جھکا دیتا ہے، اور تب یہ کہنا پڑتا ہے کہ مائیکل انجلو نے اپنی تخلیق کو صحیح معنوں میں تکمیل تک پہنچایا۔

انجلو کی تخلیقات میں حضرت موسیٰؑ کے مجسمے کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس میں نامعلوم طور پر مذہبی عقائد کا سیلاب موجیں مارتا، جنون بہ جنون دکھاتا، کسی بڑے انقلاب کا متلاشی نظر آتا ہے۔ وہ اپنے ہم عصروں سے محض مختلف ہی نہ تھا بلکہ اس کی ولولہ انگیزی کا جذبہ انتہائی بلندی پر تھا۔ وہ جو سوچتا تھا، اس کو اس بلندی تک جا پہنچاتا تھا کہ اس کے ساتھی رشک کرنے لگتے تھے۔ اس کی سوچ بچار اور تلاش بھی اپنے ہم عصروں سے مختلف تھی اور اس کے اظہار کا طریقہ بھی مختلف اور منفرد تھا۔ وہ طبعاً بھی اپنے ہم عصروں سے مختلف تھا۔ اس کے فیضانِ فن کی عملی صورت اس کی تخلیق سے نمایاں ہے کہ وہ کیا سوچتا تھا اور اس کی بیداری کے اسباب کیا تھے۔ اس کی رگ رگ میں بغاوت تھی اور پرواز تھی اور وہ ولولے تھے جو بڑی ریاضت کے بعد صرف دیدہ وروں کے ہاتھ آتے ہیں۔ وہ سادہ تھا۔ اس میں نہ تو پادریوں کا سا جنون تھا اور نہ وہ مذہبی صورت گری کا کھلاڑی تھا۔ وہ اپنی غیر معمولی شخصیت سے پورا پورا کام لینے کے حق میں تھا۔ اس زمانے کے اکثر آرٹسٹ مذہبی پیشواؤں کا سا روپ دھارے رہتے تھے۔ ایسے آرٹسٹوں کا سراپا دوسروں کو ان کا گرویدہ بنانے میں ان کا مددگار ہوتا تھا۔ ان کے چہرے کے خدوخال اور رعب دار ڈاڑھی ان کے کردار میں بڑی اہمیت رکھتی تھی۔ ان کا ہم عصر ہونے کے باوجود انجلو ایک اور نسل کی تلاش میں تھا۔ اگرچہ اسے بھی عیسائیت کا پرچار اور ترجمانی مقصود تھی۔

مائیکل انجلو کے لئے لازم تھا کہ وہ اپنے خاص اور بلند مقاصد کے پیش نظر ان مول چہروں کی تلاش میں لگ جاتا۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ وہ آدم حوا، دن اور رات، غلام و آزاد، حضرت موسیٰؑ، حضرت یسوع مسیح، روزِ محشر اور خدا کا تصور اپنے تخیل سے تخلیق کرنے میں لگ گیا۔ انجلو نے اپنے اس والہانہ جذبے کے تحت کئی مجسمے، کئی تصویریں مادیت کے شعور اور عقل کی کرید میں بنا ڈالے لیکن وہ مطمئن نہ ہوا۔ وہ سخت سے سخت آزمائش سے گزرا۔ روحانی اور ارضی حقیقتوں کے زیر اثر اسے جو راستے دکھائی دیئے طے کرتا رہا۔ ان تصورات کو حقیقت بنانے پر تُلا رہا جو اسے عقلی بلندیوں پرے بہا لے جانے پر مجبور رکھ رہے تھے تاکہ اس کی تخلیق سے زود رس نتائج پیدا ہوں۔

مائیکل انجلو کی اس تمنا اور انفرادیت کو اس کے ہم عصروں کے طرزِ عمل نے اور اُکسایا۔ وہ اپنی مخالفت اور دوست نما دشمنی کا مقابلہ کرتے ہوئے فلارنس، وینیزیا، میلانوں اور روما میں مارا مارا پھرتا رہا اور اپنی بڑھتی ہوئی بغاوت کو بروئے کار لانے میں اور مستعد ہوتا گیا۔ اس نے ہر ممکن کوشش کی کہ ایک آرٹسٹ ماڈل کی غلامی سے نجات پا جائے اور اپنی انفرادیت سے اپنے نظریوں کو اظہار بخشے اور اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کو جو اسے ودیعت کی گئی ہیں، تصورات کے نئے قالب میں ڈھال سکے۔ اس نے اپنے شدید تخیل اور اپنے ہمہ گیر کردار کی مدد سے اپنے سوز دروں کی حدت کا کامیاب اظہار کیا اور اپنی عمر کے ہر حصے میں مادی اور روحانی قوتوں سے نبرد آزما رہا۔ مسلسل جدوجہد کے باوجود اس نے نوے سال کی عمر پائی اور عمر کے آخری مرحلے میں بھی —— آخری سانس تک وہ نئے مواد اور نئی ہیئت کی تلاش میں رہا۔

ماڈل کے رواج کی بدعت زمانہ قدیم یعنی حضرتِ مسیح سے بھی کہیں پہلے کی ہے۔ مصر، ہند اور یونان میں مجسمہ سازی کا فن اتنا قدیم ہے کہ اس کے آغاز کا تعین ہی ناممکن ہے۔ ان تینوں تہذیبوں کا فنی میعار اور اسلوب بہت بلند اور قابلِ ستائش ہے۔ ان میں روحانی جمالیاتی اور شیطانی اقدارِ حیات کی پوری پوری ترجمانی کی گئی ہے۔ یہاں تک کہ سب سے قدیم (مصری) تہذیب میں فراعنۂ مصر کے سنگ تراش مجسمے تراشنے میں اتنے ماہر تھے اور ان کا جمالیاتی نظریہ اتنا انفرادی تھا کہ آج تک کوئی دوسرا اسلوب ان کی بے نظیر انفرادیت کو چھو بھی نہیں سکا۔ ایسا نظر آتا ہے کہ ان فن کاروں نے غلاموں، غلام لڑکیوں، مصر کی ملکاؤں اور فرعونوں کو اپنی نگاہوں اور پلکوں میں رکھ کر جانچا اور تولا ہوگا۔ اور اپنے بے پناہ مطالعہ سے ایسے مجسمے تراشے ہوں گے جن کے سامنے کھڑے ہو جایئے تو ان کی عظمت کا فوراً اعتراف کرنا پڑتا ہے، کہ پتھروں کے ان دیوتاؤں کو تراشنے والے خود سچے دیوتا تھے۔ حق یہ ہے کہ ان مجسموں کے سامنے ان سے دوچار ہونے کی جرأت نہیں ہوتی۔ ان کی خود آگاہی سے آنکھیں ملانے سے پہلے دل جھک جاتا ہے، محض اس احساس سے کہ وہ کوئی ایسا سوال نہ اٹھا دیں کہ ان کے کفر کا اقرار کرنا پڑ جائے اور ہم سوچتے رہ جائیں اور بھلے بیکلے اپنی شکست مان لیں جس سے ان کے دعووں کی تائید حاصل ہو۔

مائیکل انجلو جب فلارنس سے روما آیا تو اس کی عمر تیئیس برس کے لگ بھگ تھی۔ جب وہ فلارنس میں تھا تو وہ بھی اپنے ہم عصر آرٹسٹوں کی طرح خاندان مڈیچیا کی سرپرستی میں پروان چڑھا۔ اس کی شہرت ان دنوں ایک معزز مجسمہ ساز، آرٹسٹ، ماہر عمارت، مہندس اور بلند مرتبہ شاعر کی تھی۔ وہ دورِ احیاء کے آرٹسٹوں میں اپنا ایک مقام رکھتا تھا اور چوٹی کے فن کاروں میں شمار ہوتا تھا۔ یہ سبھی آرٹسٹ مقدس انجیل اور حضرت یسوع مسیح کی زندگی کو تصویروں کی شکل میں ڈھالنے میں اپنے مذہب کی خدمت بجا لا رہے تھے، مگر انجلو اپنی صلاحیتوں کی گوناگونی کے مدنظر دوسروں کی نظروں میں کھٹکتا رہتا تھا۔ جب وہ فلارنس سے روما آیا تو اسے ڈنکین کے پوپ نے اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ پوپ نے بڑی شفقت کا اظہار کیا اس لئے انجلو نے اپنی بقایا عمر روم ہی میں گزاری اور برابر چرچ سے وابستہ رہا۔

انجلو نے اپنے آہنی قلم سے جو مجسمے تراشے اور انہیں زندگی بخشی ان کی حیثیت اس تخلیق کی سی ہے جو باقاعدہ زبان رکھتی ہے اور فن کار کے خون کی حدت سے اپنی ہستی کا ثبوت بہم پہنچاتی ہے۔ انہیں دیکھتے ہی محسوس ہوتا ہے کہ ان کو تراشنے والا، ان کو اس ہیئت میں ڈھالنے والا آرٹسٹ مائیکل انجلو ہی ہو سکتا تھا۔ انجلو کی تخلیق کا سب سے بڑا وصف یہی ہے کہ جب بھی اس کے سامنے جا کھڑے ہوں وہ ہم کلام ہوتی ہیں اور جس سے ہم کلام ہوں اسے جیسے پہچان لیتی ہیں۔ انجلو جب فلارنس سے روم آیا تو اس جذبے کو جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا، اسے پورا کرنے میں بڑی کٹھن اور بھاری قیمت ادا کرنی پڑی تھی۔ اس کی شخصیت نے اپنے مستقبل کے لیے جو منزلیں روم پہنچ کر طے کیں وہ آج بھی اپنی بے زبانی کے باوجود گویا ہونے میں کوتاہی سے کام نہیں لیتیں۔ آخر وہ ہر امتحان میں پورا اترا، اس کمال تک کہ اس کی عظمت کے سامنے اس کے حاسد بھی جھک گئے

مائیکل انجلو پیدائشی مجسمہ ساز تھا اور پتھروں کے خصائص کے متعلق سب کچھ جانتا تھا۔ لیکن جب وہ روم آیا اور اسے پوپ کی سرپرستی حاصل ہوئی تو اس کے بعض ہمعصروں نے اس کی شہرت کو ٹھیس پہنچانے کے خیال سے اسے فن تعمیر اور تصویر کشی کی طرف مائل کر دیا۔ مگر انجلو ابھی پوری سنجیدگی کے ساتھ اُن فرائض کو اپنے ذمے لینے کو تیار نہ تھا۔ پوپ کی منشا سے وہ روم آیا تھا اور پوپ چاہتا تھا کہ وہ ویٹیکن کی چھتوں اور دیواروں پر تصویر کشی کا کام انجام دے۔ وہ تیار ہو گیا۔ اس نے بڑی خود اعتمادی سے کام شروع کر دیا اور پوری مستعدی سے تخلیق اور ارتقا کی منزلیں طے کرتا رہا۔ اس نے یہ عظیم کام تیرہ چودہ سال کے عرصہ میں انجام دیا اور اسے یوں تکمیل تک پہنچایا کہ اس کے بعد نہ تو ایسا موقع ہی کسی آرٹسٹ کو نصیب ہوا اور نہ اس نوعیت کے تخلیقی حسن کا زندہ سرچشمہ پھر کہیں پھوٹا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب انجلو اپنا فرض بجا لا چکا اور چھت اور دیواروں کے کام سے فارغ ہو گیا تو اس کی ذہنی کیفیت یہ ہو چکی تھی کہ اسے دنیا کی ہر چیز الٹی دکھائی دیتی تھی اس کے باوجود وہ تخلیق کی لذت سے سرشار تھا۔

رومنوں اور یونانیوں کے صحت مند مجسمے اور اُن کی توانائی آج بھی مغرب کی جدید تر زندگی کا جزو ہیں حالانکہ موجودہ زندگی کا ان سے کوئی رشتہ نہیں اس کے باوجود اہل مغرب نے انہیں عقائد کی رو سے قبول کر رکھا ہے جن پر ان کا ایمان ہے یعنی ان کا رشتہ بغیر کسی دلیل کے عیسائیت سے کسی نہ کسی شکل میں جا ملتا ہے۔

یونانی سنگ تراشوں نے ماڈل کی اہمیت کو اپنے دیوی دیوتاؤں کے حوالے سے سمجھا۔ ہر دیوتا نے ایک انفرادی کردار کی صورت میں جنم لیا تھا جس سے ان کی پرستش ہوتی تھی۔ عیسائی آرٹسٹوں اور یونانیوں کے درمیان باوجود مذہبی اختلافات کے یونان کا یہ طرزِ فن مغرب میں بہت پسند کیا گیا۔ مائیکل انجلو یونانیت سے بہت متاثر نظر آتا ہے اس کی تصویروں اور مجسموں میں یونانیت بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ کچھ فرق نظر آتا ہے تو یہ کہ یونانی حسن پرست جنسی لذتوں کے مارے ہوئے تھے وہ جسم کے حسن کی تلاش میں عریانی پر اتر آتے تھے۔ انہیں ایسے کرداروں کی تلاش رہتی تھی جن کے جسم جنسی طلسم کا مظہر ہوں۔ نہ ان کا کوئی مذہب تھا اور نہ انہیں روحانی آسودگی کی تلاش تھی۔ ان کے زوال اور انحطاط کے بعد معاشرے اور عقائد نے یک سر شکل بدل لی۔ ہر آرٹسٹ انجیل مقدس اور حضرت یسوع کا پیغام مذہبی سانچوں میں ڈھالنے لگا۔ مائیکل انجلو، رفائیل، ٹیشین، لیونارڈو ڈاونچی۔ یوں سمجھیے، جتنی بھی ماڈل سے دور رس نتائج کے حامی تھے۔ ماڈل کو تخلیق کا ایک اہم جزو سمجھتے تھے اور جمال، جلال اور بصیرت کو حصولِ فن کے مدِنظر فروغ دیتے تھے۔

انجلو ایک مغربی فن کار ہونے کے باوجود اپنے ہم عصروں سے مختلف ایک اپنی ہی انفرادیت رکھتا تھا۔ اس کے مدِنظر ایک ایسا عظیم فرد بھی تھا جو یسوع مسیح کا ماڈل ہو، اس میں پیغمبرانہ جلال و جمال اور تاثر ہو۔ چناں چہ اس انسان کی تلاش میں وہ مٹی پتھروں رنگوں اور خطوں کے طلسم میں

نئے سے نئے وجود کو جنم دیتا رہا۔ اس کی اس بے پناہ لگن کا نتیجہ ہے کہ آج بھی اس کی بقا اور سلامتی میں سرِمو فرق نہیں آیا۔

اس زمانے میں ہر آرٹسٹ کو مذہبی موضوعات ہی مرغوب تھے۔ انجلو بھی اس شوق کا اسیر تھا، لیکن وہ چاہتا تھا کہ اسے اظہار میں دوسروں پر برتری حاصل رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنی تخلیقات میں کوئی دور دراز کا سقم بھی نہیں رہنے دیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے فنی پارے کے —— کسی بھی حصے پر کوئی انگشت نمائی کا حوصلہ کر سکے۔ روم اور فلارنس میں اس کے ہم عصروں نے بارہا چاہا کہ اسے کسی نہ کسی موقعے پر شکست کا سامنا ہو، مگر وہ زندگی بھر سینہ سپر رہا اور اپنے بے پناہ جلال و جمال کے سہارے ہمیشہ فتح یاب رہا۔ وہ وقت کی سیاست میں نہ الجھا اور ہر رقابت کا منہ توڑ جواب دیتا رہا۔

ایک آرٹسٹ کی حیثیت سے تو ایک دنیا اس کی ذہنی بلندی کا اعتراف کرتی ہے مگر وہ نظمیں بھی لکھتا تھا، وہ مہندس بھی تھا، ایک ڈیزائنر کی حیثیت سے وہ چرچ کی توسیع میں حصہ لیتا رہا اور ضرورت کے مطابق چرچ کی شکل بدل دیتا۔ اس کے یہ کمالات اپنی جگہ مگر ویٹی کن کے گرجے کی چھتوں پر تصویریں بنانے کے پروگرام میں وہ اس حد تک کامیاب ہوا کہ فن کی تاریخ آج بھی اس کا جواب نہیں رکھتی۔

پوپ ویٹی کن کا حاکمِ اعلیٰ اور با اختیار حیثیت کا مالک تھا۔ اس نے مائیکل انجلو کو بڑے گرجے کی چھت مصور کرنے کی دعوت دی۔ انجلو نے جب اپنے چاروں طرف رقابت کی آگ کو بھڑکتے دیکھا تو اس کے باوجود کہ وہ اس کام کو جان لیوا سمجھتا تھا، سارے کا سارا کام اپنے ذمے لے لیا۔ اور پروگرام مرتب کرنے اور ڈیزائن بنانے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کام میں اس کی پوری زندگی اور ساری توانائیاں صرف ہو جائیں گی، مگر اس نے ہار نہ مانی اور چرچ کی چھت کے ساتھ ایک اور چھت کی طرح چمٹ گیا۔ وہ پورے چودہ سال تک اس چھت کے ساتھ چمگادڑ کی طرح لٹکا رہا اور یوں چھت کی سطح پر انسانی عظمت کی داستان رقم کرتا رہا —— روزِ محشر —— آدم و حوا۔ جنت اور نجات۔ جہاں پیدا شد —— کائنات کی یہ کہانی، اس نے اپنے عقائد اور مقدس انجیل کی زبانی بیان کی اور ان تھک ریاضت، محنت اور مشقت نے اسے وہ کامیابی عطا کی کہ آج بھی لاکھوں انسانوں کو داد کے مناسب کلمات نہیں ملتے۔

چرچ کی چھت پر مبنی ہوئی تخلیق کاری تخلیق نے اسے لافانی بنا دیا۔ سب کچھ ہوا لیکن انجلو جو چودہ سال کے لگ بھگ چرچ کی چھت سے چمٹا رہا، جب نیچے اُترا تو اسے دنیا کی ہر شے الٹی دکھائی دیتی تھی۔ کیا پرستش کی حد تک اس فن کاری کی کوئی دوسری مثال موجود ہے؟

حضرت موسیٰؑ کا مجسمہ انجلو کا ایک ناقابلِ فراموش شاہکار ہے۔ اس کی ہیئت، تکنیک اور شکوہ کے جلال پر آج جدید سکول کے مجسمہ ساز بھی جان دیتے ہیں اور اس کی پیغمبرانہ قوتِ تخیل سے انہیں وہ دس احکامِ خداوندی جو حضرت موسیٰؑ پر نازل ہوئے سنائی دینے لگتے ہیں۔ اگر مجسمے کا جائزہ لیا جائے اور مائیکل انجلو کے نظریۂ ہیئت کا مطالعہ کیا جائے تو اس کی عظمت کا اعتراف کئے بغیر چارہ نہیں۔ جب انجلو نے اس مجسمے کا تصور اور اس کے تراشنے کا عزم کیا ہوگا تو یقیناً اسے وہ سب کچھ دکھائی دے گیا ہوگا جو آج اس مجسمے کی صورت میں دنیا کے سامنے موجود ہے۔ اس کے بعد اس نے محض پردہ اٹھا دیا ہوگا۔ بہر حال جب اسے حضرت مسیح کا مجسمہ تیار کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو اس پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوئی۔ وہ گلی گلی اور کوچے کوچے آہ و بکا کرتا مارا مارا پھرنے لگا۔ اسے اپنے اندر مسیح کی آواز سنائی دینے لگی۔ انجلو در در پر دستک دیتا رہا، کہ اس نے ایک بھکاری کو دیکھا جس کے منہ سے رال ٹپک رہی تھی۔ وہ شرابی تھا اور جواری تھا اور آوارہ تھا۔ مگر اس نے انجلو کے قدموں کو جکڑ لیا۔ پتھر کا انتخاب کرنے میں تو اسے کبھی کوئی مشکل پیش نہ آئی مگر اب اس نے انسان کا انتخاب بھی کر ہی لیا۔ اس کی سرگردانی کا مقصد مجسم ہو کر اس کے سامنے آکھڑا ہوا —— دنیا کی ہر نعمت سے محروم اور ہر امید سے تہی دامن —— انجلو نے بڑھ کر اسے چھاتی سے چمٹا لیا۔ یہ مست الست جواری حیرت زدہ ہو کر انجلو کو دیکھنے لگا۔

ماڈلوں کے ضمن میں یوں تو ریمبراں کے متعلق بھی ایک قصہ مشہور ہے۔ جب ریمبراں کی تصویر کشی اور شبیہ نگاری کی شہرت حاکمِ وقت کے کانوں تک پہنچی تو اس نے چاہا ریمبراں اس کی ایک ایسی غیر فانی شبیہ بنائے کہ اسے رہتی دنیا تک اس کے فن کا شاہکار سمجھا جائے۔ حاکمِ وقت جب ریمبراں کے سٹوڈیو میں یہ تمنائے کر آیا، شاہی جاہ و جلال سے تنا ہوا، جواہرات سے لدا ہوا، بجا سجایا وقت کا بادشاہ ریمبراں کو نظر آیا تو آرٹسٹ نے نہایت عجز سے خدمت میں درخواست کی کہ وہ اس لباس میں اس کے سامنے ماڈل بیٹھے جس کا اس نے بادشاہِ وقت کے لئے انتخاب کیا ہے ——— اور وہ ایک بھکاری کا لباس تھا، اور جب مائیکل انجلو نے ایک بھکاری کو اپنے سامنے قلندرانہ ترنگ میں کھڑے پایا تو اس نے اسے پیغمبر کے لباس میں ملبوس دیکھا۔ انجلو کو ایک بھکاری حضرت مسیح کے روپ میں کھڑا دکھائی دے رہا تھا۔

فنی تخلیق کا سب سے بڑا مقصد اپنا پیغام دوسروں تک پہنچانا ہے۔ اور اسے اس انداز میں تکمیل دینا ہے کہ اس میں ابہام پیدا نہ ہو۔ بلکہ افلویت کے مدِ نظر مطالعہ نگار فن کار کی نیت کو سمجھنے میں اس کے پہلو بہ پہلو چاہے پرواز نہ کر سکے لیکن لطف اندوزی کے مراحل میں اپنے اطمینان کا جواز تلاش کرے۔ فن کار کا یہ ابلاغ نوعِ انسانی کو فن کی عظمت و کمال کا راز دار بناتا ہے۔

اب وہ مسیح صورت انسان روم کے گلی کوچوں میں پھرنے لگا جس کی پیشانی پر مائیکل انجلو کے آہنی قلم کی ضربیں نمایاں تھیں۔ اگر کوئی اسے پہچاننے کی کوشش کرتا بھی تو اسے دیکھ کر واقعات کو بھول جاتا تھا۔ وہ چلتا چلتا افق پر دیکھنے لگتا۔ اس کی آواز عرش سے جا ٹکراتی اور بازگشت کی صورت میں واپس لوٹ آتی۔ نہ وہ کوئی پیش گوئی کرتا تھا نہ مقدس انجیل کے الفاظ دہراتا تھا لیکن شکل و صورت سے زمان و مکان کا کرشمہ حق گوئی کا مبلغ، پرہیزگار، عبادت گزار، صداقتِ حقیقی کا پرستار لگتا تھا۔ وہ زندہ مسیح نظر آتا تھا۔ معزز مائیں بچوں کے سر پر اس کے شفقت بھرے ہاتھ رکھ لیتیں اور جیسے تقدس میں ڈوب جاتیں۔ ایسا محسوس ہوتا جیسے اسے دیکھ لینے سے انسانی جذبات میں اطمینان بخش تلاطم موجزن ہو جاتا ہے ایک ایسا اضطراب جو قرار کی جان ہے۔ لوگ کہتے اس مجسمے کی صورت میں حضرت یسوع مسیح کا دوبارہ اس دھرتی پر نزول ہوا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس کی پیشانی پر مائیکل انجلو کے آہنی قلم کی ضربیں نمایاں ہیں۔

عزیزہ بیگم

علم موسیقی عہدِ عالمگیر میں

عہدِ عالمگیر (۱۶۵۸ تا ۱۷۰۷ع) تاریخی لحاظ سے ابھی کل ہی کی بات ہے لیکن جتنی غلط فہمیاں اس عہد کے بارے میں پیدا ہو چکی ہیں شاید ہی کسی اور زمانے کے بارے میں ملتی ہوں۔ دوسرے متنازعہ مسائل سے قطعِ نظر موسیقی کے بارے میں بھی ہمیں مختلف رائیں ملتی ہیں اور پلہ ان لوگوں کا ہی بھاری ہے جو کہتے ہیں کہ عہدِ عالمگیر میں موسیقی کی مکمل بیخ کنی ہو چکی تھی۔ یہ غلط فہمی شاید شہنشاہ کی ذاتی روش سے پیدا ہوئی ہو جو اس نے موسیقی کے بارے میں اختیار کی لیکن بقول مولانا ابوالکلام آزاد جو روایات سالہا سال سے چلی آ رہی تھیں۔ ان کا ایک دم موقوف ہو جانا کوئی آسان بات نہ تھی جو چراغ جل چکے تھے اُن کا بجھنا اتنا آسان نہ تھا جتنا کہ ہندو مؤرخ ہمیں یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ بادشاہ شروع شروع میں اپنے اجداد کی روش پر ہی قائم تھا۔ کہیں گیارہویں سالِ جلوس میں جا کے اس روش میں تبدیلی ہوئی۔ کچھ مذہبی عقائد، کچھ بڑھتی ہوئی سلطنت کی مصروفیتیں اور کچھ ذاتی زہد و تقویٰ کی بنا پر اس نے اربابِ نشاط کو نغمہ پردازی نہ کرنے کے حکم پر ہی اکتفا کیا لیکن دربار میں حاضری سے نہ روکا اور آخر میں بقول صاحب مآثر عالمگیری ان کی حاضری بھی بتدریج بند ہو گئی۔ لیکن گزشتہ صدیوں میں موسیقی کی جو شمعیں روشن ہو چکی تھیں ان کی ضیا پاشیوں میں قطعاً کوئی کمی نہ آئی۔ اس عرصے میں علمِ موسیقی اور اس کے فن میں خواص اور عوام کی دلچسپی برابر جاری رہی جس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ عہدِ عالم گیر میں ہمیں گیارہ کتابیں سنسکرت اور فارسی کی ایسی ملتی ہیں جن کا موضوع علمِ موسیقی ہے۔ کسی اور عہد میں اتنی کتابیں موسیقی پر تصنیف نہیں کی گئیں اور اس میں عہدِ اکبری کا زریں دور بھی شامل ہے۔

ان کتابوں کا ایک اجمالی خاکہ درج ذیل ہے:۔

ہردے کوتک اور ہردے پرکاش:۔ یہ دونوں کتابیں پنڈت ہردے نارائن کی تصنیف ہیں۔ زبان سنسکرت ہے۔ سنِ تصنیف کا یقینی تعین نہیں ہو سکا لیکن مورخین کا خیال ہے کہ یہ ۱۶۶۰ع میں لکھی گئیں۔ دونوں کتابوں کا موضوع شمالی ہند کی موسیقی ہے۔ پہلی کتاب میں مصنف نے پنڈت لوچن کوی کی کتاب راگ ترنگنی (۱۱۶۰ع) کے بارہ میلوں کو دہرایا ہے لیکن دو مخصوص اور خود ساختہ سُر یعنی تین شرتی مدھیم اور تین شرتی نشادھ کے استعمال سے ایک تیرھواں ٹھاٹھ بھی ترتیب دیا ہے جس کا نام انہوں نے ہردے رام رکھا۔ ہردے پرکاش میں زور اپنی بارہ ٹھاٹھوں پر دیا ہے۔ ان کے خیال کے مطابق موسیقی کے سمندر میں لاتعداد ٹھاٹھ موجود ہیں لیکن صرف بارہ ہی بروئے کار لائے جا سکتے ہیں۔ میل یعنی

ٹھاٹھ کی تعریف میں انہوں نے کہا ہے کہ یہ سروں کا مجموعہ ہے جس سے جملہ راگ نکلتے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ دو یا تین یا چار سُروں کی تان تو ہو سکتی ہے لیکن راگ نہیں ہو سکتا اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہر دسے پرکاش کا بنیادی سکیل ہمارے موجودہ کافی راگ سے زیادہ ملتا جلتا ہے۔

چتر ڈنڈی پرکاش:۔ یہ کتاب عہدِ عالمگیر میں لکھی گئی۔ سن تصنیف ۱۶۶۰ع ہے۔ مصنّف کا نام وین کٹ ماکھی ہے اور موضوع جنوبی ہند کی موسیقی ہے۔ مصنّف کے والد کا نام گووند ڈکشٹ تھا اور وہ بھی موسیقی پر ایک کتاب "سنگیت سدھا" کا مصنّف تھا۔ چتر ڈنڈی پرکاش میں مصنّف نے ایک اور کتاب "سُر میل کلاندھی" از راما ماتیہ (وزیر ریاست وجے نگر۔ سن تصنیف ۱۵۵۰ع) پر کڑی تنقید کی ہے۔ دونوں کتابوں کا موضوع ایک ہی ہے یعنی جنک میل۔ اس کتاب میں مصنّف نے ۷۲ ٹھاٹھ ترتیب دیئے اور ان کا انحصار ۱۲ سُروں پر کیا۔ علاوہ اس کے اس نے چھ قسم کے مارگ راگ اور چار قسم کے دیسی راگ تسلیم کئے۔

سنگیت پاریجات:۔ یہ عالمگیر کے زمانے کی معروف ترین کتاب ہے۔ سن تصنیف ۱۶۶۵ع ہے۔ مصنّف کا نام اہوبل ہے۔ زبان سنسکرت ہے اور موضوع شمالی ہند کی موسیقی۔ اس کتاب کا ترجمہ دو دفعہ فارسی زبان میں ہوا۔ پہلا ترجمہ مرزا روشن ضمیر نے عہدِ عالمگیر میں کیا۔ دوسرا ترجمہ پنڈت دینا ناتھ نے ۱۷۲۴ع میں کیا۔ پنڈت دینا ناتھ کے ترجمے کی ایک نقل رام پور لائبریری میں محفوظ ہے اور اس پر شہنشاہ محمد شاہ کی مہر بھی ثبت ہے۔ مرزا روشن ضمیر والے ترجمے کی ایک نقل انڈیا آفس لائبریری میں ہے جو وہاں ایک انگریز مسٹر رچرڈسن کی وساطت سے پہونچی۔ سنگیت پاریجات کی نمایاں خوبی وینا پر شدھ اور وِکرت سُروں کا تعین ہے۔

اسی زمانے میں ہمیں پنڈت بھاؤ بھٹ بھی ملتے ہیں جنہوں نے یکے بعد دیگرے اس موضوع پر تین کتابیں تصنیف کیں۔ پنڈت بھاؤ بھٹ کو بیکانیر کے راجہ انوپ سنگھ (۱۶۷۸ تا ۱۷۰۱ع) کی سرپرستی حاصل تھی۔ چنانچہ اس نے اپنی ہر کتاب اسی راجہ کے نام سے معنون کی۔ اس کی تصنیفات انوپ سنگیت ولاس۔ انوپ سنگیت رتناکر اور انوپ سنگیت کوش ہیں۔

ان کتابوں کا موضوع راگ اور راگنیوں کی مختلف تقسیمیں ہیں۔ مصنّف نے قدیم زمانے سے لے کر اپنے وقت تک کی مختلف متنوں کا ذکر کیا ہے اور اس موضوع پر جتنے مختلف نظریات تھے اُن کو یکجا کیا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنے زمانے کے مروجہ اٹھارہ راگوں کے مختلف روپ بھی درج کئے ہیں۔ مثلاً نٹ کی سولہ شکلیں، کرناٹ کی چودہ، بلاولی کی سولہ اور ٹوڈی کے نو مختلف روپ وغیرہ۔ اس نے ایک فہرست بھی مرتب کی جس میں گرام راگوں کی ۳۰ قسمیں اور اُن سے نکلنے والے راگوں (وبھاسوں) کا ذکر ملتا ہے۔

چھ راگ اور چھتیس راگنیوں کے نظریے کے ارتقاء کی تاریخ کا ذکر بھی انہیں کتابوں میں ملتا ہے۔ انہی میں سے ایک یعنی ہنومان مت کے مطابق چھ راگ اور ان کی چھتیس راگنیوں کی فہرست بھی دی ہے۔ سنگیت پاریجات اور سنگیت رتناکر کو مصنّف نے بہت اہمیت دی ہے۔

ان سنسکرت کتابوں کے علاوہ اس زمانے میں فارسی میں تصنیف شدہ کتابیں درج ذیل ہیں۔

مرزا روشن ضمیر کے ترجمہ پاریجات کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ مرزا صاحب اپنے زمانے کے صاحب ذوق آدمی تھے اور موسیقی سے انہیں لگاؤ تھا اور اس علم میں ان کا درجہ مانا ہوا تھا۔ اس کتاب میں ۳۵ فصلیں ہیں۔ جن میں سے کچھ عنوانات یہ ہیں:۔

(۱) راگہائے طول و عرض (۲) بیان استھان ناد (۳) بیان چکر و بہم رسیدن ناد (۴) بیان سرت (۵) بیان سرت جات یعنی کیفیتِ سُر (۶) سدھ و وکر سور (۷) وادی۔ سم وادی۔ انوادی و یوادی (۸) قوم راگ (۹) ذات راگ (۱۰) برن (۱۱) دیپ (۱۲) سن (۱۳) دیوتا (۱۴) چھند (۱۵) رس (۱۶) گرام (۱۷) مورچھنا (۱۸) پرستار (۱۹) کھنڈ سُر (۲۰) نشٹ و اشٹ (۲۱) چہار بدن (۲۲) النکار (۲۳) گمگ وغیرہ وغیرہ۔ آخری فصل گویّوں کے عیب و ہنر پر شامل ہے۔ جگہ جگہ سروں کے نقشے اور جدولیں شامل ہیں۔

فارسی زبان کی دوسری اہم کتاب تحفۃ الہند ہے۔ موضوع ہندوؤں کے فنونِ لطیفہ ہیں۔ مصنّف کا نام مرزا محمد بن فخر الدین محمد ہے جنہیں ہندو اور انگریز مصنّف مرزا خان کہتے ہیں۔ اس کتاب کی تصنیف کی تحریک مرزا کو کلتاش نے کی جو اس کتاب کو شہزادہ محمد معز الدین جہاندار شاہ کے حضور پیش کرنا چاہتا تھا۔ کتاب سات ابواب اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔ تفصیل یہ ہے:۔

مقدمہ در بیان مصطلحات حروفِ تہجیہ ہند و علمِ خط و ذکرِ اشکالِ مذکورہ۔ ۴ فصل۔

باب اول:۔ در علمِ پنگال یعنی علمِ عروضِ ہندیہ۔ ۳ فصل۔

باب دوم:۔ در علمِ تُک یعنی علمِ قوافی اہلِ ہند۔ ۲ فصل۔

باب سوم:۔ در علمِ النکار یعنی علمِ بدیع و بیان۔ ۲ فصل۔

باب چہارم:۔ در علمِ سنگار رس یعنی عاشقی و معشوقی و بیانِ احوالِ عاشق و معشوق۔ ۲ فصل۔

باب پنجم:۔ در علمِ موسیقی اہلِ ہند۔ ۲ فصل۔

باب ششم:۔ در علمِ کوک وغیرہ۔ ۵ فصل۔

باب ہفتم:۔ در علمِ سامدرک یعنی علمِ قیافہ کہ علاماتِ خیر و شر در انسان ازاں معلوم شود۔

ہمارا تعلق صرف باب پنجم سے ہے اگرچہ اس میں صرف دو ہی فصلیں ہیں لیکن علمِ موسیقی کے طلباء کے لئے تمام ضروری معلومات ملتی ہیں۔ مثلاً اس میں چاروں متوں کا بیان اور ان کے باہمی اختلاف، راگوں کا سمپورن، آڈو یا کھاڈو ہونا، دھرپد، بشن پد، خیال، ٹپہ، قول، ترانہ وغیرہ۔ مختلف متوں کے اعتبار سے راگوں کے سراپا بھی بیان کئے گئے ہیں۔ مثلاً ہنومان مت کے مطابق بھیروں راگ کے بارے میں یوں لکھا ہے:۔

"صورتش در راگ مالا بصورتِ مہادیو نویسند یعنی مثل سنیاسیہائے صاحب حس خاکستری بر روئے مالیدہ و جٹا در سر داشتہ واز جٹا رودِ گنگ رواں گشتہ و در دست کنگن یعنی دست برنجن پوشیدہ ہلالے در پیشانی و چشم دو ابرو داشتہ و مارے در بر دوش او پیچیدہ و قشقہ در پیشانی کشیدہ و چرم فیل بر دوش انداختہ یا فرش کردہ و بداں نشستہ وغیرہ وغیرہ۔"

اس طرح راگ مالکونس، ہنڈول اور سری راگ کا ذکر بھی ملتا ہے۔ راگوں کے بعد راگنیوں کا سراپا اور ہر راگنی کا حلیہ بیان کیا گیا ہے۔

راگنیوں کے بعد اُن کے پتروں اور بھارجات کی تفصیل بھی اسی انداز سے دی گئی ہے۔

مصنف نے اعتراف کیا ہے کہ باب پنجم کی تصنیف میں اس نے راگ درپن، راگر نوا اور سبھا ونود سے استفادہ کیا۔ مسٹر ڈیمؒ جو نز سنسکرت کتابوں کے فارسی تراجم کو عہد مغلیہ میں (ابوالفضل، محسنی اور فیضی اور مصنف تحفۃ الہند) شامل کرنا درست خیال نہیں کرتے لیکن دوسرے نظریہ کے مطابق ان کا اپنا موسیقی پر مقالہ اسی کتاب تحفۃ الہند پر مبنی ہے۔

راگ درپن:۔ یہ تیسری اہم کتاب ہے جو فارسی زبان میں علم موسیقی پر اس زمانے میں لکھی گئی۔ اسی نام سے ملتی جلتی ایک اور کتاب سنگیت درپن بھی ہمیں ملتی ہے۔ راگ درپن اور سنگیت درپن میں تفریق کرنا ضروری ہے۔ سنگیت درپن دامودر کی سنسکرت کتاب ہے جو ۱۶۲۵ ع میں لکھی گئی۔ راگ درپن فقیر اللہ نے ۱۶۶۵ع میں لکھی۔ دراصل یہ سنسکرت کتاب مانکتوہل کا ترجمہ ہے۔ مانکتوہل راجہ مان (۱۴۸۶ تا ۱۵۱۷ع) کے ایما پر لکھی گئی تھی۔ فقیر اللہ نے اپنی کتاب کا فارسی نام "رسالہ ترجمہ پوتھی راگ درپن" رکھا۔ کتاب مندرجہ ذیل دس بابوں پر مشتمل ہے:۔

باب اول:۔ در سبب تالیف۔

باب دوم:۔ در دانستن راگہا۔

باب سوم:۔ در تعیین ہر موسم کہ دراں موسم کدام راگ و راگنی خوانند و حرف ہائے منع کردہ در اول تصانیف۔

باب چہارم:۔ در دانستن سرہا تصانیفاتی کہ در نغمہ می بندند۔

باب پنجم:۔ در دانستن سازہا و نائک و نائکہ و سکھی۔

باب ششم:۔ در دانستن عیوب گوئندہ۔

باب ہفتم:۔ در شناختن آوازہا۔

باب ہشتم:۔ در دانستن اُستاد کامل۔

باب نہم:۔ در دانستن بہ ندہ و فائدہ بہ ندہ نمودن۔

باب دہم:۔ در باب گوئندہ ہا و سازندہ ہا کہ در زمانِ ما بودند و ہستند۔

دسویں باب میں مصنف نے پچاس استادانِ فن کی فہرست دی ہے جو اس زمانے یعنی عہدِ عالمگیر میں مانے ہوئے فن کار تھے۔

شمس الاصوات بھی اسی زمانے میں تصنیف ہوئی۔ زبان فارسی ہے۔ موضوع موسیقی۔ مصنف نامعلوم۔ مادۂ تاریخ "جائے نغمہ" ہے۔ یہ کتاب مندرجہ ذیل چھ بابوں پر مشتمل ہے۔

۱۔ در کیفیت تفاصیل سرکہ در اصطلاح ہند آنرا سرادھیائے گویند۔

۲۔ در ذکر راگہا کہ در اصطلاح ہند آنرا راگ ادھیائے می گویند۔

۳۔ در شرح الاپ یعنی برداشتن و گردانیدن سُر در راگ و ذکر ارکانِ آں کہ آنرا پرہارن ادھیائے می گویند۔

۴۔ در شرح تفصیل اقسام گیت کہ در اصطلاح ہند آنرا پربندھ ادھیائے می گویند۔

۵۔ در شرح قوانینِ دستک زدن کہ آنرا تال ادھیائے می گویند۔

۶- در کلیاتِ ساز و احوال کہ آنرا ناد ادھیائے می گویند۔

مندرجہ بالا سطور میں کچھ مبہم خاکے ان کتابوں کے پیش کئے گئے ہیں جن پر اگرچہ وقت کی گرد تو جم چکی ہے لیکن عنوانات ابھی باقی ہیں۔ ان کے علاوہ دو اور کتابیں ایسی بھی ملتی ہیں جن کے عنوانات کے سوا اور کوئی چیز دستیاب نہیں ہوتی۔ شیر خاں لودھی عہدِ عالمگیر کے امیروں میں سے تھا۔ اس کی مشہور تصنیف تذکرہ مرآۃ الخیال ہے جو اسی زمانے کی پیداوار ہے اسے ایرانی اور ہندوستانی موسیقی پر مکمل عبور حاصل تھا اور اس موضوع پہ اس نے ایک کتاب بھی لکھی جو اب رائل ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کی زینت ہے۔

ایک اور کتاب بعنوان نغمۃ الاسرار بھی اسی زمانے کی یادگار ہے اس کے مصنّف کا نام میر احمد بن مرزا محمد ہے۔ سن تصنیف ۱۶۸۸ء ہے۔ کتاب خاصی ضخیم ہے۔ یہ کتاب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی لائبریری میں محفوظ ہے۔

حوالہ جات سے پتہ چلتا ہے کہ تذکرہ مرآۃ الخیال میں بھی دو فصلیں موسیقی پر ملتی ہیں۔

یہ سب ذہنی کاوشیں عہدِ عالمگیر ہی کی پیداوار ہیں۔ کیا ہم اب بھی یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ عہدِ عالمگیر میں موسیقی کی مکمل بیخ کنی ہو چکی تھی؟ دراصل یہ تاثر ہماری اپنی ہی روایتی بے اعتنائی کا نتیجہ ہے۔

(زیرِ تصنیف کتاب "ہمارے نامور موسیقار" کا ایک باب)

محمد ایوب اولیاء

مغل عہد کا ہندوستان

لندن کے "برٹش میوزم" میں "مغل انڈیا" کے موضوع پر ایک دلچسپ اور معلومات افزا نمائش ہوئی جو سلاطین مغلیہ کے حسن ذوق و شوقِ مصوری کی صحیح عکاسی کرتی تھی۔

ہندوستان میں مغل عہدِ حکومت اگرچہ شہنشاہ بابر سے شروع ہو جاتا ہے۔ مگر اس کا پوتا جلال الدین محمد اکبر "مغل اعظم" کہلانے کا واقعی مستحق ہے جس کے دورِ سلطنت میں علوم ادبیات و فنون لطیفہ نے صحیح نشوونما پائی ——— اور مختلف علوم و فنون کے اسالیب وضع ہوگئے ——— ان پڑھ ہونے ہوئے بھی وہ علم و ادب کا بہترین نقاد و مربی تھا ——— ملک کے ہر کونے سے مصور، خطاط، موسیقار، شاعر ظریف، سیاس اور علما اس کے دربار میں کھنچے چلے آئے۔ اور اس انتخاب میں معیار "کمالِ فن" تھا نہ کہ مذہب و ملت۔ یہی وجہ ہے کہ دوست و دشمن اس کی مذہبی رواداری کے رطب اللسان ہیں۔ شہنشاہ اکبر ۱۵۵۹ء میں سریر آرائے سلطنت ہوا ——— $\frac{14}{15}$ برس کا یہ نوعمر فرمانروائے ہندوستان بابر کی جرأت و دلاوری، اور ہمایوں کی رحمدلی اور کسر نفسی رکھتا تھا ——— رزم و بزم میں اس کا حسن و شکوہ اور ذوقِ جلال و جمال اپنا جواب آپ تھا ——— ہندوستان کے تخت پر وہ پچاس برس تک جلوہ گر رہا ——— اور اس کے دورِ مملکت میں علم و ادب اور فنون لطیفہ نے جو ترقی و بلاغت پائی۔ وہ پچاس قرنوں میں بھی بعید معلوم ہوتی ہے ——— رومان اور تاریخ اس کے عہد میں شانہ بشانہ چلتے ہیں۔ ایک طرف تخیل بصد ناز رواں دواں ہے تو دوسری طرف رفعتِ فکر و حقیقت کا عنصر جاری و ساری ہے۔ زیر بحث تصویری نمائش میں سب سے پرانی تصویر جو مغل عہد سے تعلق رکھتی ہے، وہ "خاندانِ تیمور کے شہزادے" کی تھی۔ یہ غالباً ۱۵۵۰ء اور ۱۵۵۵ء کے درمیان بنائی گئی تھی۔ اس میں کاغذ کی بجائے کپڑا استعمال کیا گیا ہے۔ اس میں اکبر، جہانگیر اور شاہجہان کی تصویریں بعد کو ایزاد کی گئی تھیں، رنگ روغن سے مزین یہ تصویر دربارِ اکبری کے مصور میر سید علی کا شاہکار ہے ——— حمزہ نامہ کا مصور نسخہ جو پیغمبر اسلام صلعم کے چچا کے کارناموں کے متعلق ہے ——— اکبری اسلوبِ مصوری کا اعلیٰ، جامع اور حسین نمونہ ہے ——— جس کی تشکیل فارسی روایات اور علاقائی اثر کے ادغام سے کی گئی تھی۔ بخارا اسکول بھی کسی سے پیچھے نہیں رہا۔ ہرات اکیڈمی کے اسلوب میں گلستانِ سعدی کا مصور مسودہ بالخصوص اکبر کے لئے تیار کیا گیا جو اپنی نظیر آپ ہے ——— عہدِ اکبری کے آخری پندرہ سال علم مصوری کے لئے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ انہی دنوں وزیر اعلیٰ ابوالفضل نے اکبر نامہ لکھا جو بادشاہ کے آباؤ اجداد اور خود اس کے اپنے عہد کی سال بسال اور واقعہ بہ واقعہ تفصیل و دستاویز ہے ——— اس کے ۱۸ مصور صفحے یہاں موجود ہیں جو اس اہم اور تاریخی کارنامے کو اور بھی جلا بخشتے ہیں ——— ایک تصویر میں اکبر فتح پور سیکری سے آمدہ، شہزادہ سلیم لبعد میں شہنشاہ جہانگیر کی پیدائش کا مژدہ سن رہا ہے، جس پر موسیقارِ اعظم تان سین نے اکبری راگ درباری میں ولادتِ شہزادہ کے متعلق جشنِ موسیقی میں گایا تھا۔

ع ری! انوکھا لاڈلا۔ کھیلن کو مانگے چندا

یہ تصویر کتاب کے ۲۰ مصوروں میں سے ایک ہندو چترا کی بنائی ہوئی ہے اور کتاب کی خطاطی محمد حسین کاشمیری کے بہترین خط نستعلیق میں ہے۔

عہد جہانگیری میں شستہ نظامی کی تصویر "شیریں فرہاد" اورنگ زیب اور مراد بخش کی شبیہیں بعالم جوانی، اور جہانگیر کی تصویر فقیر کی عرضداشت کے ساتھ، قابل ذکر ہیں۔ مغل راجستھانی انداز میں "محفل ناؤ نوش" کی تصویر بھی خوب ہے ---- اس عہد میں عیسائی تصویریں "مریم اور ابن مریم" از غلام شاہ سلیم اور داستان مسیح (فارسی) کا ورق حضرت عیسیٰ کا یروشلم میں داخلہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔

شاہجہان کا دور ۱۶۲۷ء سے ۱۶۵۸ء تک ہے۔ ایک مصور ورق پر خان اعظم، جہانگیر اور شیر محمد لکھو کار جیسی شخصیات کی شبیہیں ہیں ---- خواجہ ابو الحسن متوفی ۱۶۳۳ء کی وہ تصویر بھی یہاں موجود ہے جس کی اصل پیرس کی LOOVRE (لوور) گیلری میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اس کے علاوہ "مفتون عاشق"، اور "شاعر کبیرا اپنے چیلوں کے ساتھ" تصویریں بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔

ایک تصویر یورپین لوگ دریا کے کنارے" اورنگ زیب کے عہد کی ملتی ہے۔ حیرت ہے کہ عورتوں کے بالکل عریاں سینے اورنگ زیب جیسے متشرع اور متدین بادشاہ کے دور میں کیونکر عتاب شاہی سے بچ نکلے۔

محمّد خالد اختر

سواتی مُہم

(آخری قسط)

اتوار گل اور اس کا بہادر گھوڑا

لاری میں سیدو آتے ہوئے حاجی سرفراز گل نے ہمیں "مرغزار" ضرور دیکھنے کا مشورہ دیا تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل عبداللہ نے خوازہ خیل میں "مرغزار" کی رنگینی کا ذکر کیا تھا اور "ارمغان سوات" میں شیخ مظفر حسین نے اس کے سنگِ مرمر کے محل اور مسجد کو "قابلِ دید" قرار دیا تھا۔ اس جگہ کے حق میں اتنی قوی شہادتوں کے ہوتے ہوئے ہم نے محسوس کیا کہ ہم نے مرغزار نہ دیکھا تو سواتی مہم نامکمل رہ جائے گی۔

چائے پینے کے بعد کوئی چار بجے ہم مرغزار جانے کے لئے نکلے۔ یہ جگہ آٹھ میل دور تھی اور ہم نے بہادری سے وہاں پاپیادہ جانے کا طے کیا۔۔ ہم نے سیدو کی سڑک پکڑی۔ سڑک پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پولیس کے سپاہی کھڑے تھے۔ اسٹیٹ کالج کے پاس ہم نے ایک سپاہی سے پوچھا کہ مرغزار کتنی دور ہے۔ اسے اردو کم آتی تھی۔ شاید وہ ہمیں سمجھا نہیں۔ اس نے کہا "بیس کوس"۔ کم از کم ہم نے یہی سمجھا۔ ہم شک میں پڑ گئے۔ "ولیعہد صاحب" کے راہنما پر ایک سپاہی نے اسے "بارہ کوس" کردیا۔ تانگے کے اڈے پر تیسرے نے ہمیں صاف باؤلوں کا جوڑا سمجھ کر ایک طرف ہٹا دیا۔ اسے کوئی اور ضروری ڈیوٹی سرانجام دینا تھی۔ والی کی سواری گذر رہی تھی۔ ٹریفک سڑک پر روک دیا گیا۔ سپاہی اپنی اپنی جگہ پر اٹینشن ہوگئے اور موٹر سائیکل پر ایسکورٹ کے پیچھے ایک سفید کھلی گاڑی والی کو لئے زن سے گذر گئی۔ ہمیں ایک طرف ہٹانے والے سپاہی نے اب آرام کا سانس لیا۔ وہ کچھ موٹا آدمی تھا۔ اس نے اپنی پیشانی سے پسینے کے قطرے پونچھے اور ہماری طرف متوجہ ہوا۔ "ہاں اب بتاؤ ــــ "مرغزار ادھر سے دس میل ہے"۔

ایک تانگے والے نے تانگہ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "ام آپ کو مرغزار لے چلے گا۔ یہاں سے دس کوس ہے"۔ ہم نے کرایہ پوچھا۔ اس نے کہا "دس روپے۔ ام زیادہ نہیں مانگے گا۔ یہ والی صاحب نے مرغزار جانے کے لئے مقرر کیا ہے۔ ام زیادہ مانگے تو ام کو دو سال سزا ہو جائے گا"۔

آخر ہم نے تانگے میں ہی مرغزار جانے کا فیصلہ کیا۔ دن ڈھل رہا تھا اور دس میل نے ہمیں ڈرا دیا تھا۔ پیدل ہم مرغزار آٹھ نو بجے رات سے پہلے نہ پہنچ سکتے تھے۔ چاند بھی نہیں تھا۔ اور پھر ہمیں واپس بھی لوٹنا تھا۔ ہم نے "تانگہ لے کر عقلمندی کی۔

اتوار گل کوچبان کا نام تھا۔ (ام اتوار کے روز پیدا ہوا تھا") وہ ایک سیاہ سکڑے ہوئے چہرے کا پتلا لانبا آدمی تھا ــ اپنی نسوار کا رسیا۔ مجھے شک ہے کہ وہ افیون کا نشہ بھی کرتا ہوگا۔ کیونکہ اس کی آنکھیں نشے بازوں کی طرح اس کے استخوانی کھنچے ہوئے چہرے میں جلتی تھیں۔ اتوار گل ایک بیحد باتونی اور یار باش آدمی تھا۔ راستہ بھر اس کی زبان ایک کترنی کی طرح چلتی رہی۔ بڑے دلچسپ اور بھلے انداز میں۔ ہم نے اس سے سوات کے بارے میں بڑے سوال کئے۔ اس نے ان کا اچھی سوجھ بوجھ اور لطف سے جواب دیا۔ بلاشبہ وہ ایک کتاب جنتا پُراز معلومات تھا۔ اتوار گل حقیقتاً "ایک موتی تھا۔

ہم والی صاحب کی سڑک پر گئے۔ ایک طرف سیدو کے مکان اور دوسری طرف صنوبر، سرو اور بید مجنوں کے کشت زار۔ والی کے محل کے پھاٹک پر دو کانسٹیبلوں کی گارد تھی۔ آگے دکان اور سیب کے ایک باغیچے کے پاس اتوار گل کا گھوڑا اڑیل پڑ گیا۔ اور ایک بھی انچ آگے جانے سے منکر

ہو گیا۔ گھوڑے کے دماغ میں آنے والی آٹھ میل کی سخت چڑھائی سما گئی تھی۔ انوار گل نے اسے چابک پر چابک لگائے آخر اسے چلانے کے لئے اس کو نیچے اترنا پڑا۔ گھوڑے نے چار و ناچار اپنی قسمت کے سامنے سر تسلیم خم کر لیا۔ ہم پچیس سال سے تانگہ چلانے کا کام کرتا ہے۔ ہم سوات کا رہنے والا نہیں ہم ادھر ملاکنڈ کا رہنے والا ہے' اور انوار گل نے چابک سے پرلی پہاڑیوں کی سمت اشارہ کیا۔ "ہم انگریز فوج کے زمانہ میں ملاکنڈ کے پہاڑوں پر تانگہ چلایا کرتا تھا۔ اس وقت ادھر سوات میں کچھ نہ تھا۔ ادھر کوئی سڑک تھا، نہ سکول، نہ عدالت، نہ پولیس۔ یہ سب کچھ جو تم لوگ یہاں دیکھتا ہے بادشاہ صاحب کے زمانے میں بنا۔ ام ہی سیدو میں پہلا تانگہ چلانے والا ہے۔ جب یہاں ایک ہی سڑک تھا اور وہ بھی نیچا اونچا۔ اس وقت تم کو ادھر ایک بھی پڑھا ہوا آدمی نہ ملتا۔ یہ لوگ جنگلی اور وحشی تھا۔ ڈاکہ، قتل غارت، چوری عام تھا۔ کسی کا عزت، مال، جان محفوظ نہ تھا۔ سواتی لوگ کو تم نہیں جانتا۔ سخت خراب لوگ تھا۔ سگے باپ سے نہیں ڈرتا تھا ——— ام سوات کا رہنے والا نہیں ہے۔ بادشاہ صاحب نے ان کو آدمی بنا دیا ہے۔ سڑکیں، ہاسپٹال اور سکول بنا دیا۔ پولیس کا انتظام اچھا ہے۔ اب یہاں امن ہے۔ سال میں ایک آدھ خون ہوتا ہے۔ بادشاہ صاحب ام کے لئے مثل اماں باپ کے ہے" ——— انوار گل کی زبان اسی طور پر چپڑ چپڑ چلتی رہی۔

اب عام محنت کش آدمی ہمیشہ اپنے آقاؤں اور حاکموں کے متعلق باتیں کرتے وقت زہر اگلنے لگتا ہے۔ اس کی اپنی تلخی ایام، بھوک اور مایوسی جیسا کہ قدرتی ہے، اسے کڑوا کسیلا بنا دیتی ہے۔ وہ اپنے مالکوں کو موٹروں اور محلوں میں عیش کرتے دیکھتا ہے اور اس کے لئے محنت اور دکھ کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ تم یقین کرو یا نہیں، سوات میں وہ اپنے نیک نام بادشاہ صاحب اور اس کے بیٹے والی صاحب سے محبت کرتے ہیں۔ انوار گل کی طرح وہ تمہیں بادشاہ صاحب کی دانشمندی، تدبر، سوجھ اور تدبیر کی داستانیں سناتے نہ تھکیں گے۔ خوش قسمت ہیں یہ لوگ کہ ان کا ایسا بادشاہ ہے۔ (یہ شخص ایک ملوکیت پرست ہے! "ایک اشتراکی اس پر چلائے گا) لیکن ایک اچھا آدمی ایک اچھا آدمی ہے خواہ وہ تخت پر ہو یا ایک جھونپڑے میں۔ اور اپنی جسمانی اور قلبی صلاحیتوں کو انسانوں کی زیادہ سے زیادہ فلاح و بہبود کے لئے بروئے کار لانا ——— دوسروں پر اپنے اختیارات کو خدا ترسی اور منصفی سے استعمال کرنا ——— ایک سچے اور حق پرور آدمی کا ہی کام ہے۔ والی خود ایماندار ہے اس لئے سوات میں بلیک مارکیٹ کا وجود نہیں اور اس کے احکام کی حقیقتاً تعمیل کی جاتی ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی چیز میں ——— خواہ وہ ہوٹل یا تانگے کا کرایہ ہو یا چائے کی پیالی کی قیمت ہو ——— والی کا مضبوط، انصاف پرور ہاتھ نمایاں ہے۔ والی صاحب نے چائے کے پیالے کی قیمت ایک آنہ مقرر کی ہے۔ اور کوئی تم سے اس ایک آنے سے زیادہ نہیں مانگ سکتا ورنہ پانچ سو روپیہ کا جرمانہ ہے۔ والی صاحب نے حکم دیا ہے کہ چائے کی پیالی میں ہمیشہ کھانڈ استعمال ہو گی اور کوئی اس کے برعکس کرنے کی جرات نہیں کر سکتا۔ پچھلے دنوں میں ——— انوار گل نے بتایا ——— جب پاکستان میں چینی کی قلت تھی، والی صاحب کا انتظام اتنا خاطر خواہ تھا کہ اس جنس کی یہاں معمولی سی بھی قلت محسوس نہ کی گئی۔ کنٹرول تھا مگر ہر ایک کے لئے وافر چینی تھی ——— "یہ اس لئے ہے کہ موجودہ والی کو اپنے باپ بادشاہ صاحب سے اچھا تربیت ملا ہے۔" انوار گل نے کہا۔ "بادشاہ صاحب صحیح معنوں میں درویش صفت انسان ہے۔ اب پچاسی سال کی عمر میں بھی وہ صحت مند اور مضبوط ہے۔ وہ کسی لکڑہارے کی طرح کلہاڑے سے لکڑی کاٹ سکتا ہے۔ ایک تجربہ کار گڈریے کی طرح پہاڑوں پر گلہ بانی کر سکتا ہے اس لئے لوگ اس سے دل سے محبت کرتا ہے۔"

ہم نے اب چڑھائی چڑھنا شروع کر دی تھی۔ انوار گل نے چابک سے سامنے کے سبز پوش پہاڑ کی سمت اشارہ کیا جس پر ہمیں پہنچنا تھا ——— "وہ مرغزار ہے۔" اور گھوڑے کے اتنی اونچائی پر چڑھ سکنے پر ہمارے تعجب کرنے پر اس نے یقین دلایا کہ اس کا گھوڑا تقریباً روز یہ سفر کرتا ہے۔ اس نے ہمیں بتایا کہ سارے سیدو میں صرف اس کا تانگہ ہی ایسا ہے جو یہ سخت چڑھائی چڑھ سکتا ہے اور میرا خیال ہے کہ جو کچھ اس نے کہا سچ ہو گا۔ سڑک پہاڑ کے ساتھ ساتھ اوپر چڑھتی اور ایک لمبی وادی میں داخل ہوئی۔ دن ڈھل رہا تھا اور آغاز شام کا سونا ابھی تک درخت اور پتھر، کھلیان اور جنگل پر رکا ہوا تھا۔ وادی کے درمیان میں ایک پہاڑی

پر ایک بڑا قصبہ بنا ہوا تھا۔ "کالام" — انوار گل نے کہا۔ وادی ایک ہتھیلی کے خلا کی مانند تھی، پہلے کھیت تختوں کی شکل میں نچلی ڈھلانوں میں پڑے تھے اور بھیڑیں سفید دھبوں کی طرح ہری دوب پر پھر رہی تھیں۔ انوار گل نے ہمیں بتایا کہ سیدو سے ادھر کی ساری زمین — اس وادی کی زمین — والی کی اپنی ہے — اس کے مزارعین یہاں کاشت کرتے ہیں۔ آدھی فصل ان کی ہوتی ہے، آدھی والی کی ہوتی ہے۔ دوسری زمین کے لئے کاشتکار کو فصل کا دسواں حصہ ہر سال مالگذاری میں حکومت کو دینا پڑتا ہے اور یہ مالگذاری جنس میں ہوتی ہے، نقدی میں نہیں۔

اس طرح ہم اوپر چڑھتے گئے — انوار گل کی زبان ایک ہمیشہ چلتی ہوئی قینچی تھی — اس کا کوڑا بار بار بے چارے گھوڑے کی پیٹھ پر پڑتا تھا۔ گھوڑے نے چڑھائی کو محسوس کرنا شروع کر دیا تھا، اور ہم اسے الزام نہیں دے سکتے تھے۔ یہ اب دوڑنے کی بجائے چل رہا تھا اور ہر پانچ منٹ بعد سستانے کے لئے رُک جاتا تھا — آدھا فاصلہ طے کرتے کرتے وادی میں شام کے اودے اور نیلے سائے چھانے لگے۔

اچانک ایپی کیورس نے (وہ تانگے کی پچھلی نشست پر بیٹھا تھا اور اس کا منہ پربت کی طرف تھا) میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کپکپاتے ہوئے لہجے میں لفظ "برف" کہا۔ میں نے پیچھے مڑ کر اس کی انگلی کی سمت دیکھا۔ پرے پہاڑوں کے پیچھے اس پہاڑ پر جسے گنہگار کہتے ہیں، برف بلور کی طرح دمک رہی تھی۔ یہ ایک شاندار روح افزا لمحہ تھا — میں نہیں جانتا یہ ہماری اونچائی کی وجہ سے تھا یا تانگے میں ہماری خاص پوزیشن کی وجہ سے کہ ہمیں گنہگار کی برفیں بالکل قریب لگیں اور ان کا سرد سانس ہم نے اپنی پیشانی پر محسوس کیا — پھر ایک معجزہ ہوا۔ برفوں نے ڈوبتے سورج کی لالی کو منعکس کیا اور وہ آگ یا خون کے گنبد بن گئیں۔ ایپی کیورس کی آنکھوں میں اتنے ناممکن، ناقابلِ حصول حسن کو دیکھ کر آنسو آ گئے۔

پریوں کا محل

گھوڑا رکتا ہانپتا تانگے کو کھینچتا گیا، شام کے گہرے اندھیرے میں انوار گل اپنے چابک اور اپنی سامنے جمی ہوئی جلتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اب آسیب لگنے لگا — دوسری دنیا کی کوئی روح — وہ مجھے کافکا کی خوفناک کہانی میں کوچبان کی یاد دلانے لگا۔ ہم ایک لوہار کی دکان کے پاس سے گذرے اور لوہار کی دکان ایک رومینٹک چیز ہے، خاص طور پر ایک تنہا پہاڑی سڑک پر۔ یہ اچھا آدمی اپنی دکان میں ایک پہیئے کی مرمت کر رہا تھا اور اس کے ہتھوڑے کی ٹھکا ٹھک ہمارے کانوں سے موسیقی کی طرح ٹکرائی۔

پھر جب کہ شام ابھی یہاں گہری نہ پڑی تھی (وادی اب اودے اور ملگجی سایوں میں تھی) ہم مرغزار پہنچ گئے۔ انوار گل نے تانگہ کھڑا کیا۔ (ام تم کو سب کچھ دکھائے گا) اور ہم تینوں انوار گل کی راہنمائی میں چند سیڑھیاں چڑھ کر سیدھے پرستان میں آ نکلے — یہ ایک وجد کی کیفیت تھی جس کے ہم نزدیک پہنچ گئے اور ہمارے دل کی کلی کھل گئی۔ بچپن کی کہانیوں میں ہم نے ایسی جگہ کے متعلق پڑھا تھا اور اس کے خواب دیکھے تھے۔ اب ہم نے پریوں کے محل کو سچ مچ اپنے روبرو دیکھ لیا۔ کوئی تعجب نہیں کہ شیخ مظفر حسین سی۔ پی۔ ایچ نے اس کی تعریف میں اتنی رنگینیٔ بیان سے کام لیا تھا۔

ہمارے سامنے زمردیں گھاس کے قطعے کے حاشیے پر سنگِ مرمر کے چبوترے پر ایک چھوٹا سا سفید محل ایستادہ تھا — اس کا پیش رُو کار اونچے ستونوں کے ساتھ ایک یونانی فورم کا سا تھا۔ اس ننھے محل میں پھول کی ایک پتی کی سی نزاکت تھی۔ ایک غیر مرئی صفت — یہ پریوں کا محل تھا۔ آدم زاد کا یہاں قدم نہ پڑ سکتا تھا۔ پریاں اس وقت کہیں گئی ہوئی تھیں اور محل سُونا تھا۔

قطعوں میں سنگِ مرمر کی مسہریاں اور آرام چوکیاں منقش میزوں کے گرد بچھی تھیں — ایک فوارہ درمیان میں پانی اچھال رہا تھا — دو حوض تھے — ایپی کیورس اور میں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ "یکایک" ہم نے خاموش زبان سے ایک دوسرے سے کہا۔ "وہ زیبا صورت، چنچل حسین پریزاد یہاں سے اٹھ کر

کہاں چلے گئے۔ کیا ہماری آمد نے انہیں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگ جانے پر مجبور کر دیا ہے"۔

انوار گل ہمیں مرغزار کی مختلف عمارتیں اور عجوبے اس خوشی سے دکھانے لگا جیسے اس نے ہی یہ سب کچھ ایجاد کیا ہو۔ لیکن ہمیں اس وقت گائیڈ کی ضرورت نہ تھی۔ اس کی موجودگی ہم پر بار ہونے لگی تھی۔ ہم چاہتے تھے کہ وہ چلا جائے اور ہمیں تنہا چھوڑ دے۔

"یہ والی صاحب کے مہمانوں کے لئے ہے"۔ انوار گل نے قصر کے ساتھ برآمدوں والی ایک عمارت کی طرف اشارہ کیا۔ وہ پھر ہمیں قصر کے عقب میں سے سیڑھیوں پر ایک اور کھلی ہوا والی ہموار جگہ پر لے گیا۔ یہاں بچوں کی ایک سبز عمارت تھی۔ یہ بھی مہمانوں کے لئے تھی۔ ہم نے کمروں میں جھانکا۔ وہ خوب سجے ہوئے اور آراستہ تھے۔ اس مہمان خانہ کے سامنے ایک فراخ کشادہ ٹیرس تھا ــــ ایک جہاز کے عرشے کا سا اور اس ٹیرس پر سفید پتھر کے بنچ پڑے تھے۔ ہم نے انوار گل سے یہ کہہ کر پیچھا چھڑایا کہ ہم ابھی تھوڑی دیر تک آتے ہیں۔ اس کے جانے کے بعد ہم ایک بنچ پر آ کر بیٹھ گئے۔

کیسا شاندار اور حسین نظارہ اس ٹیرس پر سے ہمارے سامنے بچھا تھا! ــــ نیچے دور تک وادی دو پاگل مسافروں کو بے خود اور متحیر کرنے کے لئے اپنا سینہ کھولے پڑی تھی۔ رنگین جھٹ پٹا اس کے اسرار اور رنگینیوں پر ایک غبار کی طرح چھایا ہوا تھا۔ دہقانوں کے گھروندوں سے دھواں اٹھ رہا تھا اور گھنٹیوں کے بجنے کی آوازیں دُور کی گونجیں بن کر آتی تھیں ــــ مگر کون اس جادو، اس حُسن، اس خوشی اور اس غم کی تصویر کشی کر سکتا ہے جو اس وقت اس وادی کی صورت میں مجسّم تھا!

تمہیں وہاں بیٹھے ہوئے ایک سکوت اور گہرے سناٹے کا احساس ہوتا تھا اور یہ دریافت کر کے تم حیران ہوتے تھے کہ وادی چپ نہ تھی۔ یہ بڑی بھلی اور خوش آئند آوازوں سے معمور تھی اور اس کے پرندوں کی چہچہاہٹیں اور نواسنجیاں ایک لمحے کے لئے بھی بند نہ ہوتی تھیں۔ قدرت کے اس مستقل، کئی سُروں کے آرکسٹرا میں روح اور خون کو ہلانے کی ایسی قوت تھی جو انسانی راگ میں کمیاب ہوتی ہے۔

آدھ گھنٹہ ہم وہاں بیٹھے رہے۔ شاید ایک گھنٹہ اور سائے وادی میں گھنیرے ہو گئے۔ پھر بھی ابھی رات نہ ہوئی تھی۔ ہم نے ایک دوسرے سے ایک لفظ بھی نہ کہا اور وقت کا سب احساس کھو دیا۔ ہماری روحیں ساری ابدیت کے سمندر پر پرواز کر رہی تھیں اور ایک وقت اور ایک جگہ کے ساتھ بندھی ہوئی نہ تھیں۔ ہم وقت اور مکان کی حدود سے باہر چلے گئے تھے۔

ٹھنڈی ہوا پر فیلے گناہگار پہاڑ سے چلنے لگی۔ رات کے چند بے صبر ساتھی ابھی سے نیلگوں آسمان میں نمودار ہو گئے یہ جانتے ہوئے کہ اب اندھیرا ہونے والا ہے، ہم چلنے کے لئے اُٹھے۔ انوار گل ہمیں کوس رہا ہو گا۔ مگر نیچے قصر کے پاس آ کر ہمارے دلوں نے اس سحر زدہ جگہ سے اتنی جلدی چلے جانے سے انکار کر دیا ــــ اور ہم دوب پر آرام چوکیوں پر بیٹھ گئے ــــ ایپی کیورس نے اپنا کرانیکل جلدی جلدی لکھنا شروع کر دیا تھا کہ وہ ان تاثرات کو ابھی ابھی مسخر کر لے جب کہ وہ تازہ تھے۔

"غنک، رغنک، غنک" رنگین جھٹ پٹے میں سے آواز آ رہی تھی۔ یہ نل سے حوض میں پانی کے گرنے کی آواز تھی ــــ مگر کون کہہ سکتا ہے کہ یہ کسی شوخ پریزاد کے گنگنانے اور ہنسنے کی آواز نہ تھی۔ میں نے ایک مدھم سرسراہٹ سی فضا میں محسوس کی۔ یقیناً پریاں اپنے پرستان میں اتر رہی تھیں۔

اور پھر کئی برسوں میں پہلی دفعہ سجدہ کرنے اور نماز پڑھنے کی زبردست خواہش نے مجھ پر قابو پایا ــــ اتنی شدید اور تلملانے والی خواہش کہ یہ باقاعدہ بھوک کی ایک قسم محسوس ہوتی تھی مگر میں ایپی کیورس کی تمسخر انگیز ہنسی سے ڈرتا تھا ــــ میں بے قرار ہوا۔ مجھے اس کی بارگاہ میں ابھی سربسجود ہونا چاہیئے اور اسی جگہ ــــ یہ لمحہ پھر کبھی نہ آئے گا۔

"ایپی کیورس" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میں وضو کرنے جا رہا ہوں۔ میں نماز پڑھوں گا"۔ اس نے اپنے کرانیکل پر سے سر اٹھایا۔ وہ ہنسا نہیں، اور اس سے میں حیران ہوا۔

"مجھے یہ بتاؤ۔" اس نے مجھ سے سنجیدگی سے راز جوئی کے انداز میں پوچھا۔ "کس خدا کی تم نماز پڑھنے والے ہو۔ مذاہب کے خدا کی یا اس پراسرار قوت کی جو فطرت میں ہے اور ہر مادے میں جنبش کرتی ہے۔ دیکھو سوچ کر سچ سچ بتاؤ۔ میں یہ سب کچھ کرائسٹ کل میں رقم کر رہا ہوں۔"

"میں نہیں جانتا" میں نے کہا "شاید اسی طاقت کی نماز جس کا تم ذکر کر رہے ہو — مگر کیا مذاہب کا خدا اس طاقت سے مختلف ہے۔ کیا وہ اپنے جوہر میں وہی نہیں جو یونانیوں کا اپالو تھا، قدیم مصریوں کا حارث تھا، ہندوؤں کا شو تھا۔ اسے جو کچھ تم کہہ لو۔ اس کا تصور تم جیسے بھی باندھ لو، وہ ایک ہی خدا ہے اور میں کسی اور کو نہیں جانتا۔"

اور میں نے حوض میں وضو کر کے ہری دوب پر اترتے ہوئے نورانی وجودوں کے درمیان نماز پڑھی اور ایک ایسی ہستی کی صحت و خوشی کے لئے دعا مانگی جو اس زمین پر میرے لئے سب سے پیاری چیز تھی۔

ہم وہاں ساری رات بیٹھے رہتے کہ انوار گل بے صبر ہو کر اوپر آ گیا۔ "اب چلو اندھیرا پڑ گیا ہے۔ میرے پاس بتی بھی نہیں۔"

اور تاروں سے مدھم طور پر جھلملاتی رات میں انوار گل (وہ اپنے چابک کے ساتھ ایک عفریت تھا) ہمیں واپس سیدو میں لے گیا۔ ہم سیدو میں ہی اتر گئے کیونکہ انوار کے پاس لیمپ نہ تھا اور اسے چالان ہونے کا ڈر تھا۔ ہم نے اسے پندرہ روپے دیئے — اس کے کرائے سے پانچ روپے زیادہ اور وہ اس کا یقیناً مستحق تھا — بڑی دیر تک ہم سیدو کے پُراسرار گلی کوچوں میں گھومتے رہے اور جب ہم منگورا پہنچے تو اس وقت نو کا عمل ہو گا۔ تب بھی ہمارا دل ہوٹل میں جانے کو نہ چاہا۔ ہم ہوٹل کے سامنے بازار میں ایک سمت سے دوسری سمت ٹہلنے لگے۔ رات ابھی جوان تھی۔ یہ ہماری منگورا اور سیدو میں آخری رات تھی اور ہماری گفتگو ادب اور فن کے بارے میں تھی جس سے بڑھ کر میرے لئے اور کوئی گفتگو اچھی نہیں۔ ایبی گیورس اور مجھ میں پہلے بھی ادب کے تقاضوں پر بحثیں ہوئی تھیں مگر یہ بحث ان سے مختلف تھی۔ یہ ایک طلسماتی شہر میں دو پرجوش جوانوں کے درمیان ادب کی قدروں اور تقاضوں پر بحث تھی، میں ایک مذہبی جنونی کی حدت سے کلاسکز کے حق میں بولا۔ میں نے دعوے کیا کہ "ویکار آف ویکفیلڈ" یا "ٹریژر آئی لینڈ" یا ہماری "باغ و بہار" ہمیشہ ہری بھری رہیں گی جب کہ سارے جدید نظریاتی یا نفسیاتی شاہکار کبھی کے بھلائے جا چکے ہوں گے۔ ایبی گیورس ماڈرن انٹلیکچوئیلز (کھلے، جوائس اور ٹی۔ ایس ایلیٹ) کی طرف داری کر رہا تھا۔ اس کی رائے یہ تھی کہ اس زمانے میں کلاسکز پڑھنا محض وقت ضائع کرنا ہے — یہ ایک بڑی دلچسپ گفتگو تھی، جگہ اور وقت اور موڈ نے اسے ہمارے لئے ناقابلِ فراموش بنا دیا ہے۔ اور اگرچہ ہم ایک دوسرے سے متفق نہ ہو سکے مگر گفتگو نے ہمارے دماغوں میں ایک دمک ضرور پیدا کر دی۔

کوئی گیارہ بجے ہم ہوٹل میں کھانا کھانے کے لئے لوٹے۔

اور واپس

دوسرے دن صبح جب پیر گل ہمارا ناشتہ لے کر آیا وہ گنی جانے والی بس نیچے سڑک پر مسافروں کو بلانے کے لئے ہارن بجا رہی تھی۔ جلدی سے ہم نے ناشتہ کیا، سامان باندھا اور ہوٹل کا بل ادا کر کے بس میں آ بیٹھے۔ بل نے ہمیں حیران کر دیا — (صرف دس روپے ہم دونوں کے لئے اور اس میں کمرے کا کرایہ اور سب کچھ شامل تھا) ہمیں یقین نہ آتا تھا کہ یہ اتنا کم ہو سکتا ہے۔ شاید ہوٹل والوں سے غلطی ہو گئی تھی۔ ہم بڑے مزے اور آرام سے ایک ہوادار بالکنی والے کمرے میں رہے تھے۔ ہر کھانے پر ہم نے مرغ اور انڈے اڑائے تھے اور چائے کے لاتعداد پیالے (بالائی کے ساتھ) انڈیلے تھے۔ بجلی کو بارہ بارہ بجے تک جلائے رکھا تھا۔ اور اس سب کچھ کے لئے صرف دس روپے! کیا دنیا میں اور کوئی جگہ اتنی سستی ہو سکتی تھی!

منگورا سے ہم ایک اداس دل سے رخصت ہوئے۔ مجھے کبھی کسی جگہ کو چھوڑنے سے اتنا افسوس نہیں ہوا۔ اس خنداں وادی کو چھوڑ کر پھر اس گھٹی ہوئی عزت داروں کی دنیا کو لوٹنے کا خیال میرے لئے سوہانِ روح تھا۔ مگر آدمی کو لوٹنا ہی پڑتا ہے۔ کیوں؟ میں نے اپنے سے پوچھا۔ بیشتر انسان اپنے اور اپنے موروثی

کی روایات کے بنائے ہوئے زندان میں رہتے ہیں۔ جھوٹی عزت داری اور کامیابی اور اپنے عزیزوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے وہ اپنی جوانی اور اپنے سینے اور اپنے بہترین سال قربان کر دیتے ہیں وہ ساری عمر ایسے پیشوں میں صرف کر دیتے ہیں جن سے وہ نفرت کرتے ہیں۔ مگر آدمی چاہے تو وہ اس زندان سے باہر آسکتا ہے اور کھلی ہوا میں سانس لے سکتا ہے۔ قدرت کے قیمتی تحفے سب کے لئے مفت ہیں۔ پانی اور ہوا اور سورج کی روشنی کے لئے کچھ نہیں دینا پڑتا۔ (شاید بڑے صنعتی شہروں کے سوا) اور خدا سب سیلانیوں کے لئے کھلا مکان رکھتا ہے ــــــ بڑے سے بڑے محل سے کہیں زیادہ شاندار اور نوادر سے پُر۔ یہ حیران کن ہے کہ ایک آدمی کو خوش خوش زندہ رہنے کے لئے بہت کم اشیاء کی ضرورت ہے اور ایک روٹی کا ٹکڑا اور چشمے کے پانی کا گلاس اسے مکمل صحت میں رکھنے کے لئے کافی ہے۔ میں نے تہیہ کیا کہ میں اس زندان سے باہر آجاؤں گا۔ اور اس وادی میں آکر ان خوش و خرم لوگوں میں رہوں گا۔ شاید مجھے یہاں ایک معمولی اسکول ماسٹر کی ملازمت مل جائے۔ سکول ماسٹر کی زندگی کوئی بُری زندگی نہیں۔ عزت داری کے سب اصول، دنیا بھر کے سب رشتہ دار مجھے پھر اپنے پُرفریب واسطوں سے کھینچ کر اس لعنت کے زندان میں نہ لے جاسکیں گے۔ وہ آکر میری منتیں کریں گے۔ میں ان کی باتیں سنوں گا اور ایک سیانے چینی فلسفی کی طرح روئی سے اپنے کانوں کو دھوڈالوں گا۔

ہم درد اور حسرت کے ساتھ اس مسکراتی ہوئی جنت میں سے گذرے۔ ہم باٹ خیل میں سے گئے اور مالاکنڈ کے بھورے ننگے پہاڑوں پر چڑھے اور اترے۔ دس بجے ہم درگئی کے مصور ریلوے اسٹیشن میں تھے۔ اس واپسی کے سفر کی ایک اور اتنی ہی کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ کیونکہ آدمی کی زندگی میں کونسا ایک دن ہے جس پر ایک کتاب نہیں لکھی جاسکتی۔ مثلاً میں اس موٹے، پلپلے، عینک لگے شخص کا بتا سکتا ہوں جو انٹر میں ہمارے ساتھ سوار ہوا۔ جو دعویدار تھا کہ وہ قیمتی دھاتوں کی کانیں سروے کرنے والی ایک فرم کا مینیجنگ ڈائریکٹر ہے اس نے ہمیں بتایا کہ اس نے چترال میں سونے کی ایک کان کا پتہ لگایا ہے اور ہماری دلچسپی کے لئے کاغذ کے ایک تھیلے میں سے کنکر اور ریت کی ایک مٹھی نکالی۔ اس نے ہمیں یقین دلایا کہ اس میں چمکتے ہوئے ذرات سونے کے ذرات ہیں۔ اس نے کہا کہ وہ تین ہزار روپے ماہانہ کماتا ہے اور اس نے ہمیں اپنی کمپنی میں حصہ دار بنانے کی بھی پیش کش کی بشرطیکہ ہم ایک ایک ہزار روپیہ کا سرمایہ لگا سکیں۔ وہ ہمارے سگریٹ پیتا رہا اور ہماری صحبت اسے اتنی پسند آئی کہ گو اسے مردان میں اترنا تھا مگر وہ ہمارے ساتھ نوشہرہ تک چلا آیا۔

یا میں نوشہرہ سے پشاور کے سفر کا حال لکھ سکتا ہوں کہ کیسے ہم نے سامان پشاور کی گاڑی میں رکھوایا اور اس سے رہ گئے کیونکہ اپی کیورس نے ریفریشمنٹ روم میں کھانے پر دیر کر دی تھی۔ کیسے ہمارے سامان کا کچھ حصہ ــــ میری ایک کتاب اور اپی کیورس کا قیمتی کوائیل گاڑی کے ساتھ چلا گیا۔ کیسے ہم نے ایک بس پر گاڑی کا پیچھا کیا اور اسے اس وقت جا پکڑا جب وہ پشاور چھاؤنی میں داخل ہوئی۔ اور بڑی خوش قسمتی سے کھوئی ہوئی چیزوں کو حاصل کیا۔

لیکن ہمارا سفر اسی وقت ختم ہوگیا تھا جب ہم منگورا سے چلے اور ایک سفر سے واپسی کے بارے میں لکھنا دلچسپ نہیں ہوسکتا کیونکہ لکھنے والا اس وقت تھک چکا ہوتا ہے (اور پڑھنے والا بے پرواہ) اور اس کا دل اس چیز میں نہ ہوگا جو وہ لکھے گا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نوشہرہ سے، جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے، ہم پشاور گئے اور ایک دو گھنٹے قصہ خوانی کے بازار میں گھومے۔ وہاں سے ہم نے شام کو میل پکڑی۔ اگلی صبح لاہور میں اپی کیورس اور میں ایک دوسرے سے جدا ہوگئے ــــ اپی کیورس کو اسی دن واپس بہاولپور اپنی نوکری پر پہنچنا تھا۔ مجھے لاہور میں ایک پرانے عارضے کا علاج کرانے کے لئے کچھ دن رکنا تھا۔

یہ ہماری سواتی مہم کا خاتمہ تھا۔ بہاولپور سے روانگی کے دن سے لے کر واپسی تک ہم کل چار دن سفر میں رہے لیکن ان چار دنوں میں جگہوں اور لوگوں کی کتنی ناقابلِ فراموش تصویریں ہمارے ذہنوں میں نقش ہوگئی تھیں اور کتنا لطف ہمیں ملا تھا! ان چار دنوں میں ہم اتنی مدت جیے کہ چار دن چار مہینے ہوگئے۔ استقدر ہمارے دماغ تاثرات سے بھر گئے کہ گھر پر دو سال میں آدمی اتنا کچھ نہیں دیکھ اور سیکھ سکتا جتنا ہم نے ان چار دنوں میں دیکھا اور سیکھا اور اپنے سفر کے اختتام پر ہم نہ صرف جسمانی طور پر زیادہ صحتمند تھے بلکہ ہر طریق سے پہلے سے زیادہ سیانے اور زیادہ بہتر آدمی تھے۔ سواتی مہم نے ہماری رگوں میں گردش کرتے ہوئے خون کو نیا کر دیا تھا۔ ہمارے دماغ پر جمتے ہوئے میل کو دھوڈالا تھا۔ اور اسے خوبصورت یادوں کا خزانہ دے کر بے اندازہ امیر بنا دیا تھا۔

سیّد ضمیر جعفری

○

نہ قالینوں میں ہوتی ہے، نہ دستاروں میں ہوتی ہے
بشر کی آبرو کچھ اور معیاروں میں ہوتی ہے

نہیں دیکھی تو دیکھو! میرے شہکاروں میں ہوتی ہے
جو مایوسی قریب المرگ بیماروں میں ہوتی ہے

ہماری عاجزی کی خُو پہ وہ بیگانہ خُو بولا
یہ وہ خوبی ہے جو خستہ نمک پاروں میں ہوتی ہے

چلو اچھا ہُوا، ناداں ہیں وہ، کم فہم ہوں میں بھی
غلط فہمی، ہمیشہ دو سمجھداروں میں ہوتی ہے

کوئی رُومی، کوئی رازی، کوئی اقبال پیدا کر
کہ شہروں کی بڑائی، ان کے میناروں میں ہوتی ہے

چمک، تعلیم سے انسان میں آتی تو ہے، اب بھی
مگر، دل سے زیادہ آگ رخساروں میں ہوتی ہے

عجب کیا ہے جو بچے برق ہیں فہم و فراست میں
میاں بیوی کی بحث اب روز اخباروں میں ہوتی ہے

ہمیں تو کچھ پتا ملتا نہیں اُن کی طبیعت کا
کبھی تاروں پہ ہوتی ہے، کبھی غاروں میں ہوتی ہے

جنابِ جعفری جو بول کہنا، تول کر کہنا!
کہ تیری شاعری کی بات بازاروں میں ہوتی ہے

کنہیا لال کپور

مرزا کامل

مرزا کامل اُن افراد میں سے ہیں جن پر حالی کا یہ مصرع صادق آتا ہے۔

عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

ویسے دیکھنے میں وہ بھلے چنگے انسان نظر آتے ہیں، لیکن اپنی گفتگو میں کچھ اس انداز سے دُور کی کوڑی لاتے ہیں کہ سامعین دانتوں تلے انگلی دبا کر رہ جاتے ہیں۔ بسا اوقات اُن کے عجیب و غریب انکشافات پر لطیفوں کا گمان ہوتا ہے۔ لوگ ہنستے ہنستے بے حال ہو جاتے ہیں۔ مرزا پر طرح طرح کے فقرے کستے ہیں۔ لیکن مرزا پریشان ہوتے ہیں نہ پشیمان، بلکہ پہلے سے بھی زیادہ جوش کے ساتھ اپنی لیاقت کے جوہر دکھانے لگتے ہیں۔

ایک مجلس میں "مونالیزا" کا ذکر چل رہا تھا۔ کسی شخص نے مرزا کی رائے دریافت کی۔ انہوں نے چٹخارا لیتے ہوئے فرمایا "اجی صاحب! کیا بات ہے مونالیزا کی۔ یُونان کی یہ حسین ترین رقاصہ سکندرِ اعظم کی خاص الخاص منظورِ نظر تھی۔ کہتے ہیں جب سکندر نے ایران پر حملہ کیا تو وہ اُس کے ساتھ گئی تھی۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ دارا کو سکندر نے نہیں، مونالیزا نے قتل کیا تھا اور قتل کرنے سے پہلے اُسے اپنے تیرِ نظر سے بُری طرح گھائل کر دیا تھا۔ مرنے سے پہلے دارا نے مونالیزا کو مخاطب کرتے ہوئے فارسی کا ایک شعر پڑھا تھا جس کا مفہوم اُردو کے ایک شاعر نے یُوں ادا کیا ہے:

ہم کو تو برباد کیا ہے،
اور کسے برباد کرو گے

ایران سے مونالیزا مصر میں پہنچی جہاں اُس کی ملاقات کلیوپیترا سے ہوئی۔ کلیوپیترا کے محل میں انیتھنی نے اسے دیکھ کر کہا تھا "کاش کلیوپیترا کی بجائے مجھے تم سے عشق ہوتا"۔

اس شخص نے مرزا صاحب کو مطلع کرتے ہوئے کہا "حضور! مونالیزا تو ایک مشہور تصویر کا نام ہے، جسے لیونارڈو ڈاونچی کا شاہکار تسلیم کیا گیا ہے"۔

مرزا صاحب نے اپنے اوسان ٹھکانے رکھتے ہوئے جواب دیا "میں گوشت پوست کی مونالیزا کی بات کر رہا ہوں۔ یہ مونالیزا اُس زمانے میں ہوئی تھی جب تمہارا لیونارڈو ڈاونچی پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔ یہ وہی مونالیزا ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ اگر اُس کی ناک ذرا اور تیکھی ہوتی تو وہ آدھی دنیا کو اپنے دامِ محبت میں گرفتار کر سکتی تھی"۔

"ہم نے تو اس کا نام پہلی بار سُنا ہے"۔

"آئندہ یاد رکھئے گا"۔

ایک اور محفل میں اس موضوع پر بحث ہو رہی تھی کہ کالی داس شیکسپیر سے بڑا ڈرامائسٹ ہے یا نہیں۔ مرزا نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے یہ

فتویٰ صادر کیا۔" کالی داس چوتھی اور شیکسپیر سولھویں صدی میں ہوا۔ اس لئے کالی داس شیکسپیر سے بارہ صدیاں بڑا ڈراماٹسٹ ہے۔ اس کے علاوہ ہمیں یہ نکتہ بھی کبھی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ شیکسپیر نے اپنے ڈراموں کے پلاٹ کالی داس سے چرائے ہیں۔"

"مثال کے طور پر؟" کسی نے سوال کیا۔

"ہیملٹ کا پلاٹ شکنتلا سے چرایا گیا ہے۔"

"لیکن ان ڈراموں کے پلاٹ میں کوئی مشابہت نہیں"

"ہے کیسے نہیں؟" مرزا نے چمک کر کہا "معلوم ہوتا ہے آپ نے ہیملٹ پڑھا ہے نہ شکنتلا۔"

"اچھا آپ ہی بتائیے۔ ان دو ڈراموں کے پلاٹ میں کون سی چیز مشترک ہے۔"

"کئی چیزیں ہیں، مثلاً ہیملٹ ایک موقع پر سوچتا ہے زندگی اچھی یا خودکشی۔ اسی طرح جب دشینت شکنتلا کو ٹھکرا دیتا ہے تو وہ بھی اسی انداز میں سوچتی ہے۔"

"اوّل تو یہ غلط ہے۔ بالفرض آپ کی بات تسلیم کر لی جائے تو اس "جز" کا "کل" سے کوئی خاص تعلق نہیں۔"

"یہ تعلق آپ کی سمجھ میں نہیں آ سکتا، کیونکہ آپ کی واقفیت محدود اور معلومات ناقص ہیں۔"

ایک دفعہ دو اشخاص میں ایک شعر کے متعلق جھگڑا ہو گیا۔ دونوں مرزا کے پاس پہنچے اور اُن کی رائے طلب کی۔ مرزا نے کہا "شعر پڑھئے" شعر پڑھا گیا۔ مرزا نے اُسے دو ایک بار خود پڑھا اور فرمایا واقعی بے نظیر شعر ہے۔

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی

دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

"میں کہتا ہوں یہ غالب کا شعر ہے۔ میرے دوست کا خیال ہے ذوق کا ہے۔ آپ کی کیا رائے ہے؟"

"حضرات" مرزا نے کہا "آپ دونوں غلطی پر ہیں۔ یہ شعر غالب کا ہے، نہ ذوق کا۔ دراصل اسے تین شاعروں نے مل کر کہا ——— اور وہ تھے، جناب دل شاہجہانپوری، حضرت جگر مرادآبادی اور محترمہ ادا بدایونی۔ ثبوت اس بات کا یہ ہے کہ تینوں کے تخلص شعر میں موجود ہیں۔"

اسی طرح کا ایک اور واقعہ اس دن ہوا جب ایک طالب علم نے مرزا سے فانی کے ایک مشہور شعر کی تشریح کرنے کے لئے کہا۔ وہ شعر تھا:

مُنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے

کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ!

مرزا نے بڑی سنجیدگی سے کہا "یہ ایک مزاحیہ شعر ہے۔ عاشق معشوق کو ڈرانے کے لئے کفن میں گھس جاتا ہے اور کچھ دیر کے لئے چپ سادھ لیتا ہے۔ اس کے بعد وہ مُہر سکوت توڑتا ہے اور معشوق کو مخاطب کرتے ہوئے اُس کی بے رُخی پر طنز کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ ڈرامہ کر رہا ہے۔ ورنہ اگر واقعی اُس کی موت ہو گئی ہوتی تو وہ ایک لفظ بھی نہ بول سکتا تھا، شعر کہنا تو دور کی بات ہے۔"

مرزا نے کبھی کسی غیر ملک کی سیاحت نہیں کی، لیکن اگر کوئی شخص ان کے سامنے کسی غیر ملک کا ذکر چھیڑتا ہے تو وہ اُس میں دخل دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ ایک نوجوان جو لندن سے لوٹا تھا، ہائڈ پارک کے متعلق کچھ کہہ رہا تھا۔

مرزا نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "جی ہاں، ہائڈ پارک انگلینڈ کی سب سے بڑی کھالوں کی منڈی ہے۔ جہاں ہر قسم کے جنگلی جانور کی کھال

ل جاتی ہے۔ مجھے یاد ہے میں نے وہاں سے ایک لومڑی کی کھال دو پاؤنڈ میں خریدی تھی؟"

"بیگن صاحب ہائڈ پارک کھالوں کی منڈی نہیں، ایک پارک کا نام ہے جہاں تقریر کی مکمل آزادی ہے۔"

"آپ کا قیاس بالکل غلط ہے۔ اگر یہ محض پارک ہوتا تو پھر اس کا نام ہائڈ پارک رکھنے کی کیا ضرورت تھی؟"

کل شام تو مرزا کاتل نے کمال ہی کر دیا۔ ایک مصری سیاح نے اُن سے دریافت کیا "کیا آپ کبھی مصر بھی گئے ہیں؟"

"جی ہاں۔ کئی بار مصر جانے کا اتفاق ہوا ہے۔"

"اہرام مصر بھی دیکھے؟"

"دیکھے؟" مرزا نے چونک کر کہا "ان ہی کے ہاں تو ہمارا قیام رہا۔ وہ تو ہمارے جگری دوست ہیں۔ ان سے بڑھ کر مہماں نواز رئیس شاید ہی مصر میں ہوں گے۔"

"اور ابوالہول؟"

"اوہ مولانا ابوالہول! اُن سے ایک قہوہ خانے میں ملاقات ہوئی تھی۔ بڑے دلچسپ آدمی ہیں۔ بہت دیر تک مصر اور ہندوستان کی پرانی تہذیبوں سے متعلق گفتگو کرتے رہے۔"

اب مصری سیاح کے چونکنے کی باری تھی "لیکن مرزا صاحب! اہرام مصر تو مینار ہیں۔ اور ابوالہول ایک بت کا نام ہے جس کا چہرہ عورت کا اور دھڑ شیر کا ہے۔"

مرزا صاحب نے ذرہ بھر بھی نہ جھینپتے ہوئے جواب دیا "دیکھئے صاحب جب ہم مصر گئے تھے تب تو اہرام مصر کا شمار رئیسوں ہی میں ہوتا تھا اور ابوالہول مولانا کہلاتے تھے۔ اب اگر گردش زمانہ سے وہ مینار اور بت میں تبدیل ہو گئے ہوں تو ہم کہہ نہیں سکتے۔"

مصری سیاح نے غالب کا مصرع زیرِ لب دہرایا:

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے

اور خاموش ہو گیا۔

فکر تونسوی

بیویوں کی ٹریڈ یونین

چند دن ہوئے میں رات کو جب گھر لوٹا، اور مردانہ روایت کے مطابق دیر سے لوٹا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میری اکلوتی اور پہلی اور آخری بیگم نے اپنے گورے گورے کندھے پر ایک سیاہ بلّہ لگا رکھا ہے۔

میں نے عرض کیا "یہ کیا ہے حضور؟"

وہ بولی "جھنڈا اونچا رہے ہمارا"

میرا ماتھا ٹھنکا کہ آج دال میں کچھ کالا ہے۔ چاند سا چہرہ جو کل تک رشکِ بتاں تھا، آج کسی انجمنِ خدامِ وطن کا پوسٹر معلوم دے رہا تھا جس پر لکھا تھا۔

"اٹھو، مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امراء کے در و دیوار ہلا دو"

میں نے کچھ مسکرا کر (اور کچھ ڈر کر) کہا "اے انقلاب زندہ باد! کھانا لے آؤ؟"

وہ اپنی سڈول باہنوں کو کسی جھنڈے کی طرح لہرا کر بولی "آج کھانا نہیں ملے گا، آج چولھا ڈاؤن اسٹرائیک ہے"

شبہ یقین میں بدلنے لگا کہ معاملہ گمبھیر ہے اور اب بیگم کے ساتھ رومانٹک گفتگو کرنا فضول ہے۔ یہ کس ستم گر نے گھر پر انقلابی چھاپا مارا ہے کہ آج محترمہ کی آنکھوں میں کاجل کی تحریر کی بجائے مطالبات کا چارٹر دکھائی دیتا ہے۔ معاملے کی سنجیدگی کو دیکھ کر میں نے بھی اپنا لب و لہجہ بدل لیا اور مالکانہ وقار کے ساتھ کہا "بیگم! تمہیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ تم میری بیوی ہو"۔

تڑاق سے جواب آیا "ہاں، مگر میں ایک ورکر بھی ہوں اور آپ میرے مالک ہیں اور میری محنت کا استحصال کرتے ہیں"۔

"مگر ڈارلنگ!" میں نے پھر اپنا لہجہ بدل لیا "مالک تو تم ہو میرے دل و جان کی مالک۔ اس گھر کی مالک۔ اس سلطنت کی تم نواب واجد علی شاہ ہو۔ بتاؤ ہو کہ نہیں؟"

ایک دن پہلے تک میرا یہی فقرہ طلسم ہوشربا کا کام کر جاتا تھا۔ اور بیگم تڑپ کر میرے بازوؤں میں آ گرتی تھی۔ لیکن آج آغوش میں آنے کی بجائے اس نے اپنی نرم و نازک مٹھی دکھائی اور میز پر مارتے ہوئے بولی "سیٹھ جی! مجھے ان لفظوں کے یہ چھلاوے اب نہیں چلیں گے۔ صدیوں سے ظلم کی چکی میں پستی ہوئی بیویاں اب بیدار ہو چکی ہیں اور اب تو اپنے حقوق منوا کر دم لیں گی اور.....

جو ہم سے ٹکرائے گا چور چور ہو جائے گا"

میں نے کہا "کیا آج ہمارے گھر میں کوئی ترقی پسند شاعر آیا تھا؟"

وہ بولی "نہیں شاعر میرے اندر سویا ہوا تھا۔ آج جاگ اُٹھا ہے۔ لہٰذا میرے مطالبات مانئے نہیں تو....."

"کون سے مطالبات"

"سب سے پہلے" بیگم نے حلق میں تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ اُس کی آواز میں گھنگھروؤں کی مانوس جھنکار نہیں تھی بلکہ طبل جنگ کی سی گھن گرج تھی۔ "سب سے پہلے میرا مطالبہ یہ ہے کہ میرے کام کے اوقات گھٹائے جائیں، صبح پانچ بجے سے رات کے گیارہ بجے تک اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے روزانہ کام کرتی ہوں، انھیں کم کر کے نو گھنٹے کئے جائیں۔ ہر مہذب سماج میں یہی دستور ہے۔"

"مگر ڈارلنگ یہ تو ہندوستانی سماج ہے۔"

وہ بھڑک اٹھی۔ "اور بائی دی وے جب تک مطالبات کی گفتگو جاری رہے آپ مجھے ڈارلنگ کے لقب سے مخاطب نہ کریں۔ ہاں تو ہندوستانی سماج کو مہذب بنانے کے لئے نو گھنٹے کے اوقات آپ کو منظور ہیں؟"

میں نے کہا "دیکھو (ڈارلنگ نہیں) ورکر بیگم! گھر میں اگر صرف نو گھنٹے کام ہوا تو اس سے پروڈکشن پر برا اثر پڑے گا۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ کام کی دو شفٹیں کرنا پڑیں گی۔ دو شفٹیں اور دو بیویاں۔ کیا تم چاہتی ہو کہ میں اس گھر میں دو بیویاں لے آؤں؟"

سوکن کا جلاپا عورت کی نازک رگ ہے۔ میں نے اس رگ پر جان بوجھ کر انگلی رکھ دی کہ ٹریڈ یونین کے اندر انتشار پیدا ہو جائے مگر بیگم کے اندر بیسیوں قدیم حاسد عورت مر چکی تھی۔ وہ بولی "یہ مالک کی اپنی پرابلم ہے۔ آپ چاہیں تو کوئی ملازمہ رکھ سکتے ہیں۔"

بیگم سوکن والے پہلو سے صاف بچ کر نکل گئی۔ اس کی یہ چترائی میرے لئے پریشان کن تھی۔ چنانچہ میں نے ایک اور ہتھیار نکالا۔ "مگر اُسے تنخواہ کہاں سے دیں گے؟ جتنی تنخواہ ملتی ہے، تمہارے گورے گورے ہاتھوں پر لا کر رکھ دیتا ہوں۔ تم چاہو تو اس تنخواہ میں سے ملازمہ رکھ سکتی ہو۔"

"اس تنخواہ میں ملازمہ نہیں رکھی جا سکتی۔"

"تو پھر کیا کیا جائے؟"

"میں نے کہا نا؟ یہ مالک کی اپنی پرابلم ہے اُسے خود سوچنا چاہیئے"

"آل رائٹ۔" میں نے تنگ آکر کہا۔ "مینجمنٹ اس پر ہمدردانہ غور کرے گا۔ اب اگلا مطالبہ پیش کیا جائے۔"

"دوسرا مطالبہ چھٹیوں کا ہے۔"

"مستقل چھٹی کا؟ اس کی تو میں کئی بار پیش کش کر چکا ہوں۔ مگر ہر بار تم نے اسے حقارت سے ٹھکرا دیا۔"

"دیکھیئے آپ اسے مذاق میں مت ٹالئے (حالانکہ اللہ قسم! یہ مذاق بالکل نہیں تھا) ہندوستان بھر کے سارے کامگاروں کو اتوار کی ہفتہ وار چھٹی ملتی ہے مگر مجھے اتوار کو سب سے زیادہ کام کرنا پڑتا ہے۔ ہر اتوار کو آپ کے احباب آدھمکتے ہیں۔ کوئی لنچ کھانے اور کوئی ڈنر اور کوئی یوں ہی گھومتے گھماتے چائے پینے آٹپکتا ہے۔ دیوالی، دسہرہ، عید، بقر عید کوئی چھٹی بھی تو نہیں ملتی ہے۔ نہ میڈیکل چھٹی نہ ایمرجنسی چھٹی۔ بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے؟" یہ کہہ کر وہ زار و قطار رونے لگی۔

میں بھی رونا چاہتا تھا لیکن مینجمنٹ میں رونے کا رواج نہیں تھا۔

مطالبہ (خدا جھوٹ نہ بلوائے) بالکل جائز تھا۔ لیکن مینجمنٹ کا رویہ بھی اس کے متعلق بڑا واضح تھا کہ کسی بھی مطالبے کو جائز قرار نہ دیا جائے بلکہ اگر مطالبہ تسلیم بھی کر لیا جائے تو اُسے اس کی بجائے احسان کا درجہ دے دیا جائے۔ چنانچہ میں نے کہا "دیکھو بیگم! عورت ذات کی تاریخ گواہ ہے کہ اُسے موت سے پہلے کوئی چھٹی نہیں ملتی۔"

"لیکن میں تاریخ کا دھارا موڑنا چاہتی ہوں۔"

"میری پیاری بیگم! اگر تم عقل کا تھوڑا سا بھی استعمال کرو تو تمہیں معلوم ہو گا کہ سماج کی تاریخ کا سارا ڈھانچہ عورت کے کندھے پر کھڑا ہے۔ جس دن بھی عورت نے چھٹی کی سماج میں ایک تعطل آجائے گا۔ بھائیں بھائیں کرتی ہوئی ایک ویرانی گھر پر مسلط ہو جائے گی۔ سارا کام اُلٹ پلٹ ہو جائے گا۔ یوں لگے گا، فیکٹری پر جبری تالہ بندی کرا دی گئی ہے۔ بچے روئیں گے، میں روؤں گا، گھر کی بلی اور طوطا اور چڑیا سبھی روئیں گے میں پوچھتا ہوں، تمھاری چھٹی کے دوران کام کون کرے گا؟"

"آپ کیجئے گا" جذبات سے بالکل عاری ہو رہی تھی، ظالم!

اب میں نے پینترا بدلا اور کہا "اچھا چلو میں تمہاری ہفتہ وار چھٹی منظور کرتا ہوں، لیکن سوال یہ ہے کہ اس چھٹی پر تم کرو گی کیا؟"

"بس بیٹھی رہوں گی یعنی نرم گدے پر سوئی رہوں گی، تاش کھیلوں گی، سہیلیوں کے ساتھ گھومنے جاؤں گی، فلم دیکھوں گی۔"

لب و لہجہ سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ بیگم صرف میری نقل کرنا چاہتی ہے، اور بجز نقل کے اور کچھ بھی نہیں ہے۔ ایک بار دل میں یہ شیطانی خیال بھی آیا کہ اسے اوور ٹائم کا لالچ دے دوں، یعنی چھٹی کے دن کام کرو، تو دوگنی اجرت ملے گی، اوور ٹائم کی رقم جمع کر کے ایک ساڑھی خرید لینا لیکن بیوی کو اوور ٹائم کی ترازو پر تولنا کچھ اچھا نہیں لگا۔ لہٰذا میں نے مردانہ فراخ دلی کی انتہائی بلندی پر کھڑے ہو کر آواز دی "ویکلی چھٹی منظور کی جاتی ہے۔ مگر ایک شرط پر کہ تم اس دن بال بچوں کو ہمراہ لے کر میکے چلی جایا کرو۔"

میکے کے نام پر بیگم کچھ بوکھلا گئی۔ میکہ ہر عورت کی کمزوری ہے۔ میکے کے سامنے سارا ٹریڈ یونین ازم منتشر ہو جاتا ہے۔ اگرچہ بیگم کی سمجھ میں یہ بات فوراً نہیں آئی کہ اس کا مطالبہ تسلیم کر لیا گیا ہے یا مطالبہ کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا گیا ہے۔ مطالبے کے ساتھ شرط کی پخ لگا کر میں نے ایک تیر سے دو شکار کرلئے تھے۔ میں نے سوچا کہ اس سے بیگم بھی خوش ہو جائے گی اور میں بھی۔ بیگم کی غیر حاضری میں خاوند کو جو آزادی نصیب ہو جاتی ہے اس کا اندازہ صرف وہی شادی شدہ مرد لگا سکتے ہیں جو ایک مستقل یکسانیت سے نالاں رہتے ہیں۔

بیگم نے زیر لب تبسم سے اس فیصلے پر صاد کیا اور میں نے دل ہی دل میں خوش ہو کر کہا کہ:-

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار

انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

بیگم کا تیسرا مطالبہ یہ تھا کہ گھر کے اخراجات کے لئے اُسے جو رقم دی جاتی ہے اس میں اضافہ کیا جائے۔ کیونکہ اشیاء کے پرانے نرخ قائم نہیں ہیں۔ ہر چیز پہلے کے مقابلے میں دوگنی مہنگی ہو گئی ہے۔ مگر اخراجات کی رقم بدستور وہی ہے۔

گویا یہ مہنگائی الاؤنس کا مطالبہ تھا جو بیک وقت جائز اور ناجائز تھا۔ میں نے جھٹ کہا "بیگم! مجھے تمہارے اس مطالبے سے ہمدردی ہے بلکہ صرف ہمدردی ہے۔"

وہ تڑپ اٹھی "مگر صرف ہمدردی سے تو بنیائن بھی نہیں آسکتی۔"

"تو بنیائن نہ خریدو۔ بزرگوں نے کہا ہے کہ "روکھی سوکھی کھا کے ٹھنڈا پانی پی۔" تو اس کا کچھ مطلب تھا، کچھ فلاسفی تھی۔ افسوس یہ ہے بیگم! کہ تم ٹریڈ یونین ازم کے جوش میں بزرگوں کی فلاسفی بھول گئیں۔"

اس کے جواب میں بیگم نے جو کچھ ارشاد فرمایا وہ بہت اذیت ناک تھا، اس نے صاف کہہ دیا کہ وہ رُوکھے سوکھے کی فلاسفی پر یقین نہیں رکھتی وہ معیارِ زندگی کو گرا کر محلے میں اپنی ناک کٹوانا نہیں چاہتی۔ اس نے آنسوؤں کا ہتھیار نکال کر مجھ پر بار بار حملے کئے، اور دھمکی دی "گھر کے اخراجات کی ذمہ داری تم خود سنبھال لو۔ خالی خولی ہمدردی اور بزرگوں کی فلاسفی کے ساتھ تم ایک ہفتہ میں ہی دیوالیہ نہ بن گئے تو میں بیگم کہلانا چھوڑ دوں گی۔"

"تو پھر میں کیا کروں ڈارلنگ؟ جتنی آمدنی ہے اس سے زیادہ کہاں سے لاؤں؟"

"اپنی آمدنی بڑھاؤ" انقلابی بیوی نے نعرہ لگایا۔

"کیسے؟"

"رشوت لو، جیب کتری شروع کر دو، اسمگل کیا ہوا مال بیچو، کوئی پرمٹ لائسنس لے لو، ساری دنیا اسی طرح ترقی کر رہی ہے۔"

اور میرا جواب یہ تھا کہ مجھ سے یہ نہیں ہو سکے گا۔ گزشتہ ایک سو برس سے جو خاندانی شرافت ہمارے سر پر سایہ کئے ہوئے ہے۔ میں اسے چند کرنسیوں، اناج کے چند دانوں، بنیانوں اور آلو گوبھی کی خاطر تباہ و برباد نہیں کر سکتا۔

مگر بیگم مُصر تھی "ہر دور میں اخلاق اور شرافت کی قدریں بدلتی رہتی ہیں۔ اخراجات میں کمی کر دینا بزدلی ہے اور بزدل انسان کو کسی معزز بیوی کا خاوند بننے کا کوئی حق نہیں۔ اس لئے میرا یہ مطالبہ مان لو ورنہ جنرل اسٹرائیک کے لئے تیار ہو جاؤ۔"

اُس نے مجھے بزدل کہا۔ میرے شوہرپن کو مشکوک قرار دیا۔ جنرل اسٹرائیک کی دھمکی دے کر گھر کے مفاد پر ضرب لگانے کا اعلان کیا۔ یہ رویہ سیدھا طلاق کی منزل کی طرف بڑھا جا رہا تھا۔ مگر میں نے بھی تہیہ کر لیا کہ میں بیوی کو طلاق دے دوں گا، خاندانی اخلاق کو طلاق نہیں دوں گا۔

چند منٹ کی بحرانی خاموشی کے بعد بیگم بولی "تو کیا ارادے ہیں؟"

"مطالبہ رد کیا جاتا ہے۔" میں نے تاریخِ انسانیت کا عظیم ترین اعلان کیا۔

"لیکن یہ میرا بنیادی مطالبہ ہے۔ اگر اسے رد کیا گیا تو میں اس بات پر غور کروں گی کہ پہلے دو مطالبے بھی منظور کراؤں یا نہ کراؤں؟"

"مجھے یہ چیلنج منظور ہے۔"

اس مرحلے پر آ کر سمجھوتے کی بات چیت ٹوٹ گئی۔ مصلحت کے مطابق بیگم پلنگ پر جا لیٹی۔ میں خصلت کے مطابق یوں ہی کوئی پرانا رسالہ اٹھا کر ورق گردانی کرنے لگا۔ گھڑی کی ٹک ٹک ہمارے غم اور مسرت دونوں کو پیچھے چھوڑ کر وقت کی بے تاب منزلیں طے کرتی رہی۔ میں نے کھانا نہیں کھایا، شاید بیگم صاحبہ نے بھی نہیں کھایا۔ اور پھر یوں لگا کہ جیسے ہم دونوں ایک دوسرے سے آہستہ آہستہ دور ہوتے جا رہے ہیں۔ ایک دوسرے کی نظروں سے اوجھل ہوتے جا رہے ہیں۔ شاید ہم اندر ہی اندر روتے روتے سو گئے تھے۔ کھو گئے تھے۔

اور پھر جب بھوک کے گھڑیال نے دو بجائے تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ایک گرم گرم آنسو میری پیشانی پر آ گرا ہے اور پھر ہلکی ہلکی

سسکیوں کی آواز اور نرم و نازک ہاتھوں کا لمس اور چوڑیوں کی مترنم جھنکار۔

"یہ کون تھا؟"

یہ کوئی ٹریڈ یونین لیڈر تو نہیں تھا۔

یہ کوئی انقلابی بھی نہیں تھا

یہ میری اکلوتی، پہلی اور آخری بیگم تھی، جو کہہ رہی تھی،

"اٹھو، کھانا کھالو۔ مجھے نیند نہیں آ رہی ہے۔"

(بقیہ شاعری اور ناشاعری)

یہ خطۂ زمیں کا
میں نے مانگا تھا تجھ سے
تمہارے لئے
تو نے اپنے کرم سے دیا مجھ کو یہ پاک خطۂ زمیں کا
کہ اس میں بساؤں نئے رنگ و بوئے زندگی کے
جن میں تیری چمک اور تیری جھلک ہو
مرا عہد تم سے یہ تھا، ہے اور ہر دم رہے گا
یہ خطۂ پاک
تیری امانت
یہ میرا وطن فقط میرا نہیں ہے
یہ مشرق و مغرب میں اسلام کا اسمِ اعظم
یہ قبلہ نما سرزمیں ہے
مرے وقت کا لمحہ لمحہ
مرے خون کا قطرہ قطرہ
مرے جسم اور رُوح کا ذرّہ ذرّہ
یہاں کا امیں ہے۔ (امانت)

اعتراض اس پر ہے کہ وزیر آغا جو "آجر تا شہر" کے خالق بھی ہیں، اعجاز فاروقی کی اس مشقِ سخن کو نظم کی حقیقی صورت اور مبلوم اور تصویریت کو شاعری کی آخری منزل قرار دیتے ہیں ـــــ اور ہاں، مجھے افتخار جالب کا وہ بیان یاد آ رہا ہے جو انہوں نے حبیب جالب کے مجموعۂ کلام کی زندہ بمعصریت سے متاثر ہو کر دیا ہے:

"جبر کے حالت میں بزدلی کو برقرار رکھتے ہوئے ایہام اور استعارہ کا اسلوب ہی کام دے سکتا ہے۔"

یہ اعتراف جس نئی منزل کا سمت نما ہے، دیکھئے نئی شاعری اس پر کب پہنچتی ہے؟

محمود ریاض

ٹالنے کا فن

نوٹ: مشہور امریکی مصنف اور صحافی ڈیل کارنیگی نے جینے کا فن، گفتگو اور تقریر کا فن، دوسروں کو جیتنے کا فن۔ قسم کی کئی کتابیں لکھی ہیں۔ میں نے "ٹالنے کے فن" پر مضمون لکھا ہے۔ اس مضمون سے ادیب اور شاعر خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ دیگر قارئین بھی اگر عرق بیستان اور سفوف پوست مغیلاں کے ساتھ استعمال کریں تو شفا کی امید ہے۔

ایڈیٹر: "رستم" کا سالنامہ آرہا ہے۔

میں۔ بڑی خوشی کی بات ہے،

ایڈیٹر: آپ کا مضمون لینے آیا ہوں،

میں۔ آپ کی دوست نوازی ہے لیکن آجکل میں کہاں لکھ رہا ہوں۔ فرصت ہی نہیں اور اگر فرصت نکال بھی لوں تو موضوع نہیں ملتا۔ کوئی رومانی چیز لکھنے کی کوشش کروں تو خواجہ احمد عباس کا "عشق پر زور نہیں" پڑھ کر ہمت جواب دے دیتی ہے اور مزاحیہ لکھنے کی ہمت یوں نہیں کہ مجھ سے پہلے لکھنے والے سب لطیفوں کے مضمون بنا کر قارئین کو پڑھا چکے ہیں۔ نقاد میں بن نہیں سکتا کہ دوسروں کی طرح کوزے کو دریا میں بند کرنا میرے بس کا روگ نہیں۔ شاعر بننے کی کوشش کی تھی۔ کچھ غزلیں کہی بھی تھیں، مشاعروں میں بھی پڑھیں، شعر بھی اچھے تھے، داد بھی پائی، لیکن بعد میں پتہ چلا کہ کوئی شاعر غالب نامی دلی میں شاعری کرتا تھا، اور ہم سے اچھے شعر کہہ لیتا تھا۔ بالکل یہی غزلیں، اور اسی ترتیب کے ساتھ اس کے دیوان میں بھی موجود ہیں۔ ہم نے تو دیکھی نہیں ممکن ہے سچ ہو۔

ایڈیٹر: یہ سب بہانے نہیں چلیں گے، میں اگلے پیر کو آؤں گا اور مضمون لے کے ہی لوں گا۔

اگلے پیر کو ایڈیٹر صاحب کی آمد

ایڈیٹر: السلام علیکم!

میں۔ وعلیکم السلام۔ کدھر بھول پڑے؟

ایڈیٹر: بھول پڑے سے کیا مطلب؟ ———— آج آپ کا مضمون کا وعدہ تھا۔

میں۔ بھئی وہ ہمارے دوست جمن خان ہیں نا ———— پچھلے ہفتے کو ان کے دادا کا انتقال ہوگیا۔ مرحوم بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ صدر میں ان کی کبابوں کی ریڑھی تھی۔ دل اور گردے بھی بیچتے تھے اور شعر و شاعری کا بھی بڑا شوق تھا۔ ریڑھی کے دونوں طرف شعر لکھوا رکھے تھے۔

اس چمن میں کباب کی بو ہے
ہل بلبل جلا دیا کس نے

اور

کباب سیخ ہیں ہم کروٹیں ہر سو بدلتے ہیں
جو جل اٹھتا ہے یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے ہیں

ایڈیٹر۔ یہ سب تو ٹھیک ہے مگر میں تو مضمون لینے آیا ہوں،

میں۔ بہت خوب ———— بیٹھئے چائے پیجئے

ایڈیٹر۔ نہیں چائے کی ضرورت نہیں میں تو ————

میں۔ لڑکے! ذرا جانا بھاگ کے ایرانی کے ہاں' دو چائے لاؤ' لیکن ذرا کڑک ہو۔

ایڈیٹر۔ چائے تو خیر تم نے منگوا لی ہے تو پی ہی لی جائے گی مگر میں تو اس مضمون کی بات کر رہا ہوں جو آپ کے "رستم" کے سالنامے میں چھپے گا

میں۔ میں نے عرض کیا نا کہ جمن خاں کا دادا اس دنیائے فانی سے کوچ کر گیا (ٹھنڈا سانس بھر کر) جمن سے ہمارے بڑے دیرینہ مراسم ہیں۔ میں اور جمن بچپن میں اکٹھے پتنگ اڑایا کرتے تھے۔

ایڈیٹر۔ ٹھیک ہے، ٹھیک ہے لیکن اب تو جمن کے دادا کو مرے ایک ہفتہ سے زیادہ ہوگیا ہے۔ اب مضمون کب ملے گا؟

میں۔ بس جمن کے دادا کا چہلم ہو جائے تو فراغت سے مضمون لکھوں گا۔

جمن کے دادا کے چہلم کے بعد

ایڈیٹر۔ پکڑے گئے نا آج

میں۔ جی ہاں پکڑے تو جانا ہی تھا۔ آخر دن دہاڑے اتنا بڑا ڈاکہ ————

ایڈیٹر۔ اجی کن کا ذکر کر رہے ہیں آپ۔؟

میں۔ وہی بینک والا معاملہ

ایڈیٹر۔ جی نہیں، میں آپ کی بات کر رہا ہوں کہ آپ پکڑے گئے۔ یہ میرا تیسرا چکر ہے۔

میں۔ (سنی ان سنی کر کے) لڑکے او لڑکے! ذرا ایرانی کے ہاں سے دو چائے لانا ———— لیکن ذرا کڑک ہو۔

ایڈیٹر۔ اجی ریاض صاحب قبلہ میں چائے پینے نہیں آیا۔ آپ سیدھی طرح مضمون نکالئے۔

میں۔ بات دراصل یہ ہے کہ پچھلے دنوں سے مجھے ذرا درد ہے۔

ایڈیٹر۔ درد ———— ؟ کہاں ؟

میں۔ یہ بائیں ہاتھ کو گردن سے چھ سات انچ نیچے۔

ایڈیٹر۔ یہ تو دل کی تکلیف ہوئی۔

میں۔ جی ہاں خوب یاد دلایا ——————— یہ بالکل دل ہی کی تکلیف ہے۔

پچھلے سال بھی ہو گئی تھی اور جناب کرشن جی کے مشورے سے ٹھیک ہوئی۔

ایڈیٹر۔ بھلا کیا مشورہ تھا وہ ؟ میں نے تو سنا تھا کرشن چندر ایشیا کا سب سے بڑا افسانہ نگار ہے مگر تمہارے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حکیم بھی اچھا ہے۔ اور کیا معلوم اصل پیشہ یہ حکمت ہی ہو۔

میں میں نے پچھلے دنوں کرشن جی کے خط کا جواب تاخیر سے دیا اور حسب ذیل خط لکھا۔

ایک خط

کرشن جی! آداب

آپ کا خط ملا تھا۔ جواب میں تاخیر ہوئی۔ بقول کسے " ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا۔" یعنی پچھلے دنوں میں لاہور گیا تھا اور وہاں جاکر بیمار ہو گیا۔

لاہور ———————

جی ہاں وہی لاہور جس کے بارے میں اب تک لوگ " لاہور کی گلیاں "* جیسے مضمون لکھتے ہیں اور آہیں بھرتے ہیں۔ ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ پچھلے دنوں لاہور گیا تھا اور وہاں جاکر بیمار ہو گیا۔ وہی میر تقی میر والی بیماری ؎

دیکھا اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا

لوگ پتہ نہیں میر صاحب کی اس بیماری کی کیا کیا تشریحیں کرتے ہیں لیکن میر صاحب بھی میری طرح ہارٹ ٹربل کے مریض تھے۔

لاہور سے میں سیدھا کراچی پہنچا اور یہاں آکر ڈاکٹروں کو دکھایا۔ سب سے پہلے ایک لیڈی ڈاکٹر نے میرا معائنہ کیا۔

وہ بائیس سال کی سرو قد لڑکی تھی۔ گھنی اور دراز زلفیں جو اس کے ٹخنوں سے ذرا ہی اونچی تھیں۔ گورا رنگ گلابی ہونٹ اور کشمیری سیبوں کو مات کر دینے والے رخسار وہ اس وقت ہلکی گلابی رنگ کی ساڑھی پہنے تھی ' جسے دیکھ کر سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ساڑھی کونسی ہے اور جسم کونسا۔ ٹھوڑی میں ایک ہلکا سا گڑھا۔ ہنستی تھی تو رخساروں میں ہلکے ہلکے گڑھے پڑتے تھے۔ مسکراتی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے موتیے کے پھول جھڑ رہے ہوں۔

اس نے میرا معائنہ کیا اور ہائی بلڈ پریشر پایا۔

میرا دوسرا معالج ایک بوڑھا پارسی تھا۔ وہاں مجھے میرا دوست جمن خان ہی لے گیا تھا۔ ڈاکٹر کا چہرہ جھریاں بھرا تھا۔ آنکھوں پر درشت موٹے شیشے کا چشمہ تھا ' سر کے بال سفیدی کے بعد کچھ زردی مائل ہو چکے تھے۔

اس نے سب سے پہلے میری نبض دیکھی (جو چند منٹ پہلے بخوبی چل رہی تھی) اس کا جھریاں بھرا ہاتھ میری نبض پر تھا اور سامنے میز پر رکھے ہوئے ٹائم پیس پر۔

---

* " لاہور کی گلیاں " کرشن چندر کا مضمون ہے۔

اس نے میرا بلڈ پریشر لیا اور "لو" بلڈ پریشر نکلا۔

بات چونکہ خطرناک صورت اختیار کر گئی تھی۔ لہذا ایک تیسرے ڈاکٹر کی آمدنی میں بھی اضافہ کرنا پڑا۔

یہ ڈاکٹر اگر نوجوان نہیں تھا تو بوڑھا بھی نہیں تھا۔ اگر خوش مزاج نہیں تھا تو زیادہ سڑیل بھی نہیں تھا۔ سر پر بال زیادہ نہیں تھے، تو سرے سے گنجا بھی نہیں تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی میز صاف نہیں تھی تو زیادہ گندی بھی نہیں تھی۔ سٹیتھوسکوپ اگر چمک نہیں رہا تھا تو اس پر مکھیوں کے زیادہ نشان بھی نہیں تھے۔

بہرحال ان ڈاکٹر صاحب نے میرا معائنہ کیا تو بلڈ پریشر نارمل پایا۔ ڈاکٹر صاحب اس نتیجے پر پہنچے کہ دل تو ٹھیک ہے۔ لیکن دل کے آس پاس جو مسلز ہیں ان میں درد ہے (ہو سکتا ہے کہ میر تقی میر کے بھی دل کے آس پاس جو مسلز تھے ان میں درد ہو جسے وہ میری طرح بیمارئ دل سمجھتا رہا ہو۔

کرشن چندر کا مشورہ

پیارے ریاض

دل کا علاج کسی لیڈی ڈاکٹر سے نہیں بلکہ بڑے پارسی ڈاکٹر سے ہی کرانا چاہیے۔ انہیں دل کی بیماری دور کرنے کے نہیں، دینے کے ڈھنگ آتے ہیں۔

ایڈیٹر۔ مشورہ تو خوب ہے مگر مضمون کب مل رہا ہے۔

میں۔ مضمون بھی مل جائے گا۔ ایسا تھوڑی ہو سکتا ہے کہ "رستم" میں میرا مضمون نہ چھپے اور میں جو شہرت عام اور بقائے دوام کا بھوکا ہوں "رستم" کے لیے مضمون نہیں دوں گا تو ——— آپ بیٹھیں چائے پئیں ——— لڑکے! ذرا جانا ایرانی سے دو چائے لانا، لیکن ذرا کڑک ہو۔

ایڈیٹر۔ طے یہ پایا کہ آپ مضمون نہیں دیں گے۔

میں۔ مضمون کے لیے کون منع کرتا ہے مگر اس غم جاناں، غم دوراں، غم دل اور وحشتِ دل سے بھی تو چھٹکارا ملے۔

ایڈیٹر۔ اب کیا ہوا۔؟

میں۔ مرزا جی بیمار ہیں۔

ایڈیٹر۔ کون مرزا جی

میں۔ آپ مرزا جی کو نہیں جانتے؟ آئیے آپ کو مرزا جی سے ملاتے ہیں۔

مرزا جی سے ملیے

مرزا جی کی موجودہ عمر تو پتہ نہیں کیا ہو گی۔ یہ کام تو محکمہ آثار قدیمہ کا ہے البتہ وہ ٹھنگنے قد کے دبلے پتلے سخی سے آدمی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی چندھیائی ہوئی آنکھیں۔ آدھا سر گنجا اور باقی آدھے پر برائے نام بال ہیں۔ چہرے پر جھریاں ——— جلد جلد آنکھیں گھما کر باتیں کرتے ہیں۔

اس قصے کا تعلق آج سے نہیں لہٰذا باقی حلیہ بتانا بے کار ہے اور ویسے بھی راستے میں بھی مڈبھیڑ ہو گئی تو آپ جھیک سلیک کر بیٹھیں گے۔ لہٰذا محمود ریاض آپ کو اس زمانے میں لے چلتا ہے جب مرزا جی پر جوانی پھوٹ پڑ رہی تھی (حالانکہ میرا خیال ہے مرزا جی پر جوانی کبھی پھوٹ نہیں پڑی ہو گی کیونکہ ایسا ممکن نہیں ہے کہ مرزا جی کا اس زمانے میں قد بڑا ہو گیا جسم بھرا ہوا ہو گیا پھر کچھ اور نہیں تو آنکھیں چشم آہو کو مات کر رہی ہوں) بہر حال بقول مرزا جی ایک زمانے میں جوانی ان پر پھوٹ پڑ رہی تھی۔ جب مرزا جی نے اپنی جوانی کا اور کوئی مصرف نہ دیکھا تو فوج میں بھرتی ہو گئے۔

انگریزوں کا زمانہ تھا اور انگریز فوجیوں کو کھانا اور وردی کے ساتھ شراب بھی ملتی تھی چنانچہ پہلے پہل جہاں مرزا جی کی ڈیوٹی لگی وہ ایک ریلوے اسٹیشن تھا (آپ اس مضمون کی حد تک اس اسٹیشن کا نام چھانگا مانگا فرض کر لیں) اور مرزا صاحب کا کام اپنی نگرانی میں شراب کی بوتلوں بھری پیٹیاں اتروانا تھا۔

تین چار دن تو مرزا جی اس کام کو چپ چاپ کرتے رہے لیکن مرزا جی کو اس حرام چیز سے نفرت تھی لہٰذا وہ کہیں سے ریلوے لائن کا ایک چھ فٹ لمبا ٹکڑا اٹھا لائے اور ریل کے ڈبے کے قریب پلیٹ فارم پر رکھوا دیا اور مزدوروں کو سختی سے اس بات کی تاکید کی کہ وہ جب پیٹی لے کر اتریں تو اس ٹکڑے میں پاؤں پھنسا کر گر پڑیں تاکہ حرام چیز کی کچھ بوتلیں ضرور ٹوٹ کر ضائع ہو جائیں لیکن مرزا جی نے اس بات کا اور انتظام کیا کہ یہ حرام شے زمین پر نہ بہ سکے لہٰذا ایک بہت بڑا لوہے کا ٹب لا کر رکھوا دیا اور مزدوروں کو سختی سے اس بات کی ہدایت تھی کہ وہ پیٹی گرے وہاں سے نہ گزریں بلکہ مرزا جی ایک ہنٹر لے کر وہاں کھڑے رہتے تھے تاکہ یہ حرام شے پورے کی پوری بیچ کر نہ جا سکے۔ اس طرح شام تک لوہے کا یہ ٹب لبالب بھر جاتا تھا اور مرزا جی کو ایک گونہ سکون ملتا تھا۔ لیکن اب سوال یہ تھا کہ اس شراب کا کیا کیجئے چنانچہ مرزا جی نے ایک ہندو شراب فروش سے پچاس روپے روز کا ٹھیکہ کیا اور یوں یہ شراب بھرا ٹب روزانہ ہندوؤں کا مذہب خراب کرنے کے لئے ہندو شراب فروش کے ہاتھ پچاس روپے روز میں بیچا جانے لگا۔

ہوتے ہوتے اس یونٹ کے ایک سکھ افسر کو اس کی اطلاع ہو گئی تو اس نے مرزا جی سے آدھوں ساجھی حصہ بٹانا چاہا۔ مرزا جی نے کہا کہ ساری محنت تو وہ خود کرتا ہے پھر آدھے حصے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے، ہاں پانچ دس روپے روز کی بات ہو تو سوچا جا سکتا ہے۔ سکھ افسر کو اس پر غصہ آیا اور مرزا جی کو ایک اور اسٹیشن پر تبدیل کر دیا (اس اسٹیشن کا نام آپ بھائی پھیرو سمجھ لیجئے)۔ وہاں مرزا صاحب کو جو کام سونپا گیا وہ گاڑیوں سے کوئلہ اتروانا اور فوجی افسران کو حسب ضرورت سپلائی کرنا تھا۔

مرزا صاحب سوچ میں پڑ گئے کہ یہ عجیب بات ہے کہ بیچارے مسلمان لکڑیاں جلا کر کوئلہ پیدا کریں اور وہ کوئلہ یہ انگریز استعمال کریں چنانچہ مرزا جی نے پوری گاڑی کا سودا ایک مقامی کوئلے کے تاجر سے کیا تاکہ اس کے ہم وطن بھی یہ کوئلہ استعمال کر سکیں اور رفاہ عامہ کے خیال سے تین ہزار کا کوئلہ صرف آٹھ سو روپے میں دے دیا۔ اس کوئلے کے تاجر کے ٹرک آتے اور گاڑی خالی ہو گئی۔ اور اس طرح مرزا جی بیچارے آنے والی تمام گاڑیاں اتنے سستے داموں بیچتے رہے۔

مرزا جی کے افسران بالا کا خیال تھا کہ کوئلے میں مرزا جی کیا کر سکیں گے مگر کسی دشمن قوم نے یہ بات مرزا جی کے افسران تک پہنچا دی۔ اور مرزا جی کو چارج شیٹ ملی اور ایک دور دراز مقام پر بھیج دیا گیا۔ جہاں غیر ملکیوں کو فرنٹ سپلائی ہوتا تھا۔

مرزا جی کو غیر ملکیوں سے ہمیشہ سے چڑ تھی چنانچہ انہوں نے کاغذ پر تو کیلے اور سیب کی سپلائی دکھائی اور انگریزوں سے دام بھی اسی کے وصول کئے لیکن وہ روز چار ٹرک گنڈیریاں اور بیر لے جاتے تھے اور وہ ان غیر ملکی فوجیوں کو دے کر رسید لکھوا لیتے تھے کہ ایک سیر

فروٹ وصول پایا

یہ بات مدتوں چلتی رہی ——— غیر ملکیوں کے جبڑے کنڈیریاں کھا کھا کر تقریباً چھل گئے تھے۔ وہ بیچارے اس کو اس ملک کا فروٹ سمجھ کر کھا لیتے تھے لیکن ان میں سے ایک بدمعاش کو تھوڑی سی شُدبُد تھی اس نے رپورٹ کر دی اور یوں اس قصے کی انکوائری ہوئی۔

مرزا جی نے وہ واچر پیش کر دیے جن پر ایک ایک سیر فروٹ کی رسید تھی۔ افسران کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر معاملہ کیا ہے۔ آخر چونگی کے محکمے سے پتہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ کنڈیریوں اور ہیروں کے ٹرک کے علاوہ اور کوئی چیز اس راستے سے نہیں گزری اور ایک بار پھر بیچارے مرزا جی ایک دور مقام پر بھیج دیے گئے جہاں ہاتھیوں کی دیکھ بھال ہوتی تھی۔

مرزا جی بیچارے یہاں بالکل مجبور ہو کر رہ گئے۔ لیکن انہیں پتہ چلا کہ فلاں ریاست میں اور سب کچھ تو ہے لیکن مہاراجہ کی سواری کے لیے ہاتھی نہیں ہے۔ چنانچہ مرزا جی چھٹی لے کر فلاں ریاست میں گئے اور مہاراجہ سے ہاتھی کے بارے میں بات چیت کی اور پچاس ہزار کا ہاتھی صرف بیس ہزار میں دے ڈالا۔

مرزا جی نے ریاست کے دو آدمی ساتھ لیے اور ایک دن ہاتھی ان کے سپرد کر کے اپنی ڈیوٹی کے معاملے میں تندہی کے ساتھ مصروف ہو گئے۔

جب مرزا جی کو یقین ہو گیا کہ ہاتھی بخیر و خوبی ریاست میں پہنچ گیا ہو گا تو مرزا جی ہاتھی کی گمشدگی کی پرچی بنا کر افسر کے سامنے لے گئے۔ وہاں یونٹوں میں اگر کوئی معمولی چیز مثلاً چمچ، گلاس، پلیٹ یا اور کوئی چھوٹی موٹی چیز گم ہو جاتی تھی تو ایک قسم کی سلپ رکھی رہتی تھی۔ اس میں چیز بھر کے افسر کے سامنے پیش کر دی جاتی تھی اور افسر تھوڑی بہت پوچھ گچھ کے بعد اس پر دستخط کر کے داخل دفتر کر دیتے تھے۔

انگریز افسر نے جب پرچی پر ہاتھی لکھا دیکھا تو حیران رہ گئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ہاتھی گم کیسے ہو گیا۔

مرزا جی نے کہا "بس جی سمندر پر پانی پینے گیا اور وہاں دلدل میں پھنس گیا۔ میں بہتیرا امداد کے لیے چلایا لیکن کوئی مدد کو نہ آیا اور بیچارہ ہاتھی دلدل میں غرق ہو گیا"

یہ بیان دیتے ہوئے مرزا جی کی آواز بھرا گئی تھی اور آنکھوں میں آنسو بھی امڈ آئے تھے۔ انگریز افسر بھی مرزا جی کی طرح رحم دل تھا۔ اس نے فوراً اس سلپ پر دستخط کر دیے اور پرچی داخل دفتر ہو گئی۔

ایڈیٹر رستم۔ مرزا جی سے تو ملاقات ہو گئی لیکن مضمون کہاں ہے۔

میں۔ (سنی ان سنی کر کے) لڑکے! ذرا جانا ایرانی کے ہاں سے دو کپ چائے لانا ——— لیکن ذرا کڑک ہو۔

ایڈیٹر۔ چائے تو خیر پی لی جائے گی لیکن مضمون ——— ؟

میں۔ مضمون؟ وہ بھی مل جائے گا مگر یہ تو کہیے کہ آپ کے مزاج کیسے ہیں؟

شایاں احمد مدنی

معمّہ بازی

ہمیں معمہ بازی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ سنتے ہیں تاش، شطرنج، اور معمہ بازی قسم کی بیماریاں عموماً دوستوں سے لگتی ہیں مگر حسن اتفاق سے ہمارے کسی دوست کو ان میں سے ایک بیماری بھی لاحق نہیں تھی ——— ہم لوگ زیادہ تر وقت گھومنے پھرنے میں گزارتے، رات کو اکثر احباب جمع ہو کر خوش گپیاں کرتے اور بس ——— بعض اوقات کوئی دوست کسی شاعر کو پکڑ لاتا تو وہ اپنے کلام سے محفل کو محظوظ کرتا ——— لیکن جب کسی کی شامت آئی ہوتی ہے تو کہہ کر نہیں آتی ———

ایک دن شامت اعمال سے ہم کہہ بیٹھے "بھئی راشد، تم ایک دن اپنے ساتھ کسی شاعر محمود ٹونکی کو لائے تھے ——— یہ حضرت آجکل کہاں ہیں ——— ایک بار لاؤ تو سہی ———"

راشد ٹھنڈی سانس بھر کر بولا "بھئی اب ان کا ہم سے کیا واسطہ، وہ تو بڑے آدمی بن گئے ہیں، شاعری کو بالائے طاق رکھ کر ایک فیکٹری کے مالک بنے بیٹھے ہیں۔"

"فیکٹری کے مالک؟ ——— اور وہ دو ٹکے کا شاعر!" ہمارے ایک دوست نعیم نے حیرت سے کہا۔

"ہاں بھئی ——— تھا تو دو ٹکے کا شاعر، مگر قسمت کا دھنی تھا، ایک بار معمے میں بالکل صحیح حل نکلا ——— پورے اسّی ہزار روپے ملے بیٹھے کو ——— لوہے کا سامان تیار کرنے کی فیکٹری کھول لی ——— عیش کر رہا ہے ———"

"ارے کیا واقعی ——— ؟" ہم نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔

"اور نہیں تو کیا جھوٹ ——— چاہے جس سے پوچھ لو، احمد آئرن فیکٹری کافی مشہور ہے۔ ہر ایک جانتا ہے کہ احمد صاحب پہلے محمود تخلص کرتے تھے اور عموماً کسی گھٹیا سے چائے خانے میں پائے جاتے تھے ———" راشد نے لاپروائی سے کہا۔

"بھئی خوب ———" نعیم بولا "آج معلوم ہوا 'قسمت والے' درحقیقت کون لوگ ہوتے ہیں ——— یعنی ایک صحیح حل نے تمام دلدّر دور کر دیئے۔"

"اگر یہ بات ہے تو ہم کیوں بے کار باتوں میں وقت ضائع کرتے ہیں۔ خالی اوقات میں بیٹھ کر معمے بھرا کریں ——— ہو سکتا ہے قسمت ہمارے ساتھ بھی یاوری کرے ——— ایک صحیح حل ہمارا بھی نکل آئے۔"

"بھئی میں خود کئی روز سے یہی کہنا چاہ رہا تھا ——— مگر ہر بار یہی خیال آڑے آتا کہ نہ معلوم تم لوگ پسند کرو یا نہ کرو ———" راشد نے کہا۔

"بھئی پسند تو ہم بھی نہیں کرتے ـــــ مگر قسمت آزمائی میں کیا ہرج ہے۔" ایک اور دوست بولا۔

بہر حال یہ بات متفقہ طور پر طے پا گئی کہ آیندہ رات کی نشستوں میں معمے بھرے جایا کریں گے اور ہر ہر لفظ کو اچھی طرح ناپ تول کر اشارے کے لئے چنا جائے گا۔

دوسرے دن راشد ایک مقامی اُردو ماہنامہ اُٹھا لایا جو انعام میں کثیر رقومات تقسیم کرنے کا دعویٰ دار تھا۔ ساتھ ہی معمہ بازی کے سارے لوازم بھی تھے ـــــ سب سے پہلے ہم نے معمہ بھرنے کا طریقہ سمجھا، پھر اشارے پڑھے، دائیں سے بائیں اور اوپر سے نیچے کا عقدہ ذہن نشین کیا ـــــ اس کے بعد بحث شروع ہوئی ـــــ راشد نے پہلا اشارہ پڑھا ـــــ یہ ایک جملہ تھا جس کے درمیان میں سے ایک لفظ غائب تھا ـــــ رسالے میں کئی ہم وزن لفظ موجود تھے۔ بس جو لفظ ان میں سے مناسب سمجھو وہ بھر دو ـــــ مگر ہمارے دوست مختلف طبقوں سے تعلق رکھتے تھے لہٰذا ہر ایک مختلف لفظ کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرتا اور اس سلسلہ میں طویل بحث ہو جاتی۔"

پہلا اشارہ کیا پڑھا گیا، مصیبت ہی تو آ گئی۔ پورے تین گھنٹے کی طویل بحث کے بعد بھی یہ طے نہیں کر پائے کہ کونسا لفظ موزوں ترین رہے گا۔ اشارہ یہ تھا:

"بیوی کا مزاج ـــــ ہوا نہیں، کہ زن مرید شوہر نے خوشامد یں شروع کر دیں ـــــ" خالی جگہ کے لئے دو الفاظ تھے: نرم اور گرم۔

ہم نے کہا "اس اشارے کے لئے تجربہ لازم ہے اور یہاں کوئی شخص شادی شدہ نہیں ہے اور اگر ہوتا بھی تو خدانخواستہ زن مرید کیوں ہوتا ـــــ لہٰذا صحیح لفظ نہیں چنا جا سکتا۔"

راشد نے کہا "تجربہ نہیں تو کیا ہوا مطالعہ تو ہے ـــــ میں نے نفسیات پڑھی ہے اور میں اس قسم کے اشخاص کا بہتر تجزیہ کر سکتا ہوں ـــــ"

"ارشاد ـــــ؟" ہم نے جھک کر کہا۔

"عموماً زن مرید شوہروں کی بیویاں سخت مزاج اور چڑچڑی ہوتی ہیں، نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے اُن کا یہ چڑچڑا پن ہی نرم مزاج شوہر کو زن مریدی پر مجبور کرتا ہے ـــــ لہٰذا اُن کی زن مریدی اس وقت جاگتی ہے جب بیوی کا پارہ اونچا ہو۔ اس لئے اس جگہ کے لئے لفظ "گرم" زیادہ موزوں ہے۔"

"لیکن راشد صاحب کیا یہ ضروری ہے کہ اُس چڑچڑی عورت کا شوہر نرم مزاج ہی ہو۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ جس وقت بیوی کو غصہ آئے تو شوہر صاحب بھی بھول جائیں ـــــ اس قسم کے شوہر عموماً اُس وقت ہی بیوی کے حسن اور عادتوں کی تعریف کرتے ہیں جب ان کا موڈ بحال ہوتا ہے ـــــ لہٰذا نرم میرے نزدیک زیادہ درست ہے ـــــ" نعیم نے کہا۔

"بھئی یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی، یہاں شوہر کے مزاج کے متعلق کچھ نہیں کہا گیا ہے لہٰذا آپ اس کے متعلق کوئی رائے قائم نہیں کر سکتے ـــــ یہ تو چکر دینے والی بات کہی گئی ہے۔ یہاں تکا لگانا چاہیئے ـــــ" ایک اور دوست نے خیال ظاہر کیا۔

تکا تو ہرگز نہیں لگایا جائے گا ـــــ آپ لوگ اچھی طرح طے کر لیں کہ کونسا لفظ موزوں رہے گا ـــــ ماشاءاللہ پڑھے لکھے، لوگوں کی محفل ہے اتنی سی بات پر اتفاق نہیں ہو سکتا۔" ہم نے انہیں بحث پر ابھارا۔

اور پھر وہ پڑھے لکھے لوگوں کی محفل مچھلی بازار کا نمونہ پیش کرنے لگی ـــــ سب انٹ شنٹ ہانکے چلے جا رہے تھے پھر بعض احباب نے اپنے جاننے والے زن مرید شوہروں کی "پھبتیاں" شروع کر دیں اور سب کچھ دیر بعد یہ بھول گئے کہ وہ ایک معمہ حل کر رہے ہیں۔ جب گھنٹے نے دس بجائے تو سب چونکے لیکن اس وقت بھی یہ مسئلہ اپنی جگہ موجود تھا کہ نرم یا گرم میں کونسا لفظ مناسب رہے گا۔ مجبوراً اس بحث کو اگلی نشست تک کے لئے ملتوی کر دینا پڑا۔

دوسری نشست میں دو اشاروں پر بحث رہی اور کافی تُو تُو مَیں مَیں کے بعد دو موزوں الفاظ پر اتفاق ہو سکا۔ اس طرح ایک ہفتہ کی مسلسل دماغ سوزی کے بعد معمہ تکمیل کو پہنچا۔ احباب کا دعویٰ تھا کہ معمہ کا ایک حل بھرنے میں جو وقت صرف ہوا ہے وہ یقیناً ایک عالمی ریکارڈ ہے ـــــ بہر حال نہایت آرزوؤں اور امیدوں کے ساتھ معمہ روانہ کیا گیا۔ سب کو امید تھی کہ صحیح حل ضرور نکلے گا۔ ہر اشارے کو اچھی طرح ٹھونک بجا کر دیکھا تھا۔ پھر غلطی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ـــــ لیکن ـــــ جب نتیجہ آیا تو پوری پانچ غلطیاں تھیں ـــــ امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ احباب نے رسالے والے کو بے ایمان ٹھہرایا ـــــ مگر ہم ابھی ناامید نہیں تھے۔ چنانچہ یہ سلسلہ جاری رہا ـــــ اوپر نیچے چار پانچ بار جب برابر غلطیاں آتی رہیں اور ایک پائی بھی ہاتھ نہیں آئی تو اکثر دوستوں نے یہ سلسلہ ترک کر دینے کا مشورہ دیا ـــــ مگر ہمیں اور راشد کو تو گویا چاٹ پڑ گئی تھی۔ اس پر ستم یہ کہ ہر بار رسالے میں انعام یافتگان کی تصاویر چھپتیں اور ہمارا حوصلہ بڑھ جاتا اور ہر دفعہ پہلے سے زیادہ محنت اور سوجھ بوجھ سے حل بھرتے۔ اب ہمارے دوستوں نے رات کو آنے کا سلسلہ بند کر دیا تھا کیونکہ وہ معمے سے بھاگنے لگے تھے اور یہاں یہ عالم تھا کہ اوڑھنا بچھونا معمہ بنا ہوا تھا ـــــ آہستہ آہستہ حلوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو رہا تھا ـــــ ایک سے شروع کیا تھا پھر پانچ، دس اور آخر میں پچاس پچاس حل بیک وقت بھیجے جانے لگے، لیکن ہر بار ایک دو غلطیاں ہوتیں ـــــ حلوں کی تعداد میں اضافے کی وجہ سے اب ہم دونوں رات گئے تک بیٹھے بحثیں کیا کرتے ـــــ چائے تو پانی کی طرح بہتی، سگریٹ کے ٹکڑوں اور راکھ سے ایش ٹرے بھر جاتا۔ اس طرح کئی ماہ بیت گئے۔ گھر والے الگ چیخ رہے تھے کہ یہ کیا روگ لگایا ہے، اپنے پیچھے نہ کھانے پینے کی سُدھ نہ آرام کا ہوش۔ صحت گرتی جا رہی ہے چاروں طرف سے اس تیزی سے کم ہو رہے ہو کہ خدشہ پیدا ہو چلا ہے کہ اگلے تین چار ماہ میں مشکل سے نظر آؤ گے۔ گالوں میں گڑھے پڑ گئے ہیں۔ آنکھوں کے گرد حلقے بن گئے ہیں، شیروانی جھولا ہو کر رہ گئی ہے، ایسا بھی کیا جنون ـــــ مگر ہمیں ان باتوں پر کان دھرنے کا ہوش نہیں تھا۔ بس اُن دنوں تو ایک ہی دھن تھی ـــــ ہر صورت میں پہلا انعام ـــــ راشد مسلسل ناکامیوں سے کچھ ناامید ہو گیا تھا۔ آخر ہم دونوں نے طے کیا کہ یہ اُردو کا معمہ کچھ نامعقول معلوم ہوتا ہے لہٰذا انگریزی معمہ کیوں نہ بھرا جائے۔ سنا ہے کہ یہ ایمانداری سے انعامات تقسیم کرتا ہے اور اس معمے میں جتنی زیادہ سوجھ بوجھ اور محنت کی جائے گی، اتنا ہی اچھا نتیجہ برآمد ہونے کے امکانات ہیں۔ اس کے علاوہ اس معمے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس سے آدمی کی ووکیبلری بڑھتی ہے کیونکہ الفاظ تلاش کرنے کے لئے کئی کئی ڈکشنریاں کھنگالنی پڑتی ہیں اور ان کے معنی سمجھنے پڑتے ہیں۔ ہم نے اس معمے کا بغور مطالعہ کیا، اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ معمہ اُردو کے مقابلے میں کہیں زیادہ مشکل ہے کیونکہ اس میں ہر اشارے کے لئے بیس بیس اور پچیس پچیس ہم وزن و ہم معنی الفاظ ممکن ہو سکتے تھے۔ پھر یہ الفاظ معمے میں نہیں دیئے جاتے تھے بلکہ خود ڈکشنریوں میں تلاش کرنے پڑتے تھے ـــــ ہم انگریزی پر اتنی قدرت نہیں رکھتے کہ سب سے موزوں ترین لفظ کا تعین کر سکتے۔ اگر ہم اسطرح ڈالے جاتے کہ کوئی لفظ بچ کر نکلنے ہی نہ پائے تو اس کا مطلب یہ تھا کہ ہر بار چار پانچ سو روپے کا جوا کھیلا جائے جو ہم نے اپنی جیب خفیف پر ایک بار سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ اُردو معموں نے پہلے ہی ہماری مالی حالت کافی پتلی کر دی تھی۔

راشد کے کہنے پر اس معمے کے لئے ہم نے "قرعہ سسٹم" شروع کر دیا۔ سب سے پہلے کئی موٹی موٹی ضخیم ڈکشنریاں خریدی گئیں۔ یہ ڈکشنریاں

امریکہ اور انگلینڈ میں چھپی تھیں۔ ان ڈکشنریوں سے رات رات بھر الجھے رہنے کے بعد تمام ممکن الفاظ نکالتے اور قرعہ کے ذریعے جو لفظ نکلتا وہی چن لیا جاتا، گھر کے بچوں کو پکڑ کر لایا جاتا اور یہ قرعہ وہی اٹھاتے ـــــ بعض اوقات رات کو سوتے ہوئے بچہ کو اٹھا لاتے اور اُن سے قرعہ اُٹھواتے ہمارے اس طرزِ عمل سے بچے ہماری صورت دیکھتے ہی سر پہ پیر رکھ کر بھاگتے۔ ہماری حرکتوں پر گھر والے لعن طعن کرتے، مگر ہم نے کبھی کان نہیں دھرے سر پہ معمے کا جنون کچھ اس طرح سوار تھا کہ سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں مفقود ہو کر رہ گئی تھیں ـــــ اس تمام دماغ سوزی کے باوجود جب انعام نہیں آیا تو ہم نے معمہ بازی پر دو حرف بھیجنے کا ارادہ کر لیا، گھر والے ہمارے اس فیصلے سے خوش تھے کہ چلو جنون اُترا خدا خدا کر کے ـــــ مگر ابھی کہاں، راشد ایک نئی خبر لایا۔

"ارے کچھ سنا تم نے، اب تک ہم نے خواہ مخواہ اپنا وقت اور پیسہ برباد کیا، صحیح حل نکلنے کا طریقہ تو اب معلوم ہوا ہے ـــــ وہ ہنستا ہوا بولا۔

"وہ کیا بھلا ـــــ ہم بھی سنیں ـــــ"

"بس سنکر کیا کروگے ـــــ میں کل خوشامد کر کے انہیں لے ہی آؤں گا ـــــ"

"مگر بھئی آخر کسے ـــــ؟"

"پیر جھنڈے شاہ کو ـــــ"

"پیر جھنڈے شاہ! ـــــ یہ کون ہستی ہے؟"

"ارے یہی تو ہیں پہنچے ہوئے ولی ـــــ یہ جو قرعہ نکالتے ہیں ہمیشہ صحیح ہوتا ہے ـــــ سٹہ، لاٹری اور ریس والوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے ان کے گرد ـــــ کل لا رہا ہوں تمہارے یہاں بس اب وہی معمہ حل کریں گے ـــــ"

"مگر سنو تو سہی ـــــ ہم اس پیری فقیری کو نہیں مانتے"

"پیری فقیری بڑے کام کی چیز ہوتی ہے برخوردار تمہیں یقین اس وقت آئے گا جب اسی ہزار کا کڑکڑاتا ہوا چیک تمہارے ہاتھ میں ہوگا ـــــ بس سب تیاری کر ڈالنا ـــــ کھانے میں پیر صاحب کو انڈوں کا حلوہ بے حد مرغوب ہے، حلوہ کھا کر پیر صاحب موج میں آجاتے ہیں اور جود و سخا کے دریا بہا دیتے ہیں۔"

الغرض راشد کی باتوں سے ہم کافی مرعوب ہوئے اور "ایک کوشش اور سہی" کے مصداق ہم نے دوبارہ "قرعہ" کی تیاری شروع کر دی اور ڈکشنریاں سنبھال لیں۔

دوسرے دن شام کو بڑے اہتمام کے ساتھ دس انڈوں کا نہایت تر بتر حلوہ تیار کرایا گیا جس کے ساتھ چائے اور دیگر لوازمات بھی تیار ہوئے، پیر جھنڈے شاہ آئے، نہایت گھنی داڑھی میلا کچیلا اور چیتھڑوں پر مشتمل لباس ـــــ ہم خوفزدہ ہو گئے کہ نہ معلوم کس قسم کا سلوک کریں گے۔ انکی نظروں سے ہم پر ویسے ہی لرزہ طاری ہو رہا تھا۔ ادھر راشد جس کو پیری فقیری کا کافی تجربہ معلوم ہوتا تھا۔ ان کے آگے بچھا جا رہا تھا۔ خدا خدا کر کے پیر صاحب کا جلال کم ہوا اور صوفہ پر بیٹھ گئے، پھر حلوے کی پلیٹ دیکھ کر داڑھی پر ہاتھ پھیرا، ایک ضرب لگائی اور حلوے پر اس انداز سے ٹوٹے جیسے پلیٹ سمیت ہڑپ کر جانے کا ارادہ رکھتے ہوں، راشد نے ہمیں کچھ اشارہ کیا اور ہم نے پہلا قرعہ پھینکا ـــــ پیر صاحب نے نہایت غصہ کے عالم میں ہمیں دیکھا جیسے ہماری یہ حرکت ناگوار گزاری ہو مگر راشد فوراً ان کے قدموں کے قریب دوزانو ہو گیا اور خوشامدانہ انداز میں ان کے پیر دبانے لگا۔ پیر صاحب کے چہرے پر مسکراہٹ نظر آئی اور وہ مشفقانہ انداز میں اس کے سر پہ ہاتھ پھیرنے لگے ـــــ راشد نے فتح آمیز نگاہوں سے پیر صاحب کی جانب دیکھا۔

اچانک پیر صاحب نے ہم دونوں کو باہر چلے جانے کا اشارہ کیا۔ راشد نے جلدی سے ہمارا ہاتھ پکڑا اور ہم دونوں اندر کے کمرے میں آ گئے۔ ہم نے اشارے سے وجہ دریافت کی تو وہ بولا "شاید تنہائی میں قرعہ نکالیں گے۔"

کچھ دیر بعد ہم دونوں ڈرائینگ روم میں آ گئے تو انہوں نے کاغذ کی ایک گولی ہماری جانب بڑھا دی۔ ہم نے وہ لفظ نوٹ کیا اور دوسری بار قرعہ پھینکا، پیر صاحب نہایت خوفناک نظروں سے کمرے کا جائزہ لے رہے تھے —— ہم دونوں پھر باہر آ گئے۔ کئی بار یہی ہوا۔

ایک بار جو ڈرائینگ روم میں داخل ہوئے تو ہم دونوں چونک پڑے۔ پیر صاحب غائب تھے۔ اُن کا ڈنڈا البتہ موجود تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے انہیں زمین نگل گئی ہو اور پھر جیسے ہی ہماری نگاہ کارنس پہ گئی تو پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ ہمارا قیمتی ٹرانسسٹر سیٹ غائب تھا اور اس پر ڈھکا ہوا غلاف زمین پر پڑا ہمارا منہ چڑا رہا تھا۔ ہم جھپٹ کر باہر آئے مگر وہاں کیا رکھا تھا —— ہمیں یقین ہو گیا کہ ٹرانسسٹر پر پیر جھنڈے شاہ نے دست شفقت فرمایا ہے۔ اُدھر راشد سخت نادم تھا۔ گھر والوں کو پتہ چلا تو ہم دونوں کو شدید طنز کے تیر برداشت کرنے پڑے۔ پھر انہوں نے کہا کہ اگر اس نقصان کے عوض تم یہ "معمہ بازی" ترک کر دو تو ہمیں قطعی کوئی اعتراض نہیں ہے —— مرتا کیا نہیں کرتا کے مصداق ہم نے کان پکڑ کر توبہ کی کہ آئندہ معمہ بھرنا تو بڑی بات ہے۔ معمے کا نام بھی نہ لیں گے۔" خدا کرے اب کوئی ایسا رسالہ ہماری نظروں سے کبھی نہ گزرے جس میں معمہ جیتنے والوں کی تصویریں چھپی ہوں کیونکہ اب کے تو ہم نے سچ مچ توبہ کر لی ہے۔

فتح محمد ملک   شمیم احمد   عرش صدیقی

خالد احمد   جمیل ہمدم   نجیب احمد

اختلافات

انتظار حسین، انور خواجہ کے نقشِ قدم پر

پشاور کے نوجوان شاعر احمد فراز کے تازہ مجموعۂ کلام پر میرا تبصرہ پڑھ کر پشاور کے انور خواجہ اس حد تک غضب ناک ہوئے کہ انہیں اس تبصرے کے علاوہ میرے دو اور مضامین کی طرف بھی متوجہ ہونا پڑا۔ "فنون" کی سہ ماہی اشاعت نمبر ۹ میں "ادب کا ایک نیا مفسّر" کے عنوان سے جو تحریر شائع ہوئی ہے وہ اسی توجہ کا نتیجہ ہے۔ انور خواجہ کو میری نثر سے یہ شکایت ہے کہ اسے پڑھ کر وہ مرعوب تو ہو جاتے ہیں مگر سمجھ نہیں پاتے۔ اس کے باوجود موصوف نے میرے تنقیدی اندازِ نظر کی مخالفت میں "فنون" کے بارہ صفحات سیاہ کرنے ضروری سمجھے ہیں۔ میں اس قسم کی کسی تحریر پر اظہارِ خیال کر کے اپنا اور آپ کا وقت ضائع کرنے کا کوئی ارادہ نہ رکھتا تھا۔ مگر جب انتظار حسین نے اپنے مخصوص نسوانی لہجے میں انور خواجہ کی "بے سمجھی" کے عالم میں لکھی گئی باتوں کو عقلی اور منطقی بنیاد فراہم کرنے کی زحمت گوارا فرمائی تو مجھے بھی لب کشائی کی ضرورت محسوس ہوئی۔

یادش بخیر، اب سے اٹھارہ اُنیس برس پہلے میرا جی پر انتظار حسین کا ایک مضمون پڑھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ انتظار حسین شاعری اور خصوصاً میرا جی کی شاعری کو سمجھنے سے معذور ہیں۔ کیونکہ ان کے مضمون کا لب لباب یہ تھا:

> "میرا جی کی شاعری کا محاکمہ کرنا یوں بھی مشکل ہے اور غلط بھی کہ اس سے پہلے ان کی ذہنیت کے تجزیہ کا سوال پیدا ہوتا ہے، اور ان کی ذہنیت بڑی ٹیڑھی ترچھی ہے لیکن اس کے بارے میں ایک موٹی بات تو میری سمجھ میں بھی آتی ہے وہ یہ کہ میرا جی ذہنی اعتبار سے ہندو تھے۔"
>
> (روزنامہ "امروز" بابت ۱۴ر نومبر ۱۹۴۹ء)

لیکن آج (۲۷ر نومبر ۱۹۶۷ء) کے روزنامہ "مشرق" میں ان کا کالم پڑھ کر ایک لمحے کے لیے یوں محسوس ہوا جیسے وہ نثر سمجھنے سے بھی معذور ہو گئے ہیں۔ سوچا، شاید انتظار حسین نے کہ سابق ادیب حال کالم نگار ہیں، اصل مضمون پڑھے بغیر محض سُنی سنائی باتوں کو ذہن میں رکھ کر کالم گھسیٹ دیا ہو گا۔ پھر خیال آیا، اگر ایسا ہے تو بھی عجب ہے کیونکہ زیرِ بحث مضمون کی اشاعت سے بہت پہلے "فنون" کے شمارہ نمبر ایک میں "نئی شاعری اور جدید شاعری" کے عنوان سے میرا جو مضمون شائع ہوا تھا اس میں بھی میں نے میرا جی کی شاعری پر مجملاً ایسے ہی خیالات پیش کئے تھے، اور یہ وہ زمانہ تھا جب انتظار حسین افسانہ نگاری پر ہی تکیہ کئے ہوئے تھے اور انہوں نے "ادبِ لطیف" کی ادارت میں ناکام ہو کر ابھی "مشرق" میں کالم نگاری شروع نہ کی تھی۔

انتظار حسین کو جدید شاعرین سے اور مجھ سے یہ شکایت ہے کہ ہم نے میرا جی کی شاعری پر قلم اٹھاتے وقت خود کو "میرا جی کی نظمیں" نامی کتاب تک محدود کیوں نہ رکھا؟ ——— ہمیں اس جرم کا اعتراف ہے کہ ہم یہ فراموش نہ کر سکے کہ ۱۹۴۲ء کے بعد میرا جی نہ صرف چھ سات برس تک زندہ رہے بلکہ انہوں نے مسلسل شاعری کی۔ ہر چند یہ شاعری کتابی صورت میں یک جا موجود نہیں مگر رسائل و جرائد میں مطبوعہ صورت میں موجود ہے۔ چنانچہ ہم جب

میراجی کے بارے میں سوچتے ہیں تو ہمارے سامنے پورا میراجی ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ ہمیں انتظار حسین کی طرح میراجی کی ذہنیت "ٹیڑھی ترچھی" نظر نہیں آتی، اور اس "موٹی بات" پر اکتفا کر لینا کہ "میراجی ذہنی اعتبار سے ہندو تھے" ہمیں میراجی اور جدید اردو شاعری پر ظلم نظر آتا ہے۔

ہمارے اس خیال پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہ زندگی کے آخری چند برس کے دوران میراجی کی ہندوستانیت میں کمیت اور پھر اسلامیت کی نئی وسعتیں نمودار ہونے لگی تھیں، انتظار حسین لکھتے ہیں:

"یہ دریافت زیادہ سنسنی خیز تھی کیونکہ میراجی نے ہمیشہ اپنا رشتہ ہندو دیومالا سے، میرابائی سے اور ہند قدیم کے ایسے ہی دوسرے شاعروں سے جوڑا ہے۔ ہمارے یہاں ادب کو پسند کرنے کا مروجہ طریقہ یہ ہے کہ جو ادب تمہارے اپنے نظریات سے مطابقت رکھتا ہے اسے پسند کرو، باقی کو رد کر دو یا اگر حلوے کے طور پر کوئی ایسا ادب آپ کو پسند آ گیا ہے جو آپ کے نظریات کے مطابق نہیں ہے تو اس میں کسی نہ کسی طور اپنے نظریات انڈیلو اور اسے اپنے لئے قابلِ قبول بناؤ۔ نئی شاعری کی اپنی قباحتیں تو ہیں مگر شاعری کو پسند کرنے کا یہ مروجہ طریقہ بھی میراجی کی شاعری کو سمجھنے کی راہ میں حائل ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں شاعر کے روحانی سرچشمہ تک پہنچنے کے لئے کسی قدر غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کرنا پڑتا ہے اور یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ شاعر کسی اپنی مخصوص جذباتی صورتِ حال کی بنا پر اپنی آبائی تہذیب کے دائرے سے نکل کر کسی دوسری تہذیب کے تجربوں میں سانس لے سکتا ہے اور انہیں اس حد تک اپنا سکتا ہے کہ وہ اس کی ذات کا حصہ بن کر اس کے تخلیقی اظہار کا ذریعہ بن جائیں۔"
(لاہور نامہ — ۸ نومبر ۱۹۶۰ء)

بے شک ہم ادب کے مطالعہ کے دوران اپنے نظریات کو خیرباد کہہ دینے پر خود کو رضامند نہیں کر پاتے مگر صرف اس خطا پر انتظار حسین کا ہمارے مضامین کو رد کرتے وقت (بلکہ اپنے لفظوں میں ان کا سیدباب کرتے وقت) یہ تک نہ سوچنا تعجب انگیز ہے کہ ہم نے اپنے مضامین میں یہی دیکھنے کی کوشش تو کی ہے کہ میراجی نے جس "مخصوص جذباتی صورتِ حال کی بنا پر اپنی آبائی تہذیب کے دائرے سے نکل کر دوسری تہذیب کے تجربوں میں سانس" لینے کی کوشش کی وہ صورتِ حال کیا تھی؟ کب تک برقرار رہی؟ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ کسی اور جذباتی صورتِ حال سے بھی دوچار ہوئے یا نہیں؟۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں میں اپنے زیرِ بحث مضمون کے دو ایک اقتباسات پیش کروں:

"ہمعصر ادبی رجحانات پر میراجی کے خیالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ میراجی کو اپنے بزرگ معاصرین میں سے اقبال کا شاعرانہ مسلک پسند تھا لیکن امرِ واقعہ یہ ہے کہ میراجی نے اقبال کے دھارے کے ساتھ ساتھ بہنے کی بجائے اس رَو کا ساتھ دیا جو اقبال کے متوازی چل رہی تھی۔ اس کی وجہ بھی میراجی نے اپنے مذکورہ مضمون میں بتا دی ہے ——— "ماحول کے ناپسندیدہ ہونے کی صورت میں اگر اس کی فطرت باغیانہ نہ ہو تو شاعر صوفی یا بیراگی بن جاتا ہے اور باغیانہ صورت میں عمل کے ساتھ مصلحِ ملک و قوم بن جاتا ہے" ——— میراجی کی فطرت باغیانہ نہ تھی اس لئے انہوں نے صوفی بننے کی ٹھانی۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ کون سے ناساعد حالات تھے جن سے نبرد آزما ہونے کی طاقت خود میں نہ پا کر میراجی راہِ فرار اختیار کرتے ہیں۔"

میراجی کی اُس زمانے کی "مخصوص جذباتی صورتِ حال" کے تجزیے کے دوران میں نے لکھا:

"میں سمجھتا ہوں کہ میراجی کا ہندی مسلمان ہونا اس ضمن میں مرکزی اہمیت کا حامل ہے۔ میراجی کے مصائب سراسر

ذاتی ہوتے ہوئے بھی برطانوی ہندوستان میں رہنے والے عام مسلمان نوجوان کے نمائندہ مصائب ہیں۔ جس زمانے میں میراجی پیدا ہوئے، سنِ شعور کو پہنچے وہ زمانہ ہماری تاریخ کا عجیب و غریب باب ہے۔ سیاسی طور پر یہ عہد ہندو مسلم اتحاد اور ادبی طور پر ہندوستانیت کی بڑھتی ہوئی لے کا منظر پیش کرتا ہے مگر یہی وہ زمانہ ہے جب ہندی مسلمان کے ذہن میں یہ کشمکش اپنے عروج پر ہے کہ وہ ہندوستان میں رہتے ہوئے بھی اس بڑی اسلامی دنیا کا اٹوٹ انگ ہے جو ہندوستان کے مغرب میں پھیلی ہوئی ہے . . . . . . عام مسلمان اس الجھن میں مبتلا ہے کہ مستقبل کے آزاد ہندوستان میں اس کی ہستی کی بقا کیسے ممکن ہے؟ — اقبالؔ جن رجحانات کے نمائندہ تھے وہ سیاست کی دنیا میں ابھی زیرِ زمین کام کر رہے تھے اس لئے اس کشمکش کا آسان مگر منفی حل ابوالکلام جیسے سیاسی رہنماؤں اور میراجی جیسے شاعروں کو یہ نظر آیا کہ وہ ہندوستانی قومیت کے تصور کو اپنا کر ہندوستان میں ضم ہو جائیں — خالصتاً ذاتی سطح پر میراجی ایک ایسے باپ کے سب سے بڑے فرزند تھے جو ریٹائر ہو چکے تھے اور گھر بھر کی امید بھری نظریں اُن پر مرکوز تھیں مگر ان کی "سنگ دل خون سُکھاتی ہوئی بے کار سماج" محض اس بنا پر انہیں کوئی قابلِ عزت مقام دینے سے انکاری تھی کہ ان کے پاس اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کے باوجود میٹرک تک کی سند نہ تھی۔ نتیجہ یہ کہ میراجی ایک ایسی سرزمین کی طرف ہجرت پر مجبور ہوئے جو اس دنیا سے الگ تھی۔"

یہ اقتباسات شاہد ہیں کہ میں نے میراجی کی شاعری میں اپنے نظریات "ٹھونسنے" کی بجائے میراجی کی ذہنی اور جذباتی نشو و نما کو سمجھنے کی دیانتدارانہ کوشش کی ہے۔ ہاں اس کوشش کے دوران میں نے میراجی کے خطوط، میراجی کی زندگی کے دورِ آخر کے بارے میں ان کے اختر الایمان اور کرشن چندر جیسے رُفقا کے مضامین اور سب سے بڑھ کر میراجی کے آخری زمانے کی شاعری کے حوالے سے یہ ضرور کہا ہے کہ:

"ہندو دیومالا سے دلچسپی اور خاص انداز کی وسیع المشربی کے باوجود میراجی کے اندر جو شدید مذہبی احساسات ہیں، ان پر اسلام کی گہری چھاپ ہے . . . . . . میراجی کے دین و مذہب کا ذکر ان کی نظم "خدا" کو سمجھنے کے لئے اٹھایا گیا ہے۔ نظم یوں شروع ہوتی ہے:

میں نے کب دیکھا تجھے روحِ ابد
ان گنت گہرے خیالوں میں ہے تیرا مرقد
صبح کا شام کا نظارہ ہے
ذوقِ نظارہ نہیں چشمِ گدا گر کو مگر

"صبح کا شام کا نظارہ ہے"۔ اس میں حضرت ابراہیمؑ کے عرفانِ حقیقت کی واردات کو بیان کرنے والی قرآنی حکایت واضح طور پر موجود ہے۔ جوں جوں نظم آگے بڑھتی ہے تخلیقِ آدم اور تخلیقِ حیات و کائنات کے اسلامی تصورات موج در موج پیچھے سمٹتے نظر آتے ہیں۔"

اب اگر میراجی کی "مخصوص جذباتی صورتِ حال" کے تجزیہ کے دوران یہ کہہ دینے سے انتظار حسین اور اُن کے قبیلے کے دوسرے ادبی برہمنوں کی تیوریوں پر بل پڑ جاتے ہوں کہ میراجی ایک کٹر مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے تھے اور بقول خود انہیں "قرآن سن اور پڑھ کر غش آ جاتا" تھا تو ہمیں انتظار وغیرہم سے کوئی گلہ نہیں۔ گلہ تو اس مُلّایانہ ادبی ذہنیت سے ہے جسے مغرب کی زوال پسند تحریکوں نے جنم دیا اور مکتبۂ فرینکلن جیسے پروان چڑھا رہا ہے۔

فتح محمد ملک (راولپنڈی)

عملی تنقید سے پہلے

انور خواجہ صاحب نے ایک اختلافی نوٹ فتح محمد ملک کے ایک مضمون اور ایک تبصرے کے جواب میں لکھا ہے۔ انور خواجہ صاحب نظریاتی طور پر ترقی پسند ہیں مگر چونکہ وہ ترقی پسندوں کی نئی نسل سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے ان کے یہاں اپنی تحریک کی خوبیوں کے ساتھ اس کی خامیوں کا بھی شعور پایا جاتا ہے۔ اسی لئے انہوں نے اپنے اس مضمون کی تمہید میں محض زیٹ زبٹ کا مظاہرہ نہیں کیا ہے۔ مجھے ان کے فتح محمد ملک کی عملی تنقید سے کوئی سروکار نہیں، صرف یہ دیکھنا ہے کہ وہ نقطۂ نظر جس کو معیار بنا کر یا شاید غیر شعوری طور پر جس کا اظہار ہوا ہے، کیا ہے۔ چونکہ وہ ترقی پسند ہیں، اس لئے وہ اپنے نظریہ کا استدلال ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> "بہت سے نئے نقاد ماضی کی حیوانی اقدار کو واپس لانا چاہتے ہیں اور اسے مختلف رنگ روپ میں پیش کرتے ہیں حالانکہ انسانی تہذیب کی تمام تر کوشش اس بات پر مرکوز ہے کہ انسان کے اندر جو حیوان ہے اسے شائستہ بنایا جائے۔ ہم ماضی کی طرف کبھی لوٹ نہیں سکتے اور ان گم شدہ اقدار کو واپس نہیں لا سکتے جو اپنی افادیت کھو چکی ہیں۔"

بہت ہی معروف نظریۂ ارتقاء کا ایک تخمینی بیان ہے مگر حسبِ روایت بغیر سوچے سمجھے دیا گیا ہے اور اپنی بات کو بالکل نہ سمجھ کر استدلال بنایا گیا ہے۔ آیئے اب انور خواجہ صاحب کی ان فکری لائنوں کو سمجھ کر پڑھیں۔ انہوں نے ماضی کے معنی حیوانی اقدار قرار دیا ہے۔ گویا انسانی تاریخ نے اب تک جتنی بھی ترقی کی ہے اور بقول ان کے جتنا بھی شائستہ بننے کی سعی کی ہے وہ سب حیوانی اقدار سے ماخوذ ہیں۔ کیونکہ ان کے نظریہ کے مطابق صرف حال ہی شائستہ ترین لمحہ ہے یا پھر مستقبل شائستہ ہو سکتا ہے۔ یعنی (شائستہ کے معنی مفہوم سے قطع نظر) انور خواجہ صاحب کے اصول کے مطابق منطقی طور پر انسان کبھی شائستہ نہیں بن سکتا کیونکہ ہر حال ماضی میں مستقبل بن جاتا ہے، اور جناب انور خواجہ صاحب کا استدلال ہے کہ ماضی حیوانی اقدار کا نام ہوتا ہے۔ اس لئے گویا انسان حیوانی اقدار سے کبھی پیچھا نہیں چھڑا سکتا، اور جب وہ حیوانی اقدار سے محفوظ نہیں ہے تو یقیناً شائستہ بھی نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ شائستگی گویا عنقا ہوئی جسے انسان نے صرف فرض کر رکھا ہے، چلیے چھٹی ہوئی۔ نہ ہم حیوانی اقدار چھوڑ سکتے ہیں اور نہ شائستہ بن سکتے ہیں۔ پھر آخر انور خواجہ صاحب نے نئے نقادوں کا ذکر اتنے طنزیہ انداز میں کیوں کیا ہے جیسے وہ کوئی الزام لگا رہے ہوں، تو جناب والا آپ خود ان کا اقتباس پڑھیئے الزام تو کھلا ہوا لگایا گیا ہے مگر شاید وہ یہ بھول گئے کہ بغیر سمجھے ہوئے بات کہنے میں یہی قباحت ہوتی ہے ؏

میں الزام اس کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا۔

نہیں۔ ہمیں انور خواجہ صاحب کی مدد کرنی چاہیئے شاید وہ بھول سے یہ جملہ غلط لکھ گئے یا اپنے الفاظ کا مفہوم ہی نہیں سمجھے۔ شاید ان کی مراد یہ ہو کہ اب تک تو ماضی حیوانی اقدار سے عبارت تھا مگر آئندہ ماضی میں سے یہ عنصر ہمیشہ کے لئے خارج ہو جائے گا اور اس کے بعد جو ماضی آئے گا یعنی جب مستقبل میں حال ماضی بن جائے گا تو وہ حیوانی نہیں بلکہ انسانی اقدار سے عبارت ہوگا۔ کیوں صاحب کیسا خوبصورت خیال نکلا ہے؟ اور کتنا حق و صداقت کے ساتھ بیان ہوا ہے؟ یعنی اب تک ماضی کے تمام انسانی کارنامے صرف وحشی بندروں کی اچھل کود قرار پا گئے، اور ہمارا حال ماضی جب بنے گا تو اس کے سارے کارنامے انسانی کہلائیں گے۔ یعنی ؏

ہمارے بعد اندھیرا نہیں اُجالا ہے۔

اس طرزِ فکر اور اس استدلال پر چاہے آپ کے قہقہے آسمان تک پہنچ گئے ہوں مگر ایمان کی بات یہ ہے کہ انور خواجہ صاحب کے ذہن میں اس کے

صحیح بالکل یہی ہیں، اور آپ کے تعقبوں کو بالکل نظر انداز کر کے میں وہی مانوں گا جو انور خواجہ صاحب فرماتے ہیں۔ چنانچہ اس بات کو بالکل صحیح مان کر آگے بڑھئے تو وہ کہتے ہیں "کہ ہم ماضی کی طرف کبھی لوٹ نہیں سکتے" اب یہ بات صاف ہو گئی کہ ہم ماضی کی طرف کیونکر لوٹ نہیں سکتے۔ اس لئے کہ ماضی حیوانی اقدار سے عبارت ہے۔ گویا اگر یہ ممکن ہو سکتا تو ہم اس بات پر ایمان لے آتے کہ انسان پھر بندر بن سکتا ہے جو ناممکن ہے۔ دغا لبا انور خواجہ صاحب بھی میرے ذہنِ رسا پر اس وقت خوش ہو گئے ہوں گے کہ ان کے ماضی کے کبھی نہ لوٹنے کی تائید میں ایسی دلیل انہیں بھی نہ سوجھی ہوگی) مگر میرے بھائی نظریۂ ارتقاء کے ماننے والوں کو یہ بڑی مشکل پیش آتی ہے کہ وہ اپنا سلسلۂ نسب بندروں سے ضرور جوڑتے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے (جس طرح ہمارا دوبارہ بندر بن جانا) کہ ہم اپنا نام تو اچھا سا رکھ لیں مگر ہمارا بندر کی نسل ہونا بادن تولے اور پاؤ رتی ثابت نہ ہو۔ اور پھر یہ بات خالی از امکان ہے کہ ہم اپنا سلسلۂ نسب تو حیوان سے جوڑیں اور محض اب انور خواجہ صاحب کی فرمائش پر خود کو حیوانی اقدار سے محفوظ سمجھ لیں۔ نہیں صاحب! ہمارا حیوانی ہونا لابدی اور لازمی امر ہے۔ اور:

لاکھ طوطے کو پڑھایا پھر بھی وہ حیوان رہا

کے اصول کے مطابق بالکل صحیح ہے۔ تو گویا اس پوری تگ و دو کا نتیجہ وہی نکلا کہ کمبل کو تو ہم چھوڑنا چاہتے ہیں مگر کمبل ہمیں نہیں چھوڑنا چاہتا۔ اس لئے انور خواجہ صاحب کی اتنی بڑی بھی نئے نقادوں سے اچھی نہیں۔ وہ بے چارے تو اپنی اوقات کے دائرے میں رہنا چاہتے ہیں، پتہ نہیں انور خواجہ صاحب انہیں اچھا سا نام دے کر کیوں سولی پر چڑھانا چاہتے ہیں۔

میں بے انصافی نہیں اس لئے آیئے انور خواجہ صاحب سے ایک سوال کر کے ان کے مفہوم کو اور وضاحت سے سمجھنے کی کوشش کریں۔ مارکس کی مشہور زمانہ کتاب اور صاحبِ مقالہ کے نظریہ کی سب سے مقدس کتاب "ڈاس کیپٹل" کو چھپے ہوئے اسی مبارک سال پوری ایک صدی گزر چکی ہے یعنی وہ ۱۸۶۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ کیوں صاحب کیا ایک صدی ماضی میں نہیں شمار ہوتی؟ اگر نہیں ہوتی تو پھر انور خواجہ صاحب سے ہماری یہ درخواست ہے کہ وہ ایک ایسی جنتری بنائیں کہ جس میں یہ درج ہو کہ دراصل ماضی کا زمانہ کس عرصہ سے کس عرصہ تک کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس سے وہ کچھ اور رہنے یا نہ رہے عمر خیام کی حیثیت انہیں ضرور مل جائے گی۔ حالانکہ وہ بے چارہ ہیئت داں کی حیثیت میں کم اور شاعر کی حیثیت میں زیادہ مشہور کیا گیا ہے۔"

ڈاس کیپٹل کا ذکر آیا ہے تو ایک آخری بات انور خواجہ صاحب سے اپنے علم کے لئے معلوم کرنا چاہوں گا کہ اشتراکیت کا "مقصودِ اصلی" معاشرہ اصولی اعتبار سے وہی ہوگا یا نہیں جو انسانی تاریخ کا ابتدائی معاشرہ تھا؟ ——— یعنی بارٹر سسٹم والا معاشرہ؟؟ ——— ظاہر ہے کہ اس معاشرہ سے یہ مراد کوئی بے وقوف بھی نہیں لیتا کہ انسان بالکل اسی طرح رہنے سہنے لگے گا جس طرح وہ اپنی ابتداء میں رہتا تھا۔ یہاں تو سب سے نمایاں اصول کا سوال ہے۔ گویا اصولی طور پر یہ رجعت قہقری ہوئی؟ یہاں تک مجھے خود انور خواجہ صاحب کی یہ چند سطریں لائی ہیں اس لئے یہ سوال بھی بے جا نہ ہوگا کہ اسلام کے تیرہ سو برس پہلے کے اصل قرآنی معاشرہ کے دوبارہ قیام کا مطلب یہ کب ہوتا ہے کہ ہم ہوائی جہاز چھوڑ کر پھر اونٹ پر سواری کرنے لگیں گے۔ ظاہر ہے میرے بھائی اس کا مطلب بھی یہی ہوا کہ اسلامی اور قرآنی اصولوں کا معاشرہ ——— اس کو مسلمان بادشاہوں یا بنی امیہ سے شروع ہونے والی اسلامی تاریخ والا معاشرہ نہ سمجھئے کیونکہ ان تیرہ سو برسوں میں مسلمانوں نے دراصل اسلامی اصولوں کے خلاف ہی جہادِ اکبر کیا ہے۔ تیرہ سو برسوں میں اشتراکیت کا احوال کیا ہوگا، یہ اللہ بہتر جانتا ہے یا پھر انور خواجہ صاحب جانتے ہوں گے۔ صرف پچاس سال میں ان کے اندر بھی دھڑے بندی شروع ہو چکی ہے۔ کیا موجودہ روس اور چین کا حوالہ دینا کافی نہیں ہوگا؟

پیارے بھائی قصہ یہ ہے کہ آدرش ہمیشہ اصلی ہوتا ہے اور اصول کبھی ماضی اور مستقبل میں تقسیم نہیں ہوا کرتے۔ وہ روکے جا سکتے ہیں بگاڑے

جاسکتے ہیں، تبدیل کئے جاسکتے ہیں مگر نئے اور پرانے نہیں ہو سکتے ۔اس لئے روسی معاشرہ بھی ابھی ابتدائی اشتراکی معاشرہ ہے اور اس کو بھی ایک آدرشی معاشرہ تک پہنچنا ہے۔ مگر اس کے اصول صدیوں بعد بھی وہی رہیں گے جو آج ہیں۔ اسی لئے اصولی طور پر افلاطون کی ریاست کا قیام بھی ممکن ہے اور اس کا نظریہ بھی نظریاتی طور پر اتنا ہی اہم ہے جتنی اسلامی فکر یا مارکسی نظامِ فکر۔ اب یہ الگ داستان ہے کہ دنیا کی تاریخ میں دو ہی اصولی معاشرے کیوں قائم ہو سکے۔ خواہ ان کی مدت کتنی ہی قلیل کیوں نہ ہو۔ ایک تو اسلامی معاشرہ دوسرا اشتراکی معاشرہ، اور ان کا ماضی، حال، مستقبل، سب ایک ہی چیز کا نام ہے ـــ اصولی معاشرہ ـــ

بلا سوچے سمجھے کسی بات کی تبلیغ کرنے سے وہ بھیانک تنگ نظری بھی وجود میں آتی ہے جو انور خواجہ صاحب کو آگے چل کر تصویر کا ایک ہی رُخ دکھاتی ہے، وہ فرماتے ہیں:

"اس لئے انہوں نے (یعنی فتح محمد ملک نے) ایسا سلوگن انتخاب کیا جو سکۂ رائج الوقت کے مطابق ہو۔ اسلامی ادب کا نعرہ ایک سرکاری اور سیاسی نعرہ ہے۔ مسلمان ایک جذباتی قوم ہے۔ وہ ایک نعرے سے ہمیشہ دھوکہ کھاتے رہے ہیں کہ اسلام خطرے میں ہے۔ برسرِ اقتدار طبقہ نے اسے آزمایا اور وہ کامیاب رہا۔ ادب میں یہ نعرہ خاصہ سودمند رہا۔ اس نعرہ کو مقبول بنانے والے ادیبوں نے سرکاری عہدے، محکمہ اطلاعات کی ملازمتیں، انعامات اور وظائف پائے۔ ان ادیبوں کے لئے ترقی پسندوں کی مخالفت ثواب کا درجہ رکھتی ہے۔ انہوں نے ترقی پسندوں کو جا و بے جا بُرا کہا۔"

اگر اس اقتباس کا مطلب صرف یہ بتانا ہوتا کہ حکومت اسلام کو استحصال کا ذریعہ بنائے ہوئے ہے تو مجھے اس سے سو فیصد اتفاق ہوتا۔ مگر یہ عجیب ذہنیت ہے کہ نظریات اور اصولوں کی بحث میں خدا جانے ترقی پسند حضرات آدمی کی شخصیت اور کردار پر کیوں حملہ کرتے ہیں؟ ـــ کیوں صاحب موجودہ حکومت نے بھی تو ترقی پسندوں کو بہت نوازا ہے اور آج کل تو انھیں بڑی اہمیت دی جا رہی ہے، عہدے دیئے جا رہے ہیں، وظائف بخشے جا رہے ہیں، انعامات سے نوازا جا رہا ہے، سرکاری دوروں پر بھیجا جا رہا ہے اور کبھی انھیں زمانہ جنگ میں مسودات چیک کرنے کی ذمہ داری سونپی جاتی ہے کبھی سیاسی مشیر بنایا جاتا ہے۔ تو انور خواجہ صاحب یہ بتائیں کہ یہ سب کس نعرے کی پذیرائی میں ہو رہا ہے اور کیوں اور کیسے اس الزام کے مورد صرف اسلام کا نعرہ لگانے والے ٹھہرتے ہیں ـــ؟

خیر یہ تو ایک جوابی حقیقت اور صداقت کا سوال ہے مگر انور خواجہ صاحب سے پوچھنے کی بات یہ ہے کہ جب پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے تو اس کے نام لیوا آخر کیوں موردِ عتاب ہوں؟ ـــ کیا اگر پاکستان میں اشتراکی نظام قائم ہو گیا تو اس وقت کمیونسٹ ادیبوں کو نہیں نوازا جائے گا؟ اور کیا اس وقت مسلمان تو خیر کجا، سوشلسٹ ادیبوں کو بھی کوئی انعام یا وظیفہ ملے گا یا نہیں؟؟ اور بقول انور خواجہ صاحب اسلام کا نام لینے والے ادیب تو ترقی پسندوں کو کوس کر ثواب کما رہے ہیں لیکن اسلام کے نام پر حاصل کئے ہوئے ملک میں یہ ترقی پسند انھیں گالیاں دے کر کونسا ثواب کما رہے ہیں؟ یہ عجیب منطق ہے جو سارا حلوہ خود کھا جاتی ہے اور دوسروں کو صرف دعا پر ٹرخاتی ہے۔ حضرت سلامت اگر اسلام ایک سیاسی نعرہ ہے اور سکۂ رائج الوقت تو کیا ترقی پسند تحریک کے عروج کے زمانے میں اشتراکیت ایک سیاسی نعرہ اور سکۂ رائج الوقت نہیں تھی؟

پہ خوش چراندوی۔ چھپر پہ بھینس کودی

میرے بھائی کہیں تو ٹھیکئے! میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا وجہ ہے کہ پاکستان میں اشتراکیت سکۂ رائج الوقت نہیں بنی اور اسلام بن گیا۔ اگر اس کا جواب

وہی پُرشقاوت جواب ہے یعنی "مسلمان ایک جذباتی قوم ہے" (افسوس آپ پر ہے جو اس بدنصیب قوم کے ایک فرد ہیں) تو میرے بھائی کہاں کے مسلمان۔ مسلمان تو پاک و ہند، عرب و ایران، ترکی و انڈونیشیا ہر جگہ ہیں۔ حد یہ ہے کہ افریقہ اور مغرب میں بھی۔ تو کیا یہ سب الگ الگ نسلوں اور قوموں کے مسلمان سب جذباتی قوم ہیں؟ اگر ایسا ہے تو اسلام ہی ان کو جذباتی بنا دیتا ہوگا، اور یہ آپ بھی مانیں گے کہ وہ لاکھ حیوانی سہی مگر ایک نظامِ فکر ہے چلئے آپ کے کہنے سے جذباتی نظامِ فکر سہی۔ مگر بھائی انور خواجہ صاحب! کیا اسلام کے ماننے والے واقعی اتنے ہی جذباتی ہوتے ہیں جتنے کمیونسٹ؟

بس مجھے اس سلسلہ میں اتنا ہی عرض کرنا تھا۔ البتہ ایک خبر انور خواجہ صاحب تک پہنچانی ہے کیونکہ ان کے پاس بہت ہی پرانی خبریں ہیں کہ عسکری صاحب آج کل "فرانسیسی ادب کی ٹھنڈی میٹھی چھاؤں" میں آرام نہیں کر رہے ہیں بلکہ تصوف اور اسلام کے چکر میں آگئے ہیں۔ — عرصہ پانچ سال کا ہوا — شاید ان کے لئے یہ نئی خبر ہو۔

مضمون ختم کرتے ہوئے میری دعا ہے کہ آئندہ اس بحث سے کوئی ایسا نتیجہ برآمد ہو سکے جو میرے لئے بھی روشنی کا باعث ہو، مجھے اچھی بات قبول کرتے ہوئے ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔

شمیم احمد (کراچی)

وہ ایک پروفیسر" یہ ناچیز ہے

"فنون" کے شمارہ ۸ میں ایک صاحب جابر علی جابر کا ایک مکتوب شائع ہوا ہے۔ انہوں نے جو اندازِ گفتگو اختیار کیا ہے وہ ناشائستگی کا نمونہ ہے۔ ادب و فن بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں آراء کا اختلاف رہے گا، اور پھر روزمرہ جھگڑے اور ادب و فن اور تنقید کی زبان میں فرق ہوا کرتا ہے۔ اگر کوئی صاحب اپنی طبیعت سے مجبور ہیں اور اختلافِ رائے پر دوسرے کو جاہل اور گردن زدنی قرار دیتے ہیں تو ان سے کسی انصاف کی توقع فضول ہے۔ آپ دوسرے کی بات کو غلط ثابت کرنا چاہتے ہیں تو کہئے کہ غلط ہے اور دلائل دیجئے۔ جابر صاحب نے جس طرح قاضی عبدالقادر صاحب کا ذکر کیا ہے وہ ناقابلِ برداشت ہے۔ میری نظر سے آج تک جابر صاحب کی کوئی نثری تحریر کسی قابلِ ذکر رسالے میں نہیں گزری تھی۔ آپ نے یہ موقع بہم پہنچایا تو اندازہ ہوا کہ بعض لوگوں کا خاموش رہنا ہی بہتر ہوتا ہے۔ عبدالقادر صاحب اور زاہد ڈارانی صاحب نے اس پر (فنون ۸ میں) بجا طور پر احتجاج کیا ہے۔

ان کے جبر کا ایک شکار جس کا نام لینے کا ان میں حوصلہ نہ تھا (یا شاید انہیں خوف تھا کہ اگر نام لے دیا تو یہ شخص مشہور ہو جائے گا!) میں ہوں۔ اور میرا ذکر انہوں نے یوں کیا ہے "ابھی چند روز ہوئے جیلانی کامران کو ملتان کے ایک پروفیسر صاحب نے میتھو آرنلڈ سے مشابہت دے دی تو میری ایسی طبیعت خراب ہوئی (جناب ایڈیٹر صاحب یہ میری ایسی طبیعت خراب ہوئی" کیا ہوتا ہے؟ ہم نے تو میری طبیعت ایسی خراب ہوئی بھی سنا تھا) کہ عقل سے باہر نکل آیا" — یہ ایک پروفیسر" یہی ناچیز ہے۔

"فنون" میں میری تحریر پہ اعتراض شائع ہو گیا ہے تو ضرورت ہے کہ وہ بات بھی قارئین تک پہنچے جو میں نے کہی تھی۔ مجھے جب بھی اپنی غلطی کا احساس ہوگا میں اسے فوراً تسلیم کر لوں گا — میں نے کہا تھا کہ ہمارا آج کا عہد کئی لحاظ سے وکٹورین عہد سے مشابہت رکھتا ہے۔ اور ہمارے بعض شاعر وکٹورین عہد کے ہی بعض شعراء سے مشابہت رکھتے ہیں مثلاً میتھو آرنلڈ اپنے عہد کے انتشار کے زیر اثر مادی ترقی سے بیزار

ہوا اور مذہب کے سہارے کی تلاش میں رہا، کچھ ایسی ہی صورتِ حال سے جیلانی کامران دوچار ہے۔ پھر میتھو آرنلڈ کے ہاں جو (بوجوہ) اداسی کی ایک لہر ملتی ہے کچھ ویسی ہی اداسی کی لہر جیلانی کامران کے ہاں بھی نظر آتی ہے اور اسکے اسباب بھی تقریباً وہی ہیں۔۔۔" پھر میں نے یہ بھی کہا کہ اس میں کسی حد تک جیلانی کامران کے مطالعے کا بھی حصہ ہے۔

آپ کے مکتوب نگار محفل سے اٹھ کر چلے گئے لیکن ان سے یہ نہ ہوسکا کہ اپنی "صورتِ حال" پر غور کر لیتے۔ اگر میں انہی کے انداز میں گفتگو کروں تو مجھے یوں کہنا چاہئیے کہ موصوف نے نہ تو جیلانی کامران کو پڑھا ہے نہ میتھو آرنلڈ کو۔ ان کو نہ وکٹورین عہد سے کوئی واقفیت ہے نہ موجودہ دور سے، اور بقول زاہد فارانی ان کو جدید طرزِ احساس کی ہوا نہیں لگی ہے۔۔۔۔۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جو شخص بقول خود ادھیڑ عمر کا ہے اور رسالوں کے لئے مضمون نہ سہی گرماگرم مکتوب لکھ سکتا ہے، اتنا کورا نہیں ہوسکتا۔ سو میں آپ کے مکتوب نگار کے اس علم کو تسلیم کرتا ہوں جو ہم تک نہ پہنچ سکا لیکن ان کے لئے کہ ادھیڑ عمر کے ہو چکے ہیں (یہ بات معلوم نہ ہوسکی کہ موصوف نے اپنا مقابلہ مدیرِ "فنون" کے ساتھ کرنا اور یہ کہنا کہ لوگ ہم آپ جیسے مصاحب سے ادھیڑ عمروں کو اتو بنا رہے ہیں" کیوں ضروری سمجھا) صرف دعا ہی کی جاسکتی ہے اور میں زاہد فارانی کی دعا میں شریک ہوں کہ خدا کرے انہیں جدید طرزِ احساس کی ہوا بھی لگے اور وہ بیدزنی کی بجائے لوپی تنقید فرمایا کریں۔

عرش صدیقی (ملتان)

پارۂ ابر سمندر پہ برسنے آیا

"فنون" ۷۹ء میں" فنون" ۸۰ء پر جناب زاہد فارانی کا تبصرہ نظر سے گزرا۔ ان کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے "شمارہ ۸۰ء جی بھر کر پڑھا" اور ڈاکٹر نذیر احمد کے مقالے میں ایک "محلِ نظر" بات ڈھونڈ نکالی۔ مجھے شبہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا یہ فقرہ اُن کی سمجھ میں نہ آسکا:

"اکبر الہ آبادی جن کا اثر ہمارے قدامت پسند طبقے پر بہت گہرا تھا۔ فرماتے ہیں:

کہا منصور نے خدا ہوں میں ۔۔۔ ڈارون بولا "بوزنا" ہوں میں

سن کے کہنے لگے مرے اک دوست ۔۔۔ فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست

حالانکہ یہی دلیل دوسری طرف بھی لے جاسکتی تھی۔ کہا جاسکتا تھا کہ اگر عرصۂ امکان میں اتنی ترقی ہو سکتی ہے کہ بندر بڑھ کر انسان بن جائے، تو پھر انسان کیا نہیں بن سکے گا"

لیکن جناب زاہد فرماتے ہیں:

"لیکن ان کا یہ کہنا ۔۔۔ کہ منصور اور ڈارون سے متعلق اکبر الہ آبادی کے اشعار کی تفسیر نظریۂ ارتقاء کے حق میں بھی ہوسکتی تھی ۔۔۔ محلِ نظر ہے۔ کیونکہ اکبر نے "بوزنا" کا لفظ محض تقابل کے لئے استعمال کیا ہے، انسان سے اس کے رشتے کو تسلیم نہیں کیا"

یہاں جناب زاہد نے ٹھوکر کھائی ہے۔ انھوں نے ڈاکٹر صاحب سے ایک غلط بیان منسوب کر دیا ہے۔ حالانکہ ڈاکٹر صاحب صرف یہ کہہ رہے ہیں کہ "یہ دلیل دوسری طرف بھی لے جاسکتی تھی" یعنی جس وقت یہ دلیل دی جا رہی تھی، اس وقت اگر ذرا مختلف انداز میں سوچا جاتا" تو یہ بات کھل کر سامنے آجاتی کہ "اگر عرصۂ امکان میں اتنی ترقی ہوسکتی ہے کہ بندر بڑھ کر انسان بن جائے، تو پھر انسان کیا نہیں بن سکے گا" شعر میں

سے یہ معنی نہیں نکالے جا رہے بلکہ جس طرزِ فکر پر اس شعر کی بنیاد ہے، اس کو ایک امکان کی روشنی میں پرکھا گیا ہے۔

افسوس کہ زاہد صاحب نے نہ ڈاکٹر صاحب کے فقرے کو سمجھنے کی کوشش فرمائی اور نہ اکبرالٰہ آبادی کے شعر کو۔ اگر اس شعر میں انہیں کچھ نظر آیا تو "محض تقابل" جسے وہ ضبطِ تحریر میں لے آئے۔ معلوم ہوتا ہے "فنون" کا متذکرہ شمارہ انہوں نے صرف جی بھر کر پڑھا ہے، غور سے نہیں پڑھا۔ اس کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ وہ لکھتے ہیں۔

> "مصطفٰے زیدی نے اپنی نظم "سایہ" میں اپنے عہد پر مسلط مادہ پرستی کے سیاہ آسیب کو دور کرنے کیلئے "شہیدانِ نینوا کے لہو کی مشعل" اور "ایک سلگتی ہوئی دعا" کی ضرورت محسوس کی ہے اور کون نہیں جانتا کہ یہ دونوں چیزیں ہماری روحانی اقدار کے احیاء کی علامت ہیں"

کاش حضرت زاہد نے مصطفٰے زیدی کی اس خوبصورت نظم کی تعریف نہ کی ہوتی۔ انہوں نے یہ نظم پڑھی ضرور ہے مگر سمجھی نہیں کیونکہ ان کا یہی فقرہ۔ "کون نہیں جانتا کہ یہ دونوں چیزیں شہیدانِ نینوا کے لہو کی مشعل اور ایک سلگتی ہوئی دعا ہماری روحانی اقدار کے احیاء کی علامت ہیں" ڈھول کا پول کھول رہا ہے۔

زاہد صاحب نے اس شمارے کے افسانوں میں سے سب سے جاندار افسانوں "ڈاکٹر سعدی" اور "نئے پیمانے" کی تعریف عجب مضحکہ خیز انداز میں کی ہے۔ انہوں نے مسعود مفتی کے افسانے "نئے پیمانے" کو بھی مصطفٰے زیدی کی نظم "سایہ" والی لاٹھی سے ہانکا ہے۔ رقم طراز ہیں۔

> "مسعود مفتی کے افسانے "نئے پیمانے" میں اچکن والا ہمارے ہاں کے جاگیردار طبقے اور سوٹ والا صنعتکار طبقے کا نمائندہ ہے۔ یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ ان دو طبقوں نے آزادی کے بعد بھی اپنے کردار کو نہیں بدلا اور آج بھی ان لوگوں کے نزدیک سب سے بڑی اخلاقی اور معاشرتی اقدار رشوت اور خوشامد ہیں۔ اس کے برعکس ہماری قوم کے بعض وہ نوجوان جنہوں نے آزادی کے بعد ہوش سنبھالا اور اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز ہوئے، اپنی ذہنیت اور طرزِ احساس کے لحاظ سے برطانوی عہد کی نوکر شاہانہ اقدار سے متنفر ہیں اور اپنی آزاد خیالی اور پیشہ وارانہ دیانت کی وجہ سے انہیں سرمایہ دار طبقے کا یہ طعنہ سننا پڑتا ہے "خدا بھی ایسے لوگوں کو افسر بنا دیتا ہے جنہیں افسری کرنا ہی نہیں آتی"

ایک بار پھر زاہد صاحب نے قاری پر یہ ثابت کیا ہے کہ انہوں نے افسانہ پڑھا اور علامتی کردار ان کی سمجھ میں آ گئے۔ انہوں نے افسانے کے پلاٹ، آغاز، اٹھان، اختتام، اندازِ نگارش اور کرداروں کے نفسیاتی تجزیے کا کوئی ذکر نہیں کیا حالانکہ اس افسانے کی نمایاں ترین خصوصیات یہی ہیں۔ انہوں نے شاید ہم جیسے غبی قارئین پر صرف یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ کتنے ذہین ہیں اور کتنی واضح علامات کتنی جلدی سمجھ لیتے ہیں۔ اگر یہی بات ہے تو ہم ان کی ذہانت کی داد دیتے ہیں مگر خدارا وہ اپنے ذہن سے کام بھی تو لیا کریں۔

زاہد صاحب نے "فنون" کے بہرے "اختلافات" میں چند ادیبوں کو آپس میں الجھا ہوا دیکھ کر ایک نیا شوشہ چھوڑا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں۔

> "اپنے مراسلے کی تیوروں سے موصوف (سید جابر علی جابر) بہت غصہ ور معلوم ہوتے ہیں کیونکہ انہوں نے کم و بیش ہر لکھنے والے پر بیدزنی کی ہے۔ مثلاً قاضی عبدالقادر کے مضمون کے بارے میں لکھتے ہیں۔ "افسوس

ہے آپ نے اسے سنجیدگی سے چھاپ دیا"۔ یا "قاضی صاحب فن شاعری اور فنی تنقید سے یکسر بے بہرہ معلوم ہوتے ہیں"۔ اسی طرح جابر صاحب ایک جگہ جیلانی کامران کے لئے رقم طراز ہیں۔ "ملتان کے ایک پروفیسر صاحب نے انہیں میتھو آرنلڈ سے مشابہت دے دی تو میری طبیعت ایسی خراب ہوئی کہ محفل سے باہر نکل آیا (حالانکہ میتھو آرنلڈ بھی جابر صاحب کا ہم عصر ہوتا تو وہ اس کے بارے میں بھی یہی رائے دیتے) آگے چل کر موصوف ساقی فاروقی کی کتاب کے اشتہار میں مندرجہ شعر کو بالکل "بے اثر" اور "ناکارہ" قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ اس میں قصور ساقی فاروقی کا نہیں، جابر صاحب کا ہے جن کا ذوق انگریزی میں میتھو آرنلڈ اور اردو میں باقی صدیقی تک پہنچ کر جامد ہو گیا ہے۔ خدا کرے انہیں جدید طرز احساس کی ہوا بھی لگے اور وہ بیدذوقی کے بجائے ادبی تنقید فرمایا کریں"۔

حالانکہ اسی مضمون میں جابر صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ:۔

"پچھلے فنون (۵۔۶) میں فہمیدہ ریاض کی نظموں اور باقی صدیقی کی غزلوں کے سوا مجھے کچھ پسند نہ آیا (فیض صاحب کی نظم "بلیک آؤٹ" بھی) تازہ شمارے (نمبر ۸) میں احمد فراز کی نظم صحیح شاعری کا نمونہ ہے۔ یعنی تاثر مکمل اور گہرا ہے نظم بام پر پہنچ گئی ہے"۔

اس اقتباس کے بعد زاہد صاحب کے بیان کا پول کھل جاتا ہے اور ثابت ہوتا ہے کہ جابر صاحب سے اختلاف تو ہو سکتا ہے مگر ان کا ذوق جامد نہیں ہے۔ جامد ہوتا تو وہ فہمیدہ ریاض کو جو خود زاہد ڈار اور صاحب سے بھی بعد کے لکھنے والے گروہ کی ایک ذہین نمائندہ ہیں، کیونکر پسند کرتے؟ پھر وہ باقی کی غزل کے ساتھ احمد فراز کی نظم کو مکمل کیوں کہتے اور فیض جیسے نامور شاعر کی ایک نسبتاً کمزور نظم کو ناپسند کیوں کرتے۔ لگتا ہے کہ یہ ٹکڑا زاہد صاحب کے مضمون کا حصہ نہ بنتا اگر اس میں جیلانی کامران کا نام نہ آتا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ زاہد صاحب محض اسی بات سے چڑ گئے ہیں، حالانکہ اس میں چڑنے کی کوئی بات نہیں۔ اگر زاہد صاحب باقی صدیقی کو (جو یقیناً ایک اچھا شاعر ہے اور جس سے زاہد صاحب کی اور میری عمر کے لکھنے والوں کو بہت کچھ سیکھنا ہے۔) پسند نہیں کرتے اور وہ جیلانی کامران ہی کو اپنی طرح "اپنے عہد کا صناع شعر" سمجھتے ہیں تو اس میں ان کے اپنے ذوق کا قصور ہے نہ جابر علی جابر کا اور نہ باقی صدیقی کا۔ مجھے یقین ہے کہ باقی صدیقی کو اچھا شاعر کہنے والوں کا ذوق شعر جامد نہیں بلکہ ترقی پذیر ہے۔ محل نظر تو ان لوگوں کا ذوق ہے جو جیلانی کامران میں بھی "شاعر" کا سراغ لگا لیتے ہیں۔

خالد احمد (لاہور)

کچھ نظم، کچھ نثر

دعا گو ہوں کہ وہاں خیریت ہو مگر عرض احوال یہ ہے کہ یہاں خیریت نہیں ہے۔ مجلہ "فنون" کا شمارہ نومبر، دسمبر ۷۰ء (نمبر ۹) آیا رکھا ہے۔ اور ذہن اسی الجھن میں ہے کہ اس کا کیا کیا جائے۔ حسب عادت بہرۂ غزل کی طرف نگاہ شوق سب سے پہلے بڑھی اور وہیں الجھ کر رہ گئی۔

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیئے
ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیئے

آپ کی توجہ شمارہ مذکور کے صفحہ ۱۱۰، ۱۱۱ اور ۲۰۹ کی طرف مبذول کراتا ہوں۔ ان صفحات پر کچھ "غزل" کے اشعار درج ہیں مگر یا اللہ کیا غضب ہے میں ذوقِ شعر سے محروم ہو گیا ہوں یا کاتب نے اصل مسودہ کا حلیہ بگاڑ دیا ہے۔ قدرِ شعر بدل گئی ہے یا خدانخواستہ آپ کی پسند ناپسند کا معیار وہ نہیں رہا۔ یہ میں کیا پڑھ رہا ہوں۔

دور جانے کے لئے سڑکوں کے رستے ہیں کٹھن
پانیوں پر چل کے دیکھو، حوصلہ اونچا کرو
لفظ و معنی چھوڑ کر ارکان کا چرچا کرو
شعر الٹا ہو گیا ہے تم اسے سیدھا کرو

یا

درد حالات کے برابر ہے   یا خیالات کے برابر ہے
اپنے دل کو سنبھالئے صاحب   میرے جذبات کے برابر ہے
خط میں لکھو کلام سیّد کا   یہ بھی سوغات کے برابر ہے

یا

نہ تم اپنے ٹھکانے پر، نہ میں اپنی جگہ قائم
تمہارے ہونٹ کوچے ہیں تو آنکھیں بام پر میری
سنا ہے تا سحر اس کی فصیلوں پر بھی پہرا ہے
چلی تھی تخت پر جس کے، حکومت رات بھر میری
نہیں غیروں سے کچھ مطلب کہ سیّد اپنا مقصد ہے
ادائیں اس کی ہیں سب میں شاعری ہیں اور نظر میری

ایک تو ایسی غزلیں "فنون" جیسے پرچے میں جگہ پائیں اور پھر صادق نسیم، سیف زلفی، احسن احسان، مرتضٰی برلاس، ریاض مجید، صدیق افغانی، انور شعور، خالد احمد کی دل پذیر تخلیقات سے پہلے رکھی جائیں، میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا یہ کیا بھید ہے! کیا سلیقہ ہے! یا کیا مصلحت ہے! ہم معدودے چند پڑھنے والے جو اس ملک خداداد میں ہیں بے زر و مال عوام ہیں اور آپ کے رسالہ کے لئے ڈھائی روپے بھی مشکل سے نکالتے ہیں۔ ان پیسوں کا نعم البدل جب اس صورت میں ملے تو ہمیں حق پہنچتا ہے کہ ہم احتجاج کریں، چیخیں اور چلائیں۔ امید ہے آپ اتنے جمہوریت نواز تو ضرور ہوں گے کہ ان چیخوں کا گلا نہیں دبائیں گے۔

میرا خیال تھا شاید میرا دماغ چل گیا ہے یا اس کا کوئی پرزہ ڈھیلا پڑ گیا ہے کہ ان اشعارِ نادر و نایاب پر یوں اپنا سر پیٹ کر رہ گیا ہوں۔ چاہیے کہ کچھ با ذوق، با شعور احباب سے بھی اس باب میں مشورہ کروں۔ یہ سوچ کر چند دوستوں سے رجوع کیا۔ ان میں سے ایک تو اس دور کے جانے پہچانے بلکہ مانے ہوئے نقاد ہیں۔ مگر اس بھول بھلیاں کو نہ کوئی سمجھا نہ سمجھا سکا۔ میں نے ان صاحبان سے عرض کیا کہ ان غزلوں میں اگر کسی مصرع یا ٹکڑے پر آپ کو شاعری کا دھوکہ ہو تو مجھ ہیچ مدان اور کم فہم کو بصیرت بخشیں مگر اس حمام میں سب ننگے نکلے، بلکہ ایک دو سخن فہم و سخن سنج دوستوں کی حالت

ان اشعار کو پڑھ کر ایسی غیر ہوئی، ان کے چہرے کے نقوش کی ہیئت ایسی بدلی کہ میں اپنی حرکت پر سخت پشیمان ہوا کہ کیوں ان کو اس امتحان میں ڈالا ان اشعار سے ملتے جلتے اشعار سنانے والا ایک ظفر اقبال ہی کیا کم تھا کہ آپ نے مظفر علی سید اور ناہید شافی کو بھی داخل نصاب کر لیا۔ ظفر اقبال کو تو اس لئے برداشت کیا جا سکتا ہے کہ اس نے "آبِ رواں" میں چھپی ہوئی غزلیں بھی لکھی ہیں، مگر ان دوسروں کو کس خوشی میں ذہن پر جا کر زقی کی اجازت دی جائے۔ اگر یہ اذیت مجھ تک ہی محدود رہتی تو میں لب کشائی نہ کرتا مگر ستم یہ ہے کہ اس خرافات کو ایک مستند ادبی صحیفہ میں جگہ دی گئی ہے۔ ہماری جو نسل ابھی اکتساب کی منزل میں ہے، وہ اس مواد کو معیار سمجھے گی تو قوم کا ادبی شعور دیوالیہ ہو جائے گا۔ میں اسے ایک سازش سمجھتا ہوں اور اس کے خلاف آواز بلند کرنا میرا قومی فرض ہے۔

اگر ان شعر نویسوں نے اپنی یہ غزلیں "فنون" کو تحفتاً بھیج ہی دی تھیں تو کیا ضرور تھا کہ انہیں بھی فن پارہ سمجھ کر "فنون" اپنے ماتھے پر آویزاں کر لیتا۔ یہی کافی تھا کہ ندیم جیسے شاعر نے ان کا مطالعہ کامیابی سے کر لیا ہے۔ ان کے لکھنے والوں کے لئے یہی سعادت کم نہ ہوتی —— بلکہ ناہید شافی نے تو آپ کو لکھ بھیجا تھا:

خود پڑھو، خود کو سناؤ اور پھر دریا کرو

کہ ہمارا شعر و ادب کس بے بسی کے عالم میں ہے اور کیسی کیسی تحریریں "فنون" میں شامل ہو رہی ہیں۔

دوسری گزارش جو مجھے کرنی ہے وہ آپ کی وساطت سے اپنے دوست انور خواجہ کے لئے ہے۔

انور خواجہ کا مضمون میں نے دلچسپی سے پڑھا کہ اختلافات کے زمرے میں جو چیز آئے وہ بہرحال بحث و تمحیص کی چیز ہوتی ہے اور اس سے سمجھ بوجھ کی نئی نئی راہیں کھلتی ہیں۔ اور چونکہ مدعی اور مدعا علیہ دونوں سے شناسائی ہے، اس لئے یہ بھی جاننے کو جی چاہا کہ ایک دوسرے کے بارے میں کیا لکھتا ہے۔ یہ مضمون دیکھنے سے محسوس ہوا کہ انور خواجہ نے زیادتی کی ہے۔ معلوم نہیں انہوں نے فتح محمد ملک کے مضامین خود پڑھ کر رائے قائم کی ہے یا اِدھر اُدھر سے ٹکڑے جمع کر کے داستانِ شوق مکمل کی ہے۔ یہ شک مجھے مندرجہ ذیل عبارت پڑھ کے ہوا،

"اس تبصرے میں بھی بات ترقی پسندوں کے کوسنے سے شروع ہوتی ہے، جیسا کہ فاضل نقاد کا انداز ہے ترقی پسندوں کی انتہا پسندی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ احمد فراز نے بھی اسی فضا میں آنکھیں کھولیں اور متاثر کس سے ہوئے؟ —— حفیظ جالندھری، راشد، باقی صدیقی اور ناصر کاظمی سے —— حالانکہ ان میں سے کوئی بھی ترقی پسند نہیں۔ یہ خوب ہوا کہ ان کی شاعری تو ترقی پسندی کی فضا میں شروع ہوئی اور متاثر وہ غیر ترقی پسندوں سے ہوئے —— بیان کا تضاد ملاحظہ ہو —— ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ۔ ان مذکورہ شعرا میں ہر شاعر شعری اور فکری اعتبار سے ایک دوسرے سے قطعاً الگ ہے۔"

مگر فتح محمد ملک نے کب کہا ہے کہ ان شعرا میں ہر شاعر شعری اور فکری اعتبار سے ایک دوسرے سے قطعاً الگ نہیں ہے۔ احمد فراز کی "دردِ آشوب" پر فتح محمد ملک کے تبصرے کو جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں (اور اس میں نہ سمجھ آنے والی کوئی بات بھی نہیں ہے) ان فقروں میں جن کی طرف انور خواجہ نے اشارہ کیا ہے، بجائے مذمت کے فراز کی شاعری کی تعریف کی گئی ہے، اور اس کے ضمن میں یہ اچھا پہلو بیان کیا گیا ہے کہ اگرچہ فراز نے اپنی شاعری کی ابتدا ترقی پسندوں کی گھٹی ہوئی فضا میں کی مگر اس نے دوسرے صحت مند اثرات کو بھی قبول کیا اور ایسے لکھنے والوں سے بھی جو ترقی پسند نہیں تھے، اکتسابِ فیض کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بت سے ساتھی جہاں تھے وہیں رہے اور فراز آگے

بڑھ گیا۔ یہ بات بڑی صاف ہے اور تبصرے میں کھلے کھلے الفاظ میں اس کا اظہار کیا گیا ہے۔ معلوم نہیں انور خواجہ کو اس میں "ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ" والی کیا بات نظر آئی۔

اسی طرح مختار صدیقی پر فتح محمد ملک کی تحریر کا جائزہ لیتے ہوئے انور خواجہ نے لکھا ہے:

"اس بات کا راز افشا نہیں ہوتا کہ ذات کے پیدا پہلو اور پنہاں پہلو کیا بلا ہیں ...... حسن کی تباہی تو سمجھ میں آتی ہے مگر تباہی کا حسن کیا ہوتا ہے!"

اے مرد ہوشمند! اگر تجھے ان "بلاؤں" کا کچھ ادراک نہیں ہے تو ایسے مسائل میں اُلجھنا کیا ضرور ہے۔ ارے بھائی، یہ شعر و سخن کی بات ہو رہی ہے، دوا اور دو چار والا معاملہ نہیں ہے۔ تو کن اُلجھنوں میں گرفتار ہو گیا؟

میں فراز کو بہت اچھا شاعر سمجھتا ہوں مگر ایک لمحہ کے لئے بھی اس بے معنی دعویٰ پر کان نہیں دھر سکتا کہ اس کی شاعری خلا میں پروان چڑھی ہے اور وہ اپنے پیش روؤں یا ہم عصروں سے متاثر نہیں ہے۔ اگر فتح محمد ملک کی رائے میں اس کے بعض شعروں میں ندیم کا رنگ جھلکتا ہے تو کون سی قیامت برپا ہو گئی۔ وہ اس کے باوجود ندیم تو نہیں ہے، فراز ہی ہے اور رہے گا۔

اب اور کیا لکھوں ان کے سارے مضمون کا یہی حال ہے۔

جمیل ہمدم (پشاور)

انور خواجہ، فتح محمد ملک، احمد فراز

سُنا ہے اُردو زبان پہ فارسی زبان کا بہت گہرا اثر ہے۔ بعد میں انگریزی اور اُردو زبانیں بھی ایک دوسرے سے متاثر ہوئیں کئی اُردو الفاظ انگریزی زبان کا جزو بن گئے۔ اور اردو زبان نے بھی کئی انگریزی الفاظ کو اپنے آپ میں سمو لیا۔ کہتے ہیں کہ زبانیں بیرونی اثرات کو، بمقابلہ افراد کم قبول کرتی ہیں۔ مگر یہ طے ہے کہ وہ یہ اثرات قبول ضرور کرتی ہیں۔ جب ان زبانوں کو بولنے اور لکھنے اور پڑھنے والے ذہن اثر قبول کرتے ہیں تو ظاہر ہے کہ زبانیں بھی متاثر ہوں گی۔ اسی سوچ نے مجھے انور خواجہ کے مضمون "اردو ادب کا ایک نیا مفسّر" (مطبوعہ "فنون ۲۹") پر قلم اٹھانے کی دعوت دی ہے۔

"دردآشوب" پر فتح محمد ملک کا تبصرہ جو انہوں نے "احمد فراز کی موجودگی میں پڑھا تھا" میں نے دو وجہ سے نہایت غور سے پڑھا۔ ایک تو اس لئے کہ مجھے فراز کی شاعری سے پیار ہے، اور دوسرے اس لئے کہ میری نظر میں فتح محمد ملک اردو کے ایک ایسے اُبھرتے ہوئے نقاد ہیں جن کی تحریریں افسانوں کی طرح نہایت شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ ان میں نقادوں کی یبوست نہیں ہے۔ پھر پڑھے لکھے لوگوں کا یہ کہنا بھی ہے کہ ان کی واضح خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی رائے دوسروں کی آراء کو بنیاد بنا کر قائم نہیں کرتے بلکہ عام نقادوں کے برعکس اپنے دماغ کو بھی استعمال میں لاتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ میرے پسندیدہ شاعر احمد ندیم قاسمی کے متعلق بہت اچھی اور اونچی رائے رکھتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ ترقی پسند ادب کی تحریک کی شد و مد سے مخالفت کرتے ہیں۔ ایک ابھرتے ہوئے نوجوان میں ایسے نقاد کی موجودگی کوئی ایسی اچنبھے کی بات نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ جس طرح آج وہ ندیم کی عظمت کے قائل ہو گئے ہیں۔ اسی طرح کل ترقی پسند ادب کی تحریک کے عظیم مقاصد اور عظیم کارناموں کا بھی اعتراف کر لیں۔

جناب انور سدید خواجہ اردو کے نئے افسانہ نگاروں میں ایک مقام رکھتے ہیں۔ فتح محمد ملک کے متذکرہ تذکرے کے علاوہ انہوں نے ملک صاحب کے ان مضامین کو بھی اپنے مضمون میں آڑے ہاتھوں لیا ہے جو "فنون" میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ حیرت ہے کہ ان سب مضامین کے نقائص انور سدید خواجہ صاحب پر صرف اس وقت کیوں منکشف ہوئے جب "فنون" میں "دردِ آشوب" پر ملک صاحب کا تبصرہ شائع ہوا! —— چلئے یوں فرض کر لیجئے کہ یہ تبصرہ پڑھ کر انہوں نے سوچا کہ اس نقاد کے غلط جائزوں کی قلعی کھولنے کا صحیح وقت یہی ہے مگر مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ ان کا لہجہ بہت درشت تھا۔ وہ یہی بات ذرا نرم اور زیادہ لطیف پیرائے میں بھی کر سکتے تھے، اور یہ پیرایہ زیادہ موثر بھی ہوتا۔ مثلاً انور خواجہ صاحب کے مضمون کا وہ حصہ لیجئے جس میں وہ فتح محمد ملک کو دلائل کے زور سے زیر کرنے کے بجائے ان پر الزامات کے گھونسوں اور مکوں کی بارش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مجھ جیسے نئے لکھنے والے کو خواجہ صاحب کی خدمت میں یہ درخواست کرنا ہے کہ وہ اتنی اچھی اور تعمیری اور دلچسپ ادبی بحث کو ذاتیات کی نذر نہ کریں اور ایک اہم فنی مسئلے کی صورت مسخ نہ کریں۔ یہ بحث صحت مندانہ انداز میں چلے گی تو قارئین کو بہت لطف آئے گا اور بہت کچھ حاصل ہوگا۔ فتح محمد ملک کے ادبی نظریات کو بھی کسوٹی پر کسا جا سکے گا۔ انور سدید خواجہ کے نظریات کو بھی منطقی دلائل سے نمٹنا پڑے گا۔ اور ہم ایسے نئے ادیب اور ادب کے قاری بھی سلیقے سے اظہار رائے کر سکیں گے۔

اب میں اپنے عریضے کی ابتداء میں دی گئی مثال اور انور خواجہ کے مضمون کے آخری حصے کی طرف آتا ہوں۔ فتح محمد ملک نے فراز پر ندیم سے "متاثر" ہونے کا "الزام" لگایا ہے اور انور خواجہ نے اس کی پوری قوت سے تردید کی ہے۔ انہوں نے اشعار کی تشریح میں کچھ ایسے الفاظ استعمال کئے ہیں (مجھے یہ پورے دکھ کے ساتھ لکھنا پڑ رہا ہے) جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فراز کے اشعار ندیم سے استفادے کا نتیجہ ہوں یا نہ ہوں۔ ندیم سے زیادہ بامعنی اور گہرے ہیں۔ اور یہ انداز انور خواجہ جیسے شعر فہم اور اچھے ادیب کو زیب نہیں دیتا۔ قابلِ غور چیز یہ ہے کہ نہ صرف انور خواجہ کی تردید اس شمارے میں نظر آئی، بلکہ اسی شمارے میں احمد فراز کی دو غزلیں فیض کا گہرا رنگ لئے انور خواجہ کے مضمون کا ساتھ دیتی مل گئیں، اور یہی وہ مقام تھا جہاں پر مجھ جیسے "فراز پرست" کو قلم اٹھانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ سوچنے کی بات ہے کہ اگر زبانیں ایک دوسرے کا اثر قبول کر سکتی ہیں تو کیا دو افراد ایک دوسرے سے متاثر نہیں ہو سکتے جبکہ دونوں اچھائیوں کا مجموعہ ہوں؟ ندیم تو فراز سے بہت پہلے کا لکھنے والا ہے اور ہر نیا ادیب پرانے ادیب سے متاثر ہوتا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ آخر ندیم بھی تو غالب، درد، میر، حالی، اقبال اور فراق کی عظمتوں کا معترف ہے، اور بڑی بے تکلفی سے اور بے باکانہ انداز میں ان کے اثرات قبول کرنے کا اعتراف کرتا ہے۔

یہاں میں فتح محمد ملک اور انور خواجہ کو چھوڑ کر اپنے اچھے شاعر احمد فراز سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس کی بیس سالہ ریاضتِ فن نے جو کچھ اسے دیا ہے، وہ اس کا منفرد اور مخصوص لہجہ ہے۔ یہی اس کا فن ہے اور یہی اصل فراز ہے۔ یہ کوئی ایسی چیز نہیں جسے وہ چند معترضین اور چند دوستوں کی جھڑکیوں سے متاثر ہو کر کھو بیٹھے اور اپنے لہجے کا جھکاؤ فیض کی طرف کرے جو کہ پہلے ہی حافظ شیرازی کے اثرات سے مملو ہے۔ اگر اس نے ایسا کیا تو فراز اپنے آپ کو کھو دے گا۔ اگر ندیم سے متاثر ہونا بری بات ہے تو فیض سے متاثر ہو جانا کہاں کی عظمت ہے؟ —— میں ایک بار پھر اپنے اچھے شاعر سے اپنے لہجے کی تازگی اور انفرادیت برقرار رکھنے کی استدعا کروں گا۔

نجیب احمد (لاہور)

سید وقار عظیم　　فتح محمد ملک　　محمد کاظم　　ظہور نظر

تبصرے

انتظارِ موسمِ گُل (ناول)

تصنیف : رضیہ فصیح احمد
قیمت : قسم اول : ۶ روپے　قسم ۴/۵۰ روپے
ناشر : کلاسیک ، دی مال ، لاہور

قبائے ساز (مجموعہ کلام)

تصنیف : مصطفےٰ زیدی
قیمت : ۵ روپے
تقسیم کار : مکتبہ ادب جدید، پٹیالہ گراؤنڈ، میکلوڈ روڈ - لاہور

"انتظارِ موسمِ گُل" رضیہ فصیح احمد کا ایک اور ناول ہے۔ بڑی جلدی میں چھپے ہوئے اس ناول کے، جس کی ضخامت تقریباً تین سو صفحے ہے، موضوعات نہ گنوائے جائیں تو اس کے متعلق کسی طرح کی گفتگو قطعاً بے معنی ہو گی۔ اس لئے جلدی جلدی یہ سن لیجئے کہ ناول نگار نے اس میں کن کن باتوں کا تذکرہ کیا یا ذکر چھیڑا ہے۔ بات بچوں سے شروع ہوتی ہے، کہ عصمت نے ناول نگار خواتین کے لئے اس موضوع کو کہانی کا ایک لازمی سا موضوع بنا دیا ہے۔ اور بہت جلد اس معاشرے کے احوال تک پہنچ جاتی ہے جس نے رومان کے نئے نئے طریقے ایجاد کر لئے ہیں اور جس میں لڑکیوں کے لئے شرمانا اور لجانا اور لڑکوں کو ان سے قرب حاصل کرنے کے لئے مذاق کرنے کے مسئلے پر غور کرنا ضروری نہیں رہا۔ لیکن یہ تو صرف دو باتیں ہوئیں۔ ناول میں بے شمار باتیں ہیں، جن کی حیثیت ناول نگار کے لئے محض موضوع کی نہیں، مسائل کی ہے۔ محبت کا دائمی اور روائتی تثلیث (جو ختم ہونے لگتا ہے کہ کہیں مربع اور مستطیل نہ بن جائے)، پاکستان، اس کی جد و جہد کے مختلف مرحلے اور پاکستان کے حصول کے بعد پیدا ہونے والے بے شمار پیچیدہ مسائل۔ میر، غالب، مجاز اور فیض کی شاعری کے گہرے تاثرات کے علاوہ ذہن کے لئے جدید شاعری اور جدید مصوری کی پیدا کی ہوئی الجھنیں۔ دیہاتی زندگی اور اس کی غلاظت، گندگی اور جہالت کے باوجود وہاں کی بعض چیزوں اور وہاں کے مناظر کے حسن اور زندگی کی سادگی کی کشش، زمیندار اور کسان، غریب اور امیر کا فرق، مغرب زدہ معاشرہ۔ اس کی لائی ہوئی انوکھی قدریں، جنہیں ہم آج بھی اپنی قدروں میں سمونے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ کانونٹ کی وضع کے مدرسے، تعلیم و اس کے نظام میں انگریزی زبان کے لئے برتری اور تفوق کا مقام اور اردو کے ساتھ بیدردانہ بے رخی اور بے اعتنائی۔ گھریلو زندگی اور اس میں مرد اور عورت کا وہی پرانا فرق۔ سائنسی عہد کی برکتیں اور لعنتیں۔ ہمارے معاشرے میں اصلاحی اقدامات۔ زمینوں کی ملکیت اور اجارہ داری کا معاملہ، پھیلتے اور ابھرتے ہوئے معاشرے میں ٹریکٹر، کارخانے، اٹیم، بیراج اور ایسی بہت سی چیزیں اس چھوٹے سے ناول کے مسائل ہیں، جن میں گھرا ہوا انسان فرار اور مدافعت میں سے کسی کو ترک یا اختیار کرنے کی کشمکش میں مبتلا ہے اس لئے خوش بھی نظر آتا ہے اور بیزار بھی اور زندگی کے

دو غلے پن (یہ لفظ مصنفہ کا ہے) یا دوزخی سے بدمزہ بیکار بھی نہ ہے اور لاچار و بے بس بھی۔ یہ سب اس اوسط سائز کے ناول کے موضوعات ہیں لیکن میرے لئے ان سب کے نام گنوانا اس لئے ضروری تھا کہ یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ دنیا کی ہر چیز کو ایک ہی ناول کا موضوع بنانا ناول نگار کے لئے دانش مندی یا فن کاری کی بات نہیں، مجھے کہنا یہ تھا کہ رضیہ فصیح احمد نے اس غیر حقیقت پسندانہ اور غیر فن کارانہ روش کو اختیار کر کے بھی ایک ایسا ناول لکھ دیا ہے جس میں وہ الجھاؤ پیدا نہیں ہوئے جو اس صورتِ حال میں پیدا ہو جانے لازمی تھے۔ اس کی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ انھوں نے طویل بات کو اختصار کے ساتھ کہہ سکنے کی عادت ڈال لی ہے۔ اور بات کو بیان کی اسی حد کے اندر رکھا ہے جو اس کے لئے ضروری تھی۔ سیدھی سادی روزمرہ سے کام چلایا ہے، مکالموں کو مناظرہ بننے سے محفوظ رکھا ہے، خواہ مخواہ نئی طرح کی بات کہنے کی کوشش اور ضرورت محسوس نہیں کی، گو کبھی کبھی اس طرح کے ایسے جملے بھی لکھ گئی ہیں جن کی داد دینے کو جی چاہتا ہے اور ایسے الفاظ بھی استعمال کر گئی ہیں جنھیں لوگ بھولتے جا رہے ہیں لیکن ناول ختم کر چکنے کے بعد پڑھنے والا اپنے آپ سے یہ سوال پوچھتا ہے کہ یہ ناول کیوں لکھا گیا؟ اور جب اسے کوئی معقول جواب نہیں ملتا تو وہ یہ سوال ناول نگار سے پوچھتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ ناول نگار کے پاس بھی اس جواب کے سوا شاید ہی کوئی جواب ہو کہ ناول میں نے خود نہیں لکھا، مجھ سے لکھوایا گیا ہے۔

اس کے برخلاف جب کوئی مصطفےٰ زیدی سے یہی سوال کرنا چاہے (جن کی غزلوں اور نظموں کا قابلِ رشک حد تک حسین اور دیدہ زیب مجموعہ "قبائے ساز" دوسری کتاب ہے جس کے متعلق مجھے اظہارِ رائے کرنا ہے) تو اسے یہ سوال پوچھنے سے پہلے ہی اس کا جواب مل جاتا ہے اور "قبائے ساز" کے پہلے صفحے سے آخری صفحے تک برابر اسے اپنے سوال کا جواب ملتا رہتا ہے۔ "قبائے ساز" کے مصنف کا بڑا واضح جواب میرے نزدیک یہ ہے (یہ محض میرا قیاس ہے) کہ میں نے جو کچھ کہا ہے اس لئے کہا ہے کہ میرے دل کا مطالبہ تھا کہ میں یہ کہوں اور اس لئے آپ کو یہ بات پسند ہو یا نہ ہو کہ میری ایک نظم کا موضوع "ایر ہوسٹس" ہے۔ میں نے یہ نظم اس لئے لکھی کہ ایر ہوسٹس کے لہجے میں ترغیب کا ایک نازک پہلو نہاں تھا، اور میں نے "طیارہ" کو اس لئے اپنی نظم کا موضوع بنایا کہ یہ میرے عہد کی بلندی اور رفتار کی علامت ہے۔ موضوع کے لحاظ سے دیکھا جائے تو "قبائے ساز" کی سب سے بڑی اہمیت، اس کی وہ حقیقت بینی ہے جس نے اسے تشکک کی شاعری، حال احوال کی شاعری، نئی آبادیوں کے دکھ درد کی شاعری، بہار کی نوحہ خوانی کی شاعری اور امید نوروز کی شاعری بنایا ہے، اور میرے نزدیک سب سے بڑھ کر یہ کہ رازوں کی سرگوشی اور تنہائی کے احساس کی شاعری بنایا ہے —— موضوعات کی یہ ہمہ سمتی، جسے خود شاعر نے نہ جانے کیوں بے سمتی کہا ہے، اس کے اس فن کارانہ خلوص کا نتیجہ ہے جسے میں محض ودیعتِ الٰہی کہتا ہوں یہ ودیعت اور اس کے ساتھ ایک اور نعمت جو اکتسابی ہے (جس کا ممکن ہے شاعر کو احساس نہ ہو) اپنی شاعرانہ روایت کے ایک خاص رخ کے ساتھ اس کی گہری وابستگی ہے، جس کی دو عظیم کڑیاں انیسؔ اور جوشؔ ہیں —— ان دونوں چیزوں نے کہ ایک اللہ کی دین ہے اور دوسری شاعر کا تعلق خاطر اس سے بارہا ایسی شاعرانہ تصویریں بنوائی ہیں کہ دیکھنے والا حیرت زدہ رہ جاتا ہے کہ یہ الہامی تصویر آخر کیسے بنی ہو گی اور اس کے قلم سے کہ جس کی تقدیس اس کے فن کے آداب میں شامل ہے، ایسے شعر اور مصرعے نکلوائے ہیں کہ آدمی انھیں الہام کہہ دے تو اسے کوئی گناہ تصور نہیں کیا جائے گا۔ صرف چند شعر اور مصرعے سن لیجئے:

زندگی دھوپ کا میدان بنی بیٹھی ہے

کونپلیں ریت سے پھوٹیں گی سر دشتِ وفا

نغموں کا تلاطم تھا کہ تغییر دو عالم ہر گیت کا اک گھیر تھا ہر دل کا اک قد

وہ زخم جس کو کیا نوکِ آفتاب سے چاک اسی کو سوزنِ مہتاب سے رفو کرتے

کھڑکیوں کے ڈرے ہوئے چہرے اپنی آہٹ سے کانپ جاتے ہیں

کوئی باقی نہیں اب ترکِ تعلق کے لئے وہ بھی جا کر صفِ احبابِ گریزاں سے ملا

میں اک سراب کی خواہش پہ بیچ آیا ہوں تمام بادہ و ساغر، تمام تشنہ لبی

جنوں سے رسم نہ رکھوں تو جاں سلگتی ہے طلب کا قرض اتاروں تو جسم جلتا ہے

کلی کے اذنِ تبسم کے ساتھ شرط یہ ہے کہ دیر تک کسی آغوش میں مہک نہ سکے

دنیا کی بے اصول عداوت تو دیکھئے ہم بوالہوس بنے تو وفا عام ہو گئی

مصطفٰے زیدی کی شاعری کا ایک خاص لہجہ ہے اور اس لہجے میں دو واضح سطحیں ہیں جن میں سے ایک کی امتیازی خصوصیت ناصحانہ خطیبانہ اور تحکمانہ زور اور جوش ہے اور دوسری کی خصوصیت عاجزانہ مشفقانہ اور رازدارانہ ملائمت اور نرمی۔ یہ دونوں خصوصیتیں ان کی ذات، نفس، انا یا اگر میں یہ کہوں کہ "میں" کے دو حصے ہیں اور اس "میں" کو تکمیل کی جس منزل تک پہنچنے کے لئے مختلف مرحلے طے کرنے ہیں، شاعر بار بار وہاں تک پہنچتا ہے، اور یہاں فکر و خیال اور ذکر و بیان، سب میں صحیح قسم کا آہنگ بھی پیدا ہو جاتا ہے اور رچاؤ بھی لیکن "قبائے ساز" میں جا بجا فکر، خیال اور بیان کے وہ مرحلے بھی موجود ہیں جنہیں فن کے سفر کی منزلِ مقصود کے درمیانی اور ارتقائی مرحلے کہنا چاہیئے مگر خوشی کی بات یہ ہے کہ یہ سفر برابر جاری ہے اور شاعر میں اس اعلیٰ ترین منزل تک پہنچنے کی خواہش اور اُمنگ برابر زیادہ سے زیادہ نمایاں ہو رہی ہے۔ اور اس لئے میں "قبائے ساز" کو نظم و غزل کا ایسا مجموعہ کہوں گا جس کے بہت سے حصے روایت اور بغاوت کے بہترین عناصر کے حسین امتزاج کی نشان دہی کرتے ہیں۔

سید وقار عظیم

چلتے ہو تو چین کو چلیئے

مصنف: ابنِ انشا
ناشر: مکتبۂ دانیال کراچی
قیمت: چھ روپے

داتا گنج بخش کے عہد سے ہم سفر میں ہیں۔ داتا کے عہد سے لے کر ۱۸۵۷ء تک ہم اپنی تہذیب کے بالاتر ہونے کے جذبات لے کر

سفر کرتے تھے لیکن سن ستاون کے بعد سے ہم میں اپنے کمتر اور روبہ زوال ہونے کا احساس روبہ ترقی ہے۔ سر سید احمد خاں کے عہد میں ہمارے دانشوروں نے مغرب و مشرق میں تہذیب و تمدن کے گہواروں کا طواف کیا۔ نتیجہ یہ کہ سر سید نے 'مسافران لندن' اور شبلی نے سفرنامہ روم و مصر و شام لکھ کر ہمیں اسبابِ زوالِ امت کی طرف متوجہ کیا۔ پھر ہوا یوں کہ ہم مشرق کی راہ بھول گئے اور مغرب ہی کے ہو کر رہ گئے۔ سر عبدالقادر اور حافظ محمود شیرانی سے لے کر قرۃ العین حیدر اور محمود نظامی تک علم و حکمت کی جستجو یا سیر و سیاحت کا لپکا ہمیں مغرب ہی کی طرف لے جاتا رہا۔ اور مغربی علوم اور مغربی تہذیب کی چمک دمک سے ہماری آنکھیں خیرہ ہوا کیں۔ ہمارے اب مشرق کے نئے طلسمات نے بھی ہمیں صدا دی۔ اور ہمارے ہاں مشرق کی سرزمینوں سے متعلق سفرناموں کی رو بھی چل نکلی ہے۔ ابن انشا کا سفرنامہ "چلتے ہو تو چین کو چلیے" ان میں نمایاں مقام رکھتا ہے

یوں کہنے کو تو ۱۹۶۶ء میں ادیبوں کے ایک وفد کے ہمراہ ابن انشا پہلی مرتبہ چین روانہ ہوئے لیکن مجھ سے پوچھیے تو یہ ابن انشا کا چین کا تیسرا سفر تھا۔ پہلا سفر قدیم چین کا تھا جس کی سوغات چینی شاعری کے تراجم پر مشتمل ابن انشا کی خوبصورت کتاب "چینی نظمیں" ہے دوسری مرتبہ ابن انشا چین کے سفر پر اس وقت نکلے جب ظلم کے جنگل میں اسیر چینی عوام سامراج کے خلاف صف آرا ہو کر ماؤ کی فوجوں کو دعوت یلغار دے رہے تھے۔ اس مہم سے کامیاب واپسی پر ابن انشا جو گل مراد لائے وہ اب تک "چاند نگر" میں اپنی بہار دکھلا رہا ہے:

سڑکیں وہی ہیں اور سڑکوں کے موڑ وہی پر رفتہ رفتہ
اک شنگھائی دم توڑے ہے اک شنگھائی ابھر آئے (شنگھائی)

اور تیسری مرتبہ یعنی اب کے گذشتہ مہمات کے تجربات سینے میں چھپائے ابن انشا چین گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ:

چین نہ تو سرسری گذرنے کی چیز ہے نہ کوئی بند کتاب کہ ہم کوئی بات کہیں اور لوگ اسے عجوبہ یا جھوٹ گردانیں۔ وہ جو افیم کے نشے میں غین رہتے تھے اب ہر روز نیا ہائیڈروجن بم بناتے ہیں اور اس سے سامراج کی چھاتی پر مونگ دلتے ہیں یہ جادو ہے جو دشمنوں کے سر چڑھ کر بولتا ہے۔ ہم نے بھی چین کے متعلق بہت کچھ پڑھ رکھا تھا لیکن ۱۹۶۶ء میں چین جا کر دیکھا تو یہ کھلا کہ وہ کچھ بھی نہ تھا۔ یہ تو جہان دیگر ہے۔ ہمارا تو یہ قریبی ہمسایہ ٹھہرا اور آزمودہ دوست بھی۔ لہذا اس جہان نو کی کے سفرنامے کو جو "جنگ" میں بالاقساط چھپا لوگوں نے شرف قبول بخشا ہمیں اندازہ ہوا کہ لوگوں میں چین کے متعلق جاننے کی کتنی پیاس ہے۔

ہر چند یہ سفرنامہ پہلے پہل اخباری کالموں میں منظر عام آیا تھا مگر اس میں صحافتی انداز نظر کی بجائے فکری تازگی اور ادبی رکھ رکھاؤ بدرجہ اتم موجود ہے۔ ابن انشا کا گہرے میٹھے طنز کا حامل شگفتہ و شاداب انداز بیان اور انسان دوستی کا رچا ہوا شعور اس پر مستزاد ہے۔ بیان کہیں حکایاتی اور ڈرامائی ہے تو کہیں براہ راست اور بیانیہ۔ مگر ہر جگہ غیر ضروری تفصیل کی بجائے معنی خیز اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ تسخیر ذات اور کائنات کے انوکھے احساسات سے سرشار ہو کر چینی عوام نے گذشتہ سترہ برس میں جو مادی اور روحانی فتوحات حاصل کی ہیں ان کی مسحور کن روداد یوں بتائی گئی ہے کہ نئے چین کی تاریخی اور تہذیبی بنیادوں کے علاوہ شاندار مستقبل کی جھلک بھی صاف دکھائی دیتی ہے۔ اس سفر میں بھی قدم قدم پر اسباب زوال امت سامنے آتے ہیں۔ اور محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا زمانہ سر سید کے عہد سے جا ملا ہے مگر فرق یہ ہے کہ سر سید کے عہد میں ہم علمی پسماندگی کا شکار تھے تو آج عملی پسماندگی کا۔ پھر یہ بھی ہے کہ مغرب زدگان کے سفرنامے پڑھ کر ہم میں احساس کمتری پیدا ہوتا ہے اور

"چلتے ہو تو چین کو چلیے" سے اعتمادِ نفس بحال ہوتا اور بڑھتا ہے۔ شاید اس لیے کہ چین مشرق ہے اور مشرق ہم بھی ہیں۔
کتاب ماؤزے تنگ کے کلام کے تراجم اور زیدی کے کارٹونوں کے ساتھ نہایت عمدگی سے پیش کی گئی ہے۔
(ریڈیو پاکستان راولپنڈی سے نشر ہوا)

فتح محمد ملک

مکاتیب بہادر یار جنگ

ترتیب و اشاعت: بہادر یار جنگ اکادمی، کراچی صفحات: ۶۳۸ قیمت: دس روپے

نواب محمد بہادر خاں جو بعد میں ہمیشہ بہادر یار جنگ کے لقب سے موسوم ہوئے، ریاست حیدر آباد دکن کے ایک معزز جاگیردار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ جاگیر کی آمدنی معقول تھی اور آصف جاہی سلاطین کے انعامات و اعزازات کا سلسلہ اس کے علاوہ! چنانچہ بہادر خاں نے اپنے بچپن میں امیرزادوں کی سی نشو و نما اور تعلیم پائی لیکن جوانی میں قدم رکھا ہی تھا کہ ان کے والد — نواب نصیب یاور جنگ ثالث — جو اس زندگی میں ہمیشہ "اچھا وقت گذارنے" کے قائل رہے تھے، پانچ لاکھ کے قرض کا بوجھ اپنے یتیم بیٹے کے کاندھوں پر چھوڑ کر چل دیئے، اور نوجوان نواب محمد بہادر خاں کی زندگی میں اس کشمکش و پیکار کا آغاز ہوا جس کا رخ آگے چل کر ملی اور اسلامی مقاصد کی سمت ہو جاتا تھا اور جو ان کی زندگی میں آخر تک بڑے جذبہ و جوش کے ساتھ جاری رہی!

بہادر یار جنگ صرف چالیس برس جئے (۱۹۰۵ء — ۱۹۴۴ء) لیکن ہوش سنبھالنے کے وقت سے لے کر آخر دن تک ان کا ذہن اور مزاج یکسو رہا۔ انھوں نے ابتدائی عمر میں علومِ مشرقی کی تعلیم پائی تھی اور اس سلسلے میں اکابر علما کی صحبت کا فیض اٹھایا تھا۔ بعد میں وہ مغربی تعلیم کے حصول کے لیے پبلک سکول میں داخل ہوئے لیکن اس میں وہ ابھی میٹرکولیشن ہی کے مرحلے میں تھے کہ سلسلۂ تعلیم ترک کر دینا پڑا۔ ان کی اس مشرقی تعلیم اور صحبتِ اہلِ علم نے ان کی شخصیت اور مزاج کی تشکیل کی، اور ان کے اندر اسلام اور ملتِ اسلامیہ کی بہبود کے لئے ایک عمیق جذبہ، ایک سچی لگن اور وارفتگی پیدا کر دی۔
حیدر آباد میں انھوں نے ریاست کے مسلمانوں کی سب سے بڑی تنظیم "مجلسِ اتحاد المسلمین" کے معاملات کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور اسے ایک مذہبی جماعت کے مقام سے اٹھا کر مسلمانانِ حیدر آباد کی منظم، بااثر اور واحد سیاسی جماعت کا درجہ دے دیا۔ حیدر آباد سے باہر کی وسیع تر دنیا میں بہادر یار جنگ کو پہلے خاکساروں کی عسکری تنظیم اور اس کی حرکت و فعالیت نے کافی متاثر کیا اور وہ ایک عرصہ تک اس میں پورے جذبہ و خلوص کے ساتھ شامل رہے۔ یہاں تک کہ ۱۹۴۱ء میں جب ویلور جیل سے علامہ مشرقی کی خرابی صحت کی خبریں آنے لگیں تو بہادر یار جنگ نے وائسرائے ہند، مسٹر جناح اور نواب آف چھتاری وغیرہ کے نام تاروں اور مراسلوں کا ایک تانتا باندھ دیا، اور ان کی رہائی کے لیے ہر طرح کے جتن کر ڈالے، لیکن جب سے مسلم لیگ نے ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک الگ قوم قرار دے کر ان کے لئے ایک علیحدہ وطن کا مطالبہ پیش کیا تو ان کی ساری ہمدردیاں اس کے لئے خاص ہو گئیں۔ اس کے بعد انھوں نے خود کو ہمیشہ مسلم لیگی کہا، اور قائد اعظم کو برملا اپنا سیاسی رہنما تسلیم کیا۔

انگریزی دور میں ہندوستانی ریاستوں کے باشندوں کو عام ملکی سیاست میں حصہ لینے کی آزادی نہیں تھی۔ بہادر یار جنگ مسلمانانِ حیدر آباد کو مسلم لیگ کی تحریک کے ساتھ وابستہ کرنا چاہتے تھے۔ اس کا حل انھوں نے یہ نکالا کہ قائد اعظم کی رضامندی سے اسٹیٹس مسلم لیگ کے نام سے ایک متوازی تنظیم قائم کی، اور اپنی ولولہ انگیز قیادت میں اس کو بھی ایک زندہ اور متحرک تنظیم کی صورت میں مسلم لیگ کے شانہ بشانہ لے کر چلے۔ ان دنوں آل انڈیا مسلم لیگ کا جب بھی کوئی جلسہ ہوتا اس کے ساتھ بہادر یار جنگ کی ریاستی مسلم لیگ کا اجتماع بھی ضرور ہوتا، اور قائد اعظم اپنی

تقریر ختم کر چکنے کے بعد اعلان کرتے کہ اب اسٹیٹس مسلم لیگ کے بہادر یار جنگ آپ سے خطاب کریں گے۔ اس طرح ایک طرف ریاستی مسلمانوں کے لئے مسلم لیگ کے پروگراموں میں شامل ہونے کا دروازہ کھل گیا تھا اور دوسری طرف قائد اعظم کو بہادر یار جنگ کی شخصیت میں ایک ایسا جادو بیان مقرر میسر ہو گیا تھا جو قوم کو ان کی اپنی زبان میں خطاب کر کے ان کے دل مٹھی میں لے سکتا تھا ـــــ ایسے ایک خطیب کی قائد اعظم کو اس مرحلے میں اشد ضرورت تھی!

نواب محمد بہادر خاں کو "بہادر یار جنگ" کا خطاب ان کی اس بے مثل اور فسوں کار خطابت کے اعتراف کے طور پر ملا۔ محفل میلاد کی ایک تقریب تھی۔ بہادر خاں حیاتِ رسولؐ کا ذکر کر رہے تھے کہ اتنے میں خسروِ دکن آصف جاہ سابع آئے اور محفل میں شریک ہو گئے۔ انھیں دیکھ کر محفل میلاد کے خطیب نے بڑے مشتاقانہ انداز میں اپنی تقریر کا رخ موڑا اور خسرو وقت سے مخاطب ہوئے: "محمد عربیؐ کے اے تخت نشین و تاج پوش غلام! آ میں تجھے بتاؤں کہ اس شہنشاہ کونین کی نظر میں اندازِ ملوکیت کیا تھے۔" اور اس کے ساتھ ہی رسولِ خدا کی سیرت کے اس خاص پہلو کے واقعات ایک ایک کر کے ایسے موثر اور دل نشیں پیرائے میں بیان کرتے گئے کہ آصف جاہ کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور وہ بار بار زانو پر ہاتھ مارتے تھے اور "پھر ارشاد ہو، پھر ارشاد ہو" کہتے جاتے تھے۔ محفل کے خاتمے پر جب بہادر خاں نے آصف جاہ کو درباری آداب کے مطابق سلام کیا تو مارے فرطِ تاثر کے بادشاہ کی زبان گنگ تھی اور منہ سے ایک لفظ نہ نکلتا تھا! ـــــ دوسرے ہی روز محمد بہادر خاں "بہادر یار جنگ" کے خطاب سے سرفراز ہوئے، اور اس دن سے یہی خطاب ان کا نام بن گیا۔

اس خطاب کے سلسلے میں بہادر یار جنگ کی سیرت و کردار کا جو ارفع اور عظیم تر پہلو سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ جب انھوں نے آگے جا کر ملت کی فلاح و بہبود کا بیڑا اٹھایا اور اپنی زندگی ان سیاسی مقاصد کے لئے وقف کر ڈالی جن کو نظامِ دکن کی پسندیدگی حاصل نہیں تھی، تو انھوں نے نہ صرف "بہادر یار جنگ" کا خطاب بلکہ اس کے ساتھ اپنی تمام جاگیرات اور اعزازات بھی سرکار کو واپس کر دیئے اور پشتہا پشت کی امارت اور فارغ البالی کے بعد عسرت و تنگدستی کی زندگی کو گلے لگا لیا۔ کردار کی اس رفعت نے قومی رہنماؤں کی صف میں انھیں ایک ممتاز مقام عطا کیا، اور جب وہ اپنی ان غیر معمولی صلاحیتوں کے ساتھ مسلم لیگ سے وابستہ ہوئے تو نا ممکن تھا کہ قائد اعظم جیسے جوہری کی نگاہ سے ان کا صحیح مرتبہ و مقام اوجھل رہ جاتا!

گذشتہ برس کراچی میں قائد اعظم کے یوم پیدائش پر ایک تقریب منعقد ہوئی جس میں کچھ اشخاص نے قائد اعظم کے ساتھ اپنے تعلقات کی کیفیت بیان کر کے یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ وہ قائد اعظم کے قریبی دوستوں میں سے تھے اور ان کے یہاں ان کا بہت آنا جانا تھا۔ بیان کرتے ہیں کہ اس پر محمد حنیف آزاد، جو ہماری فلمی دنیا کے ایک جانے پہچانے فن کار ہیں اور جو پانچ برس قائد اعظم کی کار کے ڈرائیور رہے تھے، اپنے جذبات کو ضبط نہ کر سکے اور سٹیج پر آ کر بولے: "کچھ حضرات نے اپنی تقریروں میں اپنے آپ کو قائد اعظم کا قریبی دوست بتایا ہے۔ یہ قائد اعظم کا ڈرائیور ہی بہتر جانتا ہے کہ ان کا قریبی دوست کون تھا ـــــ ان کے قریبی دوست صرف ایک تھے اور وہ تھے بہادر یار جنگ!"

ہمیں آزاد صاحب کے اس بیان کو صحیح تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں لیکن اس کے ساتھ یہ بھی مان لینا چاہیے کہ اس دنیا میں قائد اعظم کا قریبی دوست ـــــ اس لفظ کے اصل معنوں میں ـــــ کوئی بھی نہیں تھا اور وہ اپنی ذات میں تن تنہا تھے۔ اس لئے کہ قائد اعظم کے نزدیک بہادر یار جنگ کا جو بھی مرتبہ ہو، ان دونوں میں سوائے قومی مقاصد اور سیاسی سطحِ نظر کے اور کوئی چیز بھی مشترک نہیں تھی۔ دونوں کی شخصیتوں میں مغرب و مشرق کا بُعد تھا اور محض قومی و سیاسی مقاصد کا اشتراک قلبی اور گہری دوستی کے لئے بنیاد نہیں بن سکتا!

ابھی کچھ دن ہوئے ایک مقامی روزنامے میں یہ سوال ایک تیز و تند مباحثے کا موضوع بنا رہا کہ آیا پاکستان میں اسلامی اور قرآنی نظام حکومت کا

قیام قائد اعظم کے پیشِ نظر تھا یا نہیں: اس ضمن میں قائدِ اعظم کی جو تقریریں پاکستان بننے سے پہلے اور بعد کی ملتی ہیں اُن میں اس سوال کا کوئی حتمی اور قطعی جواب نہیں پایا جاتا۔ ان کی دونوں طرح سے تاویل ہو سکتی ہے اور اس مباحثے کے فریقین بجا طور پر انہیں اپنے اپنے موقف کی تائید میں استعمال کرتے آئے ہیں ! ـــــ اس سوال کا ایک جواب نواب بہادر یار جنگ کے مکاتیب کے اس مجموعے سے بھی برآمد ہوتا ہے جو اس وقت ہمارے پیشِ نظر ہے! ـــــ اگر کوئی چاہے تو اس جواب کو بھی غور و اعتنا کے قابل سمجھ سکتا ہے۔ یہ جواب بہادر یار جنگ کی جن تحریروں سے مترتب ہوتا ہے وہ ان کے مختلف خطوط میں یوں سامنے آتی ہیں :-

مختصر یہ کہ ہندوستان کی تمام سیاسی کشاکش کا واحد حل جیسا کہ اوپر بیان کر چکا ہوں پاکستان کو سمجھتا ہوں اور میرے خیال میں پاکستان کے لئے ہر قسم کی سعی اور کوشش حرام ہے، اگر پاکستان سے الٰہی اور قرآنی حکومت مراد نہیں ہے جس میں قانون سازی کا بنیادی حق صرف خدائے قدوس کو حاصل ہو .... میں زندگی کے ہر گوشہ اور حیات کے ہر پہلو کے لئے قرآنی نظام کو کافی اور شافی سمجھتا ہوں، چاہے حیاتِ انسانی کا وہ گوشہ اخلاقی ہو یا علمی، اقتصادی ہو یا سیاسی، حالتِ امن سے متعلق ہو یا حالتِ جنگ سے! اور یہی وجہ ہے کہ میں نہ روسو کا قائل ہوں نہ کارل مارکس کا، نہ لینن کا قائل ہوں نہ ٹالسٹائے کا، نہ اینی بسنٹ کا قائل ہوں نہ گاندھی کا، اور اپنی اس بغاوت کا اقرار کرتا ہوں کہ اگر جناح اور مشرقی بھی اس کے سوا کوئی اور نظامِ حیات چاہتے ہیں تو ان کا بھی قائل نہیں ہوں۔"

(مکتوب ۱۶۲ بنام ایڈیٹر زمزم مورخہ ۲۷ / نومبر ۱۹۴۱ء)

"قاضی عیسیٰ صاحب کی تقریر اور نواب زادہ لیاقت علی خاں صاحب کی تائید کو سُن کر تعجب نہیں ہوا، کیونکہ لیگ موجودہ تمام لیڈر اسی ملتِ نامسلمان کے قائد ہیں جس کو دعوائے اسلام ہے .... آپ کو اور مجھے اگر ان کی ذہنیت بدلنا ہے تو ملت کی ذہنیت بدلنی ہوگی۔ یہ اتنے طاقتور نہیں ہیں کہ ملت کے عام رجحان کا مقابلہ کر سکیں ...... ہمارا کام صرف یہ ہے کہ ان مسلمان کہلانے والوں کے سامنے قرآنی دعوت: یا ایہا الذین آمنوا آمنوا باللہ پیش کریں اور اس کو مسلمان بنا کر مسلم لیگ کے ہائی کمانڈ کو بتا دیں کہ پاکستان کی اکثریت نہ اشتراکیت چاہتی ہے، نہ فسطائیت، نہ انگریزی کی پارلیمانی جمہوریت چاہتی ہے نہ ہندوؤں کی گاندھیت، بلکہ وہ اسلام چاہتی ہے، اور صرف اسلام!

.... آپ امام کی فکر نہ کیجئے۔ خدا نے ہمیشہ مسلمانوں کے لئے اس وقت امام پیدا کیا ہے جب کہ انتشار اپنی انتہا کو پہنچ گیا ہو۔ اگر پنجاب نے اقبال کی صورت میں گفتار کا امام پیدا کر دیا تو انشاء اللہ تھوڑے دنوں میں اس کی گفتار سے نسبت رکھنے والوں میں سے کوئی کردار کا امام بھی پیدا ہو جائے گا ...."

(مکتوب ۲۱۵ بنام حمید نظامی ایڈیٹر نوائے وقت مورخہ ۴ / فروری ۱۹۴۲ء)

"مسلم لیگ کے ساتھ اسی لئے ہوں کہ غیر شعوری طور پر اس کا قافلہ اس منزل کی طرف جا رہا ہے۔ پاکستان کے دستورِ حکومت کی تحریک اس سال کے اجلاس میں دو مرتبہ پیش کی گئی اور مجلس موضوعات نے اس کو قبل از وقت اور خلافِ مصلحت قرار دیا، لیکن یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس مقصد کو مقصدِ حیات سمجھنے والوں کا ایک خاصا بڑا گروہ لیگ میں پیدا ہو گیا ہے ...... آخری اجلاس کی آخری تقریر میری یاد و گرفتاں نہیں اس میں اس موضوع پر تفصیلی بحث رہی اور لیگ کے پلیٹ فارم سے اللہ نے میری زبان سے اعلان کرا دیا کہ پاکستان کا دستور الٰہی دستور اور وہاں کی حکومت قرآنی حکومت ہوگی، اور سب سے بڑھ کر قابلِ مسرت یہ کہ جب میں

دوران گفتگو جب اس مقام پر پہنچا تو قائد اعظم نے زور سے اور بڑے جوش سے میز پر مکا مار کر فرمایا تم بالکل درست کہتے ہو۔ اور میں نے فوراً اعلان کر دیا کہ قائد اعظم سے میرے قول پر سند تصدیق مل گئی ۔۔۔ ''

(مکتوب ۳،۷،۵ الف بنام مولانا محمد علی صاحب، مورخہ ۱۰؍ اپریل ۱۹۴۳ء)

کیا اوپر کی ان تحریروں سے جو مختلف وقتوں میں تین مختلف آدمیوں کو لکھی گئی ہیں، یہ حقیقت آشکار نہیں ہوتی کہ پاکستان بننے سے قبل مسلم لیگ کی ہائی کمان بشمول قائد اعظم ذہن میں پاکستان کے دستورِ حکومت کے بارے میں کوئی واضح تصور موجود نہیں تھا، یا کم از کم پاکستان کو اسلامی دستور پر چلانے کی کوئی تجویز ان کے زیر غور نہیں تھی۔ یہ بہادر یار جنگ اور ان کی طرز پر سوچنے والوں کی اپنی حکمت اور تدبیر تھی کہ انھوں نے حصولِ پاکستان کے مقصد کو بتدریج اسلامی حکومت کے قیام کی جدوجہد کا ہم معنی و مترادف قرار دیا، اور اس نعرے کی ہر دلعزیزی اور پبلک اپیل کے بل بوتے پر مسلم لیگ کی قیادت کو اسے بالآخر اپنا لینے پر مجبور کر دیا۔ اس طرح سے مسلم لیگ کو ان لوگوں پر حجت قائم کرنے کا موقع مل گیا جو پاکستان کی حمایت سے محض اس وجہ سے کھنچے ہوئے تھے کہ یہ صرف مسلمانوں کی ایک قومی اسٹیٹ ہوگی، اسلامی اسٹیٹ نہیں ہوگی۔۔۔۔ سوال یہ ہے کہ اگر ایک اسلامی اسٹیٹ کا تصور شروع ہی سے نظریۂ پاکستان کی بنیاد میں شامل تھا تو نواب بہادر یار جنگ کو اوپر کی تحریروں میں اپنے ان اندیشوں اور خیالوں کا اظہار کرنے کی ضرورت ہی کیوں پیش آتی!

بہادر یار جنگ کے مکاتیب کا یہ مجموعہ ان کے ۲۰۴ خطوط پر مشتمل ہے۔ جو دسمبر ۱۹۲۷ء سے لے کر جون ۱۹۴۴ء تک ساڑھے سولہ برس کی مدت میں لکھے گئے۔ یہ عرصہ ہندوستان اور حیدر آباد کے مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد کا ایک اہم اور پرآشوب دور تھا، اور نواب کے ان خطوط میں جو سیاست، حکومت، مذہب، علم و دانش کی بڑی بڑی شخصیتوں سے لے کر چھوٹے چھوٹے گمنام افراد کو لکھے ہوئے ہیں، اس دور کی سیاسی، مذہبی اور اجتماعی زندگی کی ایک تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ نواب کے ان خطوں کا اسلوب بہت صاف شفاف، رواں اور پابند موضوع ہے۔ یوں سمجھئے کہ جو اسلوب قائدِ اعظم کے انگریزی خطوں کا ہے قریب قریب وہی بہادر یار جنگ کے ان مکاتیب کا ہے۔ ان میں محض امرِ واقع اور مدعائے زیرِ بحث قسم کی باتیں ہی دیکھنے میں آتی ہیں۔ ایسے مکاتیب بہت قلیل اور شاذ ہیں جن میں لکھنے والے کی (یا مکتوب الیہ کی) ذات یا اس کی نجی زندگی کا کوئی زاویہ روشنی میں آتا ہو!

مکتوب نگاری آج ادب کی ایک صنف قرار دی جا چکی ہے اور انگریزی زبان میں خطوط کے بعض مجموعے (سڈنی سمتھ، ہوریس والپول، فٹز جیرلڈ) اپنی فنی قدر و قیمت اور ہر دلعزیزی میں بہت سی خالص ادبی تصانیف پر بھاری ہیں۔ لیکن مکتوب نگاری ادب کی تعریف میں جبھی آتی ہے جب مکتوب نگار اس میں تکلف کو بالائے طاق رکھ کر اپنی ذات کے غلافوں کو ہٹانے پر آمادہ ہوتا ہے، اور زندگی کے سنجیدہ مسائل کے ساتھ ساتھ اس کے ہلکے پھلکے پہلوؤں کے متعلق کچھ گپ بازی کرنے کو بھی اپنے لئے روا رکھتا ہے۔ ایسے مکاتیب اردو میں بھی بہت لکھے گئے ہیں؛ اگرچہ ان کے مطبوعہ مجموعوں کی تعداد بہت کم ہے۔ مرزا غالب، مہدی الافادی، محمد علی ردولوی اور منٹو کے خطوط اس اعتبار سے خالص ادب ہیں، اور اردو ادب کا ایک قابلِ تحفظ سرمایہ ہیں۔۔۔۔ افسوس ہے کہ بہادر یار جنگ کے ان مکاتیب کی خالص ادبی قیمت اس اعتبار سے زیادہ نہیں ہے لیکن ان کی سیاسی اور تاریخی اہمیت میں کس کو کلام ہو سکتا ہے، یہ خطوط بڑی محض دلچسپی اور شغل کے نقطۂ نظر سے بھی پڑھنے کی دیکھ چیز ہیں، اور قاری کچھ وقت کے لئے ان کے اوراق میں گم ہو کر نواب بہادر یار جنگ کی دنیا میں سانس لینے لگتا ہے، جس میں تبلیغ اسلام کی گہما گہمی ہے، تہذیبی اور معاشرتی مسائل کا ذکر اذکار ہے، کانفرنسوں اور جلسوں کا شور ہے، دستوری اصلاحات اور تعلیمی مسائل پر لے دے ہے۔ اور جس میں ہماری قد آور شخصیتیں مولانا ظفر علی خاں، قائد اعظم، مصطفےٰ نحاس پاشا، سید ابوالاعلیٰ مودودی، نواب محمد وٹ، خواجہ حسن نظامی، راج کماری

امرت کور، سرآرتھر یوتھیال، نضل داد، سدوزئی اور سیٹھ غلام محمد کلکتہ والا جیسے بھانت بھانت کے لوگوں سے ہوتی ہے ـــــ بہادر یار جنگ اکادمی نے خطوط کا یہ مجموعہ چھاپ کر ایک بڑی خدمت انجام دی ہے، اور کوئی شک نہیں کہ مستقبل کے مورخین کے لئے ایک اہم دستاویز مہیا کر دی ہے۔

مجموعے کی کتابت، طباعت اور گٹ اپ سب کچھ اول درجے کا ہے، اور اس لحاظ سے اس کی قیمت کچھ بھی زیادہ نہیں ہے۔ گرد پوش پر کوفی رسم الخط میں لکھا ہوا عنوان بہت جاذب نظر ہے، اور چھ سو صفحات کی اس کتاب کے آخر میں دو اشاریے (ایک بلحاظ موضوعات، دوسرا بلحاظ مکتوب الیہم) بھی شامل کر دیئے گئے ہیں جو ایک قاری کو اخذ و استفادہ کی بہت سہولت بہم پہنچاتے ہیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہماری تمام علمی و تحقیقی مطبوعات میں آخر کا یہ اشاریہ ایک جزوِ لازم قرار دیا جانا چاہیئے!

محمد کاظم

خلافتِ راشدہ اور جمہوری قدریں

تصنیف: رشید اختر ندوی
اشاعت: ادارۂ معارفِ ملی، میکلوڈ روڈ، لاہور
صفحات: ۱۰۶۴
قیمت: پچیس روپے

اس کتاب کا عنوان دیکھ کر جو تصور اس کتاب کے مضامین کے بارے میں قائم ہوتا ہے وہ کچھ یوں ہے کہ اس میں خلفائے راشدین کے عہد کے ان واقعات اور معاملات اور پالیسیوں کا تذکرہ ہو گا جن سے کوئی جمہوری قدریں متعین ہوتی ہوں گی اور قاری کو اس ضمن میں فکر و تجزیے کی کچھ گہرائیوں میں سے گذرنا پڑتا ہو گا ـــــ لیکن اس کتاب کے سمندر میں چند صفحے اترنے پر ہی پتہ چلتا ہے کہ اس میں ایسی کوئی بات نہیں ہے بلکہ نیچے کی زمین بالکل ہموار ہے، اور یہاں سے وہاں تک صرف کمر کمر پانی ہے ـــــ دوسرے لفظوں میں یہ خلفائے راشدین کے عہد کی اسلامی تاریخ کی ایک سیدھی سادی کتاب ہے جو نسبتہً زیادہ تفصیل سے تاریخ کی اصل کتابوں کے حوالوں کے ساتھ مرتب کی گئی ہے، اور جس میں مصنف رفتارِ واقعات پر بس کہیں کہیں تبصرہ کرتے جاتے ہیں!

ان حالات میں کتاب کا یہ نام رکھنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی، سوائے اس کے کہ دیکھنے والوں کو یہ تاثر دینا مقصود ہو کہ یہ تاریخ کی کوئی عام کتاب نہیں، بلکہ اس میں تجزیہ ہے، تحقیق ہے، تقابل ہے، نتائج کا استخراج ہے ـــــ جن میں سے افسوس ہے کوئی چیز بھی اس کتاب میں نہیں ہے!

لیکن اس غلط اندازِ تسمیہ سے قطع نظر کتاب کی افادیت اپنی جگہ موجود ہے۔ کتاب کے مصنف ندوۃ العلماء کے فارغ التحصیل فاضل ہیں اور ہمارے نزدیک ندوہ متحدہ ہندوستان کی وہ واحد درسگاہ تھی جہاں سے لوگ عربی زبان کا صحیح فہم و ذوق لے کر نکلتے تھے۔ پاکستان و ہند میں جن فضلاء کو عربی زبان میں اظہارِ مافی الضمیر پر غیر معمولی قدرت حاصل رہی ہے۔ ان میں سے اکثر و بیشتر کا تعلق بلا واسطہ یا بالواسطہ ندوہ سے ضرور دیکھنے میں آئے گا اس وجہ سے مصنف کو دوسرے تاریخ نگاروں کے مقابلے میں یہ امتیاز حاصل رہا کہ انھوں نے عربی زبان میں تاریخ کی امہات کتب (طبری، ابن کثیر، ابن خلدون وغیرہ) سے کماحقہ فائدہ اٹھایا، اور اپنی اس تصنیف کو زیادہ سے زیادہ جامع اور محیط بنانے میں کامیاب ہوئے!

مصنف کا اسلوب واضح سلیس اور دل نشین ہے لیکن ان کی فکری و ذہنی اٹھان، اور کیفیتِ خود اعتمادی ان کے ان بیانات سے جو کتاب کے شروع اور آخر میں دیئے ہوئے ہیں، کچھ اس طرح سے جھلکتی ہے:۔

"ضروری وضاحت: (صفحہ ۲) یہ سلسلۂ مکافاتِ عمل مصنف کی پہلی کڑی ہے، مصنف نے اپنے رب سے اس کے نبی

پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو شاہد بنا کر عہد کیا ہے کہ وہ اپنے گناہوں کی تلافی کے لئے دینِ حق اسلام کی اشاعت و تبلیغ کا کام زندگی بھر جاری رکھے گا۔"

"اعتراف: (صفحہ ۳) میں گو بہت گنہگار ہوں، میرے گناہوں کی نہ کوئی حد ہے اور نہ شمار، لیکن میں سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان غلاموں میں سے ہوں جنہیں حضورؐ کی غلامی پر فخر ہے اور جن کا عقیدہ ہے کہ مہر و ماہ کی ہزاروں لاکھوں گردشیں اس مادر گیتی میں کبھی بھی یہ صلاحیت ہرگز ہرگز نہ پیدا کر سکیں گی کہ کسی ایسے شخص کو متعارف کرائے جو سرورِ دو عالم جیسے اوصاف سے متصف ہو۔۔

میں نے اس کتاب کی تالیف میں پوری دیانت ملحوظ رکھی ہے اور اپنی طرف سے پوری کوشش کی ہے کہ لغزش مجھ سے نہ ہونے پائے (کسی اور سے بے شک ہو جائے؟)

تاہم میں آدم زاد ہوں، اور آدم زاد سے غلطی کا امکان ہے۔ اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہے تو میری معذرت اور ندامت کی جھولی ہر لحظہ ملت کے سامنے دراز ہے اور میں ملت کے ایک ایک فرد سے معافی کا طالب ہوں!"

ضروری وضاحت: (آخر میں) اگر کوئی بات سہواً غلط لکھی گئی ہو تو ہم ملت سے معذرت طلب کرتے ہیں اور اس کی تلافی آئندہ ایڈیشن پر کرنے کا وعدہ کرتے ہیں اور یقین دلاتے ہیں کہ جو کچھ ہوا خلوص کے باعث ہوا (نہ خلوص ہوتا نہ یہ ہوتا!) ہم ہرگز ہرگز گستاخ نہیں ہیں!"

تاریخ کے موضوع پر قلم اٹھانے کے لئے جس متانت اور ذہنی پختگی اور خود اعتمادی کی ضرورت ہوتی ہے اوپر کے یہ بیانات اور اعترافات اس کی کمی کا شکوہ کرتے نظر آتے ہیں۔ ہماری رائے ہے کہ کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں فاضل مصنف کسی اور چیز کی تلافی کریں یا نہ کریں، ان بیانوں اور وضاحتوں کو بے شک حذف کر دیں۔ اس سے کتاب کی ثقاہت پر اچھا ہی اثر پڑے گا!

اوپر کے ایک وضاحتی نوٹ میں مصنف نے اس کتاب کی تصنیف کو دینِ حق اسلام کی اشاعت و تبلیغ کی ایک کڑی قرار دیا ہے۔ بے شک اسلامی تاریخ کی تدوین و ترتیب دینِ حق کی نشر و اشاعت کے ہم معنی ہونی چاہئے، لیکن اس کے برعکس ایک تلخ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تاریخ کا مطالعہ اس بارے میں کچھ مختلف ہی اثر رکھتا ہے۔ میں دوسروں کی نہیں اپنی کہتا ہوں۔ میں نے ایک مسلمان اور دیندار گھرانے میں جنم لیا تھا، میرا لڑکپن ایسے ماحول میں گذرا جس میں نماز روزہ، اور قرآن و حدیث اور سیرت کی قیل و قال رہتی تھی، پھر میں نے عالمِ شباب میں اسلامی لٹریچر کا بغور مطالعہ کر کے اسلام کو شعوری طور پر اپنے لئے پسند کیا اور اس کی تعلیمات پر حتی الوسع چلنے کی کوشش کی ـــــ اس سارے پس منظر کے باوجود آج بھی اگر اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرنے بیٹھتا ہوں تو میرا ذہن شکوک و وساوس کی یلغار سے نہیں بچ سکتا۔ خلافتِ راشدہ کا دور اسلامی تاریخ کا زریں دور کہلاتا ہے، لیکن اس دور میں جو واقعات خصوصاً آخری دو خلفاء کے زمانے میں پیش آئے، ان کی تفاصیل میں جا کر کسی بھی سوچنے والے مسلمان کا ذہن دھچکا کھائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ یکایک یہ سب کچھ کیسے ہو گیا اور کیوں ہو گیا! ـــــ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ ہماری تاریخ کے اس دور کے جو واقعات مختلف روایتوں سے مشہور ہیں، ان کو صرف مدون کر دینا ہی کافی نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ایک ایسے رواں تبصرے اور تجزیے کی بھی ضرورت ہے جو قاری کو ساتھ کے ساتھ یہ بتاتا چلے کہ ایک خاص واقعہ کیونکر ظہور میں آیا اور اس کے پیچھے کون کون سے عوامل ـــــ تاریخی، معاشی، سماجی، انفرادی ـــــ کار فرما تھے! ایسے تجزیے میں ظاہر ہے اس دور کی بعض مقتدر شخصیتیں بھی تنقید کی زد میں آ سکتی ہیں۔ لیکن تاریخ کے صحیح اور دیانتدارانہ مطالعہ کے لئے اس سے مفر نہیں ہے۔ ہمیں آج نہیں تو کل یہ کام کرنا ہی پڑے گا!

تاریخ کی اس طرح کی تصنیف کے لئے جس فلسفیانہ اور ابن خلدونی ذہن کی ضرورت ہے وہ خدا جانے کب پیدا ہوگا، اور کبھی پیدا بھی ہوگا یا نہیں۔ جب تک ایسا نہیں ہوتا ہم تاریخ کے مطالعے کو تعلیم و تعلم کی ایک ناگزیر ضرورت تو کہہ سکتے ہیں، اسے دینِ حق کی اشاعت کا ایک ذریعہ شاید قرار نہ دے سکیں   اسلامی تاریخ کی کتاب آخری کتاب ہوگی جو میں ایک غیر مسلم یا نومسلم کو پڑھنے کے لئے دوں گا!

"خلافتِ راشدہ اور جمہوری قدریں" پہلے چار خلفا کے دور کی فتوحات اور جنگی مہمات کی ایک مبسوط تاریخ ہے جس کا مطالعہ کوئی شک نہیں کہ ایک خاص دلچسپی کی چیز ہے، اور بعض مقامات پر تو اس میں ناول اور افسانے کا سا کیف پیدا ہو جاتا ہے لیکن اتنی تفصیل میں چلے جانے کے باعث فاضل مصنف کا اپنا تاریخی نقطۂ نظر اور شخصی رجحان متعین نہیں رہ سکا۔ یوں لگتا ہے کہ تاریخی واقعات کا یہ پُرزور بہاؤ ان کے قابو میں نہیں رہا، اور وہ خود اس کی رَو میں بہتے چلے گئے ہیں!

"ادارۂ معارفِ ملی" میکلوڈ روڈ لاہور جس نے یہ کتاب شائع کی ہے ہمارے اس شہر کا ایک علمی ادارہ ہے جس کے صدر سابق چیف جسٹس جناب محمد منیر ہیں اور جس کے ایڈیٹروں میں احسان دانش اور رئیس احمد جعفری جیسے مشاہیر شامل ہیں۔ لیکن اسے نشر و اشاعت کا نقص کہیں یا اپنا قصورِ علم کہ اس ادارے کے متعلق ہماری معلومات اب تک بالکل صفر ہیں۔

ہمیں بہر صورت اس ادارے کے عزم و استقلال کی داد دینی ہے کہ اس نے تاریخ جیسے اہم اور نازک موضوع پر مستند روایات اور معلومات کا اتنا بڑا ذخیرہ یکجا کر دیا ہے!

محمد کاظم

نئے نام (انتخاب)

مرتب کرنے والے: شمس الرحمٰن فاروقی، حامد حسین حامد   ناشر: شب خون کتاب گھر ۳۱۳۔ رانی منڈی الہ آباد (بھارت)

قیمت: چار روپے

"نئے نام" پاکستان کے تین اور ہندوستان کے ان تمام جدید تر شعرا کی نظموں اور غزلوں کے انتخاب کا نام ہے جن کو مرتبین کے خیال میں ۱۹۶۰ء کے بعد جانا پہچانا گیا ہے یا جانے پہچانے کی کوشش کی گئی ہے۔ مرتبین کے نام شمس الرحمٰن فاروقی اور حامد حسین حامد ہیں۔ فاروقی صاحب کا وطن اعظم گڑھ، تاریخ پیدائش ۳۰ ستمبر ۱۹۳۵ء، تعلیم ایم۔اے، پیشہ سرکاری ملازمت اور حامد صاحب کا وطن الہ آباد، تاریخ پیدائش جون ۱۹۳۲ء (تاریخ نہیں دی گئی)، تعلیم بی۔اے اور پیشہ سرکاری ملازمت ہے۔ یہ کوائف فلیپس پر سرورق کے اندر کی طرف پلٹنے والے دونوں حصوں پر سرخ رنگ کے ساتھ جلی حروف میں چھپی ہوئی ہیں۔ ظاہر ہے ان کوائف فلیپس سے یہ اندازہ لگانا ممکن نہیں کہ اردو ادب میں مرتبین کا عمل دخل کب سے شروع ہوا۔ البتہ انتخاب کے آغاز میں فاروقی صاحب نے "ترسیل کی ناکامی کا المیہ" اور حامد صاحب نے کچھ اصولِ انتخاب کے بارے میں لکھ کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ دونوں حضرات دور کی کوڑی لانے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ اس اعتراف کے ساتھ ساتھ یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ انتخاب بڑی محنت سے کیا گیا ہے۔ اٹھاسی نظموں اور ستائیس غزلوں پر مشتمل اس انتخاب کو بلاشبہ ہندوستان کے جدید تر شعرا کا نمائندہ مجموعہ کہا جا سکتا ہے۔ "نئے نام" کے اکثر ناموں سے پاکستان کے پڑھنے والے شناسا ہیں۔ یہاں کے ایک دو پرچوں میں تو انہیں خاصے اہتمام کے ساتھ چھاپا جاتا ہے۔ احمد ہمیش، باقر مہدی، بشیر نواز، بشیر بدر، بلراج کومل، بمل کرشن اشک، زبیر رضوی، شاذ تمکنت، شہاب جعفری، شہریار، عادل منصوری، عمیق حنفی، فضیل جعفری، قاضی سلیم، کمار پاشی، محمد علوی، محمود ایاز، مصحف اقبال توصیفی، مظفر حنفی، ناہید خانی اور ندا فاضلی وغیرہ پاکستان کے رسائل میں اکثر دکھائی دیتے ہیں۔ ان ناموں کا ذکر میں نے خاص طور پر

کہا ہے تاکہ تبصرہ پڑھنے والے کے ذہن میں بھی ان ناموں کی وساطت سے وہ مانوس فضا پیدا ہوسکے جو دراصل خاصی نامانوس ہے۔ اس طرح مجھے "ارسال" اور قاری کو "وصول" کرنے میں آسانی رہے گی اور وہ مسئلہ پیدا نہیں ہوگا جسے فاروقی صاحب نے "ترسیل کی ناکامی کا المیہ" قرار دیا ہے اور وہی باتیں دُہرائی ہیں جو جدید تر شاعری کی پیدائش کے دن سے کہی جا رہی ہیں اور جن کا لب لباب، عام طور سے یہ ہوتا ہے کہ ترسیل اور ابلاغ ضروری نہیں کہ ضرور ہو جائے، جہاں لکھنے اور پڑھنے والے کی زبان، عقل، تخیل، تجربہ، مشاہدہ اور حس ایک جیسی ہوگی وہاں ہو جائے گا جہاں نہیں ہوگی وہاں نہیں ہوگا۔ شاعر کو کیا پڑی ہے کہ ایک تو وہ تخلیق کا کرب برداشت کرے، اوپر سے قاری کو سمجھانے کا دردِ سر بھی مول لے۔ دوسرے لفظوں میں شاعر کا مسئلہ صرف اظہار ہے جس کے اطلاق کی حد تک اُسے قاری کو تکلیف دینے کی آزادی بھی ہے۔ اگر یہ اظہار قاری کے ذہن میں نہیں سماتا تو شاعر اس کا ذمہ دار نہیں وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ مرتبین نے یہ بھی لکھا ہے کہ

"آج کا شاعر کسی خوش آیند مستقبل پر ایمان نہیں رکھتا۔ وہ تکنیک زدہ انتشار سے دوچار ہے اور تن تنہا بدلتے ہوئے حالات کے بھنور میں پھنسی ہوئی انفرادیت کی کشتی کو بچانے کے لئے مصروفِ عمل ہے۔ اس کے تمام تر روحانی اور مادی سہارے یکے بعد دیگرے جواب دیتے جا رہے ہیں۔ اس کے تجربات اور مسائل اس کے بزرگوں کے تجربات اور مسائل سے مطابقت نہیں رکھتے اس کے بزرگوں کو اس کی بات اور اس کے المیے کے سمجھنے میں تکلف ہے۔ اس لئے داخلی جھلاہٹ کے تاثرات کے ساتھ خود سے مصروفِ کلام ہوتے ہوئے بھی اپنے فن اور شخصیت کی حقیقت کو منوانے کے لئے مصر ہے۔" نئے نام کے مشمولات ایسی ہی کوشش کا نتیجہ ہیں:

یہ بات تو کسی حد تک ٹھیک ہے کہ نئے نام کے اکثر شعرا خوش آیند مستقبل پر ایمان نہیں رکھتے اور اپنی داخلی جھلاہٹ کو ۔۔۔ جسے میں بوکھلاہٹ کہوں گا ۔۔۔ فن منوانے پر مصر ہیں لیکن یہ فتویٰ آج کے تمام شعرا پر صادر نہیں کیا جا سکتا۔ آج بھی ایسے بے شمار نئے اور پرانے شعرا موجود ہیں جنھیں خوش آیند مستقبل پر یقین ہے اور ان کا کلام اس یقین سے بھرپور ہے۔ اب رہی یہ بات کہ آج کے شاعر کے تجربات اور مسائل اُس کے بزرگوں سے مطابقت نہیں رکھتے اور اُس کے بزرگوں کو اُس کی بات اور المیے کو سمجھنے میں تکلف ہے تو یہ ہر دور میں ہوتا رہا ہے۔ نئی نسل نے پرانی نسل سے ہمیشہ اختلاف کیا ہے لیکن ایسی ہذیانی کیفیت کا مظاہرہ کبھی نہیں کیا جسے جدید تر شاعری کی بنیاد بنایا جا رہا ہے۔ تبصرے کی طوالت کا خوف نہ ہوتا تو مرتبین کی اس "خود سے مصروفِ کلام" نثر پر چند سطریں اور بھی لکھی جا سکتی تھیں۔

اب میں "نئے نام" کے "شعری مشمولات" کی طرف آتا ہوں۔ چند نظموں کو چھوڑ کر باقی تمام نظمیں لایعنی اور لاینحل ہیں۔ کہیں کہیں ذہانت، فکر اور درد کی پرچھائیاں ضرور نظر آتی ہیں لیکن وہ اتنی مبہم اور بے سروپا ہوتی ہیں کہ ان سے کوئی تاثر لینا یا محظوظ ہونا قاری کے بس کا روگ نہیں۔ ایسی شاعری کے علمبرداروں کا کہنا ہے کہ آج کا شاعر چونکہ تخلیق کا کام باطنی احساس اور تحت الشعور سے لیتا ہے اس لئے ابہام کا ہونا لازمی ہے۔ مجھے اس سے اختلاف ہے۔ ایسا ہوتا تو انھیں شعرا کی لکھی ہوئی غزلوں کو بھی نظموں کی طرح بوالعجبیوں کی بھول بھلیاں ہونا چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں ہے۔ غزلیں اپنے تمام نئے پن کے باوجود پوری طرح سمجھ میں آتی ہیں۔ متاثر اور محظوظ بھی کرتی ہیں۔ اسی طرح انہی شعرا میں سے بعض کی نظمیں بھی سمجھ میں آجاتی ہیں۔ جانبداری پر محمول نہ کیا جائے تو اپنے اس یقین کا اظہار کروں کہ نظم کو گورکھ دھندا بنانے میں جدید تر شعرا کے تحت الشعور سے زیادہ شعور کو دخل ہے۔ وہ جان بوجھ کر بات اس انداز میں کہتے ہیں جس کا کوئی مطلب نہ نکل سکے تاکہ قاری اپنی بساط کے مطابق جو چاہے تصور کرکے انھیں فن کار مان لے۔ افتخار جالب کی نظم جس کا عنوان "نفس لامرکزیت اظہار (قدیم بنجر)" ہے کے چند ٹکڑے ملاحظہ فرمائیے:

میاوا لتعبیر چھینتے تند و تنگ ہجٹ کا آرتھرائٹس پٹھوں کی
اینٹھ تلخی دہن مزا کرکرا
قدامت پسند کاوس شبینہ درنفینہ
"شیفتہ مدور سیاہ و سورج کے درمیان
گرد باد تکذیب میں اُمڈتا ہے
گاہے چراہے میں پچکا چوند، مندمل زخم
خوفناک گمبھیر چشم بد دور تیرہ مجلس

حرام مغز امتحان میں ہے
شدید تھوڑ رکیس، درد ہر جوڑ متصل، ٹوٹنے کے لگ بھگ،
تراٹ اُٹھتی ہے
کیا تنگ ظرف شدہ الرجانیع تعظیم دل پھیپھڑے، سفید
خاکستری پھیپھڑوں میں دم بخود دائمی شراروں کی آنکھ آنگن
میں تنہا مرتی غنودگی کا شکار
تھا ئرائڈ غدود غلاظت تاب ٹھری ہے
برقی راتوں میں رونق رم نہیں جاتی، نہ جبلی وش خون تھرتھراہٹ
خفیف مدھم نڈھال ناگفتہ بہ، جسے ابھی تک ہمارے لفظوں
میں بار پانے کی آرزو ہے، وہ سانس نتھوں کے نیچے ٹھٹھرے
دمکتے ہونٹوں کی کپکپاہٹ میں غرق ہوتا ہے
آج کی رات گرم آوارگی سے محروم
چپ! ہوا ہواؤں میں غوطہ زن ہے"

کہیئے عنوان سمیت کچھ سمجھ میں آیا؟ مجھے تو یقین ہے کہ شاعر نے یہ سب کچھ جان بوجھ کر اور سوچ سمجھ کر لکھا ہے۔ لہذا وہ اس ذہانت بھری شرارت کی داد کا مستحق ہے اور اگر خدانخواستہ یہ حرکت شاعر کے لاشعور اور تحت الشعور نے کی ہے تو بصد افسوس کہنا پڑے گا کہ موصوف کا پیچ ڈھیلا ہے اور ذہن کی تہہ میں کثافت اور تعفن کے سوا کچھ بھی نہیں۔ آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ اس نظم میں ابہام کی دُھند سے کبھی کبھی کثیف لذتیت سے ڈھکی ہوئی جنس کا شائبہ بھی نظر آتا ہے۔ جنس کا ایسا تصور جدید تر شعرا کا محبوب موضوع ہے۔ انتشار اور گندگی کے موضوعات بھی انھیں بہت سوجھتے ہیں۔ چند نظموں کے اقتباسات ملاحظہ فرمائیے:

"جسم کے کپڑے تلے کچھ ہے کہ جس میں چیونٹیاں سی رینگتی ہیں
لال پیلی چیونٹیاں جن میں سے اک اک چھانٹ کر

ظلم کی بھٹی میں سلو، تب کہیں جا کر بدن ٹھنڈا پڑے گا
میں نے جب کپڑے پہن کر بے سبب زلفیں سنواریں، لب سنوارے
چیونٹیاں سی چل رہی تھیں،
اور اب تک چیونٹیاں سی چل رہی ہیں
آج جب میں درد کی دعوت میں شامل ہو رہی ہوں
کس لئے اس بے ضرر سی سرخ ٹیری لین کی ساری سے اپنا جسم ڈھانپوں
کل جو اس نے پیش کی تھی؟
داغ جو بے شلوار دینا
جس پہ پرسوں رات سنگھ کے ظلم کا پیارا نشاں تھا
اب جو مدھم پڑ گیا ہے"

(بمل کرشن اشک)

"تم سمجھتے ہو کہ جوتے نیم کی شاخوں پہ جھولا جھولتے ہیں
بیل پر کڑوے کریلے کی روپے کے نوٹ لگنے سے رہے
جاؤ ڈھونڈو کس جگہ کھو آئے ہو

جس طرح ہنس مکھ مجرد دوستوں کے ہونٹ پر ننگا بدن ہو،
بند کمروں کے لطیفے ہو رہے ہوں
اور کوئی شادی شدہ عورت، کسی ایک دوست کی بیوی
زباں پر بینگنوں کا بھاؤ لے کر
رنگِ محفل میں مخل ہو

کیا مسز سکھ پال سنگھ کی جرأتوں پر نظم لکھنے کے لئے
میں ببولوں کی جگہ جوتے اگاؤں؟
بیل پر کڑوے کریلے کی روپے کی نوٹ کی گڈی لگاؤں...."

(بمل کرشن اشک)

دیدۂ حسرت سے تکتے، ہیئتِ نقطہ لکیریں
غیر متوازی توازن کو لئے
کھنچتی دریا رواں ہے

لوگ کہتے آئے ہیں اس کو
منتقم
سوچتا ہوں
اس قیاسِ محتملِ ضدین کو
میں کیا کہوں
مجھ کو طے کرنے پڑے ہیں
سرد لمحے اور کیلے راستے
میں نے دیکھے
زرد دن، تاریک رات
چلتے پھرتے، سانس لیتے بولتے
بیت الخلا
ابنِ آدم کا نہیں مجھ کو پتہ
گر
منتقم بھی کہوں تو میں کسے

"مذاہبیت" (محمد آرزو عثمانی)

سرد ہواؤں نے پر تولے،
جھینگر، چکی، بکی بولے —
اُلّو چیخا —
"ہاؤں"
کالی بلی......
"میاؤں"
کتوں نے طمار لا پا ویرانے میں،
رات پھنسی ہے کڑی کے تانے بانے میں"
خوف نے
ڈرتے ڈرتے، جوں ہی دل میں کروٹ لی،
سناٹا بولا —
"شی !!!"

"خوف: رخوف" (مظفر حنفی)

بنگلہ ٹوٹا کوا املی کے پیڑ کے نیچے
جانے کیوں چپ چاپ بیٹھا ہے
تیز ہوا، ڈری ڈری خاموشی سے چلتی ہے
اک اخبار سے منہ کو چھپائے اک جٹنگ اونگھ رہا ہے
دھوپ، پیڑ کے پاس تھکی لیٹی ہے
حبس ہے ایسا دل تک بے آواز دھڑکتا ہے
راجا بائی ٹاور کی بڑی گھڑی رکی پڑی ہے
رگ رگ میں ایک تھکن بے معنی سے درد کے ساتھ بہتی ہے

"ایک دوپہر" (باقر مہدی)

دلیغری جمہیر میں رکھی ہوئی
طشتری میں میری دونوں آنکھیں
برہنہ پڑی تھیں
وہاں تک کسی خواب کے ہاتھ پہنچتے نہیں تھے
کبوتر کی آنکھوں میں
ٹوٹتے ہوئے آسمان کا تنزل نہ دیکھ
بدن کے شکستہ کھنڈر سے نکل بھاگنے کے لئے پھر
تمہاری مدد کی ضرورت ہے مجھ کو

"وقت کی جیبھ پر" (عادل منصوری)

ایک دن میں نے سورج اور چاند کو اپنے کمرے میں ایک کینوس پر چپکا دیا
پھر پانی کی نوک سے دونوں کے چار چار برابر ٹکڑے کر دیئے
پھر چاند اور سورج کے برابر کے دو ہلکے سبز دائرے ایک دوسرے کینوس پر بنائے
اس کے بعد ایک ایک ٹکڑا چاند کا اور ایک ٹکڑا سورج کا
میں نے اٹھا کر دائروں پر اغل بغل یوں رکھ دیا کہ
دیکھنے والے پہلے چاند کے ٹکڑے کو دیکھیں اور پھر سورج کے
اور اس طرح میں نے جب دونوں دائرے مکمل کر لیے
تو خوش ہوا یہ سوچ کر کہ اب کوئی بھی سورج اور چاند کو ایک دوسرے سے کم نہیں سمجھے گا

"ایک نظم" (یوسف اختر)

آخری اقتباس کی بحر تلاش کرنے کے ساتھ ساتھ سوچیے کہ مندرجہ بالا اقتباسات کے موضوعات میں کون سی خوبی اور کونسا انوکھا پن ہے جس کی وجہ سے شعراء نے ان کو

منتخب کیا ہے مجھے تو ان میں چھچھورپن، غلاظت اور تنگ بندی کے سوا کچھ بھی نظر نہیں پڑا۔ اگر کوئی انسان جسے حمدون صاحب چلتا پھرتا بیت الخلاء سمجھتے ہیں، کسی سڑک کے کنارے بیٹھا غلاظت کھا رہا ہو اور کوئی شخص مجھ سے کہہ دے کہ یہ شاعر ہے تو میں شاید یقین کر لوں۔ لیکن اگر وہ غلاظت یا اس کے غلاظت کھانے کے فعل کو شاعری کہے تو مجھے چاہے صلیب پر لٹکا دیا جائے، میں اس کی یہ بات تسلیم نہیں کروں گا۔ فنی نقطۂ نظر سے بھی بیشتر نظمیں معیار سے گری ہوئی ہیں۔ نظم آزاد میں شاعر کچھ پابندیوں سے آزاد ضرور رہتا ہے لیکن اتنا بھی نہیں کہ "نظم مادر پدر آزاد" لکھنا شروع کر دے۔ احمد ہمیش کی تینوں نظمیں جن کے عنوانات "تجدید ۱" "تجدید ۲" "تجدید ۳" ہیں مادر پدر آزاد ہونے کی بدترین مثال کے طور پر پیش کی جا سکتی ہیں۔ تجدید ۱ کا ایک بند آپ بھی پڑھ لیجئے:

"مصیبت یہ ہے کہ شروع ہی میں اس فونٹین پن کی نب میں انک خشک ہو گئی ہے کیوں کہ
ہمارے ملک میں
کبھی انک جھکتی اور بہتی نہیں
لکھتے ہی اس میں دھول چپک جاتی ہے
تو بہر حال جہاں سے ہم کبھی فرض کئے گئے ہوں گے
وہیں کروڑوں عمروں اور عادتوں کی آنکھیں بناتی ہوئی
روشنی ایستادہ تھی
عادتیں اور عمریں ہمارے ملک کے پرانے غلاموں کی طرح
اپنا اپنا حصہ لینے کو کھڑی تھیں
یعنی ہم نہیں جانتے کہ ہم کیوں روشنی میں بٹ گئے
یعنی ہم نہیں جانتے کہ ہم کیوں اندھیروں میں تحلیل ہے"

اگر یہ نظم ہے تو پھر نثر کیا ہوتی ہے؟ نہ بحر، نہ آہنگ، نہ نغمگی۔ زبان بھی تو خوبصورت نہیں کہ کھینچ تان کر ہی نثر پر شاعری کا الزام لگا دیا جائے۔ اس سے زیادہ شاعری تو افسانہ نگاروں کے ہاں مل جاتی ہے۔ میری رائے تو یہ نظم نہیں بدنظمی ہے۔ ایک بحر میں جب چاہے دوسری بحر گھسیڑ دینا۔ ایک تہائی، آدھا یا تین چوتھائی رکن گرانا بھی اہل ذوق پر گراں تھا۔ یہاں تو پوری بحر گرا دی گئی ہے۔ اس قسم کی نثر لکھنے والے کو شاعر ماننا ایسا ہی ہے جیسے درد سے خوف زدہ ہو کر حمل گرا دینے والی عورت کو ماں تسلیم کر لیا جائے۔

اب تک جو اقتباسات پیش کئے گئے ہیں اور ان پر جس قسم کی رائے زنی کی گئی ہے اس سے شاید آپ تاثر قبول کر چکے ہوں گے کہ "نئے نام" کے تمام متولات اسی قسم کے خرافات پر مبنی ہیں.... نہیں، غزلیں سب کی سب اچھی اور بعض بہت اچھی ہیں۔ نظموں میں کچھ بہت اچھی اور کچھ بہت ہی اچھی چیزیں مل جاتی ہیں اور ان میں نئے خیالات و احساسات کا پرتو بھی ہے۔ منہ کا مزا بدلنے کے لئے چند اشعار اور چند نظموں کے اقتباسات آپ بھی چکھ لیجئے:۔

مدتیں گذریں مرے دل کو ہوئے ویرانہ
آندھیاں بھی نہیں آتیں
کہ اڑے ریت مٹے نقشِ سراب
اور اک درد کا چشمہ
مندمل زخموں سے پھوٹے نئی خنکی لے کر

(یہ مصرعہ بے وزن ہے میرا دل اسے یوں پڑھنے کو چاہتا ہے "اور اک چشمۂ درد")

پیاس جاگ اُٹھے، سکوتِ دل منظر ٹوٹے
تاکہ میں دیکھ سکوں:
اپنی بے خواب سی آنکھوں سے وہ منظر اک دن
ریت کے تودے فضاؤں میں اُڑے جاتے ہیں
اور خوش ہو کے کہوں
"زندگی ریت سہی، درد کا چشمہ بھی تو ہے"

"ریت اور درد" (باقر مہدی)

تو ایسا کیوں نہیں کرتے
انہیں سپنوں انہیں پرچھائیوں کو جسم دے ڈالو
کہ جن کو جسم دینے کی تمنا، مجھ سے آسائش کا ہر لمحہ
مزے کی نیند، اعصابی سکوں — سب چھین لیتی ہے

"تو ایسا کیوں نہیں کرتے" (بشیر نواز)

چپ سانس لے رہی تھی درختوں کے آس پاس
آواز دے رہی تھی، کوئی بولتا نہ تھا
اے اشک اک کتاب پڑی تھی ورق ورق
وہ تیرگی تھی، لفظ کوئی سوجھتا نہ تھا

(بل کرشن اشک)

یہ جبیں، مطلعِ خورشیدِ جہانِ بیدار
شش جہت کے یہ ستوں، بازوئے سنگلاخ و جواں
میری امید گہِ نور، یہ آنکھیں یہ دماغ
آج چپ چاپ ہوئے گرم لہو میں غلطاں
کس سے فریاد کروں درد مجسم ہوں میں
تو نے جانا بھی کہاں وقت ہوں زخم ہوں میں
اب بھلا کیسے جگاؤں کہ گراں خواب ہے تو
مجھ کو معلوم نہ تھا شاذ کہ سراب ہے تو

"شکستِ انا" (شاذ تمکنت)

ساحلِ آب و سراب ایک ہے منزل منزل   تشنگی کرتی ہے سیراب نہ غرقاب مجھے

اب مجھے ڈھونڈ نہ آغوشِ گریزاں ہر سو ۔۔۔ لے اُڑی خاک، بہالے گیا سیلاب مجھے (شہاب جع...

عجیب سانحہ مجھ پر گذر گیا یارو
میں اپنے سائے سے کل رات ڈر گیا یارو
وہ کون تھا، وہ کہاں کا تھا، کیا ہوا تھا اُسے
سُنا ہے آج کوئی شخص مر گیا یارو

(شہریار)

پھول، پتیاں، شاخیں
ہونٹ، ہاتھ اور آنکھیں
موجِ خوں، صدائے دل
ماہتاب اور سورج
منجمد ہیں سب کے سب
وقت کی کماں میں اب
تیر ہی نہیں کوئی

("اسٹل لائف" شہریار)

ڈر کے جب رات سے خورشید پلٹ جائے گا
میرا سایہ میرے سینے سے لپٹ جائے گا
آنکھ مند رجائے گی جاگی ہوئی آوازوں کی
راستہ رات کے ذرات سے اٹ جائے گا

(شہزاد احمد)

کیا حسن و ادا کیا عشق و ہوس
کیا خواہش و شوق اور کیا حسرت
کیا شرم و حیا، جرأت، غیرت،
ہر منظر بھیڑ میں ڈوب گیا

میں خود بھی خود میں ڈوب گیا
تنہا تنہا، تنہا تنہا

("واپسی" شہرزاد سے) (عمیق حنفی)

رس بھرا لمحہ
سمے کی شاخ سے ٹوٹا
مری پھیلی ہوئی جھولی میں گر کر
آج میرا ہو گیا
یک بہ یک
زرّوں کے ٹھہرے کارواں نے جھرجھری لی چل پڑا
رس بھرے لمحے کا محمل
اونٹنی کی پشت پر مچلا
سنہری گھنٹیوں نے چیخ کر مجھ سے کہا
تو رہ گیا ——

"لمحہ" (وزیر آغا)

بھرے گھروں نے لوٹ لیا صدا لگانے والوں کو
اس دروازے کون گیا جس گھر میں، میں تنہا تھا
جن بانہوں نے کھینچ لیا رات مجھے تنہا پا کے
خود کو کیا سمجھاؤں میں وہ میرا ہی سایہ تھا

(وہاب دانش)

گھٹائیں
مناظر کی آنکھوں میں
کاجل کی ہلکی لکیریں سہانے اٹھی ہیں
زمیں کے بدن پر
پڑے آبلوں کی جلن مٹ گئی ہے
زمین کا بدن تازہ پھولوں کی مانند پھر جل اٹھا ہے
کہیں دور
شاخوں میں الجھا ہوا ایک زخمی پرندہ
فضاؤں کی لہروں پہ بہتے ہوئے
وسعتیں ناپنے کے جتن کر رہا ہے

"موسم کا المیہ" (زبیر رضوی)

جدید تر شاعری سے دلچسپی رکھنے والے مخالفوں اور ہمدردوں کے لئے "نئے نام" کا مطالعہ دلچسپی کے کافی سامان فراہم کرتا ہے۔ صوری لحاظ سے بھی "نئے نام" میں کئی دلچسپیاں موجود ہیں، کتابت، کاغذ اور گٹ اپ نہایت عمدہ ہے۔

ظہور نظر

پتھر کی زبان (نظمیں)

مصنفہ: فہمیدہ ریاض
ناشر: کتاب نما۔ ۳۲۔ ڈی۔ بی سیٹلائٹ ٹاؤن۔ راولپنڈی
قیمت: ۱۰ روپے

چغتائی صاحب نے اس کتاب کا سرورق خوب بنایا ہے۔ واقعی "پتھر کی زبان" سے پھول جھڑتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے اس مجموعے کی نظمیں لکھی نہیں الاپی گئی ہیں۔ رسیلے اور دھیمے سروں میں ڈوبی ہوئی ایک عجیب سی تازگی ہر نظم کے گرد ہالہ کئے ہوئے ہے۔ فہمیدہ کی شاعری کو تین خصوصیات کی دھنک کہا جا سکتا ہے: تازگی، سچائی اور نسوانیت کی حسین دھنک ——!

تبصرہ کرتے وقت زیر نظر کتاب سے دور نکل جانا ہے تو زیادتی، لیکن دل یہ زیادتی کرنے پر تل گیا ہے۔ سو یارو! فہمیدہ بھی تو آج کی شاعرہ ہے۔ حساس بھی ہے۔ پڑھی لکھی بھی ہے اور نوجوان بھی۔ اس کے تجربات اور مسائل بھی اس کے بزرگوں کے تجربات اور مسائل سے مطابقت نہیں رکھتے۔ اس کے بزرگوں کو بھی اس کی بات اور المیے کو سمجھنے میں تکلف ہے۔ پھر اس پر وہ ہذیانی کیفیت کیوں طاری نہیں ہوئی جس نے آج کے اکثر شاعروں کے ذہن سے جھاگ جاری کر رکھا ہے؟؟

جملۂ معترضہ کا یہ پتھر پھینکنے کے بعد اب میں پھر "پتھر کی زبان" کی طرف لوٹتا ہوں۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ فہمیدہ کی نظمیں تازگی سچائی اور نسوانیت سے لبالب بھری ہوئی ہیں۔ خاص طور پر نسوانیت سے۔ ہو سکتا ہے یہ خصوصیت مجھے اس لئے بھی نمایاں طور پر نظر آئی ہو کہ اردو شاعری میں نظم گو خواتین نہ ہونے کے برابر ہیں۔ آج تو پھر کچھ نام دکھائی دینے لگے ہیں ورنہ کل تک لے دے کے صرف ایک نام ادا جعفری کا تھا۔ نسوانیت تو ظاہر ہے ان کے کلام میں بھی ہے لیکن اتنی نہیں جتنی فہمیدہ کی نظموں میں نظر آتی ہے۔ چند جھلکیاں دیکھئے:

اسی اکیلے پہاڑ پر تو مجھے ملا تھا
یہی بلندی ہے وصل تیرا
یہی ہے پتھر مری وفا کا
اُجاڑ، چٹیل، اداس، ویراں
مگر میں صدیوں سے اس سے لپٹی ہوئی کھڑی ہوں
پھٹی ہوئی اوڑھنی میں سانسیں تری سمیٹے
ہوا کے وحشی بہاؤ پر اُڑ رہا ہے دامن

(پتھر کی زبان)

"پھٹی ہوئی اوڑھنی" والے مصرعے نے پوری نظم پر نسوانیت کی گہری چھاپ لگا دی ہے۔ تقریباً ہر نظم میں وہ اسی طرح کے ایک دو مصرعے کہہ کر ساری نظم میں نسوانیت کی تازگی رچا دیتی ہیں۔ چند مثالیں اور دیکھئے:-

پل دو پل کو اک محفل میں ملے تھے، گئی بہار
ادھر اُدھر کی سُنی سنائی باتیں کہیں دو چار
اُنھوں نے شاید دیکھا بھی تھا میری طرف اک بار

(ذرا سی بات)

یہ مری سوچ کی انجان کنواری لڑکی
غیر کے سامنے کچھ کہنے سے شرماتی ہے

اپنی مبہم سی عبارت کے دوپٹے میں چھپی
سر جھکائے جیسے کترا کے نکل جاتی ہے

(جھجک)

کانچ کی چوڑی کے ٹکڑوں سے
دھیان میں بیٹھی کھیل رہی تھی
سہمی سن کر نام تمہارا
آئی گرم حنا کی خوشبو

کہیں سنہرا وصل نہ دکھے
مٹھ میں رہتی ہے سب دنیا
بول نہ اٹھے دشمن گھنگرو
بات کھلے گی مجھ کو مت چھو (خوشبو)

گال پہ کاجل پھیلا پھیلا
محرومی سے اُجڑی صورت
رسوائی سے آنچل میلا
چپکے چپکے آنسو پونچھوں

نہیں نہیں میں روتی کب ہوں
مجھ کو اس کا دھیان کہاں ہے
مجھ پر تم انگلی نہ اٹھاؤ
یہ گیلی لکڑی کا دھواں ہے (اندیشہ)

پنجابی زبان کا ایک مشہور لوک بول یاد آگیا ہے ؎

اگ بال کے دھوئیں دے پج روواں
لکاواں دکھ سجناں دے

یہ بول دہراتے وقت میں نے ہمیشہ سوچا ہے کہ اسے ضرور کسی سوہنی یا ہیر نے لکھا ہوگا۔ نسوانیت کی بہت ہی نمایاں مثال فہمیدہ کی نظم "لوری" ہے۔ اس نظم میں فہمیدہ نے ایک ایسی عورت کے جذبات کی عکاسی کی ہے جسے اپنے شوہر سے بے پناہ محبت ہے لیکن بچے کی پیدائش کے بعد شوہر کی حیثیت ثانوی ہو جاتی ہے۔ عورت کی کوکھ جب تخلیق کے نور سے مزین ہوتی ہے تو اس کے سارے رنگ، سارے انگ، صرف ایک رنگ میں رنگ جاتے ہیں اور وہ صرف ماں بن کر رہ جاتی ہے۔ کس قدر پرانا ہے یہ موضوع لیکن کس قدر تازگی ہے اس نظم میں:

ننھے ننھے ہاتھوں سے
مانگتے ہو کیا مجھ سے
نیم وا دہن جیسے
کوئی آدھ کھلا غنچہ
مجھ میں ڈھونڈتا کیا ہے

جو کبھی نہیں پائی
تم میں آگیا شاید
حسن میری حسرت کا
آرزو کی رعنائی

جسم میں تمہارے کیوں۔؟
میری روح کھنچ آئی ؟
مجھ سے کیسا رشتہ ہے
کچھ بھی ہو مگر مجھ کو
زندگی سے پیارے ہو
تم تو وہ مسرت ہو
جس کو میں ترستی تھی

تم کو دیکھ کر وہ بھی
آنکھ میں لئے حیرت
نور سے مسرت سے
مسکرانے لگتا ہے
تم میں لوگ پائیں گے
ثبت کوکھ پر میری
اس کے پیار کا بوسہ

آج دیکھے دنیا
کتنا خوبصورت ہے
میرے درد کا غنچہ
میری آنکھ کا آنسو
میرے خون کا قطرہ
تو جو مسکرائے گا
سب دکھن بھلا دوں گی
زیست کی خلش لے کر
میں بھی مسکرا دوں گی

فنی لحاظ سے بھی "پتھر کی زبان" کی نظمیں بڑی جاندار ہیں۔ الفاظ کے چناؤ میں حسن، لہجے میں نغمگی اور بیان میں آہنگ کی جھنکار ہے۔ جس طرح نشے میں اتار چڑھاؤ کی کیفیتیں ایک دوسری سے منسلک ہونے کے باوجود الگ الگ ہوتی ہیں، اسی طرح نظم میں خاص طور پر آزاد نظم میں آغاز اور انجام کا نمایاں فرق ہی اُسے خوبصورت بناتا ہے بشرطیکہ اُس میں لئے کا سا تسلسل موجود ہو۔ فہمیدہ کی نظموں میں اس کی بڑی اچھی مثالیں ملتی ہیں۔ "ایک رات کی کہانی" کا آغاز دیکھئے:۔

بڑی سہانی سی رات تھی وہ
ہوا میں انجان کھوئی کھوئی مہک رچی تھی

اب ایک نظر انجام پر بھی ڈالیئے:۔

نشریری سی رات اُس کو چپکے سے وہ کہانی سنا رہی تھی
کہ آج وہ اپنی چوڑیوں کی کھنک سے شرمائی جا رہی تھی

بیچ کے دس مصرعے سامنے نہیں ہیں، پھر بھی نظم میں کسی شدیدکمی کا احساس نہیں ہوتا۔ آغاز اور انجام میں لہجے اور جذبے کے نمایاں فرق کے باوجود تسلسل برقرار ہے۔ ایسی صورت میں اندازہ لگائیے کہ جب بیچ کا جزئیات نگاری والا حصہ اس آغاز اور انجام کے ساتھ شامل ہوگا تو نظم کتنی مکمل اور کتنی بھرپور ہو جائے گی۔ ایک اور نظم "بارش" کا آغاز یوں ہوتا ہے:

جب بھی میرے آنگن میں
بوندیاں برستی ہیں
بند کر کے دروازے
بیٹھتی ہوں کمرے میں
جانتی ہوں یہ بوندیں
چاہتی ہیں جو مجھ سے

پھر ستائیس مصرعوں میں بارش کی معنی خیز منظر کشی کے بعد اٹھائیسویں مصرعے سے نظم انجام کی طرف بڑھنے لگتی ہے:

جانتی ہوں، یہ بوندیں
میرے دل پہ برسیں گی
میری بھی مٹی کو
چوم کر جگا دیں گی

اس کی سوندھی خوشبو پھر
میں کہاں چھپاؤں گی
لوگ ٹھیک کہتے ہیں
دو ہی ایسی چیزیں ہیں
جو کبھی نہیں چھپتیں
ان میں ایک خوشبو ہے

بیچ کے سطر میں مصرعے نہ ہونے کے باوجود آغاز اور انجام کو ملا کر پڑھیے تسلسل اور تکمیل کی پرچھائیں اوجھل نہیں ہوگی۔ اس نظم کا انجام تو بہت ہی خوبصورت ہے۔ بہت کم نظموں کو ایسا دلفریب انجام نصیب ہوتا ہے۔ "پتھر کی زبان" میں ایک اور خوبی بھی بہت نمایاں ہے وہ ہے بحر اور موضوع کی یگانگت۔ فہمیدہ کا وجدان ہمیشہ موضوع کا قد دیکھ کر بحر کا وزن منتخب کرتا ہے۔

پیش لفظ میں سچے غرور کے ساتھ فہمیدہ نے دیانت داری کا جو دعویٰ کیا ہے، تقریباً ہر نظم اسے پورا کرتی ہے لیکن یہ بات جو فہمیدہ نے پیش لفظ کے آخر میں تحریر کی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ دو چار سال اور لکھے گی کہ اس کے بعد کہنے کے لئے کچھ نہیں رہ جاتا، شاید سچی ثابت نہ ہو۔ سچے شاعر کے اندر تخلیق کی جو لگن ہوتی ہے اُسے کبھی موت نہیں آتی۔ یہ لگن کھلانے کے لئے نت نیا مواد خود ڈھونڈ لیتی ہے۔ وہ فہمیدہ جو اپنی شاعری کے آغاز میں "لوری" تک کا تصور کر سکتی تھی، کیا خبر تخلیق کی لگن پچیس تیس سال بعد اُس سے لوری والے لال کا سہرا بھی لکھوائے جو "لوری" کی طرح انوکھا بھی ہو اور تر و تازہ بھی۔!

آج کی بے ہنگم شاعری کے بے آب و گیاہ دشت میں "پتھر کی زبان" کو بادِ نسیم کا خنک جھونکا کہا جا سکتا ہے۔ صحرا نوردوں کو تازہ ہوا کے اس جھونکے سے فرحت ہوگی۔

ظہور نظر

کرنافلی (ناول)

مصنف: علاؤالدین الآزاد — پبلشر: کتاب نما۔ لاہور

ترجمہ: احمد سعدی — صفحات: ۱۵۱ — قیمت: تین روپے

جب میں نے پہلا بنگالی ناول پڑھا تو میں سکول میں غالباً چھٹی ساتویں جماعت کا طالب علم تھا۔ تب سے میں بنگال کے جادو تلے آ گیا اور بنگلہ دیس کی شاداب سرزمین اپنے ڈابوں، دریاؤں اور نیلے تالاؤں کے ساتھ میرے تخیل کا حصہ بن گئی۔ یہ ناول "ان پورنا دیوی کا مندر" تھا۔ ایک بنگالی لڑکی کا لکھا ہوا جس کا نام اب مجھے بھول گیا ہے، مگر مترجم پروفیسر رام سروپ کوشل ایم اے کا نام مجھے اب تک یاد ہے۔ راس کا تخیلی حلیہ جو میں نے بنایا وہ ایک مُگٹ پہنے، لٹکی ہوئی لمبی گھنی داڑھی مونچھوں والے متوسط عمر شخص کا تھا جو عینک لگاتا تھا۔ میں دارالاشاعت کی چھپی ہوئی اس چھوٹی کتاب کے پیلے کاغذی سرورق کو اب بھی دل کی دھڑکن کے ساتھ اپنی یاد کی آنکھ سے دیکھ سکتا ہوں۔ یہ کتاب "ان پورنا دیوی کا مندر" میرے لڑکپن کی یادوں کے دوزنگ پھیلے ہوئے سفید غبار میں سرسبز خوابی جزیرے کی طرح اُبھرتی ہے۔ اور میں جانتا ہوں کہ جب میرا اس دنیا سے رخصت ہونے کا وقت آئے گا اور میں اُن چیزوں کا سوچوں گا جنھوں نے مجھے اپنے لمبے کٹھن سفر میں سب سے زیادہ مسرتیں بخشیں تو یہ چھوٹی، سادہ، اداس

کہانی بھی ان چیزوں میں سے ایک ہو گی۔ اس وقت وہ خوابی ابراہیم بیرو میری ڈوبتی آنکھوں کے سامنے ہو گا ہم سب اپنے بچپن اور لڑکپن میں پڑھی ہوئی کتابوں سے محبت کرتے ہیں اور انہیں آسانی سے نہیں بھول پاتے مگر "ان پورنا" دیوی کا مندر" حقیقتاً ایک سادہ، خوبصورت اور دل کو موہ لینے والی کتاب تھی ـــ ماہیگیروں، مچھیروں اور جنگلوں کے متعلق جو کاروں والے امیر آدمیوں، اونچے عہدیداروں اور فلک بوس پتھریلی عمارتوں سے کہیں زیادہ دلچسپ ہیں۔ "ان پورنا" کے بعد میں نے کئی ایک بنگالی ناولوں کے ترجمے پڑھے۔ میرے سکول کے پاس ہی بازار میں جو ترمل کی دکان تھی۔ جہاں سے ہر قسم کے ناول ایک آنہ یومیہ پر پڑھنے کے لئے کرایہ پر مل جاتے تھے۔ میں نے ان میں چھانٹ چھانٹ کر بنگالی ناول پڑھ ڈالے۔ بنکم چندر، چیٹرجی۔ اور دوسرے مصنفوں کے! لیکن ان میں سے کسی نے "ان پورنا" کی طرح متاثر نہ کیا۔ اس وقت بھی میں یہ تمیز کر سکتا تھا کہ یہ بنگالی ناول ہر لحاظ سے اردو ناولوں سے کہیں زیادہ اصلیت، خوبصورتی اور دلچسپی سے لکھے ہوتے تھے۔ جب جو ترمل کا اسٹاک ختم ہو گیا تو میں نے ایک مدت تک بنگالی ناول نہ پڑھے۔ نویں دسویں جماعت تک میرا مذاق بھی بدل چکا تھا۔ میں نے سکول کی لائبریری میں آر ایل سٹیونسن، رائیڈر ہیگرڈ اور فینی مور کوپر کو دریافت کر لیا تھا جو ایک مضطرب کن جہاتی کہانی کو ایک مضطرب کن پیرائے میں بیان کرنے کی قدرت رکھتے تھے، اور جو اُن باتوں کے متعلق لکھتے تھے جو ایک لڑکے کے دل کے زیادہ قریب ہوتی ہیں۔ میں انگریزی ادب کا رسیا بن گیا۔

"ان پورنا" اور دوسرے بنگالی ناولوں نے میرے تخیل میں جو جوت لگائی تھی، وہ البتہ کبھی نہ بجھ سکی۔ مگر میں نے پھر کئی سالوں تک بنگالی ناول نہ پڑھے۔ اس کی غالباً ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سوائے ٹیگور کی کتابوں کے دوسرے بنگالی مصنفوں کی کتابوں کے ترجمے آسانی سے دستیاب نہ ہوتے تھے۔ کالج کے زمانے میں میں نے ٹیگور کی کئی ایک نظمیں دیکھیں جن میں دیوداس اور بڑی دیدی سرت چندر چیٹرجی کے ناولوں پر مبنی تھیں۔ لیکن انگریزی ادب میں منہمک ہونے کی وجہ سے میں نے ان ناولوں کے اردو ترجموں کی جستجو میں کچھ دوڑ دھوپ نہ کی۔ سرت چندر کو میں نے حال ہی میں پڑھا ہے اور وہ بھی ایک تلخیص شدہ صورت میں اور ایک کاروباری انداز کے ترجمے کے روپ میں جو اتنا برا تو نہ تھا لیکن اُسے اچھا بھی نہیں کہہ سکتے۔ پچھلے سے پچھلے سال نیلے گنبد کے ایک فٹ پاتھ کے کباڑیے کے پاس میں نے "بڑی دیدی" کی دو جنوں جلدیں دیکھیں اور میں نے ایک جلد غالباً چھ آنے میں خرید لی۔ چھ آنے میں اس سے اچھا سودا میں نے کبھی نہیں کیا، کیونکہ جب میں نے "بڑی دیدی" کو پڑھا تو میں نے محسوس کیا کہ میں نے دنیاوی ادب کے ایک شاہکار کو پڑھا ہے۔ "بڑی دیدی" اُن معدودے چند ناولوں میں سے ہے جنہوں نے میرے دل کو رلایا۔ ادھیڑ عمر میں آدمی سخت دل اور کٹھور بن جاتا ہے اور انسانی محبت کے سوز پر آسانی سے نہیں روتا لیکن جب سرت چندر کی اس سیدھی سادی جذباتی محبت کی کہانی کے خاتمے پر پہنچا تو میں آدمی کی ازلی تنہائی اور اس کی محرومی پر ایک بچے کی طرح رو پڑا اور کتاب کا صفحہ میرے آنسوؤں سے بھیگ گیا۔ دوسروں کے متعلق تو میں نہیں کہہ سکتا۔ میرے لئے "بڑی دیدی" ایک سچی اور عظیم کہانی ہے اور سرت چندر ایک اُستاد کہانی لکھنے والا ـــ ایک بے مثل جذبات کا مصور۔

ایک اور بنگالی ناول جو مجھے پانچ چھ سال پہلے پڑھنے کا اتفاق ہوا اور جو بھی ابھی دلیں میں جس میں وہ تخلیق ہوا، قاضی نذرالاسلام کا ناول تھا۔ نذرالاسلام کو ایک آتش، انقلابی شاعر کی حیثیت میں تو سب جانتے ہیں مگر بہت کم لوگوں کو اس کا علم ہو گا کہ وہ ناول اور کہانیاں بھی لکھتا تھا۔ اس ناول کا بنگلہ نام تو مجھے یاد نہیں مگر اردو میں اس کا ترجمہ "جوع الاجل" کے نام سے ہوا ہے (جو کچھ بھی جوع الاجل کا مطلب ہو)۔ غالباً نذرل نے بھی ایک ناول لکھا۔ اس میں کچھ تکنیک نہیں، کوئی فنی ضبط نہیں۔ مگر یہ جنجھنی اور بزرگ انداز گرفت میں لینے والا ناول ہے۔ سادے، مزیب، اگیس پھونس میں رہنے والوں کی یہ سادہ کہانی جس کا کوئی واضح انجام بھی نہیں۔ اپنے اندر بنگال کی دکھی روح کو سموئے ہوئے ہے۔ نذرالاسلام ایک ناولسٹ نہیں۔ وہ ناول کی تکنیک اور اصول کی ابجد سے بھی ناواقف ہے۔ پھر بھی "جوع الاجل" میرے لئے ایک انسانیت پرست انسان کی دل ہلا دینے والی پکار ہے۔ اور کئی ناولوں سے ہزار درجہ زیادہ موثر بری طباعت اور ناقابل ترجمہ بھی اس ناول کی خوبصورتی کو نہیں بگاڑ سکے۔ اور نذرل کی دکھ کی پکار کسی نہ کسی طرح ہم تک راہ پا لیتی ہے میرا خیال ہے کہ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ

کردار حقیقی چلتے پھرتے لوگ ہیں اور ان کی کہانی کو پڑھنا بنگلہ دیس کی روح کے حسن اور دکھ کو محسوس کرنا ہے۔ ایک شاعر ہی ایسا نفیس ناول لکھ سکتا تھا۔

"کرنا فلی" بھی انہی عوامی بنگالی ناولوں کی خوبصورت روایت میں ہے جن کے تانے بانے ایسی سجاوٹ، سادگی اور پرکاری سے بُنے جاتے ہیں کہ ان پر "تصنیف" کیے جانے کا گمان نہیں ہوتا اور جو گویا قدرتی ندیوں کی طرح پرسکون شاداب کناروں کے بیچوں بیچ بہتے جاتے ہیں۔ میں اکثر تعجب کرتا ہوں کہ ایسے ناول ہمارے مغربی خطے میں کیوں نہیں لکھے جاتے یا لکھے جا سکتے۔ ہمارے بیشتر ناول کیوں اتنے بناوٹی، غیر حقیقی اور جھوٹ موٹ کے ہوتے ہیں۔ وہ کیوں اتنے بناوٹی، غیر حقیقی اور جھوٹ موٹ کے ہوتے ہیں، وہ کیوں اس قدر عاری تخیل سے پاک اور بھونڈے ہوتے ہیں۔ کیا اس خطے میں اچھا اور قدرتی ناول نہیں پیدا ہو سکتے؟ یا ہماری آب و ہوا، طرز زندگی، ہمارے خمیر میں کوئی ایسی چیز ہے جو ہمیں زندگی کے گداز و شادمانی، قدرتی مناظر کے حسن اور ان سب چیزوں سے جو زندگی کو رہنے کے قابل بناتی ہیں، بیگانہ کر دیتی ہے؟ "کرنا فلی" کا مصنف علاؤ الدین الآزاد بھی دوسرے بنگالی مصنفوں کی طرح اپنے دیس کی عوامی زندگی، اس کے باسیوں کے دکھوں اور خوشیوں، اس کے شاداب جنگلوں، دریاؤں اور گھاٹوں سے اپنے ناول کا تانا بانا بُنتا ہے۔ سب کردار حقیقی ہیں اور اسی طرح جیتے، سوچتے اور بولتے ہیں جیسا ان کرداروں کو کرنا چاہیئے۔ انہیں زیادہ گہرائی سے نہیں دیکھا گیا مگر وہ بالکل مستند ہیں اور یہ اس ناول میں کوئی عیب نہیں ہے۔ "کرنا فلی" طویل مختصر افسانے کے اصول پر لکھا ہوا ناول ہے، پورے فنی ضبط اور اختصار کے ساتھ، اور اس لحاظ سے اپنے بیشتر بنگالی ناولوں سے بہت مختلف۔ علاؤ الدین آزاد ایک ماڈرن ہے اور اس لئے ایک ناول کی تکنیک کی مقتضیات سے پوری طرح بہرہ ور۔ سرت چندر اور نذرل سے اس کا موازنہ کافی دلچسپ ہے۔ سرت چندر اور نذرل تکنیک کے متعلق کچھ نہیں جانتے اور نہ ہی اس کی پروا کرتے ہیں۔ وہ پرانے داستان گوؤں کی طرح پڑھنے والے سے براہ راست مخاطب ہونے میں بھی برائی نہیں سمجھتے، نہ ہی وہ جذباتیت کا اظہار کرنے سے شرماتے ہیں۔ جدید ناول میں تکنیک پر بڑا زور دیا جاتا ہے۔ مگر سرت چندر اور نذرل نے اس کے بغیر ایسے ناول لکھے جو سچے، حقیقی اور اثر کرنے والے ہیں۔ علاؤ الدین آزاد ایک جگہ بھی پڑھنے والے سے براہ راست مخاطب نہیں ہوتا۔ وہ یہ کہنے کا روادار نہیں کہ اب فلاں فلاں کا سنو کہ اس کے ساتھ کلکتہ میں کیا بیتی! اس کی تحریر میں جذباتیت کے ارغوانی ٹکڑے بھی کہیں ٹنکے ہوئے دکھائی نہیں دیتے۔ وہ سرت چندر اور نذرل سے مختلف برش اور موقلم سے اپنا مرقع تیار کرتا ہے۔ مگر OBJECT وہی ہے۔ بنگلہ دیس کے عام لوگ، ان کے کڑے ایام، ان کی غم و خوشی اور دریاؤں اور پہاڑوں کا بے زوال منظر! اس کی کہانی بھی مضطرب کرنے والی ہے اور وہ اسے ایک مضطرب انداز میں کہتا ہے۔ بنگال کے حسین مناظر کی لفظی تصویریں اتنے احساس اور گہرائی سے کھینچی ہوئی ہیں کہ آدمی کو جوزف کانرڈ کے ناول یاد آ جاتے ہیں۔ (کانرڈ ایک پول تھا، اس نے انگریزی میں EXOTIC ناول لکھے ہیں جن میں اکثر کی سیٹنگ استوائی جنگلی علاقے ہیں) "کرنا فلی" میں وقفے ڈرامائی تاثر کو تیز کرتے ہیں اور تسلسل کو کوئی دھچکا نہیں پہنچتا۔ ہم سب کچھ تو نہیں دیکھتے مگر مصنف ہم کو جو کچھ بھی ہمیں کرداروں کی بول چال، چلت پھرت سے دکھانا چاہتا ہے اسے ہم مکمل طور پر دیکھ لیتے ہیں!

تم اس ناول کے صفحات میں بنگلہ دیس کے پُرحسرت سوگوار چہرے کو دیکھتے ہو۔ ایک اُجڑی بھیڑیلی دنیا جس میں انسان ہی قاتل ہے اور انسان ہی مقتول، انسان ہی بھیڑیا ہے اور انسان ہی بھیڑ کا بچہ، اور سب ایک غیر انسانی، ایک نامنصفانہ تمدنی نظام کی چکی میں پس رہے ہیں۔ کہانی میں سجاوٹ ہے۔ کوئی اینچ پیچ نہیں لیکن ایک شاعرانہ فن کاری سے مرقعے کے خاکوں میں رنگ بھرے گئے ہیں۔ تو ہمارے اس خطے کے ناول جنہیں پڑھ کر ہمیشہ ایسا لگتا ہے کہ آدمی یہ سب کچھ پہلے پڑھ چکا ہے اور جن کو عوامی زندگی سے کوئی نسبت نہیں ہوتی۔ "کرنا فلی" کی کہانی کا مرکزی کردار اسمٰعیل ایک خانہ بدوش بے پروا جیب کترا ہے۔ اپنے فن میں طاق اس کی طرح بدنما نہیں اور اس کے دل میں بھی سب جوانوں کی طرح خواہشیں اور امنگیں ہیں۔ وہ ایک جہاز کا سارنگ بننا چاہتا ہے۔ (اور یہاں مجھے اپنی نوجوانی کے خواب یاد آگئے۔ میری تمنا بھی بحری قزاقوں کے جہاز کا کپتان بننے کی تھی!) اسمٰعیل کو ایک شخص رمضان جو کبھی ٹھیکیدار تھا اور اب عورتوں کی خرید و فروخت کا دھندا کرتا تھا، اپنی حفاظت کے لئے چکمہ دیس میں لے جاتا ہے اور وہ اکٹھے کشتی میں سفر کرتے ہیں اور اپنی منزل مقصود پر کیمپ کرتے ہیں۔ رمضان کی آنکھ ایک چکمہ لڑکی رانگا میلا پر ہے۔ ایک الھڑ، وحشی، گداز بدن کی لڑکی جسے وہ اڑانا چاہتا ہے لیکن رمضان کی اس سے محبت ہو جاتی ہے اور وہ اس کو اپنے ذہن سے نہیں نکال سکتا۔ رانگا

ایک جگہ جوان زبیل متی سے پیار کرتی ہے۔ ایک رات جب رانگا میلا اور زبیل متی اپنی مسرت ڈھونڈنے کی خاطر بھاگ رہے ہوتے ہیں تو رمضان کو پتہ چل جاتا ہے اور وہ انہیں جنگل میں دریافت کر لیتا ہے۔ وہ زبیل متی کو ختم کرنے کے لئے اس پر حملہ کرتا ہے۔ مگر آخر بھائی کا شعلہ اس میں بیدار ہوتا ہے اور وہ اپنی جان پر کھیل کر ان دو عاشقوں کو رمضان کے غنڈوں سے بچا کر آزادی اور نئی زندگی کی طرف روانہ کرتا ہے۔ کہانی فقط اتنی ہے لیکن HUMAN INSIGHT کی چکاچوند سے روشن علاؤالدین آزاد اپنے کرداروں کو اندر باہر سے جانتا ہے اور ان کی قلبی و ذہنی کشمکشوں سے حیران کن حد تک واقف۔ اس کی کارکردگی اور مواد کی HANDLING متاثر کرنے والی ہے۔ اور ہمیں اس کے قلم سے جلد ایک اور ناول ملنا چاہیئے۔

احمد سعدی کا ترجمہ مثالی ہے۔ یہ اتنا اچھا ہے کہ اس پر ترجمہ کا گمان نہیں ہوتا۔ اس نے بنگالی ناول کے لب و لہجہ اور مزاج کو بڑی خوبی سے اردو کے قالب میں ڈھالا ہے اور یہ ایک طرح علاؤالدین آزاد کی خوش قسمتی ہے کہ اسے اتنا اچھا مترجم دستیاب ہوا۔

محمد خالد اختر

دیدۂ یعقوب (مجموعۂ کلام)

مصنف: عرش صدیقی　　　ناشر: جدید ناشرین، اردو بازار، لاہور　　　قیمت: ۴ روپے

"دیدۂ یعقوب" عرش صدیقی کی نظموں، غزلوں اور گیتوں کا پہلا مجموعہ ہے۔

عرش صدیقی کا شمار نظم جدید کے ان شعراء میں ہوتا ہے جو اظہار و ابلاغ میں ایک واضح حد امتیاز رکھنے کے باوصف شعری ابہام کو بیساکھی کے طور پر استعمال نہیں کرتے۔ عرش کے ہاں جب فکر کا الاؤ روشن ہوتا ہے تو جذبہ پگھل کر اس میں یوں گھل مل جاتا ہے کہ اس کے ابلاغ میں اسے کسی اخفا کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ وہ جذبے کو جس فنی پختگی سے اپنی گرفت میں لیتا ہے، اسی فنی رعنائی سے اسے اپنے قاری کو بھی منتقل کر دیتا ہے۔ مخصوص فلسفہ حیات رکھنے والے جدید شعراء جب موضوع پر قابو پا لیتے ہیں تو اکثر جذبہ ان کا ساتھ چھوڑ جاتا ہے اور جب جذبے کی آنچ تیز ہوتی ہے تو موضوع پر گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔ بے چارگی کے انہی لمحوں میں ابہام ان شعراء کا سہارا تو بن جاتا ہے لیکن قاری سے ان کا رشتہ قائم نہیں رہتا۔ نظم جدید میں قاری اور فن کار کی یہ ذہنی مطابقت جن شعرا نے بڑی خوبی سے برقرار رکھی ہے، ان میں عرش صدیقی کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ "دیدۂ یعقوب" کی نظموں میں فن، قاری اور فنکار تینوں مل کر زندگی کا سفر طے کرتے ہیں، عرفانِ حقیقت کا کھوج لگاتے ہیں اور اس "دشمنِ جاں ستیال لمحے" کو گرفت میں لینے کی کوشش کرتے ہیں جس کے ایک طرف چاہِ ماضی اور دوسری طرف دشتِ فردا پھیلا ہوا ہے۔

زمانے کی تقسیم ثلاثہ کو مدنظر رکھئے تو "یعقوب" امید از مستقبل کا سمبل ہے۔ اور "دیدۂ یعقوب" گزرے ہوئے کل اور بیتے ہوئے تجربے کی علامت۔ عرش کی بیشتر نظموں (مثلاً "دعائے نیم شبی"، "آب گم کا سفر"، وغیرہ) میں دونوں زمانے پوری شدت سے ابھرے ہیں۔ یوں اس کے ہاں زمانۂ حال کا تذکرہ بھی ملتا تو ہے ("ارتقا کا ایک موڑ" اور "پابہ زنجیر" وغیرہ نظمیں) لیکن حال تو ایک لرزیدہ سی سیمابی سی کیفیت رکھتا ہے جسے گرفت میں لینا ممکن ہی نہیں جو ہر لمحے ماضی کے اندھے کنوئیں میں گرتا جا رہا ہے۔ عرش نے ماضی کے اس اندھے کنوئیں میں جھانکنے کے لئے ادراک کی قندیل روشن کر رکھی ہے۔ اور ادراک کی انہیں روشن کرنوں سے وہ آنے والے زمانے کی تصویریں دیکھتا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جہاں ماضی اس کے ہاں دکھ، درد اور کرب کی یادوں کو ابھارتا ہے وہاں مستقبل اسے صبح تاباں کی بشارت دیتا ہے۔ فکر فردا کے ختم ہو جانے اور دردِ ماضی کے مٹ جانے کا یقین دلاتا ہے۔ رجائیت کا یہ انداز "دیدۂ یعقوب" کی بیشتر نظموں کی اساسی روح ہے۔ "آدھی رات کا درد"، "سہارے"، "اے جادوگر"، "پابہ زنجیر" اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔

احمد ندیم قاسمی کی رائے میں عرش صدیقی کی شاعری "کچھ کھوجتے ہوئے کچھ ڈھونڈتے ہوئے انسان کی شاعری ہے۔" ان نظموں کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ حقیقت کی تلاش کے لئے جس تنہائی اور یکسوئی کی اشد ضرورت ہوتی ہے وہ عرش صدیقی کے ہاں "چاہ و بیاباں"، "کوہ ماضی" اور "نصف شب" کی صورت میں

ابھری ہے۔ میں نے حال کے جس سیال لمحے کا ذکر کیا ہے اس کی نسبت سے عرشؔ کی شاعری میں تحرک کی کیفیت زیادہ نمایاں ہونی چاہیے تھی (اور "ہاتھ میں پتھر لے کر نکلو" "میرے وحشی جہان زو" میں تحرک اور عمل کی دعوت بھی ملتی ہے) لیکن اس کتاب کی نظموں کا سرسری جائزہ بھی لیا جائے تو اس کے ہاں STATIC SCENERY زیادہ پھیلی ہوئی ملتی ہے۔ سکوت کا پھیلاؤ گمبھیر ہے۔ رات بیکراں تنہا اور خموش ہے۔ درختوں پر گہری چپ خیمہ زن ہے۔ ہری گھاس پر چاندنی سوئی ہوئی ہے۔ فضاؤں کے ہمدوش پھیلا ہوا آسمان مہربلب ہے۔ یہ سٹیٹک سینری شاعر کے لئے غارِ حرا بھی ہے اور بطنِ ماہی بھی جو ذات اور کائنات کے تمام امتیازات مٹا کر عرفان کی منزل قریب لے آتا ہے۔ چنانچہ عرشؔ صدیقی اس حقیقت سے خود آگاہ ہے کہ :

مجھ کو معلوم نہیں

جز ترے اور بھی ہے کوئی خدا!

جز مرے اور بھی ہے کوئی نبی!! ("دشتۂ دل")

عرشؔ صدیقی چشمِ بینا کا شاعر ہے! اس کے تمام حواس میں باصرہ کی قوت زیادہ تیز نظر آتی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس کے ہاں فراز سے دیکھنے کا رجحان غالب ہے۔ پہاڑی پر کھڑے ہوئے انسان کے اطراف و جوانب فطرت اپنے تمام بوقلموں مناظر عریاں کر ڈالتی ہے اور ان کا جوہر کشید کرنے کے لئے سب سے پہلے باصرہ ہی عمل آرا ہوتا ہے۔ دوسری وجہ شاید یہ بھی ہے کہ عرشؔ کی نظموں کی عمومی فضا نیم روشن بلکہ کسی حد تک تاریک ہے۔ اندھیرے میں جب دوسرے تمام حواس پر ایک طرح کا خوف طاری ہو جاتا ہے تو صرف باصرہ ہی اس خوف پر قابو پانے کی کوشش کرتی ہے۔ اور بعض متلاشی آنکھیں باطن کی روشنی سے بھی بیدار ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ عرشؔ کے ہاں ظاہر کی اور باطن کی دونوں آنکھیں بیدار نظر آتی ہیں۔ اور تاریکی کی اس فضا میں کہیں روشنی کا ایک جگنو بھی چمکتا ہے تو اس کی نگاہ فوراً اس کا تعاقب کرتی ہے اور اسے اپنے آپ میں جذب کر لینے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کا ایک زاویہ تو یوں ظاہر ہوتا ہے :

اندھیرے کا تسلط تھا زمیں پر

کھلا گر چاند کا روزن نہ ہوتا ("روزن")

مگر عرفان کا متلاشی جب اسے ذات کے داخلی زاویے سے دیکھتا ہے تو اس کا ایقان یوں جلوہ گر ہوتا ہے :

اندھیرے کا تسلط تھا زمیں پر

کھلا گر دل کا یہ روزن نہ ہوتا

حقیقت یہ ہے کہ پرومیتھیس نے بنی نوعِ انسان کو زندہ رکھنے کے لئے عہدِ قدیم میں جو آگ چرائی تھی، عرشؔ صدیقی اسی آگ کی چنگاری سے نئے دور میں انسانیت کا سرد ہوتا ہوا الاؤ روشن کر رہا ہے۔ چنانچہ اس کو یقین ہے کہ :

نہ کہسار میرے

نہ میدان میرا

فقط نیم روشن پہاڑی ہے میری

ازل سے میں اس برج کا گنبد کا

ہمدمی تھکیں ہوں! ("پا بہ زنجیر")

عرش صدیقی کی یہ نظمیں اس لحاظ سے تجدید ہیں کہ اس نے مصرعوں کی طوالت اور قوافی کی مروجہ پابندیوں کو زیادہ ملحوظ خاطر نہیں رکھا لیکن اس کے ہاں نغمے کا رچا ہوا ذوق بھی ملتا ہے۔ اس کی بیشتر نظموں میں جذبے کی تیز آنچ کے ساتھ نغمے کا جادو بھی اس طرح مدغم ہوا ہے کہ ایک عام قاری بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ عرش کی خوبی یہ ہے کہ وہ آہنگ اُبھارنے کے لئے چھوٹے بڑے مصرعوں اور قوافی کے زیر و بم کو ہی کام میں نہیں لاتا بلکہ اضافتوں کے تسلسل کو بھی فن کارانہ طور پر استعمال کرتا ہے اور ان سے حیرت انگیز صوتی لطافت پیدا کرتا ہے۔ میں بخوفِ طوالت اس کی صرف ایک مثال پیش کروں گا۔

زیرِ بارِ جہاں گو کہ دن بھر یہاں معدنِ دل میں ارماں سسکتے رہے
جہدِ ہستی کے اس بحرِ ظلمات میں
راستوں پر مگر دیشِ چشمِ نہاں، تیری آنکھوں کے جگنو چمکتے رہے

"سہارے"

"دیدۂ یعقوب" میں عرش صدیقی کے فن کے دو اور پہلو گیت اور غزل کے روپ میں بھی سامنے آتے ہیں نظم میں اس نے مروجہ ہیئت سے انحراف کیا ہے لیکن غزل میں ہیئت کی اور گیت میں مزاج کی پابندی کے باوصف اس نے زندہ شاعری کے نمونے پیدا کئے ہیں اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ عرش صدیقی ہر صنفِ سخن پر قادر ہے۔

کتاب کا دیباچہ ڈاکٹر وزیر آغا نے اور سرورق کی آرا، احمد ندیم قاسمی اور عارف عبدالمتین نے لکھی ہیں جو عرش کے فن کو سمجھنے میں بڑی معاونت کرتی ہیں۔

انور سدید

احمد ندیم قاسمی ایڈیٹر، پبلشر نے محمد طفیل کے اہتمام سے نقوش پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر "فنون" ۴۷- انارکلی لاہور سے شائع کیا۔

تدارک

علاج سے بدرجہا بہتر ہے:

اپنی اوّلین فرصت میں

نابینائی کا تدارک کیجئے:

انجمن فلاحِ نابینایاں

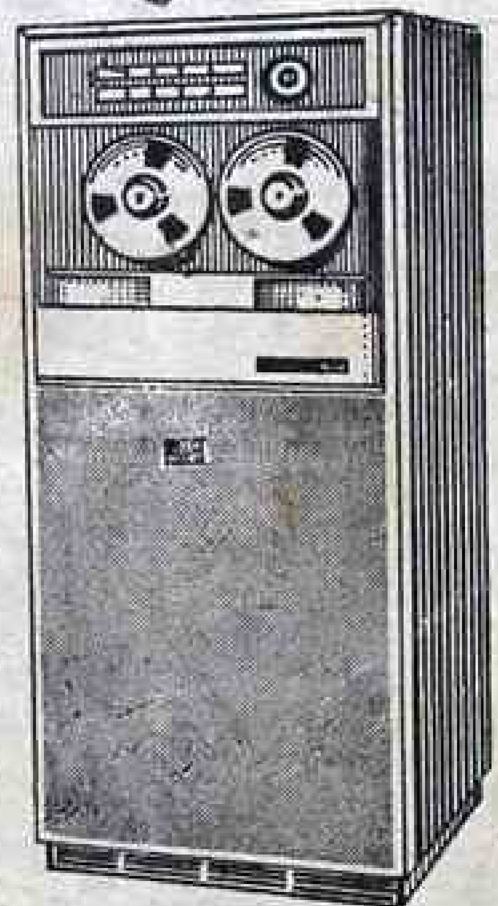
دل محمد روڈ

لاہور

یہ صفحہ پاکستان کی ایک مشہور
جہازران کمپنی کی جانب سے
شائع ہوا۔

"THE FUNOON" REGD. NO. L. 7579

آپ
اور ہمارے
کمپیوٹر



جب بھی آپ کے انعامی بونڈ پر انعام نکلے گا

حبیب بینک کے
کمپیوٹر
آپ کو خوشخبری دیں گے

حبیب بینک نے آپ کی خدمت کے لئے نئی کمپیوٹر سروس شروع کی ہے۔
حبیب بینک کمپیوٹر جو ڈھاکہ اور کراچی میں نصب کئے جا چکے ہیں
نہ صرف بڑے بڑے اداروں کی ضروریات پوری کرتے ہیں بلکہ اب آپ کی
انفرادی خدمت کے لئے بھی پیش پیش ہیں۔

آپ اپنے انعامی بونڈ کے نمبر حبیب بینک کی اپنی شاخ میں درج
کرا دیں اور آئندہ قرعہ اندازی میں جب بھی آپ کے کسی بونڈ پر انعام نکلے گا
ہمارا کمپیوٹر ڈویژن آپ کو اس کی خوشخبری دے گا۔ یہ خدمت حبیب بینک،
اپنے کرم فرماؤں کیلئے بلا معاوضہ انجام دیتا ہے۔

حبیب بینک کمپیوٹر، سیول اور ملٹری اکاؤنٹ۔ ڈیویڈنڈ وارنٹ۔ یوٹیلٹی سروس بل۔ سیلز انوائس۔ پے رول۔ لاگت کا تخمینہ۔ بیلنس شیٹ
اور مارکیٹ کے اعداد و شمار بھی ایسی برق رفتاری سے تیار کرتے ہیں جس کی کاروباری دنیا میں مثال نہیں ملتی۔
آپ حبیب بینک کے تجربہ کار اور قابل کمپیوٹر عملے پر مکمل اعتماد کر سکتے ہیں۔ آپ صرف یہ بتا دیجئے کہ کس قسم
کی خدمت درکار ہے اور آپ ان کو اپنی خدمت کے لئے ہمیشہ مستعد پائیں گے۔

حبیب بینک
کمپیوٹر
کو بہتر خدمت کا موقعہ دیجئے